

ہماری ویب ڈیجیٹل بک

محمد انور گریوال

MUHAMMAD ANWAR GRAYWAL

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ



E-BOOK SERVICES

*Collection of Published Articles
By "Muhammad Anwar Graywal"
at Hamariweb.com*

جاوید ہاشمی کا قومی اسمبلی میں خطاب
مسلم لیگ ن کے رہنما مخدوم جاوید ہاشمی نے قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے کہا
ہے کہ ”نواز شریف سمیت سیاسی رہنما قوم کو استعمال نہ کریں، پاکستان کے معاشی
حالات مصر سے بدتر ہیں، ارکان پارلیمنٹ کو بغاوت کرنا ہوگی، پارٹی قائدین کے
بیرون ملک کاروبار ہیں، پر قیث زبندگی گزارنے والے ارکان پارلیمنٹ کو عوامی مسائل
سے دلچسپی نہیں، اگر قوم کی نمائندگی کا حق ادا نہ کیا تو پارلیمنٹ رہے گی نہ قیادت، پھر
یہاں کوئی اور تماشا ہوگا“ خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پورے ایوان نے ہاشمی صاحب
کو دل کھول کر داد دی، ان میں وزیراعظم، ایم کیو ایم اور ن لیگ کے ممبران اسمبلی
بھی شامل تھے۔

دراصل جاوید ہاشمی نے ایک طویل عرصے کے بعد قومی اسمبلی میں خطاب کیا تھا، اللہ
تعالیٰ کے فضل اور عوام کی دعاؤں سے وہ ایک پریشان کن اور خطرناک بیماری کے
چنگل سے نکل کر اور نئی زندگی پا کر میدان میں موجود ہیں، پوری قوم جانتی ہے کہ
جاوید ہاشمی کی بیماری کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے، ان کی سوچ میں کس قدر خلوص
اور دردِ دل ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام تر قربانیوں

کے باوجود بھی پارٹی میں اس مقام پر فائز نہیں ہیں، جس کے وہ حق دار ہیں۔ آمریت کے سامنے ڈٹ جانے اور ان کی جیلوں کو برداشت کر لینے کا یہی صلہ ہے کہ وہ نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ پارٹی کے اندرونی معاملات ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ مخدوم صاحب ہمارے یا اس قسم کے خیالات کی تردید ہی کرتے رہیں، یہ بھی دراصل ان کا پارٹی سے اخلاص کا ثبوت ہی ہے۔

لیکن مذکورہ بالا خطاب میں ان کی باتیں زمینیں حقائق کے عین مطابق ہیں مگر ہماری سیاست میں ان کا کلچر نہیں، ہماری قیادتیں غریبوں کے غم میں مرجاتی ہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ پر قعیش زندگی گزارنے والا کوئی فرد غریب کے مسائل نہ جان سکتا ہے، نہ دل سے محسوس کر سکتا ہے۔ مخدوم صاحب سے ہمیں ہمدردی بھی ہے کہ وہ موجودہ ارکان پارلیمنٹ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بغاوت کر دیں، جناب ! ہر کوئی جاوید ہاشمی نہیں ہوتا۔ ہمیں اس بات پر بھی ان سے ہمدردی ہے کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ کھڑے ہیں، ان کے کاروبار بھی باہر ہیں اور وہ ”سیاست“ کرنے کے عادی بھی ہیں۔

ناموس رسالت ﷺ قانون کا ترمیمی بل

اگرچہ وفاقی حکومت مسلسل یہ بیان جاری کر رہی ہے کہ ناموس رسالت قانون میں ترمیم نہیں کی جائے گی، دانشور بھی قوم کو مسلسل یہ باور کروا رہے ہیں کہ

اگر حکومت مذکورہ قانون میں تبدیلی نہ کرنے کا اعلان اور وعدہ کر رہی ہے تو قوم اور مذہبی و سیاسی قیادتوں کو بھی اعتماد کر لینا چاہیئے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ ناموس رسالت کے لئے ریلیاں جاری ہیں، حکومت پر مسلسل یہ دباؤ بڑھایا جا رہا ہے کہ اس قانون میں تبدیلی برداشت نہیں کی جائے گی۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ جب حکومت یقین دہانی کروا رہی ہے تو واقعی ریلیاں بند ہو جانی چاہئیں، مگر وزیراعظم کے تازہ بیان سے حکومت کی بوکھلاہٹ کھل کر سامنے آتی دکھائی دیتی ہے۔ وزیراعظم نے کہا ہے کہ پارٹی پالیسی کے مطابق شیریں رحمان قانون رسالت میں ترمیمی بل واپس لینے پر رضامند ہو گئی ہیں، حکومت اس بل میں ترمیم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ بھی کہ سپیکر نے اس بل پر غور کے لئے کوئی کمیٹی بھی تشکیل نہیں دی۔

گویا پارٹی کی پالیسی کے مطابق ہی شیریں رحمان نے ترمیم واپس لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے، انھوں نے قوم پر مہربانی کی ہے۔ ورنہ پہلے کس پارٹی کی پالیسی کے مطابق ترمیمی بل پیش کیا گیا تھا؟ کس پارٹی کی پالیسی کے مطابق گورنر پنجاب بیانات جاری کرتے تھے اور آسیہ کو عدالت کے بعد صدر کے حکم سے رہائی دلانے کا اعلان کرتے تھے؟ حکومت یہ اعلان تو کر رہی ہے کہ ترمیم نہیں کی جائے گی، یہ اقدام ابھی تک نہیں ہوا کہ بل واپس ہی لے لیا جائے۔ عاقبت نااندیش حکمرانوں کی آنکھوں پر اختیارات اور پروٹوکول وغیرہ

کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، ان کو کچھ دکھائی اور بھائی نہیں دیتا، ان کے گورنر کا قتل بھی ان کی آنکھیں نہیں کھول سکا، نہ جانے یہ لوگ سبق کیسے حاصل کریں گے؟
مہنگائی اور بڑھے گی

سٹیٹ بینک آف پاکستان نے مالیاتی کارکردگی پر اظہارِ تشویش کرتے ہوئے کہا ہے کہ رواں مالی سال میں مہنگائی اور خسارہ مزید بڑھے گا، بتایا گیا ہے کہ ضروری تبدیلیوں میں مزید تاخیر کی گئی تو معیشت کو مزید بوجھ برداشت کرنا پڑ سکتا ہے، کم آمدنی والے گروپوں کو مہنگائی سے بچانے کے لئے سبسڈی دینا ہوگی۔

سٹیٹ بینک آف پاکستان نے کوئی نئی بات نہیں کی، ان کی ہر سہ ماہی رپورٹ میں حکومت سے اسی قسم کے خدشات و مطالبات کا اظہار ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بینک دولت پاکستان کی کسی ترجمہ نر یا سفارش پر عمل بھی کیا گیا ہو، یا بینک کی تشویش پر کبھی حکومت بھی تشویش میں مبتلا ہوئی ہو۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا، حکومت اپنی خامیوں پر نظر ثانی نہیں کرے گی، اپنے اخراجات میں کمی نہیں کرے گی، مہنگائی پر قابو نہیں پائے گی، سبسڈی اگر کہیں بچ رہی ہے تو اسے بھی تلاش کر کر کے ختم کرے گی۔ اگلی سہ ماہی میں بھی سٹیٹ بینک

اسی قسم کی رپورٹ جاری کر دے گا۔ حکومت اور سٹیٹ بینک اپنا اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور نتیجتاً عوام مہنگائی اور غربت کی چکیوں کے دو پائٹوں میں پس رہے ہیں، پستے ہی رہیں گے۔

ہمارے معزز ارکان پارلیمنٹ نے ایک مرتبہ پھر اپنے حقوق کی سر بلندی کے لئے آواز بلند کی ہے، ہوا یوں کہ قومی اسمبلی کی ایک رکن کشمالہ طارق نے احتجاج کیا کہ معزز ارکان پارلیمنٹ کے والدین کی طبی سہولیات بند کر دی گئی ہیں، انھوں نے کہا کہ ایسا کرنے سے قبل ارکان کو نوٹس ملنا چاہیئے اور یہ بھی کہ اسلام آباد کلب کی ممبر شپ کے لئے افسر شاہی سے 50 ہزار روپے لئے جاتے ہیں جبکہ ارکان اسمبلی سے 10 لاکھ طلب کئے جاتے ہیں۔ موصوفہ کی زبان سے ان جذبات کا اظہار ہونا تھا کہ دیگر معزز ارکان پھٹ پڑے، کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ گزرے کہ شائلہ پر ناراض ہوئے بلکہ ان کی حمایت میں سب ایک زبان و یکجا ہو گئے، ایسے کاموں میں ہمیشہ سے ہی یہ برادری اسی طرح یکجہتی کا اظہار کرتی آئی ہے۔

معزز ارکان نے مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی میڈیا، افسر شاہی اور جرنیلوں کے برابر مراعات دی جائیں، ہمیں بھی پلاٹ اسی طرح الاٹ کئے جائیں جس طرح ان طبقوں کو کئے جاتے ہیں۔ ان لیگ کے ایک رکن اسمبلی نے کہا کہ پارلیمنٹ کے ملازمین ارکان کے ساتھ منسلک کر دیئے جائیں۔ اس معاملہ میں سپیکر نے بھی اپنا فرض نبھایا اور اپنے ارکان کی حمایت کر کے ثوابِ دارین میں سے اپنا

حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں، انھوں نے کہا کہ ارکان پارلیمنٹ پر گندگی اچھالی جاتی ہے، جبکہ پاکستان کے ممبران اسمبلی دنیا بھر میں سب سے کم تنخواہ لیتے ہیں۔ مراعات میں اضافہ کے لئے بھی ترامیم لائی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر ماروی میمن نے ان مطالبات کی مخالفت کی، اس کا نتیجہ وہی ہوا جو اس قسم کے مواقع پر ہوا کرتا ہے معزز ارکان بیخ پا ہو گئے، یوں ماروی کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان کے سیاسی کچھر میں کون غریب یا عام آدمی الیکشن لڑنے کا تصور کر سکتا ہے؟ الیکشن میں حصہ لینے کے لئے اب لاکھ نہیں کروڑ پتی ہونا ضروری ہے، کروڑوں روپے الیکشن پر خرچ کر کے مراعات اور پلاٹوں کی بھیک مانگنا عجیب سا لگتا ہے، شاید جتنا خرچ کیا جاتا ہے، بعد میں اتنی ریکوری بھی تو کرنی ہوتی ہے۔ بہت سے عوامی نمائندے کافی کاروباری ہوتے ہیں، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آج کل کاروباری لوگ ہی زیادہ تر نمائندگی کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ وہ سرمایہ خرچ کرتے وقت یہ حساب کتاب ضرور لگاتے ہیں، کہ یہ خسارہ کب اور کیسے پورا ہوگا۔ بہت سے معزز ارکان تو بہت کچھ کر لیتے ہیں، مگر بہت سے ممبران صرف تنخواہ اور دیگر مراعات پر ہی تکیہ کرتے ہیں، یا ذاتی کاروبار پر۔ اس صورت میں بھی بعض معزز ارکان مزید آمدنی کی کوئی سبیل نکال لیتے ہیں، ان میں اسمبلی میں حاضری کے معاملے میں جعل سازی بھی شامل

ہے۔

معزز ارکان اسمبلی کی طرف سے مراعات میں اضافے کا مطالبہ کوئی نئی بات نہیں، انہیں ایسا کرنا چاہیئے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مراعات یافتہ طبقہ میں میڈیا کا نام بھی شامل ہے، یقیناً میڈیا میں بھی کچھ لوگ بھی مراعات یافتہ ضرور ہوں گے، مگر اکثریت کا معاملہ سب کے سامنے ہے، بنیادی طور پر یہ لوگ بیگار کیمپ کے قیدی ہیں، جنہوں نے سارا دن محنت کر کے اپنے مالکان کے لئے مواد اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور شام کو اپنے بیوی بچوں میں لڑائی جھگڑے کی داستان دہراتے ہیں، اور صبح پھر اخباروں اور چینلوں کا پیٹ بھرنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ رہا معاملہ افسر شاہی اور جرنیلوں کی مراعات کا تو وہاں تک جانے کے لئے تو پر جلتے ہیں، ان کی مراعات کو کم کرنے کی کسی میں ہمت نہیں، کوئی طاقت ور سے طاقت ور حکمران بھی ان دونوں طبقوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکا۔ حکومتوں کے بڑے بڑے فیصلے بیوروکریسی کی مرضی کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بیوروکریسی کی مراعات ہمیں انگریز ورثے میں دے گئے تھے، ہم ان کی وراثتوں کے صحیح امین ہیں، ان میں خیانت کی تو ممکن ہے گناہگار قرار پائیں۔ ہم بیوروکریسی کی شان، شوکت اور جاہ و جلال دیکھتے ہیں تو حد درجے مرعوب ہوتے ہیں

بیورو کرلیسی کو بھی تمام ناز نخرے آتے ہیں، اسے معلوم ہے کہ اس عوام نما مخلوق سے کس طرح نمٹنا ہے، اس کو کتنی اور کب اہمیت دینی ہے، اس کو کس مقام پر رکھنا ہے۔ نتیجہ یہی ہے کہ بیورو کرلیسی ہماری آقا اور ہماری قوم ان کی حقیقی غلام ہے۔ غلاموں کے نمائندے معزز ارکان پارلیمنٹ بھی بیورو کرلیسی کی مراعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے منہ میں بھی پانی آتا ہے، کاش ہم بھی اسی بیورو کرلیسی جیسی مراعات پاسکیں۔ یہی عالم فوجی جرنیلوں کا ہے، کہ کس کی مجال ہے جو ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کر سکے اور ان کی مراعات کو چیلنج کر سکے؟

جن لوگوں نے پورے ملک کے لئے قانون سازی کرنی ہے، سترہ کروڑ عوام کے چند سو نمائندے جو اپنے عوام کے مقدر کے فیصلے کرنے میں باختیار ہوتے ہیں، اپنی ماتحت بیورو کرلیسی اور اپنی ہی فوج کے برابر مراعات مانگتے ہوئے انہیں پریشانی تو ہونی چاہیئے، کون عقلمند ہے جو اپنے نوکر کے برابر مراعات مانگے۔ اگر یہ سوچ بھی لیا جائے کہ ان کو بیورو کرلیسی اور جرنیلوں کے برابر مراعات مل جائیں گی تو ملک کی رگوں میں بچا کھپا خون یہ چوس لیں گے۔ لیکن ایک بات دلچسپ ہے کہ عوامی نمائندے ہوں یا بیورو کرلیسی یا جرنیل، یہ سب تو مراعات یافتہ ہوں گے، عوام کا کیا ہوگا؟ عوام کے زندہ رہنے کے لئے کیا بچے گا؟ اس کے بارے میں بھی ہمارے نمائندے یا ”پبلک سرونٹ“ کیا فرماتے ہیں؟

وفاقی کابینہ کافی دنوں سے عالم نزاع میں تھی، جان کنی کا مرحلہ بہت ہی جان لیوا ہوتا ہے، جان جاتے جاتے کافی دن لے گئی۔ کون چاہتا ہے کہ اس کا ہوٹر اور پڑوٹو کول ختم ہو، اس کے جاہ و جلال میں کمی آئے، اس کی عیاشیاں اس سے چھین لی جائیں۔ لیکن کیا کریں کرسی کسی کی نہیں ہوتی، کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی، کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ کہتے ہی مضبوط کرسیوں والوں کا دھڑن تختہ ہوا، نہ ان کی کرسی سنبھلی اور نہ ہی وہ خود سنبھل سکے۔ گردشِ ایام کے جھمیلوں میں کسی نے جانے والوں کو یاد بھی نہیں کیا، ہماری موجودہ وفاقی کابینہ بھی چلی گئی، ان میں سے کچھ تو یقیناً اپنی 'اعلیٰ کارکردگی' کی بنا پر مزید کچھ عرصہ کے لئے کرسی پر قابو پالیں گے، مگر کئی اپنی خاص کوتاہیوں کی وجہ سے دوبارہ قوم کی خدمت پر بحال نہیں ہو سکیں گے، اب قوم ان کی خدمات سے محروم ہو جائے گی۔

کابینہ میں تبدیلی کی ایک وجہ تو مولانا فضل الرحمان کا حکومت کو داغِ مفارقت دے جانا ہے، ان کی وزارتوں سے پیدا شدہ خلا بھی پر کرنا تھا، اور میاں نواز شریف نے بھی حکومت کو بہتری کے لئے الٹی میٹم دیا ہوا ہے، اس کو بھی حکومت نے مد نظر رکھا ہوا ہے، اس کے تحت بھی انھوں نے اپنے اخراجات میں

کمی کرنی ہے۔ اب دیکھیں نئی کابینہ کتنے افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اور اس میں کون کون سے شفاف لوگ سامنے آتے ہیں اور کون کون سے داغدار کردار والے وزراء فارغ ہوتے ہیں، ممکن ہے اس کالم کی اشاعت تک نئی کابینہ کی پہلی قسط معرض وجود میں آچکی ہوگی۔

کابینہ کے آخری اجلاس میں جب دو مستقل اور کچے وزیروں بابر اعوان اور قمر الزماں کائرہ نے کابینہ کو اپنے اپنے استعفیے پیش کرنے کے لئے کہا گیا تو ایک وزیر صاحب سخت ناراض ہوئے، انھوں نے کہا کہ آپ کوئی فوجی ہیں جو ہم سے استعفیے طلب کر رہے ہیں، انہیں بتایا گیا کہ ہم فوجی نہیں ہیں بلکہ حوالدار ہیں۔ تاہم ایک اخبار نے یہ خبریوں شائع کی کہ وفاقی کابینہ رضا کارانہ طور پر مستعفی، ایسی رضا کاریوں کا کس کو علم نہیں۔ تاہم اپنی مرضی کے مطابق مستعفی ہونے والے وزراء ناراض اور مایوس ہو کر ہی روانہ ہوئے، نکلنا خلد سے آدم کا، بعض وزراء کا اس قدر موڈ خراب تھا کہ وہ الوداعی تصویر بنائے بغیر ہی چلے گئے۔ کابینہ کی رخصتی کے ضمن میں ایک اور بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جس روز کابینہ کو نو دو گیارہ کیا گیا، اس روز تاریخ بھی نو دو گیارہ ہی تھی، یعنی دو فروری 2011ء۔

خبر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وزیر اعظم نے اپنے انجام کو پہنچنے والی کابینہ

کے ارکان کو خراج تحسین بھی پیش کیا، ”ہم نے مشکل حالات میں اقتدار سنبھالا، تین سال کے دوران کئی تاریخی فیصلے کئے (ان تین سالوں میں سب سے اہم اور تاریخی فیصلہ خود یہ کابینہ کی تحلیل کا ہے) قوم کو چیلنجز سے کامیابی سے نکالا، کابینہ کے 77 فیصد فیصلوں پر عمل درآمد ہوا“ خراج تحسین میں یہ نہیں بتایا گیا کہ آپ لوگوں کی وجہ سے ہماری بدنامی ہوئی، آپ کے کردار کی بنا پر ہی ہمیں یہ مشکل فیصلے کرنے پڑے، آپ کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہم اس مقام کو پہنچے۔ خراج تحسین کی خبر بذاتِ خود مضحکہ خیز ہے، کہ جن لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے حکومت یہاں تک پہنچی، وزیراعظم انہی کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ اگر قوم کو چیلنجز سے نکالا تھا تو پھر کابینہ کو تحلیل کرنے جیسے چیلنج کا سامنا کیوں کر ناپڑا؟ کابینہ کے 77 فیصد فیصلوں پر عمل کی بات بھی قابلِ گرفت ہے، کہ آخر باقی 23 فیصد فیصلوں پر عمل کے راستے میں کیا رکاوٹ تھی، کیا کابینہ اتنی ہی بے اختیار تھی کہ اپنے فیصلوں پر عمل کروانے میں بے بس تھی۔

آخری اور اہم ترین بات یہ کہ ٹرین کی 70 بوگیوں میں سے کچھ تبدیل کی جا رہی ہیں، کچھ یہی رہیں گی۔ مگر انجن وہی رہے گا، جس گاڑی کا انجن ہی گڑبڑ ہو، اس پر کیا بھروسہ جو انجن خود بھی مجموعہ اعضاء ہو وہ گاڑی کو کیسے تیز رفتاری اور حفاظت سے کسی منزل، کی طرف لے جاسکتا ہے؟ اور جس گاڑی کی کوئی

منزل ہی نہ ہو، اس کے سفر پر اظہارِ ہمدردی ہی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ انصاف کی کونسی قسم ہے کہ وزیر اعظم خود اپنے منصب پر قائم رہیں اور اپنے دیگر معاونین کو نا اہل قرار دے کر فارغ کر دیں، اگر یہ نا اہلیت نہیں، بچت پروگرام ہے تو قوم کو بتایا جائے کہ وزیر اعظم نے خود اپنی ذات کی حد تک کتنی بچت شروع کی ہے، عیاشیوں میں کس قدر کمی کا اعلان کیا ہے، اپنی اقربا پروری (کہ یہ ان کا پرانا شوق ہے) کو کتنا کم کیا ہے، کونسی ایسی اصلاحات کیں ہیں جو آنے والی حکومتیں بھی جاری رکھنے پر خود کو مجبور پائیں گی۔ اگر جاتے تو سب ہی جاتے، سربراہ اگر وہی ہے جس کے ہوتے ہوئے کابینہ کوئی کارِ نمایاں نہیں کر سکی تو اسی سربراہ کے ہوتے آنے والی کابینہ کونسی آسمان میں پیوند کاری کر لے گی۔ جو تیر سابقہ کابینہ نے چلایا ہے، وہی آنے والی کابینہ چلائے گی۔ ان تہدیلیوں سے بھلا بھلائی اور بہتری کی کیا توقع۔

دانش سکول ---- چند غور طلب پہلو

دانش سکولوں کا ایک رخ تو بہت نمایاں اور اہم ہے کہ وزیر اعلیٰ ان کے معاملے میں نہایت جذباتی ہیں، ان سکولوں کی مخالفت میں وہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے، اس کا اظہار انھوں نے حاصل پور میں دانش سکول کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں دو مرتبہ کیا، کہ ”مجھے طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں غریبوں پر کروڑوں روپے کیوں خرچ کر رہا ہوں“ انھوں نے قسم کھا کر زندگی بھر اس ”جرم“ کو جاری رکھنے کا اعلان بھی کیا۔ حالانکہ اعتراض غریبوں پر کروڑوں خرچ کرنے پر نہیں بلکہ سرکاری سکولوں کی حالتِ زار کی بنا پر ہے۔ لیکن حکمرانوں کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ تنقید، رائے اصلاح کو بھی برداشت نہیں کرتے، اگر کسی جگہ دس بچے ہوں اور وہ بھوک کی شدت سے نڈھال ہوں، تو ان میں سے ایک کو پانچ ڈشوں پر مشتمل فائو سٹار قسم کا کھانا دے دیا جائے اور باقی نو بچے ایک لقمے سے بھی محروم رہ جائیں تو اس رویے کو کیا نام دیا جائے گا؟

میاں شہباز شریف نے تعلیمی میدان میں اربوں روپے کے منصوبے شروع کر رکھے ہیں، ان کے اثرات کتنے دیر پا ہوں گے اور کتنے وسیع پیمانے پر رونما ہوں گے اس موضوع کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن

حکومت پنجاب کے تحت چلنے والا ایکٹ خود مختار ادارہ ہے، جو کم فیس والے پرائیویٹ سکولوں کی مالی معاونت کرتا ہے، اس سے الحاق شدہ سکولوں کی تعداد 18 سو سے تجاوز کر چکی ہے، اس میں مفت تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد آٹھ لاکھ تک ہے۔ فاؤنڈیشن ہر سال اپنے سکولوں کے بچوں کا دو مرتبہ امتحان لیتی ہے، وفاق فوقان سکولوں کی مانیٹرنگ ہوتی رہتی ہے، فاؤنڈیشن کا کوئی اہلکار کسی سکول سے سادہ پانی پینے کا 'جرم' بھی نہیں کر سکتا، اگر ایسے جرم کا مرتکب ہو جائے تو اسے اس کی پاداش میں ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں، یہ عام گلی محلے کے سکول بہترین نتائج دے رہے ہیں۔ فاؤنڈیشن کے سلسلے کو اور بھی وسیع کر کے اس میں کم خرچ پر زیادہ بچوں کو زیادہ معیاری تعلیم دی جاسکتی ہے۔

بہاول پور میں چولستان لاکھوں ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے، اس کے ایک طرف بھارت کی سرحد اور تین اطراف میں رحیم یار خان، بہاول پور اور بہاولنگر کے اضلاع واقع ہیں، یہ تینوں اضلاع مل کر بہاول ڈویژن بناتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے پہلے دانش سکول کا افتتاح رحیم یار خان میں کیا ہے، دوسرے کے بہاول پور کی تحصیل حاصل پور میں اور اب تیسرے کا بہاولنگر کی تحصیل چشتیاں میں ہوگا۔ چولستان چونکہ صحرائی علاقہ ہے، اس لئے تعلیمی سہولتوں سے محروم ہے، کچھ عرصہ قبل میاں شہباز شریف نے چولستان کی قسمت جگانے کا فیصلہ کیا، ان کی

خواہش کے مطابق ”پڑھا لکھا چولستان پراجیکٹ“ شروع کیا گیا، طے پایا کہ قریب تر علاقے سے اساتذہ لئے جائیں گے، سینئر ٹیچر کی تنخواہ 5 ہزار اور جونیئر کی 25 سو طے ہوئی، سکول کے لئے عمارت کا بندوبست وہاں کے لوگوں کے ذمے تھا۔

سکول قائم ہو گئے، جس کو جو عمارت ملی وہیں پر اس نے علم کی شمع روشن کر لی، دیکھتے ہی دیکھتے ان 75 سکولوں میں بچوں کی تعداد 53 سو سے تجاوز کر گئی۔ یہ سکول جنوری ء میں شروع ہوئے تھے، ان کے اساتذہ کو باقاعدہ سرکاری طریقے سے بھرتی کیا 2010 گیا تھا۔ مگر یہ انکشاف شاید سب کے لئے حیران کن ہو کہ ایک سال مکمل ہونے کے باوجود ان میں سے کسی ایک ٹیچر کو ایک بھی تنخواہ نہیں ملی، معاملہ لاہور کی فنانس منسٹری میں ہے، یا پی این ڈی یا کسی اور کے پاس، یہ بھی بعید نہیں کہ خود وزیر اعلیٰ کی میز پر ہی ہو۔ 3 فروری کو جب میاں شہباز شریف حاصل پور میں دانش سکول کا افتتاح کرنے آئے تھے، اس موقع پر یہ چولستان کو ”پڑھا لکھا“ بنانے والے یہ اساتذہ اپنے سکولوں کے بانی وزیر اعلیٰ سے اپنی سال بھر کی کمائی کی بھیک مانگنے آئے تھے، مگر پروٹوکول اور سیکورٹی کے مسائل نے انہیں منظر پر نہیں آنے دیا، کیا وزیر اعلیٰ ان غریب اساتذہ پر بھی توجہ فرمائیں گے؟ ان اساتذہ کی سال بھر کی تنخواہ 67 لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے جبکہ دو دانش سکولوں کے افتتاح پر کم از کم 70 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

دانش سکول نہایت ہی ہنگامی حالت میں قائم کئے گئے ہیں، داخلے بھی اسی طرح کئے گئے ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ ان سکولوں میں مساجد کا وجود نہیں ہے، حالانکہ یہ اقامتی سکول ہیں، اور ان میں داخل بچوں پر نماز فرض ہو چکی ہے۔ 60 کروڑ کی ایک عمارت میں پر شکوہ مسجد بھی لازمی ہونی چاہئے تھی۔ ایک اور خطرناک بات جو سامنے آئی ہے کہ حاصل پور والے سکول سے دس طلباء کو فارغ کر دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ ان کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوا کہ ان کی عمریں 13 سال سے زائد ہیں۔ اول تو داخلے کے وقت انتظامیہ کو اندازہ لگانا چاہئے تھا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر تیرہ سال سے زائد عمر کے بچوں کی حرکات و سکنات مشکوک ہیں، تو آنے والے سالوں میں کیا بنے گا جب بچے میٹرک تک کی عمر کے ہونگے؟ اور جن بچوں کو سکول سے نکال دیا گیا ہے، اب ان کا مستقبل کیا ہے، وہ اب پھر انہی سکولوں میں جا داخل ہونگے جہاں سے آئے تھے، ان پر کیا بیتے گی؟

جیل کے لاؤڈ سپیکر؛

امریکی قاتل ریمینڈ کی طبیعت خراب ہونے کی بنا پر جیل کے لاؤڈ سپیکر بند کروا دیئے گئے ہیں، امریکی قونصل خانے کے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ بھی کیا۔

نیت خراب ہو تو طبیعت خراب ہو ہی جاتی ہے، اور فارسی میں جو کہتے ہیں کہ 'خوئے بد را بہانہ بسیار'، ایسے لوگوں کے پاس ہزار بہانے ہوتے ہیں۔ طبیعت خراب ہونے کے نام پر سہولتیں اور آرام کی طلبی۔ یار لوگ تو پہلے ہی کہتے تھے کہ قاتل کے لئے لاؤڈ سپیکر پر اذان پر پابندی لگادی گئی ہے، لیکن لگتا تھا کہ یہ افواہ ہے، مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افواہ نہیں سچ تھا، جسے اب صرف 'لاؤڈ سپیکر' کا نام دے کر گزارا چلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے جب لاؤڈ سپیکر بند ہوں گے تو اذان بھی بند ہو جائے گی۔ بد قسمتی سے ہمارے دانشور حضرات اس قسم کے معاملات کو غیرت سے جوڑ کر اس کے خلاف جذبات کا اظہار کرنے کے لئے زورِ قلم و زباں صرف کرتے رہتے ہیں، لیکن ایک ملزم کو ایک ملزم کی طرح ہی ڈیل کیا جانا چاہیے، ملزم، ملزم ہی ہوتا ہے، خاص یا عام نہیں ہوتا۔ جیل میں اور بھی کئی اصل مریض ہونگے، آج تک اور تو کسی قیدی کے لئے لاؤڈ سپیکر بند نہیں ہوئے، کسی امریکی قاتل کے لئے کیوں؟

پنجاب حکومت سے پی پی کی علیحدگی

پنجاب کے سینئر وزیر راجہ ریاض نے کہا ہے کہ ”پنجاب حکومت سے الگ کیا گیا تو شکرانے کے نفل ادا کریں گے ن لیگ نے لوٹوں کو ساتھ ملا کر یثاق جمہوریت کو دفن کر دیا گیا“ کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار پی پی کے ایکٹ اور وزیر اشرف سوہنا نے بھی کیا ہے۔ جواباً پنجاب کے وزیر قانون رانا ثناء اللہ نے بھی اپنا فرض ادا کرنا ضروری جانا، انھوں نے کہا کہ ”ایجنڈے پر عمل نہ ہوا تو 23 فروری پی پی کا حکومت پنجاب میں

”آخری دن ہوگا، راجہ ریاض کو داتا دربار میں نفل ادا کرنے سے نہیں روکا

پنجاب موجودہ حکومت کے اولین روز سے ہی ”مولا جٹوں“ کے قبضے میں ہے، اول تو ہمارے خادم اعلیٰ بھی کسی طرح کسی سے کم نہیں، تاہم ان کے مقابلے میں سابق گورنر سلمان تاثیر نے میدان گرم رکھا۔ اس کے بعد یہ فریضہ راجہ ریاض نے سنبھال لیا، ان کے مقابلے میں رانا ثناء اللہ بھی ن لیگ کے مولا جٹ ہی ہیں۔ پنجاب چونکہ پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم صوبہ ہے، اس لئے اس کے مسائل اور معاملات بھی ملک پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لوٹا کر لسی کا الزام مناسب نہیں کیونکہ ن لیگ خود اس کارِ خیر کی بانی ہے، اس لئے کوئی بھی بانی اپنے مشن کے فروغ کے لئے تو کام کر سکتا ہے، اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ ان لوٹوں کی

بھی ہمت ہے کہ سات سال مشرف کی چھتری تلے عیاشی کرنے کے بعد اب میاں برادران کے گھنے سائے تلے بیٹھنا چاہتے ہیں، اور میاں برادران کی بھی ہمت ہی ہے کہ وہ تما تر نعروں اور دعوؤں کے باوجود لوٹوں کی سرپرستی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پی پی پی والے نفل تو ادا کرنا چاہتے ہیں مگر اس صورت میں کہ انہیں وزارتوں سے نکالا جائے، بھی اگر آپ یہ نیک کام کرنا ہی چاہتے ہیں تو نکالے جانے کا انتظار نہ کریں، بلکہ یہ تکلیف خود ہی برداشت کریں اور نفل ادا کرنے کا موقع حاصل کر لیں، نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔

پی پی کو مزید مہلت نہیں دیں گے؛

ن لیگ کے قائد میاں نواز شریف نے کہا ہے کہ 10 نکاتی ایجنڈے پر عملدرآمد کی رفتار سست ہے، حکومت کو مزید مہلت نہیں دے سکتے، عوام سے رجوع کریں گے۔ وہ کارکنوں سے خطاب کر رہے تھے۔

میاں صاحب جب سے سعودی عرب سے واپس تشریف لائے ہیں، وہ جذبات میں کبھی کبھی ہی آتے ہیں، کافی عرصہ خاموش اور پرسکون رہنے کے بعد جب عوام چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں تو آپ کوئی سخت سا بیان دے کر ماحول کو اپنے حق میں سارگار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، عوام میں ان کی مقبولیت کا گراف کافی بلند بتایا

جاتا ہے، اس لئے عوام جلد ہی ان کے بیانات وغیرہ سے متاثر ہو کر پرانے غم بھول جاتے ہیں۔ میاں صاحب کو ایسی 'تڑیاں' وغیرہ لگانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آتی رہتی ہے کہ یار لوگ ان پر 'فرینڈلی اپوزیشن' کا الزام لگاتے رہتے ہیں، اس داغ کو دھونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ دوسری طرف وفاقی حکومت بھی 'گو نگلوؤں' سے مٹی جھاڑتی رہتی ہے، کہ کبھی ن لیگ کو مایوس نہیں کرتی۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی یہ نورا کشتی جاری رہے گی۔ تاہم ن لیگ ایسے حالات سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔

خبر پارے۔ حکومتوں کے مولا جٹ

حکومتوں کے مولا جٹ

پی پی سندھ کے مولا جٹ ذوالفقار مرزا نے کہا ہے کہ اگر ن لیگ نے پی پی کو پنجاب حکومت سے الگ کیا تو سندھ بھر میں ن لیگ کا کوئی دفتر نہیں چھوڑا جائے گا، انھوں نے نواز شریف اور عمران خان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ بد معاش نہیں مگر ملک کی خاطر ایسا کرنا پڑے گا۔ ایکٹ نے کہا کہ نواز شریف کے الٹی میٹم سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارا احتساب عوام کریں گے، وہ اپنا الٹی میٹم اپنے پاس رکھیں۔ ایکٹ نے کہا کہ پی پی تو آمریت کا مقابلہ کر رہی ہے، البتہ نواز شریف قوم سے وعدہ کریں کہ وہ ملک سے فرار نہیں ہونگے۔ ن لیگ پنجاب کے مولا جٹ رانا ثناء اللہ نے کہا کہ مرزا وہ بد معاش ہے جو ایکٹ ہی سانس میں پاؤں پڑ جاتا ہے، کچھ روز قبل نائن زیر و پر ماتھا رگڑ آیا تھا، انھوں نے کہا کہ ن لیگ نے پنجاب سے پی پی کو نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ہم اجتماعی طور پر ہی مولا جٹوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جو سیاستدان زیادہ جذباتی ہو اور بات بات پر مرنے مارنے پر تل جائے، وہ اتنا ہی مقبول ہو جاتا ہے، سیاستدانوں یا اسی قسم کے دیگر لوگوں کی بڑھکیں سن کر یار لوگ بھی

بڑھکیں مارنے لگ جاتے ہیں۔ پارٹیوں میں بھی وہی لوگ ہیرو قرار پاتے ہیں جو مخالف کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی ہوتے ہیں، عوام تو عوام پارٹی قائدین بھی انہی لیڈروں کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں، جن میں مولا جنوں کے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہوں۔ اب پی پی اور ن لیگ کے مولا جٹ آئے سامنے آچکے ہیں، کسی وقت بھی اس نوراکشی نظام حکومت اور اپوزیشن کا خاتمہ ہو سکتا ہے، آنے والے دنوں میں دیکھنا ہے کہ اقتدار کے نازک معاملات مولا جنوں کے ”گنڈاسوں“ کی تاب کہاں تک لاتے ہیں۔

وزیراعظم کا بہاول پور کا دورہ

وزیراعظم پاکستان سید یوسف رضا گیلانی نے بتایا ہے کہ بہاول پور آنے کے ان کے دو مقاصد تھے، ایک صادق پبلک سکول کی سالانہ تقریب میں شرکت اور دوسرا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ریجنل کیمپس کا افتتاح کرنا، وقت کی قلت کی بنا پر انھوں نے اپنی دوسری سرگرمی ملتوی کر دی، اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اس کارِ خیر کے لیے بہاول پور آئیں گے۔ تاہم صادق پبلک سکول کی تقریب میں انھیں کبھی میں بٹھا کر پنڈال میں لایا گیا، انھوں نے پاسنگ آؤٹ پریڈ کا معائنہ کیا، سیکڑوں بچوں کو ٹرافیاں، شیلڈز اور سرٹیفیکیٹ دیئے، ان کے لئے لکھی ہوئی تقریر پڑھی اور صحافیوں کے دوچار سوالوں کے جوابات دیئے۔ ایک بہت اہم کام جو انھوں نے کیا وہ سکول کے لئے 10 کروڑ روپے کی گرانٹ کا اعلان

تھا، جو گزرا ہاسٹل اور دیگر ترقیاتی کاموں پر خرچ کی جائے گی۔

ہمارے حکمران صادق پبلک سکول آنے اور اس کو کروڑوں روپے کی گرانٹ دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں، حکمران اور گورنرز یہاں آتے اور گرانٹیں دیتے رہتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ سرکاری سکولوں میں بعض اوقات ایک ہاتھ روم یا ایک کمرے کے لئے ہمارے سرکاری اساتذہ اپنے چھوٹے چھوٹے نمائندوں کے پاس بھکاریوں کی صورت جاتے اور بے عزت ہوتے رہتے ہیں، دسیوں چکروں کے بعد ایک آدھ کمرے کا فنڈ عنایت ہوتا ہے، تکمیل کے بعد اس پر موصوف کے نام کی تختی لگتی ہے اور اس کا افتتاح ہوتا ہے، بڑے فخر سے عوام کو ان کے نمائندوں کی علم دوستی پر قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب تو پنجاب حکومت نے بھی غریبوں کے لئے صادق پبلک سکول اور اسپچی سن کے مقابلے میں دانش سکول قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن عوام پریشان ہیں کہ کیا کبھی کوئی ایسا حکمران بھی آئے گا جو عوام کو بھی معیاری تعلیم دینے کا اہتمام کرے گا، یا سرکاری اداروں کے لئے بھی حکمران کروڑوں روپے گرانٹ کا اعلان کریں گے؟ ہے ایسے وقت کی آمد کا امکان؟؟

اب لیبیا

تیونس اور مصر میں آمرانہ حکومتوں کی تبدیلی کے بعد اب اس انقلابی ریلے کی

گھن گرج سے لیبیا کے ایوان بھی لرزنے لگے ہیں، حالات بھی وہی ہیں اور ماحول بھی وہی، کہ عوام بھر چکے ہیں، مرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، حکمرانوں کی طرف سے مظالم میں اضافہ ہو رہا ہے، حکومت نہ چھوڑنے کے اسی قسم کے اعلانات ہو رہے ہیں، اور امریکہ بہادر کی طرف سے عوام کی حمایت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جلد یا بدیر بابا قذافی کو بھی حسنی مبارک والی راہ اختیار کرنی پڑے گی۔ عرب عوام کی اپنے حکمرانوں کے خلاف یہ تحریک اب زور پکڑ چکی ہے، لیبیا کے ساتھ ساتھ اب یمن میں بھی ہلچل مچ گئی ہے۔ ان حالات میں یہی اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ اب عربوں کی بادشاہتیں اپنے انجام کو پہنچنے کو ہیں، ان کے معاملات اور عیاشیوں کی وجہ سے ہی ان کو یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں، ان تبدیلیوں میں عبرت کی داستانیں بکھری پڑی ہیں، عیاشیوں کے نتیجے اور امریکی بے وفائی سے سبق حاصل کرنے کی روایت نہ جانے کب پیدا ہوگی۔ خدا کرے کہ یہ عوامی انقلاب ان کے ملکوں اور عوام کے لئے بھی مفید ثابت ہو۔

مصروف حکمران اور بے بس عوام

پٹرول کو آگ لگ گئی، 80 روپے کی حدود پار کر گیا، ڈنزل بھی بھڑک اٹھا 86 روپے سے اوپر چلا گیا، ہم مٹی کے جس تیل کے دیئے کی روشنی میں علم کی روشنی حاصل کر کے اخبار پڑھنے کے قابل ہوئے، وہ بھی 78 روپے لیٹر ہو گیا۔ او اگر کو عوام کی مظلومیت اور محرومیوں پر ترس نہ آیا، اس نے کسی سفاک اور بے حس ظالم کی طرح عوام کو اپنے ستم کا نشانہ بنایا، صرف پٹرول، ڈنزل یا تیل کی قیمتوں میں اضافہ پر اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا، سی این جی کی قیمتوں میں بھی دو روپے کے قریب اضافہ کر دیا۔ قوم حیرت زدہ ہے کہ ایک طرف حکومتوں کو سیاسی محاذ آرائی کا سامنا ہے، سیاسی اور معاشی عدم استحکام کی صورت حال ہے اور دوسری طرف حکمران نہایت سکون سے پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافہ در اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

ایک طرف وزارتیں کم کی جا رہی ہیں تاکہ ملک کی بگڑتی معاشی حالت کو سنبھالا دیا جاسکے، سادگی کے اعلانات کئے جا رہے ہیں، پنجاب حکومت نے بھی ای ڈی اوز وغیرہ کو فارغ کر کے اربوں پچانے کی نوید سنائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمرانوں نے اپنی عیاشیوں میں ایک فیصد کمی نہیں کی، یہ جہاں جائیں خصوصی طیارے میں جاتے ہیں، آگے ایئر پورٹ سے مطلوبہ یا مقررہ مقام تک ہیلی کاپٹر

کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، جس کا وہاں خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے، ایک ایک دورہ لاکھوں میں پڑتا ہے۔ وہ شاید ضرورت ہے، ایسا کرنا شاید آئینی مجبوری ہے۔ عوام صرف معاشی چکی کے دوپاٹوں میں ہی نہیں پس رہے، بلکہ اوپر سے سیاسی تیر بھی اس کے نحیف و لاغر جسم کو چھلنی کر کے زیادہ اذیت کا سبب بن رہے ہیں، اگر میاں نواز شریف نے لوٹوں کی سرپرستی دوبارہ سنبھال کر اپنی روایتی سیاست کا نئے سرے سے آغاز کر دیا ہے تو چوہدری اعترار احسن جیسے با اصول قانون دان نے بھی لوٹا گروپ کو تقویت دینے میں اپنا حصہ ملانا ضروری جانا ہے۔ عین ممکن ہے کہ قانون میں ایسی گنجائش ہو کہ اگر اکثریت غلط بات کی حمایت کر دے تو قانون اس کا بھی محافظ بن جاتا ہے، مگر اصولی طور پر یہ فلسفہ قرین انصاف معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ایک آدمی بھی اصول پر ڈٹا رہے تو حق پر وہی ہے۔ اعترار احسن جیسے قانون دان اور سیاست دان کا لوٹوں کی حمایت کرنا اچھا نہیں لگا۔ ذاتی پسند نا پسند میں انہیں یہاں تک نہیں جانا چاہیے تھا۔ ادھر 'قائد تحریک' نے جرنیل شاہی کی ایک مرتبہ پھر حمایت کر کے پریشان حال جمہوریت پر کاری وار کیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ "خاموش رہنے کا وقت نہیں

فوج عوام کا ساتھ دے، جرنیل ملک کو ڈاکوؤں اور لیٹروں سے نجات نہیں دلا سکتے؟
 مارشل لاء کو دعوت نہیں دے رہا، ملک کے بقا کے لئے مدد مانگ رہا ہوں، سب
 سیاستدانوں کا بے رحمانہ احتساب کرنا ہوگا، ان کی جائیدادیں چھین لی جائیں، فوج
 میوزیکل چیئر کا کھیل بند کرائے ”بھائی! خاموش مت رہو، بولو، اور بولو، مگر قوم پر رحم
 کرتے جاؤ، بڑی ہی مشکلوں سے فوجی آمریت سے جان خلاصی ہوئی ہے، قوم کو اپنے
 فیصلے خود کرنے دیں، سابقہ مارشل لاؤں نے ہمارے کون کونسے مسائل حل کر دیئے
 ہیں؟ عوام کو کونسا ریلیف دیا گیا ہے؟

عوام کو پٹرول اور اشیائے خورد و نوش تک پہنچ مشکل ہو رہی ہے، مگر ہمارے حکمران
 اپنے اپنے مفاد کے لئے سیاست چمکا رہے ہیں، وفاقی حکومت عوام کی پرواہ کئے بغیر نہایت
 یکسوئی اور محنت سے مراعات کے نام پر اور دیگر ذرائع سے اپنی مالی حالت بہتر بنا رہی
 ہے، کہ اقتدار کی ڈولتی کشتی نہ جانے کب کس بھنور میں یا کس ساحل پر ہی ڈوب
 جائے۔ پنجاب حکومت نے اپنے ڈھائی سالہ دور میں شاید ہی کوئی ایسا معرکہ سر کیا ہو
 جسے آنے والی حکومتیں جاری رکھیں، البتہ نعروں اور دعوؤں کی اور بات ہے، اس
 حکومت کا تازہ یادگار کارنامہ لوٹوں کی سرپرستی ہے۔ اقتدار کی کرسیوں پر، راجانس
 حکمران سب کچھ کرتے ہیں، اگر نہیں کرتے تو وہ کام نہیں کرتے جو ان کے کرنے کا ہے،
 عوام کی بہبود کا کام۔

وہ کون سنگ دل ہے، جو شہباز بھٹی کے قتل پر دل گرفتہ نہ ہوا ہو، ہر طبقہ فکر نے اس ظلم کی شدید مذمت کی ہے، سیاستدانوں اور معاشرے کے دیگر طبقوں نے اپنے اپنے بیانات کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مسیحی برادری نے بھی بجا طور پر پورے ملک میں احتجاج کیا ہے، جو ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ یہ واقعہ ہے ہی افسوسناک اور قابل مذمت۔ اقلیتوں کا بھی اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا، وہ سب ہمارے بھائی ہیں انہیں بھی یہاں رہنے اور زندگی گزارنے کی آزادی اور حقوق حاصل ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان اس وقت دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے، اس کی اصل وجوہات کیا ہیں، ہر کوئی اپنے زاویہ نگاہ سے ہی دیکھتا اور اندازہ لگاتا ہے۔ اب شہباز بھٹی کو قتل کیا گیا، تو اس قبیح فعل کی ذمہ داری فوری طور پر طالبان تحریک نے قبول کر لی، نہ جانے یہ ”طالبان تحریک“ کیا ہے؟ اس کا رہنما کون ہے، یہ معرض وجود میں کب آئی، اس کا صدر مقام کہاں واقع ہے، اس کا نیٹ ورک کہاں ہے، جو اتنی برق رفتاری سے ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان منظر عام پر لے آتا ہے؟ کوئی اس کے متعلق جاننے کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں

کرتا، ادھر کوئی حادثہ ہوا، ادھر ذمہ داری کی قبولیت کی خبر سامنے آگئی، یہ نہایت ہی سطحی طریقہ بھی اپنایا گیا کہ جائے واردات پر کوئی پمفلٹ پھینک کر ”ثبوت“ چھوڑ گیا کہ یہ کام طالبان کا ہے۔

اس قسم کے واقعہ کے بعد اقلیت نے تو مذہبی انتہا پسندوں کا نام لینا ہی ہوتا ہے کہ ان کا ذہن بنا ہوا ہے، انسانی حقوق کے کئی علمبردار اور سول سوسائٹی کے ارکان بھی اس طرح کا الزام مذہب پسند لوگوں پر ہی لگاتے ہیں۔ شہباز بھٹی کے قتل کے بعد خود کش دھماکوں کے دو المناک واقعات ہو چکے ہیں، ان میں بچا سیوں بے گناہ لوگ مارے گئے اور بہت سے اپنی باقی زندگی معذوری میں گزاریں گے، انہیں کس جرم کی سزا ملی کسی کو نہیں معلوم؟ کہا جاسکتا ہے کہ ان خود کش دھماکوں کی ذمہ داری بھی طالبان نے قبول کر لی تھی، پولیس نے بھی اپنا روایتی بیان جاری کر کے اپنا فرض پورا کر دیا ہے کہ ان کا اصل ٹارگٹ فلاں تھا، اور یہ بھی کہ جائے واردات کے قریب ہی سے خود کش حملہ آور کا سر مل گیا۔ خود کشوں کا یہ ”سر“ بڑی اہم چیز ہے، خوش قسمتی سے حادثے کے فوراً بعد یہ مل جاتا ہے، مگر افسوس کہ اس قسم کے سروں کی شناخت کبھی نہ ہو سکی۔

کیا کوئی مسلمان کسی مسجد میں یا بازار یا نماز جنازہ کے موقع پر خود کش حملہ کر کے بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ نہیں، ہر گز

نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے اور کرنے کے بعد اس کو ذمہ داری قبول کرتا ہے، وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ کون جانتا ہے کہ القاعدہ کیا ہے؟ آج کل القاعدہ کہاں ہے؟ اس کا نیٹ ورک کیا ہوا؟ اس کے حملے کیا ہوئے؟ کیا واقعی اس کی مکر توڑ دی گئی ہے؟ یا اس کے بطن سے یہ طالبان، برآمد ہو گئے ہیں؟ یا یہ کہا جائے کہ دھماکے کرانے والوں کی اختراع ہی ہے کہ جب چاہا القاعدہ کا اعلان کر دیا، جب چاہا اس کا خاتمہ کر کے طالبان تحریک کا ذکر چھیڑ دیا، کل طالبان کو کچل دیا جائے گا اور کوئی اور نام ظاہر کر کے اپنے قتل و غارت گری کی ذمہ داریاں اس پر ڈال دی جائیں گی۔

ہم سب مسیحی بھائیوں کے غم میں بھی برابر کے شریک ہیں، ہمیں بازاروں اور جناروں میں خود کش حملوں میں جاں بحق ہونے والوں کے ساتھ بھی دلی ہمدردی ہے، مگر پاکستان کے مخصوص حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کسی 'طالبان تحریک' نامی تنظیم کا کام نہیں، بلکہ یہ کسی سوچی سمجھی سازش کا شاخسانہ ہے، یہ کوئی دشمن ہی ہے جو پاکستان کو غیر مستحکم کرنا چاہتا ہے، جو اس کو ناکام ریاست قرار دلانا چاہتا ہے، جو اس میں بھائیوں کی طرح رہنے والوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے۔ ہم سب کو مل کر اس مشترکہ دشمن کو پکڑنا ہوگا۔ اگر ہم ایسے حادثات و سانحات پر باہم دست و گریباں ہی رہے تو یہ دشمن کی کامیابی ہے، ہم آپس میں لڑ کر دشمن کو ہی خوش کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے

حکمران، ہمارے سیاستدان، ہمارے علماء، ہماری اقلیتوں کے نمائندے آپس میں سر جوڑ
کر بیٹھیں، ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی روایت ڈالیں، تاکہ مشترکہ دشمن کو کچلنے
کے لئے پوری قوم سیسہ پلائی دیوار بن جائے۔

نشہ اقتدار کا:

اپنے سابق وفاقی وزیر مذہبی امور جناب مولانا حامد سعید کاظمی کو کمرہ عدالت سے گرفتار کر لیا گیا کہ ان پر جج کے موقع پر کرپشن کے الزامات تھے، معزز جج نے ان کی ضمانت منسوخ کر دی اور انہیں ایف آئی اے کے حوالے کر دیا گیا۔ سچ جھوٹ تو بعد میں ثابت ہوتا رہے گا، مگر پروٹوکول، سرکاری وسائل کے بل پر عیاشیاں، اختیارات اور اقتدار کے مزے لوٹنے کے بعد الزامات کی بوچھاڑ اور گرفتاری کوئی زیادہ اچھا شگون نہیں۔ تحقیقات کے بعد ان کی ”باعزت“ رہائی ممکن ہے، لیکن یہ جگہ ہنسائی کی کوئی قیمت نہیں۔

نشہ تو کوئی بھی ہو برا ہوتا ہے، مگر یہ اقتدار کا نشہ شاید سب سے برا ہے کہ اس کی خاطر یار لوگ سولی پہ چڑھ جاتے ہیں، راہ سیاست میں جانیں گنوا بیٹھتے ہیں، جیلیں کاٹنا گوارا کر لیتے ہیں اور دس دس سال کی جلا وطنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس نشے کے لئے اقتدار کے بعد ذلت قبول کر لیتے ہیں، بچی خان کی طرح گمنامی یا مشرف کی طرح جلا وطنی کی زندگی برداشت کر لیتے ہیں، مگر نشہ ہے کہ اترنے کا نام نہیں لیتا۔ عوام کی ”خدمت“ پر مامور یہ سیاست دان اختیارات کے ذریعے تو ”معزز“ ہوتے ہیں، مگر عوام کے دلوں میں ان کی وہ

قدر نہیں ہوتی، حتیٰ کہ عوام کی سٹروی کیلی سن کر بھی یہ لوگ بد مزہ نہیں ہوتے۔
یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ایک مولانا پر ہی کیا موقوف یہاں کون ہے جو کرپشن
کی اس بہتی گنگا میں اشان نہیں کرتا، کون ہے جو مراعات کے نام پر قومی خزانے پر
ڈاکہ نہیں ڈالتا، کون ہے جو اختیارات کے چکر میں خدائی کا دعویدار نہیں؟ ہمارا تو خیال
یہ ہے کہ قومی خزانے کو اس بے دردی سے اجاڑنا، اس قدر عیاشیاں کرنا، خواہ وہ
آئینی حدود کے اندر رہ کر ہی ہو رہی ہوں، ظلم اور کرپشن کے ضمن میں آتی ہیں،
قانونی کرپشن کے علاوہ ہمارے حکمرانوں کے کاروباروں کے عام چرچے ہیں، کس کس کو
گرفتار کریں گے، کہ ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے۔

: وزیراعظم کا انتخابی منشور

جنوبی پنجاب کے مسیحا جناب سید یوسف رضا گیلانی جلال پور پیر والہ تشریف لے گئے،
جلسہ سے خطاب فرمایا، اور بہت کچھ فرمودات کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ پیپلز پارٹی
کے آنے والے انتخابی منشور میں سرائیکی صوبہ کے قیام کا اعلان شامل ہوگا۔

کامیاب سیاستدان وہی ہوتا ہے جو کام اپنی مرضی سے کرے اور لوگوں کو مایوس بھی نہ ہونے دے، وعدے کرنا سیاستدانوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، اور وعدوں سے مکرنا ان کی مستقل عادت۔ سیاست کا لفظ ہمارے معاشرے میں ایک مخصوص ذہنیت کے لئے استعمال ہوتا ہے، کسی نے ذرا سا چکر دیا تو دوسرے نے جھٹ کہہ دیا، یا رتم تو بڑے سیاستدان بن گئے ہو۔ کوئی فرد بھی جب کوئی واضح موقف اختیار کرنے کی بجائے گول مٹول جواب دے تو کہتے ہیں کہ یہ سیاسی بیان ہے، تاہم اس حقیقت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ

اپنے وزیراعظم اعلیٰ پائے کے ”سیاستدان“ ہیں، سیاست انہیں ورثے میں ملی ہے۔ اگر وزیراعظم چاہتے تو سرانیکی صوبہ بنانے کا اعلان کر سکتے تھے، اور اگلا الیکشن اس وعدے پر لڑ سکتے تھے، مگر انہوں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا، انہوں نے علاقے کے لوگوں کو نئی بحث پر لگا دیا کہ اگلے الیکشن تک وہ باہم دست و گریباں رہیں۔ اس فرمان میں ایک اور معاملہ بھی بحث طلب ہے کہ سرانیکی صوبہ کا قیام تو پی پی کے انتخابی منشور کا حصہ ہوگا، مگر یہ بہاول پور صوبہ کے بارے میں کیا ارشاد ہے کہ یہ تو اور بھی آسان ہے، کہ اسے صرف بحال کیا جانا ہے۔ جناب وزیراعظم صاحب! اگر آپ واقعی صوبہ بنانے کے حق میں ہیں تو اس کا اعلان فرما دیجئے، اور بہاول پور بھی پاکستان ہی کا حصہ ہے، اس کی بحالی کو بھی یاد رکھئے، اگر صرف سیاسی بیانات ہی پر کام چلانا ہے تو

کام چل ہی رہا ہے۔ لیکن ”عمل سے زندگی بنتی ہے“ اعلان اور وعدہ نہیں عمل کی ضرورت ہے۔

: غیر موزوں گارڈ

سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قتل کے بعد حکومت نے وی وی آئی پیز کے سیکورٹی گارڈز کی چھان بین کا فیصلہ کیا تھا، اب خبر آئی ہے کہ حکومت نے ایلٹ فورس میں سے ایسے گارڈز ڈھونڈ نکالے ہیں، جو کسی بھی اہم ترین شخصیت کے لئے خطرے کا باعث 94 ہو سکتے ہیں، ان میں سے 54 کا تعلق لاہور سے، 14 گجرات والہ سے، 8 منڈی بہاؤ الدین سے، 3 شیخوپورہ سے اور 19 کا تعلق راولپنڈی سے ہے۔ ان گارڈز کو اب غیر اہم شخصیات کے ساتھ لگا دیا جائے گا، بلکہ اگر ہمارے حکمران کسی سے زیادہ ہی تنگ آچکے ہوں تو ان گارڈز کو اس کی ”حفاظت“ پر مامور کر دیں، کام آسان ہو جائے گا۔ امید ہے کہ اب وی وی آئی پیز بالکل محفوظ ہو جائیں گے، باقیوں کا اللہ ہی وارث ہے۔

سہولتیں صرف امریکی قاتلوں کے لئے

ہمارے حکمرانوں نے ریمنڈ کو گرفتار تو کر رکھا تھا، مگر ان کی ٹانگیں بڑی شدت سے کانپ رہی تھیں، وہ نعرے تو بڑی طاقت سے لگا رہے تھے مگر ان کی دیوار جاں پر لرزہ طاری تھا، وہ استقامت دکھانے کے دعویدار تو تھے مگر ان کے قدموں کے نیچے ریت تھی۔ یہی خدشہ تھا کہ امریکہ سے آنے والی ذرا سی ہوا بھی اس دیوار کا نشانہ بن کر مٹا دے گی، ہمارے کھوکھلے دعوؤں اور نعروں کی بازگشت بھی سنائی نہ دے گی، ایسا ہی ہوا کہ ایسا ہونا ہی تھا، قوم دم بخود ہے، غم سے سانسیں گھٹ رہی ہیں، کلیجہ منہ کو آ رہا ہے، غم ہے، غصہ ہے، سچ یہ ہے کہ شرم اور شکست خوردگی کا ایسا احساس ہے کہ نہ سر اٹھانے کی ہمت ہے اور آنکھ ملانے کی۔

قتل کا قصاص ادا ہو جائے تو کوئی بات نہیں بچتی، اس کیس میں معاملات کیسے طے ہوئے، جبر کا کتنا استعمال ہوا، صبر کو کس قدر آزمایا گیا، رضامندی کی کہانی کہاں تک چلی ہے، یہ سب کچھ اب گئے زمانے کی کہانیاں ہیں، جو ہونا تھا ہو چکا، سانپ گزر جائے تو لکیر کو بیٹنا دانشمندی نہیں۔ مگر یہ انصاف کی کونسی قسم ہے کہ بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھنے کے جرم کی سزا بھی فوراً دی اور جرمانہ وصول کر لیا گیا، یہ تیس ہزار روپے تو ہماری جیلوں میں ناجائز

اسلمہ کے کیس میں ملوث لوگٹ پولیس اور چھوٹی عدالتوں کے ریڈروں وغیرہ کو ہی دے دیتے ہیں، ان کو اس سے کئی گنا خرچ کر کے بھی رہائی نصیب نہیں ہوتی، اب پاکستانی جیلوں میں پڑے ایسے ملزمان چندہ جمع کریں کہ عدالت نے گنگا بہا دی ہے۔

تسلیم کہ لواحقین نے کروڑوں روپے لے کر ریمینڈ کو معاف کر دیا ہے، مگر کیا ریمینڈ صرف قاتل تھا، کیا اسے جاسوسی کے الزام میں گرفتار نہیں کیا جانا چاہیے تھا، کیا اس نے کسی دوسرے ملک میں جا کر دو افراد کو قتل کر کے دہشت گردی کا ارتکاب نہیں کیا؟ کیا قانون کی نظر میں بھی کوئی وی وی آئی پی اور کوئی بے آسرا ہوتا ہے، اگر قانون ہی بے سہارا مظلوموں کی دادرسی نہیں کرے گا تو بے بس عوام کا حامی و مددگار کون ہوگا۔ کیا ہماری عدالتیں دیگر ملزمان کے لئے بھی ایسے ہی فیصلے کرتی ہیں، یا کریں گی؟ ابھی تو عدلیہ کی آزادی کے ابتدائی مراحل ہیں، کہ وکلاء اور عوام ابھی تک اس عظیم آزادی کے نشے میں چور ہیں، اس کے ثمرات عوام تک کب پہنچیں گے، کسی کو نہیں معلوم۔

امریکہ نے پاکستان میں اپنے اہلکاروں کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کریں، بلٹ پروف جیکٹس اپنے ساتھ رکھیں۔ امریکی عہدیداروں کو اپنے اہلکاروں کو یہ ہدایت بھی جاری کرنی چاہیے تھی کہ فلاں فلاں قسم کا

اسلحہ بھی اپنے ساتھ رکھیں، تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے، (اور یہ بھی کہ اس کے لائسنس وغیرہ کے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ مسئلہ صرف تیس ہزار کی مار ہے) انہیں چاہیے کہ اپنے تمام عہدیداروں اور اہلکاروں کو کمانڈو کی ٹریننگ بھی دلائیں، تاکہ جب وہ آئندہ کسی پاکستانی پر فائرنگ کریں تو گاڑی کی سکرین میں سوراخ بھی نہ ہوں، اور ایسی تربیت دیں کہ گاڑی چلاتے ہوئے پیچھے آنے والے بھی اس کے نشانے پر ہوں۔

امریکی قاتل آئندہ بھی فکر مند نہ ہوں کہ ان کو قتل کے علاوہ کچھ نہیں کرنا پڑے گا، بعد کے تمام معاملات حکومتوں کے نمٹانے کے ہیں، وکیل بھی وہ کریں گے، مدعیوں سے رابطہ بھی ان کے ذمہ ہوگا، رائے عامہ بھی وہی ہموار کریں گے۔ یہ تمام کام امریکیوں کے ہیں، لیکن پاکستانی حکومت چونکہ میزبان ہوتی ہے، اس لئے ”معزز مہمانوں“ کی نگریم کا خاص خیال رکھتی ہے، انہیں کسی کام کی تکلیف نہیں دیتی، یہ تمام بندوبست خود کر کے دیتی ہے، اور حد یہ کہ قصاص کی رقم بھی پاکستان کے قومی خزانے سے ہی دی جاتی ہے۔ اچھا میزبان وہی ہوتا ہے جو مہمانوں کا بھرپور خیال رکھے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ آئندہ قصاص کے حصے کے علاوہ خدمات کے حصے بھی دیئے جائیں، اور اس کے حقدار وہ تمام لوگ ہوں جو اس کہانی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ (یاد رہے کہ یہ تمام سہولتیں صرف امریکی قاتلوں کے لئے مخصوص ہیں)۔

خبر چوتکا دینے والی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اطمینان بخش بھی۔ وہ یوں کہ اب وفاقی حکومت نے معزز اور منتخب عوامی نمائندوں کی قیمتی جانوں کی حفاظت کا نہایت ہی معقول بندوبست کر لیا ہے۔ اب پارلیمنٹ لاجز سے پارلیمنٹ ہاؤس تک زیر زمین راستہ بنایا جائے گا، جس میں سے گزر کر ہمارے نمائندے بھجرو عافیت اسمبلی میں پہنچ جایا کریں گے، جہاں وہ مہنگائی، بد امنی، بے روزگاری، لوڈ شیڈنگ، ٹیکسز، دہشت گردی اور ایسے ہی دیگر عوامی مسائل پر سیر حاصل بحث کیا کریں گے اور ان کے بارے میں قانون سازی کا فریضہ نبھایا کریں گے، عوام کی فلاح و بہبود اور حفاظت و ترقی کے منصوبے بنایا کریں گے۔

حکومت نے یہ انقلابی اقدام کا بینہ کمیٹی برائے کا بینہ سیکریٹریٹ کے فیصلے کے بعد کیا، اب ان معزز ارکان کی حفاظت کا مسئلہ مستقل حل ہو جائے گا، اب ہمارے محترم نمائندے اپنی سرکاری رہائش گاہ سے ہی ایک وسیع و عریض، روشن سرنگ میں داخل ہونگے اور کچھ ہی دیر بعد وہ اسمبلی ہال میں بیٹھے ہونگے۔ ان کو اس ”طویل“ سفر کی صعوبت بھی برداشت نہیں کرنی پڑے گی، یہ فاصلہ بیٹریوں پر چلنے والی گاڑیوں پر طے ہوگا، یہ گاڑیاں آرائش و زیبائش کے بہترین نمونے

ہو گئی، لوڈ شیڈنگ کے اس زمانے میں بھی وہاں دن کا سماں ہوگا، کہ لوڈ شیڈنگ کی
 سوغات صرف عوام کے لئے ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لفٹ کا نظام قائم کر دیا جائے تاکہ
 ہمارے نازک مزاج نمائندوں کو ایک قدم بھی پیدل چلنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔
 اس زیر زمین راستے کے باوجود ہمارے نمائندوں کو ایک پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا
 ہے، وہ یہ کہ پارلیمنٹ لاجز سے پارلیمنٹ ہاؤس تک تو یہ لوگ محفوظ ہو جائیں گے، مگر
 اس سے پہلے اپنے اپنے علاقوں سے آتے وقت بھی سکورٹی کے خدشات سے واسطہ پڑ
 سکتا ہے، کیونکہ ان کے آبائی علاقوں سے پارلیمنٹ لاجز تک کسی زیر زمین راستے کا
 بندوبست نہیں ہے۔ اب مذکورہ کمیٹی کو نئی منصوبہ بندی کرنی چاہیے، اس کا ایک حل تو
 یہ ہے کہ ہر صوبے کے ارکان اسمبلی اپنے صوبائی صدر مقام پر جمع ہوں، جہاں سے ایک
 زیر زمین راستے کے ذریعے انہیں اسلام آباد لایا جائے، لیکن صوبائی صدر مقام تک
 پہنچنے میں بھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ سکتا ہے، اس لئے پہلے وہ لوگ اپنے اپنے
 ضلعی شہر پہنچیں، جہاں سے صوبے کے لئے کسی زیر زمین راستے میں داخل ہو جائیں۔
 یہاں بھی یہ مسئلہ بنے گا کہ بعض اوقات ضلعی صدر مقام کے لئے بھی سیکڑوں کلو میٹر
 سفر کرنا پڑ جاتا ہے، اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہر رکن اسمبلی کے

گھر سے ہی سرنگ کا انتظام کیا جائے، جو تحصیل اور ضلع سے ہوتی ہوئی اپنے اپنے صوبائی دارالحکومت میں پہنچے گی اور پھر چار سرنگیں اسلام آباد پہنچ جائیں گی، یوں اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے ہیر و ز بحفاظت اسلام آباد پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں یہ مسئلہ بھی سراٹھائے گا کہ ایک دفعہ ایک ممبر اسمبلی کے گھر سے سرنگ تعمیر ہوگی، اگلی دفعہ اگر وہ انتخابی میدان میں مد مقابل سے مات کھا گیا، تو ایک نئی سرنگ نئے ممبر کے گھر سے کھودنی پڑے گی، یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، اپنے حکمرانوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں، ویسے بھی آج اگر ایک بڑا کامیاب ہوا ہے تو کل دوسرے کی باری ہے۔ ہمارے ملک میں ”سابق“ ہو جانے کے باوجود مراعات جاری رہتی ہیں۔

کسی کو اس بات کا غم کھانے کی ضرورت نہیں کہ یہ لوگ عوام کے مسائل کیسے حل کریں گے، عوام کو جان لینا چاہیے کہ ان اربوں روپے سرنگوں پر لگانے والے لوگوں سے کسی بہبود اور ترقی کی بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے، سرنگوں میں سفر کرنے والے یہ ”عوامی نمائندے“ گھلتے عوام کے غم میں ہیں، مرتے اپنے مفاد کے پیچھے ہیں۔ زیر زمین سرنگوں میں چلنے والی اس مخلوق کی نظر اتنا دور بھی نہیں دیکھ سکتی کہ جب یہ ”زیر زمین“ چلے جائیں گے، تو ملک اور دنیا کا نظام پھر بھی چلتا رہے گا، اور معاشرے میں کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔

قائمہ کمیٹی کا اجلاس ایک منفعت بخش اور صحت مند سرگرمی ہے، اس قسم کی کمیٹیوں کے ارکان کو پڑھے لکھے اور صاحب الرائے تصور کیا جاتا ہے، ان سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مطلوبہ مسئلے پر سیر حاصل بحث کر کے کسی معقول اور قابل قبول نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ ارکان کی اس ظاہری اور اعزازی پوزیشن کے علاوہ ان کو پرکشش و طیفہ بھی مل جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنا قیمتی وقت قومی معاملہ کو دے رہے ہوتے ہیں، ان کے وقت کی قیمت تو کوئی ادا نہیں کر سکتا، تاہم ان کو کچھ رقم آنے جانے، کچھ اٹھنے بیٹھنے، کچھ کھانے پینے اور کچھ اپنا ذہن استعمال کرنے کی مد میں مل جاتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ نشستن، گفتن، (خوردن) اور برخاستن کے علاوہ قوم کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے تعلیم کے اجلاس میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے بارے میں بحث کی جائے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ مذکورہ کمیٹی کی سرگرمی اور مصروفیت بھی دیگر کمیٹیوں سے مختلف نہ ہوگی۔ بدگمانی سے پرہیز لازم ہے، مگر حالات سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں، ویسے بھی اردو تو اب کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، اب اسے سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ اپنی آخری ہچکیاں لے

رہا ہے، یہ آخری ہچکی کی بات بھی ایک تکلف ہی ہے، ورنہ معاملہ اس سے آگے بڑھ چکا ہے۔ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ تو ہوتا رہا، مگر اس شدت اور طاقت سے یہ آواز کبھی بلند نہ ہو سکی جو ایوانوں تک بھی پہنچ سکتی۔ اب خود ایوان بالا کی قائمہ کمیٹی نے اس پر توجہ کی ہے، تو اک یہی بات خوش آئند ہے، یعنی ہمیں صرف اسی بات پر ہی دل کو تسلی دے لینی چاہیے کہ یہ کیا کم ہے کہ ہمارے ایوان بالا کے معزز ارکان اکٹھے ہوں اور اردو کو سرکاری زبان بنانے کے مسئلے پر گفتگو کریں۔

مایوسی گناہ سہی، مگر حقیقت یہی ہے کہ ہمارے جیسے اکثر لوگ یہ گناہ کرتے رہتے ہیں، وہ کمزور ارادہ ہوں، یا حالات کے تسلسل کو دیکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچ چکے ہوں، یا فیصلہ کرنے والی قوتوں کے رویوں سے انہوں نے اندازہ لگا لیا ہو کہ اصلاح کی گنجائش نہیں۔ اردو کی بد قسمتی ہی ہے کہ اس کی واحد سرپرست ریاست پاکستان ہے، اور اسے اپنے گھر میں بھی کوئی قبول کرنے اور اپنانے کو تیار نہیں۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں شرح خواندگی شرمناک حدوں سے کم ہے، بعض علاقوں میں تو یہ 30 فیصد بھی نہیں۔ اس کے باوجود اردو ایسی زبان ہے جو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اگر بولنے اور سمجھنے کا تناسب اپنی آقا زبان یعنی انگریزی سے کیا جائے تو شاید ایسے لوگوں کی تعداد دس فیصد کے ہند سے کو بھی نہ پہنچ سکے۔

اردو کو سرکاری زبان قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ہمارے حکمران ہیں، یہ مقتدرہ یا اسی قسم کے دیگر ادارے تو تنخواہ دار ہوتے ہیں، ان کا سچ عموماً وہی ہوتا ہے تو حکومتوں کو پسند ہو۔ سابق ڈکٹیٹر نے انگریزی کو مزید مستحکم کیا، انگلش میڈیم کا ایسا جھکڑ چلایا کہ کسی کو اور کچھ بھی سمجھائی نہیں دیا، اب سرکاری سکولوں سمیت تمام تر تعلیمی ادارے ”انگلش میڈیم“ ہو چکے ہیں، ان اداروں میں جو مضحکہ خیز صورت حال ہے، اس کی کسی کو پرواہ نہیں، کہ نہ استاد کو خود انگریزی آتی ہے، نہ وہ اس انداز سے انگلش میڈیم پڑھا سکتا ہے، اگر کسی کو آتی بھی ہے تو اس کا لہجہ اور تلفظ کسی لطیفے سے کم نہیں ہوتا۔

حکمرانوں کے علاوہ ہمارے دانشور اور دیگر ”پڑھالکھا“ طبقہ بھی انگریزی کو زندگی موت کا مسئلہ قرار دیتا ہے، کہ اس کے بغیر ہم ترقی یافتہ دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ انگریزی عالمی زبان ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا (اور کوئی نہیں سنتا) کہ بے شمار ترقی یافتہ ممالک میں ان کی قومی زبان ہی سرکاری زبان ہے۔ انگریزی سے آشنا ہونا اور انگریزی کا سمجھ اور بول سکنا اچھی بات ہے، کہ انسان جہاں بھی جائے اس کے کام آئے، مگر ایک نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ قوم کو براہ راست انگریزی کے چکر میں ڈال دینا دانائی نہیں۔

اردو اب مکمل مظلوم زبان کا روپ دھار چکی ہے، یہ قومی زبان بھی رہ جائے تو غنیمت ہے۔ اب خود اردو اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ اس میں بہت سے الفاظ انگریزی کے ہی آچکے ہیں۔ اردو چونکہ آغاز سے ہی مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے، اس لئے کسی دوسری زبان کو قبول کرنے میں اسے کوئی عار نہیں، مگر جہاں یہ اپنا مدعا خود بیان کر سکتی تھی وہاں سے بھی دستبرداری افسوسناک امر ہے۔ قائمہ کمیٹی والے کوشش کر دیکھیں، ہمارا تو خیال ہے کہ خود اردو کو پہچانے کی ضرورت ہے۔

سیسی فائل کی دعاؤں کا ثواب

کرکٹ ورلڈ کپ کے سیسی فائل پر کالم لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اور کالم نہ لکھنے کا مطلب ثوابِ دارین سے محروم رہنا ہے، چنانچہ ہم مجبوراً یہ دونوں کام کر رہے ہیں۔ اس میچ کے اتنے پہلو ہیں کہ ہر رخ پر ایک عدد کالم نگار اجا سکتا ہے، مگر حالات و واقعات اس چیز کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لئے ایک مختصر کالم میں ہی کئی کالم سمونے کی اپنی سی کوشش ہے۔ اس میچ میں دو روایتی حریف آمنے سامنے تھے، بہت سے پاکستانیوں کے لئے یہ میچ کفر اور اسلام کا ایک عظیم معرکہ تھا، کچھ کے نزدیک حب الوطنی کے سارے سرٹیفیکیٹ اسی میچ کی حمایت اور مخالفت سے مشروط تھے، جو کافی حد تک تقسیم بھی کئے گئے۔

یہ میچ کیا تھا، ایک بخار تھا جس نے اپنی معیاد کے مطابق ہی اترنا تھا، معیاد سے پہلے لاکھ دوائیں لیں، کوئی علاج کریں، ہزار جتن کریں، افاق کے امکانات صفر تھے۔ اس میچ کی سب سے دلچسپ بات میچ کے بعد منظر عام پر آئی، اگرچہ قوم کے موبائل فونز پر جتنے میسج سیسی فائل کے موقع پر سامنے آئے ان کی مثال نہیں ملتی، مگر ہمارے خیال میں سب سے دلچسپ مواصلاتی پیغام یہ آیا، یوں کہیے کہ آیا کیا، آ کر چھا گیا۔ کسی تخلیق کار نے لکھا تھا کہ ”۔۔۔ یا

اللہ ! کل کے میچ (سیسی فائنل والے دن) یہں عجبو جو کچھ پڑھا گیا، اس کا ثواب میری نانی جی کو پہنچا دے۔“

چونکہ میچ کے دنوں میں پاکستانی قوم نے تمام کام چھوڑ کر صرف یہی دعاؤں والا کام ہی کیا تھا، میچ پر تو یہ دعائیں اثر انداز نہ ہو سکیں، مگر دعا چونکہ کبھی ضائع نہیں جاتی، اس لئے کسی سیانے تخلیق کار نے ان دعاؤں کا بہترین مصرف یہ تلاش کیا، کہ اپنی نانی جی کی روح کی آسودگی کا سامان کیا جائے، اس نے آگے بڑھ کر وہ سارے کا سارا ثواب سمیٹ لیا، جو دو روز تک لاکھوں موبائل سیٹوں میں بکھرا پڑا تھا۔ پیغام لکھنے والے نے تو اپنے طور پر پہل کر کے کامیابی حاصل کر لی، مگر بات اتنی جلدی ختم ہونے والی نہیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ اس ثواب کے حصول کے لئے ہمارے کھلاڑی کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے کیونکہ ان کی روایت لینے کی ہے، دینے کی نہیں۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ان کو بھیجا، گیا ثواب کوئی اور صاحب سمیٹ رہا ہے، تو وہ بھی اپنی اپنی نانیوں کو میدان میں لے آئیں گے، اور یوں یہ ثواب ایک نانی کی بجائے پوری ٹیم اور اس کے عملے کی نانیوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

ہم اس میسج بنانے والے صاحب کی نانی کی قسمت پر رشک کرتے، مگر دو معاملات نے مسئلہ الجھا دیا ہے، اول تو وہی بات جو اوپر بیان کی جا چکی ہے، دوم؛

یہ کہ اس سیبی فائنل میچ کے دوران اور بھی ”بہت کچھ“ پڑھا گیا، بہت سے ”ملک دشمن“ عناصر نے اپنی ٹیم کے معزز ارکان کے لئے دعاؤں سے ہٹ کر بھی کچھ ریمارکس دیئے ہیں، جو نانیوں کے ایصالِ ثواب کے لئے زیبا نہیں، اگر یہ بھی نئی دعا میں قبول ہو گئے تو نانی جی نئی مصیبت میں آ جائیں گی، اور ٹیم کے معزز ارکان کو جب ان دوسری قسم کی دعاؤں کا علم ہوگا، تو عین ممکن ہے، وہ ثواب والی دعاؤں سے بھی دستبردار ہو جائیں۔

آئندہ کے لئے ہمارے کھلاڑی پہلے سے ہی بندوبست کر رکھیں کہ اگر خدا نخواستہ قوم کی دعائیں کھلاڑیوں کے کام نہ آئیں، یا انہوں نے اپنی کارکردگی سے دعاؤں کو اپنے قریب نہ آنے دیا تو ان کو کہاں شفٹ کرنا ہے، اپنے پیاروں کے نام انہیں پہلے سے ہی سوچ رکھنے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ابھی دعائیں وصول ہی کر رہے ہوں، کہ کوئی اور اچکے کر ساری دعائیں لے جائے، یہ ادھر ادھر تلاش کرتے رہیں اور وہ ساری کی ساری دعائیں اپنی کسی نانی، دادی کے حوالے کر دیں۔ اس دفعہ تو ہمارے کھلاڑی بے خبری میں مار کھا گئے ہیں، میچ کی جیت ہار کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، اور ہارنے کی صورت میں نہ ہی کوئی انعامات کا امکان ہے، تاہم دعاؤں میں سے اپنا حصہ لے کر اپنے بڑوں کی عاقبت تو سنوار دیں۔

عوامی حکومت نے ایک مرتبہ پھر عوام کے دلوں میں لگی مہنگائی، بد امنی اور کرپشن کی آگ پر تیل چھڑک دیا ہے، ایک مرتبہ پھر پٹرولیم کی قیمتوں میں خوفناک حد تک اضافہ کر دیا گیا ہے، اگرچہ حکومت کو قوم کی نفسیات کا علم ہے، کہ وہ زیادہ احتجاج نہیں کرتے اور ان کے جذبات جلد ہی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، اس کے باوجود بھی عوام کی تسلی اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اخباری اشتہارات کا اہتمام کیا گیا ہے، تقریباً نصف صفحے کے قریب سائز کا اشتہار اکثر اخبارات کی زینت بنا ہے۔ بہت جلی حروف میں ”عوام کے لئے“ لکھا گیا ہے۔ اس اشتہار میں حکومت نے اپنے اقدام کی یہ ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ ”عوامی حکومت نے پوری دنیا میں تیل مہنگا ہونے کے باوجود تیل کی پرانی قیمتیں ایک عرصے تک برقرار رکھیں!“ یہ بھی بتایا گیا ہے ”کہ گزشتہ چار ماہ کے دوران عوامی حکومت نے قومی خزانے کو ہونے والا 25 ارب روپے کا خسارہ برداشت کیا، اپریل میں مزید دس ارب روپے کا خسارہ ہوگا۔“

اشتہار کے ذریعے قوم کو یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ”یہ عوام کا پیسہ ہے، جسے تعلیم، صحت کی سہولیات، روزگار کی فراہمی اور سیلاب زدگان کی بحالی

پر خرچ ہونا چاہیے، پوری قوم متحد ہو کر ہی قومی خزانے کے اس خسارے کو کم کر سکتی ہے۔۔ آئیں! تیل کی بچت کو یقینی بنائیں۔

اب امید ہے کہ عوام پٹرول کی قیمتوں میں اضافے پر چین بہ چین نہ ہونگے، اب ہر چند ماہ بعد اس اضافے کی خبر ان کی طبع نازک پہ گراں نہ گزرے گی۔ اب انہیں پٹرول کے ساتھ ساتھ اپنا دل نہ جلانا پڑے گا۔ کیونکہ اس اشتہار کے توسط سے وہ اس راز سے آگاہ ہو گئے ہیں کہ اگر پٹرول مہنگا ہوگا، تو عوام کی تعلیم کا بہتر بندوبست ہو سکے گا، اگر پٹرول کی قیمتیں بڑھیں گی تو عوام کو صحت کی سہولیات دستیاب ہونگی، اگر پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا تو عوام کے لئے روزگار کی فراہمی ممکن اور بہتر ہو سکے گی اور پٹرول مزید جتنا مہنگا ہوگا اتنا ہی سیلاب زدگان کی بحالی میں مدد کی جائے گی۔ کون ظالم ہے جو اپنا پیٹ کاٹ کر سیلاب زدگان کی مدد نہ کرے۔

عوامی حکومت نے اس اشتہار کے ذریعے قوم کو متحد ہونے کا مشورہ دیا ہے، تاکہ سب مل کر قومی خزانے کے اس خسارے کو کم کر سکیں۔ درست مشورہ ہی دیا ہے، قومی خزانے کے عظیم خسارے کو ختم کرنے کے لئے پوری قوم کو متحد ہونا ہوگا، ورنہ اربوں روپے کا خسارہ بڑھتے بڑھتے خسارے کا ایسا کوہِ گراں بن جائے گا جو نہ توڑا جاسکے گا، نہ گرایا جاسکے گا، نہ ہلایا جاسکے گا، نہ اس میں

سے جوئے شیر کو بہایا جاسکے گا۔ خسارہ کم کرنے کے لئے حکومت نے صرف پٹرولیم کی قیمتوں میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ نئے نئے ٹیکس بھی لاگو کر دیئے ہیں، جن میں الگ سے فلو ٹیکس بھی شامل ہے۔

عوام کو شاید ٹیکس ادا کرنے میں اتنی تکلیف نہ ہو، اگر انہیں یقین ہو کہ ان کا دیا ہوا ایکٹ ایکٹ پیسہ جائز کاموں پر خرچ ہوتا ہے، چونکہ عوام جانتے ہیں اور محسوس بھی کرتے ہیں کہ ان کے ٹیکس سے ہی حکمران عیاشیاں کرتے ہیں، ان کے ٹیکس سے ہی حکمرانوں کے بیرون ملک کاروبار چمک رہے ہیں، ان ٹیکسوں کا عوام اور ملک کے حالات پر کوئی اثر نظر نہیں آتا، کیا یہ حقیقت ہے کہ پٹرول مہنگا ہونے سے عوام کو بنیادی سہولتیں

دستیاب ہو سکیں گی؟ اور کیا صرف قوم کو ہی متحد ہونے کی ضرورت ہے؟ اس میں حکمرانوں کا کوئی عمل دخل نہیں؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ ”آئیں! تیل کی بچت کو یقینی بنائیں“، والی بات تو نہایت مضحکہ خیز ہی نہیں کرناک مذاق بھی ہے، کہ صرف حکمران ہی نہیں، تمام بیوروکریسی بھی تیل کو اس بے دردی سے پیٹے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ کونسا چھوٹا سا بھی افسر ہے، جسے گاڑی ملی ہوئی ہو اور اس کی پوری آل اولاد سرکاری تیل پر مزے میں نہ ہو۔ اگر یہ مرکزی اور صوبائی حکمران صرف سرکاری گاڑیوں کو ہی کنٹرول کر لیں تو ماہانہ کروڑوں روپے کے پٹرول کی بچت ہو سکتی ہے، مگر حکمرانوں نے تو تمام قربانیاں عوام سے ہی لینے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

جج ایک خالصتاً ذاتی مذہبی معاملہ ہے، جو صاحبِ نصاب ہے، اس پر فرض ہے، یہ الگ بات ہے کہ معاشرے میں بے شمار صاحبانِ نصاب ”غیر نصابی“ سرگرمیوں میں زندگی گزار جاتے ہیں مگر جج جیسے اہم فرض کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ بھی عجب بات ہے کہ بے شمار ایسے لوگ جو نصاب کی شرائط پوری نہیں کرتے، اپنی سچی لگن کی بنا پر ان کی رات دن کی دعائیں اور حسرتیں کام آ جاتی ہیں، ان کی منظوری کے سرٹیفیکیٹ کا بندوبست خود ہی ہو جاتا ہے۔

حاجیوں کے قافلوں کی روانگی یا واپسی کا منظر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت سے لوگ عمر رسیدہ اور کمر خمیدہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور دل میں خالق کائنات اور وجہ تخلیق کائنات ﷻ کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے، ان کی نظروں میں یہاں کی کوئی چیز نہیں سماتی، یہی وجہ ہے کہ اس کا دل ان سب چیزوں سے اچاٹ ہوتا ہے، ان کی لو کسی اور جگہ لگی ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو انتظار کی سولی پر لٹکا کے یہ رتبہ حاصل کیا ہوتا ہے، پائی پائی جوڑ کر یہ رقم اس قدر بنتی ہے کہ جج کے اخراجات پورے ہو سکیں، ان کی زندگی کی اہم ترین

حسرت یوں پوری ہوتی ہے۔

کچھ قافلے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں کوئی نہ جانتے ہوئے دیکھ سکتا ہے، اور نہ اس مقدس سفر سے واپسی پر کسی کو ان کے آنے کی خبر ہوتی ہے، یہ خصوصی اور وی آئی پی لوگ خصوصی طیارے میں سب سے آخر میں جاتے ہیں اور اسی جہاز پر سب سے پہلے واپس لوٹ آتے ہیں، ان کا خرچہ قومی خزانے سے ادا کیا جاتا ہے، اور قومی خزانہ عوام کو نچوڑ کر، ان کا خون چوس کر یا غیر ملکی امداد اور قرض حاصل کر کے بھرا جاتا ہے۔ مالِ مفت دل بے رحم کے مصداق حکمران، ان کے دوست احباب اور من پسند صحافی مفت حج کے، مزے لوٹ آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہماری فاقہ مستی رنگ لائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے راستہ نکال لیا ہے۔

رواں سال میں حج کے موقع پر حکومتی سطح پر کرپشن کے قصے زبان زد عام ہوئے تو معاملہ عدالتِ عظمیٰ تک جا پہنچا، مفتے کے حاجیوں کی بد قسمتی کہ عدلیہ آزاد ہے، اور اب کرپشن کی اس طویل داستان کے تمام کرداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔ وزیر مذہبی امور فی الحال اپنی وزارتی ذمہ داریوں کی جوابدہی کے لئے جیل میں موجود ہیں، عوام کی خواہش ہے کہ اس کہانی کے دیگر اہم کردار بھی جلد سامنے لائے جائیں تاکہ قوم اپنے مخلص

رہنماؤں کے اصلی چہرے دیکھ سکیں۔ لیکن یہ مفت حج والا معاملہ دوسری کرپشن سے ذرا مختلف ہے۔ جیسے حج میں کرپشن شروع سے ہوتی آئی ہے، ایسے ہی مفت کے حج کا کلچر بھی بہت پرانا ہے۔

مفتیان کرام سے معلوم کیا جاتا کہ آیا قومی خزانے سے مفت حج کرنا جائز ہے یا ناجائز، مگر دل خود ہی مفتی بن بیٹھا ہے، کسی طرح اس عمل کو جائز ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، حکمرانوں کے سرکاری حج سے لے کر ان کے پسندیدہ افراد تک کے یہ حج کیسے قبول ہو سکتے ہیں، جس پر انہوں نے اپنی جیب سے خرچ ہی نہیں کیا۔ اب عدالت عظمیٰ نے حکم جاری کیا ہے کہ گزشتہ دو برس میں جن لوگوں نے بھی مفت لگا کر فریضہ حج ادا کیا ہے، وہ دو ہفتے کے اندر اندر اس کے اخراجات کی ادائیگی کر دیں۔ اب ان لوگوں کو ادائیگی تو کرنی ہی پڑے گی، بہتر ہو کہ یہ فوری اور نیک ارادے سے یہ رقم ادا کر دیں نہ کہ ایک جرمانہ یا مصیبت جان کر، کیونکہ حج وہی ہے جو اپنے خرچ پر اور اپنی خوشی سے کیا جائے۔

ماضی میں جن لوگوں نے بھی عوام کے پیسوں سے عوام کی مرضی کے برعکس حج کیا ہے وہ خود ہی نیک نیتی سے رقوم خزانے میں جمع کروادیں، تاکہ ان کا حج ان کے اپنے، کھاتے میں لکھا جائے۔ ویسے بھی اگر عدالت میں 32 سال پرانے کیس ری

اوپن ہو رہے ہیں، جس کے اکثر گواہ اور جج وغیرہ اس عارضی دنیا سے کوچ کر چکے ہیں،
تو جو لوگ مفت کے جج والے ابھی زندہ و سلامت ہیں وہ خود ہی سامنے آئیں اور اپنے جج
والے سال کے حساب سے رقم قومی خزانے میں جمع کروادیں، عدالت عظمیٰ کے کسی
فیصلے سے قبل ہی اپنے ضمیر کا فیصلہ صادر کریں اور اس پر عمل کر گزریں۔ یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ یہ ساری رقم سیلاب زدگان کی بحالی پر خرچ کر دی جائے۔

نئے صوبوں کا قیام

نئے صوبوں کے قیام کی بات چل نکلی ہے تو ہر کوئی اپنی دانست کے مطابق اس پر اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہے، کسی کی نظر میں یہ سیاست ہے تو کسی کی نگاہ میں ضرورت۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملہ کو کسی بھی قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر زیر بحث لانا چاہیے۔ اسلام آباد اور لاہور میں بیٹھے لوگوں کی سوچ اور طرح کی ہے اور ان مراکز سے سیکڑوں یا ہزاروں میل دور رہنے والوں کا زاویہ نگاہ اور طرح کا ہے۔ مرکزی شہروں میں رہنے والے حکمرانوں یا وہاں کے سیاستدانوں یا دانشوروں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ دور دراز کے باسی صوبے وغیرہ کے مطالبے کی صورت میں ملک دشمنی کے مرتکب ہو رہے ہیں، یا وہاں کے چند شر پسند سیاستدان عوام کو گمراہ اور حکومت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں یا یہ کہ وہ اپنی سیاست چمکا رہے ہیں۔

مشال کے طور پر صادق آباد سے لاہور پہنچنے میں بارہ گھنٹے کے قریب وقت درکار ہوتا ہے، اگر کسی سائل کو اپنے کسی معمولی کام کی غرض سے لاہور جانا پڑ جائے تو آنے جانے کا کرایہ، وہاں قیام و طعام اور دفاتر کے چکر لگانے کے لئے آٹھ دس ہزار کا بندوبست کرے، تب جائے، اور یہ بھی نہیں یقین کہ کام

ہوگا بھی یا نہیں، یا کام کروانے کے لئے بھی فائل کو پہنچے لگانے پڑتے ہیں، یا دو چار روز دفاتر کے دھکے کھا کر، صاحب کے دفتر کے باہر بیچ پر بیٹھ بیٹھ کر چوتھے روز مایوس ہو کر گھر لوٹ جائے، لاہور کے ٹھنڈے دفتر میں بیٹھا ہوا بیورو کریٹ اس سائل کے ذہنی کرب، موجودہ معاشی حالات میں اس کی مجبوریوں سے قطعاً آگاہ نہیں ہوتا، اگر ہو بھی تو احساس نہیں کرتا۔

نئے صوبوں کے قیام کا معاملہ کوئی انہونی بات نہیں، اگرچہ پاکستان میں یہ تجربہ نہیں ہوا، مگر ہمارے ہمسایہ ممالک ایسا کر چکے ہیں اور یہ تجربہ ناکام نہیں ہوا، اگر بھارت یا دیگر ہمسایہ ممالک میں صوبوں میں اضافہ ہوا ہے تو ان ممالک کی حکومتیں بھی کمزور نہیں ہوئیں اور ان صوبوں میں کسی قسم کی غداری کی ہوا بھی نہیں چلی۔ اگر پنجاب یا خیبر پختونخواہ میں نئے صوبے معرض وجود میں آجائیں گے تو اس سے ملک کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ گلگت بلتستان کو خاموشی سے صوبہ بنا دیا گیا تو نہ کہیں سے غداری کا شائبہ پیدا ہوا اور نہ ہی ملک کی سرحدوں میں کمزوری واقع ہوئی۔

صوبوں کے قیام کا مقصد دراصل چھوٹے یونٹ بنانا کہ عوام کو ان کی دہلیز پر سہولت فراہم کرنا ہے، اس ضمن میں سابق فوجی آمر کا ضلعی حکومت کا نظام بہترین نظام تھا، اس کی صرف اس لئے مخالفت کرنا کہ وہ ایکٹ ناپسندیدہ آمر

کا نظام تھا، ختم کر دیا جائے، قرین انصاف نہیں، اس نظام میں بیوروکریسی کی بجائے عوام کی حکومت کا احساس ہوتا تھا، مقامی بیوروکریسی ناظم ضلع کے ماتحت تھی۔ اگرچہ یہ نظام بھی خامیوں سے مبرا نہیں تھا، مگر خامیوں کو ختم کر کے اسے مزید بہتر کیا جاسکتا تھا۔ یہاں اس ضلعی نظام کی مثال دینے کا مقصد یہی ہے کہ عوام کے زیادہ تر مسائل ان کی دہلیز پر ہی حل ہو جاتے تھے۔ اسی طرح اگر صوبے بھی چھوٹے یونٹ بن جائیں، تو اس کا فائدہ عوام کو ہی ہوگا۔

جن علاقوں میں صوبوں کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے، اب وہاں قیادتیں، پارٹیاں اور عوام بھی ان کے حامی ہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان علاقوں کے لوگ بھی اتنے ہی محب وطن ہیں جتنے لاہور یا اسلام آباد کے، صرف محرومیاں ہیں جو حکمرانوں نے دور دراز کے علاقوں کو دے رکھی ہیں، جب وہ بڑھ جاتی ہیں تو اپنا حق مانگنے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے، تیز رفتار میڈیا کے ہوتے ہوئے حق مانگنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔ حکمران اپنی طاقت اور اختیارات کے بل بوتے پر جسے چاہیں غدار بنا کر جیلوں میں ٹھونس دیں اور جسے چاہیں محب وطن قرار دے کر اعلیٰ عہدہ عنایت کر دیں۔

سچ تو یہ ہے کہ عوام کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ حکومت کس کی ہے، اس میں ق
 لیگ کے شامل ہونے سے ترقی کی کوئی راہیں کھلیں گی، ان لیگ کے حکومت چھوڑ
 جانے سے ملک کس قدر پیچھے چلا جائے گا، شاید صدیاں پیچھے یا شاید پتھر کے زمانے
 تک۔ عوام کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ ایم کیو ایم ایکٹ سال میں کتنی دفعہ
 حکومت میں شامل ہوتی ہے، اور کتنی دفعہ ناراض ہو کر حکومت سے نکل جاتی
 ہے، اور کچھ مطالبات منوانے کے بعد نئے سرے سے حکومت میں شامل ہو جاتی ہے۔
 عوام کو اس سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ مولانا فضل الرحمن کب چھوڑتے ہیں اور کب
 دوبارہ جوائن کرتے ہیں۔ عوام کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ق لیگ کاپی پی سے
 اتحاد قائم رہ سکے گا بھی یا نہیں، آیا یہ فطری اتحاد ہے یا غیر فطری۔
 عوام کو سروکار ہے بجلی سے، لوڈ شیڈنگ نے عوام کی زندگی معطل کر رکھی ہے، اگر بجلی
 شیڈول پر بھی آئے جائے تو بھی دس گھنٹے جدائی کے صدمے برداشت کرنے پڑتے ہیں،
 لیکن یہاں شیڈول پر بھلا کونسا کام ہوتا ہے، سوائے بے اصولی اور کرپشن کے، کہ ان
 دونوں کاموں میں نہ ہی بددیانتی برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی تاخیر، یہ دونوں کام
 نہایت دیانتداری کے ساتھ انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اگر مہی

کی گرمی میں ایک ایک دن میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے بجلی نہیں ہوگی، تو نظام زندگی کیسے چلے گا؟ اب دنیا کے اکثر کام بجلی کے مرہون منت ہیں، بازاروں کے بازار لوگ ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر دوسرے اور تیسرے گھنٹے کا انتظار کرتے ہیں، لگتا ہے یہ زندگی ہی انتظار میں گزر جائے گی۔

عوام کو غرض ہے پٹرولیم کی قیمتوں سے، کہ ان کی کاروباری زندگی بھی مفلوج ہوئی پڑی ہے، نہ موٹر سائیکل چلتی ہے نہ کار، نہ کارخانہ اور نہ ہی کاروبار، نہ جزیئر چلتا ہے اور نہ ہی ٹرانسپورٹ۔ ستم یہ کہ ڈنرل کی قیمتیں پٹرول سے بھی آگے جا چکی ہیں، ہر چند روز بعد پٹرولیم کی قیمتوں کا ایک ڈرون حملہ ہوتا ہے، عوام کی ایک چیخ نکلتی ہے اور اس کے بعد خاموشی چھا جاتی ہے، حکمران اور عوام پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ حکمران عوام کا خون چوسنے میں اور عوام لڑیاں رگڑنے میں۔

عوام کو واسطہ ہے امن وامان سے، کہ نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ مال، نہ کسی کی عزت محفوظ ہے اور نہ آبرو۔ حکمرانوں کے گرد سیکورٹی کے حصار بڑھتے جا رہے ہیں، ان کے پرنٹو کوئل کے قافلے مزید طویل ہوتے جا رہے ہیں، پولیس جو عوام کی حفاظت پر مامور ہونی چاہیے، وہ خود پولیس کے افسران، چھوٹی بڑی بیوروکریسی اور حکمرانوں کی حفاظت پر مامور ہے۔ کسی آرپی او کا دفتر

ملاحظہ کر لیں، معلوم ہوگا کہ اس شہر کا سب سے اہم اور قیمتی فرد اسی دفتر میں رونق افروز ہے۔ رہے عوام تو ان کی حفاظت کے لئے پولیس کی نفری ہی نہیں۔ یہاں اغوا برائے تاوان ہے، یہاں ڈاکے ہیں، یہاں سٹریٹ کرائم ہے، کیونکہ ان کو روکنے کے لئے پولیس فارغ نہیں۔

عوام کو دلچسپی ہے اشیائے ضرورت کی قیمتوں سے، مگر یہ قیمتیں ہیں کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، عوام انہیں صرف دیکھ سکتے ہیں، خریدنے کی سکت صرف خواص میں ہو سکتی ہے، کوئی سبزی چالیس روپے سے کم کلو نہیں ملتی، ایکٹ عدد کیلا آپ کو پانچ روپے سے کم میں نہیں ملے گا، سیب کے بارے میں عام آدمی اپنے بچوں کو صرف زبانی معلومات ہی فراہم کر سکے گا، دالیں، گھی، چینی اور استعمال کی عام چیزیں عوام کے ہاتھوں سے اچک لی گئی ہیں، ہر طرف بے بسی اور بے حسی کا ڈیرہ ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس طرح عوام کو سیاستدانوں کی پینترا بازی سے کوئی سروکار نہیں، اسی طرح حکمرانوں کا عوام کے مسائل اور پریشانیوں سے کوئی واسطہ نہیں، لوڈ شیڈنگ ہے تو حکمرانوں کی جانے بلا، پٹرول کی قیمتیں بڑھتی ہیں، تو حکمرانوں کو کیا کہ ان کا پٹرول تو سرکاری ہے، دلدل جیسے قالینوں میں دھنسے ہوئے حکمران عوام کے مسائل پر توجہ کیوں دیں، کیونکہ وہ ان

مسائل سے آنراو ہیں، مگر کیا اس تضاد کا کوئی حل ہے، کیا وسائل کا یہ وسیع خلیج کبھی پر

ہو سکے گا اور یہ کہ عیاشیوں اور مجبوریوں کی اس جنگ کا انجام کیا ہوگا؟

ہم ایٹ آباد میں ہونے والے سانحے کے بارے میں ہر طرف سے اٹھنے والے بے شمار سوالات کو ایک طرف رکھتے ہیں، کہ ملک کی خود مختاری کے بارے میں زیادہ باخبر اور زیادہ ذمہ دار ہمارے حکمران ہی ہیں، اسی لئے وہ عوام وغیرہ کی خواہشات کے برعکس وسیع تر ملکی مفاد میں اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات حکمران، میڈیا اور دانشور ایک نظریہ کے حامی ہوتے ہیں اور عوام ان کے بالکل برعکس دوسرا زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ اسامہ بن لادن کے معاملے میں اسی قسم کی صورت حال پائی جاتی ہے، کون جانے اس واقعے کی تہوں سے کتنے انکشافات برآمد ہوں گے، کیا راز سامنے آئیں گے، کتنے پردے فاش ہوں گے؟ ان تمام باتوں سے قطع نظر حیرت کی بات یہ ہے کہ ادھر امریکہ نے اعلان کیا، ادھر ہمارے حکمرانوں نے اسے عظیم فتح قرار دے دیا، ہمارے میڈیا نے بھی بہت جذباتی انداز میں گفتگو کی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پاکستانی عوام کی اکثریت خاموش اور کسی حد تک دم بخود ہے، ایسے واقعات پر اول اول یقین نہیں آیا کرتا، مگر حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، عوام کو دوسرا صدمہ ہمارے حکمرانوں، میڈیا اور دانشوروں کے رویے سے ہوا، کہ اسامہ کے بارے میں توہین آمیز انداز اختیار

کیا گیا، کیونکہ وہ بھی امریکیوں اور اپنے حکمرانوں کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں دہشت گردی کی بنیاد اسامہ نے رکھی، امن عالم کی تباہی بھی اسامہ کے ذمہ ہے، دنیا میں ہزاروں افراد کے قتل کا ذمہ بھی اسامہ پر ہے۔ ظاہر ہے ایسا شخص کسی رو رعایت کا حقدار کیسے قرار پاسکتا ہے؟ لیکن عوام کا یہ خیال نہیں۔ تیسرا صدمہ یہ کہ ہماری خود مختاری کہاں ہے؟

پاکستانی عوام یا ہم جیسے کم فہم لوگوں کو اس بات کی سمجھ نہیں آ سکی کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے گرنے کی ذمہ داری اگلے ہی لمحے امریکہ سے ہزاروں میل دور سنگلاخ پہاڑوں میں بیٹھے ایک شخص پر کیسے ڈال دی گئی، یقیناً وہاں ٹیکنالوجی کی جدید سہولتوں کا فقدان ہی ہوگا، تو اس قسم کے ماحول میں بیٹھ کر امریکہ جیسے ملک میں اس قدر منظم دہشت گردی کیسے ممکن ہو گئی۔ کسی نے تحقیق کر کے نہیں بتایا کہ ان جہازوں نے امریکہ کے فلاں فلاں اڈوں سے اڑان بھری، عملہ کون تھا، مسافر کتنے اور کون تھے، عوام کو کچھ نہیں بتایا گیا، پھر اگلے ہی لمحے ملزم کا فیصلہ بھی ہو گیا، اور سب سے اہم بات یہ کہ تمام دنیا نے اس فیصلے کو تسلیم بھی کر لیا، جن میں ہماری پاکستانی حکومت اور بعض دانشور پیش پیش تھے۔

انصاف کی یہ کونسی شکل ہے کہ ایک شخص کے لئے ملکوں کے ملک ہی تباہ کر دیئے

جائیں، مرنے والوں کی کوئی تخصیص ہی نہ ہو، شادی کی تقریبات بھی جس سے محفوظ نہ رہیں، ایسی ایسی بمباری کی جائے جسے محاوروں کی زبان مل جائے، ”پاکستان امریکہ کے سامنے سرنگوں ہو جائے ورنہ ’تورا بورا‘ بنادیا جائے گا۔“ اسامہ کی تلاش میں مرنے والے ’دہشت گردوں‘ میں ہزاروں بچے، مائیں اور بوڑھے بھی شامل ہیں، کوئی بعید نہیں کہ ہمارے دانشور بے گناہ مارے جانے والے ان افراد کی موت کا ذمہ دار اسامہ کو ہی قرار دے دیں، کہ بے چاری امریکی حکومت کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

اگر گزشتہ دس برس سے دہشت گردی کی جنگ اسامہ کے خلاف ہی جاری تھی تو اب یہ اپنے انجام کو پہنچ جانی چاہیے، کیونکہ امریکہ نے اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے، اگر یہ جنگ اب بھی جاری رہے گی، تو پھر یہ جنگ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ امریکی رویوں کی وجہ سے اب ہزاروں اسامے دنیا میں پائے جاتے ہیں، امریکہ اپنے عمل سے دنیا میں نفرت اور انتقام کے بیج بوتا اور اس کی فصل کاٹتا ہے، وہ افغانستان ہو یا عراق، وہ پاکستان ہو یا لیبیا، امریکہ اپنے دشمن خود بناتا اور دنیا کے امن کی تباہی کا اہتمام کرتا ہے۔ امریکہ جب تک اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور مسلمانوں کی تباہی کا مرتکب ہوتا رہے گا، اسامہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکہ کو پاکستانی حکمرانوں جیسے غلام بھی میسر آتے رہتے ہیں اور یہ بھی الگ بات ہے کہ ایسے

حکمران اپنے عوام کی نظموں سے محنتیں رہیں گے۔

امتحانات میں کی جانے والی محنت تین طرح کی ہوتی ہے، اول؛ پیپروں سے پہلے کی جانے والی محنت، دوم؛ پیپروں کے درمیان اور سوم؛ وہ محنت جو پیپروں کے بعد کی جائے۔ ہمارے معاشرے میں تینوں محنتیں پورے جوش و جذبے کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ پنجاب میں میاں شہباز شریف نے اپنے پہلے دور حکومت میں بورڈز کے امتحانات میں بوٹی مافیا کا خاتمہ کر کے کافی نام کمایا تھا، اب اپنے موجودہ دور میں انہوں نے امتحانی نظام کو کمپیوٹرائزڈ کر کے اس میں ہونے والی بدعنوانیوں کا مزید خاتمہ کرنے کی کوشش کی، یہ الگ بات ہے کہ کمپیوٹر سسٹم کا پہلا سال ہونے کی وجہ سے بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آہستہ آہستہ ہونے والے کام کو یک دم کرنے سے اس میں یقیناً پریشانیاں تو ہوتی ہیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس سسٹم کے بعد کسی کی مجال نہیں کہ جعل سازی کا ارتکاب کر سکے۔ لیکن بد قسمتی سے مافیا کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ کمپیوٹر میں سے بھی راستہ نکال لیتا ہے۔

بہاول پور بورڈ کے قائم کردہ ایک سینٹر میں میٹرک کے پرچہ جات چیک کئے جا رہے تھے، معلوم ہوا کہ متعلقہ بورڈ کا ایک اہلکار رفیق قریشی بھی یہ خدمت

سرا انجام دے رہا ہے، اس کا تعلق دراصل بورڈ کی کنڈکٹ برائچ سے ہے، نگرانی اور چیکنگ کی ڈیوٹیاں بھی یہی لوگ لگاتے ہیں، 'حسن اتفاق' سے موصوف کی زوجہ بھی اسی خدمت پر مامور تھیں۔ ڈیوٹیاں لگانا اور ان کے ذریعے سے مطلوب افراد کی مدد کرنا اور ان سب کچھ کے نتیجے میں آمدنی میں اضافہ فطری بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بورڈ کے اس قسم کے ملازمین کی مالی حالت غم دوراں کی پریشانیوں سے آزاد ہوتی ہے، ایک ایک کلرک کئی کئی گھروں کا مالک ہو جاتا ہے، بڑی گاڑیاں رکھنے کی پوزیشن میں بھی آ جاتا ہے۔

اگرچہ پنجاب حکومت نے سسٹم کو کمپیوٹرائزڈ کر کے پرچہ جات کی شناخت ناممکن بنانے کا دعویٰ کیا ہے، مگر ان کا یہ دعویٰ پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کے سامنے گھٹے ٹیکے پر مجبور ہو جاتا ہے جب ہمارے ذہین اہلکار ایسے سسٹم میں بھی نقب لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ کام کسی فرد واحد کا نہیں ہوتا، اس میں اوپر سے نیچے تک پورا گروپ کام کرتا ہے، اس ڈوری کا سرا کسی باختیار فرد کے دست ہنر مند نے ہی تھام رکھا ہوتا ہے۔ چیئرمین بورڈ نے کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اہلکار مطلوبہ کوڈ کھولنے میں کامیاب ہو سکے۔ کیونکہ بار کوڈنگ کا یہ سلسلہ لاہور میں ہے۔ لیکن سب کو جاننے کا حق ہے کہ بورڈ کا وہ اہلکار کس اختیار کے تحت پیپر مارکٹ کر رہا تھا؟ کیا وہ اپنی خاتون خانہ کا ہاتھ بٹا رہا تھا؟ کیا بورڈ نے اسے یہ مینڈیٹ دے رکھا ہے کہ

وہ اپنی مرضی سے جا کر پیپر دیکھا کرے، اور ان پر نمبر لگایا کرے؟

بورڈ کا یہ مافیا اپنی پوری گینگ کے ساتھ متحرک ہوتا ہے، جلساری کے خواہش مند ایسے لوگوں سے رابطے میں ہوتے ہیں، وہ بڑی بڑی رقوم کی ادائیگی کر کے نمبر لگوانے کا دھندہ کرتے ہیں، کام کو یقینی اور تسلی بخش بنانے کے لئے مافیا کے لوگ خود جا کر مارکنگ کا فریضہ نبھاتے ہیں، تاکہ کسی شک کی گنجائش نہ رہے، اور معاوضہ جائز قرار پائے۔ بورڈ کے ارباب اختیار کو اس نقب زنی کی خبر ہوئی تو انہوں نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والے چار افراد کو معطل کر دیا، اب انکو اٹری ہوگی، ہو سکتا ہے اسے کچھ روز معطلی کی سزا مل جائے اور بعد ازاں روایتی بحالی کی خوشخبری۔

قابل غور امر یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی بوٹی مافیا کے خاتمے کے لئے کی جانے والی تمام سرگرمیوں کو ناکام بنانے والے یہ عناصر کون ہیں؟ ان کے سرے کس کس مضبوط ہاتھوں میں ہیں؟ اگر یہ پیپر ڈی کوڈ ہو ہی نہیں سکتے تو یہ انہونی کیسے ہو رہی ہے؟ کیا اس کرپشن اور بد عنوانی کا مرکز لاہور میں ہی تو نہیں؟ کہ جہاں سے کوڈ دستیاب ہوں، وہاں سے ہی ڈی کوڈنگ کا سلسلہ جاری ہو، اور فی کوڈ حصہ وصول کیا جاتا ہو؟ کیا وزیر اعلیٰ دوسروں کا حق مارنے والے اس مافیا کے خلاف کوئی سخت ایکشن لیں گے؟

لاجواب سروس، پی آئی اے

جو نہی ہم نے ملتان لیئر پورٹ کے مین گیٹ سے اندر قدم رکھا تو ایسے لگا کہ ہم بس سٹینڈ پر آ گئے ہیں، ہر طرف کاغذ گرے ہوئے اور کچرا پڑا ہوا تھا، صفائی نام کی کوئی چیز نظر نہ آئی، عمارت کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو حکم ہوا کہ باہر نوٹس بورڈ ملاحظہ فرمائیں، فلائیٹ دو گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوگی، وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو سامنے دفتر میں تشریف لے جائیں، تاہم یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ابھی آپ اندر نہیں جاسکتے، کیونکہ کاؤنٹر ابھی نہیں کھلا۔ ان کے بتائے ہوئے دفتر پہنچے تو انہوں نے لاعلمی اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ہمیں مزید آگے روانہ کر دیا کہ اصل حقیقت 'ٹریفک' والے ہی بتا سکتے ہیں۔

ٹریفک والوں نے واقعی حق گوئی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ جہاز ابھی ابھی لاہور روانہ ہوا ہے، بس ایک چکر لگا کے ابھی واپس آ جاتا ہے تو اسلام آباد روانہ ہو جائے گا، رخت سفر باندھ رکھئے۔ ابھی اندر بیٹھنے کا اذن عام نہیں ملا تھا، ہم نے سوچا چلیں، کاؤنٹر کھلنے تک کینٹین کو رونق بخش دیتے ہیں، گرمی سے تپتی ہوئی کینٹین میں داخل ہوئے، تو ہم ہی ہم تھے، (یاد رہے کہ یہ مغرب کے فوراً بعد کا وقت تھا، مگر پسینہ خشک ہونے کا نام نہیں لیتا

تھا)، کینیڈین کے اونچے کاؤنٹر کے پیچھے چھپے بیٹھے دو افراد ہمیں مسلسل مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، لیکن اتنا ہوا کہ ہم نے مجبوراً وہاں ایکٹ گھنٹہ گزارا، اس دوران ایکٹ بھی گاہک بھولے سے بھی اندر داخل نہیں ہوا۔

خدا خدا کر کے کاؤنٹر کھلا، اندر داخلے کی اجازت مرحمت فرمادی گئی۔ بعید نہیں کہ ابھی انتظار کی گھڑیاں اور بھی طویل ہوتیں، وہ تو بھلا ہو چند غیر ملکی مسافروں کا کہ ان کی آمد کے بعد دروازوں کے بند رہنے کے امکانات صفر ہو گئے تھے، ہو سکتا ہے، کہ ایئرپورٹ کے عملہ کی مہمان نوازی کی بدولت اور اقدار کی پاسداری کے سبب ہی غیر ملکی مہمانوں کے لئے دروازے کھول دیئے گئے، مگر گمان غالب یہی ہے کہ ہم مغربی یا امیر ممالک کے سامنے زیادہ دیر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مہمانوں کی تکریم بہر حال لازم ہے۔ لاؤنج میں ہی مسافروں کی مشروب وغیرہ سے تواضع کردی گئی، تاکہ مسافر انتظار کی کوفت سے مایوسی میں مبتلا نہ ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ راستے میں زیادہ تنگ نہ کریں۔ کوئی گھنٹے بعد خوشخبری سنائی گئی کہ فلائٹ لاہور سے روانہ ہو چکی ہے، کچھ جان میں جان آئی، کچھ امید بندھی، آٹھ بجے والی پرواز ساڑھے دس کے قریب روانہ ہوئی گئی۔

چھوٹے جہاز میں سفر کرنے کا ایکٹ فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر ادھر ادھر

کی بجائے اپنی توجہ درود شریف، کلمہ طیبہ اور آیت الکرسی اور دیگر تسبیحات پر ہی مرکوز رکھتے ہیں۔ چلیں مصروف زندگی میں یہ چند لمحے تو انسان کو میسر آ جاتے ہیں۔ پی آئی اے والے اپنے معزز اور باکمال مسافروں کی صحت کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں، اول تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسافر دوران سفر کھانے پینے سے پرہیز ہی کریں تو بہتر ہے، کیونکہ اس سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ پی آئی اے والوں نے نہایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے فروٹ کیک کا ایک ایک ککڑا پیک کیا، اسی میں چینی اور دودھ کی پڑیا بھی رکھ دی، کیک کا یہ ککڑا کسی بہت ہی اعلیٰ بیکری کی پیش کش لگتی تھی کہ دو چار دن بچا رہے تو بھی خراب نہ ہو۔

اگلے روز لاہور سے بھی کچھ دوستوں نے ہوائی سفر کرنے کی غلطی کا ارتکاب کر لیا تھا، ان کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جہاں انہوں نے صبح آٹھ بجے پہنچنا تھا، وہاں وہ دوپہر تک پہنچ گئے۔ ہم نے حساب لگایا کہ اگر بہاول پور سے کسی اچھی سروس کے ذریعے اسلام آباد کا سفر کیا جاتا تو شاید دونوں میں اتنا ہی وقت درکار ہوتا، کچھ یہی احوال لاہور والوں کا ہے، یہ بھی گمان ہو سکتا ہے ریلوے کے ختم ہونے کی صورت میں ریلوے لائینوں پر کچھ خرچہ کر کے انہیں رن وے کی شکل دے دی جائے، رن وے سے مراد یہ ہر گز نہ لیا جائے کہ یہاں سے اڑان بھر کر جہاز ہوا میں بلند ہوگا، بلکہ رن وے سے مراد جہاز کے بھاگنے کی جگہ

۔ اگرچی آئی اسے کی یہی رفتار رہی تو جہاز کی عدم دستیابی یا تاخیر کی صورت میں یہاں

بسیں بھی چھلائی جاسکتی ہیں، کیونکہ دونوں ذرائع سے وقت تو برابر ہی لگے گا۔

نہ جانے محکمہ تعلیم کتنے سیکشن آفیسرز کے ماتحت ہے، ایکٹ سیکشن آفیسر وہ ہیں جنہوں نے موسم گرما کی چھٹیوں کا حکم نامہ جاری کیا ہے، یہ موصوف یقیناً مذکورہ محکمہ کے ہی افسر ہونگے۔ کوئی بااختیار ہستی وہ بھی ہے جو اساتذہ کو مردم شماری اور خانہ شماری جیسے کاموں پر لگاتی ہے، یہ فرض بھی کسی سیکشن افسر کے حکم پر ہی ادا ہوتا ہوگا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ صاحب محکمہ داخلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایکٹ اور صاحب بھی ہیں جن کے حکم کی تعمیل میں نہ صرف اساتذہ بلکہ ان کے تمام افسران بھی گندم کی خرید کے موقع پر خریداری مراکز پر چھاپے مارنے اور بار دانے کا حساب کتاب میں لگے رہے۔ یقیناً یہ حکم زراعت و خوراک کے محکمہ کا ہوگا۔

اگر یہ تمام احکامات اساتذہ کو ہی ملتے ہیں تو اس کی بھی ایکٹ خاص وجہ ہے، ایکٹ تو یہ کہ یہ محکمہ افرادی قوت میں سب سے آگے ہے، بے اختیار لوگوں کا یہ طبقہ اپنے مسائل کے حل کے لئے ہر وقت سیاستدانوں یا ان کے ساتھیوں کے درباروں پر موجود رہتا ہے، ان لوگوں نے اپنی اہمیت خود ہی کم کی ہے، اسی لئے حکومت کو جہاں کچھ تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت پڑتی ہے، وہاں اساتذہ کو طلب کر لیا جاتا ہے۔ دوسری اہم ترین وجہ یہ ہے کہ جب اساتذہ ہیں ہی فارغ،

تو ان کو دوسرے کاموں میں مشغول کیوں نہ کیا جائے، آخر تنخواہ تو سرکاری خزانے سے ہی جانی ہے، کیونکہ بہت سے سکولوں میں بچے برائے نام ہی ہیں، وہاں اساتذہ کی کوئی مصروفیت نہیں ہوتی، حکومت ان کی فراغت کو مشغولیت میں بدلنے کے لئے ان کے ذمے مختلف کام ڈال دیتی ہے۔

سرکاری سکولوں میں طلباء و طالبات کی تعداد پریشان کن حد تک کم ہو رہی ہے، شہروں سے ذرا ہٹ کر اساتذہ نے اپنی بقا کا بندوبست کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ رجسٹروں میں بچوں کے فرضی نام لکھ رکھے ہیں، اگر کوئی چھاپہ پڑ گیا تو بتا دیا کہ آج اتنے بچے نہیں آئے، کئی چھٹی لے کر جا چکے ہیں، اس فراڈ کو کٹرول کرنے کے لئے حکومت نے سرکاری سکولوں کے بچوں کو 20 روپے ماہانہ فیس کے لئے پابند کر دیا ہے، جس پر احتجاج بھی ہو رہا ہے، یقیناً اس احتجاج کے پیچھے اساتذہ کا بھی ہاتھ ہوگا، اب شاید انہیں جعلی بچوں کے بیس روپے بھی بھرنے پڑیں گے۔ یہ ”ظلم“ نہ بچے برداشت کر سکتے ہیں، نہ ان کے والدین اور نہ ہی اساتذہ۔

بات چلی تھی گرمیوں کی چھٹیوں سے، کسی اور طرف نکل گئی، اس سال یہ چھٹیاں یکم جون سے پندرہ اگست تک کی گئی ہیں، مگر ساتھ ہی ایکٹ ’امکان‘ بھی موجود ہے، جس کی بنا پر رمضان المبارک کی وجہ سے مزید پندرہ چھٹیاں ہو سکتی ہیں

یہ امکان بھی یقین کی صورت ہی ہے۔ یہ پندرہ روز پورے ہونے کے بعد عید الفطر کے امکانات روشن ہو جائیں گے، یوں ان پندرہ دنوں میں مزید پانچ روز کا اضافہ کر دیا جائے گا، گویا کل چھٹیاں 96 دن پر مشتمل ہوں گی، اگر محکمہ تعلیم اور اساتذہ کا بس چلے تو وہ سال بھر کی چھٹیاں کر کے اپنا اپنا کاروبار چلائیں، یہ لوگ سب کچھ کرتے ہیں، سوائے پڑھنے اور پڑھانے کے۔

چھٹیوں کے احکامات جاری ہونے کے بعد محکمہ کے افسران کا سب سے بڑا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ فوری چھاپہ مار ٹیمیں تیار کریں، اس ظالم سماج کا سراغ ڈھونڈ نکالیں، جو بچوں کو پڑھانے کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ان میں پرائیویٹ تعلیمی ادارے قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں، جس کا مزہ انہیں یوں چکھایا جاتا ہے کہ ان کی رجسٹریشن منسوخ کر دی جاتی ہے، اور پولیس کی مدد سے ان کا سکول سیل کر دیا جاتا ہے، سکول مالکان چوروں کی طرح چھپ رہے ہوتے ہیں، اگر یہ سکول مالکان بچوں سے فیس لینے کا جرم کرتے ہیں، تو سرکاری اداروں سے ان کا رزلٹ بھی سوگنا مختلف اور بہتر ہوتا ہے اور فیس سے ہی انہوں نے سکول اور اپنا گھر چلانا ہوتا ہے۔ شاید محکمہ تعلیم کے افسران کو یہ حسد بھی کھائے جا رہا ہو کہ نجی تعلیمی اداروں کا نتیجہ کیوں اچھا آتا ہے، سرکاری تعلیمی ادارے خود کو اوپر لے جانے کی بجائے دوسروں کو اپنے برابر لانا چاہتے ہیں۔

تعلیم سے محروم بچے

پھر ایک رپورٹ آئی ہے، پڑھ کر پریشانی بڑھتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ شرمندگی اس سے بھی زیادہ۔ یونیسکو کی ایجوکیشن فار آل گلوبل مانیٹرنگ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے پرائمری سکولوں سے باہر بچوں کی کل تعداد 6 کروڑ 74 لاکھ 83 ہزار ہے، پاکستان دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے، پہلا نمبر ناٹجیریا کا ہے۔ اس لحاظ سے جنوبی ایشیا میں پاکستان کا پہلا نمبر ہے، دنیا بھر کے ان بچوں میں ہر نوواں بچہ پاکستانی ہے، ان پاکستانی بچوں کی کل تعداد تقریباً 72 لاکھ 61 ہزار ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داخلوں میں اضافے کا رجحان فروغ پذیر نہیں ہے، اگر سکولوں سے باہر بچوں میں کمی کی یہی رفتار رہی تو 2015ء میں یہ تعداد صرف 58 لاکھ تک آسکے گی۔ رپورٹ میں محرومی کی ایک خاص وجہ غربت بتائی گئی ہے۔

بچوں کی تعلیم سے محرومی کی اہم ترین وجہ غربت ہی ہوگی، کہ غریب والدین اپنے بچے کو کسی ورکشاپ یا ہوٹل میں 'چھوٹا' بنوانے پر ترجیح دیتے ہیں کہ بچہ خود پر خرچ کروانے کی بجائے چند ٹکے گھرالائے تاکہ ان کے والدین کا ہاتھ بٹایا جائے۔ پاکستانی معاشرہ میں وہ کونسا ادارہ ہے، جہاں چائلڈ لیبر کا

رجحان نہیں، جس جگہ پہنچ جائیں، 'اوئے چھوٹے' کے الفاظ آپ کی سماعتوں سے ضرور ٹکرائیں گے۔ کتنے ہی بچے ایسے ہیں، جو عین اس وقت بھی آپ کو کوڑے کے ڈھیروں سے کاغذ چنتے نظر آئیں گے، جب بہت سے معصوم، خوبصورت اور اجلے بچے بیگ اٹھائے سکولوں کو جارہے ہوتے ہیں، اگر ان غریبوں کا بھی کوئی آسرایا رہنما ہوتا تو یہ بھی دیکھنے میں ویسے ہی نفیس اور پیارے لگتے۔

خطرناک اور پریشان کن بات تو یہ ہے کہ ہم گراؤ اور زوال کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں، دنیا میں کتنے ہی ملک ایسے ہیں، غربت اور پس ماندگی نے جن کو اپنے بے رحم بیٹوں میں جکڑ رکھا ہے، جہاں نہ سمندر ہیں نہ دریا، جہاں نہ سرسبز پہاڑ ہیں نہ سونا اگلنے کھیت، نہ ذخائر سے بھری کانیں ہیں اور نہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہر افراد۔ (نہ وہاں کوئی ایٹمی طاقت ہے اور نہ ایٹمی سائنسدان) صحراؤں میں نہ سایہ ہے نہ سڑکیں، نہ یونیورسٹیاں اور نہ ہسپتال۔ غربت، بیماریاں اور جہالت ہی ان کا مقدر ہے، ننگ دھڑنگ بچے، پسلیاں ایسی نمایاں کہ آپ گن لیں، پیٹ بڑھے ہوئے، آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی، پتلی گردن، بڑاسر، یہ ہے غریب افریقی ممالک کا معاشرہ۔ افسوس کہ ہم ان سے بھی پیچھے ہیں، ہم سری لنکا، بھارت اور بنگلہ دیش سے بھی پیچھے ہیں۔

اس سے بھی خطرناک بات یہ ہے کہ تعلیم ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں ہی

شامل نہیں ہے، نعرے جتنے بھی ہوں، دعوے جو بھی ہوں، عمل بتاتا ہے کہ حکمرانوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں، تعلیم پر خرچ ہونے والے بجٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تعلیم سے حکمرانوں کو کتنی دلچسپی ہے۔ وفاقی حکومت کی تو بات ہی کچھ اور ہے کہ وہ لوگ صرف حکومت کر رہے ہیں، انہیں کوئی غرض نہیں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، قوم کس حال میں ہے، مہنگائی کس منزل کو پہنچ چکی ہے، بد امنی اور خارجہ پالیسی کا کون ذمہ دار ہے، ان کی ترجیحات کچھ اور ہی ہیں اور وہ جو بھی ہیں حکمران نہایت یکسوئی سے اپنے ایجنڈے پر کاربند ہیں اور نہایت دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

ایک طرف پنجاب حکومت کہ داخلوں کے سلسلے میں مہم پر مہم چلاتی رہی، عوامی نمائندے بچوں کے داخلہ فارم پر کرنے کی تقریب کا افتتاح کرتے رہے، مگر زمینی حقائق مختلف ہیں، سرکاری سکولوں میں بچے داخل نہیں ہوتے، اساتذہ کرام جعلی حاضری کے ذریعے بچوں کے داخلے ظاہر کرتے ہیں، خود خادم اعلیٰ پنجاب کے بقول کہ ہمارے سرکاری سکولوں میں نہ دروازے ہیں، نہ ٹیچر، نہ واش روم ہیں نہ کمرے، دوسری طرف دانش سکول، کہ جن میں ایک بچے پر سولہ ہزار روپے خرچہ، دنیا کی تمام سہولتوں سے آراستہ اور تیسری طرف ان معصوم بچوں کے مستقبل کہ جو سکول نہیں جاسکے، جن کا مقدر سنوارنے میں حکومت اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہی۔ اگر حکمران اعتدال پر چلیں تو اتنا بڑا تضاد نہ رہے اور

تمام بچوں کا سکول جانا ممکن ہو سکے، پاکستان اور پاکستانی اس بڑی شرمندگی سے بچ جائیں۔

آج کل گرینڈ الائنس کے بڑے چرچے ہیں، چند روز قبل میاں نواز شریف کے جارحانہ بیانات سے اخبارات کی رونق تھی، حکومت (وفاقی) کی ناکامی کے اعلانات تھے، اس کی کرپشن کی مذمت تھی، اس کی جمہوریت کشی کا تذکرہ تھا، آزاد کشمیر میں دھاندلی کے الزامات تھے، اور آخر کار حکومت کی رخصتی کا اعلان تھا، کہ اب وہ مناسب وقت آچکا ہے کہ حکومت کو اب چلے جانا چاہیئے۔ اب یہ رونق تصویری جھلکیوں کی صورت میں ڈھل چکی ہے، میاں صاحب نے اگلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ اس گرینڈ الائنس کے لئے عملی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے، وہ اب تک سابق وزیر اعظم بلخ شیر مزاری اور پی پی کے سابق وزیر خارجہ اور پارٹی سے ناراض لیڈر شاہ محمود قریشی سے ملاقاتیں بھی کر چکے ہیں۔ امید ہے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چند روز تک چلے گا، بعض قائدین کرام سے ٹیلی فونک رابطے بھی ہونگے، چند روز بعد اس ہنگامی مشن میں ضرور کوئی پیش رفت ہو جائے گی۔

چار برس پیچھے مڑ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا، کہ اس وقت بھی میاں نواز شریف سخت جلدی میں تھے، مشرف سے معاہدہ کی صورت میں وقوع پذیر ہونے والی ڈیل کے نتیجے میں ہونے والی جلاوطنی سے واپسی پر اول تو میاں صاحب مشرف کے

زیر انتظام کرائے گئے الیکشن میں حصہ ہی نہیں لینا چاہتے تھے، انہوں نے بائیکاٹ کیا، پھر رجوع کر لیا، کسی سیانے نے مشورہ دیا ہوگا کہ جناب اگر آپ الیکشن نے میدان میں نہ کودے تو آپ کے سیاسی پہلوان میدان خالی کر دیں گے۔ دریں اثنا بے نظیر زرداری کا سانحہ ارتحال وقوع پذیر ہو گیا، میاں صاحب نے جذباتی فیصلہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا، مگر جب دیکھا کہ خود مرحومہ کے ورثاء ہی الیکشن لڑنے پر آمادہ ہیں تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اعلان کو منسوخ کر دیا۔

عوام نے دیکھا کہ ہر طرف این آر او کے چرچے ہیں، ایک فوجی آمر نے بے نظیر زرداری سے کچھ اس قسم کی ڈیل کی کہ ان کے تمام گناہ دھل گئے، اس بہتی گنگا میں بہت سے سیاستدانوں اور بیوروکریٹس نے بھی اشان کئے۔ گنگا نہا کر، پاک صاف ہو کر موجودہ حکمران طبقہ عوام پر مسلط ہو گیا، بلکہ یوں کہئے کہ عوام نے خود اپنے سروں پر اسے مسلط کیا۔ پھر میثاق جمہوریت والے آگے بڑھے اور ملک بچانے کی کوششیں کرنے لگے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ میان نواز شریف کے بھرپور تعاون سے پی پی حکومت قائم ہو گئی۔ قوم کو بتایا گیا کہ میثاق جمہوریت ایک مقدس صحیفہ ہے، جو لندن سے درآمد کیا گیا ہے، اس کی روح کے مطابق عمل کرنے سے ملک کا سیاسی نظام مستحکم ہو جائے گا، معیشت مضبوط ہو جائے گی، ملک ترقی کی شاہراہوں پر سرپٹ دوڑنے لگے گا۔

پھر مفاہمتی سیاست کا دور چلا (جو کہ اب بھی جاری ہے۔) ن لیگ اور پی پی شیر و شکر ہوئے رہے، لیکن مفاداتی اتحاد زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا، پھر عوام نے فرینڈلی اپوزیشن کے چرچے سنے، مشرف کے ہاتھوں وزارتوں کا حلف اٹھانے والے وزراء بھی اپوزیشن بن گئے، مگر کھیلے کچھ یوں کہ ”پولے پولے“ بال ہوتے رہے اور مرضی کی بینگ ہوتی رہی، حکومت چلتی رہی، اپوزیشن ہوتی رہی۔ لیکن جب دیکھا کہ اب ہر طرف سے طعنہ زنی شروع ہو چکی ہے، اور جلتی پر تیل کا کام ق لیگ کا حکومت میں شمولیت نے کیا، جب ن لیگ حکومت میں شامل تھی تو سب اچھا تھا۔ یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ موجودہ وفاقی حکومت کے لچھن تو بچے بچے کو معلوم تھے، ایسے میں ن لیگ کے قائد کو کیوں معلوم نہ ہو سکا، کیا وہ عوام کے برابر بھی سوچ نہیں رکھتے؟ دوسرے یہ کہ وہ اب یکدم گرینڈ الائنس کی طرف کیسے پلٹ آئے، وہ تو کسی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کیا ایم کیو ایم یا مولانا فضل الرحمن کی سیاست بھی این آر او کی طرح اپنے گناہ معاف کروا آئی ہیں؟ یا موجودہ حکومت کو گرانے کے بعد پھر نئے دشمن، نئے دوست۔

خدمت کے تین سال

خادم اعلیٰ پنجاب کی کارکردگی ”خدمت کے تین سال“ کے عنوان سے ایکٹ جہازی سائرس کے اخباری اشتہار کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے، یہ اندازہ لگانا تو آسان نہیں کہ اس مہم پر کتنے کروڑ روپے کا خرچہ اٹھا، کہ حکمرانوں کی اشتہاری ”خدمت“ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ایسی مہمات کا وہ اپنے پیش رو سے حساب مانگا کرتے ہیں اور انہیں خوب لتاڑا کرتے ہیں۔ مذکورہ اشتہار میں ’خادم اعلیٰ‘ کی بجائے ’خادم پنجاب‘ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، دس کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں دانش سکول، فری ڈائمنسز، گرین ٹریکٹر سکیم، آشیانہ ہاؤسنگ سکیم، جناح آبادی سکیم، مفت ادویات، پنجاب ایجوکیشنل اینڈومنٹ فنڈ، باصلاحیت طلبہ کو سکالرشپ، تقریری، مضمون نویسی اور کھیلوں کے مقابلے، کروڑوں کے انعامات اور ساؤتھ پنجاب کے انفراسٹرکچر ماڈل ویلج شامل ہیں۔

اس اشتہار میں عوام کو مطلع کیا گیا ہے کہ اگرچہ خادم پنجاب نے صوبے کے عوام کے لئے بے شمار خدمات سرانجام دیں مگر ان کا مرکز غریب عوام کو سہولیات فراہم کرنا تھا، اور اس میں حکومت کو خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اشتہار کے آخر میں ان تمام خدمات کی کامیابی کے بعد ”اپنا روزگار پروگرام“

پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ غریب خاندانوں کو باعزت روزگار مہیا کیا جائے گا، جس کا آغاز چار ارب روپے سے کیا جائے گا، ہزاروں نوجوانوں کو یوکیپ گاڑیاں دی جا رہی ہیں، پاکستانی ساخت کی گاڑیوں کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کو روزگار ملے گا۔ (یوکیپ گاڑیوں کے ساتھ ایکٹ لڑکی کی بھی تصویر ہے، گویا اب پڑھی لکھی لڑکیاں بھی ان گاڑیوں سے مستفید ہو سکیں گی) میاں نواز شریف نے بھی اپنے دور میں ایسی ہی سکیم شروع کی تھی، جس کا انجام ایسا تو نہ تھا کہ اب اس سکیم کو دوبارہ شروع کیا جائے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کارہائے نمایاں میں خادم پنجاب کی دو روپے کی روٹی اور مکینکل تنوروں کا ذکر نہیں کیا گیا، جو مخالفین کی سخت تنقید کا نشانہ بھی بنے، مگر وزیر اعلیٰ نے اسے اپنی سب سے بڑی خدمت قرار دیئے رکھا۔ اس کے لئے ٹاسک فورسز بھی سرگرم عمل رہیں، اشتہاری مہم سے بھی مدد لی گئی۔ روٹی تو دو روپے کی ہی تھی مگر اس پر خرچ کروڑوں روپے ہوتے رہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دو روپے کی روٹی سے صرف غریبوں نے ہی استفادہ نہیں کیا، بلکہ ایسے تنور پر جو بھی گیا سستی روٹی کا حقدار قرار پایا۔ شہروں میں بچی جانے والی یہ سستی روٹی مضافات اور دیہات میں نہیں تھی۔

، ساتھ ہی ساتھ صوبائی حکومت نے ’خصوصی رمضان پیکیج‘ کا بھی اعلان کر دیا ہے

جس میں رمضان المبارک کے دوران اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں استحکام اور معیار برقرار رکھنے کے لئے 1176 پرائس کنٹرول مجسٹریٹ تعینات کئے جائیں گے، جبکہ دو ہزار فیئر پرائس شاپس، 325 سٹے بازار اور پانچ سو دسترخوان قائم کئے جائیں گے۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ نے عام آدمی کی زندگی کی مشکلات، روح اور جسم کے رشتے کے معاملات اور دیگر پریشانیوں کا بھی ذکر کیا۔ اس ٹیکج میں سب سے اہم چیز وہ بارہ سو کے قریب مجسٹریٹ ہیں جو قیمتوں میں استحکام قائم رکھیں گے اور اشیاء کا معیار برقرار رکھیں گے۔

خادم پنجاب کے زیادہ تر کارنامے انفرادی مفاد کے لئے ہیں، یہ چاہے غریبوں کے لئے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ان کی قلیل تعداد ہی ان سے مستفید ہوتی ہے، وزیر اعلیٰ جس طرف رخ کرتے ہیں انتہا کر دیتے ہیں، اعتدال کا رستہ کم ہی اپناتے ہیں، ویسے بھی اس سے قبل پنجاب میں مجسٹریٹ نامی مخلوق کی کمی تھی جو بارہ سو کے قریب مزید بلائیں خزانے پر چھوڑ دی جائیں تاکہ وہی سہی کسر نکل جائے۔ پہلے بھی ہزاروں مجسٹریٹ قومی خزانے سے تنخواہ لیتے، گاڑیوں سے لطف اندوز ہوتے اور عوام کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہوئے اپنے ”فرائض“ کی انجام دہی میں مصروف عمل ہیں۔ اوپر سے ٹاسک فورسز کا قیام بھی عمل میں لایا جائے گا، یوں اگر کوئی چیز عوام کو سستی مل بھی گئی تو خزانے کو وہ نہایت مہنگی پڑے گی، تاہم ان مجسٹریٹوں اور ٹاسک فورسز کے چکر یہیں بن لیگی مقامی رہنماؤں

کے وارے نیا رے
خزور ہو جا مکی کے

مچھلی بھلا پانی کے بغیر کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ اور ایم کیو ایم کی مچھلی تو اقتدار کے سمندر کے سوا کسی پانی کو پسند ہی نہیں کرتی، دریاؤں پر تو اس کی نظر جاتی ہی نہیں، کیونچہر جھیل کا ٹھنڈا میٹھا پانی بھی اسے راس نہیں آتا، اقتدار کے سمندر کا نمکین پانی اس کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ سمندر کے کنارے رہتے رہتے وہ اس کے ایسے عادی ہوئے ہیں کہ اب ”بحر اقتدار“ ہی ان کی زندگی ہے۔

سیاست کے کھیل کا اب یہ اصول سب اصولوں پر حاوی ہو چکا ہے کہ اس کھیل کا کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہیں من مرضی کریں، جب چاہیں جس سے اتحاد کریں، جس وقت چاہیں اسے ختم کر دیں، جب چاہیں اقتدار کو خیر باد کہہ دیں، جب موڈ ہو واپس آجائیں، جب دل کرے اتحادی ہوتے ہوئے بھی واک آؤٹ کر جائیں، دل میں آئے تو ساتھ دینے سے انکار کر دیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب اصولوں کی سیاست ہوتی تھی، ہر کسی کے کچھ نظریات تھے، سوچ بچار کے بعد فیصلے ہوتے تھے، جو جہاں کھڑا ہے کھڑا رہتا تھا، انفرادی طور پر پینتر ابدلنے والے کو ”لوٹا“ کہا جاتا تھا اور معاشرے میں اس کی پوزیشن خراب ہوتی تھی، اب لوٹوں کی بھی اس قدر بہتات ہے کہ کسی کو اپنے لئے پر شرمساری نہیں ہوتی، اور اب انفرادی کے ساتھ پوری پارٹی

ہی ”لوٹی“ بن جاتی ہے، اور کچھ دنوں بعد دوبارہ لوٹ آتی ہے تو کسی کو پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ جمود کا دور تھا اب حرکت کا زمانہ ہے۔

ایم کیو ایم کے بارے میں اب بھی اگر کسی کا خیال ہے کہ وہ نظریاتی یا ایکٹ سنجیدہ سیاسی پارٹی ہے تو خام خیالی ہے، یہ الگ بات ہے کہ لسانی بنیادوں پر یا پھر اکثریتی دھونس کی بنا پر الیکشن میں کامیاب ہو جانا اس کا مقدر ہوا۔ لیکن حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ایم کیو ایم ہر مقتدر طبقے کے ساتھ رہتی ہے، وہ چاہے مشرف ہو، یا ن لیگ اور خواہ پی پی حکومت۔ ان حکومتوں سے سخت نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ اتحاد کی کہانی سمجھ سے بالاتر معلوم ہوتی ہے، مگر مفادات کی سیاست کو مد نظر رکھا جائے تو کوئی بات اجنبی محسوس نہیں ہوتی، اس نوعیت کی سیاست میں ہر کسی سے اتحاد ممکن ہوتا ہے۔

ایم کیو ایم کی قیادت اول تو حکومت میں رہتی ہے، اگر حکومت سے باہر ہوتی ہے تو ملک سے بھی باہر چلی جاتی ہے، ایم کیو ایم کی سیاست عجائبات کا ایک گہرا غار ہے، سالہا سال پہلے انہوں نے اپوزیشن کی سیاست کا ذائقہ چکھا تھا، اس تلخ تجربے کے بعد مخالفت کی سیاست سے تائب ہو گئے۔ اب اقتدار کے اندر بیٹھ کر مخالفت کرتے اور اپنا وزن بڑھاتے ہیں۔ کیا یہ عجوبہ نہیں کہ فوج کی حکمرانی کے خلاف بھی ہیں، عملی میدان میں اس کے دست و بازو بھی، جاگیر داروں

کے خلاف بھڑکیں اور تقریریں کرتے اور ایوانوں میں ان کا ساتھ دیتے ہیں؟ اور یہ کیا کم عجبہ ہے کہ برس برس سے اقتدار کی عیاشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، سندھ کا گورنر پاکستان کی تاریخ میں طویل ترین دورانیے کا حامل ہے، لیکن 'قیادت' پاکستان نہیں آتی، ٹیلی فونک خطابات سے ہی کام چلایا جا رہا ہے، حتیٰ کہ گورنر نے بھی دباؤ بڑھانے کے لئے استعفیٰ دیا اور باہر چلے گئے، اگر ایم کیو ایم کی حکومت میں دوبارہ واپسی نہ ہوتی، تو عشرت العباد باقی زندگی لندن کے کسی عشرت کدے میں ہی گزارتے۔

ایم کیو ایم کے اس فیصلے کے "خطرات" موجود تھے، کیونکہ اب بچہ جان چکا ہے کہ یہ مچھلی اقتدار کے پانی سے باہر نہیں رہ سکتی، لیکن مقام حیرت ہے کہ میاں نواز شریف کو اس حقیقت کا ادراک نہ جانے کیوں نہیں ہوا؟ ویسے بھی میاں صاحب نہ پی پی کے فطری اتحادی ہیں اور نہ ہی ایم کیو ایم کے، مگر پی پی کی دشمنی میں انہوں نے ایم کیو ایم کی حکومت سے ناراضگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، میاں صاحب نہ جانے کس قسم کے مومن ہیں جو اس قسم کے سوراخوں سے بار بار ڈسے جاتے ہیں، یا یہ تصور کر لیا جائے کہ یہاں ہر سیاسی جماعت کا ایک ہی اصول ہے، کہ اقتدار کا حصول اور بے اصولی کا دامن پوری قوت سے تھامے رکھو۔

اپنی وزیر خارجه حنار بانی کھر بھارت کیا گئیں کہ چار سو 'حنار' کی خوشبو نے ڈیرے ڈال دیئے، بھارتی میڈیا نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے محترمہ کی شخصیت کو فوکس کئے رکھا۔ بھارتی چینلز نے ان کی کم عمری، ان کے لباس، بیگ، دوپٹہ اوڑھنے کے انداز، جیولری، اور انگوٹھیوں پر تبصرے کئے اور ان کی مناسبت سے گانوں کا انتخاب کر کے انہیں بار بار ٹی وی چینلز پر دکھاتے رہے، بھارتی اخبارات میں نہ صرف ان کی نمایاں تصاویر شائع ہوئیں، بلکہ بعض اخبارات نے انہیں ٹائٹل کی زینت بھی بنایا۔ موصوفہ نے ایل کے ایڈوانی اور ان کی فیملی سے بھی ملاقات کی، اس موقع پر ایڈوانی نے کہا کہ "ہمیں حنار کی خوشبو پسند ہے۔" بھارتی میڈیا نے حنار بانی کھر کو "پاکستان کا بہترین چہرہ" اور ایک ہندی اخبار نے انہیں "ماڈل نما وزیر" بھی قرار دیا۔ جس خبر نے پاکستانی اخباروں میں بھی الگ جگہ پائی وہ بھی اپنی جگہ اہم تھی، جب پاک بھارت وزراء کے باضابطہ مذاکرات کے موقع پر دونوں وزراء خارجه میڈیا کے سامنے آئے اور انہوں نے گرمجوش مصافحہ کیا، بھارتی وزیر خارجه پاکستانی وزیر خارجه کا ہاتھ اتنی دیر تک اپنے ہاتھ میں لے کر ہلاتے

رہے کہ حنا کھرنوس ہو گئیں، کہا جاتا ہے کہ کرشنا کا تجربہ حنا کھر کی عمر سے بھی زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ ایس ایم کرشنا کی عمر 80 سال اور حنا ربانی کھر 34 برس کی ہیں، اگرچہ بعض اوقات تجربہ ذہانت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، لیکن جہاں تجربہ بھی ہو اور عیاری بھی، وہاں ذہانت بھی بے بس ہو سکتی ہے۔

حنا ربانی کھر کے مصافحہ پر سنی اتحاد کے چیئرمین اور ایم این اے صاحبزادہ فضل کریم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ ہاتھ ملا کر اسلامی اقدار کی توہین کی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی جوان عورت کی کسی غیر محرم مسلمان مرد سے ہاتھ ملانے کی گنجائش ہے، پابندی صرف ہندو کے ساتھ ہاتھ ملانے پر ہے۔ دیگر علمائے کرام یا مذہبی رہنماؤں کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟ اس پر شاید انہوں نے تبصرہ نہیں فرمایا، اگر ایسا ہوا تو ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے کہ روشن خیالی کی چوٹیں سہ سہ کر علماء حضرات خود بھی کسی حد تک روشن خیال ہو گئے ہوں، اور اس قسم کی مصافحہ جاتی سرگرمیوں پر انہیں کوئی اعتراض نہ رہا ہو۔

ہم حیران ہیں کہ ایک ایم این اے مولانا کو ہندوؤں سے ہاتھ ملانے پر اس قدر اعتراض ہے کہ اسلامی اقدار کی توہین ہو جاتی ہے، تو جناب انہوں نے تو یہی توہین ابھی یہودیوں کے ساتھ ہاتھ ملا کر بھی کرنی ہے، ابھی عیسائیوں کے ساتھ

بھی ہاتھ ملائے جائیں گے اور کرشنا جیسی سرگرمی کے ساتھ ہی ملائے جائیں گے۔ تب ہمارا ایمان نہ جانے کس سطح پر ہوگا، ہو سکتا ہے کہ بات بڑھنے سے ہمارے علماء بھی سرگرم ہو جائیں اور اس مصافحہ بازی کے خلاف نئی تحریک ہی جنم لے لے، حکومت جو کہ پہلے ہی طرح طرح کے مسائل کا شکار ہے، باقی کام چھوڑ کر اس تحریک کو ناکام کرنے میں جت جائے۔

ابھی تو بات صرف مصافحہ تک ہی محدود ہے، عربوں میں تو رخسار بھی رخسار کے ساتھ ملانے کا رواج ہے، کئی ممالک میں اگر مزید گرمجوشی کا مظاہرہ کر دیا گیا تو بات معائنہ تک بھی پہنچ سکتی ہے، لیکن کیا کریں، رسم دنیا اور موقع و دستور کو بھی دیکھنا پڑتا ہے، زمانے کی چال کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام مراعل سے ویسے ہی گزرا جائے جیسے رسم دنیا ہے۔ اب بھی اگر مغرب پاکستان پر دہشت گردی اور بنیاد پرستی جیسے الزامات لگائے تو یہ رویہ سراسر اس کی بدینتی پر مبنی ہوگا، کیونکہ حنار بانی کھر جہاں بھی جائیں گی، ہر سو خوشبوئیں پھیل جائیں گی، یہی ہماری روشن خیالی کی دلیل ہے۔

مچھلی بھلا پانی کے بغیر کب تک زندہ رہ سکتی ہے؟ اور ایم کیو ایم کی مچھلی تو اقتدار کے سمندر کے سوا کسی پانی کو پسند ہی نہیں کرتی، دریاؤں پر تو اس کی نظر جاتی ہی نہیں، کیونچہر جھیل کا ٹھنڈا میٹھا پانی بھی اسے راس نہیں آتا، اقتدار کے سمندر کا نمکین پانی اس کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ سمندر کے کنارے رہتے رہتے وہ اس کے ایسے عادی ہوئے ہیں کہ اب ”بحر اقتدار“ ہی ان کی زندگی ہے۔

سیاست کے کھیل کا اب یہ اصول سب اصولوں پر حاوی ہو چکا ہے کہ اس کھیل کا کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہیں من مرضی کریں، جب چاہیں جس سے اتحاد کریں، جس وقت چاہیں اسے ختم کر دیں، جب چاہیں اقتدار کو خیر باد کہہ دیں، جب موڈ ہو واپس آجائیں، جب دل کرے اتحادی ہوتے ہوئے بھی واک آؤٹ کر جائیں، دل میں آئے تو ساتھ دینے سے انکار کر دیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب اصولوں کی سیاست ہوتی تھی، ہر کسی کے کچھ نظریات تھے، سوچ بچار کے بعد فیصلے ہوتے تھے، جو جہاں کھڑا ہے کھڑا رہتا تھا، انفرادی طور پر پینتر ابدلنے والے کو ”لوٹا“ کہا جاتا تھا اور معاشرے میں اس کی پوزیشن خراب ہوتی تھی، اب لوٹوں کی بھی اس قدر بہتات ہے کہ کسی کو اپنے لئے پر شرمساری نہیں ہوتی، اور اب انفرادی کے ساتھ پوری پارٹی

ہی ”لوٹی“ بن جاتی ہے، اور کچھ دنوں بعد دوبارہ لوٹ آتی ہے تو کسی کو پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ جمود کا دور تھا اب حرکت کا زمانہ ہے۔

ایم کیو ایم کے بارے میں اب بھی اگر کسی کا خیال ہے کہ وہ نظریاتی یا ایکٹ سنجیدہ سیاسی پارٹی ہے تو خام خیالی ہے، یہ الگ بات ہے کہ لسانی بنیادوں پر یا پھر اکثریتی دھونس کی بنا پر الیکشن میں کامیاب ہو جانا اس کا مقدر ہوا۔ لیکن حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ایم کیو ایم ہر مقتدر طبقے کے ساتھ رہتی ہے، وہ چاہے مشرف ہو، یا ن لیگ اور خواہ پی پی حکومت۔ ان حکومتوں سے سخت نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ اتحاد کی کہانی سمجھ سے بالاتر معلوم ہوتی ہے، مگر مفادات کی سیاست کو مد نظر رکھا جائے تو کوئی بات اجنبی محسوس نہیں ہوتی، اس نوعیت کی سیاست میں ہر کسی سے اتحاد ممکن ہوتا ہے۔

ایم کیو ایم کی قیادت اول تو حکومت میں رہتی ہے، اگر حکومت سے باہر ہوتی ہے تو ملک سے بھی باہر چلی جاتی ہے، ایم کیو ایم کی سیاست عجائبات کا ایک گہرا غار ہے، سالہا سال پہلے انہوں نے اپوزیشن کی سیاست کا ذائقہ چکھا تھا، اس تلخ تجربے کے بعد مخالفت کی سیاست سے تائب ہو گئے۔ اب اقتدار کے اندر بیٹھ کر مخالفت کرتے اور اپنا وزن بڑھاتے ہیں۔ کیا یہ عجوبہ نہیں کہ فوج کی حکمرانی کے خلاف بھی ہیں، عملی میدان میں اس کے دست و بازو بھی، جاگیر داروں

کے خلاف بھڑکیں اور تقریریں کرتے اور ایوانوں میں ان کا ساتھ دیتے ہیں؟ اور یہ کیا کم عجبہ ہے کہ برس ہا برس سے اقتدار کی عیاشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، سندھ کا گورنر پاکستان کی تاریخ میں طویل ترین دورائے کا حامل ہے، لیکن 'قیادت' پاکستان نہیں آتی، ٹیلی فونک خطابات سے ہی کام چلایا جا رہا ہے، حتیٰ کہ گورنر نے بھی دباؤ بڑھانے کے لئے استعفیٰ دیا اور باہر چلے گئے، اگر ایم کیو ایم کی حکومت میں دوبارہ واپسی نہ ہوتی، تو عشرت العباد باقی زندگی لندن کے کسی عشرت کدے میں ہی گزارتے۔

ایم کیو ایم کے اس فیصلے کے "خطرات" موجود تھے، کیونکہ اب بچہ جان چکا ہے کہ یہ مچھلی اقتدار کے پانی سے باہر نہیں رہ سکتی، لیکن مقام حیرت ہے کہ میاں نواز شریف کو اس حقیقت کا ادراک نہ جانے کیوں نہیں ہوا؟ ویسے بھی میاں صاحب نہ پی پی کے فطری اتحادی ہیں اور نہ ہی ایم کیو ایم کے، مگر پی پی کی دشمنی میں انہوں نے ایم کیو ایم کی حکومت سے ناراضگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، میاں صاحب نہ جانے کس قسم کے مومن ہیں جو اس قسم کے سوراخوں سے بار بار ڈسے جاتے ہیں، یا یہ تصور کر لیا جائے کہ یہاں ہر سیاسی جماعت کا ایک ہی اصول ہے، کہ اقتدار کا حصول اور بے اصولی کا دامن پوری قوت سے تھامے رکھو۔

زوال، گراؤ اور قحط الرجالی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ ملتان میں وزیر اعظم کے ایک صاحبزادے کے بارے میں بینرز آویزاں کئے گئے ہیں جن میں موصوف کو جنوبی پنجاب کے علاقوں پر مشتمل نئے صوبے کا وزیر اعلیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ صوبہ کب بنے گا، اس کا نام کیا ہوگا، اس وقت اس کی سیاسی صورت حال کیا ہوگی؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں، مگر خوشامد کے ایسے ایسے ماہرین معاشرے میں موجود ہیں، جو حکمران طبقے کی مطلوبہ نبض پر ہاتھ رکھنے کے ہنر سے خوب آشنا ہیں۔ اتنی سطحی اور بے تکی خوشامد سے اگر عوام کو کراہت کا احساس ہو تو ہو، خوشامد کرنے اور کروانے والوں کے چہروں پر تمارت کے آثار ضرور ظاہر ہوئے ہونگے۔

وزیر اعظم کا وہ صاحبزادہ جسے 2008ء کے قومی انتخابات میں ملتان کے لوگوں نے اپنے ووٹ کا اہل نہ جانا تھا، اور اسے والد گرامی کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد رحیم یار خان سے الیکشن لڑنے اور جیتنے کا موقع مل گیا، کسی نااہل یا ناپسندیدہ انسان کا باپ جب کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جائے تو اس کی ناخجار اولاد بھی تمیں مار خان بن جاتی ہے۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ عبدالقادر گیلانی کے ساتھ بھی ہوا، رحیم یار خان سے جیت کے بعد اس کے ڈیرے ملتان میں

ہی ہیں، اس کا چچا بھی بہت ہی خاص الیکشن کے ذریعے پنجاب اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اب اختیارات کا بھوت اس خاندان کے سر پر یوں سوار ہے کہ 'اختیارات ہیں اور ہم ہیں دوستو'۔ ان دو ممبران صوبائی اسمبلی پر ہی کیا موقوف، یہاں خاندان کا ہر فرد اپنی ذات میں 'وزیر اعظم' ہے، اختیارات کے اعتبار سے، پروٹوکول کے اعتبار سے، خوشامد پسندی کے حساب سے، مستقبل کی امیدوں کے لحاظ سے۔ جلالپور پیر والہ جیسے سب تحصیل قصبے میں پاسپورٹ بنانے کی سہولت موجود ہے، جبکہ یہ فریضہ صرف ڈیوٹرئل ہیڈ کوارٹر پر ہی سرانجام دیا جاتا ہے۔ اس قصبے پر دیگر خصوصی عنایات کی وجہ یہی ہے کہ یہاں سے برادر خورد نے الیکشن لڑا اور مشکل سے جیتا تھا، اب یہی ایم پی اے بھائی ملتان میں عملاً ڈپٹی وزیر اعظم بھی ہے۔

اس قسم کی خوشامد کی روایت ہمارے پورے معاشرے میں فروغ پذیر ہے، ایوان صدر سے لے کر ایک عام ممبر اسمبلی تک، ہر کوئی اپنی اولاد کو اس منفعت بخش کاروبار میں اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا ہے۔ اور تو اور پاکستان کے اعلیٰ ترین اور غیر جانبدار منصب، سربراہ مملکت کا تاج سر پر سجانے والے آصف علی زرداری نے تو اقتدار کو دوام بخشے کے لئے اپنی اولاد کی نسل میں ہی

مضحکہ خیز تبدیلی کا اعلان کر دیا، حیرت ہے، اس اعلان ”تبدیلی نام“ کو کس طرح ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا گیا، کیا تاریخ میں ایسی کوئی روایت موجود ہے، جس میں ایک فرد ایک ہی وقت میں دو قوموں کا نمائندہ ہو؟ اگر کسی شخص کی شادی اپنی برادری یا قبیلے سے باہر ہوئی ہے تو اولاد کو والد کے نام اور قبیلے سے ہی جانا جاتا ہے، مگر پاکستان کی حکمران پارٹی کے چیئرمین بھٹو بھی ہیں اور زرداری بھی۔ اس حکومت کے دیگر عجوبوں کی طرح یہ بھی ایک عجوبہ ہی ہے۔

اب سیاست نے خدمت سے زیادہ کاروبار کا روپ دھار لیا ہے، اس لئے سیاستدانوں کی اولادیں بھی والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کاروبار میں منافع کے جدید سے جدید طریقے تلاش کریں گی، گویا اب ہمارے مقدر کے فیصلے بلاولوں، حمزہ شہبازوں، مونس الہیوں، عبدالقادر گیلانیوں اور اسی طرح کے دیگر جانشینوں کے زرخیز اذہان کیا کریں گے، کیونکہ ان کے علاوہ ملک میں کوئی قیادت کے اہل ہی نہیں۔ اب فیصلہ عوام نے کرنا ہے کہ نااہل ٹھیکیداروں کو آگے لانا ہے، یا اہل خدمت گاروں کو؟ خوشامد پرستوں اور خوشامد پسندوں کو آگے لانا ہے یا میرٹ پر کام کرنے والوں کو؟

پنجاب میں نئے صوبوں کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا ہے، ملتانى وزیراعظم آئے روز سرانیکى صوبہ كى خوشخبرى سنانا اپنا فرض منصبى سمجھتے ہیں، انہوں نے یہ ڈیوٹی گزشتہ برس ہی سنبھالی ہے، حكومتى ترجمانى كا فریضہ با بر اعوان اور فردوس عاشق اعوان نے بھی نبھانے كا فیصلہ كیا ہوا ہے، اب وہ بھی سرانیکى صوبہ كو آئینى تقاضا قرار دے رہے ہیں، اور مسلم لیگ ق نے تو پی پی حكومت كے ساتھ تعاون ہی جنوبى پنجاب كو صوبہ بنانے كى شرط پر كیا ہے۔ یہ سرانیکى صوبہ كے نام سے بنتا ہے یا جنوبى پنجاب یا كسى اور نام سے، اس كى تو كسى كو خبر نہیں، لیكن اب شور ایسا اٹھا دیا گیا ہے كہ كوئى اور بات سنائى نہیں دیتى۔

پی پی حكومت اور ق لیگ نے آخر اس صوبہ كو كدم اس شدت سے اہم ترین مسئلہ كیوں بنا لیا ہے؟ اس كى سب سے بڑى وجہ تو یہی نظر آتى ہے كہ مسلم لیگ ن چونكہ پنجاب میں كسى بھی نئے صوبے كى مخالف ہے، اس لئے پی پی اور ق لیگ نے وہى كام كرنا ہے جس سے ن لیگ كو ذہنى تكلیف ہو۔ ق لیگ كى وفاقى حكومت میں شمولیت بھی اسی سلسلے كى ایکٹ كڑى ہے، (ن لیگ كے قائد بھی اسی قسم كے شوق فرمانے كے عادى ہیں) پنجاب چونكہ آبادى كے لحاظ سے پاکستان كا سب سے بڑا

صوبہ ہے، اس لئے یہ ملکی سیاست پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجاب میں ن لیگ کی مقبولیت کا گراف بہر حال دوسروں سے بہتر ہے۔

گزشتہ دو برس سے صوبوں کی تحریک میں ایسے ہی جان آگنی ہے جیسے صحرا میں بارش کے بعد زندگی لوٹ آتی ہے، اور بے جان ریت سبزے کا منظر پیش کرنے لگ جاتی ہے۔ بہت سی جماعتیں یا تو بہاول پور صوبہ کی بحالی کی حامی تھیں یا پھر سرائیکی صوبہ کی، مگر ن لیگ کے ممبران اسمبلی اور کارکن کسی بھی واضح حکمت عملی کے اعلان سے گہ نراں تھے، مقامی قیادت یا ان کے کارکنان اندر سے تو صوبوں کے حامی ہیں، مگر اپنی مرکز قیادت کے فیصلے کی وجہ سے وہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، میاں برادران صرف خاموش ہی نہ تھے بلکہ موقع ملنے پر مخالفانہ بیان دے کر اپنے جذبات کا اظہار بھی کر لیتے تھے، ابھی گزرے ہفتے ہی میاں شہباز شریف نے اپنے دوسرے وطن لندن میں یہ جذباتی بیان جاری کیا ہے کہ وفاقی حکومت اپنی کرپشن کو چھپانے کے لئے صوبوں کا شوشہ چھوڑ رہی ہے۔

مگر جب میاں برادران نے دیکھا کہ اب صوبوں کی ہوا ایک طوفان کا روپ دھار رہی ہے، اور ممکن ہے کہ اس طوفان میں سب کچھ بہہ جائے تو اب ن لیگ کی ایک خصوصی کمیٹی نے بھی انتظامی لحاظ سے صوبوں کے قیام کی حمایت کر دی ہے، اور

کہا ہے کہ لسانی بنیادوں پر ہونے والے کسی ایسے کام کی حمایت نہ کریں گے۔ گویا ان لیگ بھی اس اٹھائے گئے طوفان کی نذر ہو گئی۔ اب صوبے بنانے کا مرحلہ آئے گا، آئین میں گنجائش ہے، مگر جس صوبہ میں دوسرا بنے گا، اس کی اسمبلی سے اور پھر ایوان زیریں اور بالا سے دو تہائی کی اکثریت سے اس کی منظوری دی جائے، تو یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔

کس اسمبلی میں کس کے پاس یہ اکثریت ہے، کب یہ مطلوبہ اکثریت حاصل ہوگی، اور کب یہ صوبے وجود میں آئیں گے، بہاول پور کا مقدمہ مختلف بیان کیا جاتا ہے، کہ وہ نیا نہیں، بلکہ اس کی تو صرف بحالی کا مرحلہ درپیش ہوگا، مگر حکمران اگر سرائیکی صوبہ بنانا چاہتے ہیں، تو بہاول پور صوبہ کا کیا بنے گا؟ گویا یہ صوبوں کے نعرے کا آسان نہیں، ان کے لئے قانونی جنگ بھی لڑنی پڑے گی اور حق کے لئے سڑکوں پر بھی آنا پڑے گا۔ دیکھئے حکمران نعروں کی سیاست کرتے ہیں یا ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے؟ اور صوبے بننے کی صورت میں ان علاقوں کے لوگوں کو کوئی ریلیف بھی ملے گا یا یہ روایتی سیاستدانوں کے چنگل میں ہی الجھے رہیں گے؟

جائیں تو جائیں کہاں؟

اصولی بات یہی ہے کہ عوام کے ووٹوں سے جو حکومت بھی معرض وجود میں آئے، وہ اپنی آئینی مدت پوری کرے، کیونکہ عوام سے ووٹ لیتے وقت یہ بات ہر کسی کے پیش نظر ہوتی ہے کہ جو لوگ منتخب ہونگے وہ حکومت بنائیں گے، اور وہ حکومت پانچ سال کے لئے ہوگی۔ بد قسمتی سے پاکستان میں اب تک صرف دو اسمبلیوں کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع میسر آیا ہے، ایک جمہوری دور تھا اور دوسرا آمریت کا زمانہ، ورنہ دیگر اسمبلیوں کو تو ڈیڑھ سے تین سال کی مدت کے اندر ہی اندر اپنے مفادات اور ذاتی مخالفت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور انہیں مختلف الزامات لگا کر رخصت کر دیا گیا۔ قوم نے موجودہ حکمرانوں کو بھی مینڈیٹ دیا ہے کہ وہ اپنا حق حکمرانی ادا کریں، ملک و قوم کی فلاح کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائیں، اور ملک کو خوشحالی کی راہ پر لے چلیں، ان کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے منشور کی روشنی میں عوام کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھیں، ان کی تعلیم اور صحت کے بہترین مواقع فراہم کریں، عوام کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری نبھائیں، ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسی منصوبہ بندی کریں جس

کی بنیاد پر ملک آنے والے سالوں میں ایک ترقی یافتہ ریاست بن کر سامنے آئے۔
 گزشتہ الیکشن میں عوام نے بہر حال ان جماعتوں کے امیدواروں کو ووٹ کے اعتماد سے
 نوازا تھا جو اس وقت حکومتی اتحاد میں شامل ہیں، لیکن ملک میں جو حالات اب پیدا
 ہو چکے ہیں، ان کی مثال اس سے قبل کے ادوار میں شاید نہ ملے۔ تقریباً ساڑھے تین
 سال کے عرصہ میں حکومتی سطح سے ایسا کوئی اقدام نظر نہیں آیا جو بجلی کی لوڈ شیڈنگ
 میں کمی کا باعث ہو، گویا حکومت نے اتنے بڑے بحران کے بارے میں بھی شاید کبھی
 سنجیدگی سے غور نہیں کیا، کیونکہ حکمرانوں کو احساس ہی نہیں کہ عوام لوڈ شیڈنگ کے
 عذاب سے کس طرح نبرد آزما ہو رہے ہیں، اس کی وجہ سے انہیں کن کن مسائل کا
 سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کیونکہ خود ان کے عشرت کدے لوڈ شیڈنگ نامی بلائے ناگہانی سے
 محفوظ ہیں۔

مہنگائی کا عالم یہ ہو گیا ہے کہ اب رمضان المبارک میں اگر کوئی اپنے بچوں کے دباؤ میں
 آ کر پھل خریدنے بھی چلا جائے تو اول تو خالی ہی واپس آ جائے گا یا پھر ایک آدھ
 سیب، چند دانے انگور دو تین امرود اور اسی طرح دیگر پھلوں میں سے بھی خوشہ چینی
 کرتا، آدھا کلو پھل شاپر میں ڈالتا، سر جھکاتا، نظریں چراتا گھر پہنچ جائے گا، جہاں فروٹ
 چاٹ کا ذائقہ تبدیل کرنے اور اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اس کے پاس وافر
 پھل ہوتا ہے، آدھا پاؤ کھجور لاکر بھی اسے

اونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے، کیونکہ فی زمانہ ایسی چیزیں بچوں کی پہنچ سے دور ہی رہنی چاہئیں۔

بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ کے علاوہ ان کی قیمتوں میں اضافہ اب روز کا معمول بن گیا ہے، عوام کو یہ چیزیں تو نہیں ملتیں، لیکن ان کے بھاری بل مل جاتے ہیں، ایک بل ادا نہ کر سکنے کے بعد دوسرے بل کے موقع پر میٹر کاٹ دیا جاتا ہے، جبکہ وزیر اعظم سے لے کر بہت سے سرکاری ادارے واپڈا کے کروڑوں کے مقروض ہیں، نہ ان کے کوئی میٹر کاٹا ہے، نہ انہیں ریکوری کے سلسلہ میں جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ پٹرول کی قیمتوں کا جن حکومت کے بس سے بھی نکل چکا ہے، ڈیزل پٹرول سے بھی بازی لے گیا، اب حکومت سی این جی گیس کے پیچھے پڑی ہے، اس کی پوری کوشش ہے کہ گیس کی قیمت بھی پٹرول کے برابر آجائے، امید ہے حکومت اس معاملہ میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

اب حکومت پر عوام کی طرف سے کئے گئے اعتماد کے پر خچے اڑائے جا رہے ہیں، مینڈیٹ کی مکمل توہین ہو رہی ہے، اگر اصول یہ تھا کہ حکومت پانچ سال پورے کرے، تو اصول یہ بھی ہونا چاہیئے کہ حکومت بھی عوام سے کئے گئے وعدے پورے کرے، اگر وعدے پورے نہیں ہوتے تو گویا ووٹ لے کر خدمت کرنے کا معاہدہ معطل ہو گیا۔ لیکن اگر موجودہ حکمرانوں کو رخصت کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ یہاں تو ہر

آنے والا ہر جانے والے سے زیادہ غاصب ثابت ہو رہا ہے۔ قوم اکی دور اسے پرکھڑی

سرچیٹ رہی ہے، کوئی راستہ بچھائی نہیں دیتا۔

معاملہ نام کی تبدیلی کا

ویسے تو پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا خادم ہونے کی بنا پر میاں شہباز شریف کی ہر بات پر یقین کر لینا اخلاقی تقاضا ہے، لیکن میاں صاحب اگر اپنی بات کو مزید باوزن بنانے کے لیے رمضان المبارک کو گواہ بنا کر کوئی بات کریں تو اس پر یقین کرنا واجب ہو جاتا ہے، انہوں نے بہاول پور میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”میں رمضان المبارک کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ زردای غریب عوام کو لوٹ کر ساری رقم سوئٹزر لینڈ منتقل کر رہے ہیں۔“ انہوں نے حسب روایت جذباتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں، میں جانتا ہوں یہ کہاں سے آرہی ہیں۔

شہباز شریف نے سب سے جذباتی اور دلچسپ بات یہ کہی کہ ”اگر ہم اس ملک میں انصاف قائم نہ کر سکے اور ان چوروں سے لوٹا گیا پیسہ نکلوا کر غریب لوگوں کے قدموں میں نچھاور نہ کیا تو میرا نام شہباز شریف نہیں ہوگا۔“ انہوں نے کہا کہ ”سرکاری فنڈز اشتہارات پر خرچ کرنے کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں، یہ فنڈز عوامی فلاح و بہبود پر خرچ کئے جائیں گے“

درِ دل کے اظہار کے جتنے اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں، وزیر اعلیٰ پنجاب ان میں مہارت رکھتے ہیں، ان کی گفتگو سے قوم کا غم اور کرب واضح محسوس کیا جاسکتا ہے، سننے والا ان کے نظریات پر رشک کرتا ہے، مگر جب ان کی باتوں اور عمل کو دیکھتے ہیں، تو عجیب تضاد کی صورت حال سامنے آتی ہے۔ وہ اپنی اکثر تقریروں میں انقلاب کی نوید سناتے بھی پائے جاتے ہیں، وہ قوم کو خبر دیتے ہیں کہ کوئی وقت آنے کو ہے جب غریب عوام حالات سے ننگ آکر جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے، اور امراء کے معاملات پر چڑھ دوڑیں گے، ان کو ختم کر دیں گے اور ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیں گے۔

خونی انقلاب اور امراء کے خس خاشاک کی طرح بہہ جانے کی خبر تو وہ دیتے ہیں، مگر یہ نہیں، سوچتے کہ خود ان کا اپنا ”میرٹ“ بھی بنتا ہے، جب پوری قوم انقلاب کے نام پر باہر سڑکوں پر نکل آئے، روزگار ختم ہو چکا ہو، بھوک کا بے رحم رقص ہر طرف جاری ہو، تو کیا انقلاب اس لئے رک جائے گا کہ وہاں کے باسی وزیر اعلیٰ نے انقلاب کی نوید سنائی ہوئی تھی، کیا عوام کچھ معاملات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور کچھ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ وہاں رہنے والے ایک صاحب نے انقلاب کی حمایت کا اعلان کر رکھا تھا، بلکہ پیش گوئی کر رکھی تھی۔ کسی نے تبصرہ کیا تھا کہ جسے خود انقلاب کی ضرورت ہے وہ انقلاب برپا کرنے کے لئے بے تاب ہے، بلکہ قائد انقلاب ہے۔

رمضان المبارک کو گواہ بنا کر قوم کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ زرداری غریب عوام کا پیسہ
 لوٹ کر سوئٹزرلینڈ منتقل کر رہے ہیں، جناب عالی! آپ تو ایک ذمہ دار فرد ہیں، اتنی
 بڑی گواہی کی کیا ضرورت تھی، آپ کے فرمودات عالیہ پر یقین کرنا رعایا پر واجب
 ہے۔ اگر زرداری ایسا کر رہے ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ موجودہ وفاقی حکومت کی جڑیں
 لگانے اور اسے پھلنے پھولنے تک آپ کی جماعت نے بھی اس کی خوب آبیاری کی تھی،
 حتیٰ کہ آپ کے وفاقی وزیر نے ایوان صدر جا کر اسی آمر مشرف کے ساتھ حلف اٹھایا
 تھا، کس کس طریقے سے زرداری حکومت کو سہارا نہیں دیا تھا۔ کیا ان لیگ ماضی کے
 معاملات سے بے خبر تھی؟ دوسری اور تلخ بات یہ بھی ہے کہ میاں نواز شریف کا لندن
 میں کاروبار کس پیسے سے چل رہا ہے، کیا انہیں بھی واپس لانے کا بندوبست ہوگا؟
 نام تبدیل کرنے کی خبر پریشان کن ہے، ہم بھی اس دن سے سوچ رہے ہیں، کہ شہباز
 شریف کا نیا نام کیا ہوگا، پہلے تو وہ اسم با مسلمی تھے، ہر پیل محو پرواز رہنا ان کی فطرت تھا،
 اب چونکہ انہوں نے انصاف فراہم کرنے اور لوٹا ہوا مال واپس لینے میں ناکامی کی
 صورت میں اپنا نام ہی تبدیل کرنے کا اعلان کیا ہے، تو حالات ایسے ہیں کہ وہ اپنے
 مشن میں کامیاب ہوتے نظر نہیں آتے، ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا نیا نام ”خادم حسین“ ہی
 رکھ لیں۔ رہی بات اشتہارات

والی، تو اگر یہ گناہ کبیرہ ہے تو عوام روز ہی یہ گناہ کبیرہ ہوتے دیکھتے ہیں، کہ پنجاب

حکومت کی طرف سے اشتہارات کا مومن سون عروج پر ہے۔

سب کا یہی خیال تھا کہ 'قائد تحریک' کوئی ایسا تیر چلائیں گے، جو ایک ہی جست میں کئی شکار کر لائے گا۔ یہ خیال خام بھی نہ تھا کہ اپنے 'پروگرام' کے آغاز میں ہی موصوف نے وضاحت کر دی تھی کہ آج میں ثبوت کے ساتھ بہت اہم باتیں کروں گا، یہ خبر بھی دے دی تھی کہ 'خبر' اور تبصروں کے لئے میں نے الگ الگ پلندے رکھ رکھے ہیں۔ الطاف حسین نے تین گھنٹے تو گفتگو کی، اس میں بے شمار تیر بھی چلائے، شو منی قسمت کہ وہ تیر نشانے پر نہیں لگے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تیر ہوا میں ہی چلائے گئے تو بے جا نہ ہوگا۔

ناظرین کو شروع میں ہی اطلاع کر دی گئی تھی، کہ ہمیں جھوٹ اور فراڈ پر مبنی تاریخ پڑھائی جاتی رہی، اگر مقرر کی بات کو سچ مان لیا جائے تو حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قوم سے بولا جانے والا یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے، کیونکہ قوم کا بچہ بچہ جھوٹ کی اس مٹی سے گندھا ہے جس میں ابتدائی کلاس سے اسے بتایا گیا کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔۔۔ لا الہ الا اللہ"

اب اگر 'قائد تحریک' نے نئی تحقیق فرمالی ہے اور نئے حقائق ڈھونڈ نکالے

ہیں تو وہ بھی قوم کے سامنے لائے جانے ضروری ہیں، اگر ان کی تحقیق درست ہے تو پھر قوم کو بتایا جائے کہ اس کے ساتھ اس درجہ 'دھوکہ' کیوں کیا گیا، دو نمبر طریقے سے اس کے جذبات کو مذہب کے نام پر کیوں بڑھکایا گیا؟ اور اگر موصوف کی تحقیق کسی اور نظریے پر مبنی ہے تو پھر قوم اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کی تردید کرے۔ ممکن ہے کہ الطاف حسین کی تحقیق میں اس راز سے پردہ اٹھایا گیا ہو کہ قائد اعظم نے کبھی خود یہ نعرہ نہیں لگایا، ہو سکتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو، کیونکہ قائد اعظم ایک سنجیدہ اور باوقار انسان تھے، وہ سیاست میں نعروں، ڈراموں، فنکاریوں اور اداکاریوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، وہ عمل پر یقین رکھتے تھے، تاہم اس علمی بحث میں ہمارے جیسے نیم خواندہ فرد کا الجھنا مناسب نہیں، یہ کام ڈاکٹر صفدر محمود، مجیب الرحمن شامی اور اسی قسم کے دیگر محققین کا ہے جو قائد اعظم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔

پاکستانی قوم پر یہ راز بھی آشکار نہیں ہو سکا کہ 'قائد' کی جو 'پریس کانفرنس' ہرنی وی چینل نے براہ راست سنانی اور دکھانی فرض جانی، اس میں کیا کہا جانا مقصود تھا، اس کا تعلق "پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔ لا الہ

اللہ ” سے کس طرح جوڑا جاسکتا ہے، پاکستانی قوم کو اس نئی بحث میں الجھانے کی کیا ضرورت محسوس کی گئی؟ کیا وہ کراچی میں ذوالفقار مرزا کی لگائی ہوئی آگ سے قوم کی توجہ ہٹانا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اپنی صفائی پیش کی ہوتی۔ الٹا انہوں نے تو ان تمام الزامات کو دوسروں کے کھاتے میں ڈال دیا، جن کا الزام ہمیشہ ایم کیو ایم پر لگتا آیا ہے، خاص طور پر بوری بند لاشوں اور ٹارچر سیلوں کی بانی تو آپ ہی کی جماعت ہے۔ موصوف نے اپنے طویل ”مزاحیہ“ میں اے این پی اور جماعت اسلامی پر بھی کرپشن کے الزامات لگائے، مگر ساتھ ہی احتیاطاً قوم کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ ثبوت وغیرہ مانگنے کے جھمیلوں میں نہ پڑیں کہ یہ ان کے پاس نہیں ہیں، کیا عجب ہے کہ اپنے ارد گرد دستاویزات کے پلندے رکھنے والے مقرر نے دواہم جماعتوں پر الزامات لگائے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ایک بھی ثبوت پیش نہ کیا۔ انہوں نے بے شمار باتیں کیں، مگر وہ اس طرف نہیں گئے جدھر قوم ان کو دیکھنا چاہتی تھی، انہوں نے یہ تو بتایا کہ قرآن پاک علم حاصل کرنے کے لئے ہے، سر پر اٹھانے کے لئے نہیں (عمل کا ذکر نہیں کیا) مگر یہ نہ بتایا کہ ذوالفقار مرزا نے جو باتیں کی ہیں وہ درست تھیں یا پاکستان کے سرکاری تعلیمی نصاب کی طرح فریب اور جھوٹ؟

کالی بھیڑوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی بازگشت پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالتوں میں بھی سنائی دے رہی ہے، کراچی کی افسوسناک صورت حال پر سپریم کورٹ کی کاروائی میں پولیس کا ذکر نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے، اور پولیس کا ذکر ہو تو کالی بھیڑوں کا نام نہ آئے یہ بھی کیسے ممکن ہے؟ نہ جانے کس نے یہ اصطلاح ایجاد کی تھی، اور یہ رنگ بدنامی کے ہی زمرے میں کیوں آتا ہے، بھیڑوں کا عمومی رنگ تو سفید ہی ہوتا ہے، لیکن بھیڑوں میں بھورے اور کالے دھبے بھی ہوتے ہیں، تاہم مکمل طور پر کالی بھیڑیں کم ہی ہوتی ہیں، یہ بھولا سا جانور کالے رنگ میں بھی بھلا لگتا ہے۔

کالی بھیڑوں نے اس قدر نام کمایا ہے کہ اب یہ بھیڑوں کی اصطلاح نہیں رہی، بلکہ اس کا اطلاق انسانوں کے ریوڑوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم زیادہ تختہ مشق دو محکمے بنتے ہیں، ان میں بھی پہلی پوزیشن پولیس کی ہے اور دوسرے نمبر پر محکمہ تعلیم کا نام آتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بہت سے کرپٹ محکموں کا ذکر تک نہیں آتا، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ان میں اب کالی بھیڑیں نہیں پائی جاتیں، بلکہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ ہی کالے ہو چکے ہونگے۔ کالی بھیڑ بہت

سی سفید بھیڑوں میں منفرد تو نظر آتی ہے، مگر اس کو برائی کی علامت بنا دینا مناسب نہیں لگتا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کالی بھیڑیں بیورو کریسی میں کیوں نہیں پائی جاتیں؟ کیا بیورو کریسی میں فرشتے بھرتی ہوتے ہیں، کیا سینئر بیورو کریٹس کی اکثریت کے بچے بیرون ملک تعلیم حاصل نہیں کر رہے، کیا زندگی بھر سرکاری عیاشیوں کے بعد ملازمت سے فراغت بھی ملک کے اندر یا باہر لوٹ مار کے پیسے سے نہیں گزرتی؟ کیا ان کی رقوم بیرون ملک کے بینکوں میں نہیں پڑیں؟ کالی بھیڑوں کا وجود سیاستدانوں میں کیوں نہیں ہوتا؟ کیا سیاستدانوں کی ایک نمایاں تعداد کرپشن میں ملوث نہیں، ملک کی آج تک باگ ڈور سنبھالنے والوں میں دیانتدار افراد کس تناسب میں آئے؟ حساس ادارے ان سے کیسے محفوظ ہیں، کیا ملک میں کرپشن، نااہلی اور غفلت کے مرتکب صرف پولیس اور تعلیم والے ہی ہوتے ہیں؟

بہتر ہو کہ سپریم کورٹ ان کالی بھیڑوں کا بھی از خود نوٹس لے لے، ہر محکمہ کے سربراہ کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے محکمے سے کالی بھیڑیں نکال کر عدالت کے روبرو پیش کرے، یوں کچھ ہی عرصہ میں ملک کالی بھیڑوں سے پاک ہو جائے گا، روز روز کی چیج چیج ختم ہو جائے گی۔ لیکن ایک مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے، کہ اتنی کالی بھیڑوں کا کیا مصرف ہوگا؟ اول انہیں برآمد کر کے اپنے زر

مبادلہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، چونکہ ملک میں اس قسم کی بھیڑیں بڑی بھاری تعداد میں پائی جاتی ہیں، اس لئے اس تجارت سے بھرپور آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ دوم؛ ان کا دوسرا اور بہتر مصرف عید قربان پر ان کی قربانی بھی ہو سکتا ہے، چونکہ عید زیادہ دور نہیں، اس لئے بہت سی کالی بھیڑیں اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس نیٹ کام میں استعمال کی جاسکتی ہیں۔

اس منصوبے پر عمل کرنے سے ایک بہت بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، کہ دیکھتے ہی دیکھتے محکموں کے محکمے خالی ہو جائیں گے، سب سے پہلے پولیس کے محکمے میں کہیں دور دراز ہی کوئی افسر یا سپاہی نظر آئے گا، سکولوں میں کہیں کہیں کوئی استاد ہوگا، بیوروکریٹس بھی تلاش بسیار کے بعد ہی کوئی ملے گا، ممکن ہے کئی محکمے بند ہی ہو جائیں، ظاہر ہے جہاں سفید بھیڑ ہوگی ہی نہیں، اس نے بند تو ہونا ہی ہے۔ امید ہے کراچی سے فارغ ہوتے ہیں عدالت عظمیٰ کالی بھیڑوں کی تلاش کا فریضہ نبھائی گی، کیونکہ ان بلاؤں کا خاتمہ بھرپور ریاستی طاقت کے بغیر ممکن نہیں، یہ الگ بات ہے کہ کالی بھیڑوں نے مضبوط نیٹ ورک قائم کر رکھے ہیں۔

لیجئے جناب ! اب جنوبی پنجاب سے ایک اور قائد اعظم برآمد ہونے کو ہے، اس سے قبل ایک تو اصلی والے قائد اعظم تھے، جنہوں نے پاکستان بنایا اور زندگی نے ان کے ساتھ وفانہ کی اور شاہینوں کا یہ نشیمن زراغوں کے تصرف میں آگیا۔ قائد اعظم کے بہت بعد میاں نواز شریف تجارت سے ہوتے ہوئے سیاست میں آئے اور وزیر سے وزیر اعلیٰ بنے اور وزیر اعلیٰ سے وزیر اعظم، تب ان کے کسی زرخیز ذہن رکھنے والے مشیر یا ان کے کسی مخلص دانشور نے انہیں ”قائد اعظم ثانی“ کا خطاب عنایت فرما دیا، جسے میاں صاحب نے تو نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ شرف قبولیت بخش دیا، مگر یہ خطاب قبولیت عام حاصل نہ کر سکا۔

ملتان وزیر اعظم نے ملتان کے قریب موٹر وے کا ’سنگ بنیاد‘ رکھتے ہوئے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا، یہاں ہم ان کے ارشادات پر بات نہیں کریں گے، بلکہ ان کے جلسہ میں جو خطابات ہوئے ان میں سے چند خوشے چنیں گے، کہ بعض باتیں خود ہی ابھر کر قلم کا دامن تھام لیتی ہیں اور کالم کا موضوع بن جاتی ہیں۔ سابق وفاقی وزیر قیوم جتوئی جو کہ سابق ناظم ضلع بھی ہیں، نے اپنے خطاب میں جوش خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ وزیر اعظم گیلانی نے علاقے

کی پس ماندگی ختم کرنے کے لئے یہاں بے پناہ ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا ہے، اب اگر وہ اس علاقے کو صوبائی حیثیت دینے کا اعلان کر دیں تو ہم انہیں اس خطے کے قائد اعظم کا خطاب دے دیں گے۔ حیرت کی بات ہے کہ وزیر اعظم نے اتنے بڑے خطاب کے بعد بھی سرائیکی صوبے کے قیام کا فوری اعلان نہیں کیا۔

بیان پڑھ کر ہمیں گہری سوچوں نے اپنے آہنی حصار میں لے لیا، کہاں قائد اعظم اور کہاں یہ وزیر اعظم؟ کہاں اصولوں کی سیاست، کہاں یہ لوٹوں کا دور اور مفاہمت کی سیاست؟ کہاں دیانتداری کی انتہا، کہاں کرپشن میں بدنامی کا عروج؟ کہاں صدیوں آگے تک دیکھنے والی نگاہیں، کہاں اپنے پیٹ سے پرے کچھ بھی نظر نہیں آتا؟ کہاں قومی مفاد کے لئے اپنی صحت بھی قربان کر دینا، کہاں ذاتی مفاد میں اپنے خوشامدیوں کو نوازنے کا کلچر؟ کہاں قومی خزانے کی ایکٹ ایکٹ پائی کو قوم کی امانت سمجھنا، کہاں قومی خزانے کو مال غنیمت جان کر لوٹ مار کا بازار گرم رکھنا؟ کہاں حالت بیماری میں ایک نرس کی سفارش بھی نہ کرنا اور کہاں سفارش کی بنا پر کرپٹ مافیا کو اپنے ارد گرد جمع کرنا اور قوم کے سروں پر مسلط کرنا۔

قیوم جتوئی کا یہ جذبہ حیرت ناک ہی نہیں، افسوس ناک بھی ہے، ان کے اس بیان سے گیلانی کا قد بڑا نہیں ہوا، کہ محدود سوچ، محدود علاقے اور محدود بصیرت

والے لوگ عہدوں کے بل پر تو جہاں بھی پہنچ جائیں، درحقیقت ان کا قد اتنا ہی رہتا ہے۔ جنوئی کے اس بیان سے قائد اعظم کی توہین ہوئی ہے، گویا اب یوسف رضا گیلانی بھی ”قائد اعظم“ ہوا کریں گے۔ آصف زرداری بھی مظفر گڑھ کا چکر لگا کر کچھ مراعات کا اعلان کر جائیں تو وہ بھی ’قائد اعظم‘ قرار پایا جائیں گے، بلاول زرداری کو مستقبل کا قائد اعظم کہا جاسکے گا، اس صورت میں عبدالقادر گیلانی کا بھی حق بنتا ہے کہ اسے بھی ابا جان کے بعد جنوبی پنجاب کا قائد اعظم ہی کہا جائے۔ ستم تو یہ ہے کہ ’قائد‘ تو کوئی پیدا نہیں ہوا البتہ قائد اعظم وافر تعداد میں مل رہے ہیں۔

جلسہ میں دوسری اہم بات یہی ہوئی کہ ہر مقرر نے زور دے کر کہا کہ حاضرین کی تعداد دیکھ کر فلاں کی آنکھیں کھل جانی چاہیئیں، کیوں نہ ہو کہ سرکاری خرچ پر قرب وجوار کے تمام اضلاع سے بسیں بھجوا کر جلسے کے حاضرین اکٹھے کرنے والے، سرکاری وسائل کا بے دریغ استعمال کرنے والے اس قسم کے دعوے کیا ہی کرتے ہیں، اور یہ بھی کہ فلاں صاحب چار سو بسوں کے قافلے کے ساتھ شریک ہوئے، اگر ہر لیڈر کئی سو بس لایا تو پھر جلسے کی حاضری لاکھوں میں ہونی چاہیئے تھی، مگر ”قائد اعظم“ کے جلسے میں چند ہزار لوگ تھے، ان میں سے اکثر سرکاری اور باقی بھی آئے ہوئے کم، لائے گئے زیادہ۔

ہم پتھر کے زمانے میں جانے کو ہیں، اس جدید سائنسی دور میں ہم سا بھی کوئی ہوگا، جو آگے کی بجائے پیچھے کو جاتا ہے؟ آج سے دس برس قبل امریکہ نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ افغان جنگ میں ہمارا ساتھ دو ورنہ 'پتھر کے زمانے' یں چھپنا دئیے جاؤ گے، ہم پتھر کے زمانے سے گھبرا گئے، ہم نے امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور خود کو پتھر کے زمانے میں جانے سے بچا لیا۔ لیکن کیا خبر تھی کہ دس سال بعد ہم نے وہ وقت دیکھنا ہے جس کی ہمیں دشمن نے دھمکی دی تھی، اس وقت تو اتنی گنجائش تھی کہ اگر ساتھ دو گے تو بچ جاؤ گے، مگر اب تو کسی نے کوئی دوسری گنجائش رکھی ہی نہیں اور نہ ہی ہمیں کسی شرط پر اس قدیم زمانہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔

ہمیں اندھیرے تاریک غاروں میں دفن کیا جا رہا ہے، لیکن ہمارا قصور نہیں بتایا جاتا، ہمیں دنیا کی سہولتوں سے محروم کیا جا رہا ہے مگر ہمیں اس کی وجہ نہ یہ بتائی جاتی، ہمیں لوڈشیڈنگ کے عذاب سے دوچار کیا جا رہا ہے لیکن اس کی کوئی وضاحت ضروری نہیں جانی جاتی۔ پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ ڈیم میں پانی کی سطح خطرناک حد تک کم ہو گئی ہے، اس لئے بجلی کی پیداوار میں کمی قدرتی امر ہے، یار لوگ اس دلیل کو سن کو خاموش ہو رہتے تھے کہ خدائی کاموں میں عمل

داخل ممکن نہیں تھا، مگر اب کیا دلیل ہے کہ پورا ملک ہی ڈیم کی صورت ہے، اور ڈیم بھی ایسا کہ کناروں سے ابل رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بجلی بنانے والی کمپنیوں کو بلوں کی ادائیگی نہیں کی جا رہی جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے، کیا انصاف ہے کہ عوام میں سے کسی غریب کا بل دوسرے مہینے میں داخل ہو جائے تو ان کو بجلی منقطع کر دینے کی نہ صرف خبر سنائی جاتی ہے بلکہ محکمہ کے اہلکار اوزار اٹھائے میٹر کاٹنے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور بڑے بڑے اداروں اور مخصوص افراد کے بل لاکھوں کو بھی پہنچ جائیں تو کوئی پوچھتا نہیں۔

بجلی کی قیمتوں کو دیکھیں تو آسمان سے باتیں کر رہی ہے، چند روز کے بعد ہی قیمتوں میں اضافے کی خبر سنا کر مظلوم عوام کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اگر اس قیمت میں بجلی چوبیس گھنٹے موجود رہے اور عوام بے احتیاطی کے ساتھ اس کا استعمال کرتے رہیں تو کچھ ہی مہینوں میں عوام کی ایک معقول تعداد بجلی کے میٹروں سے ہاتھ دھو بیٹھے گی، تب وہ مستقل قسم کی لوڈ شیڈنگ کے نظارے دیکھیں گے۔

بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے نتائج سے یقیناً حکمران بھی آگاہ ہوں گے، اگرچہ حکمرانوں کو ایک مخصوص حصار میں رہتے ہوئے بہت سے گھمبیر معاملات سے بے خبر

رکھا جاتا ہے، لیکن یہ لوگ آتے تو عوام میں سے ہی نا، یہ الگ بات ہے کہ مسند اقتدار پر بیٹھ کر ان کا دل و دماغ عوامی مسائل و مصائب سے نا آشنا ہو جاتا ہے۔ جدید دور میں جہاں بجلی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلا جاسکتا، عوام ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار میں بیٹھے ہیں، انتظار کی گھڑیاں اس قدر طویل ہو چکی ہیں کہ شیڈول نامی کسی چیز کا اب کوئی ذکر ہی نہیں، گھنٹوں کا حساب کتاب اب پرانی باتیں ہیں، اب پہروں کا تصور ابھر رہا ہے، نئی نسل کو پہروں کا اندازہ ہی نہ ہوگا۔ اب کاروبار بند، روزگار ختم، کارخانے ناکارہ، اب ہر چیز اس قدر مہنگی ہو جائے گی کہ قوت خرید وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گی۔

پتھر کے زمانے کا ہم نام تو بہت آسانی سے لے لیتے ہیں، مگر تب یہ سہولتیں نہ تھیں، قناعت پسندی تو اب بھی ہو سکتی ہے، اب بھی ہم اچار اور چٹنی سے روٹی کھا سکتے ہیں، پیاز کا یہاں ذکر نہیں کہ اس کی قیمت دوبارہ محو پرواز ہے (تھوڑا کھالیں گے، بھوک) کاٹ لیں گے، مگر ہم اپنے گھر کا کرایہ کہاں سے دیں گے؟ دودھ کا بل کیسے پورا ہوگا؟ دیگر ضروریات کا کیا بنے گا؟ پتھر کے زمانے میں اس قدر کمرشل ازم نہیں آیا تھا، مگر اب ہر انسان کا بال بال ماحول کی مجبوریوں میں جکڑا ہوا ہے، واپسی ناممکن ہے، اب بچے بھوک مریں گے تو لوگ ان کو کھانے کو دوڑیں گے جن کے پاس ہر آسائش موجود ہے، تب انقلاب آئے گا، وہی خونی انقلاب جس کا تذکرہ خادم پنجاب سمیت مختلف لوگوں سے سنتے ہیں، جس کا

سب کو انتظار ہے، کیا جانے کہ یہ انقلاب اسی لوڈ شیڈنگ کی تاریکیوں سے ہی پھوٹ
پڑے؟

اب لوڈ شیڈنگ نہ ہوگی

ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ بجلی بحال ہو چکی ہے، ہر لمحے دھڑکا سا لگا رہتا ہے، اب گئی کہ اب گئی، مگر اب وہ نہیں جاتی، اسی طرح واپڈ کے اہلکاروں کی عادت ایسی پختہ ہو چکی ہے کہ ان کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ہی مین سوئچ کی طرف بڑھ جاتا ہے، اسے آف کرنے کے بعد خیال آتا ہے کہ لوڈ شیڈنگ تو ختم ہو چکی ہے، یوں گئی ہوئی بجلی دو چار منٹ میں واپس آ جاتی ہے۔ اللہ کرے، یہ روشنیاں اسی طرح قائم رہیں اور پاکستان اور پاکستانی قوم کا مستقبل بھی اس روشنی سے چمکتا دمکتا رہے، آمین۔

بجلی کی بحالی میں حکومت کی منصوبہ بندی میں کچھ کمی رہ گئی ہے، تاہم کچھ عرصہ سے حکومت نے بجلی کی قیمت میں اضافہ کا سلسلہ شروع کیا ہے، اب اس پروگرام کو زور و شور سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ خبر آئی ہے کہ ایک سو یونٹ بجلی استعمال کرنے والوں کا ریٹ 6.40 روپے فی یونٹ ہوگا، تین سو سے سات سو یونٹ خرچ کرنے والوں کو بجلی 10.55 روپے فی یونٹ ملے گی اور سات سو سے اوپر بجلی خرچ کرنے والے 14.50 روپے فی یونٹ بجلی حاصل کر سکیں گے، خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حکومت بجلی پر سبسڈی مکمل طور پر ختم کرنا چاہتی ہے، جس کی بنا پر قوم کو مندرجہ بالا قیمتیں ادا کرنا ہوگی۔ یاد رہے

کہ یہ قیمتیں مستقل نہیں، بلکہ دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ترقی کرتی جائیں گی۔
 اگر حکومت اول روز سے ہی اس پروگرام پر عمل کرتی تو عوام کو بجلی کے بحران کا سامنا نہ
 کرنا پڑتا (بجلی کے بحران کا اثر عوام پر ہی پڑتا ہے، کیونکہ خواص کے ہاں تو لوڈ شیڈنگ
 ہوتی ہی نہیں)۔ اب سارا دار و مدار حکومت کی ہمت پر ہے کہ وہ کس قدر تیزی سے بجلی
 کی قیمتوں میں اضافہ کرتی ہے، یہ ماہانہ بنیادوں پر بھی ہو سکتا ہے، اور اس کا ایک بہترین
 طریقہ یہ بھی ہے کہ جب اضافہ کیا جائے اس اضافے کا اطلاق پچھلے جنوری یا جولائی سے
 کر دیا جائے، اس اضافے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنا سرکاری اخراجات کا ٹیکس کاٹ کر بجلی
 بنانے والوں کو رقوم کی ادائیگی ہو سکتی ہے، اس صورت میں لوڈ شیڈنگ سے نجات مل
 جائے گی۔ حکومت کے اس اقدام سے قوم دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی، ایک وہ
 لوگ جو ہر قیمت ادا کر سکتے ہیں، اور دوسرے وہ جن کی آمدنی کی حدیں مقرر ہیں اور
 وہ ان سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اگر غریب یا غریب نما لوگ زیادہ قیمتوں کا شور کریں
 گے، یا اس پر احتجاج کرنے کی کوشش کریں گے، تو قریب ہی سے بہت سے لوگ ان کی
 مخالفت میں نکل آئیں گے کہ شکر کرو بجلی موجود تو ہے، اگر یہ بھی نہ ہوتی؟ کم بجلی خرچ
 کر لو وغیرہ وغیرہ۔ بجلی کی قیمتوں میں انتہائی اضافہ کر کے اس سے ایک یہ فائدہ بھی
 حاصل ہوگا کہ بجلی کی کھپت میں کمی ہو جائے گی

کیونکہ اس کا استعمال اتنا ہی کم ہو جائے گا جتنی اس کی قیمت بڑھے گی۔

دوسری طرف جھنگ سے خبر آئی ہے کہ ایک نوجوان انجینئر نے ٹیوب ویل کے پانی سے سستی ترین بجلی بنانے کا دعویٰ کیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ نہروں کے بہتے ہوئے پانی سے بھی بجلی تیار کی جاسکتی ہے، اس نے ایک پراجیکٹ کی لاگت 25 لاکھ روپے بتائی ہے، جس سے بیس سے تیس میگاواٹ بجلی تیار کی جاسکتی ہے، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس نے صوبائی سیکریٹری انرجی اور سرکاری انجینئروں کی موجودگی میں ٹیوب ویل کے پانی سے بجلی بنا کر دکھائی ہے، جسے کامیاب تجربہ قرار دیا گیا، مگر اس کے باوجود حکومت کی طرف سے مکمل خاموشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہ صرف ایک انجم رفیع کی کہانی نہیں، پاکستان میں بے شمار ایسے ٹیکنکل لوگ موجود ہیں جو مختلف وسائل سے بجلی بنانے کے دعویدار ہیں، مگر انہیں وسائل کی ضرورت ہے، وہ حکومتی سرپرستی کے طلبگار ہیں، اگر ایسے لوگوں کی سرپرستی کی جائے، یا آسان قسطوں پر قرضے دیئے جائیں، یا حکومت خود ان لوگوں کی خدمات حاصل کر لے تو چھوٹے پیمانے پر ہی بجلی کی پیداوار شروع ہو جائے اور ملک بجلی کی خود کفالت کی طرف گامزن ہو جائے، مگر کیا کیجئے کہ یہاں تو ایسے نوجوانوں کو یہ خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے کہ اس نے کارِ سرکار میں مداخلت کی ہے (یا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے)، کیوں نہ اس کے خلاف دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے؟

بلاول زرداری کے اغوا کا منصوبہ؟

پیپلز پارٹی کی طرف سے کسی ”یوم تشکر“ یا اسی قسم کی کسی خوشی کی کوئی خبر سامنے نہیں آئی، نہ ہی کسی پارٹی رہنما نے رحمان ملک کو شاباش دی ہے۔ ہوتا تو یہ کہ خوشی کے اس موقع پر پوری پارٹی سرشاری میں سڑکوں پر نکل کھڑی ہوتی اور اپنے پارٹی چیئرمین کی سلامتی پر اظہار مسرت کرتی، مگر کیا کیجئے کہ مسائل اور ایشوز ہی اس قدر ہیں کہ بعض اوقات اہم معاملات بھی یاد نہیں رہتے۔ یہ بھی ممکن ہے پارٹی اس پر مسرت موقع پر کسی جشن کا اہتمام کر رہی ہو، جو عنقریب ملک بھر میں منایا جائے۔

رحمان ملک کے پاس ضرور کوئی جادو کی چھڑی ہے، جس کی بنا پر وہ حکومت میں مضبوط اور مقبول ترین وزیر ہیں، نہ ان کی عوام میں جڑیں ہیں، نہ ان کا کوئی حلقہ انتخاب ہے، نہ تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا ہوا ہے، نہ انہیں پاکستان کے اندرونی معاملات میں کوئی دلچسپی نظر آتی ہے۔ لیکن جو بھی ہو، نہ صرف ان کی وزارت کو کوئی خطرہ نہیں بلکہ کاروبارِ مملکت و حکومت چلانے کے لئے ان کے مشوروں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ محترمہ بے نظیر زرداری لندن میں انہی کے ’غریب خانے‘ پر سیاسی ڈیرہ داری فرمایا کرتی تھیں، یقیناً پارٹی کے لئے ان کی اپنی ملازمت کے زمانے میں بھی خدمات ہو گئی، ہو سکتا

ہے کہ ان خدمات اور تعلقات کے علاوہ بھی ان کی رسائی کسی مزید بڑی طاقت تک بھی ہو۔

وزارت داخلہ کا سربراہ ہونے کے ناطے رحمان ملک اہم وزیر ہیں، ملک میں امن و امان کی ذمہ داری بھی انہی کے کندھوں پر ہے، اتفاق ایسا ہے کہ ملک کے اس قدر گھمبیر حالات اس سے قبل کبھی نہ ہوئے تھے، لیکن اس پریشان کن صورت حال میں بھی رحمان ملک کو کسی نے پریشان نہ دیکھا ہوگا، یہی ایک اچھے لیڈر کی خوبی ہوتی ہے۔ ان کی آنیاں جانیاں دیکھیں تو صبح کراچی ہیں تو شام اسلام آباد، رات دہلی ہیں تو اگلی صبح کوئٹہ۔ امن و امان کا جائزہ لیں تو حالات جوں کے توں، مصروفیت بھرپور، نتیجہ صفر۔ رحمان ملک نے قوم کو اطلاع دی کہ بلاول زرداری کو اغوا کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا، جس کا قبل از وقت پتہ چلا کر حفاظتی انتظامات کر لئے گئے ہیں، یہ منصوبہ القاعدہ کی ایک ذیلی تنظیم اور طالبان نے مل کر شمالی علاقہ جات میں بنایا تھا، اس کے علاوہ بھی طالبان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وی آئی پیز کو اغوا کر سکتے ہیں، ہم ان کے منصوبے خاک میں ملادیں گے، اس اطلاع کے بعد کراچی میں سیکورٹی کے سخت ترین انتظامات کئے گئے ہیں۔ رحمان ملک نے یہ انکشاف بھی کیا کہ شہباز تاثیر بھی پاک افغان سرحد کے قریب ہی اغوا کاروں

کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا بلیک واٹر سے تعلق ظاہر ہو جائے تو مجھے سرعام پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

آئے روز ایسی خبریں اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ دہشت گرد فلاں علاقے میں داخل ہو چکے ہیں، حیرت تو اس وقت ہوتی ہے، جب وزارت داخلہ دہشت گردوں کے روانہ ہونے کا علاقہ، ان کے ٹارگٹ کا علاقہ اور وقت بھی بتا دیتی ہے، اور تو اور دہشت گردوں کی شکلیں اور عمریں تک بھی بتا دی جاتی ہیں۔ اگر رحمان ملک کی وزارت اتنی ہی متحرک اور سراغ رساں ہے جو واردات سے قبل ہی اس کا منصوبہ جان لیتی ہے تو آج تک پاکستان میں واردات کرنے والا کوئی دہشت گرد کیوں نہیں پکڑا گیا؟ اگر انہیں پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے تو دہشت گردی کے واقعات کیوں ہو رہے ہیں؟ ان حالات میں دہشت گردوں کا قبل از وقت قلع قمع کیوں نہیں کیا جاتا؟ دراصل یہ ایک طریقہ واردات ہے، جب کسی کی سیکورٹی زیادہ کرنے کی عیاشی کا موڈ بنا، دہشت گردی کے حملے کے منصوبے کا انکشاف کر کے سیکورٹی بڑھادی۔

اب رحمان ملک کو ڈاکٹریٹ کی ایک اور اعزازی ڈگری ملنی چاہیے، کیونکہ انہوں نے اپنی پارٹی کے چیئرمین کو اغوا ہونے پچالیا ہے، اب تو رحمان ملک کو پی پی کا تاحیات وزیر داخلہ بنا لینا چاہیے، لیکن حیرت ہے کہ پی پی والوں

نے اپنے چیرمین کے اس نو عمری میں اس خطرناک مصیبت سے بچ نکلنے پر کسی خوشی کا
اظہار کیوں نہیں کیا، ممکن ہے ذوالفقار مرزا کے قول کے مطابق پی پی کارکنان بھی
رحمان ملک سے سچ کی زیادہ توقع نہ رکھتے ہوں اور اس خبر کو بھی ایک روایتی سرگرمی
! جان کر خاموش ہوں

ہماری قوم ”مولا جٹوں“ کے کردار سے اس قدر متاثر ہے، کہ جب تک کوئی سیاسی رہنما بڑھک سے کام نہیں لیتا، قوم اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی۔ ہر پارٹی میں وہی فرد زیادہ مقبول ہے جو زیادہ بڑھکیں مار سکے، زیادہ نمک مصالحے والے بیانات دے سکے اور مخالفین کو آڑے ہاتھوں لے سکے۔ ہر پارٹی نے ایسے افراد خاص طور پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں، اگرچہ بعض اوقات ایسے لوگ اپنے قائدین کے لئے مسائل بھی پیدا کر دیتے ہیں، تاہم عمومی طور پر یہ ہر پارٹی کا سرمایہ ہیں۔ پی پی کے باہر اعوان اور فردوس عاشق اعوان (یہ حسن اتفاق ہی ہے کہ پی پی نے مخالفین کے جوابات دینے کی ذمہ داری اعوانوں پر ہی ڈال رکھی ہے) پنجاب حکومت نے یہ اہم فرض رانا ثناء اللہ کو سونپا ہوا ہے، ایم کیو ایم کے تو خود قائد ہی سب پر بھاری ہیں۔

ربع صدی ہوتی ہے کہ پنجاب کی سیاست میں میاں نواز شریف کی صورت میں ایک جرنیلی نرسری میں ”جمہوری“ کونیل پھوٹی تھی، گورنر جیلانی سے ہوتے ہوئے ان کی رسائی ضیاء الحق تک ہو گئی، اور پھر دورِ روایتی حریف ایسے مقابل ہوئے کہ 26 برس گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں، درمیان میں کیا کیا حادثے رونما ہوئے، کیا کیا قیامتیں گزریں، کتنی جمہوری حکومتوں کا قتل عام ہوا،

عوام کی رائے کا کتنی مرتبہ خون بہایا گیا۔ مشرقی مارشل لاء بھگتنا پڑا، اور میاں، برادران مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے کی بجائے قوم اور اپنی پارٹی کو بے آسرا چھوڑ کر سعودی مملات میں سکونت پذیر ہو گئے، سوائے حکمرانی کے انہیں دنیا جہان کی نعمتیں دستیاب تھیں۔

۱۹۹۹ء تک اگر جمہوریت کا پودا تناور درخت نہیں بن سکا تو اس میں ۱۹۸۵ء کسی دوسرے یا تیسرے کا نہیں خود انہی دو پارٹیوں کا ہاتھ تھا جو آج بھی ایک دوسرے کے مقابل ہیں، انہوں نے اس وقت بھی اپنی جھوٹی اناؤں کی خاطر کبھی دوسرے کی اکثریت کو قبول نہ کیا، ایک حکومت بنتے ہی دوسرے نے اس کو گرانے کے لئے تمام حربے استعمال کئے، ادھر سے خواب بکھیر کر حکومتیں گرتی رہیں اور ”ہر کم آمد عمارت نو ساخت“ پر عمل کرتی رہیں، نہ ملک نے ترقی کی، نہ قوم کو استحکام نصیب ہوا، اور نہ ہی جمہوریت بی بی کی کوئی خدمت ہو سکی۔ ۱۵ برس یہ دونوں (حکمران) پارٹیاں صرف ایک دوسرے کو نیچا کھانے کے لئے ہی اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لاتی رہیں، یہی ان کا سب سے بڑا مقصد حکمرانی تھا۔

تاریخ خود کو دہرا رہی ہے، شاید ایک آمر کا مقابلہ درپیش تھا کہ دونوں ”جمہوری“ پارٹیوں نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا اور ایک فوجی آمر کے مقابلے میں متحد ہو گئے تھے۔ اس کے ملک بدر ہو جانے کے بعد یہ مفاداتی اتحاد

تو چند روز بھی نہیں چلا، شیر و شکر ہو جانے والے ایک دوسرے سے دور ہوئے اور اب آمنے سامنے ہیں۔ اب ایک بار پھر میدان سچ گیا ہے، فریقین تیروں، تلواروں، نیزوں اور شیروں سے مسلح ہو کر میدان میں اتر چکے ہیں، فی الحال تمام تیروں کو رخ اسلام آباد کی طرف ہے، ”ایوان صدر میں بیٹھا ہوا شخص ” ان کا نشانہ ہے۔ دوسری طرف وہ ”شخص“ مفاہمتی سیاست کا دعویدار ہے، مگر کبھی کبھی اس کے اندر کا پرانا دشمن جاگ جاتا ہے اور وہ بھی زہر میں بجھے تیر برسانے سے گہر نہیں کرتا۔

زمانہ ترقی کر چکا ہے، اب ایک دوسرے کو کوٹنے، الزامات لگانے، لکارنے، دھڑلے چٹکھانے کا زمانہ نہیں، دلیل سے قائل کرنے کا زمانہ ہے، قوم کی توانائیوں کو مثبت، انداز میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے، عوام کو آگاہی دینا سیاستدانوں کا فرض ہے، قوم کو بتایا جائے کہ حکومت میں فلاں فلاں خرابیاں ہیں، ان کے مظالم گنوائے جائیں، اور قوم کے سامنے اپنی وہ خدمات بیان کی جائیں جو اپنے دور حکومت میں سرانجام دی ہیں۔ تاکہ عوام جذبات اور ٹکراؤ کی سیاست کی بجائے عقلی دلیل کی بنا پر فیصلہ کر سکیں کہ اگلے الیکشن میں ہم نے حکمرانی کا تاج پہنا کر کس کو اقتدار کے ایوانوں میں بھیجنا ہے۔

تعلیمی بورڈز اصلاح احوال کی ضرورت

بھلا کون کافر کمپیوٹر کی افادیت کا منکر ہو سکتا ہے، اس کی اہمیت و ضرورت مسلمہ ہے، موجودہ زمانے میں کمپیوٹر کے بغیر کاروبار حیات ادھورا ہے۔ لیکن جہاں حساب کتاب کی بات ہو اور جہاں بہت سے کوائف کو جمع کرنا ہو، وہاں کمپیوٹر لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ خادم پنجاب نے بجا طور پر پنجاب کے تعلیمی بورڈوں کے امتحانی نظام میں مزید جدت لانے کے لئے کمپیوٹر کی مدد سے امتحان لینے اور ان کا نتیجہ تیار کرنے کا حکم صادر کیا۔ ان کے مزاج کو سمجھنے والے کسی سمجھدار نے انہیں بریف کیا کہ کس طرح کمپیوٹر کے ذریعے سارے امتحانی نظام کو شفاف بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی بریفنگ کارگر ثابت ہوئی اور بورڈوں کو عمل کرنے کا پابند کر دیا گیا۔

انٹر کے امتحان میں جو ہنگامہ ہوا، وہ نہم کے امتحان میں بھی ہو سکتا تھا، کیونکہ بچوں کا نتیجہ اسی قسم کا تھا جیسا کہ اب آیا ہے، کسی بورڈ کا نتیجہ 26 فیصد سے اوپر نہ گیا، مگر بچے ابھی بچے تھے، احتجاج کا خیال نہ آیا، اگر آیا بھی تو ان کے لئے اس درجہ اہتمام سے اکٹھے ہونا آسان نہ تھا۔ حتیٰ کہ اس بڑے پیمانے پر ری چیکنگ کا رجحان بھی پیدا نہ ہوا، اگر کسی نے ہمت کی

بھی تو 750 روپے فی پرچہ فیس بھری اور دوسروں کے گناہ کی سزا اپنے سر لی، یعنی غلطی کسی اور کی اور خرچہ کسی اور کا۔ لیکن یہ منزل بھی کسی کسی نے سر کی۔ اب اگر انٹر والوں نے ہمت کر کے احتجاج کیا ہے تو حکومت کو خود سوچنا چاہیئے کہ نہم والوں کا مستقبل کس جرم کی پاداش میں خراب کیا گیا ہے؟

فطرت کی روایت یہی ہے کہ زینہ زینہ چڑھ کر چھت تک پہنچا جائے، ایکٹ ہی جست میں ایسا ممکن نہیں ہوتا، چند ماہ کا بچہ یکا ایکٹ چلنے اور بھاگنے نہیں لگتا، ہر کام کے لئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے، ریاضت اور محنت سے کامیابی کی منزلیں خود ہی قریب ہو جاتی ہیں، ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ اپنے خادم پنجاب جو منصوبہ بھی بنالیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ایکٹ سال کا کام ایکٹ ماہ میں ہو جائے، دانش سکول ہوں یا لاہور کا فلائی اوور یا کوئی ماڈل بازار، ہر کام کو وہ فوری مکمل کروانا چاہتے ہیں، جس کے نتیجے میں تعمیر کا معیار قائم نہیں رہ سکتا، پوری انتظامیہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوتی ہے، اور ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے سے اخراجات میں بے حساب اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔

بورڈوں کی اس بڑی ناکامی میں کرپشن کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بورڈوں کے کرتا دھرتاؤں نے ناقص کاغذ خریدنا، جہاں بچوں کی طرف سے لگائے گئے دائرے کی روشنائی کو کمپیوٹر نے اٹھایا ہی نہیں، کیونکہ ان

کاغذوں پر سیاہی پھیل گئی جسے اٹھانے سے کمپیوٹر نے انکار کر دیا، سستے داموں کاغذ خریدنے والے معاملے پر بھی تمام بورڈوں میں کرپشن کی تحقیق ہونی چاہیے۔ پیپروں کے بعد والی محنت میں میڈیا کے ہتھے بہاول پور بورڈ کا ایکٹ ملازم چڑھ گیا، جو ایک سینئر میں بیٹھ کر پیپر چیک کر رہا تھا، اس کی خبریں آنے کے باوجود اس نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا، نہ ہی اسے کچھ کہا گیا۔ بورڈوں کی فیس میں بھی سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں کے بچوں میں سگی اور سوتیلی کا سافرق روار کھا جاتا ہے، کیا پرائیویٹ سکولوں کے بچے پنجاب کے باسی نہیں، کیا وہ تمام کے تمام ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کیا سرکاری سکولوں کے تمام بچے غریب ہی ہوتے ہیں؟

ہوتا یہ کہ پہلے بورڈز میں کمپیوٹر جاننے والے بھرتی کئے جاتے، پھر سٹوڈنٹس کو فارم آن لائن دیئے جاتے، پاؤں پاؤں چلتے بچے دو تین امتحانوں میں پورے نظام سے آگاہ ہو جاتے، جو کئی رہ جاتی ساتھ ساتھ دور ہوتی جاتی، مینول نتیجہ بھی تیار ہوتا، ہر بورڈ کو آزادی دی جاتی کہ وہ اپنا رزلٹ بنا کر لاہور بھیج دیتا، جس سے کام تقسیم بھی ہو جاتا اور ذمہ داری کا احساس بھی رہ جاتا، مگر انقلابی سوچ کے حامل جذباتی لوگوں کا کیا کجیئے کہ جذباتی فیصلے کرنے کے عادی لوگ اکثر غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اب جن صاحب کی وجہ سے اس سال انٹر کے ہی نہیں انہم کے رزلٹ بھی خراب ہوئے ہیں، اور وہ شخص کروڑوں روپے

کما کر گھر جا چکا ہے، کیا اس کی چھٹی کر دینا ہی اس کی کافی سزا ہے، کیا لاکھوں سٹوڈنٹس کا مستقبل تاریک کر کے اپنی تجوریاں بھرنے والے سے بچوں سے اکٹھا کیا گیا روپیہ واپس نہیں لیا جانا چاہیے؟ کیا خادم پنجاب کو اس بہت بڑے واقعے کے بعد راتوں رات تبدیلی لانے کی روش تبدیل نہیں کرنی چاہیے؟

عین ممکن ہے کہ اب بھی کچھ دانشور انھیں اور اپنے نوجوان ہیروز کے لئے نرم گوشہ اختیار کرنے کا حکم نامہ مشورہ جاری فرمادیں، کیونکہ جب کبھی یہ ’معصوم نوجوان‘ میدان میں شکست سے دوچار ہو جائیں تو انہیں قوم اور بعض دانشوروں کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے شک انسان خطا کا پتلا ہے، مگر کچھ غلطیاں ناقابل برداشت ہو جائیں اور معافی کی سرحدیں پار کر جائیں تو سزا ضروری ہو جاتی ہے۔ کرکٹ اتا منافع بخش ”کاروبار“ بن چکا ہے جس کا عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا، ان ہیروز کی لاکھوں روپے تنخواہ ہوتی ہے، اور ہر میچ کا معاوضہ الگ ادا کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ ان حضرات کا ”کاروباری اور مظہر مجیدی بندوبست“ اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ ہم ایک جذباتی قوم ہیں، خوش ہوتے ہیں تو فریق ثانی کو سر پر بٹھا لیتے ہیں، ناراض ہوتے ہیں تو نفرتوں کی آخری حدوں تک پہنچ جاتے ہیں، اگر کسی کھلاڑی سے کبھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ ہو گیا تو اس کو صدر اور وزیراعظم اپنے منسلکات یہاں مدعو کرتے ہیں، انواع و اقسام کے کھانوں سے تواضع کی جاتی ہے، انعامات و اکرام سے نوازا جاتا ہے، اعزازات عنایت کئے جاتے ہیں۔ پذیرائی کا

یہ عمل رکھنے کا نام نہیں لیتا، حکومتی عہدیداروں کے بعد مختلف سرکاری یا نیم سرکاری عہدے حرکت میں آتے ہیں، لاکھوں روپے کیش انعامات دیتے ہیں، پھر ”مختار“ حضرات بھی اس نیکی کے کام میں چند لاکھ روپے ڈال کر ثواب دارین کے ”مستحق“ قرار پا جاتے ہیں۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اعلیٰ کارکردگی دکھانے والا کھلاڑی کروڑ پتی بن جاتا ہے، (حالانکہ عموماً ہمارے کرکٹر کروڑ پتی ہی ہیں)۔

کوئی بھی کھلاڑی جب نام کما لیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ ملک کا نام روشن کرنے کے لئے تن من کی باری لگا دے گا، یا لگا رہا ہے، (دھن کا اس میں کوئی ذکر نہیں) اب بھی بہت سے کھلاڑی ایسا ہی سوچتے اور کرتے ہوں گے، مگر جب سے کرکٹ نے کھلاڑیوں کو کروڑ پتی بنانا شروع کیا ہے، تب سے حب الوطنی نامی چڑیا کہیں دانہ چگنے چلی گئی ہے، اب اوپر سے دعویٰ وہی ملک کی خدمت ہی ہوتا ہے اور اندر سے مال بناؤ پروگرام پر عمل کیا جاتا ہے، خالی عزت کی اہمیت کم ہو چکی ہے، بلکہ عزت کا معیار بھی روپیہ ہی ہے۔ حسد کی آگٹ ہے کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی، دوسروں کو کروڑ پتی دیکھ کر راتوں رات امارت کی منزلیں حاصل کرنے کی خواہش نے اپنے نوجوان ہیروز کا اخلاق تباہ کر دیا ہے۔

کس کا فرض تھا کہ ان کھلاڑیوں پر نظر رکھتا؟ ان کی سرگرمیوں کی نگرانی کی ذمہ داری
 کس پر تھی؟ ان کی تربیت کا ذمہ دار کون تھا؟ اس فرد نے اپنا فرض کیوں پورا نہیں کیا؟
 اس کو مجرمانہ غفلت کی سزا کون دے گا؟ جس ٹیم کے ساتھ ٹیکنکل لوازمات کی پوری
 فوج جاتی ہے، اس کا حساب کتاب کون دے گا؟ دراصل جب آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہو
 تو کون کس کی اصلاح کرے، ایکٹ چور یا ڈاکو دوسرے کو شرافت یا دیانت کی تلقین
 کس طرح کر سکتا ہے؟ کرپشن کی اس دوڑ میں ہر کوئی ایکٹ دوسرے سے آگے نکلنے کے
 لئے بے تاب ہے۔ یہی کھلاڑی اگر یہ کارنامہ پاکستان میں سرانجام دیتے تو اب بھی
 عزت کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے ہوتے، کہ یہاں کبھی کبھار ہی کوئی قانون کی
 گرفت میں آتا ہے۔ ویسے بھی جب اوپر سے نیچے تک ہر با اختیار فرد کرپشن کے متعفن
 جوہر میں دونوں ہاتھوں سے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے تو ہمارے نوجوان کرکٹر
 کیوں پیچھے رہتے، وہ بھی ایسے میں کہ انہوں نے اوائل عمری میں ہی کروڑوں کے
 خواب دیکھے اور ان کی تعبیر پائی۔ اب حالت یہ ہے کہ اس حالت میں کوئی پاکستانی
 دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں اور اصلاح کی کوئی صورت بھی نہیں، چند روز کا رونا
 دھونا، کچھ دنوں تک تنقید اور اس کے بعد زندگی معمول پر، نہ ماضی سے سبق سیکھنے کا
 یہاں رواج ہے اور نہ مستقبل کی بہتری کی منصوبہ بندی۔

ریاست بہاول کی بحالی؟

گزشتہ دنوں ن لیگ کے صدر میاں نواز شریف بہاول پور گئے تو حسب روایت ان سے بہاولپور صوبہ بحالی کا سوال بھی کیا گیا کیونکہ جو سیاست دان بھی بہاول پور کا رخ کرتا ہے اسے اس سوال کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ میاں نواز شریف سے پوچھے جانے والے اس سوال کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ جنوبی پنجاب کی سیاست میں مسلم لیگ ن کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں نے بہاول پور صوبہ کی بحالی کی حمایت کا اعلان کر رکھا ہے۔ مسلم لیگ کے رہنما (قومی ہوں یا مقامی) بحالی صوبہ کے معاملے میں خاموشی کا روزہ رکھے ہوئے تھے، ان کی اس پر اسرار خاموشی کا فائدہ دیگر جماعتوں نے خوب اٹھایا، اور صوبہ بحالی کی حمایت کر کے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

جنوبی پنجاب میں اس وقت سب سے اہم اور ہارٹ ایٹھ صوبوں کے قیام کا ہے، وفاقی حکومت اس ضمن میں جنوبی پنجاب کو سرائیکی صوبہ بنانے کا اعلان کر چکی ہے، کبھی وہ اس کا نام صوبہ جنوبی پنجاب رکھ دیتے ہیں اور کبھی سرائیکی صوبہ کی حمایت کا بیان جاری ہو جاتا ہے، دوسری طرف بہاول پور والے اپنے صوبے کے قیام کی نہیں بلکہ بحالی کی بات کرتے ہیں، دونوں ”صوبوں“ کے حامی ایکٹ

دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، غداری کا سرٹیفیکیٹ نہایت ارزاں قیمت پر دستیاب ہے، بلکہ اکثر اوقات مخالفین کو یہ مفت اور طلب کئے بغیر ہی فراہم کر دیا جاتا ہے۔ جب سے وزیر اعظم نے اپنی مقامی سیاست سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اس وقت سے صوبے کی سیاست نے زور پکڑ لیا ہے۔

میاں نواز شریف نے صوبہ بحالی کی عجیب طریقے سے حمایت کی، انہوں نے کہا کہ ہم بہاول پور ریاست کو بحال کریں گے، اور اس میں وزیر اعلیٰ بھی ہمارا ہوگا ”ان کے“ اس بیان پر تبصرہ جاری ہے، کچھ نشانہ بازی اور کسی حد تک تیر اندازی بھی ہو رہی ہے۔ ریاست کی بحالی کی نہ جانے ان کے ذہن میں کیا ترکیب ہے، یا انہوں نے اس سلسلہ میں کیا منصوبہ بندی کر رکھی ہے، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ بیان میاں صاحب نے طنزاً دیا ہے، ورنہ ریاستوں کی بحالی کا یہ کونسا زمانہ ہے، اب تو دنیا میں رہی سہی ریاستوں کے وجود بھی خطرے میں ہیں، پاکستان میں قبل تقسیم سے پائی جانے والی ریاستوں کے والیوں نے انہیں بخوشی پاکستان میں شامل کر دیا تھا، اب نہ ان کی بحالی کا کسی کا مطالبہ ہے اور نہ ہی اس کے کوئی امکانات ہیں۔

میاں نواز شریف نے یہ بھی کہا ہے کہ بحال ہونے والی ریاست میں وزیر اعلیٰ ہمارا ہی ہوگا، اے بندہ خدا! اگر ریاست بحال ہوگی تو وہاں جمہوریت کا کیا

کام؟ وہاں تو وہی والیان ریاست واپس آئیں گے جن کی وہ ملکیت تھی، وہاں تو نواب ہونگے، عوام رعایا ہونگے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اب بدلے ہوئے زمانے کے مطابق میاں صاحبان میں سے ہی کوئی ”نواب“ قرار پا جائے، ریاست اور نوابی کی کسی حد تک ریہرسل انہوں نے اپنی نئی اور خود ساختہ ریاست ’جاتی عمرا‘ میں کر لی ہے، اب وہ چاہیں تو بہاول پور ریاست بحال کر کے یہاں نوابی کا شوق پورا فرمائیں، یہاں معاملات ہیں، جو فی الحال تو پاک فوج کے مصرف میں ہیں، چلیں اس بہانے یہ معاملات بھی واگزار ہو جائیں گے۔

مسلم لیگ ن کو جنوبی پنجاب میں صوبوں کی سیاست میں اس لئے کودنا پڑا کہ بات ان کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی، مگر ان کا یہ بیان کہ ریاست بہاول پور بحال کریں گے، کسی زہریلے مذاق سے کم نہیں، ریاستوں کے قیام اور بادشاہتوں کے شوق رکھنے والے میاں نواز شریف کو چاہیے کہ وہ بادشاہتوں کے انجام کو مد نظر رکھیں، خود بہاول پور میں یہاں کے اعزازی نواب صلاح الدین عباسی اپنی تمام تر مقبولیت اور احترام کے باوجود سابقہ دور میں دونوں دفعہ ناظم ضلع کا الیکشن ہار گئے تھے۔ بہر حال اگلے الیکشن میں کوئی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ میاں صاحب بہاول پور صوبہ کی بحالی کی حمایت کریں ورنہ وہ یہاں سے عوامی حمایت کھو بیٹھیں گے۔

قوم لاہور میں ہونے والے عمران خان کے جلسہ کے بعد میڈیا کی چلائی ہوئی، نہ ختم ہونے والی مہم میں الجھی ہوئی تھی، ٹی وی لنکرز ایکٹ سے بڑھ کر ایکٹ اس جلسہ کو ملکی تاریخ میں اہم ترین مقام دینے کی ٹگٹ و دو میں مصروف تھے، کالم نگار اپنے اپنے طریقے اور اسلوب سے اس کا مقابل بھڑیا دیگر لیڈروں سے کرنے میں لگے ہوئے تھے، دانشور اس جلسہ کو تبدیلی کا واضح اعلان قرار دے رہے تھے، اگر کسی نے رائے سے اختلاف کی جسارت کر لی تو کالموں کے کالم مخالفین پر زہر اگلنے میں جھونک دیئے۔ ٹی وی، اخبارات میدان جنگ کا منظر پیش کر رہے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر قیوں کے اثاثے تلاش کئے جا رہے تھے اور چیئنج پر چیئنج ہو رہا تھا۔

میدان کارزار گرم تھا کہ میمو کا ایشو پہاڑ تلے سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھی کا روپ دھار گیا، ایسے لگتا تھا کہ یہ ہاتھی حکومت کو کچل کر رکھ دے گا، قوم اس پوشیدہ راز کے فاش ہونے کا انتظار کرنے لگی، معاملہ قومی سیاسی رہنماؤں سے ہوتا ہوا سپریم کورٹ تک جا پہنچا، التجا یہی تھی کہ اس معاملہ کو ایسے ہی نہ چھوڑ دیا جائے، بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں تک پہنچی، کٹری سے کٹری کیسے ملی، کون کون ذمہ دار تھا، کون کون کس کس سزا کا

حقدار ہے؟ سفیر کو پاکستان بلا کر گھر بھیج دیا گیا، بہت سے دوسروں کو بھی گھر بھجوانے کی خواہش ابھی دلوں میں مچل رہی ہے، نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے، یہ وقت ہی فیصلہ کرے گا۔

حکومت میمو کی خط و کتابت کی الجھنوں میں الجھی ہوئی تھی، خط لکھنے والا، لکھوانے والا اور اس کا تصور پیش کرنے والا کوئی ایک شخص قرار نہیں دیا جا رہا، تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن اسی دوران نیڈ افواج نے ایک پاکستانی چوکی پر حملہ کر کے 26 جوان شہید کر دیئے، اگر حکومت اس ظلم پر بھی متحرک نہ ہوتی تو عوام سڑکوں پر نکل آتے۔ امریکی ڈرون حملوں میں ہمارے علاقوں کے بچا سیوں لوگ آئے دن جان گنوا بیٹھتے ہیں، مگر حکومتی سطح پر کبھی احتجاج نہیں کیا جاتا، کہ شاید عوام وغیرہ کی جان کی اتنی قدر نہیں، اور تو اور یہ ڈرون حملوں سے مرنے والے شہید نہیں 'ہلاک' ہوتے ہیں، چاہے بے گناہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اس واقع نے (فوج اور) حکومت کو ہلا کر رکھ دیا، جہاں حکومتی سطح پر احتجاج ہوا وہاں ہر سیاسی اور مذہبی جماعت نے بھی احتجاج کروا کے خود کو فہرست میں شامل کروایا۔ حکومت اتنی مجبور تھی کہ اسے امریکہ سے سٹشی ایئر پورٹ خالی کروانے کا اعلان کرنا پڑا، کابینہ نے بھی اس فیصلے کی توثیق کردی، حیرت ہے کہ حکومت اپنے فیصلے پر ابھی تک قائم ہے۔ حکومت کے اس فیصلے کے بعد قوم ایک بار

پی پی مخالف بھول کر امریکہ مخالفت میں لگ گئی۔ ایسی ایسی سیاسی جماعتیں جو حکومتی سیاست کی بھی رسیا ہیں، نے امریکہ مخالف ریلیاں نکالیں۔ یوں جہاں امریکہ نے دباؤ میں آ کر ایئر پورٹ خالی کرنے کا اعلان کیا وہاں پاکستان کے اندر حکومت کا گراف بھی کچھ اوپر گیا، قوم چند لمحوں کے لئے عمران خان کے جلے اور میمو کے چکروں سے باہر آئی اور حکومت کے خلاف نفرت میں کمی کا موڈ بنایا۔

حکومت جانتی ہے کہ قوم کو تو کچھ دیکھنے اور سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ اگر عام حالات میں بھی پٹرولیم کی مصنوعات میں اضافہ کر دیا جاتا ہے تو عوام کا پروگرام احتجاج کی بجائے کچھ باہم تبصرے، کچھ خون چلانا، کچھ چڑنا، کچھ کڑھنا اور گھٹ گھٹ کر مرنا ہی ہوتا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ معمول بن چکا ہے، لفظوں کا گورکھ دھندہ کرنے والے دلائل کے انبار لگا دیں گے، ظلم بہر حال ظلم ہے، عوام پر ہونے والا یہ ظلم آخر کب تک جاری رہے گا؟ حکومت کی یہ لوٹ مار کیا رنگ دکھائے گی؟ ان کا یہ غیر سنجیدہ رویہ انہیں کس منزل تک لے جائے گا؟ حکمرانوں کی گاڑیاں عوام کے خون سے کب تک چلتی رہیں گی؟ یہ نہ ہو کہ حکومت تو ایشوز کی سیاست کرتی رہے اور عوام میں نفرتوں کا زہر اپنی آخری حدوں کو پہنچ جائے اور 'مرض' ناقابل علاج ہو جائے؟

سرکاری گاڑیوں کا ناجائز استعمال

خبر حیران کن، خوش کن اور کسی حد تک پریشان کن تھی، وہ یہ کہ وزیراعظم گیلانی نے وفاقی سیکریٹریوں اور دیگر اعلیٰ سول حکام پر نئی گاڑیوں کی خریداری اور پراجیکٹس کی گاڑیوں کے ذاتی استعمال پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق ان نئے قواعد و ضوابط کی منظوری اور ان پر عمل درآمد کے نتیجے میں صرف وفاق میں لگ بھگ 14 ہزار سرکاری گاڑیوں کا غیر قانونی اور ناجائز استعمال بھی رک جائے گا، جن کی وجہ سے قومی خزانے کو سالانہ 5 ارب روپے کا ٹیکہ لگایا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ گاڑیاں اعلیٰ افسران کے نجی کاموں کے علاوہ غیر مجاز ملازمین بھی وسیع پیمانے پر استعمال کر رہے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 296 محکموں نے گاڑیوں کی تفصیلات فراہم کی تھیں، ان محکموں کی 18 ہزار میں سے 14 ہزار گاڑیاں غیر قانونی طور پر استعمال ہو رہی ہیں، جبکہ 190 سرکاری محکموں نے آڈٹ کے متعدد بار راپٹوں کے باوجود گاڑیوں کی تفصیلات فراہم نہیں کی تھیں۔

سرکاری افسران (اور غیر مجاز) ملازمین سرکاری گاڑیوں کا استعمال کس طرح کرتے ہیں، اس سے بھلا کون آگاہ نہیں۔ بیگمات کی شاپنگ، بچوں کا سکول جانا، سیر سپاٹا، میل ملاقات کے لئے تو ان گاڑیوں کا استعمال معمول کی بات ہے،

پراجیکٹس کی گاڑیوں پر یار لوگوں کی بارائیں بھی لے جائی جاتی ہیں، گاڑیوں پر قابض لوگوں کی اولاد ڈرائیونگ بھی انہی گاڑیوں اور سرکاری پٹرول سے ہی سیکھتی ہے، ہر شہر میں شام کو ایسی گاڑیاں عام ملتی ہیں جن کو 15 سے 18 سال کے لڑکے چلا رہے ہوتے ہیں، اول تو وہ دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں، یا ان کے ساتھ افسر والد یا ڈرائیور بھی ہوتا ہے۔

جس شہر میں ہمارا آشیانہ ہے (اسے آشیانہ ہاؤسنگ سکیم والا نہ سمجھا جائے) یہ ڈیڈ ٹرنل ہیڈ کوارٹر ہے، اس سے صرف 16 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ضلعی صدر مقام ہے، دوسرا ڈیڈ ٹرن اور دوسرا ضلع ہونے کے باوجود تقریباً دس سے زیادہ گاڑیاں ایسے افسران کے پاس ہیں جو ہمارے شہر کے باسی ہیں، یوں وہ ہر روز قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہاں آتے اور اگلی صبح نوکری پر جاتے ہیں، شام کو گاڑی ان کے بیوی بچوں کے تصرف میں ہوتی ہے، محرم کے دنوں میں ایسی گاڑیاں حلیم تقسیم کرتی پائی گئی ہیں۔ ان گاڑیوں کا استعمال تو ناجائز ہے ہی، مگر ستم یہ بھی ہے کہ حکومت عوام کے لئے تو سی این جی گاڑیوں کے احکامات جاری کرتی اور سی این جی بسوں کا بندوبست کرتی پھر رہی ہے مگر سرکاری گاڑیاں پٹرول پر ہی چل رہی ہیں، (کیونکہ یہ جیب سے نہیں ڈلوانا ہوتا)۔

یہ تو وفاقی محکموں کی بات ہے، جہاں 18 میں سے صرف چار ہزار گاڑی کا استعمال

درست ہے، بہت سے محکموں نے گاڑیوں کی تفصیلات سے آگاہ کرنا مناسب ہی نہیں جانا۔ حکمرانوں نے اپنے من پسند لوگوں کو بھی گاڑیوں کی سرکاری طور پر عیاشی کروار کھی ہوتی ہے، مشیروں اور دیگر نامعلوم شعبوں کو جواز بنا کر اپنے لوگوں کو گاڑیاں عنایت کردی جاتی ہیں۔ یہ معاملہ وفاقی حکومت کا ہی نہیں، صوبائی حکومتوں میں معاملہ اس سے بھی آگے ہوگا، ایک اندازے کے مطابق اگر کل اضافی خرچہ 5 ارب روپے ہے تو صوبوں کو شامل کرنے سے اس کی تعداد تین گنا سے بڑھ سکتی ہے۔ اور اگر ہم پنجاب حکومت کی طرف دیکھیں، کہ دیانتداری جن کا دعویٰ ہے، کرپشن کے خلاف جنہوں نے اعلان جہاد کر رکھا ہے، یہ بھی اپنے من پسند لوگوں کو مختلف اداروں کی آڑ میں سرکاری گاڑی معہ پٹرول، گارڈ اور ڈرائیور عنایت کرتے ہیں، اور پارسائی (؟) کے دعویدار بھی ہیں۔ وفاقی حکومت کے بعد یہ فیصلہ صوبائی حکومتوں کو بھی کرنا چاہیے۔ کیا ان فیصلوں پر عمل بھی ہو سکے گا؟ کیا گیلانی صاحب کا خاندان پر وٹو کول کی عیاشی ختم کر سکتا ہے؟ کیا میاں شہباز شریف بھی اس قسم کا فیصلہ صادر کریں گے؟

ڈاکٹر قدیر خان کی خدمت میں

اگر کچھ لوگ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قومی ہیرو تسلیم نہ کریں تو بھی ڈاکٹر صاحب کی عزت اور احترام میں کمی نہیں آئے گی۔ انہوں نے زندگی بھر کی محنت سے پاکستانیوں کے دل جیتے ہیں، اپنے کارناموں کے ’صلے‘ میں انہوں نے ایک فوجی آمر کے دور کی سختیاں بھی برداشت کی ہیں، جب بھارت نے اپنے ایٹمی سائنس دان کو اپنے ملک کا صدر بنا دیا تھا تو ہمارے ایٹمی سائنسدان کو فوجی آمر نے قید کر رکھا تھا، ڈاکٹر قدیر خان کے خلاف استعمال ہونے والے تمام حربے انہیں عوام کی نظروں سے نہ گرا سکے۔ قوم انہیں بجا طور پر ”محسن پاکستان“ سمجھتی اور قرار دیتی ہے۔ ان پر ہونے والی بے جا سختیوں سے مزید ہمدردیاں ان کے حصے میں آئیں۔ کچھ عرصہ سے ڈاکٹر صاحب نے کالم نگاری کے میدان میں بھی شاہسواری شروع کی ہے تو اس میں بھی بہت سے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے کالم تاریخ، ادب اور حالات حاضرہ کا مرکب ہوتے ہیں، ان کے کالم کے مطالعہ سے ’بھلے وقت‘ یاد آ جاتے ہیں، قاری دانائی کی باتیں پڑھتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی فہم و بصیرت کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی صلاحیتوں کا بھی قائل ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریر تاریخ اور ذاتی مشاہدات سے مزین ہوتی ہے۔

گزشتہ دنوں ڈاکٹر صاحب کے ”انسانی ذہنیت، خود فریبی، نفسیات“ کے عنوان سے لکھے گئے کالم کی ایک بات ہمارے ذہن سے چپک کر رہ گئی، انہوں نے لکھا ہے کہ ”اس سلسلہ میں کئی سال پیشتر ایک عالم اور مردم شناس عرب دوست نے بہت ہی اہم تبصرہ کیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ میں انسانی اعمال اور کردار کے مشاہدہ کی بنیاد پر بلا جھجھک کہہ سکتا ہوں کہ آپ بد شکل انسان میں عقل و فہم کا فقدان پائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جس فرد کو اپنی رحمت سے نواز کر عقل اور فہم دیتا ہے، اس کو کم از کم خوش شکل بھی بناتا ہے۔ ایک خوبصورت پھول بدبودار نہیں ہوتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ عیار، مکار اور ناقابل بھروسہ فرد میں ضرور ظاہری عیب دے دیتا ہے کہ لوگ اس سے ہشیار رہیں میں نے ہمیشہ یہ بات مد نظر رکھ کر لوگوں کا مشاہدہ کیا اور اس بیان کی صداقت کا قائل ”ہو گیا“

ہم ڈاکٹر صاحب کی جناب میں نہایت ادب سے ہی گزارش کریں گے، کوشش ہوگی کہ نہ تو ان کی توہین کا کوئی پہلو نکلے اور نہ ہی ان کے معزز قاری ہمارے اوپر سنگ باری فرمائیں، کہ انسان کو فہم و فراست یا عقل و شعور یا شکل و شباہت بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی عنایت فرماتا ہے، مگر ہمارے غیر متوازن معاشرہ میں بے شمار عقل و دانش کے حامل افراد کمپرسی اور گتائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور کہتے ہی بے صلاحیت لوگ دوسروں کے مقدروں کے فیصلے کرنے کے لئے اقتدار کے

ایوانوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ رہی بات بد شکل لوگوں کی تو ان خوبصورت چہروں کو دیکھئے جو حکمرانی کے منصب پر فائز ہیں، ان کے کرتوت ملاحظہ فرمائیے، کونسی برائی ہے جو ان میں نہیں پائی جاتی؟ اللہ تعالیٰ بے شک جمیل ہے اور جمال کو ہی پسند کرتا ہے، مگر جو اس کی اپنی تخلیق ہے، اگر ہم اسی کو اچھائی اور برائی کا پیمانہ بنالیں تو ہمارے حکمران اور اپوزیشن تمام کے تمام لوگ انسان نہیں فرشتہ ہیں، حسن و جمال کے پیکر ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سے خوش شکل لوگوں کے کرتوت بالکل کالے ہوتے ہیں، اور بہت سے ایسے لوگ جنہیں اچھی شکل نہیں ملی وہ بہترین انسان ہوتے ہیں۔ اور کیا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو برابر پیدا نہیں کیا؟ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل تکریم انسان وہ نہیں جو متقی ہے؟ کیا مشرکین مکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے خلاف اسی قسم کا پروپیگنڈہ نہیں کرتے تھے؟ شکل صورت، رنگ اور نسل وغیرہ کی نفی تو مذہب میں جا بجا ملتی ہے۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب کے اس فلسفے سے بے شمار لوگوں کی دل آزاری بھی ہوئی ہوگی۔

بلاول کی قیادت

اخبار میں شائع ہونے والی ایک تصویر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا؟ پاکستان کی حکمران پارٹی کے تمام سرکردہ قائدین اس نوجوان کی زیر صدارت اجلاس میں موجود ہیں، جس کی عمر ابھی اچھلنے کودنے اور کھیلنے دوڑنے کی ہے، جو ابھی اپنی تعلیم کی منازل زینہ زینہ طے کر رہا ہے، جو ابھی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کی اہلیت تک اپنی کم عمری کی وجہ سے نہیں پہنچ سکا۔ پارٹی کے کیسے کیسے نام اس کے سامنے ہمہ تن گوش بیٹھے ہیں، اس کی ہدایات کو حرف حرف سننے اور ان پر عمل کرنے کے جذبے سے سرشار نہایت عقیدت سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ یہ سارے کے سارے لیڈر اپنے 'انڈراج' چیئرمین کے اشارہ لبرو کے منتظر ہیں، کہ اشارہ ملے اور یہ لوگ اسے حکم کا درجہ دے کر اپنی تقریروں اور بیانات کا موضوع بنائیں۔

پارٹی چیئرمین بلاول کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں شریک پارٹی قائدین کی اکثریت کو اپنے چیئرمین کی عمر سے کم و بیش دگنا وقت دشت سیاست کی سیاحی کرتے گزر گیا ہوگا، چار دہائیوں پر محیط ان کا سیاسی تجربہ ایک طرف اور ان کی ایک خاندان سے وفاداری کا حساب دوسری طرف۔ یہ نہیں ہے کہ نئی نسل میں

قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان ہے، نسل نو ٹیکنالوجی کے جدید امور سے بخوبی آگاہ ہے، انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کے معاملات پر اس کی نظر ہے، حالات حاضرہ سے وہ اچھی طرح واقف ہے، کاروبار حکومت پر بھی ان کی توجہ ہوتی ہے۔

بلاول کو قیادت تو ورثے میں ملی ہے، جس کے نانا، دادا، والدہ، والد اور دیگر کئی رشتہ داروں نے عمریں ایوان اقتدار کی راہداریوں میں گزاری ہوں، جس نے آنکھ ہی بھر پور سیاسی ماحول میں کھولی ہو، جس کی والدہ ماجدہ دو دفعہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم رہ چکی ہوں، جس کے والد صدر مملکت کے معزز ترین عہدے پر فائز ہوں، اسے بھلا پارٹی کے چند بابوں کی صدارت کرنے میں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں، وہ تو خود اعتمادی کی دولت سے ہی اس قدر مالا مال ہے کہ اس کی کسی تربیت کی ضرورت نہیں، کسی سہارے یا کسی تجربہ کے چکر میں دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کی محتاجی نہیں۔

ستم تو یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان اگر عمر یا عہدے یا تجربے میں بڑے بھی ہو جائیں، تو وہ کسی نہ کسی شخصیت کے محتاج ہیں، پارٹی کی محتاجی کی تو بات بنتی ہے، کہ جمہوریت پارٹی کے بنا پنپ نہیں سکتی، مگر ہمارے ہاں پارٹیاں شخصیات کے ہاتھوں پر غمال ہیں، ان پر شخصیات کا ایسا سحر قائم ہو چکا ہے کہ

اس کا اثر عوام تک بھی پکھيلا ہوا ہے، اپنے ”محبوب“ سیاستدانوں کی نو عمر اولادوں کو بھی عوام اور مقامی قائدین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، مقبول پارٹیوں کے ”مالکوں“ کی خوشامد کا جو طریقہ بھی دریافت ہو سکتا ہے، سیاستدان اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہیں، بلاول کا ”بھٹو، زرداری“ ہونا موروثی سیاست اور عوامی غلامی کی ایک کھلی نشانی ہے۔

اخبارات کے صفحہ اول پر جگہ پانے والی ایک اور تصویر بھی یقیناً قابل غور ہے، جس میں ”سلطنت پاکستانیہ“ کے دو ولی عہد شہزادے ’ملاقات‘ کر رہے ہیں، بلاول زرداری سے عبدالقادر گیلانی اور موسیٰ گیلانی محو گفتگو ہیں۔ خدایا! اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھ کر پروٹوکول اور عیاشی کے رسیا حکمرانوں کے یہ نو عمر اور لاابالی بچے قوم کے مقدر کے فیصلے رقم کر رہے ہیں۔ بلاشبہ مستقبل نسل نو کا ہی ہے، مگر ہر کام کا کوئی وقت ہوتا ہے۔ یہ ماننا کہ پی پی کے لیڈروں کی بھٹو خاندان کی چھتری کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں، مگر دل لگتی یہی ہے کہ یہ جمہوریت کا چلن نہیں۔

!توانائی کا بحران اور تاریک مستقبل

تعلیمی بورڈوں نے نسلِ نو کے مستقبل سے کھیلنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، ذمہ داروں کے خلاف مقدمات عدالتوں میں ہیں، متاثرین اور قوم پر امید ہے کہ ان کے خلاف ہونے والی کارروائی ثمر بار ہوگی، سزا جرمانہ پر مشتمل ہو یا قید وغیرہ تک بھی نوبت آئے، اس سے ایسے کرپٹ اور سازشی مافیا کی حوصلہ شکنی تو ضرور ہوگی، مگر جن بچوں کا مستقبل ضائع ہو گیا، ان کا ازالہ کون کرے گا، ایک امتحان کی وجہ سے جو آگے بڑھنے اور ترقی کے زینے چڑھنے سے محروم رہ گئے ان کی دلجوئی کس کے ذمہ ہے؟ ظلم کا ذمہ دار کوئی فرد واحد ہو یا تمام بورڈوں کے چیئرمین، لیکن مظلوم کی وادری ضروری ہے، جس کا کوئی امکان بھی نہیں۔

لیکن اب طلباء و طالبات کے مستقبل سے کھیلنے کی دوسری گھناؤنی سازش جاری ہے، ابتدائی کلاسوں سے لے کر اوپر تک کے امتحانات کا موسم سر پر ہے، راتیں طویل اور سرد ہیں، بچے آوارہ گردی سے بھی محفوظ ہیں، دوستوں کی محفلوں سے بھی کسی حد تک بچت ہے، ظاہر ہے گھر پر ہیں تو والدین انہیں پڑھنے کے لیے کہیں گے، کیونکہ موقع بھی ہے اور دستور بھی کہ آنے والے دنوں میں امتحانات ہونے والے ہیں، لیکن بچے کیسے پڑھیں کہ بجلی نے پھر آنکھ میچولی کھیلنے کا

شوق شروع کر رکھا ہے، کتابیں درست کرتے اور پڑھنے کا ماحول بناتے ہیں تو بجلی غائب ہو جاتی ہے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر آمد برق بیٹھے ہیں۔

لوڈ شیڈنگ ایک ایسا عذاب ہے جو کسی وقت بھی نازل ہو سکتا ہے، کسی کو کوئی خبر نہیں کہ کس لمحے یہ محترمہ چلی جائے اور کب لوٹ آئے، ہاں البتہ تناسب کو معلوم ہے کہ جب یہ جاتی ہے تو کم از کم دو گھنٹے نہیں آتی۔ بجلی جاتی ”برق رفتاری“ سے ہے اور آتی ریل گاڑی کی طرح ہے، کہ آئے، نہ آئے یا کتنی ہی تاخیر سے آئے۔ شیڈول نامی کسی چڑیا سے یہ واقف نہیں، آپ کسی کام کو اس بھروسے پر موخر نہیں کر سکتے کہ استری فلاں وقت کر لیں گے یا بجلی سے متعلقہ دیگر امور فلاں وقت نمٹالیں گے۔ اس کا حل یہی ہے کہ جب آپ فرصت پائیں بجلی سے ہونے والے کام کر رکھیں۔

جدید ٹیکنالوجی کو زندگیوں کا حصہ بنالینے کی وجہ سے اب اکثر کاروباری لوگ لوڈ شیڈنگ کے دوران فرصت کی فراوانی کی وجہ سے حکومت کو فراوانی اور روانی کے ساتھ بددعائیں دیتے اور حسبِ توفیق القابات اور مغلفات سے بھی نوازتے ہیں، ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کے کاریگر تو شام کو اپنی مزدوری کا تقاضا کریں گے، مگر بجلی کی عدم دستیابی کی وجہ سے ان کا کام پورا نہیں ہوا ہوتا۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے تمام لوگ متاثر ہوتے ہیں، کیونکہ پورے معاشرے کی کڑیاں

ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاروباری لوگوں سے لے کر بڑی بڑی صنعتوں تک سب ہی متاثر اور پریشان ہیں۔ زرعی ملک میں ڈنرل کی قیمت پٹرول سے بھی زیادہ ہے، اور اب سی این جی کی قیمتیں بھی امید ہے پٹرول کے برابر ہو جائیں گی، ٹرانسپورٹ کا کیا حال ہوگا، مسافروں پر کیا بیٹے گی؟

جن فیکٹریوں اور مملوں میں سیکڑوں مزدور کام کرتے ہیں، گیس اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے کام ٹھپ پڑا ہے، تو مزدور کو لاکھوں روپے کہاں سے ادا ہونگے اور اس مل سے نکلنے والی پیداوار کی قیمت کیا ہوگی، جس میں سے مزدوروں کی تنخواہ کا حساب بھی لیا جائے گا؟ جہاں صنعت کا پھیلاؤ ہو جائے گا وہاں ترقی کے کیا امکانات رہ جائیں گے؟ نہ کھیت کو پانی ملے گا، نہ سستی کھاد دستیاب ہوگی، نہ مزدور کو روزگار میسر آئے گا، نہ طالب علم کو روشنی نصیب ہوگی، تو ایسی قوم کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہمیں بہر صورت امید کا دامن دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام کے رکھنا چاہیے، مگر سچ جاننے کہ ان المناک اندھیروں میں ہمیں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، اس کا دامن کیسے تھامیں؟ کیا عوام کو گیس اور پٹرول کے ٹیکے لگانے والے حکمرانوں نے (کہ جن کے بچے برطانیہ یا امریکہ میں زیر تعلیم ہیں) کبھی ان بحرانوں سے نمٹنے اور اپنی عیاشیاں کم کرنے کے بارے میں بھی سوچا ہے؟؟

اس نے اپنے کمرے میں ہر طرف اپنے قائدین کی چھوٹی بڑی تصاویر آویزاں کر رکھی تھیں، ذوالفقار علی بھٹو، نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی تصاویر سے کمرہ بھرا پڑا تھا۔ یہ تصاویر دراصل اس کے ذہن اور دل کی عکاسی کرتی تھیں، یہ اس کے جیلا ہونے کا مظہر تھیں، وہ جیلا جو اپنی پارٹی اور قائدین پر دل و جان سے فدا تھا، اس کا ذہن بھٹو اور روٹی، کپڑا اور مکان والی پیپلز پارٹی میں اٹکا ہوا تھا، اس نے اسی دنیا کو اپنے خوابوں میں سجا رکھا تھا، وہ تصورات کی دنیا میں جیتا اور اسی دنیا کی خواہش رکھتا تھا۔ حالات مگر اور ہی ڈگر پر چل نکلے، بے نظیر تک تو اس کی امیدوں کا دیا جلتا رہا، پھر مایوسی نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا، لیکن اس نے ہمت سے مایوسی کو شکست دی۔

بے نظیر کے سانحہ ارتحال کے بعد اس کا دل ٹوٹ گیا، اس کی امیدوں کے چراغ گل ہو گئے، اس کی آس کے دیسے بجھ گئے، اس کی تمنائیں خاک میں ملنے لگیں، اس کی خواہشات کا خون ہو گیا، اس کی آرزوئیں ہوا ہو گئیں۔ لیکن جو جیلا پن اس کے خون میں رچ بس چکا تھا، اسے نکالنا اس کے اپنے بس میں بھی نہ رہا تھا، ان مایوسیوں اور تاریکیوں کے باوجود اس نے پارٹی کا دامن نہیں چھوڑا، ہزار

و سوسوں کے باوجود اس نے وفا کے چراغ جلا کر ناامیدیوں کو ہی مایوس کر دیا، پارٹی کے ٹمٹماتے دیسے سے ہی روشنی حاصل کرتا رہا۔ لیکن تابہ کے؟ آخر پیمانہ صبر لہریز ہو گیا، اور امید کا دیا آخری مرتبہ بھڑکا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

جنوبی پنجاب کے دور دراز تاریخی قصبے اج شریف سے تعلق رکھنے والے جیالے نے اس صبح اپنے گلے میں پھندہ ڈال کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا، جس روز پارٹی اپنی لیڈر کی چوتھی برسی منانے کے لئے اس کی قبر پر جمع تھی، حکومتی پارٹی ہونے کے ناطے پارٹی کے شریک چیئرمین (جو کہ مرحومہ کے شوہر نامدار بھی ہیں) سے لے کر عام کارکنان تک گڑھی خدا بخش پہنچ کر اپنی قائد کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے، پھولوں کی چادریں چڑھا رہے تھے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے اور ان کے علم کو اٹھانے کے عزم کا اعادہ کر رہے تھے، اسی روز اج شریف کا جیالا ریاض احمد راہی مایوسیوں اور پریشانیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پھندے سے جھول گیا۔

ریاض احمد راہی کا مطالبہ یہ تھا کہ بے نظیر کے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے، اگر حکومت میں ہوتے ہوئے بھی یہ کام نہیں ہو سکتا تو اس کی نوبت کب آئے گی؟ لیکن اس کا مطالبہ کون سنتا، اس کی آواز کہاں تک جاتی؟ اس کی معاشی حالت

بھی پریشان کن تھی، اگرچہ وہ برگر کی سڈھی لگاتا تھا، مگر اس کا گزر بسر مشکل ہو رہا تھا، نو بہت فاقوں تک آچکی تھی۔ وہ بیمار بھی رہنے لگا تھا، پارٹی عہدیداروں کی طرف سے مسلسل نظر انداز کئے جانے کے رویوں سے وہ نالاں تھا۔ جہاں وہ بے نظیر کو یاد کر کے روتا تھا، وہاں وہ اپنے قائدین کے منفی اور خشک رویے سے بھی پریشان اور مایوس تھا۔

بادشاہوں سارہن سہن رکھنے والے حکمران کیا جانیں کہ غربت اور فاقہ کشی کیا ہوتی ہے، ان کی بلا سے کوئی مرے یا حیئے، ان کی عیاشیاں جاری ہیں، ان کے لاکھوں روپے روزانہ کا خرچہ ان کی جیب سے ادا نہیں ہوتا۔ جو حکمران اپنی پارٹی کے ایک ایسے جیلے کو بھی دو وقت کی روٹی اور علاج معالجے کی سہولت نہیں دے سکے، جس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی پارٹی سے محبت کو قرار دے رکھا تھا، جس نے پارٹی کی محبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے شادی بھی نہیں کی تھی، اس کو پارٹی خود کشی سے نہیں بچا سکی تو پوری قوم کا کیا حال ہوگا؟ اس عوام کا پرسان حال کون ہوگا جو نظریاتی یا سیاسی طور پر پی پی کے خلاف ہیں؟ نظام سلطنت چلانے میں اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات حکمرانوں کی نظر میں آتے بھی نہیں، نہ ان پر کوئی توجہ دیتا ہے، کہ حکمرانوں کی توجہ مال غنیمت سمیٹنے پر ہے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان کے اپنے اصول ہونگے، ممکن ہے کچھ کسی حد تک لاگو بھی ہوتے ہوں، مگر یہ بات یقینی ہے کہ وزیراعظم پر ان کا نفاذ قطعاً نہیں ہوتا۔ اس کا عملی ثبوت ایک ضمنی الیکشن میں اس وقت دیا گیا جب ملتان کی ایک تحصیل جلالپور پیر والا میں یہ معرکہ برپا ہوا، ان لیگ کی طرف سے نغمہ مشتاق امیدوار تھیں تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں وزیراعظم اپنے بھائی کو لے آئے، الیکشن مہم کے دوران وزیراعظم نے ذاتی طور پر وہاں کے لوگوں سے فون پر رابطے رکھے اور ایک روایت کے مطابق اسی دوران بیرون ملک دورے کے دوران وہاں سے بھی موصوف گھنٹوں مذکورہ حلقے کے خواص سے رابطے میں رہے۔

وزیراعظم کا اپنے بھائی کے لئے الیکشن مہم چلانا ایک مجبوری تھی، چلیں فون پر بات کرنا شاید الیکشن کمیشن کی گرفت میں نہ آتا ہو، مگر وہاں کروڑوں روپے کے ترقیاتی کام کروائے گئے، جہاں تصور نہیں جاسکتا، وہاں سوئی گیس چلی گئی، جہاں راستہ نہیں جاتا تھا وہاں بجلی پہنچ گئی، کچی سڑکوں کو پختہ کر دیا گیا، ملازمتوں کی سہیلیں بھی لگادی گئیں، وزیراعظم کے احکامات پر عمل کرنے کے لئے سرکاری دفاتر میں دھکے کھانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ سڑکوں،

گلیوں اور کھیتوں میں ہی دفاتر قائم تھے اور ہر چیز کی منظوری وہیں ہو رہی تھی۔ اوپر سے ایکٹ اور بٹاکام یہ ہوا کہ پنجاب کے حکمرانوں نے اپنی امیدوار کے حق میں جلسہ کرنا بھی مناسب نہ جانا، وہ خود ہی اپنے زور بازو پر الیکشن لڑی اور چند ہزار کی لیڈ سے وزیراعظم اپنے بھائی کو جتانے میں کامیاب ہو گئے، اگر میاں برادران میں سے کوئی ایکٹ بھی آخری وقت میں یہاں جلسہ کر جاتے تو نتیجہ مختلف ہوتا، اور وزیراعظم کے برادر خورد کی مقبولیت کا پول کھل جاتا۔

تب بھی الیکشن کمیشن آف پاکستان نے خاموشی کا روزہ افطار نہ کیا، اور ساتھ ہی میاں برادران نے بھی جہاں الیکشن مہم میں حصہ نہ لیا وہیں وزیراعظم کی طرف سے کی جانے والی سرکاری مشینری کے استعمال اور مداخلت پر کوئی احتجاج نہ کیا، اپنی سیٹ قربان کر دی مگر گیلانی سے فرینڈلی اپوزیشن کے تناثر کو مزید تقویت بخش دی۔ ایکٹ ایسا ہی معرکہ ایکٹ مرتبہ پھر برپا ہے، شاہ محمود قریشی کی خالی ہونے والی سیٹ (حلقہ این اے 148) پر وزیراعظم نے اپنے دوسرے بیٹے کو ٹکٹ عنایت کر (یا کروا) دی ہے۔ اپنے (148) خاندان اور اہل و عیال کو عوامی نمائندے بنانا ان کا جمہوری حق ہے، ابھی ان کا ایکٹ پیٹامیدان سیاست سے باہر ہے، ان کی بیٹی خازن سیاست میں قدم رکھ چکی ہیں۔ وہ سب کو ہی انتخابی میدان میں لے آئیں اور عوام انہیں اعتماد کا ووٹ دیتے ہیں تو کسی دوسرے کو

اعتراض کا کیا حق ہے؟ اگرچہ یہاں بھی ایکٹ بے اصولی ہو رہی ہے کہ جمہوریت میں وراثت کا کیا کام؟ مگر پاکستانی جمہوریت میں ایسا سب چلتا ہے، بڑے بڑوں سے لے کر چھوٹے چھوٹوں تک اپنی اولادوں کو پینا فلیکسوں کی زینت بناتے اور اپنے ہاتھوں سے عوام کے کندھوں پر بٹھاتے ہیں۔

وزیراعظم بھلے اپنے تمام اہل خانہ کو ہی اسمبلیوں میں لے آئیں، مگر سرکاری وسائل اور کروڑوں کے بجٹ سے ترقیاتی کاموں کے ذریعے ان کی انتخابی مہم تو نہ چلائیں، انھوں نے قوم کو نئے سال کا تحفہ بھی دیا کہ ملتان کے نواح میں قادر پور راں میں ایکٹ ضمنی الیکشن کے موقع پر کروڑوں روپے کے ترقیاتی منصوبوں کا افتتاح کیا، کیونکہ ان کا بیٹا یہاں امیدوار ہے۔ ایکٹ چھوٹے قصبے میں پاسپورٹ کارڈ ہیل آفس قائم کیا، فلائی اوورز سڑکوں کی کشادگی اور سولنگوں اور نالیوں تک کے لئے بجٹ مہیا کیا۔ اس سے قبل بھی، وہ جنوبی پنجاب کا زیادہ بجٹ ملتان میں ہی لگا چکے ہیں۔ کیا یہ اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کر رہے ہیں؟ الیکشن کمیشن اور اپوزیشن پارٹیاں غواب غفلت سے کب بیدار ہوں گی، یہ کھلی دھاندلی کب اور کیسے ختم ہوگی؟ کیا الیکشن کمیشن، ن لیگ اور تحریک انصاف والے کی خالی کردہ ہے) اس پر غور کریں گے؟ PTI کہ یہ سیٹ)

ہمارے ہاں کہنے کو تو جمہوری نظام ہے، مگر طور طریقے سارے آمرانہ ہی ہیں۔ سیاسی جماعتیں خاندانوں کی وراثت ہیں، کوئی پارٹی لیڈر جب گزر جاتا ہے، تو اس کی دیگر جائیداد کی طرح پارٹی بھی اس کی اولاد کو منتقل ہو جاتی ہے، اور پارٹی میں موجود دوسرے ”رہنما“ بھی کسی وفادار فشی کی طرح اولاد کی خدمت میں جت جاتے ہیں، ان کے والد سے اپنی عقیدت اور خدمات کے قصے سنا کر نئے سربراہ کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوتا یہ کہ عقیدت کے نام پر خوشامد کا سلسلہ ہے جو باپ دادا سے شروع ہو کر نسل در نسل منتقل ہوتا جاتا ہے، نوجوان بلاولوں اور حمزہ شریفوں کے ارد گرد بوڑھے فشی یوں بیٹھے گردنیں ہلارہے ہوتے ہیں، جیسے ان سے بڑا دانشور، مسیحا اور نجات دہندہ آج تک چشم فلک نے نہیں دیکھا اور ان کے ’بڑے‘ کی سب سے بڑی خوبی اور خدمت یہی تھی کہ وہ ’آپ‘ جیسا رہبر ہمیں عطا کر گئے۔ پارٹیوں کے اس رجحان اور ان کے رہنماؤں کے ایسے رویوں کی وجہ سے پارٹیاں انہی کے ہاتھوں میں یرغمال ہیں، ان کی ذاتی جاگیر ہیں، کوئی ”سیاسی مزارعہ“ ان کی مرضی کے خلاف نہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ ہی جاگیر میں رہ سکتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ پارٹیاں عوام میں مقبول ہیں اور اسی مقبولیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پارٹی لیڈر اپنے مقامی رہنماؤں کو دبا کر رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے مقامی لیڈر بھی اسی پارٹی کی طرف جاتے ہیں جہاں سے کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ ان پارٹیوں کے قائدین کا رویہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہوتا، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی مزارعہ کے ساتھ زیادہ بے تکلفی ہو جاتی ہے اور کوئی ذرا دور ہی رہتا ہے۔ پاکستان میں کونسی ایسی جماعت ہے، جو کسی کی ذاتی جاگیر نہیں، سوائے جماعت اسلامی کے۔ ن لیگ ذاتی جاگیر اور تلخ رویوں کے معاملہ میں سرفہرست ہے، کچھ یہی حال پی پی پی کا بھی ہے کہ پارٹی کی مرحومہ سربراہ اپنے لوگوں کو جھاڑ اور دبا کر ہی رکھتی تھیں۔ یقیناً دیگر جماعتوں میں بھی ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

چند ماہ قبل ملک میں اچانک عمران خان کا سیلاب برآمد ہوا، عمران خان نے اسے سونامی قرار دیا، تاہی کہاں سے چلے گی اور کہاں تک سفر کرے گی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، مگر اس سے ایک فرق یہ پڑا کہ بڑی سیاسی جماعتوں نے اندرون خانہ ہفتہ خوش اخلاقی ”منانے کا فیصلہ کیا ہے، اب میاں برادران نے اپنے پارٹی کے“ ممبران اسمبلی سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، بلکہ اپنی مہم میں مزید تیزی لاتے ہوئے انہوں نے اپنے ممبران کو خصوصی اور اضافی فنڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے، ساتھ ہی (ساتھ ق لیگ کے فارورڈ بلاک کے لوگوں

واضع رہے کہ یہ لفظ لوٹ کر آنے والوں کے معانوں میں استعمال کیا گیا ہے) کو بھی تالیف قلب کے لئے فنڈز کے ساتھ آنے والے الیکشن میں ٹکٹ کے وعدے بھی شامل ہیں۔

کارکنوں کا دل نرم کرنے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے، انہیں مختلف کمیٹیوں میں ایڈجسٹ کیا جائے گا، ممکن ہے سرکاری گاڑی کے جھولے اور دیگر مراعات کا مزہ بھی چکھا دیا جائے، یا ایسے اختیارات عنایت کر دیئے جائیں جن سے معاشی فائدہ حاصل کرنے کے امکانات بھی روشن ہوں، ویسے یہ کام تو پہلے بھی کسی حد تک ہو رہا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اصول پسندی، بچت اور دیانت داری کے دعوؤں کو برقرار رکھتے ہوئے صوبائی حکومت کس طرح اپنے لوگوں پر سرکاری خزانوں کے دروازے کھولے گی؟ میاں برادران کو اس مشن پر چلنے سے قبل یہ بھی سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس عمل سے پارٹی کے اندر اور باہر بے چینی اور غیظ و غضب کی لہر بھی اٹھے گی اور انقلاب لانے کا دعویٰ کرنے والے خادم پنجاب خود بھی انقلاب کی زد میں آجائیں گے۔

وفاقی کابینہ کے انقلابی فیصلے

چونکہ ہر طرف انقلاب برپا کر دینے کے چرچے ہیں چنانچہ وفاقی کابینہ نے بھی کچھ ایسے ہی فیصلے کئے ہیں، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ حکومتوں کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ فیصلے تو کرتی ہے مگر عمل کی روایت نہیں، اس لئے حکومتی فیصلوں پر زیادہ خوش اور زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کابینہ نے محسوس کیا ہے کہ جہاں تمام سرکاری ملازمین اپنے اثاثے عوام کے سامنے ظاہر کرنے کے پابند ہوتے ہیں وہاں عدلیہ، فوج اور بیوروکریسی بھی عوام کے سامنے اپنے اثاثے ظاہر کرنے کی پابند ہوگی۔

وفاقی کابینہ نے گیس کے بحران پر قابو پانے کے لئے جو منصوبہ بنایا ہے وہ کوئی عالی دماغ لوگ ہی سوچ سکتے تھے، اس معاملہ میں حکمران خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایسے ماہرین دستیاب ہیں جو ملک و قوم کو ہر بحران سے ایسے نکال سکتے ہیں جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ فی الحال توانائی کے بحران سے قوم کو نجات دلانے کے لئے حکومت نے زبردست فیصلہ کیا ہے کہ گیس استعمال ہی نہ کی جائے، اور اگر گیس کا استعمال بالکل ختم کر دیا جائے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ توانائی کا مصنوعی بحران اپنی موت آپ مر جائے گا۔ کابینہ نے ار

راہ کرم قوم کو چولہوں میں جلانے کے لئے گیس فراہم کرنے کا حکم دیا ہے، اگرچہ یہ بھی ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

کابینہ نے فیصلہ کیا ہے کہ صنعتوں، پاور سیکٹر، کھاد اور سیمنٹ کے شعبوں کو گیس معطل کردی جائے گی، یہ کہہ کر بھی قوم کے زخموں پر مرہم رکھ دیا کہ عوام کے چولہے نہیں بجھنے چاہئیں۔ قوم اپنے ”نمائندہ اعظم“ کے احکامات سن کر خوشی، مسرت اور تشکر

کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔ قوم کے پاس الفاظ نہیں جن میں اپنے قائد کی تعریف کریں اور ان کا شکریہ ادا کریں۔ وزیر اعظم نے بجلی اور گیس کی فراہمی کو اولین ترجیح قرار دیا، اور یہ ہدایت جاری کر کے پوری قوم کے دل جیت لئے کہ لوڈ شیڈنگ کا شیڈول جاری کیا جائے، شیڈول کے بغیر لوڈ شیڈنگ سے گم نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے جب صنعتیں اور کارخانے بند ہو جائیں گے تو اتنی گیس تو بچ ہی رہے گی کہ چولہے جل سکیں۔ انقلابی فیصلے کرتے وقت کابینہ کے ذہن میں یہ خیال نہیں گزرا کہ چولہا جلانے کے لئے گیس تو ہوگی، یعنی چولہا تو جلے گا مگر چولہے کے اوپر کیا رکھا جائے گا، خالی برتن؟ کیونکہ اس دیکھی میں ڈالنے کے لئے کچھ بھی خریدا جائے تو اس کے لئے روپے درکار ہوتے ہیں، اور جب صنعتیں اور کارخانے بند ہونگے تو ان میں کام کرنے والے کہاں سے کمائیں گے، ان کارخانوں کو خام مال فراہم

کرنے والے شعبے کیا کریں گے، اس فراہمی میں اہم کردار ادا کرنے والے مزدور کی آمدنی کہاں سے آئے گی؟ جناب وزیراعظم صاحب! چولہے جلانے کا آپ کا فیصلہ تو واقعی قابل تحسین ہے، مگر اس پر پکانے کے لئے بھی کچھ ہونا چاہیئے۔ ویسے بھی تمام صنعتیں بند ہو جانے سے کاروبار زندگی ہی معطل ہو کر رہ جائے گا، اس کے اثرات صرف صنعتکاروں پر یا وہاں کام کرنے والوں پر یا ان کو خام مال مہیا کرنے والوں پر یا وہاں مزدوری کرنے والوں پر ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کے ہر فرد پر مرتب ہونگے، بے روزگاری اور مہنگائی میں اضافہ ہوگا۔

کابینہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ توانائی کے بحران کی ایکٹ وجہ بجلی چوری بھی ہے، اور جہاں محکمہ مذکورہ کے افراد کاروائی کرنے جاتے ہیں تو مقامی پولیس تعاون نہیں کرتی، یوں ملزمان دندناتے پھرتے ہیں اور حکومت بے بس ہے، خدایا! یہ کیسی الٹی گنگا بہنے لگی، حکومت کہتی ہے کہ بجلی چور قابو نہیں آتے، چور کہاں سے قابو آئیں گے کہ ڈاکوؤں کے روپ میں خود حکمران ملکی وسائل کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ کابینہ کے فیصلوں سے خاص طور پر عدلیہ، فوج اور بیوروکریسی کے اثاثوں کے ظاہر کئے جانے کے فیصلے پر خوشی کے تازیانے بجانے کی ضرورت نہیں، کہ حکومت کے ایسے فیصلوں پر عمل کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ اس کے باوجود یہ بھی کم غنیمت نہیں کہ مذکورہ بالا تین طبقات کے اثاثوں کے بارے میں حکومت نے سوچا تو سہی!!

پاکستان کا ایوانِ زیریں آئے روز مچھلی منڈی کا منظر پیش کرتا ہے، ”معزز“ ممبران اسمبلی اپنے جذبات کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہر کوئی بول رہا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ بھی ایک اہم اور قابلِ غور معاملہ ہے جس پر سوچا جانا چاہیئے، اور مسئلے کا بہتر حل نکالا جائے، مگر کیا کیجئے کہ ملک و قوم کی تقدیر کے فیصلے لکھنے والا ایوان خود قوم کے لئے ایک بڑا تماشہ ہے، غیر سنجیدہ رویے، ایک دوسرے کو مغالطات بکنا، دست و گریبان ہونا، گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا، غیر اخلاقی قسم کا مذاق کرنا ان کا روز کا معمول ہے۔ ایسی ایسی گل افشانی ہوتی ہے کہ اکثر اوقات معزز ممبران کے اقوال اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اسمبلی کی کاروائی کا مستقل حصہ رہ سکیں، انہیں کاروائی سے حذف کر دیا جاتا ہے کہ آئندہ آنے والے ممبران اپنے پیش روؤں کی زنائوں کی سیاہی سے آگاہ نہ ہو سکیں۔

قومی اسمبلی کا حالیہ اجلاس بھی ایسے ہی ماحول میں ڈھل گیا جب دو حکومتی اتحادی جماعتیں خم ٹھونکنے کی ایک دوسرے کے خلاف میدان میں اتر آئیں۔ زیر بحث مسئلہ نئے صوبوں کا قیام تھا، ایم کیو ایم نے صوبوں کے قیام کے حق میں اپنا

پورا زور صرف کر دیا، جبکہ اے این پی نے اپنی پوری توانائیاں اس کی مخالفت میں لگا دیں۔ بات باتوں اور تقریروں تک محدود نہ رہی، مجبوراً قائم مقام سپیکر کو اجلاس 20 منٹ کے لئے ملتوی کرنا پڑا، ن لیگ کے ارکان بھی اس کارِ خیر میں حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے، یوں حکومت کے اتحادیوں میں بھی کسی حد تک پھوٹ پڑ گئی، اے این پی والے صدر کو بھی شکایت لگا آئے۔

ہنگامے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی پارٹی بھی دوسرے کی بات سننے پر آمادہ نہیں، اس پر غور کرنا تو دور کی بات ہے۔ ایم کیو ایم اپنی روایتی سیاست کے مطابق اسمبلی میں بغیر ایجنڈے اور بنا کسی قرار داد کے ہی بحث کرنے پر تلی ہوئی تھی، اے این پی نے بائیکاٹ کیا، ن لیگ نے احتجاج کیا، مگر قائم مقام سپیکر نے کسی کی نہ سنی، کہ وہ صرف ایم کیو ایم کی سننا چاہتے تھے۔ ایم کیو ایم کا یہ انداز سیاست ہے کہ وہ کسی بھی ایٹو پر اتنی بلند آہنگی سے ہنگامہ کرتی ہے کہ متاثرہ پارٹی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ جنوبی پنجاب میں اس کا براہ راست کوئی سروکار نہیں، مگر جمہوریت کی برکات سے مستفید ہونے کا کوئی موقع بھی وہ ضائع نہیں کرتے۔

ڈپٹی سپیکر نے اگر بغیر ایجنڈے اور قرار داد کے ایم کیو ایم کو تقریریں اور

ہنگامہ کرنے کا موقع دیا تو اس کے پیچھے بھی ایک فلسفہ ہے، کنڈی صاحب خود بھی سرانیکی صوبے کے جذباتی حامی ہیں، وہ اس قسم کے احتجاجی جلسوں میں تقریریں بھی فرمایا کرتے ہیں۔ وہ کیسے نہیں چاہیں گے کہ ان کی آواز دوسروں کے ذریعے بلند ہو، وہ ایم کیو ایم یا کسی اور کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا رہے ہیں، لیکن جس مقام بلند پر وہ بیٹھتے ہیں اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ جانبداری کا مظاہرہ کریں یا اپنے مقامی مفادات کے تحفظ کا کھیل کھیلیں۔ اگلے روز پھر ایم کیو ایم نے بحث کا آغاز تو کیا، مگر اجلاس ہنگامہ کی نذر ہو گیا، سپیکر کے لئے کاروائی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا، چنانچہ کاروائی ملتوی کرتے ہی بنی۔

سرانیکی صوبے کی کہانی مختلف ہے، اس میں ایک بڑا علاقہ بہاول پور بھی ہے، جس کے رہائشیوں کی ایک بڑی نمایاں اکثریت اپنے لئے بہاولپور صوبے کا مطالبہ کر رہے ہیں، ان کے پاس بھی تاریخی دلائل ہیں، سرانیکی خطے کے عوام بھی اب الگ صوبہ چاہتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کی تحریک بھی اگر پرانی تھی تو زیادہ نمایاں نہ تھی، اب سرانیکی صوبہ وزیراعظم اور ق لیگ کی خواہش بھی ہے، شاید سیاست بھی۔ عوام کی خواہشات تو اسی وقت پوری ہوتی ہیں جب مقتدر قوتوں کی منظوری ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہی بہتر ہو کہ یہ معاملہ آئینی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے، اور پارلیمنٹ اس نئے صوبے بنانے کے ایٹوپر قانون سازی

کدو سے متاثرہ سب اسی کے چاہنے والے ہیں۔

سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے غیر ترقی یافتہ علاقہ جات کے بہاول پور میں ہونے والے اجلاس میں تمام شرکا اس وقت حیران رہ گئے جب انہوں نے یہ جاننا کہ جنوبی پنجاب میں تعلیم، صحت اور دیگر بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے وفاقی حکومت نے 64 بڑے منصوبے تیار کئے ہیں جن پر 170 ارب روپے لاگت آئے گی، اس میں حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کل رقم کا 85 فیصد حصہ صرف ملتان شہر پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ کمیٹی نے اس رویے پر سخت احتجاج کیا۔ واضح رہے کہ جنوبی پنجاب کی تین ڈویژنوں کے کل گیارہ اضلاع ہیں، دس اضلاع کے لئے صرف 15 فیصد اور صرف ایک شہر کے لئے 85 فیصد رقم مختص کی گئی ہے۔ یہی نہیں، پیپلز ورکس پروگرام کا حال بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں۔

یہ حکومتی خانہ جنگی تو نہ جانے کیا رنگ دکھائے گی، مگر عدالت کی یہ بات کہ ”بادی النظر میں جناب وزیر اعظم کے معاملات ایمانداری پر مبنی نظر نہیں آتے“، قابل توجہ ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ عدالت کو کون کونسے ثبوت مہیا کئے گئے ہیں، یا انہوں نے ”بے ایمانی“ پر کھنے کا کیا پیمانہ مقرر کیا ہے، مگر اتنا معلوم ہے، کہ جب خلق خدا کچھ کہتی ہے تو اس کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی

بات ہوتی ضرور ہے۔ سرکاری وسائل کا استعمال ہو یا پروٹوکول کا معاملہ، دیکھنے والے انگشت بہ دندان رہ جاتے ہیں، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ گیلانی سرکار کے (ملتان والے) گھر کے باہر پولیس سکاڈ کی گاڑیاں ہمہ وقت تیار رہتی ہیں، نہ جانے کب، برادرِ خورد برآمد ہو جائیں، کب بڑے صاحبزادے کا باہر نکلنے کا پروگرام بن جائے یا کب چھوٹے یہ کہنا بھی عجیب سا لگتا ہے کیونکہ یہ بھائی جڑواں ہیں) صاحبزادے کا کسی تقریب میں جانے کا موڈ ہو؟

ایک وزیر اعظم تو اسلام آباد میں مقیم ہے، مگر ان کے بھائی اور اولاد کی صورت میں دو تین وزرائے اعظم ملتان میں بھی رہائش پذیر ہیں، یہ بات کسی کے علم میں اضافے کا موجب شاید نہیں بنے گی کہ وزارت عظمیٰ سے قبل کی صورت حال اور اب کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہوتا رہے، وطن عزیز میں کسی سے یہ پوچھنے کی روایت نہیں کہ بھائی مال کہاں سے بنایا۔ یہ خاندان تو صدیوں سے روحانی حکمرانی پر مامور ہے، یہ الگ بات ہے کہ روحانی سے دنیاوی حکمرانی بعد میں ایسی شروع ہوئی کہ روحانیت صرف گدی نشینی تک رہ گئی، اعمال و افعال دنیاوی ہو گئے، یہ لوگ پیری مریدی سے بھی مال کھاتے ہیں اور دنیا داری سے بھی مال بناتے ہیں۔ وزیر اعظم کا پہلے اپنے بھائی کے لئے اور اب اپنے لخت جگر کے لئے انتخابی

مہم چلانا اور ان حلقوں میں کروڑوں کے ترقیاتی منصوبوں کا اعلان کرنا اور کچھ کا افتتاح کرنا اور سنگ بنیاد رکھنا قرین انصاف نہیں، یہ عمل کسی بھی صورت میں دیانتداری کے ذیل میں نہیں آتا، یہ کرپشن بھی ہے اور دھاندلی بھی۔ لیکن سرعام سب کچھ ہو رہا ہے، کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی، اپوزیشن بھی خاموش ہے کہ پنجاب میں یہی کچھ لاہور اور دیگر اضلاع کے ساتھ ہو رہا ہے، دور دراز علاقوں کا خون نچوڑ کر لاہور کی رنگینیوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے، اب ملتان کا سیدزادہ بھی اسلام آباد اور لاہور کی طرح اپنے ساتھی غریب علاقوں کا استحصال کرنے پر اتر آیا ہے۔

یہ بھی لمحہ فکریہ ہے کہ مذکورہ بالا دس اضلاع کے عوامی نمائندے کس خواب غفلت میں غرق ہیں، انہیں اپنے حلقے کے عوام کے ساتھ روارکھے جانے والے ظلم کا احساس کیوں نہیں ہوتا، وہ کن مصلحتوں کا شکار ہیں، انہیں کونسے مفادات عزیز ہیں، اس غیر منصفانہ تقسیم کا ذمہ دار کون ہے، اس کا احتساب کون کرے گا۔ ٹوٹی پھوٹی یا کچی سڑکوں پر اترتی دھول، پینے کے صاف پانی کی عدم دستیابی، تعلیمی اداروں کے فقدان اور بنیادی طبی سہولتوں کا نہ ہونا جیسے مسائل والے علاقے فنڈ سے بھی محروم اور وزیراعظم کا شہر سب کچھ ہڑپ کر جائے، عوام کو اپنے روزگار کی فکر ہے تو عوامی نمائندوں کو اپنے پیٹ !! کی۔ نہ کوئی سنسنے والا اور نہ سنانے والا

احتساب، مگر کس کا؟

میاں نواز شریف کا یہ بیان ایسے ہی لگا جیسے گھنٹوں سے گئی ہوئی بجلی اچانک لوٹ آئے، اگرچہ مہنگائی، بد امنی اور غیر یقینی جیسی کیفیات نے عوام کے ذہنوں کو پرانگندہ کر رکھا ہے، مگر سیاستدانوں کی مہربانی ہی ہے کہ وہ اس قسم کے بیانات جاری کر دیتے ہیں، یا جوش خطابت میں ایسے اقوال زریں چھوڑ جاتے ہیں کہ لوگوں کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اب یہ کام خاص سیاسی رہنما ہی نہیں کرتے، بلکہ ملک کے مقبول ترین لیڈر بھی ایسی باتیں کر رہے ہیں، جو ایک دفعہ تو غم بھلا دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں غم بھلانے کی ضمانت مستقل نہیں، کیونکہ بعض اوقات غم عارضی طور پر غلط ہوتا ہے، بعد میں کرب کی صورت میں پھر نازل ہو جاتا ہے۔

سابق وزیراعظم نے ایک ہی جلسہ میں کئی اہم اور دلچسپ باتیں کیں، انہوں نے کہا کہ ”ماضی میں آمروں کا ساتھ دینے والے ججوں کا بھی احتساب ہونا چاہیئے“ میاں صاحب کا مطالبہ عوام کے دل کی آواز ہے، اگر وہ اس کے ساتھ آمروں کے احتساب کی بات بھی کر دیتے تو بھی عوام کو مزید خوشی ہوتی۔ عوام تو ایسے احتساب کے منتظر ہیں، مگر ”نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا“ کے مصداق

عوام ایسی خواہشات کی تکمیل سے میسر آنے والی خوشیوں سے مستفل محروم ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان ججوں کا تو احتساب ہو جنہوں نے آمروں کا ساتھ دیا تھا، ان سیاستدانوں کا احتساب کیوں نہ ہو جنہوں نے آمروں کا ساتھ دیا تھا۔ اگر معیار یہی ہے کہ آمروں کا ساتھ دینے والوں کا احتساب درکار ہے تو پھر بہت سے سیاستدان بھی احتساب کے قابل ہیں۔

معاملہ صرف آمروں کی حمایت تک ہی محدود نہیں، خود میاں صاحب کی سیاسی اٹھان ہی آمریت کی گود میں ہوئی، تربیت بھی وہیں سے پائی، ادھر ہی پاؤں پاؤں چلنا سیکھا اور وہیں سے سیاسی لڑکپن اور جوانی میں قدم رکھا۔ ان کی سیاسی جوانی بھی اسی آمریت کی چھتری تلے گزری، آمریت ختم ہوئی تو خود کو ان کا وارث قرار دیا پھر حالات بدل گئے، وراثتیں بھی ختم ہو گئیں، موقف بھی تبدیل ہو گئے، لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ اپنی سرپرست آمریت کی مخالفت کی ہو، یہ مروت کی ایک اچھی علامت ہے۔ البتہ یہ بات قرین انصاف نہیں کہ ایک آمریت کے احتساب کی بات کی جائے اور اپنی سرپرست آمریت کے لئے احتساب کے معاملہ میں خاموشی کی بکل مار لی جائے۔

میاں نواز شریف نے ایک اور بات بھی بڑی دلچسپ کی، ”اگر ہمارے مستعفی ہونے سے حکومت جاتی ہے تو ہم ابھی تیار ہیں۔“ بہت محتاط رہے، صرف اعلان کیا

عمل کا ارادہ نہیں کیا۔ کیا نواز شریف کو نہیں معلوم کہ ان کی پارٹی کے مستعفی ہو جانے کے بعد اسمبلی کے حالات یکسر تبدیل ہو جائیں گے، اتنی بڑی تعداد میں سیٹیں خالی ہونے سے حکومت ضمنی الیکشن کروانے کی پوزیشن میں نہیں ہوگی، وہ بھی ایسے موسم میں جب ہر جانب زوال اور خزاں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، ایسے میں تو گرتی ہوئی دیواروں کو ایک معمولی سا دھکا ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کے استغفوں سے ایک تحریک برپا ہو سکتی ہے، مگر میاں صاحب ایسا نہیں کرتے، اوپر سے یہ ضد بھی ہے کہ ہم فرینڈلی اپوزیشن نہیں۔

ان لیگ نے ”گوزرداری گو“ کا ترانہ بھی کچھ روز تک خوب الاپا، نہ جانے کیوں آخر خاموش ہو رہے، زرداری کو (کہیں) بھیجنے کی خواہش تو بہت کی مگر منصوبہ بندی اور عمل کی طرف توجہ نہ کی، شاید ایسا چاہتے ہی نہ تھے۔ خوش قسمتی سے میاں نواز شریف اس وقت بھی ملک کے مقبول ترین رہنما گئے جاتے ہیں، مگر ان کے اعمال و افعال میں تضاد ہوتا ہے، حکومت کے خلاف بیان بازی کرنے میں دونوں بھائی اپنی توانائیاں خوب صرف کرتے ہیں، مگر عمل کے وقت جمہوریت بچانے کے دعویدار بن کر حکومت کا ساتھ دینے کے پر مجبور ہو جاتے ہیں، صاف کیوں نہیں کہتے کہ موجودہ حکومت اپنی آئینی مدت پوری کر لے۔ ایک طرف اپنے بارہ سال ضائع ہونے کی بات ہے تو دوسری طرف مشرف کے خلاف ابھی تک پراسرار خاموشی؟ میمو کے خلاف تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیا، ایک جمہوری حکومت ختم کرنے کے جرم

کارِ تکاب کرنے والے مشرف کے خلاف عدالت نہیں گئے۔ خدایا! ہمارے قائدین

تضاد بیانی کب ختم کریں گے؟

ارکان پنجاب اسمبلی اپنے وزیر تعلیم پر برس پڑے، وجہ اس بارش کی یہ ہوئی کہ وزیر تعلیم پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے چار سالوں میں 33 میں سے 13 سوالات کے جوابات نہیں دیئے، اور جن کے دیئے، وہ بھی اکثر غلط تھے۔ ایک معزز ممبر نے کہا کہ وزیر موصوف سے پوچھے گئے سوال گندم جواب چنا ہیں، وزیر تعلیم کو اس عہدے پر نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک رکن نے کہا کہ ہم بچوں کے لئے سائنس لیبارٹری نہیں بنائیں گے تو بچے خاک پڑھیں گے۔ دیگر ارکان نے بھی جوابات غلط دینے پر برہمی کا اظہار کیا، اس ماحول میں وزیر تعلیم بے بس نظر آئے۔ وزیر تعلیم نے اسمبلی کو یہ بھی بتایا کہ پنجاب میں 18 ہزار سکولوں میں سہولیات کا فقدان ہے، جس کے لئے 150 ارب کی خطیر رقم درکار ہے۔

ارکان خوب جانتے ہیں کہ وزیر تعلیم پر مختاری کی تہمت ہی ہے، اول تو عرصہ دراز تک پنجاب میں تعلیم کا سرے سے کوئی وزیر ہی نہ تھا، پھر آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں مجتبیٰ شجاع الرحمن کا نام آنے لگا اور اب یہی نام وزیر تعلیم کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اگر موصوف کو گزشتہ چار برس کے حساب سے ارکان کی جلی کٹی سننی پڑی ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں، وہ انہوں نے اپنے قائد

پر ہونے والے وار اپنے سینے پر سبے ہیں، کیونکہ اس سے قبل یہ وزارت خود میاں شہباز شریف کی جیب میں ہی تھی۔ اگر وزیر تعلیم نے جوابات نہیں دیئے، یا غلط دیئے ہیں، تو اس سے پنجاب حکومت کی محکمہ تعلیم کو دی جانے والی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور اسی رویے کو دیکھتے ہوئے تعلیم اور تعلیمی اداروں کی حالت زار کا اندازہ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

سپیکر پنجاب اسمبلی نے کہا کہ وزیر تعلیم ذمہ داران کے خلاف انکوائری کروائیں اور کارروائی کریں، اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایوان خود یہ کام کرے گا۔ وزیر تعلیم نے یہ بھی بتایا کہ 2010-11ء سائنس لیبارٹری کی مد میں ایکٹ ارب روپے مختص کئے گئے تھے، ایکٹ ہزار سکولوں میں لیبارٹری بنانے کا منصوبہ تھا، سیلاب کی وجہ سے یہ فنڈز لیبارٹریوں کے لئے استعمال نہیں ہو سکے، تاہم رواں مالی سال میں اس کے لئے کوئی فنڈز نہیں رکھے گئے۔ کیا کسی اور محکمے یا خود حکومتی عیاشیوں میں کٹوتی کر کے بھی کوئی رقم سیلاب زدگان پر لگائی گئی؟ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جہاں لیبارٹری نہیں وہاں عارضی بندوبست کیا گیا ہے (شاید یہ بات بھی غلط جواب کی ذیل میں ہی آتی ہو)۔ ارکان کے جذباتی ہونے پر وزیر تعلیم نے کہا کہ معزز ارکان اپنے فنڈز سے بھی اپنے حلقے کے سکولوں کی اپ گریڈیشن کا کام کر سکتے ہیں۔

ویسے تو یہ 18 ہزار سکولوں میں سہولیات کے فقدان والا بیان بھی درست معلوم نہیں ہوتا، یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ٹھیکیداری کلچر کی آڑ میں کمیشن مافیاسرگرم رہتا ہے، کمیشن خور افسران کی بلا سے جتنی رقم اصل کام پر خرچ ہو، ان کا حصہ بروقت اور اصل مقدار میں موصول ہونا چاہیئے، دوسری طرف ٹھیکیدار کی کوشش ہوتی ہے کہ جتنی ناقص سے ناقص چیز لگائی یا مہیا کی جائے وہ بہتر ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ بچت ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سڑک ہو یا کمرہ، فرنیچر ہو یا کمپیوٹر لیب، بننے کے چند روز بعد ہی اس کے بھینے ادھڑنے لگتے ہیں، اور جو چیزیں مہیا کی جاتی ہیں ان کے نمونہ جات بھی ”ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور“ والا معاملہ ہوتا ہے۔

محکمہ تعلیم کے افسران بھی بسا اوقات بہتی گنگا میں اشران کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ناقص اشیاء طالب علموں کے مقدور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض چیزیں خود ”اوپر“ سے آتی ہیں، مثلاً کمپیوٹر لیب، تو اس میں اول تو لاڈلا سپلائر خوب کمائی کر لیتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر وہ اشیاء معیاری بھی ہوں تو سکولوں میں ان کی حفاظت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور کچھ ہی عرصہ بعد کروڑوں کی لیبارٹری یا لائبریری گردوغبار میں دب کر رہ جاتی ہے، یا اس کے قیمتی پرزہ جات چوری ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور وہ

یہ بار ٹرمی جس کا چند ماہ قبل کسی وزیر شہزیر یا کسی اور وی آئی پی شخصیت نے افتتاح کیا

ہوتا ہے، کرپشن اور نااہلی کی بھینٹ چڑھ کر اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوتی ہے۔

جشن عید میلاد النبی ﷺ کے تقاضے

اس نے ہاتھوں کی پلیٹ میں رکھ کر ایک ملفوف کارڈ مجھے دیا، مصروفیت کی وجہ سے میں اسے موقع پر تو نہ کھول سکا تاہم گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک دعوت نامہ تھا جس میں ربیع الاول کے حوالے سے ایک محفل کا ذکر تھا، جس میں مرکزی جلسہ اور جلوس کے وقت اور جگہ کا تعین کیا گیا تھا، اس کے ساتھ ہی بڑے سائز کے ایک صفحہ کے دونوں طرف ان علاقوں کے نام، قیادت کرنے والے اصحاب کے اسمائے گرامی اور جہاں جہاں سے جلوسوں نے گزرنا تھا ان علاقوں کے نام درج تھے۔ اول و آخر عقیدت کے پھول بھی نچھاور کئے گئے تھے، دعائیں طلب بھی کی گئی تھیں اور شرکاء کے لئے خوشخبریاں بھی موجود تھیں۔

کالم کے آغاز میں ہی میں معافی کا خواستگار ہوں، اگر میری نگارشات کسی محترم قاری کے دل پر گراں گزریں تو میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں، ایسے حساس معاملات پر رائے زنی کرنا گویا مصیبت کے منہ میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ انسان فتوؤں کے ایسے گرداب میں پھنس جاتا ہے جہاں سے سلامت نکلنا مشکل ہو جاتا ہے، اور ستم یہ کہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ نہ جانے جشن عید میلاد النبی ﷺ کے کتنے جلوس ہیں جو 12 ربیع الاول کو برآمد ہوں گے اور بالآخر ایک بڑے جلوس

میں شامل ہو جائیں گے، ان کے لئے کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں، روٹ تیار ہو چکے ہیں۔ یکم ربیع الاول سے ہی چھوٹے چھوٹے جلوس بڑے پروگرام کی ریہرسل کرتے دکھائی دیتے ہیں، شہروں کی معروف سڑکوں پر مدرسے کے بچوں کی قطاریں گزر رہی ہوتی ہیں، جھنڈے لہراتے، نعرے لگاتے یہ بچے روزانہ سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ آخری دن تو نہایت عقیدت سے سیکڑوں ٹرائیاں اور دیگر سواریاں لاؤڈ سپیکر لگائے جوش خروش سے منزل کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔

اگرچہ ہمارے علماء حضرات کے پاس اپنے اعمال و افعال کے لئے بیسیوں دلائل ہوتے ہیں، انہیں اظہار کا سلیقہ بھی آتا ہے اور ان کے پاس محراب و ممبر کی صورت میں زبردست پلیٹ فارم بھی موجود ہے۔ مگر ذرا سوچئے، کہ کیا ان کمیٹیوں نے اصلاح معاشرہ میں کبھی کوئی کردار ادا کیا ہے؟ ہمارے شہروں کے درمیانے اور غریب علاقوں کی گلیاں محلے کوڑا کرکٹ سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں، ہر گلی کے باہر کچرے کا ڈپو موجود ہوتا ہے، کیا صفائی نصف ایمان نہیں، کیا اس عظیم مقصد کے لئے ہم میں سے کسی نے کبھی کوئی کمیٹی تشکیل دی؟ گلیاں محلے تو الگ بات ہے، مساجد اور سکولوں کے قریب خالی جگہوں پر بھی کوڑے کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ کیا کوئی کمیٹی اس کار خیر کو بھی سنت نبوی ﷺ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں گے؟ کیا ہم نے کبھی ایسی کمیٹیاں بنائیں جو ہمارے بچوں کو آوارگی اور بے راہ روی سے بچانے کا بندوبست کریں؟ کیا ہم لوگ اپنے کاروبار میں دیانتداری سے

کام لیتے ہیں، ہم میں سے کتنے ہیں جو ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کی غلاظت سے پاک ہیں؟ کتنے ہیں جو ناجائز منافع خوری نہیں کرتے؟ کیا ہم نے معاشرتی برائیوں کے خاتمہ کے لئے کبھی اپنی خدمات پیش کیں یا رکاوٹ بننے کی کوشش کی؟

شہروں میں ایسے بینروں نے سایہ کر رکھا ہے، جن پر آمد رسول اللہ ﷺ کے نعرے درج ہیں، ان بینر لکھوا کر ثواب دارین حاصل کرنے والوں میں سے ممکن ہے کوئی لوگ ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں سے مستحق لوگوں پر بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور رشوت ستانی کے ذریعے دواست جمع کرتے ہیں، حج اور عمرہ کی سعادت بھی حاصل کر لیتے ہیں، مگر کسی ہونہار غریب بچی کی سکول کی فیس یا دیگر اخراجات کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتے، کسی مستحق بچی کے علاج یا جہیز خریدنے میں تعاون نہیں کرتے، کیا لاکھوں روپے کے بینر معاشرتی زوال کے زمانے میں ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا ہمیں دکھاوے اور جلوسوں کی بجائے سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہیئے؟ کیا عقیدت اور محبت کا اظہار جلوسوں اور نعروں سے زیادہ ہوتا ہے یا اپنی زندگی کو اتباع رسول ﷺ کے مطابق ڈھالنے سے؟؟

گوگل اور سیاحتی مقامات؟

حکومت پنجاب کے گوگل کے ساتھ تازہ معاہدہ کے موقع پر مایوسی کی باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، مگر کیا کیجئے کہ کچھ عادتیں سر کے ساتھ ہی جاتی ہیں، زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے کے لئے انفارمیشن ٹیکنالوجی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، جس نے ایسا سوچا وہ اس دوڑ میں نہ صرف پیچھے رہ جائے گا، بلکہ اس کے کچلے جانے کا امکان زیادہ ہے۔ ہمارے حکمران دعوے بھی بہت کرتے ہیں، اور اپنے سوچے اور کئے پر مزید کچھ سننے اور اس میں تبدیلی کا حوصلہ بھی کم ہی رکھتے ہیں۔ اب گوگل نے پنجاب کے تاریخی اور سیاحتی مقامات دنیا کے سامنے پیش کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں، دنیا دیکھ سکے گی کہ ماضی کے حکمرانوں نے اس خطے میں طرز تعمیر کے کون کون سے شاہکار نمونے تیار کئے، جو صدیوں سے سیاحوں کی تفریح طبع کا سامان کرنے کے لئے موجود ہیں۔

پنجاب حکومت کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترویج اور ترقی کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کی تحسین نہ کرنا بجلی کے زمرے میں آتا ہے، اچھا کام تعریف و تقلید کا حقدار ہوتا ہے۔ حکومت اس ضمن میں اپنے خیال میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے، سکولوں میں آئی ٹی لیسز دی گئیں، تعلیمی بورڈوں کے

امتحانی نظام کو کمپیوٹرائزڈ کیا گیا، سافٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک کا نام ارفع کریم کے نام کیا، اور اب ایک لاکھ پچیس ہزار لیپ ٹاپ تقسیم کرنے کا کام شروع ہے۔ پنجاب حکومت کی یہ ساری کاوشیں آئی ٹی کے فروغ کے لیے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک تازہ کٹری پنجاب حکومت اور گوگل کے درمیان انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک یادداشت پر دستخط کرنا ہے، اس معاہدے کی رو سے گوگل کے ذریعے پنجاب کے سیاحتی اور تاریخی مقامات کو انٹرنیٹ پر رسائی دی جائے گی، جس سے دنیا بھر کے کروڑوں افراد پنجاب کے قدیم اور جدید ورثے سے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔ بظاہر تو ذکر پورے پنجاب کا ہی ہے، ہو سکتا ہے کہ گوگل کا سارا زور لاہور پر ہی لگا رہے، ویسے لاہور جہاں پنجاب کے حکمرانوں کا شہر ہے، وہاں تہذیب و ثقافت میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں، لاہور روایات کا امین بھی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اتنے سارے تاج سر پر سجانے سے رویوں میں کچھ تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے۔

توقع کی گئی ہے کہ دنیا میں کروڑوں افراد گوگل کے ذریعے ایسے مقامات کو دیکھ سکیں گے، لیکن کیا ان مقامات کی حالت زار ایسی ہے کہ ہم کسی کو اس کی دعوت نظارہ دیں، کسی کو اس کی سیاحت کی طرف مائل کریں۔ پنجاب سیاحت کے مقامات کے اعتبار سے خود کفیل خطہ ہے، اس کے چپے چپے پر تاریخ کے قدموں کے نشانات ہیں، بہت سے تو معروف ہیں مگر بے شمار ایسے بھی ہیں جو ہماری

حکومتوں کی عدم دلچسپی کے باعث منظر عام پر نہیں آ سکے، یا ان مقامات تک رسائی کے لئے مناسب سڑکیں بھی موجود نہیں۔ کوئی بہت باذوق یا جنونی ہی ایسے علاقوں کی خاک چھانے، ان مقامات کو ڈھونڈ نکالے اور پھر وہاں پہنچ کر زمانے اور حکمرانوں کی عدم توجہی پر ماتم کرے، ایسی جگہوں کو دیکھنا تو اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کے مترادف ہے، مگر جب وہاں لاوارث کھنڈرات کے سوا کچھ نہیں ہوتا، تو صدمے سے دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ان مقامات کو گولگل پر دکھانا بھی ٹھیک ہے، مگر ان کی حالت پر توجہ دینا بھی آخر حکومتوں کا ہی فرض ہے، ان کا محکمہ آثار قدیمہ اپنے ورثے کو محفوظ رکھنے کی بجائے قدیم آثار کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، ان خوبصورت سیاحتی ورثہ جات کو ہم اپنے ہاتھوں ضائع کر رہے ہیں۔ ہمارے حکمران یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ترقی یافتہ قومیں ایسے مقامات کی حفاظت کر کے ان کی مدد سے بے حساب زر مبادلہ کماتی ہیں، شاید ہمارے مقدر میں نوحہ گری اور ماتم ہی ہے کہ اپنی پسند کے دیگر منصوبوں پر تواریبوں روپیہ جھونک دیتے ہیں، مگر ماضی کو دنیا سے نابود ہونے سے بچانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتے۔ گولگل پر جانے کا معاہدہ خوش آئند، مگر زمینی حقائق سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ان مقامات کی حالت ناقابل دید ہے۔

وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے بارے میں تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ ان کا جذباتی رویہ ان کے اجتماعی رویے پر غالب رہتا ہے، بہت کم مواقع پر ہی وہ مسکراتے پائے جاتے ہیں۔ ان کے انداز کو اگر ان کی عادت قرار دے کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اقدامات، فیصلے اور منصوبے بھی جذبات سے بھرپور ہوتے ہیں، ان منصوبوں اور فیصلوں کے بارے میں ان کا رویہ یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے، اگر کسی کو موقع مل بھی جائے تو اس بات کے بعد ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایکٹ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب حکومت نے اربوں روپے مالیت سے انصاف کی فراہمی، میرٹ اور شفافیت کے عمل کو یقینی بنایا ہے، تاکہ حقداروں کو ان کا حق مل سکے، یہی پنجاب حکومت کا طرہ امتیاز ہے۔ دوسری طرف اسلام آباد میں بیٹھی ہوئی حکومت کھربوں روپے کی کرپشن کر رہی ہے، لوٹ مار ان کا کلچر ہے، اگر وفاقی حکومت نے لوٹ مار بند نہ کی تو میں اقتدار کو ٹھوکر مار کر عوام کے ساتھ مل جاؤں گا۔

میاں شہباز شریف کی باتیں جہاں جذباتی ہیں وہاں دلچسپی سے بھی خالی نہیں، جہاں تک ان کے میرٹ کے دعوے ہیں تو وہ ایسے غلط بھی نہیں، انہوں نے اپنے

دور میں طلباء و طالبات کے لئے بے شمار انعامات رکھے ہیں، بورڈ ٹاپ کرنے والے بچوں کو لاکھوں روپے دینے سے لے کر سکالرشپ کی تقسیم تک تمام معاملات کو میرٹ کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے تو اس میں بہت حقیقت بھی ہے، لیکن ان لوگوں کے بارے میں خاموشی کا روزہ کبھی افطار نہیں کیا جاتا جنہیں ن لیگ صرف اس لئے سرکاری مراعات سے نواز رہی ہے کہ ان کے سر پر ”برے وقت میں ساتھ کھڑے رہنے“ کی کلنی لگی ہوئی ہے۔ ایسے بے شمار لوگ مختلف اداروں یا محکموں کے سربراہ بھی بنے بیٹھے ہیں، ٹاؤن کمیٹیاں، مارکیٹ کمیٹیاں، ترقیاتی ادارے اور ٹاسک فورسز حکومت کا ہاتھ بٹانے میں مصروف عمل ہیں۔

یقیناً حکومت کے پاس اس قسم کے صوابدیدی اختیارات ہونگے، جن کی بنا پر سرکاری کالریاں، دفاتر اور عملہ اپنے لوگوں کو عنایت کر دی جاتی ہیں، لیکن ان صوابدیدی اختیارات کے پیچھے ہمیں میرٹ نامی کسی چڑیا کا وجود نظر نہیں آتا، شفافیت کی صرف گردان ہی کرتے جانے کا نام میرٹ نہیں ہوتا، اپنے میرٹ کے ابلاغ پر ہی کروڑوں روپے کے اشتہارات دینا بھی نہ میرٹ ہے، نہ شفافیت۔ ان اختیارات کی آڑ میں ایسے لوگ عوام پر مسلط کئے گئے ہیں، جن کا ماضی اور حال ایسا ہے، جس پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ اصول اور میرٹ کا ایسا ڈھنڈورا بیدٹا جاتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، لیپ ٹاپ کی تقسیم کے لئے نصف صفحہ کے اشتہارات کافی روز تک شائع ہوتے رہے، جب تک لیپ

ٹاپ تقسیم ہوتے رہیں گے یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا، اس تقسیم کے موقع پر جو افتتاحی تقریب کے اخراجات ہیں وہ بھی میرٹ اور اصول پسندی کی نفی کرتے ہیں۔
 وفاقی حکومت پر لگائے گئے الزامات تو جوں کے توں ہیں، کیا اب وہ وقت آگیا ہے کہ میاں صاحب اقتدار کو ٹھوکر مارتے ہوئے خود عوام سے آملیں، گویا وہ پہلے عوام کے اندر نہیں ہیں، ان کے منصوبے بھی زبان حال سے یہی ظاہر کر رہے ہیں، کہ وہ عوام کے اجتماعی مفاد کی بجائے ایکٹ بہت ہی چھوٹی اقلیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے جاری کئے جاتے ہیں۔ مثالوں کی کمی نہیں، کہ دانش سکول، ماڈل گاؤں، تعلیمی بورڈوں کا رزلٹ اور لیپ ٹاپ بھی میرٹ اور مفاد کے درمیان کی ہی کسی کیفیت کا نام ہے، عوام کی بنیادی ضرورتوں سے پہلو چراکے نان ایشوز پر اربوں روپے اور تمام تر توانائیاں صرف کردینا لمحہ فکریہ بھی ہے اور میرٹ اور شفافیت کے دعوے پر سوالیہ نشان بھی۔

ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ قومی اسمبلی کی جو کمیٹی پٹرولیم کی قیمتوں میں کمی کے لئے قائم کی گئی تھی، اس کے اجلاس میں ارکان کو بتایا گیا کہ آئندہ ہفتے پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ خبر میں ارکان اسمبلی کے کسی رد عمل کی اطلاع نہیں ہے، بعید نہیں کہ کوئی رد عمل ظاہر ہی نہ کیا گیا ہو۔ ایکٹ رکن نے کہا کہ پٹرولیم کی قیمتوں پر سیلز ٹیکس فکس کیا جائے، ڈنرل کی قیمتوں میں کمی کی جائے خواہ وہ علامتی ہی کیوں نہ ہو (؟؟)۔ سیکریٹری پٹرولیم نے بتایا کہ چونکہ عالمی مارکیٹ میں قیمتوں میں اضافہ ہو چکا ہے، اس لئے ہمیں بھی مجبوراً یہ کام کرنا پڑے گا۔ وزیر خزانہ نے کہا کہ ”پارلیمانی کمیٹی کا رول صرف اپنے لئے تالیاں بھجوانا نہیں ہونا چاہیئے، حکومت مہنگائی کا بوجھ کم کرنے کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے جا رہے ہیں، تمام فیصلے قومی مفاد میں ہونگے۔ موجودہ حکومت عوام کو مشکل میں دیکھ کر تکلیف محسوس کرتی ہے، دوسری طرف حکومت کو مالی مشکلات کے باوجود اقتصادی ترقی کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے۔ محدود وسائل کے پیش نظر سبسڈی دی جاتی ہے، یہ یا تو عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ ڈال کر پوری کی جاتی ہے یا بیرونی دنیا کے آگے ہاتھ پھیلا کر حاصل کئے گئے قرضے اسی مد میں خرچ کئے جاتے ہیں، دونوں صورتوں میں بوجھ آخر عوام پر ہی پڑتا

ہے ” کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ آئندہ اجلاس میں پٹرولیم کی قیمتوں سے متعلق فیصلہ کر لیا جائے گا۔

ہم یہاں یہ اندازہ تو نہیں لگا سکتے کہ قیمتیں کم کروانے والی کمیٹی جب قیمتوں میں اضافہ کی خبر لے کر باہر آئی ہوگی تو ان کے دل و دماغ پر کیا گزری ہوگی، وہ پریشان ہوئے یا پھر افسروں اور افسر نماؤں کی باتیں سن کر لاجواب اور بے بس ہو گئے، یا ان حضرات کی ’مدلل‘ گفتگو سن کر ان کے نظریات کے قائل ہو گئے۔ کمیٹی پر ایک اہم انکشاف یہ بھی کیا گیا کہ حکومت عوام کو مشکل میں دیکھ کر تکلیف محسوس کرتی ہے اور یہ بات تو اور بھی دلچسپ ہے کہ حکومت مالی مشکلات کا بھی شکار ہے اور محدود وسائل کے باوجود سبسڈی دے رہی ہے۔ خدایا! جس ملک میں حکمرانوں کے لاکھوں روپے کے روزانہ مستقل اخراجات ہوں، جن کی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر بھی لاکھوں ہی اجڑتے ہوں، جن کا رہن سہن شاہانہ ہو، جن کی اربوں کی کرپشن کے قصے عام ہوں، جن کے آگے پیچھے دسیوں گاڑیاں پروٹوکول کے نام پر سفر کرتی ہوں، ایسی حکومت مالی مشکلات کا شکار ہے؟ یہ محدود وسائل کے لچھن ہیں، بھی اگر وسائل محدود ہیں اور مالی مشکلات کا سامنا ہے تو حکومت کچھ کفایت شعاری کا سوچے، کچھ فضول خرچی پر قابو پانے کی کوشش کرے، کچھ الٹے تلووں کو روکے، کچھ عیاشیوں میں کمی کرے، کچھ اپنوں کو نوازنے سے ہاتھ روکے۔ کیا فرماتے ہیں سرکاری دانشور بیچ مالی

مشکلات کے مسئلے کے؟

کیا کمیٹی کے سربراہ ریاض حسین پیرزادہ نہیں جانتے کہ پٹرول گاڑیوں میں جلتا ہے، اور گاڑیوں کی عیاشی پر کس طرح کنٹرول کیا جاسکتا ہے، وہ خود تو پروٹوکول کے قائل نہیں ہیں، تو پھر عیاشی کرنے، دوستوں کو نوازنے اور پروٹوکول وغیرہ کے نام پر چلنے والی گاڑیوں پر پابندی کیوں نہیں لگواتے، اگر آج حکومت سنجیدگی سے تمام سرکاری گاڑیوں کو صرف سرکاری کاموں کے لئے پابند کر دے، تو حکومت کو پٹرولیم کی قیمتوں پر سبسڈی دینے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ یا پھر دیگر معاملات کی طرح سپریم کورٹ آف پاکستان از خود نوٹس لے کر سرکاری گاڑیوں کے ذاتی استعمال پر نہ صرف پابندی لگا دے بلکہ ایسے جرم کا ارتکاب کرنے والے افراد کو بھاری جرمانے اور جیل کی سیر بھی کروادے تو قوم بھی سکھ کا سانس لے گی اور پٹرول کی قیمتیں بھی قابو میں آجائیں گی۔ جب حکومتیں خود کچھ نہیں کرتیں تو پھر سپریم کورٹ کے از خود نوٹس پر تنقید کرنے کا بھی انہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ بھی خوب کہی کہ آئندہ اجلاس میں فیصلہ کر لیا جائے گا، بھلا کمیٹیاں بھی کبھی فیصلوں کے لئے بنائی جاتی ہیں؟

یہ کالم ضمنی الیکشن کے ضمن میں ضرور ہے مگر الیکشن پر ماہرانہ رائے ہر گز نہیں کہ ہم مہارت سے یکسر تہی دامن ہیں۔ یہ کارِ خیر ادارہ نولیس، کالم نگار، دانشور اور ٹی وی پروگراموں کے میزبان اور خود عوام بھی کافی بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں۔ ہمیں تو وزیراعظم پاکستان جناب سید یوسف رضا گیلانی سے اظہارِ ہمدردی کے لئے چند الفاظ لکھنے ہیں، سو لکھ رہے ہیں۔ الیکشن کے نتیجے کے بعد ایک خبر یہ بھی دی گئی کہ وزیراعظم واحد فرد ہیں جن کے گھر سے چار افراد اسمبلیوں میں موجود ہیں، وزیراعظم موصوف کے علاوہ ضمنی الیکشن میں کامرانی پانے والے ان کے لختِ جگر موسیٰ گیلانی قومی اسمبلی میں رونق افروز ہیں، جبکہ ان کے برادرِ خورد محبتے گیلانی اور خلیف الرشید عبدالقادر گیلانی پنجاب اسمبلی میں جلوہ گر ہیں۔ اتنی مقبولیت اور پذیرائی مقدر والوں کو ہی ملتی ہے۔

یہ ضمنی الیکشن عوام کی دلچسپی کا سبب نہ تھا، ٹرن آؤٹ سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے، کیونکہ حکومت اگر اپنی مدت ختم ہونے تک بھی قائم رہی تو بھی شام کے سائے گہرے ہو چکے ہیں اور منزل سامنے نظر آرہی ہے۔ امیدوار بھی گومگو کا

شکار تھے، سیاست میں میدان خالی چھوڑنا کوئی اچھا شگون نہیں ہوتا، نیا آنے والا قدم
 جما بھی سکتا ہے، پرانے برجوں کو ہٹا بھی سکتا ہے، اپنا مقام بنا بھی سکتا ہے، اس لئے
 مجبوراً میدان میں کودنا پڑتا ہے، جاوید ہاشمی یا شاہ محمود قریشی کا معاملہ تو ذرا مختلف ہے
 کہ ان کی نئی جماعت نے قومی الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا، اب ضمنی الیکشن میں حصہ لینا
 بلا جواز تھا، لیکن جس پارٹی کی سیٹ تھی، فی الحال تو اسی کو مل گئی، اس الیکشن میں
 وراثتی سیاست کی جھلکیاں بھی نمایاں نظر آئیں، گیلانی، مخدوم اور مرزا اپنا کاروبار
 سیاست اپنی اولاد کو منتقل کرنے میں کامیاب ٹھہرے، کمال ہے جمہوریت کا لبادہ بھی
 قائم ہے اور موروثی سیاست بھی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ دیکھیں اگلے الیکشن تک سونامی
 اور انقلاب اور خدمت کے دعویدار کس تناسب سے کامیا بیاں حاصل کرتے ہیں۔
 وزیر اعظم سے اظہار ہمدردی کی اہم وجہ تو یہی ہے کہ موجودہ حکومت اپنی آئینی مدت
 پوری کرنے کو ہے، اب اس موقع پر اپنی اولادوں کو کروڑوں روپے خرچ کر کے
 اسمبلیوں میں لے جانا زیادہ مفید کام نہیں، لیکن اصل پریشانی یہ ہے کہ اب اگلے بچے
 کچھے وقت میں کوئی سیٹ خالی ہوتی نظر نہیں آتی جس پر ضمنی الیکشن کروایا جاسکے،
 کیونکہ گیلانی صاحب کے پاس ابھی دو تین افراد ایسے موجود ہیں جو اگرچہ وزارت عظمیٰ
 سے تو لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن خود براہ

راست اس مزے سے محروم ہیں جو اس خاندان کے دیگر افراد لے رہے ہیں۔ دختر نیک اختر تو میدان سیاست میں اتر چکی ہیں، خواتین کے معاملات میں خیر سگالی سفیر بھی ہیں، یہی تو فائدہ ہوتا ہے، اقتدار میں ہوتے ہوئے بھی اگر سیاسی تربیت نہ ہوئی تو کب موقع ملے گا؟

اب یا تو سپریم کورٹ کسی معزز ممبر کو جعلی اسناد کی بنا پر رکنت سے فارغ کر دے، یا کوئی ایماندار رکن اسمبلی سونامی والوں سے مل کر اپنی سیٹ ان عوام کے حوالے کر دے جنہوں نے انہیں اقتدار کے ایوانوں میں بھیجا تھا، ایکٹ اور ذریعے سے بھی کوئی نشست خالی ہو سکتی ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ کام کسی کے کرنے سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوگا، یہ صورت اتنی پرکشش اس لئے بھی نہیں ہے کہ جس کی سیٹ خالی ہوتی ہے وہ اسی کے لواحقین کو دی جاتی ہے۔ ہماری ہمدردیاں اپنے وزیراعظم کے ساتھ ہیں، کہ شاید اب ان کے خاندان کے رکن پارلیمنٹ بننے کا ریکارڈ مزید بہتر نہ ہو سکے، بظاہر کوئی سیٹ خالی ہوتی نظر نہیں آتی، ان کا بیٹا، بیٹی اور خاتون اول اب اگلے الیکشن کا انتظار کریں، لیکن خاندان کے تمام افراد یہ ضرور یاد رکھیں کہ اپنی حکومت کے دوران ضمنی الیکشن اور آزادانہ قومی الیکشن میں بہت فرق ہوتا ہے۔

اردو بولنے سے معذرت؟

قومی احتساب بیورو کے چیئرمین نے اردو بولنے سے معذرت کر لی، صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ اردو نہیں بول سکتے۔ خبر میں اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ ان کے معذرت کی وجہ کیا تھی، کیا وہ اردو سے نا آشنا ہیں، یا اردو بولنے میں ان کی توہین کا کوئی پہلو نکلتا ہے کہ ایسا کرنا ان کے منصب کو زیر نہیں دیتا، بہتر ہوتا کہ اردو سے معذرت کی خبر کے ساتھ ہمارے صحافی بھائی اس کی وجہ بھی معلوم کر لیتے۔ اگرچہ وجہ معلوم نہیں، لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس انکار کی وجہ کیا ہے۔

ہم وہ بد قسمت قوم ہیں جن کی قومی زبان بھی مظلوم ہے، جن کے حکمران اور بیورو کریسی اردو کی بجائے انگریزی بولنے کو ترجیح دیتے ہیں، کئی ایسے حکمران بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان پر مسلط رہے ہیں جو اردو اخبارات ہی نہیں پڑھتے تھے۔ جس فرد کو انگریزی نہیں آتی وہ کسی محفل میں معزز نہیں کہلا سکتا، اہمیت اسی کی ہوتی ہے جو انگلش میں بات کرے۔ انگریزی کو پروٹوکول کی زبان بنا دیا گیا ہے، بعض تقریبات کو اعلیٰ سطحی بنانے کے لئے ان میں صرف انگلش میں ہی خطابات فرمائے جاسکتے ہیں، ایسی تقریبات میں اردو کا داخلہ بند ہوتا

ہے۔

انگریزی بولنا تو عام ہے، مگر اب صرف انگریزی بولنے کی مثالیں بھی سامنے آنے لگی ہیں، آخر اس تبدیلی کے پیچھے کوئی سوچ تو ہے جو ماحول بنا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اب سرکاری نصاب بھی انگلش میڈیم ہوا کرے گا، اگرچہ ترقی کے اس زینہ پر ہم صدیوں پہلے قدم رکھ چکے تھے، مگر اب ہمارے حکمرانوں اور ماہرین تعلیم نے یہ راز پالیا ہے کہ انگریزی کی تعلیم کو عوام وغیرہ کی مرضی پر نہ چھوڑا جائے، یعنی اختیاری یا صوابدید نہ ہو بلکہ اب اسے نصاب تعلیم کا لازمی حصہ بنادیا جائے، چنانچہ اب ہماری نئی نسل اس بین الاقوامی زبان میں ہی تعلیم حاصل کیا کرے گی، اب ہم بھی کسی سے کم نہ ہونگے۔

یہاں یہ گھسا پٹا موضوع چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ناخواندہ قوم کو پہلے سکول کی راہ تو دکھائی جائے، پھر تدریس کی زبان کا تعین بھی ہو جائے گا۔

اگر ہماری گزارشات کو جذبات سے مغلوب نہ جانا جائے تو ہم عرض کریں گے کہ ہمارا انگریزی بولنے والا طبقہ دراصل انگریزوں کی غلامی میں ذہنی اور دلی طور پر جکڑا ہوا ہے، ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی وغیرہ کے لئے انگریز کی جو حیثیت ہے وہی عوام کے لئے انگریز کے ان شاگردوں کی ہے جو قوم پر مسلط ہیں۔ ہمارے دانشور بھی انگریز کی مخالفت کو گناہ جانتے ہیں کہ یہ

انٹرنیشنل، زبان ہے، پوری دنیا میں سنی اور سنجھی جاتی ہے، اس لئے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن ہمارے ان رائے سازوں کو ان ممالک کے معاملات کا جائزہ بھی لینا چاہیئے جہاں انگلش کا کوئی لفظ کسی سائن بورڈ پر بھی نظر نہیں آتا، وہ قومیں یورپ میں نمایاں حیثیت سے زندہ ہیں، وہ قومیں نہ کسی کی محتاج ہیں اور نہ ہی دست نگر۔

جن ممالک میں انگریزی پڑھائی، بولی، لکھی اور سنجھی نہیں جاتی ان کو ہمارے حکمران یا بیوروکریٹ یا دانشور کیا نام دینا پسند فرمائیں گے، وہ ممالک تنگ نظر ہیں، وہ غیر مہذب ہیں، وہ ماضی سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں، وہ دقیانوسی ہیں۔ ٹھیک ہے بہت سے ممالک میں انگریزی کو بطور مضمون کے پڑھایا جاتا ہے، مگر جاپان، چین، جرمنی، ڈنمارک، ناروے، روس اور بھی بے شمار ملک ایسے ہیں جو ترقی کی منازل طے کر چکے ہیں مگر انگریزی کے بغیر، ان پر کوئی فتوے بازی نہیں ہوتی، بلکہ وہ بھی ہمارے لئے مثال ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں مقتدر لوگوں کا یہ آخری فیصلہ ہے کہ انگریزی ہی حرف آخر ہے، اسی کے راستے ترقی کی منزل پر پہنچا جاسکتا ہے، ایسے میں اگر احتساب بیوروکریٹ چیرمین اردو بولنے سے انکار فرمادیں تو اردو کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا، نہ ہی اس کی بے عزتی ہوتی ہے (وہ تو عزت والوں کی ہوتی ہے) البتہ اہم تقریبات اور مواقع پر اردو بولنے والوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے، آئندہ اس میں اضافہ ہی متوقع ہے۔

! تعلیم، پاکستان کہاں کھڑا ہے

خبر پریشان کن بھی ہے اور باعث ندامت بھی۔ ایک تحقیقی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی بہترین 400 جامعات میں پاکستان کی کوئی بھی یونیورسٹی شامل نہیں، اس وقت امریکہ میں 5 ہزار 758 یونیورسٹیاں ہیں، 56 کے لگ بھگ اسلامی ممالک میں کل 580 جبکہ بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد مجموعی طور پر اسلامی ممالک سے زائد یعنی 583 ہے۔ پاکستان میں 128 جامعات تعلیمی میدان میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ دنیا کی 400 بہترین جامعات میں اسلامی ممالک میں سے سعودی عرب کی صرف ایک یونیورسٹی شامل ہے، امریکہ کی 6 جبکہ بھارت کی 2 یونیورسٹیاں اس فہرست میں شامل ہو سکی ہیں۔ امریکی جریدے ”یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ“ نے یہ درجہ بندی تعلیم اور کیریئر پر تحقیق کرنے والے ایک بین الاقوامی ادارے سے کروائی ہے، جس میں دنیا میں یونیورسٹیوں کی علمی ساکھ، عملے کی ساکھ، فیکلٹی اور طلباء کا تناسب انٹرنیشنل فیکلٹی اور دیگر معاملات کو میرٹ بنایا گیا ہے۔

مندہ ہی تعلیمات، تاریخ دانوں، روایات اور دانشوروں کی رائے یہی ہے کہ کسی قوم کی ترقی، خوشحالی اور عروج کے لئے اللہ تعالیٰ کے کچھ اصول ہیں، جو اقوام یا افراد ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں، وہ کامرانی کی منازل کو

ضرور پاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اصولوں پر اگر غیر مسلم عمل کریں گے تو کامیاب قرار پائیں گے اور اگر مسلمان ان اصولوں کو نظر انداز کر دیں گے تو وہ بھی نظر انداز کر دیئے جائیں گے، ہم لوگ اس اصول کا عملی مظاہرہ دیکھ بھی رہے ہیں، سبق حاصل کرنے کی توفیق پھر بھی نہیں ہوتی۔ بد قسمتی سے مسلمان ممالک کے حکمرانوں کی ترجیح علم کی بجائے مال ہے، دنیاوی عیاشیاں، مملات اور اسی قسم کے دیگر معاملات ہی ان کے معمولات ہیں، وہ یونیورسٹی کی بجائے ایکٹ پر قعیش محل کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلم امت کا حال سامنے ہے۔ ایشیا کی یونیورسٹیوں میں چین، جنوبی کوریا اور بھارت اپنی یونیورسٹیوں میں ملکی اور غیر ملکی طلباء پر سب سے زیادہ سرمایہ کاری کرنے والے بالترتیب تین ممالک ہیں۔ جب قدیم ترین یونیورسٹیوں کی تحقیق ہوتی ہے تو مصر کی جامعہ الازہر دنیا کی مستند قدیم ترین یونیورسٹی ہے، جو 10 ویں صدی میں قائم ہوئی، اس کے بعد 11 ویں صدی میں بغداد کی آل نظامیہ یونیورسٹی قائم ہوئی، اس کے بعد مسلمانوں کے علمی چراغ گل ہو گئے، دنیا کو جہالت کی تاریکیوں سے علم کے نور سے منور کرنے والے خود تاریکیوں میں بھٹکنے لگے، زوال کی یہ داستان تب سے شروع ہے اور اب تک جاری ہے۔ اس دوران یورپی ممالک نے تعلیمی ادارے قائم کئے جو علم کے مینارے بن گئے، جو دنیا بھر کے لئے دانش گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں اور

مسلمان حکمرانوں نے مملکت اور قلعے بنائے جو اب عبرت گاہیں ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ مسلمان حکمران ابھی تک اپنی اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں، عرب ممالک میں آنے والے انقلابات سے بھی بادشاہوں کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کے لئے تیار نہیں۔

اب جبکہ پوری دنیا کو ایک مواصلاتی گاؤں کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، مسلمان حکمران دو قدم آگے دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں، ان کی نظر اپنی ذات سے پرے جاتی ہی نہیں، تعلیم کو پہلی ترجیح قرار دینے والے کسی حکمران نے تعلیم کو عملی طور پر اپنی پہلی ترجیح کبھی نہیں بنایا۔ اپنی وزارتوں، ممبران اسمبلی، بیوروکریسی، پروٹوکول اور دیگر عیاشیوں سے انہیں فرصت نہیں، تعلیم کے لئے شرمناک حد تک کم بجٹ مختص کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شرح خواندگی بھی اس مختص شدہ رقم کی طرح شرمناک حد تک ہی محدود ہے۔ مسلمان حکمران یہ نہیں سوچتے کہ علم اسلام اور ہمارے اسلاف کی میراث ہے، سائنس کی بنیاد میں ہمارے آبا کا خون پسینہ رچا بسا ہے، انہی نے اس کی آبیاری کی مگر یہ میراث؟؟ تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو، ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر، فردا ہو۔ اپنے اسلاف کی کتابیں یورپ کی لائبریریوں میں دیکھ کر دل کو سی پارا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ کسی بھی مسلمان ملک کو ان کتابوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

گندم کی کٹائی کا موسم تھا، گرمی کی شدت اپنا رنگ دکھا رہی تھی، کسان کھیتوں میں بکھرا 'سونہ' سمیٹ رہے تھے، بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کا کوئی سال تھا۔ دور نہر کے کنارے سے کوئی اجنبی کھیتوں میں اترا، کام کے دوران کسان اس مسافر کو بھی دیکھ رہے تھے، قریب آیا تو وہ واقعی اجنبی تھا، وہ کسی کے نام یا شکل سے واقف نہ تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے کسی شخص کے بارے میں معلومات مانگیں، اسے بتایا گیا کہ وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اس اجنبی مسافر سفید ریش بزرگ نے بتایا کہ 32 ایکڑ زمین جھنگ کے علاقہ اٹھارہ ہزاری میں موجود ہے، جس پر کسی نے قبضہ کر رکھا ہے، جبکہ سرکاری کاغذات میں وہ آپ لوگوں کے نام ہے۔ بزرگ اجنبی نے تعاون کی یقین دہانی کرائی، بعد میں یہ ثابت ہوا کہ ان کی تمام کاوشیں بے لوث ہی تھیں۔

کسان کا تو کل اثاثہ زمین ہی ہوتا ہے، اسے گمشدہ یا نامعلوم اثاثہ مل جائے تو اور کیا چاہیئے، اگلی صبح وہ اپنے کچھ کام سمیٹ کر اور کچھ موخر کر کے مسافر کے ساتھ خود بھی سفر پر چل نکلا، تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بزرگ کی بات سچ تھی، زمین میں تین حصہ دار تھے، ایک حصہ دار نے اجتماعی حصے میں سے

ایکڑاؤنے پونے فروخت کر دیئے تھے۔ کسان نے تیسرے حصے دار کو اطلاع کی اور 12 زمین کے حصول کے لئے قانونی جنگ لڑنے کا فیصلہ ہوا۔ قانون کی لڑائی میں قبضہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے، فیصلہ آنے تک وہی مالک ہوتا ہے جو قابض ہوتا ہے، چنانچہ کسان کی پہنچ احاطہ عدالت تک محدود رہی، اور نامعلوم پارٹی لاوارث زمین کے مالک کی حیثیت سے فصلیں کاشت کرتی رہی۔

قبضہ نہ ہو تو مقدمہ بے جان ہی ہوتا ہے، دوسری طرف قبضہ لینا نہ صرف بہت مشکل ہوتا ہے بلکہ خطرات سے خالی نہیں ہوتا، تیسری طرف پیشیوں کا ایسا چکر چلتا ہے کہ انسان چکرا کر رہ جاتا ہے، کسان کی تو گزر اوقات ہی کاشت کاری سے ہوتی ہے، اس دوران اسے دور دراز شہر میں پیشیاں بھگتنے میں سارا سارا دن گزارنا پڑ جائے تو نقصان دو چند ہو جاتا ہے، لیکن حق چھوڑ دینا کوئی قابل فخر عمل نہیں۔ کسان نے قانونی جنگ کے ساتھ ساتھ قبضہ لینے کا بھی فیصلہ کیا۔ اب کی بار وہ پیشی پر گیا تو کئی روز تک نہ لوٹا، تشویش میں اضافہ ہوتا گیا، آخر آٹھ دس روز بعد وہ پلٹا تو کپڑے میلے کھیلے ہوئے تھے، گریبان پر کالی میلی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ کسی سے دست و گریبان ہوا ہے، حال احوال بیان ہوا تو معلوم ہوا کہ قبضہ کی کوشش میں نوبت تھانے تک بھی آئی، ملزم کسان نے رات تھانے بسر کی، نہ جانے کس نے چھڑوایا۔

پیشیوں کے چکر سے عاجز آ کر تیسرے حصہ دار نے بھی اپنا حصہ معمولی قیمت پر فروخت کر دیا، اب ایک کسان ہی تنہا رہ گیا، جو پیشیوں کے چکر سے بھی مایوس نہ ہوا، آخر اس کی محنتیں رنگ لائیں اور ضلعی عدالت نے کسان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حساب کون لگاتا ہے، اور حساب کون دیتا ہے کہ نصف صدی وہ زمین کسی اور کے قبضے میں رہی، اسی نے اس کی کوکھ سے برآمد ہونے والی فصلوں کی خوشہ چینی کی، آمدنی کا حقدار بھی وہی تھا۔ مگر یہ خوش فہمی کا چراغ زیادہ عرصہ نہ جلا کہ قابضین نے اعلیٰ عدالت سے ”انصاف“ کی اپیل کر دی۔ ایک مرتبہ پھر پیشیوں کا چکر چلا، پہلے تو قریبی ضلع کا معاملہ تھا اب لاہور کی مسافت تھی۔

اس دوران کسان آج سے 17 برس قبل ایک حادثے میں اپنی زمین کی ملکیت حاصل کرنے کی حسرت دل میں لئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا، وہ اجنبی رہنما نزرگ اب زندگی کی آخری منازل پر ہے۔ میں کبھی کبھار اپنے برادر نزرگ کو فون کر کے حالات جاننے کی ہمت کرتا ہوں، ہر مرتبہ امید افزا جواب ملتا ہے کہ ”اب پیشی کی تاریخ بہت جلد مل جاتی ہے، کیس بھی اوپر ہی ہوتا ہے، بس جس روز بھی بحث ہو گئی فیصلہ ہو جائے گا“ 65 برس ہونے کو ہیں، ابھی تک تو وہ زمین اس کے حقداروں کو نہیں ملی، امید ہے کسی روز بحث ہو جائے گی، مقدمہ کا فیصلہ ہو جائے گا، اگر پہلی دو نسلیں محروم رہ گئیں تو یقیناً تیسری نسل تو اس سے

ضرور ہی مستفید ہو جائے گی، 65 سالہ حق تلفی کا کیا ہوگا؟؟؟ وزیراعظم کی توہین عدالت
کا فیصلہ آیا تو دل و دماغ میں بجلی سی کوند گئی، کیا کسانوں کی قسمتوں کے فیصلے بھی
ہو جائیں گے؟؟ یا وہ بھی اپنے بڑوں کی طرح انتظار کی سولی پر لٹک کر قبروں میں اتر
جائیں گے؟؟

شاید اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی انتظامیہ کی کوشش تھی کہ منفرد اسلوب کے کالم نگار، دانشور، شاعر جناب عطا الحق قاسمی کی یونیورسٹی میں دوروزہ سرگرمی کی کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑ جائے، ”آؤٹ سائیڈروں“ کی موجودگی سے نظم و نسق میں خلل کا اندیشہ رہتا ہے، بہتر ہے وہ کام ہی نہ کیا جائے جس پر ”آئیل مجھے مار“ کی کہاوت صادق آجائے۔ ایسے ’بیلوں‘ سے احتیاط لازم ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا، لہذا اس پروگرام کی خوشبو مجھ تک بھی پہنچ گئی، میڈیا سٹڈیز کے ڈاکٹر محمد شہزاد کی ہمسائیگی میں رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس دوروزہ سرگرمی کی تصدیق ہو گئی، یونیورسٹی جاتے ہوئے یہ راز بھی کھلا کہ قاسمی صاحب کی شخصیت اور کالم نگاری پر واحد مضمون ڈاکٹر شہزاد نے ہی پڑھنا تھا۔ تاہم یونیورسٹی انتظامیہ اپنی مہم میں کامیاب ٹھہری، قاسمی صاحب کے ساتھ پہلی نشست جو کہ ان کی کالم نگاری کے بارے میں تھی، آؤٹ سائیڈروں نہ ہونے کے برابر تھے۔

اگرچہ یونیورسٹی کو سامعین و حاضری کی قلت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ طلباء و طالبات کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے، لیکن سٹوڈنٹس کی ”علمی وسعت“ کو

دیکھ کر مجھے مئی کے اوائل میں ”یونیورسٹیاں“ کے عنوان سے لکھا ہوا اپنا کالم یاد آگیا، جس میں اس پریشانی کا اظہار کیا گیا تھا کہ دنیا کی چار سو بہترین جامعات میں پاکستان کی کوئی جامعہ شامل نہیں۔ اس کی وجہ مجھے یونیورسٹی میں اچھی طرح سمجھ آ گئی، جہاں اساتذہ اور طلباء طالبات کے ایکٹ دوسرے کے ساتھ رویے حیران کن تھے، وہاں سٹوڈنٹس کی معلومات بھی دلچسپی سے خالی نہیں، ان کے مشاغل اور ترجیحات بھی سامنے تھیں، ان کی مصروفیات بھی ظاہر تھیں۔

طاہر الحق قاسمی نے اپنے منتخب اور پسندیدہ کالم پڑھ کر سنائے، جو قہقہہ بار بھی تھے اور اشک بار بھی، ان کے پہلے ہی کالم ”دھوتی“ نے تو سماں باندھ دیا، اور الہ دین کے جن کی روداد نے سب کو افسردہ کر دیا۔ کالم پڑھے جاتے رہے، قہقہے لگتے اور تالیاں پیٹی جاتی رہیں۔ کالم لکھنا تو جو کچھ ہنر ہے، لکھے ہوئے کو اس انداز میں پڑھنا کہ جملوں کے درمیان میں روپوش معانی بھی کھلتے جائیں، یہ کسی کسی کا کام ہے۔ سب لوگ ہمہ تن گوش کالموں کو لفظ لفظ سن رہے تھے، محفوظ ہو رہے تھے، ہمارے پیچھے والی قطار میں مسلسل ہچکیوں کی آواز آرہی تھی، جس میں وقفہ بھی نہیں تھا، میں کالم خوانی کا کوئی حرف چکانا نہیں چاہتا تھا، مگر ان صاحب کی درد میں ڈوبی ہچکیاں میری توجہ بانٹ دیتی تھیں، آخر کسی چھوٹے سے وقفے میں میں نے بہانہ بنا کر کن اکھیوں سے

پیچھے دیکھا تو وہ ایک نوجوان تھا، جو دنیا سے بے گانہ کالم سننے میں مگن تھا، وہ اس کی درد ناک ہچکیاں نہیں تھیں بلکہ ہنسنے کا اپنا مخصوص اور منفرد انداز تھا۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں ہم میں سے کسی کو عار محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ موجودہ دور میں سائنس نے تو ترقی کی بے شمار منازل حاصل کر لی ہیں، مگر اقدار اس قدر زوال پذیر ہو گئی ہیں، کہ انسان کی سوچ ماؤف ہو جاتی ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسانی سوچ کے 'کتے فیل ہو جاتے ہیں'۔ اساتذہ کے احترام اور عقیدت کا معاملہ بھی اگرچہ بحث طلب ہے، بلکہ حل طلب بھی ہے، مگر سٹوڈنٹس کی معلومات (جنرل ناچ) کی بہتری کے لئے یونیورسٹیوں کی انتظامیہ مل کر کوئی لائحہ عمل تیار کریں، ہائر ایجوکیشن کمیشن کوئی منصوبہ بندی کرے کہ یونیورسٹیوں کے سٹوڈنٹس لیپ ٹاپ، نیٹ، تعلیمی نوٹسز اور موبائل کی 'مصروفیات' سے باہر بھی نکلیں، انہیں کتاب کی اہمیت بھی بتائی جائے، کتاب پڑھنے پر راغب بھی کیا جائے۔

یونیورسٹیوں میں عموماً سائنس کے پروفیسر وائس چانسلر کے فرائض انجام دے رہے ہیں، چند ماہ بیشتر بہاول پور میں پاکستان کی آٹھ جامعات کے سربراہوں کا اجلاس ہوا تھا جس میں سوشل سائنسز کی ترقی اور ترویج کے لئے آپس میں

معاهدہ ہوا، اس معاہدے کی روشنی میں ہی ان یونیورسٹیوں میں سال میں کم از کم تین مرتبہ کسی علمی ادبی شخصیت کو لازمی دعوت دی جائے تاکہ طلباء و طالبات ان کی باتیں سنیں، سوال کریں، ان کے اذہان بھی کتاب اور ادب کی طرف راغب ہوں۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی سائنسدان ہیں، مگر نہایت سوشل اور مثبت سوچ رکھنے والے۔ ایسی تقریبات سٹوڈنٹس کی تعلیم اور تربیت کے لئے آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہیں، اور آکسیجن زندگی کے لئے ضروری ہے۔

گورنر پنجاب کا بیٹا سر قلم کرے گا

”سرائیکی صوبہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے غدار اور عوام دشمن ہیں، ان کے سر قلم کر دیئے جائیں گے لیپ ٹاپ، سیلو کیپ اور روٹی سکیم میں کرپشن ہوئی، اگر یہی رقم درست استعمال کی جاتی تو بجلی کا بحران نہ ہوتا (؟) اس کرپشن پر سپریم کورٹ نے ایکشن کیوں نہیں لیا وزیراعظم گیلانی کے خلاف سازش کی گئی ہے، انہیں سرائیکی صوبہ بنانے کے جرم میں سزا دی گئی ہے عجلت میں فیصلہ کا مقصد سرائیکی صوبہ کے قیام کے اعلان کو روکنا تھا“

غداروں کے مجرم کا سر قلم کرنے کا رواج اگرچہ پرانا ہو چکا ہے، مگر کیا کیجئے کہ ہمارے حکمرانوں، ان کی اولادوں اور بیوروکریسی کے بعض افسران کے ذہنوں سے بادشاہی اور شہزادگی نہیں جاتی، جہاں بادشاہ اور شہزادے ہونگے، وہاں غدار بھی ہوں گے اور جہاں غدار بھی ہوں گے تو اس کا ارتکاب کرنے والے کا سر قلم بھی ہوگا۔ پاکستان کی تاریخ میں تو ایسے واقعات نہیں پائے جاتے، لیکن ضروری نہیں کہ جو واقعہ تاریخ میں نہ ہو وہ رونما ہی نہ ہو، آخر نئے واقعات ہی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ روایات میں سزا یافتہ لوگوں کے علاوہ حکمرانوں کے مخالفین کے بھی بغاوت وغیرہ کو بہانہ بنا کر سر قلم کر دیئے جاتے تھے، اب یہی

سلوک سرائیکی صوبہ کے مخالفین کے ساتھ روارکھا جائے گا۔

سر قلم ”قسم کا اعلان“ شہزادہ ”خرم کھوسہ نے ایک تقریب سے خطاب کے دوران“
کیا، واضح رہے کہ موصوف پنجاب کے موجودہ گورنر لطیف کھوسہ کے خلاف الرشید ہیں،
اپنے نزرگوں کی طرح شعبہ قانون سے وابستہ ہیں۔ عدلیہ کی آزادی کے بعد چونکہ
قانون دانوں کا رویہ کافی جارحانہ اور بعض اوقات ظالمانہ قسم کا ہو گیا ہے، وہ اپنی زبان
سے نکلنے والی ہر بات کو قانون کا ہی درجہ دیتے ہیں، اور انحراف کرنے والوں کو قابل
گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ اس لئے خرم کھوسہ نے بھی اسی رو میں بہتے ہوئے یا
جذبات سے مغلوب ہو کر یہ بیان دے دیا ہے، امید ہے کہ انہوں نے اپنے قول کی
عملی صورت پر غور کرنے کے بعد ہی اعلان کیا ہوگا، انہوں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہوگا
کہ تقریباً کتنے لوگوں کو اس امتحان سے گزرنا ہوگا، جلا دوں کا بندوبست کیسے ہوگا، اس
ضمن میں ہو سکتا ہے کہ خورشید شاہ کی خدمات حاصل کر کے سعودی حکومت سے مدد
طلب کی گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تارا مسیح کی اولاد میں سے انہیں لوگ مل جائیں،
جن سے کام لے کر وہ پرانے ”قرض“ بھی اتار سکتے ہیں۔

قلم کا دور گزر چکا ہے، تاہم ابھی اس دور کو گزرے زیادہ زمانے نہیں بیتے، اس لئے
قلم کے نام اور کسی حد تک شکل سے بھی لوگ واقف ہیں۔ مگر یہ سردار

لوگ تو جدید زمانے کی ہر سہولت سے بہرہ مند ہیں، انہیں قلم کو صرف محاورے میں استعمال کرنے کا علم ہوگا، کبھی استعمال کا موقع شاید نہ ملا ہو۔ خبر میں خرم کھوسہ کو سردار لکھا گیا ہے، کسی قبیلے کا سردار تو شاید ایک ہی ہوتا ہوگا، اگر ہر بندہ ہی سردار ہے تو پھر ایسے قبیلے کا اللہ ہی حافظ ہے۔

یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا کہ آیا صرف انہی لوگوں کے سر قلم کئے جائیں گے جو سرائیکی علاقے کے اندر رہتے ہوئے صوبے کے قیام کی مخالفت کریں گے، یا اس "قلم کہانی" کا دائرہ کار خطے سے باہر بھی ہوگا؟ سر قلم کرنے کے پروگرام کے داعی چونکہ قانون دان ہیں، اس لئے انہوں نے تمام انتظامات مکمل کر رکھے ہونگے، کوئی ایسا قانونی راستہ نکال لیا ہوگا، جس کے ذریعے سے یہ "قلم کاری" کی جائے گی، یہ بھی طے ہو چکا ہوگا کہ سر قلم کرنے کا فیصلہ موجودہ عدالتیں ہی کریں گی یا پی پی کے قانون دانوں پر مشتمل الگ بندوبست ہوگا۔ جس ملک کا صدر ایک پارٹی کا ہو، اسی پارٹی کا امیدوار پارلیمنٹ کا متفقہ امیدوار قرار پا کر اور کامیاب ہو کر وزیراعظم کے منصب پر فائز ہو، سب سے بڑے صوبے کا گورنر بھی اسی پارٹی سے ہو اور نامور قانون دان ہو، ایسے میں سرداروں "کے سردار بچے کسی کا بھی سر قلم کر سکتے ہیں، یا ایسا کرنے کی خواہش" کر سکتے ہیں، خوابوں کی تعبیر ملے نہ ملے، خواب دیکھنے پر تو کوئی

پابندی نہیں لگا سکتا۔ گورنر باپ ہو اور وہ بھی بڑھکوں کا عادی (کہ آخر جیالا ہے) ایسے
بچوں کو باپ سے چار قدم آگے ہی ہونا چاہیئے۔ (نوٹ؛ گورنر کے ٹماٹروں والے بیان
پر ”ٹماٹرانہ کالم“ بعد میں لکھا جائے گا۔

نئے صوبوں کی تشکیل کا بل

چند ماہ قبل تک نئے صوبوں کی تشکیل کی سب سے بڑی (اور شاید واحد) مخالف جماعت مسلم لیگ ن تھی، بہاول پور کی صوبائی حیثیت کی بحالی کی تحریک میں تمام چھوٹی بڑی جماعتیں شامل تھیں، اگر نہیں تھی تو ن لیگ۔ اسی طرح چند ماہ قبل ہی وفاقی حکومت کی باسی سڑھی میں یوں ابال آیا کہ اس نے سرانیکی صوبہ کا ایسا نعرہ مستانہ بلند کیا کہ ملک کے دیگر تمام مسائل کو پس پشت ڈال دیا، انہی جذبات کی رویوں جہہ کر وہ بہاول پور کی بحالی سے بھی دستبردار ہو گئے اور اپنی تمام تر توانائیاں سرانیکی صوبہ کی تشکیل پر صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جبکہ ان کی اتحادی جماعت ق لیگ ایک عرصہ پہلے جنوبی پنجاب کے صوبہ کی بات چیت شروع کر چکی تھی۔

صدر اور وزیراعظم کی طرف سے سرانیکی صوبہ کے معاملات اچھالے جانے کے بعد میاں برادران نے بھی جوابی کارروائی کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک روز یکایک بہاول صوبہ کی بحالی کا مطالبہ داغ دیا۔ اب خطے میں نئی بحث کا آغاز ہوا کہ کونسا صوبہ بنایا جانا مناسب ہے؟ اسی دوران وزیراعظم کے خلاف توہین عدالت کا فیصلہ آ گیا، ن لیگ جو کہ 'فرینڈلی اپوزیشن' کا الزام سن سن کر اکتا چکی تھی

نے وزیر اعظم کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا، کہ گرتی ہوئی دیواروں کو دھکا، دینا موقع بھی ہے اور دستور بھی۔ اس سے حکومت کے ختم ہونے کے امکانات بھی پیدا ہو جائیں گے اور جنوبی پنجاب میں ن لیگ کی کھوئی ہوئی ساکھ کو بہتر کرنے کا موقع بھی ملے گا۔

اب تک بہاول پور صوبہ کی بحالی اور سرانیکی صوبہ کے قیام کی جو کوششیں یا دعوے تھے وہ سیاسی نعروں سے زیادہ اور کچھ نہ تھا، گیلانی، درانی سمیت سب کو علم تھا کہ نئے صوبے کی تشکیل کا آئین میں طریقہ درج ہے، اس کے باوجود کوئی بھی اس طریقے پر عمل کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ ان کے بس سے باہر تھا، جو پارٹی عمل کر سکتی تھی وہ نئے صوبوں کی تشکیل کے خلاف تھی، طریقہ یہ تھا کہ جس صوبے میں سے نیا صوبہ بنایا جانا مطلوب ہے اس کی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے اس کے حق میں بل منظور کر کے قومی اسمبلی کو بھیجے، وہاں سے منظوری کے بعد متعلقہ صوبے کی اسمبلی دوبارہ اس کی منظوری دے گی۔

ن لیگ نے پنجاب اسمبلی سے بہاول پور کی بحالی اور جنوبی پنجاب کے نام سے نئے صوبے کی تشکیل کے لئے متفقہ بل منظور کروا کے سب کو حیران کر دیا۔ حیرت کا سلسلہ طویل اس لئے بھی ہو گیا کہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی، دوسری وجہ یہ ہوئی کہ صرف بہاول پور کا معاملہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ جنوبی پنجاب

کا مسئلہ بھی ساتھ ہی حل کر دیا، لیکن سب سے بڑی حیرت اس بات پر ہوئی کہ پی پی نے جنوبی پنجاب کے بل کی حمایت کی، سرائیکی صوبہ کہاں گیا؟ اس کے لئے تو حمایتوں، مخالفتوں اور نفرتوں وغیرہ کے طوفان برپا ہو رہے تھے، آخر خاموشی سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے ہو گیا؟

خیر جو بھی ہوا، جیسے بھی ہوا، علاقے کے عوام کا دیرینہ مطالبہ تھا، اب آئینی طریقہ اپنا کر ن لیگ کریڈٹ لینے میں کامیاب ٹھہری ہے، بسا اوقات ایسے ہی ہوتا ہے، منزل اسی کو ملتی ہے جو شریک سفر نہیں ہوتا۔ اب گیند وفاقی حکومت کی کورٹ میں ہے، ان کشیدہ حالات میں اگر پی پی نے پنجاب اسمبلی سے متفقہ قرارداد منظور کروانے میں ن لیگ سے اتفاق کیا ہے، امکان یہی ہے کہ قومی اسمبلی میں بھی ایسے ہی تعاون ہوگا، اگر ایسے ہی ہوا تو صوبوں کا یہ معاملہ آئینی طریقے سے اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔ لیکن وزیراعظم کی نااہلی کا معاملہ اور اپوزیشن کے ”مارچ“، جانے کیا رنگ لائیں گے۔ آیا پنجاب اسمبلی میں اختیار کیا گیا آئینی راستہ فیصلہ کن مرحلے پر آپس کی کشمکش کا شکار تو نہیں ہو جائے گا، کیا اس کے لئے دونوں پارٹیاں نرم رویہ اختیار کریں گی، یا اپنی روایتی مخالفت سے جمہوریت کو بھنور میں ہی پھنسائے رکھیں گی اور صوبوں کی نیا ساحل کے قریب آ کر ڈوب جائے گی؟

بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے سلسلہ میں قوم نے ماحول کو بہت کشیدہ کر رکھا ہے، آئے روز ہڑتالیں، ریلیاں، مظاہرے اور توڑ پھوڑ کی خبریں آتی ہیں، کوئی نہیں جو اس کشیدگی کے ماحول سے بھی خیر کشید کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے سوچ و بچار کے بعد چند ایسے پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے جن کا شمار یقیناً لوڈ شیڈنگ کے فوائد میں ہوتا ہے۔ آئیے ان نکات کا جائزہ لیتے ہیں اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب اور تکلیف سے کچھ دیر کے لئے خود کو محفوظ کرتے ہیں۔

لوڈ شیڈنگ کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان وقت کی پابندی دیکھتا ہے، کون نہیں جانتا کہ پاکستانی قوم وقت ضائع کرنے کی بادشاہ ہے، وہ واپڈا ہی ہے جس نے مسلسل جدوجہد کر کے قوم کو وقت کا پابند کیا ہے۔ اب ہر کسی کو معلوم ہے کہ اس نے فلاں وقت کپڑے استری کرنے ہیں، فلاں وقت کمپیوٹر کا استعمال کرنا ہے، گرمی میں پانی اہم ضرورت ہے، وقت کی پابندی کرتے ہوئے مخصوص اوقات میں پانی نکالنے والی موٹر چلانا بھی یاد رکھنا پڑتا ہے۔ مکینک کو علم ہے کہ اس نے کس وقت اپنے فرائض سرانجام دینے ہیں، کہ تھوڑی سی کوتاہی سے کام اگلے کئی گھنٹوں تک ملتوی ہو جائے گا اور گاؤں کے ساتھ تلخی

بڑھ گئی تو گرما گرمی میں معاملہ دست و گریبان تک پہنچ سکتا ہے، مسئلہ روزگار کا بھی تو ہے۔

صبر کی تلقین ہمیں مذہب تو بہت کرتا ہے، مگر ہمیں اس حکم پر عمل کرنے کی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔ واپڈا نے صبر کرنے کا مشورہ تو کبھی نہیں دیا، لیکن اس کا ماحول ضرور فراہم کرتا ہے، جب ایک گھنٹہ بجلی آئے گی اور اگلے گھنٹہ میں وقفہ ہوگا تو صبر کرنا آ ہی جائے گا۔ صبر کی انتہا تو اس وقت ہوتی ہے جب شیڈول کا گھنٹہ پورا ہونے کے بعد چند منٹ بجلی آتی ہے، اور گھنٹہ بھر کے لئے پھر غائب ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ شیڈول والا گھنٹہ شروع ہو جاتا ہے، یوں ایک گھنٹہ انتظار کا اور ایک صبر کی پریکٹس کا۔ اگر چند پاکستانی ہی واپڈا کی کوششوں سے صبر جیسی نعمت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو واپڈا الہکاروں کے لئے صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔

ہم بحیثیت قوم نہایت تساہل پسند اور آرام طلب ہو چکے ہیں، تھوڑی سی محنت سے بھی دل گھبرانے لگتا ہے، معمولی سی گرمی بھی برداشت نہیں ہوتی، نزاکتیں حد سے بڑھ چکی ہیں، واپڈا کا احسان ہے کہ اس نے گھر بیٹھے پسینہ بہانے کا بندوبست کر دیا ہے، کیا ہی جدید دور آیا ہے کہ فارغ بیٹھتے ہیں اور پسینہ بہاتے ہیں۔ پسینہ انسانی صحت کے لئے بہت ضروری ہے، اس کے لئے اب ہمیں ورزش

یا واک کی محتاجی نہیں ہوتی۔ ایک فائدہ سادگی کا بھی ہے، لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ہم کلف زدہ لباس زیب تن نہیں کر سکتے، وہ صرف حکمران ہی ہیں جو سخت گرمی کے موسم میں بھی ہر وقت سوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں، کیونکہ لوڈ شیڈنگ کی نعمت سے وہ محروم ہیں۔

واپڈا کی مہربانیوں سے ہم اپنی روایات اور کلچر کو اپنانے پر بھی مجبور ہیں، ہم نے اپنی روایات کو خیر باد کہہ دیا تھا، اب ایک تو قومی لباس کا رواج فروغ پذیر ہو رہا ہے، دوسرے یہ کہ دھوتی بنیان کی مائٹک بڑھ گئی ہے، تیسرے یہ کہ ایک بہت ہی خوبصورت اور شاعرانہ تخیل کے حامل روایتی آئیٹم دستی پنکھا ضرورت بن چکا ہے، یہ صنعت زوال پذیر ہی نہیں تھی بلکہ دم توڑ رہی تھی، رنگین دستی والا پنکھا، جس کی جھالر پر رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھائی کی ہوئی ہوتی تھی، مہمان کو پیش کیا جاتا تھا۔ اب تو نئی نسل اس روایت سے واقف ہی نہیں۔ لوڈ شیڈنگ کے عالم میں اگر چارپائی پر دھوتی باندھ کے بیٹھے ہوں اور کھجور کے پتوں کے پکھے سے مصنوعی ہوا کا بندوبست ہو تو اس کامزہ ہی کچھ اور ہے، اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو ہم اپنے بچوں کو ماضی کے جتنے بھی قصے سناتے، وہ سنی ان سنی کر دیتے تھے، اب وہ حق الیقین کی حدوں میں داخل ہو چکے ہیں، شکر یہ واپڈا۔

میرے جیسے مسافروں کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی مرکزی عالمہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں کی روایات دیکھنے، ان کے مسائل سے براہ راست آگاہ ہونے اور ان کے معاملات کا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ”مشکلیں پڑی مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں“ کے مصداق ہمیں وہاں ڈھائے جانے والے بھارتی فوج کے مظالم محسوس ہی نہیں ہوتے، کہ شہادت، اغوا اور تشدد کی خبریں اب معمول ہیں، اور مصروف زندگی میں اب ہر کوئی آگے دیکھتا ہے پیچھے کسی کی نظر نہیں جاتی، کہ تیز رفتار قافلوں کی اثرائی ہوئی دھول میں بھلا دکھائی بھی کیا دے گا۔

آزاد کشمیر کی خوبصورت وادی راولا کورٹ دنیا میں جنت سے کم نہیں، اس کا ایک ایک منظر دل میں اتر جاتا ہے، بنجوسہ ہو یا تولی پیر، دیکھیں تو بس دیکھتے ہی جائیں، منظر د ایکٹ سے بڑھ کر ایک منظر دکش۔ لوگ ملنسار اور گرم جوش، ہوش مند اور باخبر، اپنے مقصد پر کاربند اور نظریات پر یکسو۔ مناظر کو دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر حیران رہ جائیں، وہاں کے باسیوں کی باتیں سنیں تو دلوں میں بڑھکتی آگ کے شعلے سیٹے اور چھپائے ہوئے۔ پہاڑوں کا سبزہ، موسم

کی خنکی، وادیوں کے حسن کو دوبالا کرتے سفید بادلوں کے ٹکڑے، سبز پہاڑوں کے عقب سے اٹھتی کالی گھٹائیں، چھم چھم برستی بارش، بارش کے بعد وادیوں میں شور مچاتے جھرنے، سردیوں میں سبزے پر سفید چادر بچھا دینے والی، برفباری بھی کشمیریوں کے دلوں میں لگی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ کشمیریوں کے جذبات شعلوں کی مانند ان کی باتوں سے لپکتے ہیں، یقیناً اس کے پیچھے وہ قربانیاں ہیں جو انہوں نے اپنی آزادی کے لئے دے رکھی ہیں اور ابھی دے رہے ہیں۔ پی ایف یوجے کی مرکزی عاملہ کی آزاد جموں کشمیر کے صدر سردار یعقوب سے ملاقات ہوئی، سیکر سے ملے (ان دونوں حضرات کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے)، مسلم کانفرنس کے سردار عثمان عتیق سے ملنے کا موقع ملا، جماعت اسلامی کے سردار اعجاز افضل خان سے نشست ہوئی، آزاد جموں کشمیر پیپلز پارٹی (یاد رہے کہ یہ پاکستان پیپلز پارٹی نہیں) کے سربراہ سردار خالد ابراہیم سے سننے سنانے کا موقع ملا، ان میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا، جس نے کشمیریوں کی قربانیوں کا ذکر نہ کیا ہو، ان کشمیریوں کو یاد نہ کیا ہو جب زندہ انسانوں کی کھالیں کھینچی گئیں، مگر انہوں نے غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مذکورہ بالا تمام لوگ (ماسوائے حکومتی پارٹی کے، کہ ان کی مجبوریاں اور

ہوتی ہیں) تمام قائدین نے پاکستان کی بھارت نواز پالیسیوں کی کھل کر مخالفت کی، ان کا کہنا تھا کہ ہم پاکستان کو ہی اپنا وطن سمجھتے ہیں، کشمیر کا پاکستان کے ساتھ ہی الحاق چاہتے ہیں، پاکستان کے احسانات کے بھی معترف ہیں، مگر آخر بھارت اور پاکستان کے درمیان متنازع فریق تو ہم ہی ہیں، ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے سے قبل ہمیں بھی اعتماد میں لینا چاہیئے۔ بھارت سے دوستی کی پیٹنگیں بڑھائیں، اس کے ساتھ تجارت کریں، اسے پسندیدہ ترین ملک قرار دیں، مگر یہ سب کچھ کشمیریوں کی قربانیوں کی قیمت پر نہیں ہونا چاہئے، ہمارے لاکھوں شہیدوں کے لہو کی فروخت ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔

کشمیریوں کے جذبات میں کرب ہے، وہ پاکستان کی محبت، یہاں کے لوگوں کے پیار، پاکستانی حکومتوں اور عوام کی طرف سے تعاون پر جہاں خوش ہیں وہاں ان کے دل کرجی کرجی بھی ہیں، کیوں نہ ہوں کہ اپنوں کے دیئے گئے زخم زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں، دشمن سے تو کسی بہتری کی توقع ہی کیا، مگر جب اپنے جڑیں کاٹنے لگ جائیں تو پھر دشمنوں سے کیا گلہ؟ پاکستان کو کشمیر میں ٹورازم پر توجہ دے کر اپنے اور کشمیریوں کے زرمبادلہ میں اضافہ کا سوچنا چاہیے، نہ کہ شہدائے بڑے بڑے قبرستانوں کے وارثوں کے زخموں پر نمک چھڑک کر ان کی تکلیفوں اور کرب میں اضافہ کرنا چاہیئے۔

اخبار کے صفحہ اول پر وفاقی حکومت کی طرف سے ایک اشتہار شائع کروایا گیا ہے، نصف صفحے کا اشتہار، موجودہ وزیراعظم کے ایک تاریخی اعزاز کے بارے میں ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات معلوماتی بھی ہوتے ہوئے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ان اشتہارات کو حکمران طبقہ اپنی ذاتی تشہیر کے لئے استعمال کرتا ہے، سابقہ حکمرانوں کو انہی اشتہارات کے ذریعے نچا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے، بعض اوقات تو ایسے ہی اشتہارات کے ذریعے سابق حکمرانوں پر سرکاری وسائل سے اشتہارات شائع کرنے پر تنقید بھی کردی جاتی ہے، حسن کرشمہ سار کچھ بھی کہہ سکتا ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اشتہار کے دو حصے ہیں، ایک میں سید یوسف رضا گیلانی کا یہ اعزاز درج ہے کہ انہیں پاکستان کا سب سے زیادہ عرصے تک منتخب وزیراعظم رہنے کا اعزاز حاصل ہے، پھر ان کے چار سالہ دور کی نمایاں کامیابیاں لکھی گئی ہیں؛ اول؛ شہید جمہوریت محترمہ بے نظیر کی مفاہمتی پالیسی کی مکمل پاسداری۔ دوم، تین آئینی ترامیم کی متفقہ منظوری۔ سوم، خیبر پختونخواہ اور گلگت بلتستان کو شناخت دینا۔ چہارم، ساتویں این ایف سی ایوارڈ کے تحت صوبوں کے وسائل میں

خاطر خواہ اضافہ۔ پنجم، غربت کی لکیر سے نیچے 60 لاکھ سے زائد خاندانوں کو بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت مالی معاونت۔ ششم، دیامیر، بھاشا، نیلم، جہلم اور داسو جیسے آبی منصوبے پر تیز تر عمل درآمد۔ ہفتم، حقوق نسواں، انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور ملازمتوں میں کوٹا۔

اشتہار کے دوسرے حصے میں اس وزیراعظم کی تصویر اور ذکر ہے جن کا ریکارڈ توڑ کر موصوف پہلے وزیراعظم بنے ہیں، وہ ہیں لیاقت علی خان، انہوں نے چار سال دو ماہ حکومت کی، گیلانی سرکار کہ جنہوں نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں، چار سال تین ماہ سے اوپر جا چکے ہیں اور ابھی مسلسل جارہے ہیں۔ ایک چھوٹی تصویر میں لیاقت علی خان پاکستانی پرچم لہرا رہے ہیں، اور ایک بڑی تصویر میں جناب ملتانی سرکار بھی پرچم کشائی میں مصروف ہیں۔ اشتہار کے اوپر قائداعظم، بھٹو، بے نظیر اور زرداری کی تصاویر بھی آویزاں ہیں۔ تاہم اشتہار کے نیچے 'پاکستان پیپلز پارٹی' کے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ یہ امر تو بحث طلب ہے ہی نہیں کہ حکومتی پارٹی اگر اخباروں میں اشتہار دے گی تو اس کی ادائیگی کہاں سے ہوگی؟ مگر پریشانی اس بات پر ہے کہ چار سالہ حکومت کا رہائے نمایاں سے بھری پڑی ہے، مگر یہاں صرف ان سات کا ذکر کیا گیا ہے جو عوامی یا ملکی سطح پر اتنے اہم نہیں یا مقبول عام نہیں۔ اس لوڈ شیڈنگ کا

کوئی ذکر نہیں جس نے پوری قوم کا مقدر اور مستقبل تاریک کر دیا ہے، جس نے عوام کو ذہنی مریض بنادیا ہے، جس کی وجہ سے کاروبار ٹھپ اور معیشت تباہ ہو رہی ہے۔ پٹرول کی قیمتوں کا کوئی تذکرہ نہیں جس کی وجہ سے مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے، پٹرول سے چلنے والی فیکٹریاں اور کاروبار بند ہو رہے ہیں، ڈنرل جو کہ زراعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے اس کی قیمت پٹرول سے بھی زیادہ کر کے موجودہ حکومت نے کارنامہ ہی سرانجام دیا ہے۔

عدلیہ کو آزاد کرنے کے دعویٰ بھی نہیں کیا گیا، کیونکہ اب عدلیہ کی تضحیک کا کاروبار بھی جوش و جذبے سے جاری ہے، عیاشیوں کا بھی اشتہار میں ذکر نہیں، اپنی پسند ناپسند کے سرکاری افسروں کے تبادلوں کا بھی کوئی حوالہ نہیں، اپنے غیر ملکی دوروں کے موقع پر 80، لاکھ کے کوٹوں اور اپنی فیملی کے ہمراہ کروڑوں کی خریداری کا تذکرہ بھی نہیں، 80 کرپشن اور کمیشن کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں، خارجہ پالیسی میں جو معرکے سرکے ان کا بھی ذکر نہیں، تعلیم کے میدان میں ترقی کی منازل طے کیں تو ان کا بھی ذکر نہیں، ہاں ایک کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان سے گیلانی صاحب سبقت لے گئے، ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ متفقہ، مقبول اور منتخب وزیراعظم ہیں۔ ان کا یہ اعزاز کسی اور وزیراعظم کے پاس نہیں کہ آپ سپریم کورٹ سے سزایافتہ بھی ہیں۔

ہم غور نہیں کرتے، لیکن جب بھی ہم کسی عالمی ادارے کی تعلیم پر کی گئی تحقیق پڑھتے ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ناخواندگی کا معاملہ ہو یا غربت کا مسئلہ، چائلڈ لیبر کی بات ہو یا کرپشن کا معاملہ، ہر غلط اور برے کام میں پیارے پاکستان کا نام بہت نمایاں ہوتا ہے۔ گزشتہ دو تین دنوں میں ”جنگ“ میں شائع ہونے والی عالمی بینک کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان تعلیم پر سب سے کم خرچ کرنے والے سات ممالک میں سے ایک ہے۔ چائلڈ لیبر کی بات آئی تو بھی دنیا بھر میں پاکستان پہلے دس ممالک میں سے ایک ہے، اور اگر کرپشن کا معاملہ ہوتا ہے تو پاکستان نمایاں مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس معاملے کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ جن سات یا دس ممالک میں پاکستان شامل ہوتا ہے، ان کے نام ایتھوپیا، جمہوریہ کونگو، لائبیریا، نائجیریا، صومالیہ، زیمبیا اور گنی وغیرہ جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن ان ممالک کی فہرست میں شامل ہونے پر وطن عزیز کے کسی طبقے کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی، اور نہ ہی ان شرمناک معاملات سے نمٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، دعووں کی حد تک تو تعلیم واقعی حکمرانوں کی اولین ترجیح ہے، مگر عمل اس کے برعکس ہے، بجٹ

میں مختص کی گئی رقم اور دعوے حکمرانوں کے قول و فعل کا کھلا تضاد ہیں۔ پنجاب حکومت اپنے طور پر تعلیم کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہے، ان کے پاس دانش سکول، پوزیشن لینے والے بچوں کے لئے لاکھوں روپے کے انعامات، مستحق طلباء کے لئے وظائف اور ادبی مقابلوں میں کروڑوں کے انعامات جیسے اقدامات اظہارِ تفاخر اور حصولِ تحسین کے لئے موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر پر مخالفین تنقید کے ڈونگرے برساتے رہتے ہیں، جن میں دانش سکول، لیپ ٹاپ اور دیگر مقابلوں میں ضرورت سے بہت بڑے انعامات شامل ہیں۔

تعلیم کے میدان میں پنجاب حکومت کا سب سے بڑا اور قابلِ تحسین اقدام پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن ہے، اس کا قیام تو اس وقت عمل میں آیا تھا جب میاں نواز شریف پہلی مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تھے، تاہم اس کو نئی (موجودہ) زندگی چوہدری پرویز الہی کے دور میں ملی، جب پنجاب حکومت نے فاؤنڈیشن کے ذریعے عمارت کے لئے قرضہ دینے کی بجائے کم فیس والے پرائیویٹ سکولوں کے طلبہ کو مفت تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ تب کے فاؤنڈیشن کے ایم ڈی ڈاکٹر اللہ بخش ملک کی رہنمائی میں فاؤنڈیشن نے حکومتی اداروں میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا، میرٹ کے ذریعے منتخب ہونے والے سکولوں سے فاؤنڈیشن کا کوئی عہدیدار اب بھی پانی کا گلاس نہیں پی سکتا۔

موجودہ حکومت نے بھی اس پروگرام کو جاری رکھ کر علم دوستی کا ثبوت دیا، اس سال کے بجٹ میں فاؤنڈیشن کے سکولوں کے لئے ساڑھے چھ ارب روپے مختص کئے گئے ہیں، فاؤنڈیشن اس وقت تقریباً چودہ سو سکولوں کی مالی معاونت کر رہی ہے، جن میں مانیٹرنگ کا سخت نظام قائم ہے، فاؤنڈیشن خود ان بچوں کا امتحان بھی لیتی ہے۔ راجہ محمد انور کی قیادت میں اب یہ سکول معیاری تعلیم مہیا کر رہے ہیں، ان کی ذاتی دلچسپی سے سکولوں کو لائبریریاں اور لیبز فراہم کی جا رہی ہیں، ان کو کتابیں بھی مفت دستیاب ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حکومت پنجاب اپنے سرکاری سکولوں کو بہتر طریقے سے چلانے میں تمام تر کوششوں کے باوجود ناکام ہے، سرکاری سکول کے بچے پر ڈیڑھ ہزار سے کم خرچ نہیں اٹھتا، جبکہ فاؤنڈیشن کے ایکٹ بچے پر شاید ایک ہزار روپیہ بھی خرچ نہ ہوتا جبکہ بچے کو تعلیمی معیار سمیت تمام ضروری سہولتیں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ناکام ہو جانے والے سرکاری سکول اور بقایا پرائیویٹ سکول فاؤنڈیشن کے حوالے کر دے۔ راجہ انور ان سب کو لائن پہ لے آئیں گے، قوم کے بچے مفت اور معیاری تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں گے، ترقی کی راہیں بھی خود ہی کھل جائیں گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طرف پاکستان اپنے تعلیمی زوال میں آخری حدوں کو چھو رہا ہے تو دوسری طرف پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو عالمی اداروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، اور اسے مثالی قرار دیا جا رہا ہے۔ اگر دنیا اس کو مان گئی ہے تو کیوں نہ اس مثال کو آگے بڑھایا

46

ہم نہیں جانتے کہ ذوالفقار مرزا کا قرآن کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ قرآن پر کس قدر عمل پیرا ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ الطاف حسین نے قرآن کو کس قدر پڑھ اور سمجھ رکھا ہے، ہمیں نہیں خبر کہ وہ قرآن کے کس پایہ کے مفسر ہیں، ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ وہ اس پر کتنے عامل ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ملک ریاض نے کس گہرائی سے قرآن کا مطالعہ کر رکھا ہے، ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس قدر قرآنی احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے ان حضرات اور قرآن کے درمیان جو رابطہ یا واسطہ ہے اس کے وہ خود ہی شاہد ہیں، اس ضمن میں ہم کچھ عرض کریں گے تو وہ بدگمانی ہی ہوگی، بدگمانی بذات خود ایک گناہ ہے۔ قرآن کو گواہ بنانا کوئی کار آسان نہیں، مگر یہ کام اس ارزانی اور روانی سے ہو رہا ہے گویا معمول کی بات ہے۔ ہم بدگمانی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر کیوں لادیں، کسی کی نیت پر شک کیوں کریں؟ ہم عام زندگی میں تارک قرآن ہوتے جا رہے ہیں، ممکن ہے یہ جملہ کچھ دلوں میں کانٹے کی طرح چبھے، مگر حقیقت سے انکار کرنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوا کرتی، پہلے گھر گھر میں تلاوت کا رجحان تھا، صبح سویرے بڑے قرآن پڑھتے تو بچوں کو

بھی ترغیب ہوتی تھی، اب یہ سلسلہ ختم نہیں تو بہت کم ہو گیا ہے، تاہم نئی نسل کے لئے مدرسے کی تعلیم اور قرآن کو حفظ کرنے کا رجحان ابھی عروج پر ہے، جو کہ غنیمت سے کم نہیں۔ ہم قرآن نہیں پڑھتے، تو ہمیں اس میں لکھی ہوئی ہدایات کا علم کیسے ہوگا، ہم جمعۃ المبارک کو بھی مسجد میں اس وقت جاتے ہیں جب عربی خطبہ شروع ہو چکا ہوتا ہے، یوں وہاں سے بھی کوئی قرآنی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں، جب ہم قرآن ہی نہیں پڑھتے تو ایسی کوئی کتاب کیا پڑھیں گے جس میں قرآن سے متعلق معلومات ہوں۔

بدگمانی گناہ ہے، مگر جن تین حضرات کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان میں سے کسی کی ظاہری زندگی ایسی نہیں جسے شریعت یا مذہب کے مطابق کہا جاسکے، (اندر خانے ایسی کوئی پابندی ہو تو علم نہیں) ذوالفقار مرزا پر لیس کانفرنس میں قرآن لا کر اس روایت کے بانی کہلائے، ان کے اس عمل سے ایک تہلکہ سا مچ گیا، چند روز بعد الطاف حسین نے بھی جوابی پر لیس کانفرنس داغی، اپنے دلائل کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے انہوں نے بھی قرآن پاک کا سہارا لیا، ایسے ایسے طریقے سے قرآن پاک کو لہرایا کہ اس سے خود قرآن کی توہین کا پہلو نکلتا تھا، اس کی اپنے خیال کے مطابق تشریح بھی کی، اور بعد میں اسی پر لیس کانفرنس میں لہک لہک کر گانا گانے کی مشق بھی کی۔ اور اب ملک ریاض نے تمام مقتدر طبقوں کو خریدنے کا فریضہ سرانجام دینے کے بعد ہاتھ میں قرآن اٹھا لیا۔

کیا ملک صاحب کے سارے کاروبار اور تمام معاملات قرآن کی روح اور احکامات سے مطابقت رکھتے ہیں؟ کیا ان کا بحریہ ٹاؤن کا پورا نظام قرآنی ہدایات کے مطابق ہے؟ یقیناً وہ کھربوں پتی ہونے کے نامے ”مختیر“ بھی ہونگے، مگر کیا انہوں نے ہزاروں مقتدر لوگوں کو مختلف ذرائع سے خرید نہیں رکھا؟ کیا یہ پلاٹ اور بھاری رقوم تحفہ کے طور پر دینا قرآن کے کسی حکم سے اخذ کیا گیا ہے؟ یا قرآن کو عمل کے لئے نہیں اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ماہر القادری کی نظم ”قرآن کی فریاد“ سے دو شعر : حسب حال ہیں :

جب قول قسم لینے کے لئے تکرار کی نوبت آتی ہے پھر میری ضرورت پڑتی ہے، ہاتھوں پہ اٹھایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے یوں بھی مجھے رسوا کرتے
- ہیں، یوں بھی ستایا جاتا ہوں

پولیس کی توہد میں کمی؟

پنجاب پولیس کے سربراہ حاجی حبیب الرحمن نے اپنی پولیس کو الٹی میٹم دیا ہے کہ وہ اپنی توہدیں فوری طور پر 138 انچ تک لے آئیں ورنہ انہیں ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں۔ توہدوں میں کمی کی معیاد یک جولائی تک رکھی گئی ہے۔ اخباری خبر کے مطابق یہ انکشاف پولیس کی خاتون ترجمان نے غیر ملکی میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کیا، خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آئی جی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں کم کھانا کھا سکتا ہوں تو آپ کیوں نہیں کھا سکتے؟ یہ بھی اطلاع آئی ہے کہ اس الٹی میٹم کے بعد پولیس کی 'دوڑیں' لگ گئی ہیں۔

یہ خبر ہر لحاظ سے پریشان کن ہے، اول اس لئے کہ آخر اتنی بڑی توہد کو صرف دو ہفتوں میں اتنا کم کرنا شاید ممکن ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ سربراہ پولیس نے اخبارات میں وہ بات تصویر اشتہار پڑھ لیا ہو جس میں توہد کو صرف تین گھنٹوں میں چھ سے تین انچ تک چھوٹا کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے، یہ بھی بتایا گیا ہے کہ درد، کٹ کے بغیر، مضراثرات سے پاک، بے ہوش کئے اور خون بہے بغیر، ہمیشہ کے لئے موٹاپے سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ تاہم آئی جی صاحب ایک مہربانی کر دیں کہ توہد بردار پولیس والوں کو اس کا کوئی جادوئی ٹوٹکا عنایت

کردیں، جس سے یہ کام راتوں رات ہو جائے، یا متعلقہ پولیس والے بھی اخبار سے ایسے اشتہار تلاش کر لیں جو رات بھر کی بجائے صرف تین گھنٹوں میں ان کا کام کر دیں۔

پریشانی کی دوسری وجہ یہ کہ کم کھانے کا مشورہ دینا تو پولیس والوں کو گالی دینے کے مترادف ہے، کھائے پیئے بنا تو ان کی زندگی ادھوری ہے، وہ کھانا ہو، یا رشوت ہو، یا مظلوموں کا خون ہو۔ کھانے پینے سے منع کرنا ان کے لئے سب سے بڑی اور بامشقت قسم کی سزا ہے۔ صاحب! انہیں جو چاہے سزا دے دیجئے، مگر یہ کھانا کم کھانے کا مشورہ نہ دیجئے، زندگی کو بے مزہ نہ کیجئے۔ سوم؛ پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سابقہ حکومت نے بھی توند بردار پولیس والوں کو اپنی توندیں کم کرنے کا حکم دیا تھا، جس پر عمل نہیں ہو سکا تھا، اس کی شاید وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جن اہلکاروں نے توندیں نا پنی ہیں وہ بھی تو ان کے پیٹی بھائی ہی ہونگے، کون اپنے پیٹی بھائی کی نوکری ختم کروا کے ان کے پیٹ پر لات مارے گا؟

سچ تو یہ ہے کہ اب پولیس والے توند کے بغیر چلتے ہی نہیں، توند ان کی شخصیت کا لازمی حصہ بن چکی ہے، بسیار خوری کے ساتھ ساتھ بے کار بیٹھنے سے بھی توند بڑھنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ عام طور پر پولیس کی ملزمان کے پیچھے

بھاگ دوڑ کی کہانی کم ہو چکی ہے، اب پولیس کی زیادہ نفری پر وٹو کول اور محافظ کے طور پر حکمرانوں، وزیروں، مشیروں، ٹاسک فورسوں کے نام نہاد چیئر مینوں اور دیگر عوام دشمن وی آئی پیز کی حفاظت پر مامور ہوتی ہے، انہیں صرف اپنے وی آئی پی کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے، جو کہ ورزش کے زمرے میں نہیں آتی، بلکہ جہاں وی آئی پی صاحب کی دعوت ہوتی ہے وہاں مذکورہ پولیس والے بھی کھانے کی الگ میز پر بیٹھ کر اپنے صاحب کی حفاظت کا فریضہ نبھا رہے ہوتے ہیں۔ خبر سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جن کی توندیں مطلوبہ ٹارگٹ سے کم ہیں وہ کیا کریں، کیا وہ اپنی توند کو بڑھانے کے لئے دن رات ایک کر دیں۔

آئی جی پولیس جہاں بھی تشریف لے جاتے ہیں، وہاں وعظ بھی لازمی فرماتے ہیں، غنیمت ہے کہ پولیس سربراہ اس قسم کی گفتگو کرے، اللہ کرے ان کی یہ نصیحتیں رنگ لائیں اور ہماری پولیس جو سخت جانی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے، راہ راست پر بھی آجائے۔ آئی جی صاحب کوئی ایسا فارمولا بھی ترتیب دیں کہ پولیس اپنے روایتی ہتھکنڈوں سے دستبردار ہو جائے، تشدد، گالی گلوچ اور بے گناہوں کو چھتر کے زور پر اپنے مطالبے منوانا ان کا روز کا معمول ہے۔ توندیں چھوٹی کرنا زیادہ مشکل ہے، مگر اخلاق بہتر کرنے پر تو نہ محنت آتی ہے، نہ خرچہ ہوتا ہے اور نہ ہی اخلاق بہتر کرنے کے لیے کم کھانا پڑتا ہے، دعا ہے کہ آئی جی صاحب کی محنتیں کارگر شاہت ہوں اور سمارٹ اور بااخلاق

پولیس قوم کی خدمت کرتی نظر آئے

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مسٹر جسٹس عمر عطا بندیال نے اپنی ماتحت عدالتوں کے تمام ججوں سے ان کے اثاثوں، بینک بیلنس اور بیوی بچوں کے اخراجات کی تفصیلات طلب کر لی ہیں۔ تمام ڈسٹرکٹ، ایڈیشنل سیشن ججوں، سینئر اور سول ججوں کو ایک مراسلہ بھیج دیا گیا ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ 30 جولائی تک لاہور ہائی کورٹ کو ٹھوس شواہد کے ساتھ معلومات فراہم کریں کہ عدلیہ میں آنے سے پہلے اور بعد میں ان کے اثاثوں اور بینک بیلنس کی تفصیلات ہیں، ان کے بیوی بچوں کے اخراجات کیا ہیں، اگر بیرون ملک دورے کئے تو اخراجات کہاں سے پورے کئے، بچوں کے سکولوں کی فیسیں اور تعلیمی اخراجات کتنے ہیں، ان کو پورا کرنے کے وسائل کہاں سے آئے؟

اتنے سادہ اور آسان نسخے کو آزمانے کا مشورہ تو کئی معقول لوگ پہلے بھی دیتے آئے ہیں لیکن ہمیشہ بد قسمتی آئے آتی رہی، ویسے بھی کون حکمران ہے جو اس نسخے پر عمل کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا ارتکاب کرے۔ اب عدلیہ آزاد ہے، یہ آزادی اپنے اثرات دکھا رہی ہے، قوم منتظر ہی نہیں مطمئن بھی ہے کہ سستا اور فوری انصاف ان کی دہلیز پر انہیں میسر آئے گا۔ ایسے میں

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا یہ قدم قوم کے لئے کسی بہت بڑی خوشخبری اور خوش بختی سے کم نہیں۔ اس ہدایت نامہ کے بعد قوم ایک نئی امید لگا کر ایک ماہ اثاثے آنے کی راہیں دیکھے گی، پھر وہ ان کی جانچ پڑتال اور چھان بین کا انتظار کرے گی، بہتر ہو کہ بعد میں چھان بین کی بھی کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے اور سب سے اہم اور بڑی بات یہ ہو کہ ان اثاثہ جات کو قوم کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے۔

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کے ہدایت نامہ کے بعد اب تمام محکمہ جات کا اخلاقی فرض ہے کہ اس کے سربراہ یہی حکم اپنے تمام ماتحت عملے کو جاری کریں، تاریخ بھی 30 جولائی ہی کی بہتر ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں غلط بیانی میں کسی حد تک کمی آسکتی ہے۔ وطن عزیز میں ایک ایک محکمہ کرپشن کی دلدل میں گردن گردن تک دھنسا ہوا ہے، پولیس ہو یا مال ایکٹ تھانیدار کی کئی کئی کوٹھیاں، پلاٹ، گاڑیاں اور نہ جانے کتنے کاروبار ہیں۔ پٹواری سے تحصیل دار تک کے بنگلوں، کاروں اور دیگر اثاثوں کا حساب لینا بھی ضروری ہے، اگر کسی پٹواری کی تین سے کم کوٹھیاں اور ایک دو کاریں وغیرہ ہوں تو سمجھا جائے کہ وہ قناعت پسند پٹواری ہے۔ عام سرکاری ملازمین سے بھی اسی طرح حساب لے کر اثاثے معلوم کئے جائیں۔

بیورو کریسی سے بھی اثاثوں وغیرہ کی تفصیل کوئی معلوم نہیں کرتا، کہ یہ طبقہ حکمرانوں
 سے بھی زیادہ طاقتور اور محفوظ ہے، یہ مراعات کے چکر میں ہی لاکھوں کروڑوں کا
 حساب برسر کر جاتے ہیں، ان کے بچے کن اداروں میں زیر تعلیم ہیں، کتنے بیرون ملک
 اپنی باقی زندگی کس آمدنی کے ذریعے گزار دیتے ہیں، اے سی سے لے کر چیف سیکریٹری
 تک کے صوابدیدی اختیارات کس قدر ہوتے ہیں، اس مد میں کتنے فنڈ کہاں خرچ کئے
 جاتے ہیں اور کتنے بچائے جاتے ہیں۔ فوجی بیورو کریسی کو بھی حساب کتاب میں آنا
 چاہیئے، کہ وہاں بھی تاحیات مراعات وغیرہ کا چکر چلا رہتا ہے۔ حکومتوں میں آنے
 والے سیاستدان بھی اقتدار سے قبل اور بعد کے اثاثے ظاہر کروانے کے پابند ہوں۔ دعا
 اور امید ہے کہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ اس سلسلہ میں بارش کا پہلا قطرہ ثابت
 ہونگے، اور اگر صوبائی چیف صاحب اس پورے ہدات نامہ کو حقیقی انجام تک پہنچادیں
 اور دیگر کے لئے مثال بنادیں تو یہ قوم پر احسان ہوگا، اس کے بعد عدلیہ بھی مقتدر
 طبقوں سے اثاثے طلب کر سکے گی۔ اگر قوم کا نیچوڑا ہوا یہ کھربوں روپیہ ملک و قوم پر ہی
 لگا دیا جائے، کرپشن ختم ہو جائے، ظلم اور غربت بھی کم رہے گی، خوشحالی اور سکون
 نصیب ہوگا۔ قدم بڑھائیں چیف جسٹس، قوم آپ کے ساتھ ہے۔

مسلم دنیا اور پاکستانی میڈیا

مسلم دنیا کس حال میں ہے، اس پر کیا بیت رہی ہے؟ پاکستانی میڈیا واضح تصویر پیش نہیں کر رہا، دھندلی اور مبہم سی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، بہت ہی کم لوگت ہیں جو ان معمولی معلومات سے بھی آگاہ ہیں، ورنہ عوام کو تو کانوں کان خبر نہیں۔ اول تو خود

پاکستان ہی اس عذاب میں مبتلا ہے جو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں افغانستان پر مسلط کرنے کے نتیجے میں قوم پر نازل ہے۔ پاکستان بھی امریکہ کا اتحادی ہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ کچھ عرصہ سے پاکستان نے سلالہ چیک پوسٹ پر امریکیوں کی بمباری کے نتیجے میں 24 فوجی جوانوں کی شہادت کے بعد سخت ترین دباؤ کے بعد نیو سپلائی لائن کو منقطع کر رکھا ہے، لیکن اتحادی ہونے اور اس سلسلہ میں انجام دی جانے والی خدمات کا امریکہ نے صلہ یہی دیا ہے کہ آئے روز پاکستان کی حدود کے اندر

ڈرون حملے کرتا اور بے شمار بے گناہ شہریوں کی شہادت کا موجب بنتا ہے۔ گزشتہ دنوں سے برما میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ ایکٹ بودھ لڑکی کے اسلام قبول کرنے پر بودھوں نے لڑکی کو قتل کر کے مسلمانوں پر اس کا الزام لگا دیا، یوں یہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی اور مسلمانوں کا

قتل عام شروع ہو گیا، ان کے جھوپڑی نما گھروں کو آگ لگا دی گئی، یوں ہزاروں لوگ ساحل سمندر کی طرف بھاگ نکلے، جہاں سے وہ بگلہ دیش پہنچ گئے، بگلہ دیش کی فوجوں نے انہیں جوں کا توں واپس دھکیل دیا، بہت سے لوگ ساحلی دلدل میں دھنس گئے اور سسک سسک کر مر گئے، کچھ سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، بھوک پیاس نے کچھ کی جان لے لی

اور جو واپس پہنچے، بودھوں نے انہیں ساحل پہ ہی مٹی کا رزق بنا دیا۔ اس ساحل پر تاحد نگاہ وہ لوگ قطاروں میں لیٹے ہوئے ہیں جنہیں پہلے تو بودھوں نے سمندر کی طرف دھکیلا، جو بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے وہ بگلہ دیش پہنچے، وہاں سے دھکیلے گئے تو اپنے انجام کو پہنچے، ان لیٹنے والوں کے جسم روحوں سے خالی ہیں کہ یہ قتل کئے گئے لوگ ہیں، اور دنیا میں ان کا نہ کوئی وارث ہے، نہ ہی ان کے لئے کوئی احتجاج کرنے والا اور نہ ان کے کفن و دفن کا کوئی ذمہ دار۔ حد تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کے لئے اظہار افسوس کرنے والا بھی کوئی نہیں، یوں ان کی روحوں دنیا میں زندہ سلامت مسلمانوں سے سوال کر رہی ہیں، کہ اخوت کا رشتہ کیا ہوا؟ وہ حدیث کیا ہوئی جس میں فرمایا گیا تھا کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، کسی حصے کو بھی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم ہی بے آرام ہو جاتا ہے؟ کیا ہوئی 'او آئی سی'؟ کہاں گیا اقوام متحدہ اور اس کے بلند و بانگ دعوے، ہیومن رائٹس کی تنظیمیں کہاں گئیں؟ بیشتر عرب ممالک میں صدیوں سے بچے گاڑے آمریت اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے، مگر شام میں بھی

مسلمانوں کو گاجر مولیوں کی طرح کاٹا جا رہا ہے۔

ان بری خبروں پر بھی ہمارا میڈیا خاموش ہی ہے، مگر دوسری طرف ایک بہت اچھی خبر بھی تقریباً خاموشی سے ہی گزر گئی، مصر کے صدارتی الیکشن میں اخوان المسلمون کے

ڈاکٹر محمد مرسی کی کامیابی اسلامی دنیا کی تاریخ میں ایک بڑا معجزہ ہے، اخوان نے قربانیوں کی جو تاریخ رقم کی ہے، موجودہ اسلامی دنیا یہ اس کی مثالیں ملنا ممکن نہیں، قطب شہید اور ان کے کئے ہی سرفروش ساتھی پھانسیوں پر جھول گئے، کئے جانثار جیلوں میں گئے مگر واپس نہیں آئے، ان کی قبروں کے نشان بھی کسی کو معلوم نہیں۔

فرعونوں کے دلیں میں زمانہ حاضر کے فرعونوں سے نکل لینے اور استقامت دکھانے والے اخوان کو عوام نے منتخب کر کے مصر کی ہزاروں سالوں کی تاریخ کو تبدیل کر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ خون رائگاں نہیں جاتا۔ اگرچہ ہزاروں سال کا نظام اپنی مضبوط جڑوں کے ساتھ موجود ہے، جس کو اکھاڑنا اخوان اور عوام کی کوشش سے ہی ممکن ہوگا، انہیں بڑی ہی استقامت، دعاؤں اور اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ مگر ہمارا میڈیا پاکستانی عوام کو مصر میں فرعونیت سے جمہوریت کے سفر کی روداد تو سنا دیتا، اس سفر میں کس کے ساتھ کیا ہوا، یہ تو بتا دیتا؟؟

جب پاکستان کی تاریخ کے سب سے نیک، شریف، دیانتدار، ایماندار اور منصفی کے منصب سے ریٹائر ہونے والے صاحب جناب عزت مآب رفیق تارڑ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے، تو وہ اپنے گرد پھیلی سیکورٹی سے کہتے تھے، ”میںوں کھنٹے مارنا ایں“، جب کسی صحافی نے یہ کہہ ہی دیا کہ جناب اگر ایسا ہی ہے تو پروٹوکول کے لئے رکھے گئے اتنے بڑے لاؤ لشکر میں کمی کا اعلان فرمادیں، تو ان کا جواب سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل تھا، انہوں نے فرمایا، ’یہ آئینی مجبوری ہے‘۔ ظاہر ہے ایک سابق جج کو تو آئین کی پاسداری عام لوگوں سے زیادہ ہی کرنی چاہیئے۔

ابھی تک تو قوم کے علم میں یہی تھا کہ پاکستان کا صدر کسی عدالت، کسی پارلیمنٹ اور کسی عوام نامی مخلوق وغیرہ کے سامنے جوابدہ نہیں ہے، اسے ہر معاملہ میں استثنیٰ حاصل ہے۔ اگر عدلیہ نے کبھی کوئی سوال پوچھ لیا تو پاکستان کا آئین ڈھال بن کر سامنے آکھڑا ہوا۔ موجودہ حکومت کا پسندیدہ، اہم اور سب سے زیادہ لگایا جانے والا نعرہ ہے ”پارلیمنٹ بالادست ہے“۔ اس نعرہ کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ عدلیہ آزاد ہے، اور اس کی آزادی کے

اثرات بے مہار حکومت کی 'آزادی' پر پڑ رہے ہیں۔ نئے سربراہ حکومت نے کہا ہے کہ پارلیمنٹ تمام اداروں کی ماں ہے، جمہوریت میں واقعی پارلیمنٹ ایک مقدس گائے ہوتی ہے۔

وفاقی کابینہ نے صدر کے استثنیٰ سے بھی دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایک نئے بل کی منظوری عنایت فرمادی ہے، جس کے مطابق اب صدر، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ، اور وزیر توہین عدالت سے مستثنیٰ ہونگے۔ کابینہ نے ویسے تو اور بھی کئی انقلابی فیصلے کئے ہیں، مگر یہ استثنیٰ والا فیصلہ بہت تاریخی ہے، جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا طبقہ کا استحقاق نہایت درجے نازک واقع ہوا ہے، وہ ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا، بہت جلد مجروح ہو جاتا ہے اور مجروح ہونے کی صورت میں معاملہ پارلیمنٹ میں پیش ہوتا ہے۔ لیکن کیا ان لوگوں کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ عدلیہ کے بارے میں جو چاہیں فرمان جاری کرتے رہیں، عدلیہ کے احکامات سے جو چاہیں سلوک کرتے پھریں، گویا وہ کسی قانون اور ڈسپلن کے تابع نہ ہوں، ان کی مرضی ہی قانون ہو، ان کی خواہش ہی آئین ہو۔

جمہوریت پر منفی تبصرہ آئین سے غداری کے زمرے میں آ جاتا ہوگا، مگر یہ جمہوریت کی برکات ہی تو ہیں کہ سب انسان برابر نہیں، (مسجد اور قبر میں تو

سب برابر ہی ہوتے ہیں) اگر مندرجہ بالا ہستیاں توہین عدالت سے مستثنیٰ ہیں تو گورنروں کو بھی شامل کر لیجئے، وفاقی اور صوبائی اداروں کے سربراہ، سیکریٹریز وغیرہ بھی اس میں شامل ہو جائیں، مشیروں اور ٹاسک فورسوں کے نام نہاد چیئرمینوں کو بھی عدلیہ سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کروادیا جائے، سیاستدانوں نے بھی کبھی حکومت اور کبھی حزب اختلاف کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے، انہیں بھی استثنیٰ مل جائے تو بہتر ہے۔

یہ سب لوگ جس طرح چاہیں عوام کا خون نہچوڑیں، جیسے چاہیں ملک کو لوٹیں، جتنی چاہیں دولت بنائیں، جس قدر ہو سکے کرپشن کریں، اسمبلیوں میں جتنا جاہلانہ یا غیر سنجیدہ رویہ ممکن ہے اپنائیں، ایوان کے اندر مغفلات یکے کا مظاہرہ اور ریکارڈ قائم کریں، اسمبلی کے اندر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر اپنے معزز اور باوقار ہونے کے معاملہ پر مہر تصدیق ثبت کریں۔ یہ لوڈ شیڈنگ سے بھی مستثنیٰ، یہ لوٹ مار کے بھی ماہر، یہ ملک و قوم کے نام پر قومی خزانے کو اپنے آبائی وراثت تصور کر کے ہڑپ کریں، اپنی مراعات میں اضافے پہ اضافہ کرتے جائیں۔ کیا عوام بھی کبھی سوچیں گے کہ کیا یہ ہمارے ہی نمائندے ہیں؟ کیا استحقاق اور استثنیٰ انہی کے لئے ہے، کیا اس کے بدلے میں عوام کے لئے صرف ”استحقاق“ ہے، جو ہوتا آیا ہے، اس باخبر اور آگاہی کے دور یہاں بھی جاری ہے۔ کیا استثنیٰ اور استحقاق اسی طرح جاری رہے گا؟

گاڑی چولستان کے آگے، رساتے صحرا کے ایک خشک ٹوبے کے کنارے رکی، چند قدم کے فاصلے سے پیاس سے بے سدھ تیترا کا جوڑا صحرا کی جانب بھاگا، کسی نے ان کو پکڑنے کی تجویز بھی دی، حقیقت یہی ہے کہ جوڑا شدت پیاس کی وجہ سے اڑان بھرنے کے قابل بھی نہ تھا، چولستان میں گرمیوں میں ’ٹوبہ‘ زندگی کا استعارہ ہوتا ہے، بشرطیکہ اس میں پانی ہو۔ ٹوبہ کے چاروں اطراف میں کئی ایکڑ تک پھیلا جانوروں کا فضلہ اس بات کا ثبوت تھا کہ چند ماہ قبل تک یہاں زندگی کے آثار تھے، مگر جب یہاں پانی نہ رہا تو زندگی بھی روٹھ کر کسی اور منزل کی جانب سفر کر گئی۔ چولستان کے روہیلے، اونٹ اور گائیں اللہ تعالیٰ کی کئی نعمتوں سے مالا مال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سیکڑوں میل کے بے سمت راستوں میں یہ لوگ بھٹکتے بہت کم ہیں، جانوروں کو بھی ٹوبوں کے رستے معلوم ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ خود بخود ہی ٹوبوں کی جانب سفر کرتے، اپنی پیاس بجھاتے اور بعض اوقات رات وہیں بسر کر کے اگلی صبح پھر تلاش رزق کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تیترا کا جوڑا بھی اسی فطرت سے آشنا تھا۔

منظر تو دوسرا بھی معمولی تھا، مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، خشک

ٹوبے کے کنارے ایک مریل سے درخت کے نیچے اگی جھاڑی پر بیٹھے چھوٹے سے پرندے کی پیاس کے مارے بے بسی سے کھلی چونچ دیکھ کر مسافر لرز گئے، تجھ نہ ہوا کہ ان کو پانی پلایا جائے، مگر کوئی ایسا برتن نہیں تھا، جس میں پانی ڈال کر ان کے سامنے رکھا جاتا، پانی بوتل میں تھا، اگر پانی زمین پر انڈیلتے ہیں تو چند سیکنڈ میں اسے صحرا کی پیاسی ریت جذب کر جائے گی، ٹوبہ میں پانی کھڑا رہنے کی وجہ سے زمین سخت ہو جاتی ہے، ایک فٹ لمبی اور چھ انچ چوڑی زمین کھودی گئی، ایک آدھ لٹر پانی اس میں ڈالا گیا، اس کے بعد کا منظر ناقابل فراموش ہے، مسافروں نے دیکھا کہ وہ منے منے سے پرندے کہ بھوک پیاس نے جن کو ہڈیوں اور پروں کا ڈھانچہ بنا دیا ہے، پانی پر ایسے گرے جیسے شکاری کی گولی لگنے سے پرندہ گرتا ہے، پہلے ایک اترا، پھر دوسرا، تیسرا، یوں آٹھ دس پرندے پیاس بجھانے لگے، اور چند ہی سیکنڈ میں واپس درختوں کی شاخوں میں کھیلنے لگے، ان کی آواز کا سادہ سلیس مفہوم یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں اور مسافروں کو دعا دے رہے ہیں۔

یہ ٹوبوں کی کہانی نہایت سادہ ہے، صحرائی ٹیلوں میں نشیبی جگہ پر پانی اکٹھا ہو جاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے پہاڑی علاقوں میں جھیل معرض وجود میں آتی ہے۔ ان ٹوبوں کے راستے خود جانور ہی تلاش کر لیتے ہیں، ٹوبے مویشیوں کے پانی پینے کا قدرتی ذریعہ ہے جو صدیوں سے رائج ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے یہ

ہوا کہ چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے کروڑوں روپے لگا کر تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر طویل پائپ لائن بچھائی، آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر پانی کے حوض بنائے، جہاں انسانوں اور چھوٹے بڑے جانوروں کے پانی پینے کے الگ بندوبست تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں سے رائج طریقہ متروک ہوتا گیا، ٹوبے صفائی نہ ہونے کی وجہ سے زمین کے برابر آگئے، اب وہاں بارش کی صورت میں معمولی پانی کھڑا ہوتا ہے، جو چند روز میں ختم ہو جاتا ہے، پائپ لائن کی سہولت چولستان کے محدود علاقے کو میسر ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ چولستان میں بسنے والے انسان اور جانور پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں، بارش نہیں ہوئی، ہو بھی جائے تو ٹوبے پانی محفوظ کرنے کے قابل نہیں ہیں، پائپ لائن میں پانی ندارد، اگر کبھی کوئی احتجاج وغیرہ سامنے آجائے تو ایک دفعہ لائن کھل جاتی ہے، پھر بند ہو جاتی ہے۔ مسافروں نے پچشم خود جگہ جگہ مردہ گائیوں کے ڈھانچے دیکھے ہیں، یہ تو راستوں میں تھے، سیکڑوں میل پھیلے چولستان میں ان کا شمار کیونکر ممکن ہے؟ حکومت پنجاب جہاں چولستان کی ترقی اور بہبود کے لئے ہزاروں ایکڑ زمین سرمایہ کاروں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی اور چولستان میں جہاں لاکھوں روپے کی مالیت کے سٹیڈیم بنا کر روپیہ ضائع کیا گیا ہے وہاں ضرورت ان ٹوبوں کی صفائی کی تھی، وہاں ضرورت پائپ لائن کو چالو کرنے کی ہے۔ کیا پنجاب کے وزیر اعلیٰ پانی کی بوند بوند

کو ترسنے والے انسانوں اور جانوروں کے بارے میں سوچنے کے لئے ابھی کچھ وقت

نکالیں گے، یا یہ لوگٹ اور ان کے جانور بے بسی سے یونہی مرتے رہیں گے؟؟؟

پنجاب حکومت نے اپنی بچت پالیسی کو جاری رکھنے کے لئے مزید احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ اس کے لئے سب سے اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایک ”کفایت شعاری کمیٹی“ قائم کر دی گئی ہے، صوبائی وزراء اور بیوروکریسی کو ہوائی سفر میں اپنے استحقاق سے ایک درجہ کم کلاس میں سفر کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں، نئی گاڑیوں اور دیگر ساز و سامان خریدنے پر بھی پابندی ہوگی۔ ایک اعلیٰ سطحی اجلاس یہاں وزیر اعلیٰ کی طرف سے چیف سیکریٹری کو یاد دہانی کرادی گئی کہ جس بچت پالیسی کا ذکر بجٹ میں کیا گیا تھا وہ آنے والے سال میں بھی جاری رہے گی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کی خریداری ناگزیر ہوگی تو کفایت شعاری کمیٹی کے سامنے کیس پیش کرنا ہوگا۔

اخراجات میں نمایاں کمی لانے کا حکم بھی ملا ہے، سپلیمنٹری گرانٹ کا حجم بھی کم کرنے کی پابندی ہے، پٹرول کے ساتھ ساتھ یوٹیلیٹی بلز پر بھی قابو پانا ہوگا۔ یہ حکم بھی ملا ہے کہ جس سرکاری ادارے کے اخراجات میں کمی نہ آئی یا جس ادارے کے اخراجات میں کسی حوالے سے اضافہ ہوا اس محکمہ کا صوبائی وزیر اور سیکریٹری ذمہ دار ہوں گے۔

اس صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی کوئی پالیسی گزشتہ برس بھی موجود تھی

جس کے تسلسل کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اگر تھی تو اس کی مناسب تشہیر نہیں کی گئی جس کی وجہ سے وہ عوام میں 'قبولیت عام' حاصل کرنے سے محروم رہی، حکومت پنجاب نے ضرور اس کے ثمرات سمیٹے ہونگے، تبھی تو اس کا ر خیر کو دوام بخشا جا رہا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت کے ترجمانوں کے پاس اس پالیسی سے حاصل شدہ نتائج کی طویل فہرست موجود ہو، مگر کیا کیجئے کہ عوام ان سے بے خبر ہی رہے، اب بھی اگر انہی کا تسلسل ہے تو حکومت کو سوچنا چاہیئے، اگر یہ پالیسی نئے نکات اور تخیلات سے مزین ہے تو اچھے وقت کا انتظار کرنا ہوگا، مگر یہاں بھی بے بسی اور مایوسی آڑے آجاتی ہے کہ ہمارے حکمران اپنے اعمال کے نتیجے میں اعتماد اور یقین کی منزلوں سے آگے گزر چکے ہیں۔

حکومتی لوٹ مار سے عوام کے دل و دماغ میں غیظ و غضب کے عناصر جنم لیتے ہیں، عوام میں بغاوت کے جذبات بھی بھڑکتے ہیں، نفرت سے خصہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے للوں تللوں کا بوجھ بالآخر عوام کو ہی برداشت کرنا ہوتا ہے، مہنگائی کی ایکٹری وجہ حکومتی عیاشی ہے۔ عیاشی ایک ایسی بیماری ہے جو لگ جائے تو سر کے ساتھ ہی جاتی ہے، مگر یہ حکومتی عیاشی تو ایسی مجبوری ہے کہ جو بھی اقتدار کے تالاب میں اترے گا، لامحالہ بھیگنا تو اس نے ہے ہی، کون ایسا درویش ہے جو سرکاری عیاشی کو خیر باد کہہ دے؟ پروٹو کول حکمرانوں اور بیوروکریسی کی سب سے بڑی کمزوری ہے، جس سے نجات کے بغیر اخراجات کم کرنے

کا خواب ایک مذاق ہی ہو سکتا ہے۔

ضلع کے درجہ پر بیورو کرہی کے پاس گاڑیوں کا حساب لگا لیجئے، ان کے صوابدید فیڈز کا اندازہ کر لیجئے، ان کی مراعات کو دیکھ لیجئے، یہی عالم نیچے سے اوپر تک ہے۔ کیا بہت ہی جذباتی اور نیک نام وزیر اعلیٰ کو علم نہیں کہ ان کے سرکاری افسران کے پاس کتنی کتنی گاڑیاں ہیں، ان کے وزراء کے پاس سیوریٹی کی مدیہیں پولیس۔ ایک ایسے صاحب کو ہم بھی جانتے ہیں کہ جو کسی نامعلوم ٹاسک فورس کے چیئرمین ہیں، جن کے پاس ایک بڑی سبز نمبر پلیٹ گاڑی مع ڈرائیور اور بندوق بردار پہرہ دار بھی۔ آپ کی وفاداری کا نتیجہ قومی خزانے سے عیاشی، غیر قانونی، غیر جمہوری، غیر اخلاقی عمل! اس سے عوام پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح سرکاری افسران کو سرکاری گاڑیوں کو دفاتر تک ہی محدود کر کے کروڑوں روپے ماہانہ بچائے جاسکتے ہیں، یہ کام وزیر اعلیٰ کے ایک معمولی سے اشارے سے ہو سکتا ہے۔ بچت کیجئے، مگر جن فضول خرچیوں کو آپ لوگوں نے مراعات اور استحقاق قرار دے کر اپنے لئے ضروری قرار دے رکھا ہے ان میں بھی کمی کی ضرورت ہے۔ دیکھیں اب یہ کفایت شعاری کمیٹی بچت کا کیا طریقہ اپناتی ہے، یا ٹی اے ڈی اے بنا کر خود بھی اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔

پولیس کی اصلاح؟

لیجے جناب! اب استثنائے معاملہ صدر، وزیر اعظم، وزرائے اعلیٰ اور وزیروں وغیرہ سے نکل کر پولیس تک بھی پہنچ گیا، پنجاب اسمبلی نے کثرت رائے سے ایکٹ بل منظور کر لیا ہے جس کے مطابق پولیس پر ”پیڈ ایکٹ“ لاگو نہیں ہو سکے گا۔ سرکاری ملازمین کے لئے یہ ایکٹ دفعہ 302 کی حیثیت رکھتا ہے، جس پر لگ جائے اس کی خیر نہیں۔ تاہم پولیس پر چونکہ پنجاب حکومت کی خصوصی نظر کرم ہے، اس کو زیادہ اختیارات دے کر ہی شاید دہشت گردی اور امن وامان کا قیام ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ پنجاب پولیس کو سابق حکومت کے دور سے ہی زیادہ سے زیادہ مراعات، سہولیات، گاڑیاں، جدید اسلحہ اور جدید ٹیکنالوجی سے روشناس کروایا گیا تھا، ماڈل تھانوں کی بات بھی ہوئی، گریجویٹ بھرتیوں کا ذکر بھی ہوا مگر تبدیلی کہیں نظر نہ آئی۔

پنجاب پولیس کے سربراہ حاجی حبیب الرحمن نے جنوبی پنجاب کا طوفانی دورہ کیا، اپنے پہلے دوروں کی طرح اس مرتبہ بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، پولیس کو بتایا گیا کہ وہ عوام کو انصاف فراہم کرے، رشوت نہ لے، ان فرمودات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں سڑے احتساب کا حشرہ سنایا گیا، پولیس کو عام

آدمی‘ سے قریبی رابطہ رکھنے کا حکم بھی دیا گیا، تاکہ خلیج کم ہو سکے، کہ عام آدمی ہمارا دست و بازو ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوام کو انصاف کی فراہمی شہباز شریف کا وٹن ہے، انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ نیٹو سپلائی پولیس نے بحال نہیں کی، مگر اس کے بعد پولیس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے، ان کے بقول پولیس کی ان غیر ضروری مصروفیات کے باعث جرائم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آئی جی نے یہ بھی کہا کہ ”دہشت گردوں کی کاروائیوں کی وجہ سے پولیس حالت جنگ میں ہے، میاں شہباز شریف نے انہیں دہشت گردی کے خاتمے کا خصوصی ٹاسک دیا ہے، خادم پنجاب نے انہیں خصوصی طیارہ دیا ہے تاکہ پنجاب کا دورہ کر کے دہشت گردوں کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ہم نے سرگرم دہشت گردوں کی فہرستیں تیار کر لی ہیں، مجرموں کے خلاف مہم سے جرائم اور اغوا برائے ”تاوان میں کمی آئی ہے، ہم دہشت گردوں کو امن تباہ نہیں کرنے دیں گے۔

ادھر خادم پنجاب کے ٹینٹ آفس میں سائلین کے مسائل سنتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ”عوام کی دادرسی نہ کرنے والے پولیس افسران اپنا رویہ درست کر لیں، اگر وہ بے سہارا اور مظلوم لوگوں کو انصاف فراہم نہیں کر سکتے تو اپنے عہدوں سے الگ ہو جائیں، انصاف ہماری پہلی ترجیح ہے، غفلت اور کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔ عجیب بات ہے کہ یہ ”سائلین“ کی آمد بھی ٹینٹ آفس کی برکت سے ہی شروع ہوئی ” ہے، ورنہ اس سے قبل ’اعلیٰ سطحی‘ اجلاس اور ملاقاتوں

وغیرہ کی خبر تو ہوتی تھی مگر عوامی مسائل سننے کا رواج دفتر میں کم ہی تھا۔ دوسرا یہ کہ ساکلمین بھی زیادہ پولیس کے ستائے ہوئے ہی نکلے، یہی وجہ ہے کہ خادم اعلیٰ کو پولیس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا پڑی۔

کیا تقریروں اور دھمکیوں سے معاملات درست ہو سکتے ہیں؟ کیا خادم اعلیٰ اور پولیس کے سربراہ کے کہنے سے رشوت ختم ہو جائے گی، کیا ان کی تقریریں سن کر عوام کو انصاف ملنا شروع ہو جائے گا، کیا ان کے اخباری بیانات سے مظلوم اور بے سہارا عوام کی داد رسی ہونے لگے گی؟ کیا ”جہازی دوروں“ سے انقلاب برپا ہو جائے گا؟ کیا آئی جی صاحب نے پولیس والوں کی لگتی توندیں کم کر والیں؟ کون نہیں جانتا کہ پولیس کی ”غیر ضروری مصروفیات“ کیا ہیں، کیا غیر ضروری پروٹوکول پر ہزاروں کی تعداد میں پولیس تعینات نہیں۔ کیا ہمارے حکمران نہیں جانتے کہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے سخت قوانین ضروری ہوتے ہیں، کیا پولیس کی ”پیڈ ایکٹ“ سے نکال کر انہیں مزید ’ہتھ چھٹ‘ نہیں بنادیا جائے گا، کیا اس سے دیگر سرکاری ملازمین پر منفی اثر نہیں پڑے گا؟ کیا پنجاب حکومت نے صوبہ کو پولیس سٹیٹ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

واپڈا کے مظالم اور بددعائیں

یہ رمضان المبارک کا پہلا جمعہ تھا، معمول سے زیادہ نمازی مسجد میں موجود تھے، یہ رمضان المبارک کی برکتیں ہی ہیں کہ ان دنوں میں مساجد میں رونقیں بڑھ جاتی ہیں، اسی کو غنیمت جانئے۔ اسی دوران واپڈا حرکت میں آیا اور بجلی چلی گئی۔ ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایسے موقع پر بے اختیار دل اور زبان سے کیا الفاظ نکلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ واپڈا والوں نے اتنی گالیاں کھائی ہیں کہ ان کے گناہ نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہونگے، مگر معاملہ اب گناہوں کی معافی سے کافی آگے گزر چکا ہے، گالی دینا گناہ ہے، ظالم کو بددعا دینا ایک فطری عمل۔ اگرچہ بددعا کی نوبت انتہا ہو جانے پر آتی ہے، اور اب انتہا ہو چکی ہے کہ رمضان المبارک میں لوڈ شیڈنگ کے معمولات تمام حدوں کو پار کر گئے ہیں۔

جہاں اس ناچیز کی رہائش ہے، وہاں دن کے بارہ بجے سے پانچ بجے تک دو گھنٹے بجلی آتی ہے، اور ان دو گھنٹوں میں بھی کم از کم دس مرتبہ داغ مفارقت دیتی ہے۔ اول تو یہ شیڈول ہی ظالمانہ ہے کہ دو سے تین بجے اور چار سے پانچ بجے بجلی نہ ہو، مگر اس شیڈول پر بھی واپڈا کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ جمعہ والے دن تو ڈیڑھ بجے ہی نمازیوں کے صبر کا مزید امتحان شروع ہو گیا، جو بڑی ہمت سے

روزے کا امتحان دے رہے ہوتے ہیں۔ دو بجے بجلی جانے کا اعلانیہ شیڈول کا وقت تھا، چنانچہ وہ نہیں آئی، چند منٹ آنکھ مچولی کھیلنے کے بعد تین بجے کا وقت ہوا، اس شیڈول میں بھی تین مرتبہ بجلی گئی۔ اور پھر چار بجے اس نے ”اعلانیہ“ جانا تھا، بھلا جانے والوں کو کون روک سکتا ہے؟ یہی روز کا معمول ہے، دوپہر کے پانچ گھنٹوں میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ بجلی کو شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔

رمضان المبارک میں عوام کا خیال تھا کہ شاید حکمرانوں کو ان پر کچھ ترس آجائے، مگر جن کے دل ہی پتھر ہو گئے ہوں وہاں سے ترس وغیرہ کی کیا امید؟ لیکن کیا چار سالوں میں حکمرانوں نے اس عذاب سے نجات کی کیا منصوبہ بندی کی ہے؟ کسی پاور سٹیشن کی بنیاد رکھی گئی ہے؟ کہیں ونڈپاور پلانٹ تیار ہو رہا ہے؟ کہیں سولر انرجی سے کام چلانے کا تجربہ کیا جا رہا ہے؟ کہیں کوئلہ سے بجلی بنانے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے؟ حکومت کی اس ضمن میں سنجیدگی سب کے سامنے ہے۔ جب حکومت نے اس کے لئے کچھ کیا ہی نہیں تو بہتری کہاں سے آئے گی، کیسے آئے گی؟ اس کو فکر ہے تو اپنے اقتدار کو طول دینے کی، اس کو پریشانی ہے تو لوٹ مار کی، اس کی منصوبہ بندی ہے تو بیرون ملک بینک بیلنس کی۔

ستم بالائے ستم ملاحظہ ہو کہ آئے روز فیول ایڈجسٹمنٹ کے نام پر بجلی کے نرخ بڑھا دیئے جاتے ہیں، تازہ خبر یہ ہے کہ جون کے مہینے میں خرچ کی گئی بجلی کی قیمت میں بھی اضافہ لیا جائے گا، مہینہ کا تعین ابھی باقی ہے کہ عوام کے گلے پر یہ چھری کب چلائی ہے۔ عوام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ صدمہ عوام کئی مرتبہ پہلے بھی برداشت کر چکے ہیں۔ یہ ظلم تو انوکھے انداز کا ہے کہ گزشتہ مہینوں میں استعمال کی گئی بجلی کے نرخ کئی ماہ بعد بڑھا دیئے جائیں، یہ کاروباری بددیانتی کی ایک گھٹیا سی مثال ہے۔ لیکن کیا کیجئے کہ بجلی ہے نہیں، مگر اس کے بل ہیں، بلکہ دو دو مرتبہ ہیں۔

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے سائنس و ٹیکنالوجی نے تھرکول منصوبے کے لئے تھرکول پراجیکٹ کے لئے تمام تر وسائل بروئے کار لانے اور ضروری فنڈز مہیا کرنے کی بھرپور سفارش کر دی ہے، کمیٹی کو ڈاکٹر شرمند مبارک نے بریفنگ دی، انہوں نے کمیٹی کو زیر زمین کوسکے سے گیس پیدا کرنے کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ مگر پریشانی تو یہی ہے کہ یہ قائمہ کمیٹیاں تو نام کی ہوتی ہیں، کیا کبھی ان کی 'سفارشات' پر کسی حکومت کے کانوں پر جوں بھی رہ سکی ہے؟ ان کمیٹیوں کا کام شاید عوام کو خوش کرنا ہے، خوش فہم عوام ان کی رپورٹوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کیا حکمران اس ضمن میں خود سادگی کا سوچ سکتے ہیں؟ کیا وہ بجلی بچانے کا بھی کوئی منصوبہ رکھتے ہیں، یا عوام سے رمضان

میں بھی بددعا میں لینے کی ہی منسوب بندی ہے؟

ابھی چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مسٹر جسٹس عمر عطا بندیال کے اس حکم کی آخری تاریخ بھی نہیں آئی تھی، جس میں انہوں نے عدلیہ سے تعلق رکھنے والے ملازمین کے اثاثوں کی مکمل تفصیلات طلب کی تھیں، یہ جون کے آخر کا واقعہ ہے اور آخری تاریخ 31 جولائی مقرر ہوئی تھی۔ ایک ایسا ہی حکم نامہ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی طرف سے جاری ہو گیا ہے، جس میں گریڈ 17 سے 22 تک کے تمام افسران سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اور خاندان کے مکمل اثاثے یکم ستمبر تک اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کو بھیج دیں، جس میں ان کو تحائف اور دینے والوں سے تعلق کی نوعیت بھی ظاہر کی جائے، گزشتہ سات برسوں میں جتنا مال و دولت اکٹھا کیا اس کی تفصیل دی جائے، بیوی بچوں کے پرائیویٹ غیر ملکی دوروں کی تفصیلات سے آگاہ کیا جائے، مجموعی آمدن ظاہر کی جائے، اندرون اور بیرون ملک بچوں کے تعلیمی اخراجات بتائے جائیں، بیوی اور بچوں کے زیر استعمال موبائل، گیس اور بجلی کے اخراجات بھی طلب کئے گئے ہیں۔ انکار کرنے یا اثاثے چھپانے یا غلط اعداد و شمار دینے پر کارروائی کی جائے گی، جس میں نوکری سے خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔

کسی صوبے میں قانون کا سب سے بڑا محافظ وہاں کے چیف جسٹس کو ہی قرار

دیا جاسکتا ہے، موصوف کے اس حکم کی تائید میں اس ناچیز نے بھی ایک عدد کالم لکھا تھا،
 اور دیگر محکموں سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ بھی اسی حکم کو مشعل راہ بنائیں، اس
 مشال پر عمل کرتے ہوئے اگر تمام محکموں کے سربراہ ایسے ہی حکم جاری کردیں، تو
 کرپشن کو اپنی جان کے لالے پڑ سکتے تھے، مگر یہ خیال ہی مایوسی بن کر دماغ کو ماؤف
 کر دیتا ہے کہ کون سا محکمہ یا ادارہ ہے جس کا سربراہ ”آئیل مجھے مار“ کے محاورے کو
 عملی جامہ پہنائے اور خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی کا وار کر لے۔ اس قسم کے احکامات
 میں ایک اور زبردست کمی رہ جاتی ہے کہ ان پر عمل کی نوبت کم کم ہی آتی ہے۔
 اگرچہ یہ حکم عوام کے دلوں کی آواز ہے، عوام چاہتے ہیں کہ بیوروکریسی کا بھی احتساب
 ہو، ان کے لئے تو مراعات بھی کرپشن کی حد تک زیادہ ہیں، جنہیں بد قسمتی سے آئینی
 تحفظ حاصل ہے، ان کے ضلع کی حد تک کے افسران کے پاس چار سے آٹھ کنال تک کے
 سرکاری غریب خانے، شہروں کے عین وسط میں موجود ہیں، گاڑیوں، اختیارات اور
 دیگر مراعات کا حساب کسی کو معلوم نہیں، ان کے صوابدید فیڈز بھی ہیں جو قومی
 خزانے میں نقب کا ذریعہ ہیں، ان کے علاوہ ’اوپر‘ کی آمدنی کا بھی کوئی اندازہ نہیں لگایا
 جاسکتا، سرکاری گاڑیوں کا بے جا استعمال عام افسر بھی بے دریغ کرتا ہے، بیوی بچے تو
 تقریباً ہر صاحب سواری سرکاری افسر کے سواری کے استعمال کو اپنا استحقاق جانتے ہیں،
 گاڑیوں

کے ذاتی استعمال پر تو شاید کسی دیانتداری کے دعویدار حکمران کو بھی اعتراض نہیں۔
 اس ضمن میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ سرکاری افسران کے اثاثوں کی ضرورت کیوں پڑتی
 ہے، حکومت کا فرض ہے کہ جب کوئی کسی اہم منصب پر بھرتی ہوا، سال بہ سال اس کے
 اثاثے ٹیکس وغیرہ کی غرض سے سامنے آتے ہیں، انہی سے بہترین حساب لگایا جاسکتا
 ہے، اگر حکومتوں کے پاس ایسا کوئی خود کار انتظام نہیں تو پھر ان احکامات اور پروفارے
 بھیجنے سے بھی کوئی نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے، جو لوگ کرپشن کر سکتے ہیں، اثاثوں کو
 چھپانے کا بندوبست کرنا ان کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اگر کوئی حکومت ایسا فریضہ
 نبھانے کا تہیہ کر لے اور فیصلہ کر لے کہ کرپشن کا قلع قمع کر کے ہی دم لینا ہے تو یہ
 ناممکنات میں سے نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مراعات اور عیاشیوں کا نشہ اترنے والا
 نہیں، اثاثوں کا حساب کتاب لینے والا بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتا، اگر یکایک اور راتوں
 رات کسی میں ایمانداری اور اصلاح کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم یہ
 اپنے مخالفین کو دبانے کا حربہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود اور مایوسیوں کے
 ہوتے ہوئے ہماری دعا ہے کہ ان احکامات پر عمل کی نوبت آئے اور لوٹ مار کے کلچر کا
 خاتمہ ہو سکے۔

خادم اعلیٰ پنجاب نے صوبہ بھر کے سکولوں میں آدھی بازو کی شلٹس اور نیکر پر فوری طور پر پابندی لگا دی ہے۔ انہوں نے یہ جذباتی اور فوری فیصلہ ڈیٹنگی کے حملے سے بچاؤ کے لئے کیا۔ پنجاب میں اتوار کو ”ڈیٹنگی ڈے“ منایا گیا، تمام سرکاری ملازمین کو ڈیوٹی پر آنے کے لئے پابند کیا گیا تھا، کونسا محکمہ ہوگا جس نے ’واک‘ یا ’سیمیٹار‘ منعقد نہ کروایا ہو، تصاویر بنوائی گئیں، اخبارات میں شائع کروانے کے اہتمام کئے گئے، ڈیٹنگی کے بارے میں آگاہی دی گئی، اس کی علامات اور بچاؤ کی تدابیر سے آگاہ کیا گیا۔ خادم پنجاب خوش ہوئے اور کہا کہ ڈیٹنگی کے خلاف مہم اب تحریک بن چکی ہے۔

کہا گیا کہ اتوار کو اگر یہ آگاہی مہم برپا نہ کی جاتی، اس کا انعقاد پیر کو کر لیا جاتا تو یقیناً بہت ہی زیادہ لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا جاسکتا تھا، مثلاً سکولوں کا ہی حساب لگالیں طلباء و طالبات کی تعداد کروڑوں میں ہوگی، مگر اتوار والی آگاہی مہم میں یہ طبقہ شامل نہ تھا، اسی طرح دفاتر میں سائل اور دوسرے لوگ موجود نہ تھے۔ اگر یہ سب کچھ ہو جاتا تو عوام کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ حکمرانوں کے دل میں جو بات بھی آجائے وہ اس پر عمل

کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، وہ چاہیں تو اتوار کو بھی سرکاری دفاتر کی رونقیں قائم کر سکتے ہیں، یہی ان کی رٹ ہے۔ ناقدین اور مخالفین کا تو کام ہی تنقید کرنا ہے، کام خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، یا ر لوگٹ اس میں سے بھی کیڑے نکالنے لگ جاتے ہیں۔

بات شروع ہوئی تھی، بچوں کی شرٹس اور نیکر سے، خادم پنجاب کا یہ خیال ہے کہ جسم اگر پورا ڈھانپا ہوا ہوگا تو ڈیٹنگی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے، اللہ کرے یہ بچے ڈیٹنگی سے محفوظ ہی رہیں، (شاید یہ حسن اتفاق ہی ہے کہ گزشتہ برس ڈیٹنگی کے شدید حملے سے متاثر ہونے والوں میں شاید بچوں کا کہیں ذکر نہیں تھا) خیر بچے معصوم اور کمزور ہوتے ہیں، انہیں زیادہ حفاظتی بندوبست کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے پورے بازو کی شرٹ پہننے اور نیکر کی جگہ پتلون پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اتوار کو تمام سرکاری ادارے کھول کر آگاہی دینے میں اگرچہ کروڑوں روپے صرف ہوئے ہونگے، مگر ان کے سوچے ہوئے کو تبدیل کرنا بھی ممکن نہیں۔

ہمیں جس بات نے پریشان کیا ہے وہ یہی آدھی بازو والی شرٹ ہے۔ صوبائی حکومت اس پر پابندی لگا رہی ہے، وفاقی حکومت اس کے بالکل برعکس اقدام کر رہی ہے، وفاقی حکومت نے لوڈ شیڈنگ کے ذریعے قوم کو جس لباس پہننے پر مجبور کر دیا ہے

اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ لوڈ شیڈنگ اور شدید ترین جس کے موسم میں پورے، کپڑے پہننا تو بہت دور کی بات ہے، خود ستر ڈھانپنے کو ہی غنیمت سمجھا جائے تو بہتر ہے، پہلے کرتا دھوتی کا کچھ تصور پایا جاتا تھا، جس بڑھا تو کرتے کی جگہ بنیان نے لے لی۔ بنیان کی کہانی الگ ہے، جسم سے چمٹ جاتی ہے تو پسینے کے عالم میں اور بھی عذاب بن جاتی ہے۔ گرمی اور جس نے مزید جلوہ دکھایا تو بنیان بھی رخصت ہوئی، صرف دھوتی کا سہارا رہ گیا، نوجوان اور ماڈرن طبقہ نے گھٹنوں تک کی نیکر سے ہی کام چلایا، یہ الگ بات ہے کہ دھوتی بقول عطاء الحق قاسمی ”کھلے ہوا دار کمروں“ کی مانند ہوتی ہے، جبکہ نیکر میں یہ سہولت دستیاب نہیں ہوتی۔

قوم کدھر جائے، پورے کپڑے پہنتی ہے، تو گرمی سے جان جاتی ہے، کیونکہ بجلی کا گزر تو گھر میں کسی وقت ہی ہوتا ہے، لوڈ شیڈنگ ایک عذاب کی طرح قوم پر مسلط ہے۔ اگر لوگ پورے کپڑے نہیں پہنتے تو خادم پنجاب کے غیظ و غضب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور ڈیٹنگ بھی موت کا ٹیکہ لگانے کے لئے تیار رہتا ہے، دونوں طرف موت ہی سامنے کھڑی ہے۔ مگر یہ حکمران لوگ اس موسم میں بھی کوٹ ہی میں کیسے ملبوس رہتے ہیں؟ وہ ڈیٹنگ سے بھی محفوظ ہیں اور گرمی سے بھی، کیا کبھی یہ نسخہ عوام کے ہاتھ بھی لگے گا؟

پی ایچ ڈی کی ضرورت

تحریک انصاف کے رہنما مخدوم جاوید ہاشمی نے کہا ہے کہ زرداری کی سیاست کو سمجھنے کے لئے پی ایچ ڈی کرنا پڑے گی۔

قومی سیاستدانوں میں سے اکثریت کی عمریں ساٹھ کے پیٹے میں ہیں۔ اگرچہ علم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں، لہذا سے مہد تک علم حاصل کرنے کا حکم ہے، اہل علم اس بات سے آگاہ بھی ہیں اور عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ مگر ہمارے سیاستدان اب اس لئے تو آگے پڑھنے سے رہے کہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا مقصد زرداری کی سیاست کو سمجھنا ہی ہو۔ ہاشمی صاحب تو سا لہا سال نواز شریف کی سیاست کو نہ سمجھ سکے وہ زرداری کو بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کتنے لوگ زرداری کی سیاست کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور کتنے ہیں جو اس غرض سے پی ایچ ڈی کا وزن اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔

مخدوم صاحب کو معلوم ہے کہ پاکستان میں اسمبلیوں میں جانے کے لئے کسی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں، گزشتہ حکومت نے اس غرض کے لئے کسی بھی امیدوار

کے لئے بی اے پاس ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ یار لوگ جعلی اسناد کی مدد سے اسمبلیوں میں پہنچ گئے، کچھ تو دوران مدت ہی نااہل قرار دے دیئے گئے، بہت سے ایسے بھی ہیں جو جعلی اسناد کے حامل تو ہیں، مگر ”ستے اور فوری“ انصاف کے ان کی دہلیز تک آتے آتے ذرا تاخیر ہو گئی، ابھی تک اسمبلی رکنیت کے مزے لوٹ رہے ہیں، عدالتوں کی کاروائیاں جاری ہیں، ممکن ہے اسمبلی کی مدت ختم ہوتے ہوتے ان کی رکنیت بھی ختم ہو جائے۔ زرداری کی سیاست کو سمجھنے کے لئے اب پرانی قیادت تو پی ایچ ڈی کی منزل کو نہیں پہنچ سکتی، لہذا مجبوراً ان کی سیاست کو سمجھنے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑے گا، اور یقیناً ایسا کیا جا رہا ہے، یہ بھاری کام آئندہ نسلوں پر چھوڑ دیا جائے۔

انگراں وزیراعظم اور کالا منہ

پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر قدیر خان نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں نگران وزیراعظم بننے کا مطلب منہ کالا کروانے کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ بھی کہ نگران وزیراعظم بننے کی بجائے وہ ریفرنڈم کی طرز پر براہ راست عوام کے ووٹوں سے صدر یا وزیراعظم بننے کو ترجیح دیں گے۔

ڈاکٹر قدیر کو قوم نہایت عقیدت اور احترام سے دیکھتی ہے، وہ قوم کے ہیرو ہیں، اخبار میں کالم لکھنے کے حوالے سے دانشور بھی ہیں، ان کا تجربہ اور

مطالعہ بہت وسیع ہے، وہ کھری اور سیدھی بات کرنے کے قائل ہیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے نگران وزیراعظم کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے، ہمارے لئے تو وہ کافی وزنی ہے، لیکن ہمارے ہاں نگران کی بجائے خود منتخب وزیراعظم کے لئے ایسے حالات ہوتے ہیں، جن کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے، پاکستان میں وزیرائے اعظم کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ان میں سے اکثریت کو جس طریقے سے ان کے منصب سے فارغ کیا گیا، حتیٰ کہ موجودہ وزیراعظم کو بھی جس 'احترام' سے رخصت کئے جانے کا امکان ہے وہ بھی عوام کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ رہی بات ریفرنڈم طرز کی، تو جناب ریفرنڈم بذات خود ایک بدنام سرگرمی ہے، جسے ایک بھیانک مذاق کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان میں اس قسم کے معاملے کو 'عزت' کے معاملات کے ساتھ نہیں جوڑا جاتا، نہ ہی تھوڑی بہت بے عزتی کو دل میں جگہ دی جاتی ہے، اگر ایسا ہونے لگ جائے تو پھر ہماری حکومتیں ایک روز بھی نہ چل سکیں، یہ ان کی ہمت ہی ہوتی ہے کہ وہ رقیبوں کی گالیاں سن کر بھی بے مزہ نہیں ہوتیں، کیونکہ ہر اگلے الیکشن میں سیاستدانوں نے انہی عوام کے پاس ہی جانا ہوتا ہے، لہذا ایسے مواقع پر ان کے تمام خسرے برداشت کرنے پڑتے ہیں، اسے سیاست کہیں یا ڈھٹائی، یہ ہر کسی کی اپنی سوچ ہے۔

باتیں تو بہت فکر انگیز تھیں، مگر مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ ہم اپنی عادات تبدیل کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں، ہم ہر قیمت پر اس محاورے پر عمل پیرا رہنا چاہتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ ”عاداتیں سر کے ساتھ جاتی ہیں“۔ چیف جسٹس آف پاکستان انور ظہیر جمالی نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ایسی باتیں کیں، جنہیں سن کر انسان کچھ دیر کے لئے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مگر کیا کریں کہ ایسی باتوں پر عمل کرنے کے لئے ضروری ماحول دستیاب نہیں ہوتا۔ باتیں سنیں، ہال سے باہر نکلے اور باتوں کے اثرات ہال میں ہی چھوڑ آئے۔ انہوں نے کہا ”... ہم بحیثیت قوم بے حسی اور بے یقینی کا شکار ہیں، اگر ہم باہمی اختلافات ختم کر دیں تو دنیا کی بہترین قوم بن سکتے ہیں، ہم بد انتظامی اور کرپشن کی وجہ سے تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں، سرکاری وسائل کو بے دردی سے استعمال کرتے ہیں، یہ سب کچھ ہمارے برے اعمال کا نتیجہ ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم وہی قوم ہیں جس کا خواب اقبال اور قائد نے دیکھا تھا، ہمارے مسائل حل کروانے کوئی مسیحا آسمان سے نہیں اترے گا، نہ کوئی باہر سے آئے گا، مجھے افسوس ہے کہ ہم منزل سے کوسوں دور ہیں، ہمیں منزل پانے اور ترقی کرنے کے لئے آئین اور قانون کو مقدم

رکھنا ہوگا...۔“

یہ ہمارا اجتماعی رویہ ہے، اس میں حکومت اور عوام برابر کے ذمہ دار ہیں، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ تبدیلی اوپر سے شروع ہوتی ہے، اگر حکمران عوام کو دیانتداری، محنت وغیرہ جیسے اوصاف کا درس دیتے رہیں اور خود اپنی مالی حالت بہتر کرتے رہیں، دوسروں کو سادگی کا سبق سکھائیں اور خود پروٹوکول اور مراعات کی آڑ میں عیاشیوں کے سمندر میں غوطہ زن رہیں، عوام کو قانون پر عمل کرنے کی ہدایت کریں اور خود قانون کی دھجیاں بکھیرنے میں سب سے آگے ہوں۔ یہ تبدیلیاں تو اسی وقت آسکتی ہیں جب انسان خود کسی کام پر عمل کرے اور اس کے بعد دوسروں کو ایسا کرنے کے لئے کہے۔ حکومت عوام سے ٹیکس نہجوڑتی ہے، کہ قرض بہت زیادہ ہیں، ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، مگر اپنی اربوں کروڑوں روپے کی عیاشیوں میں ایک روپے کی کمی کرنے کے لئے تیار نہیں، سیر سپاٹے اور پروٹوکول کو کوئی بھی کرپشن نہیں کہہ سکتا، قانون اور آئین کے دائرے میں رہ کر لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ چیف جسٹس نے بقول ہم سرکاری نل بند کرنا بھول جاتے ہیں، یعنی سرکاری وسائل کا بے دردی سے استعمال کرتے ہیں۔ جب اس حکومتی رویے میں تبدیلی نہیں آئے گی، قوم کو بچت، سادگی اور اسی قسم کی دیگر باتوں کا درس مناسب نہیں لگتا۔

چیف جسٹس آف پاکستان کا یہ کہنا اب بہت پرانی اور روایتی بات لگتی ہے، کہ کیا ہم وہی قوم ہیں جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور جس کے لئے قائد نے پاکستان بنایا تھا؟ اگر ہم صدر اور وزیراعظم سے لے کر عوام تک دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ قطعاً وہ پاکستان نہیں، یہ بالکل مختلف پاکستان ہے، جہاں نہ اصول ہیں، نہ اخلاق، نہ سوچ ہے اور نہ ہی احساس۔ ہر کوئی اپنی دھن میں مگن ہے، ہر کوئی نہایت یکسوئی کے ساتھ لوٹ مار اور مار دھاڑ میں مصروف ہے۔ جو لوگ کرپشن نہیں کرتے، ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں، کسی دفتر میں سائل کو چکر لگوانا، اسے مشکل میں ڈالنا، ہوتے ہوئے کام میں بھی رکاوٹیں کھڑی کرنا دفاتر کی عام کاروائیاں ہیں، ظاہر ہے یہ باتیں کرپشن تو نہیں کھلواتیں، مگر عوام کا خیال ہوتا ہے کہ اگر کچھ 'خدمت' کر دی جائے تو ساری مشکلیں پلک جھپکنے میں ہی آسان ہو جاتی ہیں۔

سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر بہتری کی جانب سفر کب شروع ہوگا، کون اس کا آغاز کرے گا، بارش کا پہلا قطرہ کون بنے گا؟ یقیناً ذمہ دار تو حکومت ہے، مگر اساتذہ کے بھی فرائض ہیں، کہ وہ نئی نسل تیار کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں کہ انہی بچوں نے آگے جا کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، ان کو کس طرح بہتر شہری اور اچھا مسلمان بنایا جاسکتا ہے۔ یہ علما کا فرض بھی ہے کہ وہ محراب و منبر پر عوام کو مخاطب کرتے ہوئے قوم کو اتحادِ امت کا درس دیں،

انہیں انتشار پھیلانے کے طریقوں پر لگانے کی بجائے انہیں اخوت سکھائیں، ایک دوسرے کا غم بانٹنے والا بنائیں۔ افسوس کہ یہ دونوں طبقے اپنے فرائض احسن طریقے سے ادا نہیں کر رہے۔ مگر سب سے زیادہ رکاوٹ خود حکومت ہے، کہ جس کا کوئی مطمع نظر ہی نہیں، جس کی کوئی منزل ہی نہیں، جس کی بہتری کی کوئی منصوبہ بندی ہی نہیں۔ دورے، بیانات اور اپنی مرضی کے چند میگا پراجیکٹس سے عوام کو قوم کی شکل نہیں دی جاسکتی، اس کے لئے قیادت کی ضرورت ہے، مگر وہی افسوس کہ موجودہ قیادتوں میں وہ دم خم نہیں۔

پاکستانیوں کی ایک پرانی حسرت رنگ لائے کو ہے، ان کے خواب تعبیر پانے کو ہیں، امکان پیدا ہو چلا ہے کہ اب اردو کے دن پھر جائیں گے اور تقریباً سات دہائیوں تک اپنے ہی ملک میں اجنبی کے طور پر زندگی گزارنے کے بعد اب امید پیدا ہو چلی ہے کہ اردو کے بھاگ جاگ جائیں گے۔ عوام کی یہ خواہش ضرور تھی کہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا بھی طریقہ یہی تھا کہ کبھی کسی تقریب میں اردو کے حق میں دو چار جملے بول دیئے۔ کچھ لوگوں نے اردو کے لئے تحریک بھی چلائی، مگر زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، کیونکہ اردو کو سرکاری زبان کا رتبہ دینا عوام یا دیگر طبقات کا کام نہیں تھا، یہ اختیارات صرف اور صرف حکومت کے پاس تھے، مگر بد قسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ حکومتوں نے بھی اپنے عوام کو لاروں اور وعدوں پر ٹخا کر اپنا کام نکالنے کی کوشش کی ہے، کسی بھی حکمران نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہ بھی حقیقت ہی ہے کہ اپنے حکمران بھی انگریزی کے اس قدر دلدادہ نہیں تھے کہ وہ اردو کو ناپسند کرتے تھے، چونکہ حکمران طبقہ ایک ہی طرح کے لوگ ہیں، ان میں سے بھی بہت سے ایسے ہیں، جو انگریزی سے نظریں چراتے ہیں، مگر کیا کریں کہ مجبور ہیں۔

اپنے حکمرانوں کی اس قدر بھی کیا مجبوری ہے کہ وہ اردو کو بطور سرکاری زبان نافذ کرنے سے اتنے خوفزدہ ہیں؟ اس 'خوفزدگی' کی وجہ تو وہ مغربی ممالک ہیں، جن کے قبضے میں ہمارے حکمرانوں کی جان ہے۔ حکمرانوں کا خیال ہے کہ ہم اپنے مغربی بڑوں کو کیا منہ دکھائیں گے، یعنی کس منہ سے ان کے سامنے اردو میں بات کریں گے اور وہ ترجمہ کروانے کے پابند ہونگے۔ حالانکہ اس معاملے میں منہ کا کوئی مسئلہ نہیں، ہر کام اسی منہ سے ہوتا ہے، اسی سے بیان دے کر انکار کیا جاتا ہے، اسی منہ سے پارٹیاں تبدیل کی جاتی ہیں اور اسی سے سابق لیڈروں کی مخالفت میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں، اور نئے لیڈر کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں، اسی منہ سے ظاہری اور باطنی کرپشن ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ کے سامنے جاتے ہوئے پریشانی کا سامنا ہے، حالانکہ وہاں پہلے بھی انگریزی کی ایسی قمیسی ہی پھیری جاتی ہے، ورنہ وہ بھی مروت میں ہی خاموش ہو رہتے ہیں، ورنہ کہہ سکتے ہیں کہ جناب اگر انگریزی نہیں آتی تو کوئی اچھا انگریزی بولنے والا رکھ لیں جو مترجم کے فرائض سرانجام دیتا رہے۔

اب اردو کی بات بننے کو ہے تو ایکٹ بہت بڑی پریشانی یہ بیان کی جا رہی ہے کہ جناب جو الفاظ ہیں ہی انگریزی زبان کے تو ان کی ادائیگی کیسے ہوگی؟ یعنی ہم

موبائل کو کیا کہیں گے، کمپیوٹر کو کس نام سے پکاریں گے، ہم تو وہ بیچارے ہیں جنہوں
 نے ٹیلی ویژن کا اردو میں کوئی نام ہی نہیں رکھا۔ اسی طرح تکنیکی تعلیم میں ایسی
 اصلاحات ہیں، جن کا اردو میں وجود ہی نہیں۔ ایسے ہی سیکڑوں الفاظ ہیں جو ہماری
 روزمرہ کی زندگی میں شامل ہیں اور معمول بن چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے
 کہ اردو میں بہت سے الفاظ عربی کے بھی ہیں، جن کی ہم اردو تلاش نہیں کر سکے، بعض
 الفاظ ترکی زبان کے ہیں۔ فارسی تو محاوروں سمیت اردو میں موجود ہے۔ اسی طرح
 ہندی نے بھی اردو پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس سے قبل بھی انگریزی کے ایسے
 الفاظ موجود ہیں، جو اردو میں بھرپور طریقے سے استعمال ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی کے
 کچھ الفاظ بھی اردو میں جگہ بنا چکے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ خاص طور پر ایسے
 الفاظ جن کا استعمال اس قدر زیادہ اور عام ہو چکا ہے کہ ہر کس و نا کس اس کو درست
 طریقے سے بولتا اور اس کے مفہوم کو سمجھتا ہے، تو ایسے الفاظ کو اردو سے دیس نکالا
 دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ تو ادیبوں، شاعروں اور دیگر لکھاریوں کا فرض ہے کہ
 وہ کوشش کر کے ایسے الفاظ استعمال کریں جن کی اردو میں بھی قاری کو آسانی سے سمجھ
 آ جائے۔ چونکہ انگریزی بھی فارسی وغیرہ کی طرح ہماری حکمران زبان رہی ہے، اس
 لئے اس کے بہت سے الفاظ اردو میں جگہ بنا چکے ہیں، ایسے الفاظ کو طنز وغیرہ کا ذریعہ
 بنانے کی بجائے ان کی جگہ اردو کے معقول لفظ استعمال کئے جاسکتے ہیں، اور انگریزی کے
 بعض معروف الفاظ کی جگہ اردو کے الفاظ استعمال کئے

جائیں تو سماعت کو بہت بھاتے ہیں، جیسے ٹشو کو 'کاغذی رومال' کہنا۔ ایسے الفاظ کو تلاش کر کے اردو میں انگریزی کی بہتات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ نہ تو انگریزی کو دلیں نکالا دینے کی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ کوئی دانش مندی ہے۔ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے مطلب ملک کی اکثریتی آبادی کے دل کی آواز کو سننا ہے۔

ریحام خان اگرچہ پہلے بھی لائبریری تھیں، مگر پاکستان میں ان کا نام اس قدر مقبول عام نہ تھا، گزشتہ برس اسلام آباد میں تحریک انصاف کے مشہور زمانہ دھرنے میں بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں، بہت سی نئی روایات دریافت ہوئیں، ان میں سے ایک دریافت ریحام خان تھیں تو تحریک انصاف کے چیئرمین کی زندگی میں آندھی کی طرح آئیں اور بگولے کی طرح چلی گئیں۔ اگرچہ کسی لیڈر کی زندگی کا کوئی گوشہ 'ذاتی' نہیں ہوتا، تاہم بال کی زیادہ کھال اتارنا بھی زیادہ مناسب دکھائی نہیں دیتا۔ عمران خان اور ریحام کی زندگی کے بہت سے معاملات الجھے ہوئے ہیں، مگر معاملہ ختم ہونے کے بعد زیادہ انکشافات کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم جس کپتان کی شامت کے ساتھ ریحام خان کا ذکر آیا ہے، وہ عمران خان نہیں، بلکہ پی آئی اے کا کپتان ہے۔ لندن سے پاکستان آتے ہوئے خبر ہے کہ ریحام خان نے کاک پیٹ کا بھی معائنہ کیا۔ تحقیقات پر ریحام کا کاک پیٹ میں جانا ثابت ہو گیا ہے، اس لئے اب جہاز کے کپتان کو انکوائری کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ کاک پیٹ میں کسی مسافر کا جانا غیر قانونی کام ہے۔ یہ چونکہ وفاقی حکومت کا معاملہ ہے، اگر پنجاب حکومت کی کہانی ہوتی تو کپتان کو معطل کر کے آرام پر بھیج دیا جاتا، اگر پنجاب کے کپتان کو زیادہ غصہ آ جاتا تو مزید سخت فیصلہ بھی کیا جاسکتا تھا۔

ایکٹ پائلٹ بھی آج کل زیرِ عتاب ہے، وہ جہاز کراچی سے اڑا کر لاہور لایا اور وہاں رن وے پر اتارنے کے بعد اسے قریبی کھیتوں میں لے گیا، جہاں اسے بریک استعمال کرنے کی ضرورت نہ رہی اور جہاز خود ہی کچھ سفر کرنے کے بعد رک گیا۔ اگرچہ مسافر خیریت سے رہے، مگر ایکٹ دہشت سی پھیل گئی، اور کسی پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس سلسلے میں پائلٹ ہی سب سے مناسب آدمی دکھائی دیا، جس پر اس تمام معاملے کا بوجھ ڈالا جائے۔ چنانچہ میڈیکل رپورٹس حاصل کی گئیں، معلوم ہوا کہ پائلٹ نے پی رکھی تھی، ہمت ہے کہ اس نے پی کر کراچی سے لاہور کا سفر طے کر لیا مگر اس پر پینے کا اثر اس وقت ہوا جب لینڈنگ کا موقع آیا۔ یہ چونکہ نجی کمپنی کا جہاز تھا اس لئے اس پائلٹ کی معطلی کے احکامات تو جاری نہ ہوئے، بلکہ اسے براہ راست جیل بھیج دیا گیا، جس کی ابھی تک ضمانت نہیں ہو سکی۔ خبروں میں آئے روز پائلٹوں کے پینے کا ذکر سنتے پڑھتے رہتے ہیں، حیرت کی بات ہے کہ جہاز اڑانا کس قدر حساس معاملہ ہے، مگر پائلٹ بھائی اسے کتنا سادہ اور ’لیزنی‘ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جہاز اڑانے کے لئے پینا منع ہے، تاہم اگر آپ نہیں رہ سکتے تو گھر سے ”پی آئی اے“۔

قومی اسمبلی کے حلقہ 154 میں ضمنی الیکشن ہو رہا ہے، جس میں مقابلہ روایتی حریفوں مسلم لیگ ن اور تحریک انصاف میں ہے، اس الیکشن کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس حلقے کا شمار اُن چار حلقوں میں ہوتا ہے، جن کے بارے میں تحریک انصاف کا مطالبہ تھا کہ انہیں کھولا جائے۔ دوسری اہمیت یہ کہ الیکشن ٹریبونل نے یہاں کا الیکشن کا عدم قرار دے دیا تھا، اور منتخب ایم این اے کو تاحیات نااہل قرار دے کر دوبارہ الیکشن کا اعلان کر دیا تھا۔ اس حلقے کی تیسری اہمیت یہ ہے کہ یہاں سے تحریک انصاف کے مرکزی قائد جہانگیر ترین الیکشن لڑ رہے ہیں۔ چوتھا واقعہ یہ پیش آیا کہ عدالت عظمیٰ نے ایم این اے کی ڈگری کو اصلی قرار دیتے ہوئے بحال کر دیا اور اس کی تاحیات نااہلی ختم کر دی۔ مگر کچھ ہی روز میں الیکشن کو دوبارہ کا عدم قرار دے کر پھر الیکشن کا ڈول ڈال دیا گیا۔ اب سابق ایم این اے اور مسلم لیگ ن کے امیدوار صدیق بلوچ کو ایک مرتبہ پھر نااہل قرار دے دیا گیا۔ اس مرتبہ کہا گیا کہ موصوف نے کاغذات نامزدگی داخل کراتے وقت اثاثے چھپائے ہیں۔ ہائی کورٹ نے اس الزام میں نااہل کر دیا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب وہ سپریم کورٹ میں جائیں گے جس سے وہ بحال ہو کر میدان میں آجائیں گے یہاں یہ عمل بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ صدیق بلوچ پر جعلی ڈگری کا مقدمہ بھی کافی، عرصہ چلتا رہا، ثبوتوں کی روشنی میں عدالت نے ان کی اسناد درست قرار دے دیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے حلقے کے لوگوں کا حق نمائندگی یوں نبھایا ہے کہ کبھی اسمبلی میں کوئی بات نہیں

کی اور نہ ہی علاقے کی تعمیر و ترقی کے لئے زیادہ توانائیاں صرف کی ہیں۔ جبکہ جہانگیر
ترین کی علاقے کے لئے سماجی خدمات بھی بہت سی ہیں، اور عوام کو بھی یقین ہے کہ
جہانگیر ترین مسائل بہتر طریقے سے حل کروا سکتے ہیں، مگر امکان ہے کہ جیت صدیق
بلوچ کی ہوگی، یہی جمہوریت کا حسن ہے۔

!مزید دو سوٹن کھجوریں

سعودی عرب نے پاکستان کو دو سوٹن کھجوروں کا تحفہ دیا ہے، سعودی عرب کے ڈپٹی ہیڈ آف مشن جاسم محمد خالد الخالدی نے ایکٹ تقریب میں یہ کھپ جوائنٹ سیکریٹری کابینہ ڈائریکشن کے حوالے کی۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے لئے خیر سگالی کے جذبہ پر سعودی حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ گزشتہ برس بھی اتنی مقدار میں اور انہیں دنوں میں یہ کھجوریں پاکستان کی دی گئی تھیں۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ یہ تحفہ پاکستانی عوام کے لئے ہے۔ مگر یہ عوام کو کیسے ملے گا، اس کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے گا، یہ ابھی معلوم نہیں ہو سکا۔ یہاں تو یہ عالم ہوتا ہے کہ زلزلہ یا سیلاب زدگان کے لئے دی گئی امداد بھی تقسیم کرنے والے اپنے گھروں کو لے جانے میں عار محسوس نہیں کرتے، تحفے کو کون چھوڑے گا۔ اگرچہ یہ کھجوریں وفاق کو ملی ہیں، مگر یہ تمام صوبوں کو دی جائیں گی۔ یہاں ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہوگا کہ مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ یقیناً پنجاب اور بلوچستان میں تو یہ بھیج دی جائیں گی، کیونکہ ایک میں اپنی حکومت ہے اور دوسرے میں اتحادی حکومت، مگر کے پی کے اور سندھ کو اس میں سے حصہ ملے گا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا۔ حکمران اپنے خاص کارکنوں کے علاوہ خاص مصاحبین کو بھی یہ تحفہ وافر مقدار میں دے سکتی ہے۔ دوسری طرف

بیورو کریسی کے بھی اپنے احباب اس قسم کی گنگا میں ہاتھ دھوتے ہی رہتے ہیں۔ بہت سے عقلمند لوگ اس متبرک تحفے کو اپنے استعمال کے لئے ذخیرہ بھی کر لیں گے۔ اگرچہ خبر سے اس تحفے کی تقسیم کی کوئی تفصیل سامنے نہیں آئی، مگر اس موقع پر کہ ابھی سعودی عرب سے آنے والے ڈالروں کے بوجھ تلے سے حکومت نکل نہیں پائی تھی کہ کھجوروں کا وزن آن پڑا۔ ممکن ہے کہ یہ تحفہ تھر میں قحط سے مرنے والوں کے لئے ہو، اگر سعودی عرب نے نہ بھی کہا ہو تو بھی شفاء اور غذائیت سے بھرپور یہ کھجوریں اگر تھر کے متاثرین کو کھلائی جائیں تو یقیناً افاقہ ہو سکتا ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ ہمارے تو مقتدر طبقے خود بھی 'متاثرین' ہی ہوتے ہیں، اس قسم کی جو چیز بھی آجائے بس اوپر والے

متاثرین لیبارٹری ٹیسٹ" سے جو بچے گا وہی اصلی متاثرین کو مل سکے گا۔

اگر سعودی حکومت مزید کچھ تاخیر سے یہ تحفہ بھیجتی تو رمضان المبارک میں ہمارے حکمران اور بیورو کریسی اپنے احباب کو یہ تحفہ پیش کر کے ثواب دارین کے مستحق قرار پا جاتے۔ بڑے لوگوں کی افطاریاں بھی بڑے لوگوں کے لئے ہی ہوتی ہیں، ان میں غریبوں اور مستحق لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسی طرح بڑے لوگ کھجوریں خود کھائیں یا اپنے احباب کو کھلائیں، غریبوں اور عوام کو

پریشان ہونے یا کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں البتہ اگر یہ کھجور خور بڑے لوگ از راہ کرم ان کی گٹھلیاں غریبوں کو دے دیں تو بھی ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہے گی، کیونکہ اول تو یہ لوگ ان گٹھلیوں کو مدینہ کی نسبت سے عزیز رکھیں گے، انہیں آنکھوں سے لگائیں گے، انہیں دل میں بسائیں گے، انہیں اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا محور بنائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایسی ہی گٹھلیوں کو فوتگیوں میں قل خوانی وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاسکے گا، اس مرنے والی کی قسمت پر رشک کیا جاسکے گا جس کی فوتگی پر سعودی عرب سے آئی ہوئی گٹھلیوں پر کوئی تسبیحات پڑھی جائیں گی۔

یہاں قسمتوں کے معاملے زیر بحث نہیں، اوپر والا اپنی حکمتیں خود ہی جانتا ہے، وہی جانتا ہے کہ امیر مفت کی کھجوریں کھائیں اور غریبوں کو ان کی گٹھلیاں بھی نصیب نہ ہوں، دولت مند اور صاحبانِ اقتدار دنیا کی ہر نعمت سے لطف اندوز ہوں اور غریب صرف ان کی حسرت ہی کر سکے۔ بے شمار غریب عقیدت مند ایسے ہیں، جو دل و جان سے مکہ مدینہ دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، ان میں سے بہت سے حیرت انگیز طور پر پونجی جمع بھی کر لیتے ہیں، مگر مہنگائی اور اوپر سے پی آئی اے کے کرائے دیکھ کر دل اور غریبوں کی حسرتیں ڈوب جاتی ہیں، دوسری طرف حکمرانوں اور بیوروکریٹس کے لئے مفت عمرے اور مفت حج دستیاب ہوتے ہیں، ساتھ ہی سیر سپاٹا بھی، رہائش بھی پروٹوکول بھی۔ ایسے میں اگر یہ لوگ

کھجوریں کھا جائیں گے تو کونسی آفت آجائے گی؟ اگر سعودی حکومت نے یہ کھجوریں
غریبوں کے لئے بھی دی ہیں تو بھی ان کا ایک قلیل حصہ ہی غریبوں تک پہنچے گا، کیونکہ
رستے میں بڑی بڑی سرکاری ”چیک پوسٹس“ بھی موجود ہوتی ہیں۔ بلدیاتی نظام تو ہے
نہیں، کہ ناظمین اور کونسلروں کے ذریعے ان کی تقسیم ہوتی، اب ممکن ہے یہ کام
پٹواریوں یا پھر سکول ٹیچروں کے ذریعے کروایا جائے، مگر اس سے بڑا امتحان کیا ہوگا کہ
سعودی کھجوریں تقسیم کرنے والے ان سے محروم رہ جائیں۔

بنیادی جمہوریتوں کا تیسرا مرحلہ بھی تمام ہوا، امیدواروں میں سے کچھ کی امیدیں بر آئیں، باقی یا تو مایوس ہو جائیں گے یا پھر اگلے الیکشن کی امید لگا کر زندگی کے باقی دن پورے کریں گے۔ الیکشن کے نتائج میں کوئی بات نئی نہیں، اگر پنجاب کے الیکشن کی بات ہے تو مسلم لیگ ن میدان مار رہی ہے، اگر سندھ کی بات ہے تو میدان پی پی کے ہاتھ میں ہے اور اگر سندھ کے بڑے شہری حلقوں کا ذکر ہے تو پوزیشن ایم کیو ایم کے پاس ہے، نتیجہ پہلے دو مراحل کا تسلسل ہے، اب بھی نتیجہ سب کو معلوم تھا۔ دوسرے مرحلے کے اختتام پر حکومت کے ایکٹ عہدیدار کا ستم رسیدہ بیان سامنے آیا تھا کہ ”حکومت نے قومی الیکشن کے موقع پر کیا ہوا ایکٹ اور وعدہ نبھادیا۔“ یہاں یہ سوال نہیں کہ پہلے کون سے وعدے نبھائے ہیں جو ایکٹ اور نبھادیا، مگر یہاں اتنا تو عرض کیا جاسکتا ہے کہ الیکشن کے ڈھائی سال بعد تک بھی بلدیاتی الیکشن کے راستے میں رکاوٹ کونسی تھی، کہ حکومت کو اپنا وعدہ پورا کرنے میں سالوں لگ گئے، حلقہ بندیاں، مردم شماری، دہشت گردی، بدینتی یا کوئی اور وجہ تھی۔ یہ حقیقت ہر کسی پر عیاں ہے کہ حکومت وقت نے بلدیاتی الیکشن نہ کروانے کے لئے کتنے پاڑے بیلے ہیں، عدالت کو کتنی پیشیاں دی ہیں، کتنے حیلے بہانے کئے ہیں، وہ تو عدالت عظمیٰ نے مضبوط اعصاب سے

کام لیا، ورنہ حکومت کی طرف سے الٹے سیدھے بہانے سن سن کر عدالت بھی مایوس ہو جاتی۔

حکومت نے جوں توں کر کے الیکشن کروانے کا وعدہ تو کر لیا، مگر احتیاط اس قدر کی کہ الیکشن کو تین مرحلوں میں کروانے کا فیصلہ کیا، کہ اگر حکومتی پارٹی کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑ گیا تو دوسرے دو مراحل میں معاملہ کو کنٹرول کر لیا جائے گا۔ دوسری طرف الیکشن کمیشن آف پاکستان کی طرف سے عام کی جانے والے پابندیوں کا ایسا بھر کس نکالاکہ الیکشن کمیشن وارنگ دیتا ہی رہ گیا، وزراء اور دیگر طریقوں سے سرکاری مداخلت کا کام جاری رہا، حتیٰ کہ فنڈز کا اعلان بھی ہوتا رہا۔ اس الیکشن میں حکومت نے سب سے اہم کام یہ بھی کیا کہ سابق دور میں ہونے والے الیکشن کے عہدوں کے نام تبدیل کر دیئے، اب یہاں ناظم اور نائب ناظم نہیں، چیئرمین اور وائس چیئرمین ہونگے۔ اور سب سے بڑی تبدیلی جو موجودہ حکومت نے کی ہے، وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، اب جو لوگ چیئرمین منتخب ہوئے ہیں، وہ اختیارات سے تہی دست ہونگے۔ کیونکہ موجودہ حکومت کا ایکٹ بہت بڑا نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ وہ تمام اختیارات اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ بہت سی وزارتوں کے قلمدان بھی انہوں نے اپنے پاس ہی رکھے ہوئے ہیں، صرف مشیروں وغیرہ کے زور پر کام چلایا جا رہا ہے، اگر وفاق میں دیکھا جائے تو خارجہ جیسی وزارت بھی خود وزیراعظم کے پاس ہے، اسی طرح صوبے میں بھی

اختیارات کی تقسیم کا یہی عالم ہے۔ اب یہ لوگ اجلاس کیا کریں گے، دعوتیں اڑایا کریں گے، دفاتر میں اپنے عہدے کی کلنی سجا کر جایا کریں گے، سائیکلین کے کام نکلوانے کی ناکام کوشش کیا کریں گے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بے اختیار ہونے کے باوجود قوم کے خزانے پر بوجھ بن کر رہیں گے کہ ان کی تنخواہ وغیرہ بھی مقرر ہوتی ہے۔ کوئی کام کرنے والا قومی خزانے سے تنخواہ لے تو کوئی بات بھی بنتی ہے۔

اس الیکشن میں الیکشن کمیشن کے احکامات کی کھلی خلاف ورزیوں کے عام مناظر بھی دیکھنے میں آئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ الیکشن پر اخراجات کی حد مقرر ہوتی ہے، مگر یہاں عام امیدوار نے بھی اس سے کئی گنا زیادہ خرچ کیا، ضابطہ اخلاق کی اس سرعام خلاف ورزی پر الیکشن کمیشن نے صرف وارننگ وغیرہ پر ہی کام چلایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب صرف آئندہ کوئی عام آدمی بلدیاتی الیکشن لڑنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بلدیاتی الیکشن میں پارٹی کارکنوں کی آپس میں لڑائی مارکٹائی اور تصادم سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ بہت تشویش ناک ہے، اس سے معاشرے میں عدم برداشت اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا ہے، گلی گلی لڑائی جھگڑا دیکھنے میں آیا، ہمسایہ ہمسائے کا دشمن ہو گیا۔ اس الیکشن میں درجنوں افراد زندگی کی بازی بھی ہار گئے۔ آخری مرحلے میں راولپنڈی میں ایک سابق صوبائی وزیر کا بھانجا بھی قتل ہو گیا۔ ان کے علاوہ بھی پانچ افراد الیکشن

کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کیا ان درجنوں لوگوں کو ”شہدائے جمہوریت“ قرار دیا جاسکتا ہے، کیا ان کا خون رنگ لائے گا اور اپنے ملک میں جمہوریت کا پودا تناور درخت بن سکے گا؟ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا مقتدر طبقہ جمہوریت کو اس کی روح کے مطابق پروان چڑھتا نہیں دیکھنا چاہتا، ورنہ شاید یہ پہلی حکومت ہے جس نے بلدیاتی الیکشن کروائے ہیں، وہ بھی عدالت کے زور پر، اور اختیارات کے بغیر۔

! پارلیمنٹ لاجز اور چرس

الزام تو بہت پرانا ہے، مگر اب اسے ایک معزز رکن پارلیمنٹ نے بھی دہرا دیا ہے، خاص بات یہ بھی ہے کہ محترمہ حکومتی پارٹی سے تعلق رکھتی ہیں، انہوں نے قائمہ کمیٹی کے اجلاس میں یہ 'انکشاف' کیا کہ پارلیمنٹ لاجز میں ملازمین سرعام چرس پیتے ہیں، کبھی جذباتی ہو کر معزز ارکان بھی اپنے کمروں میں منگوا لیتے ہیں، یوں رات دیر گئے تک کمروں میں ہلہ گلہ رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اسی قسم کا ایک الزام کچھ عرصہ قبل جنوبی پنجاب کے ایک ایم این اے جمشید دستی نے بھی لگایا تھا، جس پر کچھ لوگوں نے تردید، کچھ نے تائید کی تھی، اور کچھ خاموش ہی رہے تھے۔ تاہم وہ الزام چرس سے سنگین تھا، یعنی ام النجاشٹ شراب نوشی کی بات تھی۔ اس بالاتر ادارے کے تقدس کے پیش نظر معاملے کی تحقیق کی کہانی کا آغاز بھی کیا گیا تھا، مگر جب وال میں کالا ہو، اور ماحول بھی سازگار نہ ہو تو ایسی صفائیاں پیش کرنا بعض اوقات الٹا بھی پڑ جاتا ہے، لہذا اہل منول کی پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے معاملہ پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ اب یہ بات ایک خاتون نے کی ہے، دیکھیں اس پر کیا ایکشن ہوتا ہے، حکومت حرکت میں آکر اپنی ممبر پارلیمنٹ پر ناراض ہوتی ہے، یا تحقیق کی بات چلتی ہے، یا احتیاط کی کوشش شروع ہوتی ہے اور یا پھر مٹی ڈالنے کی پالیسی پر عمل

ہوتا ہے، غالب امکان یہی ہے کہ آخری آپشن پر عمل کیا جائے گا۔
 جب جمشید دستی نے معزز ارکان پارلیمنٹ پر شراب نوشی کا الزام لگایا تھا تو بعض ارکان
 بہت جذباتی ہو گئے تھے، انہوں نے کہا تھا کہ لازم ہمارا گھر ہے، یہاں ہمارے اہل خانہ
 بھی آتے ہیں، یہاں کا ماحول بہت ہی بہتر اور پسندیدہ ہے۔ عموماً شریف اور اچھے
 لوگوں کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ ان کے ساتھ قریب کے گھروں میں کس قماش کے
 لوگ رہائش پذیر ہیں، علم ہو بھی جائے تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ دیکھا جائے تو
 پارلیمنٹ لازم میں رہائش پذیر معزز ممبران معاشرے کا عکس ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام
 جس قسم کے ہونگے ان کا انتخاب بھی اسی قسم کا ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو ہمارے
 معاشرے کا ایک مجموعی تاثر یہ ہے کہ فلاں تو شریف آدمی ہے، تھانے کچھری کی سیاست
 نہیں کر سکتا، موقع بے موقع عوام کے ساتھ نہیں کھڑا ہو سکتا۔ کیونکہ عوام کو تو اپنے ہر
 قسم کے کام کے لئے نمائندوں کے پاس ہی جانا ہے، جو غلطی پر ہے وہ بھی سفارش کروانا
 چاہتا ہے اور جو حق پر ہے یہاں اس کو بھی سفارش ہی کروانی پڑتی ہے۔
 جہاں تک چرس کا معاملہ ہے، خیبر پختونخواہ میں اس کا چلن عام ہے، چند دوست مل کر
 بیٹھے ہوئے ہیں تو چرس کا سیگریٹ تیار ہو جائے گا، چرس کی ڈلی کو

ماچس کی آگ سے ذرا حدت دکھائی، نرم ہونے پر سگریٹ کے تمباکو میں یکس کیا، پھر سگریٹ میں بھرا، آگ دکھائی اور 'سُوتا' شروع۔ چرس پینے والے آپس میں کس قدر اخوت کا اہتمام کرتے ہیں کہ ایک ہی سگریٹ پورے دائرے میں گھومتی ہے، ایک ایک یا دو دو سُوتے لگانے کے بعد اگلے بھائی کے پاس۔ وہاں اسے کوئی جرم تصور نہیں کیا جاتا، پڑھے لکھے لوگ بھی 'سُوتا' لگاتے پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ٹرک ڈرائیور چرس کا عام استعمال کرتے ہیں۔ مگر چرس قانون کی گرفت میں آنے والا نشہ ہے، اس لئے چرس پینے والے اپنے کام سے قبل ادھر ادھر ضرور جھانک لیتے ہیں۔ مستقل چرس پینے والوں کے دماغ میں شاید کوئی خلل نہیں آتا، ایک ٹرک ڈرائیور کا کہنا ہے کہ جب ہم نے چرس پی ہوتی ہے، تو ہمیں سڑک پر تکا پڑا ہوا بھی شمتیر دکھائی دیتا ہے، یعنی ایسے میں ہم خود کو بہت تروتازہ اور ہشاش بشاش محسوس کرتے ہیں۔

رہا پارلیمنٹ لاجز کا اور وہاں کے رہائشی معزز ارکان کا، تو ان پر تبصرہ کرنے سے معزز ارکان کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے، وہ غلطیاں کرتے جائیں، ان پر طرح طرح کے الزامات لگتے جائیں، وہ بار بار نا اہل قرار پاتے جائیں، علاقے میں ان کے بارے میں بہت سی افواہیں گردش کر رہی ہوں، بہت سی کہانیوں کا تذکرہ ہوتا ہو، ان کے کاروبار اور رویوں پر اعتراضات ہوں، غیر اعلانیہ کرپشن اور زیادتیوں کے قصے ہوں، مگر جب عوام انہیں منتخب کر کے معزز ہونے کا

اعزاز بخش دیں تو بات ہاتھ سے نکل جاتی ہے، منتخب ہونے سے قبل بھلے وہ چرس پیتے
ہوں، یا اب بھی ایسا شوق فرما لیتے ہوں، مگر اب ان کا مقام بلند ہو چکا ہے، اب ان
کے بارے میں تبصرہ یا الزام خود تبصرہ کرنے اور الزام لگانے والے کے لئے نقصان دہ
ہے۔ اب یہی کہا جائے گا کہ معزز ارکان پارلیمنٹ ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس سے ان
پر کوئی انگلی اٹھائے۔

گدھے کی کھال

گدھوں کی کھال اتارے جانے کی خبریں ایک تسلسل سے آرہی تھیں، کبھی معلوم ہوا کہ کھال اتارتے ہوئے باپ پیٹا گرفتار، کبھی دو بھائی گرفتار اور کبھی کھال اتارنے والے فرار۔ اس خبر میں ایک حیرانی بھی پوشیدہ تھی، وہ یہ کہ گدھے کی کھال اتارنے والے یہ کاروبار کسی شاہراہ کے کنارے بیٹھ کر نہیں کر رہے ہونگے، وہ بھی جانتے ہیں کہ آجکل یہ کاروبار کچھ بدنام ہو گیا ہے، اور اس پر قانون بھی حرکت میں آ جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی بے وقوف بھی ایسی جگہ بیٹھ کر کھال نہیں اتارے گا، جہاں سے اسے گرفتاری کا ڈر ہو۔ یقیناً کوئی مخبری ہوتی ہے، جس کی بنا پر آئے روز باپ بیٹے گدھے کی کھال اتارتے پکڑے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گدھے کی کھال بہت مہنگی ہو گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے ذہین اور تیز لوگوں نے یہ کاروبار بنا لیا۔ گدھا ایسا جانور ہے جو اگرچہ بہت کام کا ہے، مگر بسا اوقات آوارہ گردی کرتا اور پکھرے کے ڈھیروں پر پکھرا شکاری کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”کھال اتار“ طبقہ اس بھولے بھالے جانور کو ورغلا کر لے جاتا ہے، اور مار کر اس کی کھال اتار لیتا ہے۔ اگرچہ بذاتِ خود یہ دھندہ بھی مکروہ اور قابلِ گرفت ہے، مگر یہاں ایک اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر کھال اتارے جانے والے گدھے کا گوشت کہاں ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔ جب کڑیوں سے

سکڑیاں ملتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی مکروہ گوشت فروخت بھی ہوتا ہے۔ جب فروخت ہونے کی بات چلی تو یہ راز کھلا کہ یہ گوشت عام چھوٹی موٹی دکانوں پر دستیاب نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے قصابوں کی دکانوں پر تو ذبح ہونے والے جانور کی کھال، اور سری پائے وغیرہ موجود رہتے ہیں، جس سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ یہ اسی جانور کا گوشت ہے، جس کی کھال اور سری پائے وغیرہ ہیں۔ اسی لئے ایسا گوشت عام دکانوں کی بجائے بڑے ہوٹلوں وغیرہ پر سپلائی ہوتا رہا، کیونکہ وہاں گوشت سپلائی کا ٹھیکہ ہوتا ہے۔ یہ کہانی تکلیف دہ اور مکروہ ہے کہ بڑے ہوٹلوں اور ریسٹوران پر ہمیشہ بڑے لوگ ہی جاتے ہیں، یوں یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کونسا بڑا آدمی کہاں کہاں جا کر گدھے کا گوشت کھا چکا ہے، اور اس پر اس گوشت نے کون کونسے اثرات مرتب کئے ہیں۔ آیا ان کی عادتوں میں ضدی پن کا اضافہ ہوا، وہ بات بات پر کسی بحث یا کسی اور کام میں ضد کر کے تو نہیں بیٹھ جاتے، یا وہ کسی کے ماتحت ہوں تو بہت ہی جھاڑیں وغیرہ کھانے کے بعد بھی کام نہیں کر رہے، یا اس وقت کام کرتے ہیں جب ڈانٹ ڈپٹ کی انتہا ہو جائے۔ یہ بھی جانچنے کی ضرورت ہے کہ آیا وہ دن کے مختلف اوقات میں زور زور سے چلتاے تو نہیں، یا چیخنے اور چلنے کا انداز تو نہیں اپناتے؟ یا کہیں اکیلے میں تنہائی پا کر گانے وغیرہ کی پریکٹس تو نہیں کرتے؟ یا یہ بھی کہ وہ گدھے کے گوشت کے زیر اثر

عادت سے مجبور ہو کر بیٹنگنے کی کوشش تو نہیں کرتے؟ یہ بھی خیال کرنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے اپنی کچھ سرگرمیاں کم یا ختم تو نہیں کر دیں اور اب محض سر جھکائے گھر کے کسی کونے میں پڑے تو نہیں رہتے؟ جب اہل خانہ نے کوئی کام کہا بس منہ سا بنا لیا، کام کو بوجھ تصور کر لیا۔ اور یہ بھی کہ جب کام کرنے پر آئے تو سارا دن کام کرتے رہے۔ یہ تجزیہ تو صاحب کو خود ہی کرنا پڑے گا، یا ان کے دوست احباب کو یا زیادہ سے زیادہ ان کے اہل خانہ کو۔

اگر بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھانے والے بڑے لوگوں میں مندرجہ بالا قسم کی تبدیلیاں یا ان میں سے کچھ اپنے اندر محسوس ہوں تو جان لیجئے کہ آپ نے جو گوشت مختلف ڈشوں کی صورت میں مزے لے لے کر کھایا تھا وہ اُسی بھولے جانور کا تھا جسے عرف عام میں گدھا کہتے ہیں اور آجکل جس کی شامت آئی ہوئی ہے، آجکل اس کے ساتھ وہ ہو رہا ہے، جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اس پر اینٹیں لادیئے یا مٹی، کتا ہیں لادیئے یا کچرا، وہ سب کچھ اٹھالے گا، مگر اپنی مرضی اور عادتوں کو تبدیل کبھی نہیں کرے گا۔ دراصل یہ ہمارا ہی کام ہے کہ گدھے کو نہ تو تہذیب سکھائیں اور نہ ہی اس کی عادتوں میں کچھ تبدیلی لائیں۔ یہ پورے معاشرے کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ مگر اب سوچنے اور پریشان ہونے کا کیا فائدہ؟ اب تو اپنے ملک میں گدھے ہی گئے چنے رہ گئے ہیں، اب یا تو کھالیں اتار کر انہیں تہہ خاک دفن کر دیا گیا، یا بڑے ہوٹلوں کو ان کے گوشت

کی سپلائی دے دی گئی۔ یہ اندازہ لگانے کی بھی ضرورت ہے کہ بیرونی ممالک گدھوں
کی کھال کو کس مصرف میں لاتے ہیں؟

! ٹاپ ٹین جاہل اقوام

میری نگاہ ایک کالمی خبر پر پڑی، سروے تو ہوتے رہتے ہیں، مگر یہ سروے ذرا مختلف قسم کا تھا اور قدرے دلچسپ بھی۔ جہالت میں ”ٹاپ ٹین“ ممالک (اقوام) کے نام لکھے ہوئے تھے۔ خبر سے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ جہالت کا معیار پر کھنے کے لئے کمپنی نے کون کونسے اشاریے دیئے تھے، ظاہر ہے جب کوئی سروے ہوتا ہے، یا کسی معاملے میں تحقیق ہوتی ہے، تو ایک سوالنامہ تیار کیا جاتا ہے، مختلف طبقہ ہائے فکر کی آرا لی جاتی ہیں، مختلف قسم کے معاشی حالات رکھنے والوں سے معلومات لی جاتی ہیں، جو ایک دوسرے سے تعلیم، رہن سہن اور رویوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ 33 ممالک کے 25 ہزار افراد سے معلومات اکٹھی کر کے یہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ادارے مختلف معاملات پر سروے کرتے رہتے ہیں، اور بنی نوع انسان کے رویوں سے پیدا ہونے والے نتائج کے بارے میں دنیا کو آگاہ کرتے رہتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ فلاں معاملے میں فلاں ملک سرفہرست ہے، یا اس کا کونسا نمبر ہے۔ زیرِ نظر خبر میں ان ملکوں کی فہرست دی گئی ہے جو سب سے زیادہ جاہل ہیں۔

بد قسمتی سے پاکستان کا نام ایسے ممالک کی فہرست میں بہت نمایاں ہوتا ہے، جو

بدامنی، کرپشن، ناخواندگی اور اسی قسم کے معاملات میں آگے ہوتے ہیں۔ مذکورہ خبر میں صرف دس ممالک کے نام تھے، اچھی خبر تو یہ ہوئی کہ ان دس ممالک میں پاکستان شامل نہیں۔ جہالت میں پوزیشن حاصل کرنے والے ممالک بالترتیب اس طرح ہیں، میکسیکو، بھارت، برازیل، پیرو، نیوزی لینڈ، کولمبیا، سیلھیئم، جنوبی افریقہ، ارجنٹائن اور اٹلی۔ ساتھ ہی خبر میں اس ملک کا نام بھی بتا دیا گیا ہے، جو جہالت کی متضاد فہرست میں پہلے نمبر پر ہے، وہ ہے جنوبی کوریا۔ ہمارا خیال تھا کہ مغربی ممالک بڑے مہذب کہلاتے ہیں، یقیناً انہی میں سے کوئی ملک پہلے نمبر پر ہوگا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگرچہ خبر سے ہمیں سروے کے معیارات اور اشارات نہیں مل سکے تاہم اپنے ہمسایہ ملک کی جہالت میں دوسری پوزیشن ہونے پر بھارت کے معاملات سے ہی اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کا معاملہ بھی اس سے ملتا جلتا ہی ہوگا۔ اگرچہ پاکستانیوں کے لئے یہ فہرست دو لحاظ سے بہت خوش کن ہے، اول یہ کہ اس میں پاکستان کا نام شامل نہیں، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس میں بھارت کا نام نمایاں جگہ پر موجود ہے، لیکن انسانیت کی بھلائی کو مد نظر رکھ کر سوچا جائے تو یہ خوشی نہیں پریشانی کی بات ہے، کیونکہ معاشرتی اور اقدار کا زوال بڑھتا جا رہا ہے۔

بھارت کے وزیراعظم کے معاملات پر نگاہ ڈالی جائے تو بات وہیں سے شروع

ہو جاتی ہے، بھارت میں تنگ نظری اور انتہا پسندی کا اگرچہ ہمیشہ زور اور عمل دخل رہتا ہے، مگر موجودہ دور حکومت میں تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا، وہاں نہ صرف مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے، بلکہ دوسری اقلیتوں پر بھی حملے ہو رہے ہیں، انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے کی بھی اجازت نہیں یا اس ضمن میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ جہالت میں چوری چکاری اور سینہ زوری کا بھی بہت عمل دخل ہے، شاید بھارت میں اس کے اثرات انہی کی فلموں کے ہوتے ہوں، کیونکہ بالی وڈ کی فلموں میں غنڈہ گردی سب سے پسندیدہ عمل ہے، اصلاحی فلمیں بھی بنتی ہیں مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ فلموں کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں پاکستان کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ بھارتی فلموں کی اکثریت خود بھی جہالت پر مبنی ہے اور اس کے نتیجے میں بھی جاہل قوم ہی پروان چڑھ رہی ہے۔ بھارت میں غربت بھی عام ہے، جس کی وجہ سے تعلیم کی بھی کمی کا سامنا ہے، یہ عمل بذاتِ خود جاہلانہ ہے، تاہم کچھ ان پڑھ لوگ بھی جاہل نہیں ہوتے، اور بعض اوقات پڑھے لکھے جاہل بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں، کیونکہ جہالت ایک رویے کا نام ہے۔ جاہلوں کی فہرست میں جن ممالک یا قوموں نے پوزیشنیں حاصل کی ہیں، ان میں بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہیں، عجیب بات ہے کہ وہ پڑھے لکھے

بھی ہیں اور ترقی یافتہ بھی مگر تعلیم اور ترقی نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا، جاہل ترقی کس طرح کر سکتے ہیں، یہ راز بھی نہیں کھلا۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ اقوام عالم کے ادارے دنیا سے دہشت گردی، غربت، بیماری اور اسی قسم کی مصیبتوں کو ختم کرنے کے دعوے کرتے ہیں، کچھ اقدامات بھی دکھائی دیتے ہیں، جہالت کو ختم کرنے اور تعلیم کو عام کرنے کے لئے بھی بہت سے بندوبست دیکھنے میں آتے ہیں، یہ نہ جانے کس قسم کی جہالت ہے، کیونکہ اگر شرح خواندگی کا حساب لگایا جائے تو بہت سے ملک اس فہرست والوں سے زیادہ ان پڑھ ہوں گے، گویا بہت سی قومیں ان پڑھ ہیں مگر جاہل نہیں۔ اگر سروے کرنے والے ادارے جہالت یا دیگر مسائل پر اعداد و شمار بتاتے ہیں تو یقیناً اس کے نتیجے میں متاثرہ ممالک کو اپنی خامیوں کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے، تاکہ دنیا سے جہالت کا بھی خاتمہ ہو اور امن بھی قائم ہو سکے۔

جناب اسحاق ڈار کے مسلسل بیانات کے بعد اب یہ بات یقین بن کر سامنے آرہی ہے کہ حکمران بادشاہت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہو چکے ہیں، جب سے انہوں نے قومی خزانے میں چالیس ارب روپے کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس وقت سے انہیں ہر روز کوئی نہ کوئی بیان جاری کرنا پڑتا ہے۔ اپوزیشن وغیرہ والوں نے اگر ایک دو بیانات دے کر اپنا فرض پورا کر ہی لیا ہے تو اس پر ڈار صاحب کو برداشت سے کام لینا چاہیے تھا، مگر وہ مخالف کو ہر صورت میں شکست دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کے بیانات مخالف کو لاجواب کر دینے والے ہوتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ”چالیس ارب روپے کے ٹیکس سے عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا“ تو اپوزیشن کو ہی برداشت کر لینا چاہیے، کیونکہ اگر پاکستان کے خزانے پر مامور ایک امین وزیر جو بیان دیتا ہے، وہ غلط بیانی تو کر نہیں سکتا، نہ ہی وہ جھوٹ بول سکتا ہے، کیونکہ اس کا منصب دروغ گوئی وغیرہ کی اجازت نہیں دیتا، نہ ہی اسے جھوٹ بولنے یا قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا مینڈیٹ ملا ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور ان کے قریبی رشتہ دار طاقتور وزیروں کی باتوں پر یقین کریں اور زیادہ بحث نہ کریں، وہ جو بھی فیصلہ کرتے ہیں، وہ ملک و قوم کے مفاد میں ہی ہوتا ہے۔

وزیر خزانہ چونکہ ہر روز بیان دیتے ہیں، اس لئے انہیں ہر روز نیا تحفیل تلاش کرنا پڑتا ہے، نئے الفاظ اور نیا ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے اسمبلی میں پالیسی بیان جاری کر دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ”... ہم نے جو فیصلہ بھی کیا ہے یہ آئین اور قانون کی روشنی میں کیا ہے، اس لئے اسے اقدام کو ’منی بجٹ‘ کا نام دینا زیادتی ہے، اس کا عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ ہم نے ایمپورٹڈ چیزوں پر ٹیکس لگایا ہے، ہم نے کتے اور بلیوں کی خوراک پر ٹیکس لگایا ہے، پالتو جانوروں کے ساتھ تصاویر بنانے والے ٹیکس بھی دیں...“۔ اس سے قبل بھی انہوں نے قوم کو بتایا تھا کہ یہ ٹیکس ”آپریشن ضرب عضب“ پر خرچ کیا جائے گا۔ پھر ان کا بیان آیا کہ یہ صوبوں کو حصہ تھا، اگر یہ ٹیکس نہ لگایا جاتا تو صوبے بہت سے فنڈز سے محروم ہو جاتے۔ حتیٰ کہ وزیر صاحب یہ باریک نکتہ بھی قوم کو سمجھا چکے ہیں کہ مہنگائی نہیں ہوئی، کیونکہ اس ٹیکس کا عام آدمی پر فرق نہیں پڑا، ان کا کہنا ہے کہ اگر بچے دکان سے چیز لینے جاتے ہیں اور واپسی پر بقایا والدین کو نہیں دیتے تو وہ سمجھتے ہیں چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں۔ اس قدر تفصیل اور وضاحت سے چالیس ارب روپے کی صفائی پیش کر دی گئی ہے، کہ قوم کے بچے بچے کو اس پر اطمینان ہے۔

ہم وزیر موصوف کے ایک ایک حرف کی تائید کرتے ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی

عام آدمی“ احتجاج نہیں کر رہا، صرف خواص ہی اپنی سیاسی دکان چکانے کے لئے بیان ”
 باری کا سہارا لے رہے ہیں۔ حکومت بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ عام آدمی کو
 اس چالیس ارب روپے سے کوئی دلچسپی نہیں، عام آدمی کو معلوم ہے کہ حکمرانوں نے
 بھی آخر زندگی کے دن پورے کرنے ہیں، انہیں خوراک اور رہائش کی ضرورت ہے،
 انہوں نے ملک کے اندرونی اور بیرونی دورے کرنے ہوتے ہیں، ان کے پروٹوکول کا
 مسئلہ ہے، ان کی سکیورٹی کے مسائل ہیں، ایسے قیمتی لوگوں کی حفاظت پر تو ہم اپنا تن من
 دھن بھی قربان کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی عام آدمی نے حکومت کی بھرپور تائید کر کے
 ثابت کر دیا ہے، کہ وہ دل و جان سے ان کے ساتھ ہیں۔ عوام نے بلدیاتی انتخابات
 میں اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ مزاجاً تو حکمرانوں کو ایک عرصہ سے ہی
 بادشاہ قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ ان کے مزاج شروع سے ہی شاہانہ ہیں، ان کی عادتیں
 بادشاہوں والی ہی تھیں، جو ان کے آگے سے گزر جائے اسے ہیرے جواہرات سے
 نواز دیتے ہیں اور جو پیچھے رہ جائے، وہ پیچھے ہی رہ جاتا ہے۔ مگر بلدیاتی الیکشن نے ان کو
 بادشاہ بننے کی بھی چھوٹ دے دی ہے۔ اس سے قبل ضمنی الیکشنز میں حکومتی پارٹی کی
 کامیابی اور اب بلدیاتی الیکشن میں سویپ سے شہ پا کر وہ مزید بادشاہ بن گئے ہیں۔ یہ
 وہی وقت ہے جب ظالم حکمرانوں کے لئے فرانس کی تاریخ سے یہ جملہ سنایا جاتا ہے کہ
 اگر بھوک لگی ہے تو کیا ہوا، کیک کھائیں۔ حکمران معاشی لحاظ سے جس مقام پر ہیں، وہ
 ، غربت کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے ، وہ بھوک ، افلاس

بیماری اور غربت کے تصور سے ہی نا آشنا ہیں، مہنگائی کا بھی انہیں کوئی اور اکٹ نہیں، یہی

وجہ ہے کہ اب حکمران طرز پر اتر آئے ہیں، اور یہ زوال کا آغاز ہے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان اصولی طور پر اگلے الیکشن تک فارغ ہی ہے، کوئی ضمنی الیکشن پڑ گیا تو کہا نہیں جاسکتا، تاہم یہ معاملہ بہت ہی جزوی نوعیت کا ہے۔ بلدیاتی الیکشن سے فراغت کے بعد چیف الیکشن کمشنر سردار رضا خان نے کہا ہے کہ اب ہمارا اگلا ہدف ۷ کے قومی انتخابات ہیں، انہوں نے حالیہ بلدیاتی الیکشن پر اطمینان کا اظہار 2018 کرتے ہوئے عملے کو بہترین خدمات اور کارکردگی پر مبارکباد دی، انہوں نے کہا کہ بلدیاتی الیکشن سے ہمیں اپنے معاملات کو مزید بہتر کرنے کا موقع مل جائے گا۔ انہوں نے افسران اور پولنگ کے عملہ کے لئے اعزاز یہ کا بھی اعلان کیا۔ پورے ملک میں الیکشن کروانا واقعی بہت محنت اور تجربے کا کام ہے، جس میں ووٹرز کی تعداد، ان کا اندراج، پولنگ کا سامان، ووٹرز لسٹیں، عملہ کی تعیناتی سمیت بے شمار انتظامی امور کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر یہ کام ہونے کی وجہ سے بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں، جنہیں یقیناً تجربات سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ قومی انتخابات کے انعقاد کے موقع پر پاکستان کی سیاسی قیادت ملک بھر سے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرنے میں ناکام ہو گئی تھی، جس کے کاندھے پر

الیکشن کمیشن کا بوجھ ڈالا جاسکے، بہت سے لوگوں کے نام لئے گئے، مگر انہوں نے خود ہی یہ ذمہ داری نبھانے سے انکار کر دیا۔ آخر مشکلوں سے جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم پر اتفاق کر لیا گیا، تاہم جب الیکشن ہو گئے تو ہارنے والی تمام جماعتوں نے دھاندلی کے الزامات دہرانے شروع کر دیئے، جن میں پاکستان تحریک انصاف سرفہرست تھی، احتجاج کے طور پر دھرنے بھی ہوئے، عدالتوں کے دروازوں پر دستک بھی ہوئی، مگر کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ الیکشن کمیشن کے موجودہ چیف کے بارے میں کسی کو زیادہ اعتراضات نہیں تھے، کچھ ضمنی الیکشن بھی انہی کی قیادت میں ہوئے اور بلدیاتی الیکشن بھی انہوں نے ہی کروائے۔ اگرچہ حکومت اور الیکشن کمیشن نے حالیہ بلدیاتی الیکشن کو شفاف قرار دیا ہے، تاہم ناقدین اور مخالفین نے پھر بھی اعتراضات کر ہی دیئے ہیں۔

اگلا ہدف موجودہ الیکشن کمیشن کا یقینا اگلے قومی الیکشن ہی ہونا چاہیے، مگر ماضی سے کافی کچھ سیکھنے کی ضرورت بھی بہت ہے۔ گزشتہ قومی انتخابات سے قبل الیکشن کمیشن نے نادرا کے تعاون سے لاکھوں ووٹرز کو اٹھا کر ان کے آبائی علاقوں میں پہنچا دیا تھا، یعنی جن لوگوں کے شناختی کارڈ پر عارضی پتہ درج تھا، انہیں مستقل ٹھکانے لگا دیا گیا۔ حالانکہ ایک بہت بڑی اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے، جو کاروبار یا ملازمت کے سلسلہ میں مستقل پتہ کو چھوڑ کر عارضی دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں اور زندگی بھر عارضی ٹھکانوں پر ہی

گزار دیتے ہیں۔ مگر الیکشن کمیشن نے انہیں آبائی علاقوں میں ووٹ دینے پر مجبور کیا، نتیجہ یہی نکلا کہ وہ لوگ اپنے دور دراز کے آبائی علاقہ نہ گئے اور اپنے حق رائے دہی سے محروم رہ گئے۔ الیکشن کمیشن نے اگرچہ ووٹ درج کروانے کے لئے بہت سے اشتہارات وغیرہ بھی دیئے، مگر پھر بھی جن کے ووٹ پہلے درج تھے وہ جگہ تبدیل ہو جانے کی وجہ سے ووٹ نہ ڈال سکے۔ اب حکومت کا فرض ہے کہ وہ نئے الیکشن سے قبل ایک مرتبہ مردم شماری بھی کروالے، تاکہ آنے والے الیکشن میں نہ مُردے ووٹ ڈالیں اور نہ زندہ اس سے محروم رہیں۔

اگلے ہدف سے قبل الیکشن کمیشن اپنے احکامات پر عمل درآمد کروانے کی منصوبہ بندی بھی مکمل کر لے، کیونکہ ہر الیکشن میں کمیشن کی جانب سے ضابطہ اخلاق جاری کیا جاتا ہے، مگر اس کی دھجیاں سب سے پہلے حکومت، پھر اس کے وزراء اور ممبران اسمبلی اور آخر میں امیدوار اور ان کے نمائندے اڑاتے ہیں۔ اخراجات کا اندازہ ہی لگایا جائے تو کمیشن کی مقرر کردہ حدود سے معاملہ بہت آگے چلا جاتا ہے، لاہور کے حلقہ 122 میں کون نہیں جانتا کہ اربوں روپے خرچ ہوئے، اور الیکشن کمیشن والے امیدواروں کے اس جواب سے مطمئن ہو گئے کہ یہ خرچہ ہم نے خود نہیں کیا، ہمارے چاہنے والے یعنی سپورٹرز نے کیا ہے۔ گویا سپورٹرز چاہے جتنا بھی خرچ کر لیں، ان پر کوئی ضابطہ اخلاق لاگو نہیں ہوتا۔ اسی طرح الیکشن والے حلقے میں ترقیاتی کام ہونا، فنڈز کا اعلان ہونا، یا وزراء کا

ووٹرز پر اثر انداز ہونا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، جس پر کمیشن کو سختی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی باتیں جب میڈیا پر اٹھائی جاتی ہیں تو بعض وزراء وغیرہ مغلظات کا آزادانہ استعمال بھی کرتے ہیں، اکثر اوقات ان کی توپوں کا رخ الیکشن کمیشن کی طرف ہی ہوتا ہے۔ رہی بات اعزازِ یے کی، واقعی محنت تو بہتر ہے، مگر یہ کلچر غیر مناسب ہے، کیونکہ وہ لوگ اپنی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں، اور تنخواہ لیتے ہیں۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ اگر الیکشن کا تسلسل جاری رہے تو عوام میں بھی آگاہی کی سطح بہتر ہوگی اور انتخابی عمل بھی بہتر طریقے سے انجام پذیر ہوگا۔

! ممبران اسمبلی کی غیر ذمہ داری

قومی اسمبلی قانون ساز ادارہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں تشریف لانے والے ممبران معزز کھلاتے ہیں اور ان کا استحقاق قائم ہو جاتا ہے، کیوں نہ ہو کہ ایک تو یہ اپنے عوام کے لئے قانون بناتے ہیں، ان کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ لاکھوں لوگوں کے مینڈیٹ سے یہ لوگ اونچے ایوانوں میں پہنچنے کے قابل ہوتے ہیں، گویا ان کے پیچھے پاکستان کے عوام کی اکثریت موجود ہوتی ہے۔ انہی خوبیوں اور اہمیت کی بنا پر ان لوگوں پر قومی خزانے سے کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں، ان کو مراعات دی جاتی ہیں، آنے جانے کا خرچ ملتا ہے، اسلام آباد میں رہنے کے لئے محفوظ رہائش گاہیں ہیں، جو کہ بعض اوقات الزامات کی زد میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ وی آئی پی قرار پاتے ہیں، ان کے حلقوں کے لئے انہیں کے سہارے دفاتر میں جا کر اپنے کام وغیرہ نکلواتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں

مہذب ہیں، بااخلاق ہیں اور باکردار بھی، آئین ان پر طرح طرح کی پابندیاں بھی لگاتا ہے، آئین میں ایسی دفعات بھی موجود ہیں جو کسی بھی منتخب ہونے والے افراد کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق مرتب کرتی ہیں، ان معززین کا صادق اور امین ہونا ایک لازمی شرط ہے، ان کا دیانتدار ہونا بھی ضروری ہے، غیر اخلاقی مقدمات میں ملوث بھی نہ رہا ہو۔ گویا قانونی طور پر معاشرے کے بہتر لوگ ہی اسمبلیوں کے ایوانوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

مگر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ ویسے ہیں نہیں، جیسا انہیں ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ یار لوگ ان پر تنقید کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اندر سے بھی ان پر تنقید ہوتی رہتی ہے۔ انہیں خرابیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوگ بہت سی خوبیوں کے حامل ہونے کے باوجود غیر سنجیدگی جیسے مرض میں مبتلا ہیں، جو انسان کسی کام کی تنخواہ لیتا ہے، جس بنا پر اسے مراعات مل رہی ہیں، اس کام میں بھی وہ ڈنڈی مارے، یا فرائض میں کوتاہی برتے، یا اپنے آپ کو ایک ذمہ دار شہری ثابت نہ کر سکے تو پھر قوم یا میڈیا یا کسی اور کے اعتراضات پر تیخ پا ہونے کی گنجائش نہیں رہتی، نہ ہی استحقاق کو اتنی جلدی مجروح ہونا چاہیے، اگر انا ہے، اور عزت کا اس قدر خیال ہے تو پھر ذمہ داری کا خیال رکھنا بھی ان کا فرض ہے، جب انسان اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے تو اس پر

انگلی اٹھانا آسان نہیں ہوتا، ایسے میں اگر کوئی ایک فرد انگلی اٹھائے گا تو اس کا دفاع کرنے والے بھی بہت سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ قومی اسمبلی کے حالیہ اجلاس کو ہی لے لیجئے، کونسا دن ہے جس روز کورم کے ٹوٹنے کی صدائیں ایوان سے باہر تک سنائی نہیں دیتیں؟ یہ کورم بھی عجیب چیز ہے، یہ اس وقت تک نہیں ٹوٹتا، جب تک کوئی اس کی نشاندہی نہ کرے۔ گویا کوئی غلط کام ہو رہا ہے تو مل کر خیانت کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے، اگر کوئی دشمن نشاندہی کر دے تو گنتی وغیرہ ہوتی ہے اور کورم پورا کرنے کی کوشش میں گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں، سکول کے زمانے میں گھنٹی کی دہشت ہوتی تھی، یہ معززین اس موقع پر بھی گھنٹی پر ہی ایوان میں آتے ہیں۔ کورم پورا نہ ہونے پر اجلاس کا جاری رہنا بھی دیانت داری کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔

بد قسمتی سے اپنے حکمران بھی ایوان کو قید خانہ ہی تصور کرتے ہیں، قوم کو شاید یاد ہوگا کہ گزشتہ برس اسلام آباد میں دھرنوں کے دوران پاکستان کے تیسری مرتبہ بننے والے وزیراعظم میاں نواز شریف سال بھر میں پہلی مرتبہ ایوانِ بالا تشریف لے گئے تھے، گویا مشکل پڑی تو انہوں نے ایوان کا رخ کیا، پھر دونوں ایوانوں کا طویل مشترکہ اجلاس کیا اور ہر روز اس میں حاضر ہوئے، حتیٰ کہ ارکان اسمبلی سے مصافحہ وغیرہ بھی شروع کر دیا تھا اور اپنے دفتر میں بھی ممبران اسمبلی کو بلانا شروع کر دیا تھا، مگر کیا کیجئے کہ جو نہیں

حالات سازگار ہوتے ہیں، ایوان کا راستہ یاد نہیں رہتا۔ گزشتہ روز قومی اسمبلی کے قائد حزب اختلاف خورشید شاہ کو جب صدر کے خطاب پر بحث اوپن کرنے کے لئے فلور دیا گیا تو انہوں نے وزیراعظم کی غیر موجودگی میں خطاب سے انکار کر دیا، کہ ایوان خالی پڑا ہے، میں کس کو اپنی باتیں بتاؤں؟ وہ یہ کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے کہ جب تک وزیراعظم ایوان میں نہیں آتے تب تک میں بحث اوپن نہیں کروں گا۔ قوم اپنے نمائندوں سے کبھی نہیں پوچھتی، جناب آپ کہاں ہوتے ہیں، آپ نے ہمارے علاقے کے کون سے مسائل اجاگر کروائے ہیں، آپ نے قانون سازی میں کہاں تک حصہ لیا ہے؟ معزز ممبران سے پوچھنے والا کوئی نہیں، کیونکہ اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔

! اسلامیہ یونیورسٹی ہماری بھی ہے

کہنے کو تو میڈیا ایک آئینے کا کردار ادا کرتا ہے کہ معاشرے یا اداروں میں جو کچھ ہوتا ہے، میڈیا اسی کا عکس قوم کو دکھاتا ہے، مگر آئینے میں چونکہ ہر انسان کو اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے، لہذا بہت سے لوگ برا بھی مان جاتے ہیں۔ جو ادارے اپنی کارکردگی دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں وہ میڈیا سے آنکھیں چراتے یا نظر بچاتے رہتے ہیں، ایسا ہی ایک ادارہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور ہے، ایک برس سے زیادہ ہو چکا ہے کہ یہاں نئے وائس چانسلر صاحب تشریف لائے ہیں، ان سے قبل دو نے چند ماہ تک عبوری دور بھی گزارا، ایک ریٹائر ہو کر گھر سدھارے تو دوسرے کو ان کے ڈیپارٹمنٹ میں مزید خدمات کے لئے واپس بھیج دیا گیا، اسلام آباد سے ڈاکٹر قیصر مشتاق کا انتخاب عمل میں آیا اور وہ مادر علمی کے نئے سربراہ کے طور پر تشریف لائے۔ آتے ہی نہ جانے کن لوگوں نے ان کے کانوں میں ایسا سیمہ انڈھیلا کہ انہیں باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، انہوں نے یونیورسٹی کو میڈیا کے لئے شجر ممنوعہ قرار دے دیا۔ اگر میڈیا کے کسی فرد نے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل سابق وائس چانسلر ڈاکٹر مختار نے یونیورسٹی کو تعلیمی کے ساتھ ساتھ ایک عوامی اور سماجی ادارہ بھی بنا دیا تھا، یونیورسٹی میں نہ صرف یہ

کہ مختلف موضوعات پر بین الاقوامی کانفرنسز منعقد ہوئیں، بلکہ ملک کے اندر سے بھی علم و ادب اور سماجی خدمت کے بڑے بڑے نام یہاں مدعو کئے گئے، ان عالیشان تقریبات میں شہریوں کو بھی دعوت عام ہوتی تھی، ہر کوئی اپنی دلچسپی کے مطابق یونیورسٹی کے خوبصورت اور بڑے آڈیٹوریم میں جا کر طلباء و طالبات کے ساتھ بیٹھ کر اہم شخصیات کی باتیں سن سکتا تھا اور انہیں قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے ان تقریبات کی میڈیا کوریج بھی ہوتی تھی اور لوگوں کو یونیورسٹی کی روز و شب کی مصروفیات کا علم ہوتا تھا۔ یہی نہیں تعلیمی لحاظ سے یونیورسٹی کی رینکنگ میں بھی بہتری آئی۔ نئے وائس چانسلر صاحب نے آتے ہی یہ تمام سلسلے بند کروا دیئے۔ میڈیا کا یونیورسٹی میں داخلہ بند ہو گیا، سماجی تقریبات قصہ پارینہ ہوئیں، شخصیات کی آمد ماضی کا حصہ بن گئی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یونیورسٹی ملک و قوم اور اپنے شہر کے لئے تھنک ٹینک کا کردار ادا کرتی، اپنے ڈیپارٹمنٹس کے حوالے سے مختلف شعبہ جات کو معاونت فراہم کی جاتی، ان کے تجربہ کار لوگوں کو یونیورسٹی بلا کر طلباء و طالبات کو ان کے تجربات اور مشاہدات سے آگاہی دی جاتی، مگر صاحب نے ایسی کوئی منصوبہ بندی نہ کی، ہر اہم موقع پر میڈیا اور دوسروں کو ان کی اور ان کے بچوں کی مادر علمی سے دور رکھنے کے ہر بندوبست کی حوصلہ افزائی کی۔ گزشتہ دور میں جب یونیورسٹی کا کانووکیشن ہوا تھا تو تب کے وزیراعظم پاکستان سید یوسف رضا

گیلانی مہمان خصوصی تھے، اور بہاولپور کا میڈیا آزادی، احترام اور اہتمام سے اس تقریب میں موجود تھا۔ اب کانو کیشن ہوا ہے، جس کے مہمان خصوصی یونیورسٹی کے چانسلر گورنر پنجاب رفیق رجوانہ تھے، مگر بہاول پور کا کوئی بھی صحافی اپنے شہر کی یونیورسٹی کی تقریب میں مدعو نہ تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کا ایک طرف یہ کہنا ہے کہ ہم نے پنجاب حکومت کے احکامات کی روشنی میں غیر سرکاری میڈیا کے لوگوں کو مدعو نہیں کیا، دوسری طرف اسلام آباد، لاہور اور ملتان کے صحافیوں کو بھی دعوت نامے بھیجے، یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے دو ایک نے ہی تقریب میں شرکت کا تکلف کیا۔ تیسرا رخ یہ کہ یونیورسٹی نے کانو کیشن کے موقع پر شہر سے ہی کئی پرائیویٹ اداروں کے عہدیداروں کو بھی مدعو کیا تھا، سوائے ایک ادارے کے، جسے پریس کلب کہتے ہیں۔

مقامی صحافیوں کو نظر انداز کرنے کا کلچر عام ہے، یہاں وزیراعظم آئیں، یا صدر یا پھر وزیر اعلیٰ، مقامی صحافیوں کو ان حضرات سے دور ہی رکھا جاتا ہے، کچھ عرصہ قبل قائداعظم سول پارک کے افتتاح کے موقع پر قومی کے ساتھ ساتھ اسلام آباد اور لاہور سے چالیس کے قریب صحافیوں کو خصوصی طیارے کے ذریعے بہاول پور لایا گیا تھا، مگر مقامی صحافیوں پر دروازے بند ہی رکھے گئے، شاید یہ صحرائنشین تہذیب کے آداب سے آگاہ نہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب کو اگر کسی بات پر صحافیوں سے خاص نفرت اور مخالفت کا معاملہ

ہے تو انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ اس کا زیادہ نقصان یونیورسٹی کو ہی ہوگا، یہ میڈیا ہی ہے جس کے ذریعے دنیا بھر میں یونیورسٹی کا نام روشن ہے، آپ اگر مردم بیزار انسان ہیں تو ادارے کو تو میڈیا سے دور رکھ کر تاریکٹ غاروں میں نہ دھکیلیں، یونیورسٹی کو دنیا سے کاٹ کر نہ رکھیں، آپ کا فریضہ تو دوسری کی رہنمائی کرنا ہے، نہ کہ دوسروں سے مخاصمت رکھنا اور ان کے راستے روکنا۔

چند روز قبل دواضلاع کے درمیانی سڑک پر پولیس ہی پولیس تھی، اگرچہ یہ فاصلہ صرف سولہ کلومیٹر پر مشتمل تھا، تاہم پولیس نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مسافر ایکٹ دوسرے سے استفسار کر رہے تھے اور کوئی اپنی تسلی کے لئے پولیس والوں سے معلومات لے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بھی دسیوں گاڑیوں پر مشتمل ایکٹ قافلہ گزرا، جس میں بڑی اور لگژری گاڑیوں کے علاوہ پولیس کی گاڑیوں کے جھرمٹ میں ایک گاڑی تھی، جس کے دونوں طرف پولیس کے بڑے بڑے موٹر سائیکل تھے، سائرن کی آواز ماحول کو مزید متاثر کن اور جذباتی بنا رہی تھی۔ یہ قافلہ گزر گیا، معلوم ہوا کہ مرکزی گاڑی میں تخت لاہور سے آیا ہوا، شہزادہ حمزہ تھا۔ بادشاہت کے دور میں گھر کے ہر فرد کی اہمیت ہوتی ہے، اسے وہی پروٹوکول دیا جاتا ہے جو بادشاہوں کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اس سے قبل قومی الیکشن کے موقع پر بھی یہ شہزادہ یہاں آچکا ہے، شہر بھر میں جہازی سائز کے پینا فیلکس لگائے گئے تھے، شہر سے باہر سٹیڈیم میں پروگرام تھا، پروٹوکول تھا، سائرن کی گونج تھی، اور نعرے اور دعوے تھے۔ اب بھی یہ شہزادہ لودھراں کے قومی اسمبلی کے ضمنی الیکشن کی مہم کو گرمانے کے لئے لاہور سے خاص طور پر آیا تھا، اور خاص ہی طریقے سے آیا تھا۔

ضلع لودھراں میں قومی اسمبلی کے کل دو حلقے ہیں، ان میں سے ایک پر ضمنی الیکشن ہو رہے ہیں، یہاں سے قومی الیکشن میں منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے ممبر کو نااہلی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا، یہ حلقہ ان چار معروف حلقوں میں سے ہے جنہیں تحریک انصاف نے کھولنے کے لئے کہا تھا اور بعد ازاں دھرنا بھی دیا تھا، کیونکہ یہاں سے جہانگیر ترین امیدوار تھے (اب بھی ہیں)۔ مذکورہ امیدوار کی نااہلیوں کی داستان طویل ہے، دھاندلی کا الزام بھی تھا اور تعلیمی اسناد کے جعلی ہونے کی کہانی بھی تھی، صدیق بلوچ نااہل ہوتے گئے اور اعلیٰ عدالتوں سے بحال ہوتے رہے۔ ان کی اسناد یقیناً اصلی ہیں، کیونکہ وہ پورے بندوبست کے ساتھ بنوائی گئی ہیں، مگر تعلیم کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے، کیونکہ وہ انہوں نے حاصل نہیں کی۔ قومی الیکشن انہوں نے ضلعی سطح پر بننے والے ’شہید کالج گروپ‘ کے پلیٹ فارم سے لڑا اور جیتا تھا، بعد میں وہ ن لیگ کے ساتھ مل گئے تھے، 23 دسمبر کو ہونے والے الیکشن میں وہ ن لیگ کے ہی امیدوار ہیں۔ حمزہ شہباز بھی انہی کی حمایت کے لئے لودھراں آئے ہوئے ہیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ حمزہ شہباز کو الیکشن کمیشن نے نوٹس جاری کر دیا ہے، کہ وہ الیکشن کمیشن کے مرتب کردہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کر

رہے ہیں، سات یوم میں اس بارے وضاحت کریں۔ الیکشن کمیشن کا ضابطہ اخلاق اگر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کو بھی انتخابی مہم سے روکتا ہے، تو پھر لاہور کے حلقہ 122 کی توپوری مہم میں حمزہ شہباز پیش پیش تھے، اگر یہ پابندی وزراء پر بھی ہے تو لاہور میں تو وفاقی وزراء نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ سنا تو یہی جانتا تھا کہ وزیراعظم، وزیراعلیٰ وغیرہ پر انتخابی مہم کی پابندی ہے۔ بلدیاتی الیکشن میں بھی اس پابندی کا لحاظ کسی نے نہیں کیا، ممبران اسمبلی سے لے کر وزراء تک سب نے یہ مہم چلائی اور اپنے حمایت یافتہ امیدواروں کی کھل کر حمایت کی۔ وزراء کی جانب سے فنڈز تک بھی جاری ہوتے رہے، ترقیاتی کاموں کے وعدے بھی ہوئے۔ مخالفین نے الیکشن کمیشن کو درخواستیں بھی دیں، مگر 'نوٹس' اور 'وراننگ' کے سوا کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔

اپنے ضابطہ اخلاق کے بارے میں تو الیکشن کمیشن ہی بہتر جان سکتا ہے، مگر سرکاری پروٹوکول کے ساتھ کسی ایم این اے کا الیکشن مہم چلانا کیا ثابت کرتا ہے؟ کیا قومی اسمبلی کے ایک ممبر کو اس قدر استحقاق ہے کہ اس کے تمام راستوں پر پولیس تعینات کر دی جائے، اس کی موومنٹ کے ساتھ پوری ضلعی مشینری بھی حرکت میں آجائے، کیا اس طرح حکومت ووٹرز پر اثر انداز نہیں ہو رہی؟ سیاسی جلسوں میں چونکہ مقررین کا سب سے زیادہ زور مخالف کو لتاڑنا ہوتا ہے، حمزہ شہباز نے کاغذ لہرا کر بتایا کہ جہانگیر ترین نے کروڑوں کے قرضے معاف

کروائے ہیں۔ دوسری طرف جہانگیر ترین نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ میرے بارے میں جھوٹ بولا جا رہا ہے، میں نے قرضے معاف نہیں کروائے، میں سب سے زیادہ ٹیکس دینے والا ممبر اسمبلی تھا۔ بہر حال جھوٹ سچ اپنی جگہ، پاکستانی سیاست اور جمہوریت اپنی جگہ۔ اور یہ بھی سچ ہی ہے کہ ضروری نہیں کہ الیکشن میں کامیاب ہونے والا ہر فرد ہی سچا اور اچھا ہوتا ہے، اس کے مخالف غلط اور بُرے ہوتے ہیں۔ معاملہ چونکہ عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ جس ماحول کے زیر اثر ہوتے ہیں، ویسا ہی نتیجہ سامنے آتا ہے، تاہم اب شعور بہتر ہو رہا ہے۔

سردار ایاز صادق کے بارے میں ایک تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ وہ بہت متوازن اور اعتدال پسند شخصیت کے مالک ہیں، ان کے اقدامات اور خیالات سے ان کی عادات وغیرہ کے بارے میں ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے۔ این اے 122 لاہور میں ہونے والے الیکشن میں بھی اپنے پرانے سب اس بات کے معترف تھے کہ شخصیت کے اعتبار سے سردار صاحب کی پوزیشن بہتر ہے، کہ وہ مسلسل کامیاب بھی ہوتے رہے ہیں اور ان کا رویہ بھی بہت اچھا ہے، ان پر کرپشن وغیرہ کو کوئی الزام بھی عائد نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ سپیکر بننے کے بعد وہ اپنے حلقے کے عوام کو مناسب وقت نہ دے سکے ہوں۔ بحیثیت سپیکر قومی اسمبلی بھی ان کے کردار پر کسی نے زیادہ اعتراض یا پریشانی وغیرہ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ سپیکر قومی اسمبلی کا نگران اور سرپرست ہوتا ہے، اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ خود خواہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، تمام ممبران کے ساتھ برابر کا سلوک کرے، کسی کو شکایت کا موقع نہ دے، کسی کو جانبداری کے الزام کی بات کرنے کی نوبت نہ آئے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایاز صادق نے دو سال تک ایک اچھے سپیکر کی طرح اسمبلی کو چلایا، اپنوں پر ایوں کو اپنے ہی جانا۔ یوں بہت سی نیک نامی ان کے حصے میں آئی۔

سپیکر ایاز صادق کے حلقے کے بارے میں تحریک انصاف کو تحفظات تھے کہ یہاں دھاندلی ہوئی، دلچسپ بات یہ ہے کہ جن چار حلقوں میں پی ٹی آئی کے اہم لوگ ناکام ہوئے تھے، پارٹی نے انہی حلقوں کے کھولنے کی بات کی تھی، ان میں ایک حلقہ یہ بھی تھا، اسلام آباد کے تاریخی دھرنے کے بعد عدالت نے اس حلقے میں الیکشن کروانے کا حکم دیا تھا، اگرچہ ایک عام خیال پایا جاتا تھا کہ یہاں سے سردار ایاز ہی کامیاب ہونگے، مگر حلقے نے میڈیا میں بہت ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، نتیجے سے ثابت ہوا کہ مقابلہ واقعی بہت سخت تھا، اور حکومتی پارٹی بڑی مشکلوں سے رن آؤٹ ہوتے ہوتے ہچی، اس میں میٹسمن اوئدھے منہ گر بھی گیا، مگر اس کا بلٹا لائن کوچ کر گیا تھا۔ مگر اس الیکشن کا نقصان یہ ہوا کہ سردار ایاز صادق کا موڈ پہلے والا نہ رہا، ان کے مزاج میں جہاں کچھ غرور در آیا، وہاں غصے کے آثار بھی نمایاں دکھائی دینے لگے، انہوں نے اپنے اعتدال پسند رویے میں تبدیلیاں کر لیں، یا یوں کہیے کہ تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اب وہ قومی اسمبلی میں سب سے اونچی سیٹ پر بیٹھ کر لوگوں سے ناراض بھی ہوتے ہیں، انہیں جھڑ بھی پلاتے ہیں، اور وہ سطحی تبصرے بھی کر جاتے ہیں، جو ان کے منصب کے معیار کے مطابق نہیں ہوتے۔ اب وہ قدرے غصے میں رہنے لگے ہیں۔

گزشتہ دنوں انہوں نے اپنا غصہ الیکشن کمیشن پر بھی نکالا، انہوں نے بتایا کہ الیکشن کمیشن سادگی کی عام زبان نہیں سمجھتا، بلکہ اسے سختی کی زبان سے سمجھ آتی ہے۔ الیکشن کمیشن کی بد قسمتی ملاحظہ فرمائی جائے، کہ یہ پی ٹی آئی کے چیئرمین کے بھی زیر عتاب ہے، پچھلی دفعہ کوئی صاحب الیکشن کمیشن کا چیئرمین بننے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہا تھا، اس کی وجہ یہ تھی سب کو معلوم تھا کہ عمران خان دھاندلی دھاندلی کا ایسا شور مچائیں گے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی۔ کیونکہ اس سے قبل عمران خان نے الیکشن کمیشن کے تمام اہم عہدیداران کے مستعفی ہونے کا مسلسل مطالبہ کیا تھا۔ صرف عمران خان ہی نہیں بلکہ اکا دکا دیگر جماعتوں نے بھی دھاندلی کی شکایت کرتے ہوئے الیکشن کمیشن کے فارغ کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ بہر حال موجودہ الیکشن کمیشن پر مسلسل دباؤ تھا، مگر دھاندلی کے بارے میں جوڈیشل کمیشن کی رپورٹ اور چیئرمین الیکشن کمیشن سردار رضا کی مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے کمیشن ہر دباؤ کو مسترد کرتا چلا گیا، حتیٰ کہ سپیکر کے دباؤ کو بھی کمیشن نے مسترد کر دیا۔ عمران خان انڈیا گئے تو سپیکر نے فرط جذبات میں آ کر کہا کہ عمران خان انڈیا ہی رہیں۔ اور اب جنوبی پنجاب کے ایک پسماندہ ضلع مظفر گڑھ کے ایم این اے جمشید دستی کی باتوں سے ناراض ہو کر سپیکر نے کہا کہ بات ختم کریں ورنہ میں آپ کو اٹھوا کر باہر پھینکوا دوں گا۔ جمشید دستی کے کردار اور باتوں سے قطع نظر، یہ خیال ہونا چاہیے کہ اسمبلی میں وہ واحد ممبر ہے، جس نے ایک پسماندہ

علاقہ سے جاگیر داروں اور وڈیروں کو سیاست سے تقریباً آؤٹ کر دیا ہے۔ یہ غلام مصطفیٰ کھر اور دستیوں کی سیٹیں تھیں، جن پر جمشید دستی نے قبضہ کر لیا ہے۔ بہر حال دستی ہو یا کوئی اور سپیکر کو قانونی طریقے اور مناسب الفاظ استعمال کرنے چاہئیں، ایک سپیکر کا مولا جٹ بننا کوئی خوبی والی بات نہیں، برداشت کا جذبہ پیدا کرنا اور غیر جانبداری کو قائم رکھنا وقت کی ضرورت ہے۔

اُس نے دریائے چناب میں چھلانگ لگا دی، لوگ اسے دیکھتے ہی رہ گئے، وہاں اس کو کوئی نہ جانتا تھا، کسی سے اس کی واقفیت نہ تھی، تاہم انسان ہونے کے ناطے لوگوں نے اس کو بچانے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ مل سکی، نوجوان دریا میں ڈوب گیا، ساتھ ہی اس کے ارمان، اس کی خواہشات اور حسرتیں بھی دریا برد ہو گئیں۔ اس کے دامن میں مایوسیوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی تھا، جسے سنبھال کر رکھنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا، پریشانیوں کا اضافی بوجھ بھی اس کو اٹھانا پڑ رہا تھا، جو اس کے ناتواں کندھوں کی استطاعت سے زیادہ تھا۔ ڈگری بھی اس کے لئے ایک عذاب بن چکی تھی کہ اگر وہ کم تعلیم یافتہ ہوتا تو مایوسی بھی کم ہی ہوتی، ایم اے تک پڑھنا اور وہ بھی فلسفہ میں۔ کون نہیں جانتا کہ ایک فلسفی کے نظریات کیا ہوتے ہیں، حقیقی فلسفی سوچتا کس طرح ہے، اس کا زاویہ نگاہ کیا ہوتا ہے؟ وہ تصورات کی دنیا میں رہتا ہے، خیالوں میں گم رہتا ہے، تصورات میں ہی زندگی گزارنے کے تانے بانے بنتا ہے۔ یہ ایک فلسفی تھا، اس نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کی، جہاں معقول ملازمت کے مواقع دکھائی دیئے، درخواست گزار دی، مگر روایت کے مطابق کہیں بھی اس کی دال نہ گئی، چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے حصول کے لئے بھی زیادہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی فہرست ہی تیار ہو جاتی۔ پیسے

نہ ہونے کی بنا پر کاروبار کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا، جب مایوسیوں کا بار بڑھتا رہا، پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا، تو فیصلہ کن دن آگیا۔

اس نے پریشانیوں اور مایوسیوں سے نجات پانے کا فیصلہ کر لیا، وہ دریائے چناب پر گیا، چند لمحے رک کر اپنی توانائیاں جمع کیں، اپنے ذہن کو زندگی کے آخری اور اہم ترین فیصلے کے لئے تیار کیا اور آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ پانی تک پہنچنے کے دوران نہ جانے اسے کتنے خیال آئے ہونگے، ممکن ہے اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ اس کا یہ فیصلہ مناسب نہیں، اسے کچھ دن اور بھی نوکری کی تلاش کرنی چاہیے تھی، ممکن ہے کچھ بن جاتا، اسے دوستوں کے مشورے بھی یاد آئے ہونگے، جو انہوں نے ملازمت وغیرہ کے لئے اس کو دیئے ہونگے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا، کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب واپسی ممکن نہ رہی تھی، اب اس کی منزل قریب تھی، اب وہ اپنے پریشان ماضی سے نجات پا چکا تھا۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اسے دریا سے نکال تو لیا، مگر اس کی پہچان کا معاملہ کچھ ٹیڑھا تھا، تاہم کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا نام سلیمان ہے اور وہ پاک گیٹ ملتان کا رہائشی ہے۔ اس کے گھر سے ہی معلوم ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ تھا، زندگی کے فطری تقاضے نبھانے کے لئے اسے روزگار کی تلاش تھی، معاملہ طعن و تشنیع تک پہنچ چکا تھا۔ حالات کی سختیاں برداشت کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں، زمانہ ایسا آچکا ہے کہ بے

روزگاری تو دور کی بات ہے، کم آمدنی سے بھی کام نہیں چلتا، کمر توڑ مہنگائی نے ناک میں دم کر رکھا ہے، عام تنخواہ دار یا چھوٹے کاروبار والے لوگ سخت پریشان ہیں۔

قناعت پسندی انسان کی فطرت میں تو شامل ہو سکتی ہے، مگر دنیا کی رفتار قناعت پسندی جیسے پرانے نظریات کو روندتی ہوئی آگے گزر گئی ہے، ویسے بھی جب اشیائے ضرورت کی قیمتیں ہاتھ سے نکل رہی ہوں، گھر کا خرچہ پورا نہ ہوتا ہو، بجلی کے بل اور کرایہ مکان وغیرہ کی کہانی بھی قابو میں نہ ہو تو کہاں کی سادگی اور کیسی قناعت پسندی؟

فیصل آباد کے مضافات کی تیس سالہ عائشہ بی بی نے اپنی تین بیٹیوں کو گندم میں رکھنے والی زہریلی گولیاں کھلا دیں، سب سے چھوٹی سات ماہ کی بیٹی کو اس نے دودھ کے ساتھ گولی کھلائی۔ بعد ازاں عائشہ بی بی نے خود بھی زہریلی دوائی نگل لی۔ چاروں ہسپتال پہنچائے گئے، چھ سالہ بسمہ اور سات ماہ کی نور فاطمہ اپنی ماں کے ساتھ ہی موت کی وادی میں اتر گئیں، تاہم ایک بیٹی موت و حیات کی کشمکش میں ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ بچیوں کا والد عمارت بنانے والا مستری تھا، کچھ غربت آڑے آئی، یقینی طور پر کچھ ”بچیوں“ کا طعنہ بھی وجہ بنا ہوگا، گھر میں لڑائی رہتی تھی، ظالم باپ نے یہ نہ جانا کہ جن تین بچیوں نے اس کے لئے آخرت میں سرخروئی کا اہتمام کرنا ہے، وہ انہی کو طعنہ بناتا ہے۔ یہاں معاملہ ایک سلیمان کا نہیں، نہ ہی کسی ایک عائشہ بی بی کی بات ہے،

نہ جانے کتنے سلیمان اور کتنی عائشائیں روزانہ غربت، ظلم اور نا انصافی کی بھیینٹ چڑھتی
ہیں، یہ سب کچھ ہمارے معاشرے میں معاشی عدم توازن کا شاخسانہ ہے، ذمہ دار
حکومت اور ہم خود ہیں۔

!سکول سے باہر بچوں کا ہدف اور پیف

اگرچہ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے اہالیانِ صوبہ پنجاب کو یہ خوشخبری دے دی ہے کہ 2018ء تک پنجاب میں کوئی بچہ سکول سے باہر نہیں ہوگا۔ یعنی اگلے سوا دو برس میں سکولوں سے باہر تمام بچوں کو سکول میں داخلے کا ہدف پورا کر لیا جائے گا۔ اگر وزیر اعلیٰ پنجاب کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے، تو تعلیمی اہداف کو پورا کرنا کوئی بڑی بات نہیں، ان کے حکم پر تین ماہ میں فلائی اوور بن جاتے ہیں، گیارہ ماہ میں دانش سکول کی عالیشان عمارات تعمیر ہو جاتی ہیں، کئی کلو میٹر پر محیط میٹرو چند ماہ میں مکمل ہو جاتی اور غریبوں کے لئے سستے سفر کے لئے تیار ہو جاتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ پنجاب میں 80 لاکھ کے قریب سکول جانے کی عمر کے بچے سکولوں سے باہر ہیں۔ یہ عمر پانچ سے سولہ سال تک ہے۔ یہ بچے ورکشاپوں پر کام کرتے ہیں، چھوٹے ہوٹلوں پر بیرے ہیں، یا ان کے برتن دھوتے اور میز صاف کرتے ہیں، یا چھوٹی دستی صنعت کھتے ہیں، یا گلیوں میں کچرا چھتے ہیں، یا کھیتوں میں کام کرتے ہیں، اور یا پھر گلیوں میں آوارہ پھرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

حکومت پنجاب نے ”پڑھو پنجاب، پڑھو پنجاب“ کی سکیم کا آغاز کر رکھا ہے، حکومت کے پاس یہ ہدف مکمل کرنے کے لئے دو سال اور تقریباً دو ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ اسی ہدف تک پہنچنے کے لئے گزشتہ سالوں سے حکومت ہر سال اپنے اساتذہ کے ذریعے دیہات میں اُن بچوں کا ڈیٹا اکٹھا کرتی ہے، جو سکولوں سے باہر ہیں، سرکاری سکولوں کے اساتذہ مضافات اور دور دراز دیہات میں جاتے اور بہتی بہتی گھوم پھر کر ان بچوں کے بارے میں معلومات لیتے ہیں، جن کی عمر سکول جانے کی ہے اور وہ کبھی سکول نہیں گئے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ استاد صاحب ایک بہتی میں گئے وہاں کسی ایک صاحب کے پاس بیٹھ کر بہتی بھر کے بچوں کی معلومات اکٹھی کر لیں، اور واپس آ گئے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ محکمہ تعلیم کے تمام دفاتر نے سرکاری سکولوں سے حاضری چیک کی، نئے داخلوں کا حساب لگایا اور نجی سکولوں سے ڈیٹا اکٹھا کر لیا، معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اگر کسی ایک دفتر نے اپنے ہر کارے کو کسی سرکاری سکول میں بھیجا تو کچھ ہی دیر بعد محکمہ تعلیم کے کسی ماتحت دفتر کا ہر کارہ بھی اسی قسم کا فارم اٹھائے سکول میں آدھمکا، کچھ ہی دیر بعد قریبی سرکاری ہائی سکول کا کوئی ٹیچر پہنچ گیا اور اگلے روز کسی سرکاری پرائمری سکول کی ہیڈ ٹیچر خود آ گئیں۔ مذکورہ نجی سکول نے اگر دس نئے داخلے کئے ہیں تو سرکاری طور پر کم از کم پانچ لوگوں نے وہی تعداد اپنے ہی طور پر آگے پہنچادی، یوں وہ دس بچے پچاس بچے بن گئے، حکومت کے داخلے بڑھتے گئے۔

دوسری طرف جب گلی محلے، ورکشاپوں، ہوٹلوں، کام سیکھنے کی جگہوں وغیرہ کو دیکھتے ہیں، تو جگہ جگہ مزدوری کرتے معصوم بچے ہمارے منصوبوں کا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں۔

آؤٹ آف سکول“ بچوں میں سے حقیقت تو یہ ہے کہ شاید یہ فیصد کے حساب سے ” ایک ٹکٹ بھی نہ پہنچتے ہوں۔ مگر حکومت کے دعوے کچھ مختلف ہوتے ہیں، اس لئے کہ اُن کے اعداد و شمار کے مطابق لاکھوں بچے داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت کی کوششیں تو کسی حد تک قابل ستائش ہیں، مگر عملی اور زمینی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ بھی بات تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے کہ حکومت نے سکولوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے کوششیں شروع کر رکھی ہیں، مگر جتنے بچے سکولوں سے باہر ہیں اگر ان کو سکولوں میں لایا جائے گا تو ان کے لئے کمرے اور دیگر سہولتیں ناکافی ہیں، اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ پہلے سکولوں کے لئے مناسب عمارات بنوائے، پانی، بجلی، فرنیچر، چار دیواری اور واش رومز وغیرہ کا بندوبست کرے تب جا کر نئے داخلوں کے لئے ماحول تیار ہو سکتا ہے۔ حکومت نے داخلوں میں اضافے کے لئے ہی ایک نیا قدم اٹھایا ہے کہ پنجاب کے تقریباً ایک ہزار سکول پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ سکول ہیں جو سرکاری طور پر ناکام ہو چکے ہیں، جہاں بنیادی سہولتیں (تعلیم سمیت) اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ فاؤنڈیشن نے یہ سکول، بڑے سکولز کی چینز، این جی اوز اور دیگر لوگوں کو دینے کا اعلان

کر دیا ہے۔ اس سے ایکٹ تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فاؤنڈیشن پنجاب حکومت کا ایکٹ کامیاب ترین منصوبہ ہے، جس پر حکومت اور عوام دونوں کو پورا اعتماد ہے۔ دوسرا یہ کہ ختم شدہ سرکاری سکول دوبارہ زندہ ہو جائیں گے، مگر بڑے سکولوں کی چینمز اور این جی اوز کی بجائے اگر یہ سکول بے روزگار تجربہ کار لوگوں کو دے دیئے جاتے تو ہزاروں خاندانوں کا معاشی مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

!گیس کی لوڈ شیڈنگ کے فوائد

اگر عوام کی سوچ حکمرانوں جیسی ہوتی تو وہ کب کے حکمران بن چکے ہوتے، اُن کی سوچ محدود ہے، وہ بس دو قدم آگے تک ہی دیکھ سکتے ہیں، یہ تو حکمرانوں کی مہربانی ہے کہ وہ عوام کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ دوسری طرف اپنی کم فہمی اور کوتاہ نگاہی کی وجہ سے ہی عوام حکمرانوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ہر تنقید کرنے والا خود کو دانشور اور سامنے والے کو کم علم جانتا ہے۔ مگر عوام کو باور کر لینا چاہیے کہ حکمران عوام سے زیادہ ذہین تھے تو انہیں حکمرانی نصیب ہوئی۔ حکمران جو اقدام کرتے ہیں وہ نہایت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد کرتے ہیں، پہلے آئیڈیا تیار ہوتا ہے، اس کی فیئر سبٹھی بنتی ہے، اس کے نشیب و فراز کو پرکھا جاتا ہے، اس کے فوائد اور نقصانات کا جائزہ لیا جاتا ہے، پھر وہ بڑے صاحب کو پیش کیا جاتا ہے، انہیں قائل کیا جاتا ہے اور آخر میں اس کی منظوری ہوتی ہے۔ اتنے مراحل سے گزرنے والے منصوبے میں آخر کئی کہاں رہ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت کے منصوبے حرفِ آخر ہوتے ہیں، ان پر مخالفت برائے مخالفت کے لحاظ سے تنقید تو کی جاتی ہے، مگر تنقید بے جان اور خواہ مخواہ ہی ہوتی ہے۔

اب گیس کی لوڈ شیڈنگ کو ہی لے لیجئے، ہر طرف چیخ و پکار ہے، جلوس نکل رہے

ہیں، خواتین ہانڈیاں اور چولہے اٹھا کر سڑکوں پر آگئی ہیں، نعرے لگ رہے ہیں، انہوں نے بینر اور کتے اٹھا رکھے ہیں، دھرنے دیئے جارہے ہیں۔ اخبارات میں بیانات دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے، پریس کانفرنس کے ذریعے خود نمائی کا بندوبست کیا جا رہا ہے، جلسوں میں حکومت کو گیس کی لوڈ شیڈنگ کا مورد الزام ٹھہرا کر نااہل قرار دیا جا رہا ہے، حتیٰ کہ انہیں حکومت چھوڑ دینے کا حکم بھی دیا جا رہا ہے۔ نجی محفلوں میں گیس کی لوڈ شیڈنگ پر اظہار افسوس کیا جا رہا ہے، کونسا موقع ہے جب حکومت کو کوسنے نہیں دیئے جاتے، بعض جذباتی لوگ تو مغالطات سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ مگر کبھی کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر گیس کی لوڈ شیڈنگ ہے تو حکومت نے یہ فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا، اس پر ماہرین کا اجلاس ہوا ہوگا، زمینی حقائق کو دیکھا گیا ہوگا، اس کے فوائد اور نقصانات کو مد نظر رکھا گیا ہوگا، تب جا کر لوڈ شیڈنگ کا فیصلہ ہوا ہوگا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر حکومت نے بجلی کے ساتھ ساتھ گیس کی لوڈ شیڈنگ کی ہے تو ضرور عوام کی بہبود کا خیال رکھ کر ہی کی ہوگی، وہ کون سی حکومت ہے جو عوام سے ووٹ لے کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے اور عوام کے ہی خلاف اقدامات شروع کر دے؟ ایسا ممکن نہیں، تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ آخر لوڈ شیڈنگ کیوں ہوتی ہے، ہم نے غور و خوض کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس نتیجے

پر پہنچے ہیں کہ حکومت نے یہ مشکل فیصلہ عوام کے فائدے کے لئے ہی کیا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سروے کروا کے دیکھ لیا جائے پاکستان میں توہم بردار افراد کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی ہے، اس کی سب سے اہم اور خاص وجہ یہی ہے کہ ہم لوگوں نے بسیار خوری کو اپنی عادت کا حصہ بنا لیا ہے، ہم اس وقت تک اپنا ہاتھ نہیں روکتے، جب تک ہماری بس نہیں ہو جاتی۔ پھر اسی پر بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ سردیاں ہوں یا گرمیاں، دن میں تین مرتبہ کھانا کھانے کی عادت بھی پختہ ہو چکی ہے، اس کے علاوہ گیارہ بجے ٹی ٹائم، شام کو کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی ایک اور نشست۔ انہی خراب عادتوں کی بنا پر ہی بیماریاں ہمارے ہاں گھر کر جاتی ہیں۔ ہم چونکہ ہاتھ روکتے نہیں، کسی اخلاقی حتیٰ کہ قانونی پابندی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، اس لئے حکومت نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ نہ گیس ہوگی اور نہ ہی کھانے پکانے کا بازار گرم ہوگا۔ محدود وقت میں اور محدود مقدار میں گیس آتی ہے، مشکلوں سے ضرورت پوری ہوتی ہے، پھر چلی جاتی ہے۔ اسی طرح ہم لوگ رات دیر تک جاگتے اور صبح دیر سے اٹھنے کے عادی بھی ہو چکے ہیں، اب حکومت کے اقدام کی وجہ سے گھر کا چولہا دیر سے اٹھنے والوں کا منہ چڑھا رہا ہوتا ہے، اگر کوئی صبح سویرے اٹھے گا تو ناشتہ کر سکے گا۔ سردیوں میں دوپہر کے کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے دوپہر کو گیس آتی ہی نہیں۔ اب چونکہ سردیاں محدود ہوتی جا رہی ہیں، مگر ہم لوگ اپنی عادت سے مجبور ہو کر گیس کے ہیٹر چلانے سے باز نہیں آتے، حکومت نے

اخبارات کے ذریعے اور گیس کے بل پر تحریر کر کے مسلسل عوام کو منع کیا، انہیں بتایا کہ
ہیئر نہ جلائیں بلکہ گرم کپڑے پہنیں، کوئی نہیں رکا، مجبوراً حکومت کو لوڈ شیڈنگ کرنی
پڑی، ”ہور چوپو“۔

پہلے یہ تصویر لاہور کے اخبارات میں شائع ہوئی، جنوبی پنجاب جیسے دور دراز علاقوں کی باری اگلے روز آئی، جس نے جس اخبار میں تصویر دیکھی، اسی اخبار کا حوالہ دیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی ضروری جانا، بلکہ بہت سے لوگوں نے تو اپنے جذبات کے تیر اخبار پر ہی چلانے میں ذرا دیر نہ کہ وہ ”دو ٹکے“ کی خاطر کہاں تک گرجاتے ہیں۔ تصویر نے سوشل میڈیا پر بھی خوب دھوم مچائی، اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ کسی اشتہار کے لئے دی گئی اس تصویر نے اشتہار دینے والی کمپنی کی توقع سے بہت بڑھ کر بنزس کیا۔ دنیا کے دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ اشتہار کے پیمانے بھی تبدیل ہو رہے ہیں، اب کئی روز تک اشتہار آتا ہے کہ ”آ رہا ہے“۔ لوگوں میں جب خوب تجسس بڑھ جاتا ہے تو کمپنی اپنا مطلوبہ اشتہار لے آتی ہے، یوں اس کے لئے ماحول پہلے سے ہی تیار ہوتا ہے، یوں اپنی بات دوسروں تک اشتیاق کے ساتھ پہنچ جاتی ہے۔

زیر نظر اشتہار میں بہت انفرادیت ہے، ایک یہ کہ اس نے بھی قوم کو پہلے انتظار کروایا، اب بھی ”اشتہار“ صرف ایک تصویر پر مشتمل ہے، اخبار کے صفحہ اول کے، لوہراف کے بالکل آخر میں ایک (چھ کالمی) خاتون اوندھی لیٹی ہے

اس علاقے میں موجود خبریں اس کے قریب آ کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں، کیونکہ وہاں سے خاتون کا وجود شروع ہو جاتا ہے، اس کے ایک ہاتھ میں ایک موبائل بھی ہے، جو کہ تصویر کو دیکھنے کے آخری مرحلے میں دکھائی دیتا ہے، کیونکہ اس سے قبل اور بھی بہت سے مناظر ہیں، جہاں نظر ٹھہر جاتی ہے، خاتون نے سرخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں، جن کا اگر رنگ تبدیل کر کے ”سکن کلر“ کر دیا جائے، تو مدعا مزید جلدی پورا ہو سکتا ہے۔ اخبار کھولتے ہی وہ تصویر قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے، اگر کوئی قاری اپنے اہل خانہ میں بیٹھا ہے تو وہ اخبار کو فولڈ کر کے اوپر والا آدھا اخبار ہی پڑھ سکتا ہے، کیونکہ نیچے والے حصے میں فطری حیا اس کا راستہ روک لیتی ہے۔

نسوانی حُسن کی جلوہ گری اس اشتہار میں نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے، اس موقع پر حیا وغیرہ کی ہڈی کباب میں ڈالنا زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا، یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے، کہ قارئین کی اکثریت نے اسے بہت پسند کیا ہوگا، اور اس میں خوب دلچسپی لی ہوگی، ضروری نہیں کہ ہر کوئی گھر والوں میں بیٹھ کر ہی یہ اخبار پڑھے گا، بہت سوں کو تنہائی میں اخبار بنی کا موقع ملے گا اور کہتے ہیں کہ جب انسان تنہا ہوتا ہے تو شیطان اس کے قریب ہی ہوتا ہے، ایسے میں حیا وغیرہ کی بانڈی بھی چولہے پر نہیں چڑھتی۔ مگر یہاں مسئلہ اہل خانہ میں یا تنہائی میں یا دوستوں میں ایسی تصویر دیکھنے کا نہیں، بلکہ اصل

مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم لوگ آہستہ آہستہ، ہلکی ہلکی چوٹیں کھا کر اس قسم کی باتوں کے عادی نہیں ہوتے جا رہے؟ کونسا ڈرامہ ہے، کونسی خاتون لائن کر رہی ہے جس کے سر پر دوپٹہ ہو، اب یہ باتیں دقیانوسی معلوم ہوتی ہیں، اب برقعہ وغیرہ تو باقاعدہ جہالت کی ڈگری اختیار کرنے کو ہے، جس نے پردہ کرنا ہے، وہ دفاتر میں ملازمت کے قابل کیونکر قرار پاسکتی ہے، اگرچہ چند ایک ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں، جو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

یہ بات نہایت ہی صدمے کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، کہ قرآن پاک میں جس عریانی فحاشی کو دورِ جاہلیت کی نشانی قرار دیا گیا ہے، وہی گنگا اپنے ہاں الٹی بہہ رہی ہے، یہاں پردے کو جہالت اور عریانی فحاشی کو ترقی کی علامت قرار دیا جا رہا ہے۔ اب اگر ایک خاتون کی مذکورہ بالا تصویر آئی ہے تو بہت سے لوگ اس کو ایک اشتہار کی ایک ضرورت قرار دے سکتے ہیں، ٹی وی میں جیتی جاگتی تصویروں کی مثال دے سکتے ہیں، اس تصویر پر منفی تبصرہ اور تنقید کرنے والوں کو دقیانوسی اور قدامت پرست کہہ سکتے ہیں۔ ایسا طبقہ موجود ہے، جو اس قسم کی روایات کو نہ پتہ دیکھنے کے لئے بے چین ہے، ان کی نگاہ میں معاشرہ گھٹنا ہوا ہے، اسے آزاد ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو زیادہ فکر مندی کی ضرورت نہیں، اپنے ٹی چینلز پر ڈراموں کی حالت ملاحظہ کر لیں، کونسا ڈرامہ ہے جس میں لڑکی لڑکے کی داستانِ عشق نہیں؟ ہر گھر میں بیٹھی بیٹی کو نئے طریقے دکھائے اور

سمجھائے جاتے ہیں، نوجوان لڑکے دوسری شادی کرتے اور پہلی کو طلاق دیتے عام طور پر دکھائے جارہے ہیں، اس قسم کے ٹریننگ سینٹر ہر گھر میں ٹی وی چینلز کی صورت میں قائم ہو چکے ہیں، صرف تین سو روپیہ ماہانہ پر ہر کوئی یہ تربیت حاصل کر سکتا ہے۔ مذکورہ اشتہار کی تصویر کو ہم لوگوں نے جو پذیرائی بخشی ہے، امید ہے کمپنی کو بہت حوصلہ ملا ہوگا اور اگلی تصویر اس سے مزید پرکشش ہوگی۔

اس سال کے آخری ضمنی الیکشن کا معرکہ سر ہوا۔ روایت کے برعکس قومی اسمبلی کے اس الیکشن میں حکومت کے مخالف امیدوار نے کامیابی حاصل کر لی۔ یہ الیکشن اگرچہ ایک حلقے میں ہوا اور یہ حلقہ بھی دور دراز ایک پسماندہ اور چھوٹے ضلع میں ہوا تھا، تاہم اس کی اہمیت ملکی سطح پر بن چکی تھی، کیونکہ اس میں مسلم لیگ ن اور پی ٹی آئی کی مرکزی سطح پر دلچسپی تھی، یہاں الیکشن مہم میں حمزہ شہباز شریف تین مرتبہ اور عمران خان دو مرتبہ لودھراں آئے۔ یہ سیٹ صدیق بلوچ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے جیتی تھی، روایتی طور پر جیسے آزاد امیدوار حکومت کے ساتھ مل جایا کرتے ہیں، انہوں نے بھی حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ صدیق بلوچ اگرچہ بہت کم تعلیم یافتہ ہیں، تاہم جب سے اسمبلی ممبر شپ کے لئے ڈگری لازمی ہونے کی کہانی شروع ہوئی انہوں نے تمام مراحل مکمل کر کے ڈگری حاصل کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار ناپا اہل ہونے کے باوجود آخر کار سپریم کورٹ نے انہیں الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی تھی۔

صدیق بلوچ کی یہ سیٹ خاندانی قرار دی جاسکتی تھی، کم از کم ایم پی اے کی سیٹ ان کے گھر سے باہر کبھی نہیں نکلی۔ اب بھی وہ خود ایم این اے تھے تو

انہوں نے ایک ضمنی الیکشن میں اپنے بیٹے کو ایم پی اے بنوایا تھا، اس سے قبل بھی مشرف دور میں جب تعلیمی ڈگری کو لازمی قرار دیا گیا اور موصوف ڈگری سے تہی دست تھے تو انہوں نے اپنے ایک بھانجے کو اپنی سیٹ پر ایم پی اے بنوایا تھا۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سیٹ ان کی خاندانی ہے، وہ عشروں سے یہاں سے کامیاب ہوتے آرہے ہیں، مگر اس کے باوجود حلقے میں ترقیاتی کاموں کی جھلکی دکھائی نہیں دیتی۔ گزشتہ نظامت کے دور میں اگرچہ کچھ ترقیاتی کام دیکھنے میں آئے، مگر شہر میں ایک ہی سرکاری ہائی سکول تھا، اب بھی ایک ہی ہے تاہم مضافات میں اکا دکا ہائی سکول بن گئے ہیں۔ لودھراں شہر ایک دیہاتی قصبے کا منظر پیش کرتا تھا، تاہم اب شہر کے اندر وہی نظامت دور کی ترقی کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔

۷ کے الیکشن میں اگرچہ جہانگیر ترین کو دس ہزار ووٹ کم ملے، مگر یہ بھی قابل 2013 غور بات ہے کہ ایک اور امیدوار بھی مسلم لیگ ن کا ہی ساتھی تھا جس نے پینتالیس ہزار ووٹ لئے تھے، لہذا اب حکومتی پارٹی کا خیال تھا کہ دوسرے امیدوار کے ساتھ ملنے سے ووٹوں کی تعداد کافی زیادہ ہو جائے گی اور یوں ہمارا امیدوار کم از کم تیس ہزار ووٹوں سے کامیابی حاصل کر لے گا۔ حکومت نے بھی اپنی تمام تر مشینری اس الیکشن میں جھونک دی۔ چند ماہ قبل وزیراعظم بھی یہاں ڈھائی ارب روپے کے ٹیکج کا اعلان کر کے گئے تھے۔ وفاقی و صوبائی وزراء

وفاقی و صوبائی سیکریٹریز اور بہت سے دیگر معزز ممبران اسمبلی لودھراں کے الیکشن میں، پائے گئے۔ بہت سے ترقیاتی کاموں کے وعدے ہوئے، سرکاری ملازمین کو جلسوں میں پابند کرنے کے ساتھ انہیں سرکاری امیدوار کو کامیاب کروانے کا بھی حکم دیا گیا۔ پی ٹی آئی کی جانب سے بھی مرکزی اور صوبائی قیادت میں سے لوگ لودھراں آئے۔ لودھراں میں چند روز خوب میلہ سجا رہا۔

گزشتہ الیکشن میں صدیق بلوچ کے مقابلے میں جہانگیر ترین کو 75 ہزار ووٹ ملے تھے، حالانکہ اس وقت تک جہانگیر ترین کا لوگوں میں گھل مل جانے کی روایت عام نہ تھی۔ یار لوگوں نے تو اب تک یہی مشہور کر رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو ملتے نہیں اور یہ بھی کہ ملنے کے بعد صابن سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ مگر حالیہ الیکشن میں ماحول بالکل مختلف تھا، اس بات جہاں صدیق بلوچ کو بلدیاتی الیکشن میں کامیابی اور حکومتی تعاون کا زعم تھا تو دوسری طرف عوام میں جہانگیر ترین کی پذیرائی کافی زیادہ تھی۔ یہ لہر بھی دیکھنے میں آئی کہ ہر چوتھا فرد ایسا تھا جس کا قول تھا کہ وہ صدیق بلوچ کے ساتھ ہے مگر ووٹ ترین کو جائے گا، شام کے نتیجے نے عوام کے قول اور رویے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس مرتبہ فوج کی موجودگی بھی جہانگیر ترین کے مفاد میں گئی، کیونکہ جہاں کسی وڈیرے وغیرہ نے دھاندلی کرنا تھی، وہاں انہیں قریب پکھٹکنے کی اجازت نہ ملی، لوگوں کو ڈراتا کون اور ووٹ دینے پر مجبور کون کرتا؟ کسی تعصب کے بغیر

اب کہا جا رہا ہے کہ لودھراں کی تقدیر سنور جائے گی، یہی بات جہانگیر ترین کے لئے کسی امتحان سے کم نہیں، اب انہی اپنے رویے کو بھی سیاسی بنانا پڑے گا اور کام کے معاملے میں بھی کچھ کر کے دکھانا پڑے گا۔ عوام نے انہیں مینڈیٹ دے دیا ہے، اسے پورا کرنا اور عوام کی توقعات پر پورا اترنا ان کا کام ہے، ورنہ تبدیلی کا اختیار تو عوام کے پاس ہی ہے۔

بھارتی وزیراعظم مودی جی نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستانی وزیراعظم میاں نواز شریف کو سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بھاری واجپائی سے دلی لگاؤ ہے، انہوں نے یہ ٹویٹ پاکستان سے بھارت پہنچنے کے بعد کیا، مودی جی اچانک لاہور پہنچ گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی آمد کا انکشاف اپنے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے کیا، خبر سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا، جس پر انہوں نے بتایا کہ یہ لاہور میں موجود ہیں، معاملہ فاسل ہونے پر مودی جی لاہور آئے اور انہیں ہیلی کاپٹر پر جاتی امرالایا گیا، حکومتی بڑوں نے ان کا پر جوش استقبال کیا انہوں نے تقریباً ڈھائی گھنٹے اپنے پاکستانی ہم منصب کے ساتھ گزارے اور واپس روانہ ہو گئے۔ مودی کی پاکستان میں آمد پر بھارتی اپوزیشن پارٹیوں نے سخت احتجاج کیا، تاہم پاکستانی میڈیا میں پاکستان کی طرف سے کوئی خاص احتجاج سامنے نہیں آیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس عمل سے دونوں ممالک کے تعلقات بہتر ہوں گے، تلخیاں مٹیں گی اور قربتوں میں اضافہ ہوگا، تاہم اتنا ہوا کہ چینلز کو اچانک اور زبردست خبر میسر آ گئی، جس پر اپنے میڈیا نے گھنٹوں رپورٹیں چلائیں، تجزیے پیش کئے، پیکیجز بنائے، مودی کی پاکستان کے خلاف زہر آلود گفتگوئیں سنائیں، مودی کے خلاف جو کچھ

مواد میسر آیا اسے بھی پیش کیا گیا۔ مودی نے اپنے ٹویٹ میں نواز شریف کے واجپائی کے ساتھ دلی لگاؤ کی بات کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے واجپائی کے لئے خیر سگالی کا پیغام بھی دیا ہے۔ اور یہ بھی کہ میں وزیراعظم نواز شریف کے جذبہ خیر سگالی سے بہت متاثر ہوا ہوں، مجھے نواز شریف کا ایئر پورٹ تک چھوڑنے کے لئے آنا بھی یاد رہے گا۔

اگر میاں نواز شریف واجپائی سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں، مودی جی بھی نواز شریف کے جذبہ خیر سگالی سے بہت متاثر ہیں اور پاکستانی قوم بھی صرف واجپائی سے ہی نہیں بھارت کے بہت سے افراد کے ساتھ نہ صرف جذبہ خیر سگالی رکھتی ہے بلکہ ان سے بہت زیادہ متاثر بھی ہے، پاکستانی قوم کی اکثریت بھارت سے دلی لگاؤ رکھتی ہیں۔ اس میں ناراض ہونے والی کوئی بات نہیں، اگر ”دلی لگاؤ“ کا لفظ کسی کو برا لگا تو اس کی جگہ پر ”لاہوری“ لگاؤ کہا جاسکتا ہے، یا ”اسلام آبادی“ لگاؤ لکھا جاسکتا ہے، اگر معاملہ جزییات کی بجائے کل کا کرنا ہے تو ”پاکستانی“ لگاؤ بھی نامناسب نہیں۔ بھارت کے ساتھ یہ لگاؤ اس حد تک مضبوط اور پختہ ہے کہ اس میں شک کرنا بھی خیانت کے زمرے میں آنے کا خدشہ ہے۔ ہمارے ہاں کونسا نوجوان یا فلم بین ہے جو بھارت کی فلم دیکھنے سے انکاری ہو، ان کے ڈسلاگٹ ہمارے ہاں گلی محلے میں اور روز مرہ کے معاملات میں استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ کون سا فلمی ہیرو ہے جو ہمارے

نوجوانوں اور فلم بینوں کا ہیر و نہیں، گھروں، دکانوں اور بازاروں میں بھارتی اداکاروں کی تصاویر آدھنراں ہیں، اپنے دل میں کنگ خان، دینگ خان، عامر خان اور نہ جانے کتنے خان اور کنگ بسے ہوئے ہیں۔ اگر ہمارے نوجوان بھارتی فلمی ہیر وز کو اپنا ہیر و تصور کرتے ہیں، تو بھارتی ہیر و نہیں بھی ان کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہیں۔

ہم لوگوں نے کبھی یہ بھی خیال نہیں کیا کہ بہت سی فلموں میں پاکستان کے خلاف خوب زہر افشانی کی جاتی ہے، ہماری پاک آرمی پر الزامات ہی نہیں لگائے جاتے، اس کی تذلیل بھی کی جاتی ہے، مگر محال ہے کہ ہم میں سے کسی نے کبھی برا مانا ہو، یا ہمارے جبین پر کبھی شکن بھی ابھری ہو۔ بات فلموں، ہیر وز اور ہیر و بینوں تک ہی محدود نہیں، بھارتی گانے ایک طویل عرصے سے ہمارے دلوں میں دھڑکتے اور لبوں پر مچلتے آئے ہیں۔ اس داستان کا نشان بھی مٹ گیا جب لوگ پاکستانی گانے بھی سنا کرتے تھے، جن میں شاعری بھی تھی، موسیقی بھی اور سریلی مدھر آواز بھی۔ اب شور شرابا ہے۔ سب کچھ کے باوجود ہم نئے یا پرانے گانوں کی بات کریں تو انڈیا کا نام ہی آتا ہے۔ اس لئے مودی جی دل چھوٹا نہ کریں، ہمارے وزیر اعظم کو آپ کے سابق وزیر اعظم سے دلی ”لگاؤ ہے تو ہمیں آپ کی فلموں اور اداکاروں سے ”لاہوری“ لگاؤ ہے۔ آپ ”نواز شریف کے جذبہ خیر سگالی سے متاثر ہیں تو ہم آپ کے کسی جذبے کے بھی منتظر نہیں، بلکہ نفرتوں

کے باوجود آپ سے متاثر ہیں، ہم آپ، آپ کی حکومتوں اور ملک کے سخت مخالف بھی ہیں، مگر لگاؤ میں بھی کوئی کمی نہیں، ہے کوئی ہم سہا، ہے تو سامنے آئے ! مودی کو سمجھنا اتنا آسان نہیں، نہ ہی مودی کے اقدامات کو سنجیدہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ ایک لمحے میں پاکستان کے خلاف زہر اگلنے لگتے ہیں اور دوسرے ہی کسی مرحلے میں پاکستان سے اچھے تعلقات کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔

! پر وٹو کول اور بے بسی

صدر مملکت جناب ممنوں حسین نے پشاور کے سٹیڈیم میں تشریف لے جانا تھی، وہاں فانا یو تھ فیسٹول کا اختتامی پروگرام جاری تھا۔ جب پاکستان کی سب سے اونچے عہدے پر متمکن شخصیت باہر نکلتی ہے تو پروٹوکول دینے کے لئے آئین اور قانون حرکت میں آ جاتا ہے۔ اگرچہ صدر صاحب نے دو بجے آنا تھا، مگر قانون ان کی آمد سے گھنٹوں قبل ہی متحرک ہو گیا اور سٹیڈیم کو جانے والے تمام راستے بلاک کر دیئے گئے۔ ملک میں آبادی بہت زیادہ بڑھ چکی ہے، چند لمحے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو ٹریفک بلاک ہو جاتی ہے، اور اگر معاملہ منٹوں سے گھنٹوں تک چلا جائے تو ٹریفک کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اس طرح ٹریفک بند کرنے کے موقع پر جو لوگ بے بسی کے عالم میں رسکے ہوتے ہیں، وہ یا تو وہاں پر موجود پولیس وغیرہ سے الجھنے لگتے ہیں، یا ہر کمزور کی طرح چیختے چلاتے اور روتے رہتے ہیں، مگر ان کی فریاد یا غصہ سننے والا کوئی نہیں ہوتا، کیونکہ موقع پر موجود پولیس خود بھی بے بس ہی ہوتی ہے۔ میاں نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں جب رفیق تارڑ پاکستان کے صدر بنا دیئے گئے، اور وہ پہلے ہی روز باہر نکلے اور انہوں نے اپنے ارد گرد سکیورٹی کا حصار دیکھا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کہ ”میںوں کنھے مارناں ایں“۔ اس قول پر ایک صحافی نے سوال دیا کہ اگر ایسی بات

ہے تو آپ پروٹوکول لینے سے انکار کر دیں۔ صدر مملکت نے فرمایا کہ ”یہ آئینی مجبوری ہے۔“

پاکستان ایک غریب اور ترقی پذیر ملک ہے، جہاں تعلیم، صحت، پینے کا پانی اور دیگر بنیادی ضرورتیں بھی مناسب طریقے سے دستیاب نہیں، مگر ایک فرد واحد کے پروٹوکول وغیرہ پر اس قدر اخراجات اٹھتے ہیں، کہ رہے رب کا نام۔ قوم کو وقتاً فوقتاً یہ باور کروایا جاتا ہے کہ حکومت نے اپنے اخراجات میں اتنے فیصد کمی کر دی ہے، گویا حکومت سادگی کے راستے پر چل نکلی ہے، مگر ایسی کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آتی۔ کس مد میں کتنا خرچ ہو رہا ہے، اس سلسلے میں بھی بعض اوقات اعداد و شمار سامنے آتے رہتے ہیں، ایسی خبروں کو لوگ سنتے اور سر دھنتے ہیں، ان کا خون کھولنے لگتا ہے، لیکن وہ کمزور اور بے بس ہیں کر کچھ نہیں سکتے، حتیٰ کہ احتجاج وغیرہ کرنے کے لئے بھی ان کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ تاہم حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی آمدورفت وغیرہ کا ایسا بندوبست کرے جس سے عوام کو تکلیف نہ ہو۔ مگر بات وہی آ جاتی ہے، کہ جسے تکلیف ہے اگر وہ احتجاج کے لئے اپنی آواز ہی بلند نہیں کر سکتا تو تکلیف دینے والے کو کیا پریشانی ہے۔ اپنے ہاں مذکورہ بالا صدر ہوں یا موجودہ، ان کی مدح سرائی اس انداز سے کی جاتی ہے کہ اس قسم کی سادہ اور نیک خصلت شخصیات ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوگی، وہ قوم کا درد بھی دل میں چھپائے پھرتے

ہیں اور انہیں انسانیت کی بھلائی کی بھی بہت فکر لاحق رہتی ہے، وہ آنے والے مہمانوں کو بھی بہت تپاک سے ملتے ہیں، اور ان کی خاطر مدارات بھی کرتے ہیں۔ مگر صدارتی محل کے اخراجات کو دیکھا جائے تو اس 'مہمام' میں پہنچ کر سب برابر دکھائی دیتے ہیں۔

پی پی کے چیئرمین کی بہن نے اپنی زندگی کا پہلا ووٹ کاسٹ کر دیا، اپنے گھر سے چند سو میٹر کے فاصلے پر ووٹ دینے جانے کے لئے گاڑیوں کی قطاریں آگے پیچھے تھیں، سکیورٹی ہائی الرٹ تھی۔ ابھی چند روز قبل ہی کراچی میں بلاول زرداری کو دیئے جانے والے پروٹوکول کی وجہ سے ایکٹ بچی کو فوری طبی امداد نہ دی جاسکی تھی، جس کی بنا پر وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی، اگرچہ میڈیا نے پروٹوکول کی کرب ناکوں پر خوب احتجاج کیا تھا، مگر اگلے ہی روز بلاول کے مرحومہ بچی کے گھر جانے سے معاملہ ٹھنڈا ہو گیا، مگر پروٹوکول ختم یا کم نہ ہوا۔ معاملہ صرف صدر یا بلاول یا بختاور تک ہی محدود نہیں،

وفاق کے حکمرانوں سے لے کر صوبوں تک اور حکمرانوں کی اولادوں تک یہ وبا عام ہے، حمزہ شہباز کو بھی مکمل پروٹوکول دیا جاتا ہے، کس کا کیا استحقاق ہے اس کی کسی کو پرواہ نہیں۔ یہ دراصل نشہ ہے، جو لگ جائے تو چھڑوانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب خیبر پختونخواہ نے پروٹوکول ختم کرنے کا اعلان کیا ہے، دیکھنا ہے کہ اس پر عمل ہوتا ہے، یا یہ اعلان صرف اعلان ہی رہے گا۔ اگر کے پی کے کی حکومت

اس قسم کے فیصلے پر عمل کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، تو اسے ایک بہت ہی مثبت قدم قرار دیا جائے گا، اسے دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کرنے کی بات بھی ہونے لگے گی، اور اگر عمل نہ ہوا تو جمہوری رویوں میں ایک اور مذاق کا اضافہ ہو جائے گا اور کمزور اور بے بس عوام اپنی روایتی بے حسی کی بنا پر خاموشی اختیار کئے رکھیں گے۔

!وقت کی قدر

گزشتہ دنوں سال کا آخری سورج غروب ہو گیا، اس منظر کو ٹی وی چینلز نے خوب نمایاں کر کے دکھایا، بات اسلام آباد سے شروع ہوئی اور کراچی اور کوئٹہ تک پہنچ گئی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایک ہی سورج جب ایک مرتبہ غروب ہو چکا تھا تو اس کو دوبارہ غروب کروانے میں کیا حکمت تھی، تاہم بہت سے شہروں میں ان کا اپنا اپنا سورج غروب ہوا تھا، شاید اس لئے سب کی اہمیت الگ تصور کی گئی۔ ٹی وی چینلز کی کاروائیوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی یہی کوشش ہو کہ سورج کو کچھ دیر روک لیا جائے، مگر یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ تاہم نمائندوں نے سورج کے غروب ہوتے وقت سال بھر کی کارکردگی اور اگلے برس کی توقعات بیان کر کے خود کو مصروف کر لیا تھا۔ اگرچہ سال بھر میں یہ واقعہ 365 مرتبہ رونما ہوا، مگر اکتیس دسمبر کے غروب آفتاب کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ تھی کہ یہ سال کا آخری سورج تھا، اگلے برس بھی سورج کے طلوع و غروب کا عمل جاری رہے گا، یہ وہ کاروائی ہے جس کے لئے نہ کسی کی ڈیوٹی ہے، نہ وقت کی پابندی کا مسئلہ ہے اور نہ ہی انتظامات مکمل کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا متعین نظام ہے، جو اس کے ایک ”دُکُن“ کہنے سے ہو جاتا ہے اور ہو رہا ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کی گردش ہمارے لئے غور

کی چیزیں ہیں، انہی گردشوں سے شام و سحر کا تعین ہوتا ہے، انہی سے ماہ و سال کا حساب لگایا جاتا ہے اور انہی سے موسموں کی تبدیلی کی کہانی جنم لیتی ہے۔

کہنے کو تو سال پلک جھپکنے میں گزر جاتا ہے، مگر دیکھا جائے تو اس میں مہینوں، دنوں، گھنٹوں وغیرہ کی مقرر تعداد موجود ہے، بس اس کا استعمال ایک اہم مسئلہ ہے، جو

بحیثیت مجموعی ہماری پوری قوم کا مشترکہ ہے۔ وقت کی ایک بہت ہی بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ کبھی رکتا نہیں، جو اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا، کامرانی آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہولے گی اور جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وہ پیچھے رہ جاتے ہیں، دنیا آگے گزر جاتی ہے اور رکنے والے قدموں نے نیچے کچلے جاتے ہیں۔ جو فرد دوڑنے کے کسی مقابلے میں شریک ہی نہیں ہوگا، اسے کامیابی کہاں سے ملے گی؟ یہ فطری بات ہے کہ کسی بھی مقررہ مدت کے پورے ہونے پر جذبات بھی مخصوص قسم کے ہوتے ہیں، گزرے وقت کی اچھی اور بری یادیں، گزرے وقت کی مصروفیات سے مرتب ہونے والے اثرات، آنے والے وقت کی منصوبہ بندی، دعاؤں اور نیک تمناؤں پر بات چیت کی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ماضی کو بھول کر آگے سفر جاری رکھا جائے، ماضی خراب تھا تو رونے دھونے کی بجائے محنت اور منصوبہ بندی کی جائے، ماضی بہت اچھا تھا تو اس کی اچھائی کو برقرار رکھا جائے، اگر خدا نخواستہ تباہک ماضی چھین گیا ہے تو

اسے یاد کر کر کے بھی اپنا خون نہ جلایا جائے، بلکہ آگے کی فکر کی جائے۔ ماضی کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے، تاہم ماضی کو صرف یاد رکھنے اور سبق حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جانا چاہیے، اگر ماضی کی صورت میں کوئی تجربہ ہمارے سامنے نہیں ہوگا تو ہم غلطیاں دوبارہ دہرا سکتے ہیں، کہتے ہیں تاریخ خود کو دہراتی ہے، اس صورت میں تو ماضی سے سبق سیکھنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم وہ غلطیاں دوبارہ نہ کریں جو ماضی میں ہم سے سرزد ہو گئی تھیں۔ اسی طرح جو اچھے کام تاریخ میں درج ہیں، ان کا جاری رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔

اب فارغ بیٹھے رہنے کا زمانہ نہیں رہا، دیہات میں اب بھی بہت سے لوگ کچھ وقت فارغ ہی رہتے ہیں، ان کا مسئلہ تو یہ ہے کہ ان کا فرض کھیتوں میں کام کرنا ہے، فرصت کے اوقات میں وہ لوگ فارغ بیٹھ سکتے ہیں، مگر یہ روایت شہروں میں بھی عام ہے۔ شاموں کو لمبی محفلوں کا کلچر ہے، گھنٹوں بیٹھے بے مقصد گپ شپ کی جاتی ہے، اس مصروفیت کو وقت پاس کرنے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ہم وقت پاس نہیں کرتے، بلکہ وقت ہمیں ضائع کر رہا ہوتا ہے۔ صدے والی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو مختلف عمر میں مختلف کلاسوں اور اداروں میں پڑھ رہے ہوتے ہیں وہ بھی گھنٹوں کسی گلی، یا کسی گراؤنڈ کے کونے میں بیٹھ کر وقت ضائع کرتے ہیں، وہ کن معاملات پر گفتگو

کرتے ہیں، اس بارے میں زیادہ گہرائی تک جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ خود ضائع ہو رہے ہوتے ہیں۔ آئیے! نئے سال کی ابتدا میں ہی ہم سب تہیہ کریں کہ ہم وقت کے ضیاع کے نام پر اپنے آپ کو ضائع نہیں کریں گے، اپنے لئے، اپنے معاشرے اور ملک کی بہتری کے لئے کام کریں گے۔

صبح کسی دکان پر سودا خریدنے چلے جائیں، یا کسی کاری گر سے کوئی چیز بنوانے یا مرمت کروانے کے لئے پہلے گاہک آپ ہوں تو یاد رکھئے، کہ آپ کی جیب (دانستہ یا نادانستہ، مجبوراً یا سہواً) خالی نہیں ہونی چاہیے، ایسی صورت میں آپ سودا خریدنے یا کام کروانے سے محروم رہیں گے، کیونکہ کاروباری طبقے نے اس تصور کو اپنا اصول بنا لیا ہے کہ اگر پہلے گاہک کو ادھار دے دیا تو سارا دن ہی ادھار میں گزرے گا۔ کچھ اسی قسم کا تصور اپنے معاشرے کے دیگر شعبوں میں بھی پایا جاتا ہے کہ پہلا دن، پہلا کام، پہلی کوشش وغیرہ اگر کامیاب ہیں تو سمجھیں ترقی اور کامیابی کے راستے کھل گئے، اور اگر پہلے قدم پر ناکامی نے استقبال کیا تو نحوست، مایوسی اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ نئے سال کے دوسرے روز کے اخبار سے پہلے دن کی خبریں سامنے آئیں تو ہم نے غور کرنے کی کوشش کی کہ نئے سال میں کونسے روپے سامنے آئیں گے اور معاملات کیا رخ اختیار کریں گے۔

وزیراعظم میاں نواز شریف نے نئے سال کے پہلے ہی روز تاجروں کے لئے مختلف پیکیج تیار کر رکھے تھے، کالے دھن کو سفید کرنے کے عمل کو قانونی لبادہ

پہنانے کی کہانی تھی، دوسری طرف انہوں نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ ٹیکس کم کر دیا جائے گا اور اس کا طریق کار بھی آسان بنایا جائے گا تاکہ کوئی بھی ٹیکس دینے میں دشواری یا ناگوار محسوس نہ کرے۔ اس موقع پر ایک تاجر بھائی نے وزیراعظم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جذباتی ہو کر ایک عدد گولڈ میڈل کا اعلان فرما دیا، معاملہ اعلان پر ہی نہ رہا، بلکہ تاجروں کے وزیر یعنی اسحاق ڈار صاحب نے فرمایا کہ میڈل ہے تو پیش کیا جائے، سو تاجر صاحب کہ جنہوں نے اندر خانے کسی سے تو رابطہ کر ہی رکھا ہوگا، فوراً میڈل نکالا اور میاں صاحب کے گلے میں ڈال دیا خالص سونے کا مذاق بھی تاجر کے لئے کسی انعام سے کم نہ ہوگا۔ ایک اور معروف تاجر کے لئے میاں صاحب نے آفر پیش کی کہ اگر الیکشن وغیرہ کا موڈ بن جائے تو ہمارے ساتھ رابطہ کرنا۔ اب تجارت ہر شعبے میں داخل ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ مضبوط معاشی پوزیشن ہی کی وجہ سے سیاست میں کامیابی کے امکانات ہیں، ورنہ موجودہ سیاست میں عام آدمی کا عمل دخل صرف نعرے لگانے اور کسی تاجر سیاستدان کی حمایت تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ گویا سال کے پہلے روز ہی میاں نواز شریف کو ان کی مقبولیت اور محبت کا تحفہ مل گیا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ان کا یہ سال اسی حکمرانی سرشاری میں گزرے گا۔ نئے سال کے پہلے ہی دن جہانگیر ترین نے قومی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے

حلف اٹھالیا، جہاں یہ ان کے لئے خوشگوار اور تاریخی لمحات تھے وہیں حکومت کے لئے وہ مستقل سر درد بن جائیں گے، انہوں نے اپنے پہلے ہی خطاب میں دھاندلی وغیرہ کے بارے میں روایتی باتیں کیں، تاہم ڈھائی ارب روپے کا معاملہ ذرا مختلف ہے، وزیراعظم نے تو الیکشن سے قبل اپنے امیدوار کو کامیاب کروانے کے لئے اس خطیر رقم کا اعلان کیا تھا، ان کا تصور بھی نہیں تھا کہ ان کا امیدوار ناکام ہو جائے گا۔ اب اگر حکومت اپنے وعدے کے مطابق ڈھائی ارب روپے لو دھراں کے مختلف پراجیکٹس کے لئے جاری کرنے پر مجبور بھی ہو جاتی ہے، تو اس کے پاس یہ آپشن تو موجود ہے کہ وہ یہی رقم اپنے دوسرے ممبران کے ذریعے استعمال کروائے، تاکہ اس کا کریڈٹ حکومت اور اس کے اپنے نمائندوں کو مل سکے۔ ڈھائی ارب کسی بھی نمائندے کے ذریعے استعمال ہوں، لگیں گے تو لو دھراں پر، کریڈٹ لینے کے لئے جہاں حکومتی ممبران آگے آئیں گے وہاں جہانگیر ترین بھی اسی صف میں کھڑے ہوں گے۔ سال کے پہلے ہی روز سرکاری سکول کھل گئے، مگر بچے نہیں آئے تاہم اساتذہ سکول پہنچ گئے، اس سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں کہ سال بھر بچے چھٹیاں تلاش کرتے رہیں گے، اور موقع پاتے ہی مرضی کی چھٹی کریں گے۔ دوم یہ کہ اساتذہ چاہیں یا نہ چاہیں، انہیں سکول آنا پڑے گا، اس سے حکومت کی اپنے ملازمین پر گرفت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، کہ اب اساتذہ بہت حد تک سکول آنے کے پابند ہو چکے ہیں۔ پاکستانی گلوکار عدنان سمیع نے بھارت کی شہریت اختیار کر لی اور اسی تناظر میں دیکھا جائے تو

ایک اور پاکستانی گلوکار راحت علی خان کو بھارت سے ڈی پورٹ کر دیا گیا، تاہم بعد میں وہ دبئی سے دہلی پہنچے تو انہیں پروگرام میں جانے دیا گیا۔ یہ دونوں متضاد واقعات بھی نئے سال کے ابتدائی لمحات میں بھارت میں پیش آئے، ان دونوں واقعات سے بھارت کی پاکستان سے دشمنی کی بُو آتی ہے، اور ان میں ”اگلا برس کیسا گزرے گا؟“ کا واضح جواب موجود ہے۔

بھٹہ جات اور چائلڈ لیبر

الحراہال میں وزارتِ محنت، پولیس اور انتظامیہ کے افسران اکٹھے ہوئے، سر جوڑ کر بیٹھے، مسئلے پر غور و فکر کیا اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ معاملہ زیر بحث یہ تھا کہ بھٹہ جات پر چودہ سال سے کم عمر بچوں سے کام نہ لیا جائے۔ اس کے لئے پولیس انتظامیہ نے بھٹہ جات کے مالکان کو سات روز کی مہلت دی، کہا گیا کہ اگر سات روز کے بعد چودہ سال سے کم عمر کا کوئی بچہ بھٹہ پر کام کرتا پایا گیا تو بھٹہ مالک یا ٹھیکیدار کے خلاف سخت قانونی کاروائی ہوگی۔ اس سیمینار میں مندرجہ بالا محکمہ جات کے افسران کے علاوہ بھٹہ مالکان بھی موجود تھے۔ خبر سے یہی تاثر ملتا ہے کہ جس صاحب نے بھی گفتگو کی اس میں بھٹہ مالکان کے بارے میں سخت الفاظ ہی استعمال کئے گئے، اور مسلسل دھمکی آمیز انداز اپنایا گیا۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ہم سب لوگوں کا یہاں اکٹھے ہونے کا مقصد یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ پنجاب کے واضح احکامات آپ لوگوں تک پہنچا دیئے جائیں۔ بھٹہ مالکان کے لئے یہ بھی حکم ہے کہ وہ والدین کو مجبور کریں کہ بھٹہ مزدوروں کے بچے کام کرنے کی بجائے سکول جائیں۔ بھٹہ پر چائلڈ لیبر کو قانونی جرم اور گناہ قرار دیا گیا۔ لاہور بھٹہ یونین کے صدر نے بھی خطاب کیا، حکومت کو اپنے مکمل تعاون کا یقین

دلایا، اور بھٹے مزدوروں کو مجبور کر دینے کی بھی یقین دہانی کرائی کہ ان کے بچوں کو سکولوں میں داخل کروایا جائے گا۔ تقریب میں انتظامیہ نے یہ بھی بتایا کہ اس سلسلہ میں ہر ہفتے جائزہ میٹنگ ہوا کرے گی، جس میں فیصلوں پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جائے گا۔

یہ خبر چونکہ صرف لاہور کی ہے، ہوتا بھی یہی ہے کہ بات لاہور سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد جلد یا بدیر قریب وجوار اور بالآخر دور دراز تک پہنچ جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ پہلے لاہور میں اس حکم پر عمل کر کے دوسروں کے لئے ماڈل قائم کر دیا جائے گا۔ یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ چائلڈ لیبر کو صرف بھٹے جات کے ساتھ نھتی نہیں کرنا چاہیے، یہ لعنت، یا جرم، یا گناہ تو گلی گلی میں ہو رہا ہے، کوئی بیکری ہے تو اس کے کچن میں چائلڈ لیبر سے کام لیا جاتا ہے، کوئی ورکشاپ ہے تو وہاں دسیوں لڑکے کام سیکھ رہے ہیں، کوئی حجام ہے تو اس کی دوکان میں بھی لڑکے کھڑے ہیں، اسی طرح جس شعبے پر بھی نگاہ ڈالیں، اس میں بچے کام سیکھ رہے ہیں۔ بہت سے کام میں تو محض مزدوری ہی ہوتی ہے، وہ جتنا کام بھی کر لے وہ اس کا چند روپوں کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکالتا۔ البتہ جو بچے کسی کاریگر کے پاس کوئی کام سیکھتے ہیں، ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے، تاہم ایسے مقامات پر بھی لڑکوں کو ”ہنرمند“ بننے تک سالہا سال ”چھوٹا“ بن کر رہنا پڑتا ہے، استاد کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس کی طرف سے

مغلطات اور مار پٹائی کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ’چھوٹے‘ بڑے ہوتے جاتے ہیں اور یہ معمول جاری ہے۔ ممکن ہے ان لڑکوں یا بچوں کی تعداد میں کچھ معمولی کمی آئی ہو، مگر واضح تبدیلی قطعاً نہیں آئی۔

حکومت کے دعووں اور منصوبوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چائلڈ لیبر اول تو ختم ہو چکی ہے، یا ایکٹ آدھ برس میں اس کا وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومتی اقدامات میں کاروائیاں زیادہ ہوتی ہیں، عمل کی نوبت کم آتی ہے۔ حکومت نے سکولوں میں داخلے بڑھانے کے بہت زیادہ اہداف مقرر کر رکھے ہیں، مگر انہیں بھی بوگس طریقے سے ہی پورا کیا جاتا ہے، کاغذی کاروائی مکمل کر لی جاتی ہے، جس کا زمینی حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ کاغذات میں پانچ سے سولہ سال کے لاکھوں آؤٹ آف سکول بچے داخل کر لئے جاتے ہیں، مگر نہ تو سکولوں میں بچوں کی حاضری میں اضافہ ہوتا ہے، اور نہ ہی چائلڈ لیبر میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اگر لاہور انتظامیہ نے بھٹہ جات پر چائلڈ لیبر کے خاتمے کا تہیہ کر لیا ہے تو یہ اقدام بھی سراہے جانے کے لائق ہے، مگر ضرورت کاروائیوں کی بجائے عمل کی ہے۔ دوسری طرف بھٹہ جات پر کام کرنے والے مزدوروں کے بچوں کے لئے پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے اپنی سکیم ”نیو سکول پروگرام“ کا اعلان کیا ہے، آغاز میں جنوبی پنجاب کے تین اضلاع ملتان، لودھراں اور مظفر گڑھ شامل ہیں، ان

سکولوں میں بھٹہ مزدوروں کے بچے اور دیگر غریب اور مستحق بچے تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اس منصوبے کو اصلی اور عملی قرار دیا جاسکتا ہے، جس میں باتیں نہیں کام ہوگا۔ اسی سکیم کو شہروں کے مضافات میں نہایت ہی غریب آبادیوں اور دور دراز کے علاقوں میں جاری کر کے چائلڈ لیبر کا خاتمہ اور شرح خواندگی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

نہ جانے یہ منصوبہ کس زر خیز ذہن کی پیداوار تھی، مگر نہ اس سے کوئی زر خیزی سامنے آئی اور نہ ہی پیداوار حاصل ہو سکی، ہاں البتہ اس کے لئے حکومتی کارندوں نے نہایت ہی محنت اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ چار برس قبل وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے ”پکن گارڈنگ“ کا حکم جاری کیا تھا، کہا گیا تھا کہ لوگ گھروں میں سبزیاں اگائیں، بات صرف گھروں تک ہی محدود نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے بھرپور منصوبہ بندی کی گئی تھی، سبزی اگانے کے طریقے بتائے گئے تھے، سلسلہ سکولوں کالجوں تک پھیلا دیا گیا تھا، کالونیوں کے گرین بیلٹ پر بھی سبزی اگانے کا مشورہ تھا، گھروں کی مخصوص چھتوں پر بھی سبزی اگائی جانی تھی، پرانے بڑے سائزر کے ٹائر کو کاٹ کر اس میں مٹی ڈال کر اسے بھی ایک چھوٹی سی کیاری بنانے کی بات تھی، یہ کام گھریلو سطح پر کرنے کا حکم تھا۔ اس سرکاری حکم نامے کے پیچھے یقیناً غریب و امیر کی بہبود ہی پیش نظر ہوگی، کہ سب کو گھر میں تیار شدہ، خالص پانی سے پلے بڑھی اور اپنے سامنے تیار ہونے والی سبزی میسر ہوگی، سب سے بڑی بات یہ کہ اس پر خرچ حد سے کم ہوگا۔ حکومت نے صرف حکم ہی جاری نہیں کیا، بلکہ محکمہ زراعت کے ذریعے سبزیاں

اگانے کے لئے بھرپور رہنمائی کا بندوبست بھی کیا گیا، پورا محکمہ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق عوام الناس کو آگاہ کرنے کے لئے میدان میں نکل آیا تھا، افسران بیانات جاری کر رہے تھے، سیمینار منعقد ہو رہے تھے، اخبارات میں اشتہارات چل رہے تھے، پمفلٹ بنائے جا رہے تھے۔ کوئی دن نہ گزرتا تھا کہ محکمہ زراعت کے ضلعی افسر کچن گارڈنگ کے فوائد قوم کو نہ بتا رہے ہوں۔ ایسے لگتا تھا کہ پورا محکمہ تمام دیگر کام چھوڑ کر (جو کہ زیادہ تر کاروائیوں پر ہی منحصر ہیں) چھوڑ کر صرف کچن گارڈنگ کی ترویج کے لئے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے سرکاری ملازمین کا فرض بھی یہی ہے کہ جو حکم حاکموں کی طرف سے ملے اسے حرف آخر تصور کرتے ہوئے عمل کروانے کے لئے نکل کھڑے ہوں، عوام تک رسائی اور ان کی آگاہی کے لئے ایسا ڈھول بیٹھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ حکومت نے ایک تو اچھا کیا کہ اپنے محکمہ مذکور کو کوئی کام بتا دیا، کسی کام پر لگا دیا، مگر افسوس کہ عوام نے محکمہ زراعت کے افسران و اہلکاران کی کوئی بات سن کر نہ دی، یہ بھی نہ سوچا کہ اس مشورے کے پیچھے پنجاب کے متحرک ترین وزیر اعلیٰ کا حکم ہے، عوام نے کسی مشورے پر کان نہ دھرے، کسی نے سبزی نہ اگائی۔ محکمہ زراعت نے اگرچہ اپنی پوری توانائیاں کچن گارڈنگ پر صرف کردی تھیں، ایسا کرنے کے لئے محکمہ نے عوام کو بیج کی فراہمی کا پروگرام بھی بنایا تھا

جس کے لئے ایوب ریسرچ سینٹر فیصل آباد سے گرمیوں اور سردیوں کی سبزیوں کے نئے اور جدید بیج بھی عوام کو فراہم کئے جانے تھے، اس غرض کے لئے پنجاب بھر میں پانچ لاکھ ایکس ہزار 'سیڈ کٹس' بھی تیار کر کے تقسیم کی گئیں، ایکٹ کٹ پچاس روپے کی تھی، مگر یہاں ایک مرتبہ پھر افسوس کی ضرورت ہے کہ ان سیڈ کٹس کے اجراء کے باوجود لوگوں کو غیر تصدیق شدہ اور غیر معیاری بیج دیئے گئے، جن کی وجہ سے پیداوار مناسب نہ ہو سکی، اور حکومت کے مقرر کردہ اہداف پورے نہ ہو سکے۔ رفتہ رفتہ یہ کام بند کر دیا گیا، اول اول یہ بھی طے پایا تھا کہ ان طریقوں سے لگائی جانے والی سبزیاں اگر ضرورت سے زیادہ ہونگی تو انہیں محکمہ زراعت ہی خریدے گا، مگر نوبت یہاں تک نہ آ سکی، کیونکہ سبزیوں کے فروخت کرنے کا موقع تب آتا اگر سبزیاں اگی ہوتیں، اس مہم میں چونکہ عوام نے دلچسپی ہی نہیں لی، اور اپنے ہی فائدے کے ایک سرکاری حکم کو نظر انداز کر دیا، اب حکومت کا فرض یہ تو نہیں تھا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر سبزیاں کاشت کرے، اس کی دیکھ بھال کرے اور پیداوار کو خریدنے کا وعدہ بھی نبھائے۔ حکومت کی اس غیر ضروری مہم پر ایکس کروڑ روپے سے زائد کا خرچ اٹھا، اور وہ ضائع ہو گیا۔ یہ ایسی مہم تھی، جو کسی حد تک عوام کی ضرورت ہونے کے باوجود عوام میں شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی، سرکاری افسران و کارکنان چونکہ مجبور اور پابند ہیں اس لئے انہوں نے اپنا فرض نبھایا۔ حکومتیں اس قسم کی مہمات وقتاً فوقتاً چلاتی رہتی ہیں، جس محکمہ کا ان سے تعلق ہوتا ہے، انہیں

نیا کام مل جاتا ہے، افسران وغیرہ اس قسم کے تلوں سے کچھ تیل بھی کشید کر لیتے ہیں،
کروڑوں اجاڑ کر ہم اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

ہم نے آگے جانا تھا، منور حسین سندھا کا سکول راستے میں پڑتا تھا، ہم نے انہیں اتارا اور واپسی پر ساتھ لینے اور ان کا سکول دیکھنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ واپسی پر سکول آئے تو عجیب منظر دیکھا، گیٹ کے باہر تک چھڑکاؤ ہوا ہوا تھا، سکول کے اندر باقاعدہ رکاوٹ اور آنے والوں کے نام کی انٹری کا بندوبست تھا، ایک طرف سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کی نہایت سلیقے سے لمبی قطار تھی۔ بائیں ہاتھ گراؤنڈ میں مکمل فرنیچر کے ساتھ دو کلاسیں علم کے حصول میں مصروف تھیں، آگے ایک دو جگہ پر بچے ٹیبلٹ دے رہے تھے۔ کچھ ڈیسک اور بنچ رنگٹ کئے جا رہے تھے، (ہیڈ ماسٹر صاحب نے بتایا کہ یہ سکول ملازمین ہیں جنہیں فراغت تھی) ان کا سکول جنوبی پنجاب کی ایک پسماندہ تحصیل لودھراں میں ہے، شہر سے زیادہ دور تو نہیں، مگر خالص دیہاتی ماحول میں واقع ہے، ڈاکٹر منور کو یہاں آئے ہوئے ایک سال سے کم عرصہ ہوا ہے۔ انہوں نے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے، اب وہ یہاں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ کسی بھی اچھے ادارے کے دفتر سے کم نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک دھوتی پوش فرد اندر داخل ہوا، اس نے کچھ فائلیں الماری میں رکھیں، ایک آدھ کام اور کیا اور باہر چلا گیا۔

منور صاحب نے بتایا کہ یہ فرد سا لہا سال سے درجہ چہارم کا ملازم ہے، مگر اس نے کبھی سکول میں قدم نہیں رکھا تھا، کیونکہ اسے مقامی ایم پی اے نے بھرتی کروایا تھا، اس کی زمین بھی ہے، یہ صرف تنخواہ لینے کی حد تک ملازمت کر رہا تھا۔ جب سے وہ سکول میں آئے ہیں، انہوں نے ریکارڈ دیکھا تو یہ فرد بھی سکول کے ملازمین میں موجود تھا، جب اسے بلوایا گیا تو اس نے خود آنے کی بجائے ایم پی اے سے فون کروایا، مگر ہیڈ ماسٹر صاحب کے قانونی دباؤ پر اسے سکول آنا پڑا۔

جب سے موجودہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے سکول میں سربراہی کے فرائض سنبھالے ہیں، انہوں نے آتے ہی اساتذہ کو حاضری کو یقینی بنایا، کیونکہ بعض اساتذہ بھی ایسے تھے جو یا تو کسی سیاست دان کے نام پر سکول سے غیر حاضر رہ کر تنخواہ وصول کرتے تھے، یا پھر یونین باری وغیرہ کے سہارے اپنا دباؤ بنا کر رکھتے تھے، مگر نئے ہیڈ ماسٹر کے سامنے ان کی ایکٹ نہ چل سکی۔ اس کے بعد انہوں نے ہر کلاس کی الگ سے حاضری منگوائی تو معلوم ہوا کہ ہر کلاس میں کم سے کم پندرہ بیس ایسے بچوں کے نام موجود ہیں جن کا سکول میں کوئی وجود ہی نہیں۔ اس جعلی بھرتی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ’اوپر‘ سے داخلوں کا دباؤ ہوتا ہے، اس لئے ای ڈی اور ایجوکیشن اور ڈسٹرکٹ مانیٹرنگ آفیسر وغیرہ کو خوش کرنے کے لئے یہ کام کیا جاتا ہے۔ منور صاحب نے جعل سازی کو ختم کر کے اصل بچوں کے

نام لکھنے کی روایت قائم کی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ نئے داخلوں کے موقع پر سکول کی اصل حاضری اس جعل سازی والے زمانے کے قریب پہنچ گئی۔ منور صاحب نے ہمیں سکول کا وزٹ کرواتے ہوئے بتایا کہ سکول میں کوئی بھی افسر کسی بھی وقت آجائے، سکول کے کسی کونے میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا گرا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔ سکول کا کوئی استاد تو دور کی بات ہے کوئی ایکٹ بچہ بھی میری چٹ کے بغیر سکول کے گیٹ سے باہر نہیں جاسکتا۔ سکول میں ڈسپلن مثالی ہے جبکہ مار نہیں پیار کے سرکاری حکم پر مکمل عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔

سکول عمارت کے آخر میں انہوں نے ہمیں کچھ کمرے دکھائے، جن کی چھتیں اتار دی گئی تھیں اور دیواریں گرا دی گئی تھیں، ملبہ کو سلیقہ سے الگ الگ کر کے رکھا جا رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت نے سکول کے لئے چند لاکھ روپے دیئے ہیں، ٹھیکیدار سے بات کی گئی ہے، مگر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم خود اپنی نگرانی میں کمرے بنوائیں گے، جن پر ٹھیکیداری نظام سے بہت ہی کم لاگت آئے گی۔ جس سے تمام بچوں کے لئے کلاس روم بھی تعمیر ہو جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ بے شمار بچے سکولوں سے باہر بھی موجود ہیں، جنہیں سکول لانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، مگر اس میں ان پڑھ والدین بھی بہت بڑی رکاوٹ ہیں، ان کے رویے بھی قابلِ افسوس ہوتے ہیں۔ سکول کے اساتذہ کو پڑھانے، ڈسپلن قائم کرنے اور بچوں کی تربیت وغیرہ کے معاملات کے لئے قائل کرنے میں کافی

مشکلات پیش آئی ہیں، منور صاحب کی مستقل عادت ہے کہ وہ تمیں کلومیٹر سے زائد سفر کر کے سکول وقت سے آدھ گھنٹہ قبل پہنچ جاتے ہیں۔ سکول سے نکلنے وقت ہم لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ کوئی دیانتداری سے کام کرنے والا ہو تو سکول مشالی ہو سکتا ہے، خواہ وہ دیہات میں ہو یا شہر میں۔

دس مرلہ کے گھر میں ایک درخت

اب پنجاب سرسبز ہونے کو ہے، یہ مت جانے کہ وزیراعظم نے اربوں روپے کا جو ٹیکج کسانوں کو دینے کا اعلان کیا ہے اس کے نتیجے میں چار جانب سبزہ ہی سبزہ ہو جائے گا، اور ہر طرف کھیتیاں لہلہاتی دکھائی دیں گی، بلکہ یہاں جس سکیم سے سبزہ ہوگا اس کا کھیتوں سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ شہروں میں ابھرے گا۔ پنجاب کو بہت سے اعزاز حاصل ہیں، بہت سے خوابوں پر یہ دعویٰ بھی ہوتا ہے کہ تعبیر اب ملی کہ اب ملی۔ حکمران اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے میں دیر نہیں لگاتے، یہ الگ بات ہے کہ عوام اول تو خواب دیکھتے ہی نہیں، کیونکہ جو کوئی سکون کی نیند سوئے گا خواب بھی وہی دیکھ پائے گا، اگر عوام کبھی خواب دیکھ بھی لیں تو وہ ڈراؤنے ہی ہوتے ہیں، کیونکہ جو کچھ ان کے دل و دماغ میں ہوتا ہے وہی تصورات اور تخیلات میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح 'پڑھا لکھا پنجاب' کی سکیم ہے، جیسے 'پرامن پنجاب' کی بات کی جاتی ہے، خوشحال پنجاب' کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اسی طرح اب شہروں میں سرسبز پنجاب کی کہانی میں رنگ بھرے جائیں گے۔ پنجاب حکومت نے ایک حکمنامہ جاری کیا ہے کہ دس مرلہ کے گھر میں ایک درخت کو لازمی قرار دیا گیا ہے، ضلعی حکومتوں اور محکمہ مال کو پابند کیا گیا ہے کہ رجسٹری کے وقت اس بات

کا خاص خیال رکھا جائے کہ دس مرلہ کے گھر میں ایک درخت کا لگایا جانا لازم ہے، اگر کوئی درخت نہ لگائے یا درخت کاٹے تو اسے ایک سال تک قید کی سزا دی جائے گی۔ حکومت نے یہ اقدام اس لئے کیا ہے کہ معاشرے میں موسمیاتی تغیرات سے حالات خراب ہو رہے ہیں، درخت لگانے سے یقیناً بہتری کی توقعات ہیں۔

پنجاب حکومت کا یہ فیصلہ بہت اہمیت کا حامل ہے، مگر زمینی حقائق مختلف ہیں۔ اپنے ہاں بے شمار آبادیاں کسی ترتیب سے بغیر ہی معرض وجود میں آئی ہوئی ہیں، جہاں گلیاں بھی سیدھی نہیں، جس کا دل چاہا اس نے گلی میں اپنی دیوار آگے کر کے بنالی، جس کا موڈ بنا اس نے ہمسایہ سے دو فٹ اونچا کر کے گھر بنا لیا، جس کے دل میں آئی اس نے گلی میں اپنے گھر کی سیڑھی چڑھالی، گویا جتنے لوگ اتنے عمل سامنے آتے ہیں۔ اس لئے اس بے ترتیب قوم کو کسی ترتیب میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اپنے ہاں یہ مسئلہ بھی درپیش ہے کہ کسی گھر میں رہائش پذیر خاندان بڑا ہے، جس کے افراد مشکل میں پورے آتے ہیں، پودا لگانے کی کوئی جگہ ہی نہیں بچتی۔ ہر طرف کمرے اور راہداریاں ہوتی ہیں۔ ان گھروں پر قانون لاگو کرتے وقت بھی زمینی حقائق کو مد نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ ہاں جن گھروں میں کمرے کم ہیں، وہاں پودوں کا لگایا جانا صحت کے لئے بھی اچھا ہے اور موسمیاتی تغیرات میں بھی بہتری کی طرف قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

اپنے ہاں سڑکوں پر بہت سی جگہ سڑک کے حصے کی ہوتی ہے، بعض اوقات وہاں فٹ پاتھ بنا دیا جاتا ہے، مگر جگہ خالی ہو، یا اس پر فٹ پاتھ ہو، دکان داروں کے لئے وہ دونوں برابر ہیں، اکثر دکان داروں نے اپنا سامان باہر فٹ پاتھ پر بھی سجا رکھا ہوتا ہے، جہاں سے لوگوں نے گزرنا تھا، یا جہاں درخت یا پودا لگایا جانا مقصود تھا، وہاں کاروبار ہو رہا ہے۔ شہروں میں سڑکوں کی توسیع کے بھیٹ جس طرح دسیوں برس پرانے درخت چڑھ جاتے ہیں، وہ کہانی الگ ہے، کہا جاتا ہے کہ تعمیر کے لئے کچھ تخریب بھی کرنی پڑتی ہے، مگر ایک بڑے درخت کو کاٹنے کے بعد وہاں چھوٹے یا زیادہ درخت نہیں لگائے جاتے بلکہ وہاں تو سڑک یا کوئی پلازہ وغیرہ بن جاتا ہے، موسم میں تغیرات کیوں پیدا نہیں ہونگے۔ نہروں کی حالت دیکھ لیں، جہاں چھوٹی نہروں اور راجا ہوں کے کناروں پر درختوں کے جنگل ہوتے تھے، چھوٹی نہر پر پورا سفر سائے میں گزرتا تھا، اب میلوں کے میل کوئی درخت نہیں، درخت خشک ہوتے گئے، بیماری تھی تو کوئی علاج نہ ہوا، ناقابل علاج تھی تو نئے درخت نہ لگائے گئے، جو درخت خشک ہو گئے، متعلقہ محکمہ سے ملی بھگت کے ساتھ یا رلوگٹ اکھاڑ کر لے گئے۔ جنگلوں کی بات کریں تو کوئی بات کرنے کے لئے بچتی ہی نہیں، کیونکہ جنگلوں کو بھی محکمہ جات دیمک کی طرح کھا رہے ہیں، جنگل بھی کم ہو رہے ہیں۔ شجرکاری کی بات کی جائے تو حکومت ایکٹ نہیں دو مہمات چلاتی ہے، ”شجرکاری“ سال میں دو مرتبہ ہوتی البتہ ”شجر اکھاڑی“ کی مہم سارا سال سرکاری سطح اور نجی سطح پر جاری

رہتی ہے۔ کیا درخت نہ لگانے یا اکھاڑنے پر ایک سال کی سزا سب پر لاگو ہوگی؟ گھروں
میں قانونی طور پر درخت لگوانے کی حکومت کو شش اچھی ہے، مگر دوسری اہم اور
ضروری جگہوں پر درخت لگوانا اور انہیں پروان چڑھانا بھی حکومت کا ہی فرض ہے۔

ریلوے کے مزدور رہنا نے خود کو زنجیروں میں جکڑا، گلے میں بجلی اور گیس کے میسٹر ڈالے، سر پر چولہا رکھا، اور اس پر دیکھی، دیکھی کا خالی ہونا بھی ایک اہم بات ہے، اس سے صرف گیس اور بجلی کا رونا نہیں رویا جاتا، بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ دیکھی خالی ہے، اس میں ڈالنے کے لئے پیاز لہسن یا دیگر اشیا بھی اس کی قوت خرید سے باہر ہو چکی ہیں، ہاتھوں میں سوئی گیس اور بجلی کے بل اٹھائے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ احتجاج کرتے سڑک پر آگیا۔ مزدوروں نے یہ احتجاج بجلی اور گیس کی بندش کے خاتمے کے لئے کیا۔ احتجاج کرنے والوں نے یہ کہا کہ ان کے بچے ناشتے کے بغیر سکول جاتے ہیں، انہوں نے احتجاج کا سلسلہ ٹرین تک بڑھاتے ہوئے ریل کا پیہر روک دیا۔ مزدور رہنا کا جب ان تمام جکڑ بندیوں میں آیا ہوگا تو یہ منظر کتنا منفرد ہوگا، لوگوں نے اسے کتنی دلچسپی سے دیکھا ہوگا، میڈیا والوں نے اس کی تصویر کشی کی ہوگی، بہت سے لوگ اسے دیکھ کر ہنس بھی رہے ہونگے۔ وہ ظاہر ہے مزدور رہنا ہے، اس لئے اس نے اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کرنا تھی، اسی لئے اس نے تمام لوگوں کا دکھ اپنے گلے میں ڈال لیا، اپنے سر پر لاد لیا اور اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ ان کا فرض تھا کہ وہ احتجاج کرتے، اگر کسی

کو تکلیف ہے تو رونا تو اس نے ہے، اگر وہ نہیں روئے گا تو اس کی بات کون سنے گا، مگر بد قسمتی سے اپنے ہاں رونے والے کی کوئی نہیں سنتا۔ بلکہ سرکاری کھاتے میں تو یہ ہوتا ہے کہ احتجاج کرنے والوں کو سرکاری طور پر دبا دیا جاتا ہے، اس کو مختلف مقدمات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح نجی کاروبار والے لوگ بھی جب احتجاج کرتے ہیں تو حکومت ان کو قابو میں لانے کے لئے مقدمات کا ہتھیار استعمال کرتی ہے، اگلی مرتبہ وہ لوگ احتجاج کرنے سے قبل سوچتے ہیں کہ آیا ہم اپنا کاروبار چلائیں یا عدالتوں میں مقدمات بھگتیں۔ سرکاری ملازمین کو احتجاج سے روکنا انتہائی آسان ہے، کیونکہ ان کی جان سرکاری طوطے میں ہوتی ہے۔

لوگ احتجاج کرتے ہیں، مگر جس کے سامنے احتجاج کیا جاتا ہے وہ یا تو سماعت کی قوت سے محروم ہیں، یا ان کی بصارت کام نہیں کرتی، یا ان کے حواس جواب دے گئے ہیں۔ احتجاج کا فائدہ تب ہی ہے جب ان کی بات سنی جائے، اس پر غور کیا جائے، توجہ دی جائے، اگر مطالبہ جائز ہے تو اسے حل کرنے کی کوشش کی جائے اگر ناجائز یا بلا ضرورت ہے تو اسے نظر انداز بھی کیا جائے اور اس کی حوصلہ شکنی بھی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہاں تو روایت ہی الٹی ہے، معقول و نامناسب کا کوئی فرق ہی نہیں، ہر احتجاجی کے خلاف حکومتی لوگوں کا ایک ماسنڈ سیٹ ہے، کرسی پر بیٹھا ہوا ہر افسر احتجاج نام کی چیز سے سخت چڑرکھتا ہے، احتجاج

کا نام سنتے ہی وہ غصے میں آ جاتا ہے، اس کی برداشت کا پیمانہ لبریرز ہو جاتا ہے۔ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہی حال سائل کا بھی ہے، جب کسی کے گھر میں بجلی نہیں ہوگی اور پانی کی ٹینکی بھی خالی ہوگی، تو گھر کا نظام کیسے چلے گا، سکول جانے کے لئے بچے کیسے تیار ہوں گے، چلیں مانا کپڑے تو اس وقت بھی استری کئے جاسکتے ہیں جب بھی بجلی آئے، مگر منہ تو رات کو دھو کر نہیں سویا جاسکتا، اور اسی طرح ناشتہ بھی صبح ہی کرنا پڑتا ہے، یہ کام بھی رات کو کر کے سونے کا نہیں ہے۔

حکومت سی این سٹیشنز کے کھولنے کا اعلان بھی کرتی رہتی ہے، یہ کہانی اور ہے کہ سی این جی سٹیشنز والوں نے اربوں روپے کا نقصان کر لیا، کسی نے اپنے بندوبست کو پٹرول پمپ بنا لیا تو کسی کے ابھی تک بند پڑے ہیں۔ مگر حکومت ہے کہ گیس کے بارے میں کوئی درست اور آخری فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔ اب گیس عوام کی بنیادی ضرورت ہے، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، اور یہ سہولت ایک طویل عرصہ سے عوام کو حاصل تھی، آخراً اب کوئی آفت آئی ہے کہ گیس منظر سے غائب ہو گئی ہے، لوگوں کے چولہے ٹھنڈے ہو گئے ہیں، کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ حکمرانوں کے کانوں پر تو جوں ریگتی نہیں، دیگر ذمہ داران اور افسران کو کسی کی کوئی فکر نہیں۔ حکومت کی نگاہ میں شاید گیس بجلی کی لوڈ شیڈنگ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، کیونکہ حکمرانوں کو تو ان مسائل کی شدت کا علم ہی نہیں

ہو سکتا کیونکہ ان کا واسطہ نہیں پڑتا، مگر چھوٹی دنیا میں رہنے والے چھوٹے وسائل والے
عوام کے لئے یہ زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ حکمرانوں نے گڈ گورننس میگا پروجیکٹس کو
سمجھ رکھا ہے، جب کہ عوام کی پہلے اور بہت سی ضرورتیں ہیں، یہ پوری کر کے عوام کو
خوش اور مطمئن کیا جاسکتا ہے۔

ہنسنا یا قہقہہ لگانا ہر کسی کے بس کا روگ بھی نہیں ہوتا، بعض لوگ بڑے معقول لطیف پر بھی مسکرانے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، وہ خود اس قدر بخیل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے چہرے اور مزاج کی بناوٹ ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی بات پر ہنس کر نہیں دیتے۔ بعض صاحبان ایسے ہوتے ہیں جو معمولی باتوں پر بھی کھلکھلا کر ہنستے ہیں، اور ان کی ہنسی کے آفر شاکس بھی جاری رہتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنی ہی بات پر نہایت زور دار طریقے سے نہ صرف خود ہنستے ہیں، بلکہ ساتھ والے فریق سے بھی ان کا اصولی تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ بھی ہنسنے، یہ نہایت مشکل ڈیوٹی ہے، جسے نبھانا آسان کام نہیں، اور ایسے لوگوں کے ساتھ ہم نوائی بھی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اور بعض صاحبان ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جنہوں نے ہنسی کو کبھی اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا۔ بعض قہقہوں میں بسا اوقات بڑی فرعونیت وغیرہ کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں، ایسی ہنسی اکثر فلموں میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے اپنے معاشرے میں دکھ زیادہ ہیں اور خوشیاں کم، تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انفرادی طور پر زیادہ تر لوگ مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنے ہاں دہشت گردی، مہنگائی، بد امنی، بے روزگاری، بیماریاں اور اسی قسم کے دیگر مسائل ہیں جن کی وجہ سے قہقہوں کا زمانہ نہیں رہا، اُن

میں کچھ کمزوری آگئی ہے، اب قہقہے ہنسی میں بدل گئے ہیں، ہنسی مسکراہٹ کا روپ دھار چکی ہے اور مسکرانے والے چہرے سنجیدہ ہو چکے ہیں اور جو سنجیدہ تھے وہ غمی چہرے پر سجائے پھر رہے ہیں، یہ تمام تبدیلیاں حالات کی بنیاد پر ہیں، حالات بہتر ہونے کی صورت میں یہ تمام معاملات اس کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔

ہنسی کو غم کا علاج بتایا جاتا ہے، دراصل غم ایک ایسا مرض ہے، جو ادویات سے درست ہونے والا محسوس نہیں ہوتا، چونکہ یہ تصورات کی بیماری ہے اس لئے اس کا علاج بھی تصوراتی طریقے سے ہی ممکن ہے۔ یار لوگ کسی بھی غمگین کے پاس جاتے ہیں، اسے دلاسہ دیتے اور غم کو مار بھگانے کا مشورہ دیتے ہیں، مگر غم کی حقیقت تو وہی جانتا ہے جس نے غم پال رکھا ہے، یا جسے غم نے اپنے گھٹنے میں جکڑ رکھا ہے۔ غم کو ختم یا کم کرنے کے لئے اس کمی کو پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے غم نے ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں، مثلاً اگر کسی بیماری کی وجہ سے کوئی فرد غمگین ہے تو جب تک بیماری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اس وقت تک غم بھی اس سے چمٹا رہے گا، اور جب بیماری جاتی رہے گی تو غم اپنے آپ اپنا راستہ لے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو معاشی مسائل کا سامنا ہے اور غربت وغیرہ نے اس کو گھیر لیا ہے تو دلاسوں سے اس کا غم غلط نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگوں نے یہ بھی تصور کر رکھا ہے کہ تلخیوں اور پریشانیوں کے

باوجود انسان کو نہ صرف خوش رہنا چاہیے، بلکہ ممکن ہو سکے تو ہنسنے اور قہقہے وغیرہ لگانے کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غمگین انسان سے ہنسی بھی روٹھ جاتی ہے اور مسکراہٹ تک اس کی طرف رخ نہیں کرتی۔

غم کے مارے لوگوں کو ہنسانے کا بندوبست کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی اپنی اندرونی حالت بھی ناقابل بیان ہوتی ہے۔ کوئی غمزہ مریض ڈاکٹر کے پاس گیا اور اپنے غم کے علاج کی درخواست کی، ڈاکٹر نے حالات جاننے کے بعد مشورہ دیا کہ اپنے شہر میں فلاں تھیٹر میں ایک بہت پائے کا مزاحیہ فنکار کام کر رہا ہے، تھیٹر دیکھنے سے آپ کا غم غلط ہو سکتا ہے۔ مریض نے نہایت افسردگی اور رازداری سے ڈاکٹر کو بتایا کہ جناب! وہ فنکار میں ہی ہوں۔ ان کی اندرونی کہانی کا معاملہ مختلف ہے، تاہم یہ لوگ عام لوگوں کے لئے غنیمت ہیں۔ مزاح کی حس بہت زوال پذیر ہے، ہم لوگ دوسروں کا مذاق اڑانے کو ہی مزاح قرار دیتے ہیں، اگر کسی کی دل آزاری کر کے مزاح پیدا کیا جائے تو یہ سودا مناسب نہیں۔ ہنسانے والے کا کام ہے کہ وہ خود کو تو نشانہ بنالے مگر کسی دوسرے کو تفحیک کا نشانہ ناپسندیدہ عمل ہے۔ ہم پاکستانی بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ہمارے لئے ہنسا اور قہقہے لگانا نہایت ضروری ہے، مگر کیا کیجئے کہ حالات ہمارے بس میں نہیں۔ ہم کمزور لوگ اپنے دل پر یہ جبر بھی نہیں کر سکتے کہ

اپنی بے بسیوں پر ہی غصہ لیں۔ اب تو اپنی قوم کی مجموعی طور پر یہ حالت ہو چکی ہے،
بقول غالب ”پہلے آتی تھی حالِ دل پہ غصہ.. مگر اب کسی بات پر نہیں آتی۔“

!وی وی آئی پی لفٹ

پی آئی اے کی لفٹ بند ہو گئی، یہ کوئی عام لفٹ نہ تھی، بلکہ وی وی آئی پی لاؤنج کے ساتھ لگی لفٹ تھی، دبئی سے آنے والے مسافر وی وی آئی پی لاؤنج سے لفٹ میں سوار ہی ہوئے ہی تھے کہ برقی روکے معطل ہونے کی بنا پر لفٹ بھی جواب دے گئی، اور مسافر بند ہو کر رہ گئے۔ یہ مسافر بھی کوئی عام لوگ نہیں تھے، کیونکہ وی وی آئی پی لاؤنج میں تشریف لانے والے لوگ عام نہیں ہوا کرتے، ایسے ہی یہ مسافر بھی خاص تھے، بلکہ خاص الخاص تھے، یہ تھے وزیراعظم پاکستان کے صاحبزادے جناب حسن نواز صاحب اور ان کے ساتھ تھی ان کی فیملی۔ ان لوگوں کو لفٹ میں تقریباً پانچ منٹ تک رکتا پڑا، پی آئی اے والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، انہوں نے بھاگ دوڑ جزیئر چلوا یا، وی وی آئی پیز کو پیئر باہر نکالا، باہر نکل کر جناب حسن نواز وہاں پر موجود افسران و اہلکاران پر شدید برہم ہوئے۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں وزیراعظم کے مشیر برائے ہوا بازی بھی متحرک ہو گئے، انہوں اس سنگین واقعہ کی تحقیقات کے لئے انکوائری کمیٹی تشکیل دے دی، تاکہ ذمہ داران کا تعین ہو سکے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جاسکے، کہ کس کوئی اتنی جرات ہوئی کہ وہ وزیراعظم کے صاحبزادے اور ان کی فیملی کی لفٹ کو بند کرے۔ امید ہے بہت

جلد تحقیق مکمل ہو جائے گی اور نتیجہ سامنے آ جائے گا۔

وزیراعظم میاں نواز شریف کے صاحبزادگان پاکستان میں نہیں رہتے۔ یہ بات بھی پاکستان کے لئے قابلِ فخر ہے کہ ”میڈان پاکستان“ لوگ، برطانیہ میں کاروبار کرتے ہیں، خیر وہ کاروبار کہاں کہاں کرتے ہیں اس کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملتی ہیں، وہ جہاں بھی کاروبار کریں، وہ اُن کا مسئلہ ہے۔ مگر ہم پاکستانیوں کو فخر اس بات پر ہے کہ پاکستان کے سرمایہ کار، برطانیہ میں کاروبار کریں۔ آجکل وہ لوگ پاکستان آئے ہوئے تھے، کیونکہ ان کی بھانجی کی شادی تھی، اس دوران وہ دہلی وغیرہ گئے ہونگے، واپس آئے تو کسی سازش کے ذریعے لفٹ میں الجھا دیئے گئے۔ وہ تو پاکستان پہلے ہی کم آتے ہیں، ان کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں، وہ کاروبار میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، اور برطانیہ میں ان کا کاروبار زیادہ بہتر اور محفوظ ہے۔ اگر وہ کسی مجبوری کے تحت پاکستان آ ہی گئے تھے تو پی آئی اے والوں کو اس طرح سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا، بلکہ ’لاجواب سروس‘ والوں کا فرض تھا کہ وہ مہمانوں کو اپنے حسن سلوک اور اعلیٰ کارکردگی سے متاثر کرتے اور انہیں مستقل گاہک بناتے۔ پی آئی اے کے رویے اور انداز سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر پی آئی اے کے فروخت وغیرہ کی بات چل رہی ہے تو یہ کام بجا ہے، پی آئی اے اسی سلوک کی حقدار ہے۔

جو نہیں ہوا بازی کے وزیر اعظم کے مشیر شجاعت عظیم نے اس واقعے کی خبر سنی، انہوں نے فوری طور پر انکوائری کا حکم دے دیا، انہوں نے ایک کمیٹی تشکیل دے دی جو چند روز میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گی، یہ دونوں چیزیں پی آئی اے کے افسران کے کام آسکتی ہیں۔ اگر یہاں وزیر اعلیٰ پنجاب کا معاملہ ہوتا تو بہت سے لوگ موقع پر ہی معطل ہو چکے ہوتے، بہت سے دوسرے لوگوں کو کان ہو چکے ہوتے، اور مزید ایک آدھ جزیئر کا حکم جاری ہو چکا ہوتا۔ مگر کیا کیجئے کہ انہوں نے ابھی تک وفاقی اداروں میں مداخلت کا فیصلہ نہیں کیا۔ جہاں تک مشیر ہوا بازی کے بارے میں ایکشن کا تعلق ہے تو موصوف میاں نواز شریف کی گڈ بکس میں ہیں، گزشتہ دنوں انہوں نے مختلف الزامات کی روشنی میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا تھا، مگر وزیر اعظم نے ازراہ کرم ان کے استعفیے کو شرف مقبولیت بخشے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ مشیر صاحب میاں صاحب کے بھلے دنوں کے ساتھی ہیں۔ اس لئے اس موقع پر جو ایکشن بھی لیا جائے گا وہ کم از کم مشیر ہوا بازی سے نیچے تک ہی محدود رہے گا۔ رہی انکوائری تو یقیناً اس کا دائرہ واپڈا تک وسعت اختیار کرے گا، وہاں بھی میاں حسن نواز کے کزن چوہدری عابد شیر علی ہی موجود ہی موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انکوائری کا حکم وہ بھی جاری کر دیں، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ آخر کس کس نے جرات کی کہ وزیر اعظم کے بیٹے کی لفٹ کو روک سکے۔ انہیں البتہ ہمت کر کے ایک دو واپڈا اہلکاروں کو معطل کروا دینا چاہیے، تاکہ کزن کا دل رکھا جائے۔

اگر یہی معاملہ عوام کا ہوتا تو کیسی انکوائری، کیسی معطلی اور کیسی تحقیق؟ عوام دن رات بجلی کی معطلی کا شکار ہیں، کبھی لفٹ میں پھنس گئے تو کبھی بجلی نہ ہونے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، کام سے بھی گئے اور بل بھی بھاری ادا کئے۔ یہ پاکستان صرف وی وی آئی پیز کا ہے، عوام صرف دیکھا کریں۔

! ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر

میں دفتر پہنچا تو کچھ لوگ میرا انتظار کر رہے تھے، وہ الخدمت فاؤنڈیشن کی جانب سے آئے تھے، انہوں نے باہمی تعارف کے بعد اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا، اپنی خدمات کو شمار میں لانے کے لئے وہ ایک ایک بات کا ذکر کرتے گئے، یتیم بچوں کی کفالت پر انہوں نے زیادہ توجہ صرف کی، ان کا کہنا تھا کہ یتیم بچوں کی کفالت ہماری معاشرتی اور مذہبی ضرورت ہے، تاکہ ایسے بچے جن کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے ہوں وہ خود کو لاوارث تصور نہ کریں، ان کو تعلیم، صحت اور دیگر ضروریات بہم پہنچانے کا بندوبست ہو، الخدمت نے اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کر رکھی ہے، سیکڑوں بچے اس سے مستفید ہو رہے ہیں، ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو رہا ہے، ایک بچے پر تین ہزار روپے ماہانہ خرچہ اٹھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مختیر حضرات اس کارِ خیر میں مسلسل تعاون کر رہے ہیں۔ ان بچوں کے لئے سکول بیگ، کتابوں کا بندوبست، سکول یونیفارم اور عید کے موقع پر بھی کپڑے وغیرہ مہیا کئے جاتے ہیں۔ الخدمت کے وفد نے اپنی خدمات کا شمار جاری رکھا۔ بیواؤں کی کفالت کی جاتی ہے، غریب اور مستحق بچیوں کی شادیوں پر اخراجات کئے جاتے ہیں، معذوروں کی سہولت کے بندوبست ہوتے ہیں، جن میں وہیل چیئر وغیرہ کا بندوبست ہوتا ہے۔ صاف پانی کے پلانٹ بھی لگائے گئے ہیں۔ سیلاب یا زلزلہ وغیرہ کے

موقع پر تو الخدمت کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

الخدمت والوں نے دلچسپ بات یہ بتائی کہ وہ چولستان میں نلکے (ہینڈ پمپ) بھی لگا رہے ہیں، تقریباً پچاس نلکے لگا دیئے گئے ہیں، ابھی منصوبہ جاری ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بتایا کہ ہم لوگ خود ہی سروے کرتے ہیں جس میں مقامی سطح پر لوگ شامل ہوتے ہیں، چولستان میں چونکہ پینے والے پانی کی بے حد کمی ہے، اونٹ، بکری اور گدھوں کے ساتھ روہیلوں کو بھی اُسی گھاٹ سے پانی پینا پڑتا ہے، اس لئے جہاں حکومت نے چولستان میں پینے کے صاف پانی کی میلوں طویل پائپ لائن بچھائی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس کے اندر بھی مسائل ختم ہونے کا نام نہیں لیتے، بہت سے مقامات پر یہ پائپ لائن اپنا وجود ختم کر چکی ہے۔ بہر حال مختلف اطراف میں بکھری آبادی کو پانی مہیا کرنا انتہائی مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن کام ہے۔ ایسے میں اگر حکومت یا کوئی این جی او یا کوئی الخدمت جیسا ادارہ ان علاقوں میں پانی پینے کے لئے نلکا لگا دیتا ہے تو یہ خدمت کسی نعمت سے کم نہیں، اسے غنیمت جاننا چاہیے۔ مگر یہاں پریشان کن پہلو یہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں نلکا لگانے کے کچھ عرصہ بعد خراب ہو گیا ہے تو اس کی مرمت کرنے کے لئے اطلاع کوئی نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نلکا وقت کے ساتھ ساتھ اپنے باقیات سمیت غائب ہو جاتا ہے۔

معاملہ صرف نلکے کا نہیں، جب سے مختلف تنظیموں نے چولستان کا رخ کیا ہے، اب وہاں کے لوگوں میں بھی آگاہی کی کمی نہیں، وہ ہر آنے والے کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ کچھ نہ کچھ دے کر جائے گا، حتیٰ کہ کوئی سیاح بھی ادھر جا نکلے تو یار لوگ اسے بھی کسی این جی او کا نمائندہ جان کر اس سے مطالبات وغیرہ شروع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ روایت بنالی ہے کہ اپنی ہر ضرورت کو مطالبے کا رنگ دینا ہے، ہر آنے والے کے سامنے حکومت وغیرہ کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔ این جی او نے انہیں اتنا سیانا تو کر دیا ہے کہ وہ احتجاج کرنے لگ گئے ہیں، مگر انہیں یہ یاد نہیں دلایا جاتا کہ ہر کام حکومت یا این جی او کے کرنے کا نہیں ہوتا۔ ٹوبہ چولستان کے باسیوں کی زندگی کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، چولستان کے اندر آبادیاں ٹوبوں کے کناروں پر ہی بستی ہیں، کیونکہ پانی زندگی ہے۔ مگر جب ٹوبے خشک ہو جاتے ہیں تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، چولستانی اپنے مویشیوں سمیت وہاں سے کسی دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے مقامی لوگ پہلے خود ہی ٹوبوں کی کھدائی اور بھل صفائی کیا کرتے تھے، مگر اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے حکومت اور این جی او کی راہیں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ بات تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ چولستان محروم ترین علاقہ ہے، اور بے شمار وسائل سے ہی وہاں حالات میں معمولی بہتری آ سکتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہی ہے کہ حکومت کے مہیا کردہ وسائل بھی ضرورت سے بہت کم ہیں۔ مگر اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جو کام چولستانیوں کے

خود کرنے کا ہے، وہ اس پر بھی حکومت اور این جی اوز کی طرف دیکھتے ہیں۔ جن کاموں پر افرادی قوت اور معمولی اخراجات ہوتے ہیں، وہاں اپنی مدد آپ کی ضرورت ہوتی ہے، مگر بد قسمتی سے ہم سب کے منفی رویے پختہ ہو چکے ہیں۔

! چڑیا گھر کی ٹکٹ اور جانور

چڑیا گھر لاہور میں داخلے کے لئے خریدی جانے والی ٹکٹ کی مالیت پندرہ روپے سے بڑھا کر چالیس کردی گئی ہے، بچوں کی ٹکٹ پانچ روپے سے بڑھا کر بیس روپے ہوگی، تاہم تین برس سے کم بچے، معذور اور بزرگٹ شہری ٹکٹ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس بے حد اضافہ پر جب شہریوں نے احتجاج کیا تو ڈائریکٹر چڑیا گھر نے بتایا کہ 'آٹھ سال سے یہی ٹکٹ چلا آ رہا تھا، اب اضافہ ناگزیر ہو گیا تھا'۔ چڑیا گھر عوام کی تفریح کا ایک مقام ہے، جن جانوروں یا پرندوں کو بچے ٹی پر دیکھتے یا جن کی کتابوں میں تصویریں دیکھتے ہیں انہیں چڑیا گھروں میں براہ راست دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چڑیا گھر بچوں کی دلچسپی کی جگہ ہے، بچوں کے والدین کو بھی بچوں کے ساتھ چڑیا گھر جانا پڑتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ چڑیا گھر میں صرف بچے ہی نہیں بڑے بھی اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ چڑیا گھر کے سلسلہ میں ایک سوال بہت اہم ہے کہ نایاب، منفرد اور اہم جانور رکھنے کے اس مقام کو "چڑیا گھر" کیوں کہتے ہیں، جبکہ یہاں 'چڑیا' نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو بیخوروں میں نہیں پائی جاتی۔ دوسری جانب وزیر جنگلات و جنگلی حیات ملک آصف اور وزیر عشرز کوۃ ندیم کامران

کا کہنا ہے کہ لاہور چڑیا گھر اور زرو سفاری پارک میں مزید جانور لانے کے لئے 11 کروڑ
 اور پچاس لاکھ سے زائد رقم خرچ کی جائے گی، وزراء نے چڑیا گھر انتظامیہ کو یہ بھی کہا
 کہ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے ذریعے یہاں لینڈ سکیننگ اور آرٹ ورک کروایا
 جائے، جس سے چڑیا گھر میں کشش پیدا ہوگی اور زیادہ لوگ یہاں سیر وغیرہ کی غرض
 سے آئیں گے۔ چونکہ وزراء کا حکم ہے اس لئے یقیناً انتظامیہ فوری طور پر احکامات پر
 عمل کے راستے تلاش کرے گی، زندہ دلان لاہور چند روز بعد چڑھا گھر اور دیگر تفریحی
 پارکوں میں آرٹ ورک کے بہترین نمونے دیکھ سکیں گے۔ چڑیا گھر جانے کے لئے سب
 سے بڑی اور اہم کشش تو یہی ہوتی ہے کہ وہاں طرح طرح کے جانور ہوں، رنگت
 . برنگت کے پرندے ہوں، خونخوار جانور بیخوروں میں بند ہوں، ہر نیس میدانوں میں
 اچھل رہی ہوں، ہاتھی پر بچے سیر کر رہے ہوں، ریچھ، لنگور، چیتا، شتر مرغ اور اسی
 قسم کے نایاب جانوروں سے چڑیا گھر بھرا پڑا ہو۔ چڑیا گھر کی راہداریاں صاف ستھری
 ہوں، درختوں کی بہتات سے چڑیا گھر جنگل کا نقشہ پیش کر رہا ہو۔ پھول پودے لگے
 ہوئے ہوں، جانور انسان دوست ہوں اور انسان جانور دوست۔
 ایکٹ چڑیا گھر بہاول پور میں بھی ہے، بیخمرے خالی ہو رہے ہیں، بطخوں اور مرغابیوں
 وغیرہ کے لئے موجود تالاب خشک ہو رہا ہے، یقیناً صفائی کے مراحل سے گزر رہا ہوگا،
 سال کے جس موقع پر بھی ایسی صورت حال ہو تو ہر موسم میں اور

ہر روز سوال بھی ایک ہی ہوتا ہے اور جواب بھی ایک، ”... تالاب کی صفائی ہو رہی ہے، بندروں کے پیچھے بن رہے ہیں، ہاتھی کی خرید کے لئے ٹینڈر ہو چکے ہیں، عنقریب ہاتھی آجائے گا، جانوروں کی خوراک کو باقاعدہ چیک کیا جاتا ہے، طبی لحاظ سے بہترین غذا جانوروں کو کھلائی جاتی ہے...“۔ اجڑے ہوئے اور صفائی سے بے نیاز چڑیا گھر میں جنگل کے بادشاہوں کے لئے جو زندہ گائے لائی جاتی ہے، وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوتی، اس کو چاند گاڑی نما ٹرائی پر لاد کر لایا جاتا ہے، اور بیٹھی ہوئی گائے کو کھینچ کر زمین پر گرایا جاتا ہے، پھر اسے ذبح کرنے کا تکلف کیا جاتا ہے، یہی خوراک بادشاہ سلامت بڑی رغبت سے تناول فرماتے اور اپنے آباؤ اجداد کی زندگیوں پر رشک کرتے ہیں۔ بہاول پور میں چڑیا گھر کا ہاتھی ایک عشرہ قبل آنجہانی ہو گیا تھا، یقیناً اس کی کھال اور دانت تو حکومت یا محکمہ کے مال خانے میں جمع ہو چکے ہونگے، مگر اہالیانِ بہاول پور کو دوبارہ ہاتھی نصیب نہیں ہوا۔

مذکورہ بالا وزراء نے اگرچہ لاہور چڑیا گھر کی انتظامیہ کو پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کی بات کی ہے، اور آرٹ ورک وغیرہ کروانے کا حکم دیا ہے، ممکن ہے کچھ وقت کے بعد وہ یہی حکم دیگر چڑیا گھروں کے لئے بھی جاری کر دیں، ویسے تو پنجاب میں دو ہی چڑیا گھر قابل ذکر ہیں، لاہور کے بعد دوسرا بہاول پور میں ہے۔ بہاول پور میں وزراء کے اس حکم پر کسی صورت میں پہلے ہی عمل ہو رہا ہے

یعنی چڑیا گھر میں جانور ہوں یا نہ ہوں، مگر پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ پہلے سے موجود ہے، یعنی جگہ جگہ کھانے پینے کے لئے ٹینٹ لگے ہیں، کرسیاں جمی ہیں، موسیقی کا دور چل رہا ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصہ بعد ایسا وقت بھی آجائے جب معلوم ہو کہ یہاں کبھی کھیت ہوا کرتا تھا، جسے ’چڑیاں‘ چُکٹ گئی ہیں، تاہم بہاول پور چڑیا گھر پر ”اجڑیاں باگاں دے گا لہڑ پٹواری“ کا محاورہ اب بھی صادق آتا ہے۔

شیخ جاوید بہاول پور کے مقامی صحافی ہیں، وہ قومی اور مقامی اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں، صحافت کے میدان میں اترے انہیں اٹھائیس برس ہو رہے ہیں۔ چھبیس سال سے وہ بہاولپور پریس کلب کے ممبر ہیں۔ وہ آج بھی کراہیہ کے مکان میں رہتے ہیں، ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ کوئی پانچ برس قبل ان کی اہلیہ کے پیٹ میں شدت سے درد اٹھا ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ بڑی آنت میں ٹیومر ہے، دو سال تک اس کا علاج، ہوتا رہا، افاقہ نہ ہوا۔ کسی نے شوکت خانم کا مشورہ دیا، وہاں جا کر لاکھوں روپے کے ٹیسٹ کروائے گئے، مفت علاج کی بابت معلوم ہوا کہ اگر ہم مریض کو داخل کریں گے تو علاج مفت شروع ہوگا۔ تاہم نہ داخلے کی صورت بنی اور نہ ہی مفت علاج کا موقع آیا، رپورٹوں کی روشنی میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ کینسر آخری سٹیج پر ہے، ہم صرف ابتدائی سٹیج پر ہی علاج کرتے ہیں۔ چنانچہ مریض کو لا علاج قرار دے کر واپس بھیج دیا گیا۔ بہاول پور واپس آ کر کچھ صحافی دوستوں نے ’بینو‘ میں علاج کروانے کا مشورہ دیا، اور مفت علاج کا خاکہ ذہن میں تیار کیا، مگر ڈائریکٹر صاحب نے مفت علاج سے معذرت کر لی اور بتایا کہ ان کے اختیارات میں صرف یہی ہے کہ ہسپتال کے اندر کے ٹیسٹ پیچاس فیصد رعایت پر کر دیئے جائیں گے۔ شیخ صاحب نے لاکھوں روپے علاج پر لگائے۔

علاج مہنگا تھا اور وسائل نہ ہونے کے برابر۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ صاحب نے با وسیلہ اور
 باختیار لوگوں کے در پر دستک دینے کا آغاز کیا، بہاولپور کی حکومتی پارٹی کی ایم این اے
 پروین مسعود بھٹی کے پاس گئے، ٹیسٹ دکھائے، فائل دی اور ڈھیر سارے وعدوں اور
 امیدوں کے ساتھ واپس لوٹے، مگر دن ہفتوں میں اور مہینے سالوں میں بدل گئے،
 درخواست خادم پنجاب ٹکٹ پہنچی یا نہیں، کوئی جواب نہ آیا۔ پریس کلب کے سابق صدر
 شاہد بلوچ نے ذاتی کوششوں سے ٹیسٹ اور ادویات فراہم کرنے کی بہت کوشش کی،
 مگر ان کی کوششیں بھی اتنے مہنگے علاج میں دب کر رہ گئیں، انفارمیشن عابد رضوی کے
 بھی ذاتی کوششیں اور وعدے کئے، مگر مقتدر اور مختار لوگوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکے۔
 عزیز رشتہ داروں سے مسلسل قرض لیا جاتا رہا۔ امید دلانے والے ہر کسی سے توقعات
 بڑھ جاتیں، وہی مساجد کھائی دینے لگتا، اسی کے پیچھے ہو لیتے۔ گرتے پڑتے، ٹیسٹ
 کرواتے رہے، کچھ دوائیاں لیتے رہے۔ ٹیو مر بڑھ گیا، حالات مزید خراب اور مایوس کن
 ہو گئے، مگر امید کی کرن اس وقت پیدا ہو گئی جب ڈاکٹروں نے ٹیو مر نکال دیا، مگر
 امید کا یہ دیا زیادہ دیر روشنی نہ دے سکا کہ کینسر نے جاتے جاتے جگر پر بھی اپنے اثرات
 چھوڑ دیئے تھے۔ علاج کی اسی کشمکش میں مریضہ کی آنکھوں پر بھی بہت برا اثر پڑا پانچ
 برس میں چار مرتبہ آنکھوں کا آپریشن کروانا پڑا۔ شیخ صاحب کی مالی حالت حد سے
 زیادہ کمزور ہو چکی تھی اور مریضہ

کی حالت بھی کمزوری کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ آخر ایک دن مریضہ پانچ برس کینسر سے لڑنے کے بعد زندگی کی بازی ہار گئی۔

اب شیخ صاحب اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہیں، ایک بیٹی کی تعلیم تقریباً مکمل اور دوسری کی ادھوری ہے، بچیوں کی ماں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے، بیٹیاں اگرچہ محبت باپ سے زیادہ کیا کرتی ہیں، مگر فطری رازداری اپنی ماں سے ہی کرتی ہیں۔ اب شیخ صاحب کے سر پر دو بچیوں کے مستقبل کا بوجھ بھی ہے اور ان کی ماں کے علاج پر خرچ ہونے والے لاکھوں روپے کے ادھار کا قرضہ بھی۔ آمدنی نہایت محدود اور قرضہ لا محدود ہے۔ وہ کس کی طرف دیکھیں، کس سے امید رکھیں، حکمرانوں کو تو پروٹوکول اور مراعات کے بغیر ایک قدم چلنا محال ہے، اور کون نہیں جانتا کہ حکمرانوں کا ایک ایک دن لاکھوں روپے کھا جاتا ہے۔ خادم اعلیٰ کی نظر میں جو آجائے اس کے تو وہ گھر پہنچ جاتے ہیں، مگر پیچھے پلٹ کر کوئی نہیں دیکھتا۔ انتظامیہ وغیرہ کو اس قسم کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ این جی اوز کروڑوں روپے خرچ کرتی ہیں مگر ان کی ترجیحات اپنی ہوتی ہیں۔ مخیر حضرات بھی اپنا حساب کتاب کر کے ہی خرچ کرتے ہیں۔ اخبار مالکان کو بھی اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ صحافیوں کی تنظیموں کو نہ جانے کیا مصروفیات ہیں، وہ کن کے مفاد کے لئے کام کر رہی ہیں، پریس کلب کے ممبران کو اپنے اٹھائیس برس کے رفیق کی رفیقہ

حیات کے جنارے میں شرکت کی توفیق بھی نہ ہوئی۔ حکومت پنجاب، اخبار مالکان، صحافتی تنظیموں، پریس کلب، مخیر حضرات اور پورے معاشرے کے لئے یہ لمحہ فکر یہ ہے کہ ایک غریب صحافی لاکھوں کے قرضوں کے بوجھ سے کیسے چھٹکارا پائے گا؟ اس بے بسی کے سامنے بے حسی زیادہ طاقتور دکھائی نہیں دیتی؟

! پولیس رویے

جس اخبار میں کوئی خبر مجھے کالم لکھنے کی دعوت دیتی ہے، یا میں اپنے طور پر اس خبر کو اہم تصور کرتا ہوں۔ میں اسے الگ رکھ لیتا ہوں، پہلے تو اسی روز اس خبر کی خواہش پوری کر دی جاتی ہے، مگر بعض اوقات زیادہ خبروں کی وجہ سے یا اپنی نجی مصروفیت کی بنا پر خبر کو کالم کا رنگ نہیں دیا جاسکتا۔ یوں اخبارات اکٹھے ہوتے رہتے ہیں، پھر جب خاتونِ اولہ“ اخباروں کے اُس ڈھیر کو ردی فروش کے حوالے کرنے اور اپنی آمدنی“ میں اضافہ کرنے کا پروگرام بناتی ہیں تو ازراہِ کرم مجھے ایک مرتبہ اخبارات پر نظر ثانی کرنے کی اجازت مرحمت فرما دیتی ہیں۔ میں ان اخبارات کی چھانٹی کرتا ہوں، بہت سی اہم خبریں اپنی معیاد پوری کر چکی ہوتی ہیں، اور بعض ضروری اور سدا بہار خبریں پھر دامنِ تھام لیتی ہیں۔ اب چھٹی والے دن جب مجھے ’اوپر‘ سے ایسا ہی حکم ملا تو میں نے مجبوراً اخبارات کی ورق گردانی کی تو چند روز قبل کی ایک خبر نے میرا ہاتھ روک لیا، میں نے وہ اخبار الگ کر کے باقیوں کو پروانہ آزادی جاری کر دیا۔ خبر پولیس کے بارے میں تھی اور معاملہ پولیس رویوں کا تھا۔

بہاول پور کے ضلعی پولیس افسر کی ہائی کورٹ میں پیشی تھی، یہاں ذرا رک کر

اندازہ لگائیے کہ ان صاحبان کی عدالت میں پیشی اسی وقت ہوتی ہے، جب یہ اپنے اختیارات سے دو قدم آگے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ عدالت کے احاطے میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں گاڑی آگے لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہاں پولیس کی نفری جج صاحبان کی سکیورٹی کے لئے موجود ہوتی ہے۔ سب انسپکٹر نے اپنے ہی ضلعی افسر کی گاڑی آگے لے جانے سے روک دیا، صاحب نے اصرار کیا، ماتحت نے انکار۔ موقع پر چونکہ ماتحت ہی بااختیار تھا اور آگے ہائی کورٹ کے جج صاحبان کا معاملہ تھا، المذاڈی پی او صاحب نے بہتری اسی میں جانی کہ گاڑی سے اتر کر چند قدم پیدل چل لیں۔ ایسے مواقع پر عام طور پر افسر اپنے ماتحت کے ایسے رویے پر شاباش بھی دے دیا کرتے ہیں، مگر جہاں ایسے ماتحت کم ہیں وہاں ایسے افسران کی بھی کمی ہوتی ہے۔ موصوف پیشی سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچے تو اپنی شان میں گستاخی کرنے والے سب انسپکٹر کی معطلی کے احکامات جاری فرما دیئے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ بھی جج صاحب کے سامنے پیش ہو گیا، اب ڈی پی او کو ہی طلب نہ کیا گیا بلکہ ان کے ساتھ آر پی او کی بھی پیشی پڑ گئی، بعض اوقات اپنے ماتحت کی کسی بات کی وجہ سے افسر کی شامت بھی آجایا کرتی ہے۔ عدالت میں پہنچ کر ڈی پی او نے معطلی کے احکامات واپس لئے اور آر پی او نے نہایت مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے معاملہ کو سلجھانے کا وعدہ کیا، انہیں اندازہ تھا کہ ڈی پی او کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہوگا۔ ڈی پی او کی جرات کی داد دینی چاہیے، جنہوں نے ہائی کورٹ کے احکامات کی تعمیل کو دلچسپ

رخ دے دیا، کہ عدالت سے واپس آ کر موصوف نے جس سب انسپکٹر کی معطلی ختم کی تھی، اب اس کا تبادلہ کر دیا۔ اس مرتبہ جسٹس صاحب نے از خود نوٹس لیتے ہوئے ڈی پی او کو عدالت طلب کیا۔ ایسے مواقع پر جو کچھ روداد ہوتی ہے، وہ کسی بھی صورت میں کسی شریف اور معقول آدمی کے حق میں بہتر نہیں ہوتی، چنانچہ ڈی پی او صاحب عدالت سے اپنی عزت افزائی کے بعد واپس لوٹ آئے۔

پولیس کا یہ رویہ کوئی ایک دفعہ منظر پر نہیں آیا، ان کا معمول ہے، بہاول پور میں ہی ایک آر پی او ایسے گزرے ہیں، جنہوں نے اپنے دفتر کے آگے سے گزرنے والی سڑک پر سے بھاری ٹریفک بند کرادی تھی۔ وہ سڑک بہاول پور سے بہاولنگر کی طرف جانے والا واحد راستہ تھا، یہ ٹریفک چار کلومیٹر کا چکر کاٹ کر صاحب کے دفتر سے تھوڑا سا آگے دوبارہ اسی سڑک پر ملتی تھی، تاہم اس چکر میں یہ ٹریفک ایک گریڈنگ، گریڈ ہائی سکول، ریڈیو سٹیشن اور سینٹرل جیل جیسے مقامات سے گزر کر آتی تھی، تعلیمی اداروں میں چھٹی کے وقت روزانہ سڑک بلاک ہوتی تھی۔ وہ آر پی او بعد میں پنجاب کے پولیس سربراہ بھی بنے۔ پولیس کے یہ افسران جب کسی سیمینار یا تقریب میں گفتگو کرتے ہیں تو ان سے زیادہ معقول اور بہترین سوچ کا آدمی کوئی دوسرا نہیں ہوتا، مگر جو نہی وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اختیارات کا استعمال کرتے ہیں تو وہ وہی روایتی پولیس والے بن جاتے ہیں جن اوصاف کی بنا پر پولیس بدنام ہے۔ براہ راست بھرتی ہونے والے نوجوان

پولیس افسران سے بہتری کی توقعات تھی، مگر وہاں بھی مایوسی کے ہاؤل ہی دکھائی
دیتے ہیں، یہ لوگ بہت جلد نمک کی کان میں جا کر نمک ہو جاتے ہیں۔ بہت کم افسران
ہیں، جو اخلاق اور کردار میں اپنا نام روشن کرتے ہیں۔

! بھٹوں پر چائلڈ لیبر

حکومت پنجاب کی طرف سے کچھ مہینے قبل ایک مہم چلائی گئی تھی، جس میں خورد و نوش کی اشیاء میں سے مضر صحت ثابت ہونے پر ان ہوٹلوں، مشروبات وغیرہ کو سیل کر دیا جاتا تھا۔ اس مہم کی زد میں بڑی بڑی چینرز، بڑے ہوٹل اور مشروبات کی ڈسٹریبیوشنز آئیں۔ کسی کو سیل کیا گیا تو کسی کو جرمانہ، کسی کو وارننگ دی گئی تو کسی کو معافی۔ اس ادارہ کی سربراہ عائشہ ممتاز کا نام معیار پرکھنے کا استعارہ بن گیا، انہیں ٹی وی کورج ملنے لگی، انٹرویو شائع ہونے لگے۔ کہنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ فلاں محلے کو بھی ایک 'عائشہ ممتاز' کی ضرورت ہے، گویا جہاں سے ملاوٹ یا خرابی کا خاتمہ درکار ہوتا وہاں عائشہ ممتاز کو یاد کیا جاتا۔ اس مہم سے عوام خوش ہوئے، کیونکہ ہم لوگ مولا جٹ سٹائل سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس مہم کا ایک نقصان بھی ہوا، جس مقامی افسر کو کسی سے کوئی رنجش ہوتی وہ ہوٹل یا فاسٹ فوڈ یا مشروب کی دکان کو سیل کر دیتا، چونکہ حکومت کا دباؤ بھی تھا اس لئے وہ معاملہ جلدی قابو میں نہیں آتا تھا، مقامی انتظامی افسران نے خوب اپنی من مانی کی اور لوگوں کو خوب ہراساں کیا۔ تاہم اس مہم کا مجموعی تاثر اچھا رہا۔ مگر یہ مہم رکتے رکتے شاید رک ہی گئی ہے۔

آج کل اینٹوں والے بھٹوں پر کام کرنے والے بچے حکومتی ایوانوں میں زیر بحث ہیں۔ یقیناً پنجاب حکومت کی طرف سے 'چائلڈ لیبر' کے خلاف کوئی مہم جاری ہے۔ اینٹوں والے بھٹوں پر بچوں سے کام لینے کے پاداش میں بھٹے مالکان کی گرفتاری اور بھٹوں کو سیل کرنے کا عمل زور و شور سے جاری ہے۔ ہر روز اسی قسم کی خبریں نام اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔ بھٹے پر موجود کسی بھی ذمہ دار کو گرفتار کیا جا رہا ہے اور بھٹوں کو سیل کیا جا رہا ہے۔ یہ مہم بھی اسی جوش و خروش سے جاری ہے، جس طرح کھانے پینے کے سامان میں ملاوٹ یا مضر صحت کا معاملہ درپیش تھا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مہم بھی نہایت مثبت اثرات کی حامل ہے، ان بچوں کا مستقبل بن جائے گا، جو بچے آج اینٹیں پکا اور بنا رہے ہیں، وہ کل کے مزدور ہی ہونگے۔ اس صورت میں مزدوروں کے بچوں کی قسمت میں مزدوری ہی لکھی دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ فطرت کا اصول نہیں، بلکہ یہ بچے معاشرے اور حکومت کے ہاتھوں سے تباہی کے گڑھوں میں گر رہے ہیں، اگرچہ اس میں کسی حد تک والدین کا قصور بھی ہے، مگر زیادہ ذمہ داری حکومت اور معاشرے پر ہی عائد ہوتی ہے۔

بھٹوں پر بچوں کا کام کرنا تو جو کچھ تکلیف دہ ہے، اور حکومت اپنے احکامات اور اقدامات کی صورت میں کچھ کرتی دکھائی دیتی ہے، وہاں اگر غروں کو کام

کرتے دیکھیں تو روٹ گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، انسان کا دماغ چکرانے لگتا ہے، جب مٹی
جون کی جھلسا دینے والی گرمی میں یہ لوگ بھٹے کے اندر سے پختہ اینٹیں نکال رہے ہوتے
ہیں، ان کے چاروں طرف بھٹے کی گرمی ہوتی ہے اور اوپر سورج بھی آگ برسا رہا ہوتا
ہے۔ معاملہ صرف گرمی کا ہی نہیں، بلکہ مٹی اور گرد و غبار کی وجہ سے انہیں پہنچانا مشکل
ہو جاتا ہے، وہ بھوت بنے بھٹے کے اندر سے گدھوں پر اینٹیں لاتے ہیں اور باہر نکال کر
پھینکتے ہیں، بہت سے مزدور وہاں سے ٹیل گاڑیوں اور ٹریکٹر ٹرالیوں پر لاد کر باہر کے
لوگوں کو مہیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اینٹ کا بنایا جانا انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے،
کیونکہ گھر اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، عمارات کی تعمیر سے ترقی کا تاثر بھی پیدا ہوتا
ہے۔ مگر جس ماحول میں یہ لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں، اس کی مزدوری عام مزدور
سے بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ اپنی صحت کو قربان کر کے یہ خدمت سرانجام
دے رہے ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں بچوں کا عالم کیا ہوگا، بچے ویسے بھی مزدوری
کے لئے پیدا نہیں ہوئے، ہم انہیں مزدور بنا دیتے ہیں۔ حکومت کا یہ اقدام اگرچہ قابل
تحمین ہے، مگر ہم کسی مہم کو اٹھا کر بھاگ لیتے ہیں اور چند ہی روز میں ایک کو چھوڑ کر
کسی اور مہم کو اٹھا لیتے ہیں، یوں یہ مہمات اپنی منزل پانے کی بجائے مذاق کی صورت
اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک محدود وقت تک تو لوگ پریشان رہتے ہیں، مگر کچھ ہی عرصہ بعد
وہ مصیبت کے منہ سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں دور دراز بھٹوں پر چھاپے
مارنے کی

بجائے اپنے دفاتر جاتے ہوئے راستے میں بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے، جب صبح دفاتر کا وقت ہوتا ہے تو ہر ورکشاپ، موٹر سائیکل مکیٹنگ اور اسی قسم کے دیگر مقامات پر چھوٹے ”صفائی کر رہے ہوتے ہیں، ان کی تعداد کا اندازہ لگایا جانا اور تدارک کرنا“ بھی ضروری ہے۔

! برطانیہ میں مقیم مسلمان خواتین

برطانیہ میں مسلمان خواتین کے لئے نیا حکم نامہ جاری ہو چکا ہے، جو برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرن نے براہ راست جاری کیا ہے۔ وزیراعظم کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں مقیم مسلمان خواتین اپنی انگریزی بہتر کر لیں، ورنہ ڈھائی سال میں برطانیہ چھوڑ دیں۔ کیمرن صاحب نے اپنے اس انقلابی فیصلے کی وجہ یہ بتائی کہ کچھ مسلمان حلقوں کی برطانوی معاشرے میں ملنے گھٹلنے میں کمی سے انتہا پسندی کو پنپنے میں مدد ملتی ہے، ان حلقوں کی طرف سے مسلمان خواتین کو الگ تھلگ رکھنے اور ان کے ساتھ امتیاز برتنے کے خلاف ”مزید موثر“ اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ان مسلمانوں سے صرفِ نظر ختم کرنے کا کہا ہے جو اپنے دقیانوسی رویے کے ذریعے اپنی خواتین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً بائیس فیصد ایسی مسلمان خواتین ہیں جو بہت کم انگریزی جانتی ہیں، یا بالکل ہی نہیں جانتیں۔ اس سلسلہ میں حکومت نے صرف حکم نامہ ہی جاری نہیں کیا، دو کروڑ پاؤنڈ بھی جاری کئے ہیں، جو گھروں، سکولوں اور کمیونٹی سینٹرز میں انگریزی سکھانے کی جماعتوں کا انتظام کیا جائے گا، جبکہ سفر اور بچوں کی دیکھ بھال کے اخراجات بھی دیئے جائیں گے۔

برطانیہ میں یقیناً تمام مسلمان ممالک کے لوگ آباد ہیں، یہی وجہ ہے کہ کیمرون کا یہ حکم تمام مسلمان ممالک کی خواتین کے لئے ہے۔ وہ خواتین جو برطانیہ میں ہی پیدا ہوئیں اور پلی بڑھیں، ان کی انگریزی پر تو نہ کسی کو شک ہے اور نہ پریشانی، کہ بہت سے میدانوں میں وہ خود انگریزوں کو مات دے جاتی ہیں، برطانوی پارلیمنٹ تک ان کی رسائی ہو چکی ہے، سیاسی پارٹیوں میں ان کا اثر و رسوخ موجود ہے، اور وزارتوں کی ذمہ داریاں نبھانے تک کے فرائض سرانجام دے چکی ہیں۔ وہ برطانوی معاشرے سے ہم آہنگ ہیں، یا کم سے کم معاشرے کے قریب تر ہیں۔ دوسری وہ خواتین ہیں جو بعد میں وہاں پہنچیں، جن کے والد وہاں تھے، وہ بعد میں بچوں کو بھی لے گئے، ایسی بچیاں بھی بڑی ہو کر انگریزی سے آشنا ہو چکی ہیں۔ مگر وہ خواتین جن کی شادی ہو کر برطانیہ جاتی ہیں، وہ ضروری نہیں کہ خود اپنے ملک میں بھی زیادہ پڑھی لکھی ہوں۔ پاکستان جیسے ملک میں تو معاملہ نیم خواندگی کا ہے۔ جہاں سے گئے ہوئے مرد بھی مزدوری کرنے کے لئے گئے ہیں، ان کی بیویاں کہاں پڑھی لکھی ہو گئی، یا انگریزی سے کہاں واقف ہو گئی۔ پاکستانی سکولوں اور تعلیمی اداروں میں انگریزی کی صورت حال تسلی بخش نہیں۔ کہنے کو تو یہ انگلش میڈیم سکولوں سے پڑھے ہوئے لوگ ہیں، مگر صرف نام کی حد تک۔ خاص طور پر خواتین تو تعلیم کے میدان میں بھی مردوں سے کافی پیچھے ہیں۔

کیمرون کے حکم سے یہ نکتہ صاف ظاہر ہے کہ معاملہ صرف انگہ نری بہتر کرنے کا نہیں، بلکہ بات معاشرتی معاملات میں ملنے اور گھلنے کی ہے۔ گھلنے سے مراد رچاؤ ہے، کسی معاشرے میں رچ بس جانا، اس کے تمام نشیب و فراز سے آشنائی حاصل کرنا اور اس سے ہم آہنگ ہو جانا، جیسے شیر و شکر کا معاملہ ہے۔ وہاں کی روایات کی پاسداری کرنا، وہاں کے کلچر کو اپنانا، وہاں کی سوسائٹی میں اکٹ بکٹ ہو جانا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کھل کر متبع کر دیا گیا ہے کہ معاشرے سے الگ رہنے والی خواتین انتہا پسندی کی طرف راغب ہو جاتی ہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی خاتون اسلام کے اصولوں پر عمل کرنا چاہتی ہے تو اسے دہشت گردی کی طرف راغب قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ بد قسمتی سے مسلمانوں نے اسلام کا نقشہ پیش کرنے میں یہ کمزوری دکھائی ہے کہ جو مسلمان بھی اسلام کے حقیقی اصولوں پر کاربند ہے، اسے دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نہ صرف رواداری کا علمبردار ہے، بلکہ برداشت، تحمل اور بردباری کا درس بھی دیتا ہے، معاف کردینے کی صلاحیت بھی اسی کے اصولوں میں سے ایک ہے۔ اب کیمرون کے احکامات کو دیکھا جائے تو جو مسلمان عورتیں برطانوی معاشرے سے الگ تھلگ رہیں گی، ان کے لئے برطانیہ میں کوئی جگہ نہیں، انہیں ملک چھوڑنا ہوگا۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ملک چھوڑنے کی بجائے اپنے رویوں کو اس قدر مثبت بنائیں کہ وہ مذہب پر بھی کاربند رہیں اور برطانیہ کے لئے بھی قابل قبول قرار پائیں۔ ایسا کرنا اگرچہ بہت مشکل ہے، مگر مشکل کو آسان بنانے کے لئے

سب سے اہم اور ضروری اقدام یہی ہے کہ مسلمانوں کے کردار پر لگے دھبوں کو دھویا جائے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمان برطانیہ میں رہائش کی خاطر اپنے دین اور مذہب کو ہی چھوڑ دیں، بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد ہو کر ایسا کردار پیش کرنا چاہیے، جس سے مسلمانوں کو دہشت گرد تصور کرنے کی بجائے انہیں امن، تعلیم اور بر دباری کا داعی قرار دیا جائے۔ ضرورت عمل کی ہے اور اب اس کے بغیر اپنی بقا خطرے میں ہے۔

سی ڈی اے نے برق رفتاری سے آپریشن کیا اور سیاسی جماعتوں کے دفاتر سیل کر دیئے۔ تحریک انصاف، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ ق کے دفاتر سیل کر دیئے گئے، پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی مزاحمت کی وجہ سے پارٹی کا دفتر سیل نہ ہو سکا۔ البتہ یہ بات دلچسپ ہے کہ پاکستان مسلم لیگ ن اور آل پاکستان مسلم لیگ نے رضاکارانہ طور پر ہی اپنے دفاتر بند کر دیئے۔ ظاہر ہے مسلم لیگ ن حکومتی پارٹی ہے، وہ خود قانون کی پاسداری کر کے ہی دوسروں کے لئے مثال بن سکے گی، ورنہ انگلیاں اٹھیں گی، رہ گئی آل پاکستان مسلم لیگ تو اس نے بھی فوری قدم اٹھا کر شہیدوں میں نام لکھوایا، یہی کامیاب لوگوں کی نشانی ہے۔ وفاقی دارالحکومت کے انتظامات چلانے والی وزارت کے وزیر مملکت نے بتایا کہ یہ کاروائی سپریم کورٹ کے حکم پر عمل میں لائی جا رہی ہے، دسمبر میں سیاسی جماعتوں کے دفاتر بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ عدالت کی اگلی پیشی بیس جنوری کے بعد کی تھی، گویا حکومت نے یہ کاروائی عدالت کو مطمئن کرنے کے لئے کی ہے، تاکہ پیشی کے موقع پر عدالت کے سامنے کسی بھی پریشانی سے محفوظ رہا جاسکے۔

ملک بھر میں چلنے والے تمام معاملات کی ڈوریوں کے آخری سرے وفاقی

دارالحکومت کے ہاتھ میں ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کو تمام اختیارات کا منہج جانا جاتا ہے۔ تمام وزارتیں یہاں ہیں، جن کی وجہ سے وزارتوں اور دیگر مسائل سے متاثرہ لوگ بھی اسلام آباد جاتے اور اپنے کام نکلواتے ہیں۔ کوئی زمانہ تھا جب اسلام آباد ایک جنگل ہوتا تھا، ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر جاتے ہوئے بھی راستے میں کوئی نالہ اور بہت سا جنگل پڑتا تھا۔ مکانات سرکاری تھے اور بہت زیادہ منزلوں کو نہیں پہنچتے تھے۔ اس لئے تب کی ایک اہم سیرگاہ 'شکر پڑیاں' سے کھڑے ہو کر جب اسلام آباد کا نظارہ کیا جاتا تو پورا شہر درختوں میں ڈھکا ہوا ہی دکھائی دیتا، بس کہیں کوئی پانی کی ٹینکی یا کسی مسجد کے مینار ہی نمایاں ہوتے تھے۔ مگر آبادی بڑھتی گئی، ضرورتوں میں اضافہ ہوتا گیا، درخت کٹتے گئے، سڑکیں بنتی گئیں، عمارتیں تعمیر ہوتی گئیں، اب شکر پڑیاں میں بھی وہ رونق نہیں رہی، دیگر مقامات سیر و سیاحت تعمیر ہو چکے ہیں، تاہم اب ہر اونچی جگہ سے پورا شہر بھی دکھائی دیتا ہے، سڑکیں بھی صاف نظر آتی ہیں، البتہ درخت بھی کسی حد تک موجود ہیں۔

فطری طور پر ہر میدان میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں، اسلام آباد صرف سرکاری باہوؤں کا شہر تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ دیگر لوگ بھی آتے گئے، جاگیر داروں، سرمایہ داروں اور صنعتکاروں نے بھی وہاں ڈیرے ڈالنے شروع

کردیئے، کاروباری طبقے نے بھی اسلام آباد کا رخ کر لیا۔ یہاں دفاتر تو ہر طبقے کے تھے، اور حکومت کی ڈوریاں بھی یہیں سے ہلتی تھیں، مگر نہ یہاں سیاست تھی، نہ کاروبار، نہ یہاں ادبی محفلیں جہتی تھیں اور نہ ہی فنونِ لطیفہ کے مناظر تھے۔ آخر سب نے آہستہ آہستہ ادھر آنا شروع کر دیا۔ پھر وقت آ گیا کہ یہاں سیاسی گٹھ جوڑ بھی ہونے لگا، جوڑ توڑ کے میدان بھی سجھنے لگے، تحریکوں کی بنیادیں بھی پڑنے لگیں، ادبی میلے بھی سجھنے لگے، اخبارات کے دفاتر بھی کھلنے لگے۔ رونقیں بڑھ گئیں، یہاں بھی زندہ دلی کے مناظر دکھائی دینے لگ گئے۔ ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی، حتیٰ کہ گزشتہ سے پیوستہ برس یہاں سیاست نے مسلسل طویل دھرنہ دے کر اپنا ریکارڈ بھی قائم کر دیا۔ اس شہر میں جسے بعض سنگدل لوگ ”شہرِ خاموشاں“ بھی کہہ دیتے تھے، جلوس برآمد ہونے لگے اور ریلیاں نکلنے لگیں۔

اب حکومت اگر سیاسی جماعتوں کے دفاتر ختم کر رہی ہے، تو یہاں چوہدری شجاعت حسین کا بیان قابلِ غور ہے، کہ اگر سیاست بھی ’تجارت‘ ہے تو شہر میں بہت سے مکانات تجارتی استعمال میں لائے جا رہے ہیں، ڈاکٹروں نے اپنے گھروں کو کلینک بنا رکھا ہے، وکلاء نے بھی اپنے گھروں میں اپنے دفاتر بنا رکھے ہیں۔ اگر چوہدری شجاعت کی بات کو آگے بڑھایا جائے تو کتنی این جی اوز ہیں جو بہت بڑے گھر کرائے پر لے کر تجارت کر رہی ہیں، بے شمار کاروباری ادارے ہیں، جنہوں

نے آبادیوں میں اپنے دفاتر بنا رکھے ہیں۔ ویسے خود وزراء کی رہائش گاہیں بھی سیاسی دفاتر سے کم نہیں۔ سیاسی جماعتوں کے سربراہوں میں سے بہت کم ہیں جن کے اسلام آباد میں دولت خانے نہیں، ان کی پارٹی کے بڑے اجلاس ان کے گھروں پر ہی منعقد ہوتے ہیں۔ اگر حکومت نے اس قسم کے اقدامات کرنے ہی ہوتے ہیں تو یہ قدم اس وقت اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے، جب معاملہ خرابی کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے، حکومت اس وقت ایکشن شروع کرتی ہے، جب معاملہ آخری سٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت اپنے فیصلے پر مستقل کاربند رہتی ہے اور تمام اداروں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے، یا چند روز کے بعد یہ غبار بیٹھ جائے گا؟

پاکستانی قوم ابھی سانحہ پشاور کے صدمے سے نہیں نکلی تھی، ابھی ایک ماہ چار روز قبل اپنے بچوں کی پہلی برسی منائی جا رہی تھی، ابھی اے پی ایس کے بچوں کے زخم بھی ہرے تھے، ابھی لوگوں کے دلوں پر لگی چوٹ سے بھی ٹیسس نکل رہی تھیں، کہ ایک اور سانحہ ہو گیا۔ چار دہشت گرد باچا خان یونیورسٹی کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر آئے اور کینیٹین اور ہاسٹل پر اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ ایک جانب سٹوڈنٹس پیپر میں مصروف تھے، دوسری طرف خود باچا خان کی اٹھائیسویں برسی کے موقع پر تقریب کا بندوبست تھا۔ یونیورسٹی میں تین ہزار طلبہ و طالبات اور چھ سو کے قریب مہمان بھی موجود تھے، ایسے میں دہشت گردوں کا گھس آنا بے حد خوفناک منظر تھا۔ دہشت گردوں کے پاس جدید اسلحہ بھی تھا، اور ہینڈ بم بھی، اور وہ خود کش جیکٹس سے بھی لیس تھے۔ اس ناگہانی آفت سے بھگدڑ مچ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف قوم کے نوجوان معماروں کا خون بکھر گیا، جنہوں نے اگلے سالوں میں مختلف شعبوں میں اہم کردار ادا کرنا تھا، ملکی ترقی میں اپنا حصہ ملانا تھا، اپنی حاصل کی گئی تعلیم سے معاشرے کو روشن کرنا تھا، وہ چراغِ بجاہد دیئے گئے، وہ خواب بکھیر دیئے گئے۔

حملے کے موقع پر سب سے پہلے تو یونیورسٹی کے اندر موجود سکیورٹی نے اپنا کردار ادا کیا، جن کی وجہ سے دہشت گردوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد چار سده کی پولیس بھی نہایت ہی تیزی سے موقع پر پہنچ گئی، یوں دہشت گردوں کو کھل کھیلنے کے موقع نہ مل سکا۔ اور فوجی جوانوں نے پشاور سے آنا تھا، دھند بھی یقیناً ہیلی کاپٹرز کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ تھی، مگر ہمارے فوجی جوان بھی دھند کا سینہ چیرتے ہوئے چار سده کی باچا خان یونیورسٹی پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر میں چاروں دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا گیا، مگر اس سے قبل دہشت گردوں کے حملے میں ایک اسٹنٹس پروفیسر سید حامد حسین، لائبریرین افتخار، سولہ طلباء اور دو طالبات جام شہادت نوش کر چکی تھیں۔ اس حملے کے موقع پر ایک اور بھی اہم بات سامنے آئی کہ سکیورٹی گارڈز، پولیس اور فوج کے بعد چار سده کے کئی لوگ بھی اسلحہ لے کر یونیورسٹی پہنچ گئے، دہشت گردوں سے مقابلے کا یہ منظر نہایت حوصلہ افزا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نے اب دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سٹوڈنٹس نے بتایا کہ پروفیسر حامد حسین نے بھی پستول کی مدد سے دہشت گردوں پر فائرنگ کی، جس سے سٹوڈنٹس کو محفوظ مقامات پر پہنچنے میں مدد ملی، تاہم بعد میں پروفیسر صاحب بھی شہید ہو کر اپنی زندگی کو امر کر گئے۔ دہشت گردی کی اس واردات سے قبل خیبر حکومت ہائی الرٹ ہو چکی تھی، کیونکہ اس قسم کی دھمکیاں موجود تھیں، اسی الرٹ کی بنا پر تمام سکول بند تھے۔ تمام سکیورٹی اداروں کے بروقت پہنچنے، دہشت

گردوں کو مزاحمت کا سامنا ہونے اور تعلیمی اداروں کے بند ہونے سے قوم ایک بہت بڑے سانحے سے محفوظ رہی۔ یونیورسٹی میں چونکہ ہزاروں طلبہ و طالبات اور سیکڑوں مہمان تھے، اللہ کے فضل سے وہ محفوظ رہے۔

جنرل راجیل شریف بھی اس اندوہناک واقعے کے بعد باچا خان یونیورسٹی پہنچ گئے، انہوں نے موقع پر صورت حال کا جائزہ لیا اور زخمیوں کی عیادت کی، اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھایا اور اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ رواں سال دہشت گردی کے خاتمے کا سال ہوگا۔ جنرل راجیل شریف کے موقع پر پہنچنے سے ماحول میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے، ان کی دہشت گردی کے خاتمے کے لئے ذاتی دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اور شہداء کے لواحقین بھی اس اقدام کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سانحہ کے بعد پاک فوج کے ترجمان عاصم سلیم باجوہ نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ دہشت گردوں کے پاس جو موبائل فون تھے، ان میں افغان سمیں استعمال ہو رہی تھیں، اس لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ دہشت گردوں کے تانے بانے افغانستان سے ملتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دہشت گردوں کو مسلسل موبائل کے ذریعے ہدایات دی جا رہی تھیں، حتیٰ کہ ان کے ہلاک ہونے کے بعد بھی ایک فون بجتا رہا، ان کا ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا ہے، اصل دشمن تک پہنچ گئے ہیں، بہت جلد صورت حال واضح ہو جائے گی۔

پاکستان کئی سالوں سے دہشت گردی کے عذاب میں مبتلا ہے، ہزاروں بے گناہ شہری اور فورسز کے سیکڑوں جوان جام شہادت نوش کر چکے ہیں، بے شمار گھراڑ گئے اور بہت سوں کے گھروں میں تاریکی اور مایوسی نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ مارنے والے کو یہ نہیں معلوم کہ وہ ان بے گناہوں کو کیوں مار رہا ہے اور مرنے والے نہیں جانتے کہ ان کا قصور کیا تھا۔ دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لئے وفاقی حکومت اور پاک فوج نے تمام سیاسی و دینی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے ہم آہنگ کیا تھا، تمام لوگوں نے مل کر دہشت گردی کے خاتمے کے لئے حکومت اور فوج کو مینڈیٹ دیا تھا، جس کے نتیجے میں گزشتہ سے پوسہ سال کے آخری دنوں میں نیشنل ایکشن پلان تشکیل دیا گیا تھا، اسی کے تحت وزیرستان میں آپریشن ”ضرب عضب“ کا آغاز کیا گیا تھا۔ اگرچہ گزشتہ سال بھی دہشت گردی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے، مگر پہلے سے واضح کمی محسوس کی گئی۔ جب کمی کو دیکھتے ہیں تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ دہشت گردی میں کمی ضرور ہوئی ہے، مگر اب جتنے واقعات رونما ہو رہے ہیں، یہ بازاروں یا مساجد میں نہیں ہو رہے، بلکہ ان میں فورسز یا تعلیمی اداروں کو ٹارگٹ بنایا جا رہا ہے، گزشتہ چار چھ واقعات کو دیکھیں تو سب کے سب کسی اہم ٹارگٹ کو مد نظر رکھ کر کئے گئے ہیں۔

یہ ظلم کون کر رہا ہے، اس کے پیچھے کون سے مضبوط اور منظم ہاتھ ہیں، پاک

فوج کے ترجمان کے مطابق دہشت گردی کے اس تازہ واقعہ میں ہم مکمل طور پر اصل دشمن تک پہنچ گئے ہیں، ظاہر ہے ابھی بہت سی باتیں فوری طور پر منظر عام پر نہیں لائی جاسکتیں، مگر اتنا تو عام آدمی بھی جانتا ہے، کہ چند ماہ قبل جب بھارتی شہر یٹھانکوٹ کے ایئر بیس پر دہشت گردی کے حملے میں چند بھارتی فوجی مارے گئے تو اس کے بعد سے بھارتی وزیر دفاع نے جتنے بھی بیانات دیئے ہیں، اور مسلسل جس انداز میں گفتگو کی ہے، اس سے عام آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ بھارت کے اس سلسلہ میں کیا عزائم ہیں۔ بھارتی وزیر دفاع منوہر پاریکر نے مختلف تقریبات اور میڈیا بریفنگ وغیرہ میں کہا کہ جب تک دشمن کو تکلیف نہیں دیں گے اس وقت تک وہ ہماری تکلیف کو نہیں سمجھے گا۔ یہ بھی کہا کہ اب ہم بتائیں گے کہ ہم نے کب، کہاں اور کیا کرنا ہے؟ انہوں نے صاف الفاظ میں دہشت گردوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کی بات کی۔ اور یہ بھی کہا کہ دیش کی محبت میں ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں، اس معاملہ میں سب کچھ جائز ہے۔ بھارتی وزیر دفاع نے تو پاکستان دشمنی کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا کہا اور کیا، مگر صدمے کی بات تو یہ ہے کہ استعمال تو ہمارے لوگ ہی ہو رہے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ دہشت گردی کے ایسے واقعات کو بھی اسلام کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، ایسی شرمناک اور غیر اسلامی حرکت کوئی مسلمان بھی کر سکتا ہے، دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں، اگر واقعی وہی لوگ کر رہے ہیں جو ایسے واقعات کی ذمہ داری قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتے، اور بعض اوقات ایک سے

زیادہ گروہ ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں، مگر کوئی مسلمان کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پاک آرمی اور حکومت کے دیگر ادارے یقیناً اس سانحے میں ملوث دہشت گردوں تک پہنچنے کی پوری کوشش کریں گے، جبکہ اس مرتبہ ثبوت پہلے سے زیادہ واضح ہیں، انہی کی روشنی میں وہ خفیہ ہاتھوں تک بھی پہنچ جائیں گے، مگر قوم پریشان اس لئے بھی ہے کہ نیشنل ایکشن پلان پر پوری توانائیاں صرف کرنے کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، اس پر حکومت کو تمام متعلقہ اداروں اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر اس سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اصل ٹارگٹ دہشت گردوں کا خاتمہ ہے، ورنہ تعلیمی اداروں کی سکیورٹی بڑھانا یا انہیں محفوظ بنالینا ممکن ہی نہیں، کیونکہ ملک بھر میں لاکھوں سکول ہیں، اور یونیورسٹیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس وسیع رقبہ ہے، جس کی چار دیواری بھی مسئلہ ہے، اور اس پر سکیورٹی کا بندوبست بھی ممکن نہیں۔ اس وقت پوری قوم دہشت گردی کے خاتمے کے لئے حکومت اور پاک فوج کے ساتھ ہے، شہدائے سانحہ چار سدہ کے غم میں برابر کی شریک ہے، اور اپنے ملک کی حفاظت کے لئے دعا گو بھی ہے اور فورسز کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لئے تیار بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک وطن کی حفاظت فرمائے، آمین۔

گاؤں میں ہمارا گھر ایک بڑے احاطے میں تھا، جس میں ہمارے علاوہ ہمارے عزیزوں کے بھی تین چار گھر تھے۔ احاطے کے تقریباً درمیان میں جامن کا ایک بڑا سا درخت تھا، گرمیوں کی دوپہر تمام گھروں کی خواتین اور بچے اسی درخت کے نیچے چارپائیاں رکھ کر گرمی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لئے جمع ہوتے، مرد حضرات شام ڈھلے کھیتوں سے واپس پلٹتے تھے۔ اگرچہ ہمارا اکیلا گھر باقی تمام گھروں کے برابر تھا، مگر تمام گھروں کے درمیان دیواریں نہیں تھیں، بس دو تین فٹ اونچی رکاوٹ نما دیواریں تھیں، جن سے صرف گھروں کی حدود کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کہاں سے کس کا گھر شروع ہوتا ہے۔ جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے، دیواریں بھی بڑی ہوتی گئیں، چھوٹے گھر دیواروں میں گھر گئے، اور مل جل کر رہنے والے بڑے ایک دوسرے سے دور ہو گئے، اکٹھا کھیلنے والے بچے رکاوٹوں کے سامنے بے بس ہو گئے۔ دیواریں شاید وقت کی ضرورت تھیں، مگر جتنا بھی پیچھے کی طرف سفر کرتے جائیں دیواریں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں، پہلے احاطے ہی ہوتے تھے اور کئی قریبی عزیزوں کے گھر اس میں موجود ہوتے تھے۔ مگر بعد ازاں دیواروں کی اٹھان کا سلسلہ شروع ہو گیا اور معاملہ آگے بڑھ گیا۔

شہروں میں حالات آغاز ہی سے مختلف تھے، ہر کسی کی اپنی حد پر دیوار کھڑی تھی، وجہ یہ تھی کہ دیوار کے اُس پار کوئی اجنبی لوگ رہتے تھے، دیوار کا مطلب ہی یہی لیا جاتا ہے کہ اس کے پار غیر رہتے ہیں، دیہات میں اگر ایک احاطے میں دیواریں اٹھیں تو اس کے پیچھے بھی یہی فلسفہ کارفرما تھا، یعنی خاندانوں کی آپس کی لڑائیوں اور مخالفتوں کی بنا پر ہی دیواریں کھڑی ہوئیں، اور اپنے بھی اجنبی کھلائے۔ تاہم شہروں کی دیواروں کے پیچھے اجنبیت ضرور تھی، نفرت نہیں۔ آج بھی یہی عالم ہے کہ شہروں کی جدید اور بڑی آبادیوں میں کوئی ہمسایہ دوسرے کا واقف تک نہیں، کئی کئی سال سے ہم دیوار لوگ ایک دوسرے کی چہرہ شناسی سے بھی محروم ہوتے ہیں، انہیں ساتھ والوں کی کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔ دیواریں گھروں کے درمیان میں تو تھیں ہی، مگر اب گھروں سے باہر گلیوں میں بھی تعمیر ہو رہی ہیں، جنہیں عرف عام میں ناجائز تجاوزات کہا جاتا ہے، یہاں یہ بات بھی حیران کن ہے کہ کیا تجاوزات 'جائز' بھی ہوتی ہیں؟ خیر تجاوزات کا سلسلہ جاری ہے، انہی تجاوزات کی وجہ سے گلیاں تنگ ہوتی جا رہی ہیں۔ گھروں کے درمیان دیواریں تو فطری سی بات ہے، کہ آخر ہر کسی کو خلوت درکار ہوتی ہے، مگر شہروں میں مختلف اداروں اور دفاتر کے باہر چھوٹی سی دیوار ہوتی تھی، اس کے اوپر لوہے کی خوبصورت اور مختصر سی گرل۔ باہر سڑک پر گزرتے

ہوئے اس دیوار کے اندر کی طرف ادارے یا دفتر کی جانب سے لگائے گئے پھول، پودے اور گھاس وغیرہ کا منظر باہر سے صاف دکھائی دیتا تھا، ماحول خوبصورت اور دلکش ہوتا تھا، سبزہ آکھوں کو بھاتا تھا۔ مگر برا ہو دہشت گردی کا کہ اس نے پورے معاشرے کے حُسن کو گہنا کر رکھ دیا ہے، ہم نے دہشت گردوں کے خوف سے دیواریں اونچی کر لی ہیں، تعلیمی اداروں کو حکومت کے حکم کی تعمیل کرنا پڑ رہی ہے، کہ آج کل تعلیمی اداروں کو نشانہ بنانے کی روایت فروغ پذیر ہے، معصوم بچوں اور طلباء و طالبات پر حملے ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اداروں کی دیواریں اونچی کرنا قانون کا حصہ بن چکا ہے، ہمارے ہاں ایک بڑا سرکاری کالج ہے، جس کی خوبصورت عمارت سڑک سے دکھائی دیتی تھی، سامنے بڑا لان تھا، جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوتے اور گھاس کا قالین بچھا ہوتا تھا، کسی ماہر استاد کی نگرانی میں مالیوں کی محنت کے مناظر سڑک سے دیکھے جاسکتے تھے، طلباء گھاس پر بیٹھ کر خوش گلیاں کرتے دکھائی دیتے یا کبھی بیٹھے پڑھ رہے ہوتے۔ کالج انتظامیہ نے نئے حکم پر جب دیواریں بنائیں تو کمال ہی کر دیا، کہ سنگ و خشت کی بجائے آہنی دیوار کھڑی کر دی، لوہے کی بڑی بڑی چادریں لگا کر باہر کا منظر اندھا کر دیا، مزید ستم یہ بھی ڈھایا کہ لوہے کی دیوار کو سیاہ رنگٹ کر دیا، حسین مناظر کے عادی لوگ اب لوہے کی کالی دیوار دیکھتے اور اپنی نگاہوں کو تاریکیوں سے آشنا کرتے ہیں۔ سکیورٹی کا تقاضا ہے کہ دیواریں بنائی جائیں، اگر پہلے سے ہیں تو اونچی کر دی جائیں،

مگر بد قسمتی سے جہاں کہیں بھی دہشت گردی ہوئی، عقبی دیوار پھلانگٹ کر ہی ہوئی۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ دہشت گردی کا خاتمہ کیا جائے، اس کے اسباب پر بھی نگاہ
رکھنے کی ضرورت ہے، دہشت گرد پیدا کرنے والے علاقوں کی ترقی کا منصوبہ بھی بنایا
جائے، وہاں سڑکیں، سکول، ہسپتال اور بنیادی ضرورت کے دیگر عوامل بہم پہنچائے
جائیں، تاکہ کسی کو آسودگی اور خوشحالی چھوڑ کر دہشت گردی کی طرف مائل ہونے کا
موقع ہی نہ ملے۔ ورنہ دیواریں تو صرف سادہ اور سیدھے لوگوں کا راستہ ہی روکا کرتی
ہیں۔

! ہیڈ ماسٹر سکیورٹی گارڈ

ہم گوجرانوالہ کے اُن ہیڈ ماسٹر صاحب کو چشم تصور سے ہی دیکھ سکتے ہیں، جنہوں نے از خود سکول کے سکیورٹی گارڈ کے فرائض سنبھال لئے ہیں، کیونکہ اخبار میں ان کی خبر تو آئی ہے مگر تصویر نہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ہے کہ ہم محکمہ تعلیم کو لکھ لکھ کر تھک گئے ہیں، مگر ابھی تک شنوائی نہیں ہوئی، ہمیں سرکاری طور پر کوئی گارڈ نہیں دیا گیا، جبکہ حکومت کی طرف سے مراسلے آرہے ہیں، جن میں سختی سے حکم دیا جا رہا ہے کہ سکول میں سکیورٹی کا بندوبست مناسب ہونا چاہیے، تعمیل ارشاد میں کوتاہی کی صورت میں ہیڈ ماسٹر ہی ذمہ دار ہوگا، چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک حکومت ہمیں سکیورٹی گارڈ فراہم نہیں کرتی، میں خود ہی یہ ذمہ داری نبھاؤں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا یہ جذبہ قابل تحسین ہے، مگر اس کے پیچھے بہت سی قباحتیں موجود ہیں، اول یہ کہ بہت سے لوگ اور سکول کے اندر سے بہت سے اساتذہ و طلبہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بددوق پکڑے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر (نچی محفلوں میں) مذاق کا نشانہ بنائیں گے۔ دوم یہ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب ہر کسی کی تلاشی لیتے اور ہر کسی پر نگاہ رکھتے مناسب بھی نہیں لگیں گے۔ سوم یہ کہ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب سارا دن گیٹ پر کھڑے رہے تو سکول کون چلائے گا؟ کیونکہ گارڈ کی ڈیوٹی تو بہت سخت ہوتی ہے اور وہ ایک لمحہ بھی

گیٹ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔

جس ادارے کے سربراہ ہر کام خود کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کام کرنے سے نہیں کتراتے، وہ ادارے اکثر کامیاب ہی رہتے ہیں، تعلیمی ادارے کے سربراہ کو کلاس پڑھانی بھی آتی ہو، اس کی معلومات بھی نسبتاً بہتر ہوں، وہ ڈسپلن قائم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، اسے باغبانی کی باریکیوں کا بھی ادراک ہو، وہ عمارت کی تعمیر و مرمت پر بھی گہری نگاہ رکھتا ہو، اسے کمپیوٹر اور آئی ٹی میں بھی مہارت ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بہترین سکول نہ چلا سکے۔ اور اگر ہیڈ ماسٹر خود ہی گارڈ بننے کی خوبی بھی اپنے اندر چھپائے پھرتا ہو، تو یہ مزید سونے پہ سوہاگہ والی بات ہو جاتی ہے۔ اداروں کے ایسے سربراہ جو تمام سکول کے تمام کاموں میں ذاتی دلچسپی لیتے اور خود نگرانی کرتے ہیں، سکول سے متعلقہ ہر فرد ان سے پریشان رہتا ہے، سب کو یہی خدشہ ہوتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب ادھر ہی نہ آجائیں، اور یہ بھی کہ وہ ہر قسم کی غلطی کو پکڑ سکتے ہیں، اس لئے ٹیچر سے لے کر مالی تک سب لوگ چوکس رہتے ہیں۔

گارڈ محکمہ تعلیم (حکومت) نے دینے ہیں یا ان کا خود بندوبست کرنا ہے، یہ ایک اہم مسئلہ ہے، مگر پیچیدہ ہر گز نہیں، بے شمار سرکاری سکول سکیورٹی گارڈ کے بغیر ہی اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، کیونکہ سکول

انتظامیہ کی نگاہ حکومت پر ہے اور حکومت کا تکیہ خود سکول انتظامیہ پر۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سرکار کوئی ایسا حکمنامہ جاری فرمادے، جس سے سرکاری سکولوں پر یہ واضح ہو جائے کہ انہوں نے خود سیوریج کا بندوبست کرنا ہے یا وہ حکومت کا انتظار کریں۔ مگر چھوٹی سی بات پر گو مگو کی کیفیت ہے۔ سرکاری سکولوں میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بہت سے فنڈز ہوتے ہیں، اور ان میں سے بہت سے فنڈز صوابدیدی ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے سکول سربراہان ”فروغِ تعلیم فنڈ“ میں سے رقم نکال کر اس سے سیوریج گارڈ کا اہتمام کر لیتے ہیں، مگر بعض لوگ ہر فنڈ کو اس کی مخصوص مد میں ہی استعمال کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ میں بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ فروغِ تعلیم فنڈ کو گارڈ کی تنخواہ پر خرچ کرتے، آخر بچے محفوظ اور ماحول پر امن ہوگا تو تعلیم کی گاڑی کو آگے بڑھایا یا چلایا جائے گا۔

گوجرانوالہ کے ہیڈ ماسٹر صاحب پر لگتا ہے وزیر اعلیٰ پنجاب کی کارکردگی اور مصروفیات کے بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، کیونکہ میاں شہباز شریف ہر کام خود کرنا چاہتے ہیں، اور ہر مقام پر خود ہی پہنچ جاتے ہیں۔ اسی عمل کو بعض لوگ اُن کی گڈ گورنس قرار دیتے ہیں، جبکہ یہ کمزور حکومت کی علامت ہے، مزہ تب ہے کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر معاملات کو کنٹرول کریں۔ اس عمل کے پیچھے دراصل یہ نفسیات کارفرما ہے کہ وہ ہر کام، اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں،

وہ اختیارات کو تقسیم کرنا ہی نہیں چاہتے، وہ اہم وزارتیں اور زیادہ تر اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اگر مذکورہ بالا ہیڈ ماسٹر صاحب نے احتجاج کے طور پر یہ طریقہ اپنایا ہے تو انہیں کامیابی مشکل ہی ملے گی، اگر انہوں نے وزیر اعلیٰ کے انداز میں کام کرنے کی کوشش کی ہے، تو ممکن ہے انہیں فائدہ ہو جائے۔ اور اگر انہوں نے خلوص نیت سے یہ کام شروع کیا ہے، تو اس کا اجر انہیں ضرور مل کر رہے گا۔

! کھانے کا ضیاع

خود سعودی شریاتی ادارے کی رپورٹ ہے، یہ کسی خفیہ ادارے کی رپورٹ نہیں، نہ ہی کسی ادارے کی سروے رپورٹ۔ کہا گیا ہے کہ صرف سعودی شہر مکہ میں تقاریب میں ضائع ہونے والے کھانے سے اٹھارہ ترقی پذیر ممالک کے سترہ فیصد بچوں کو خوراک مہیا کی جاسکتی ہے۔ اس ضائع شدہ کھانے سے خوراک کی قلت کا شکار 48 لاکھ بچوں کو کھانا فراہم کیا جاسکتا ہے۔ یہ اندازہ تو صرف مکہ مکرمہ کی بابت لگایا گیا ہے، ابھی وہاں مدینہ منورہ بھی ہے اور ریاض اور جدہ بھی۔ ان تمام شہروں کا حساب کتاب کہاں تک پہنچے گا، یہاں کی بڑی تقاریب میں سے بچنے والا کھانا کتنا ہوگا، اور کتنے لاکھ (بلکہ کتنے کروڑ) بچوں کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ دھن کی ریل پیل نے حالات کس قدر تبدیل کر دیئے ہیں کہ ہر قسم کی روایات دم توڑتی جا رہی ہیں۔ کوئی زمانہ تھا جب انسان خوراک کے حصول کے لیے بہت محنت کرتا تھا، تب جا کر وہ پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست کر پاتا تھا۔ ترقی ہوتی گئی اور وسائل بڑھتے گئے، یوں خوراک کی ضرورتیں پوری ہوتی گئیں۔ مگر یہ سب کچھ ہر ملک میں اور ہر جگہ نہیں ہوا، ابھی دنیا میں بہت سے ملک خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔

دنیا میں صرف سعودی عرب ہی نہیں جس کے شہروں میں ہونے والی تقریبات میں کھانا ضائع ہو جاتا ہے، بلکہ اکثر ممالک کا یہی عالم ہے۔ پاکستان کے شہر بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں۔ بڑے ہوٹلوں میں جانے والے لوگ حساب کتاب کے قائل بھی نہیں ہوتے، کیونکہ ان کی جیب میں اس قدر روپے ہوتے ہیں، کہ جتنے بھی خرچ ہو جائیں، انہیں پرواہ نہیں ہوتی، نہ ہی فکر مندی دامن گیر ہوتی ہے کہ پیسے کم ہو جائیں گے، یا دیگر ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں روپے فی کس کے حساب سے بھی کھانا کھایا جاتا ہے۔ کھانے کے ضیاع کی سب سے زیادہ امکان اس وقت ہوتا ہے، جب ہوٹلوں میں 'بوفے' کا بندوبست ہوتا ہے۔ کھانے کی قیمت تو مقرر کر دی جاتی ہے، مگر کس نے کتنا کھانا ہے اور کوئی کتنا کھا سکتا ہے، اس کا کوئی حساب نہیں ہوتا، بعض لوگ تو قیمت نکالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اور بیسیوں ڈشوں میں سے کوئی ڈش بھی بغیر چکھے نہیں چھوڑتے، مگر بعض صاحبان ایسے بھی ہوتے ہیں جو پرہیزی کھانا کھاتے ہیں، یہاں وہ چند لقمے لیتے اور بھاری قیمت دیتے ہیں۔ بوفے میں یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ کسی ڈش کی کمی نہیں ہونے دی جاتی، یوں جب کھانے کا وقت ختم ہوتا ہے تو تمام چیزوں کا پچنا فطری بات ہے۔ یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ جو چیز ایک دفعہ کھانے میں تیار ہو گئی تو دوسرے کھانے میں ہر چیز تازہ ہی ہونی چاہیے، یوں پچھلے کھانے والی تمام چیزیں ضائع ہی تصور ہوتی ہیں۔

اگر قحط زدہ دنیا پر نگاہ ڈالی جائے تو غریب اور مستحق لوگوں کی بھی کمی نہیں، کہیں قلت ہے، کہیں زلزلہ زدگان ہیں، کہیں سیلاب زدگان، کہیں جنگی حالات سے مہاجرین جمع ہیں تو کہیں حالات کی تباہ کاریوں نے لوگوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یوں دنیا میں خوراک کی کمی والے بے شمار لوگ موجود ہیں اور دوسری طرف ضائع کرنے والے بھی کم نہیں۔ اگر کھانے سے قبل ہی یہ خیال کر لیا جائے کہ اتنا کھانا تیار کروایا جائے یا اسی کا آرڈر دیا جائے جتنا آسانی سے کھایا جاسکے، یا جتنا ضرورت ہو، تو یقیناً خوراک بھی بچ سکتی ہے اور جیب پر بھی زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔ اور جن لوگوں کے پاس پیسہ حد اور ضرورت سے زیادہ ہے، وہ یہی شوق مستحق لوگوں کی مدد کے ذریعے پورا کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اب ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ضرورت مندوں کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ پیسے خرچ کرتے ہیں، فلاحتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

مکہ مکرمہ کی اس قسم کی خبر سے لمحہ فکریہ بھی جنم لیتا ہے، یہ وہی سرزمین ہے جہاں معلم کائنات نے آنکھ کھولی، آپ ﷺ نے دنیا کو جہاں تہذیب کے تمام اسلوب سمجھائے اور زندگی گزارنے کے سلیقہ سکھایا وہاں کھانے کے بھرپور آداب سے بھی آگاہ کیا، بتایا گیا کہ اس وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا جائے

جب کچھ بھوک ابھی باقی ہو، اس ضمن میں سائنس اب حرف حرف کی تائید کرتی ہے۔ پلیٹ کو صاف کرنے کو لوگ اب بھی سنت پر عمل کرنے کا نام دیتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کھانے کا کوئی ٹکڑا نیچے گر جائے اسے بھی اٹھا کر کھانے کا حکم ہے، مگر افسوس یہ کہ بہت زیادہ کھانے کے ضائع ہونے کی خبر بھی مکہ مکرمہ سے بھی آئی۔ خوراک پہچانا اسلام کا تقاضا بھی ہے، حالات کا بھی اور اخلاق کا بھی۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب دنیا میں لاکھوں بچے غذائی قلت کا شکار ہوں۔

صبح کے وقت بچے سکولوں کے لئے نکلتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ گلشن میں پھول کھلے ہیں، سڑکوں پر تمام سواریوں کا رخ سکولوں کی طرف ہوتا ہے، غریب علاقوں اور دیہات میں بچے پیدل ہی سکول جا رہے ہوتے ہیں۔ اور کسی سکول کے صدر دروازے کے پاس کھڑے ہو کر دیکھیں تو کیسے سواریوں سے اتر کر بھاگ بھاگ کر سکول میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔ سکول کیا ہے، بچوں کا دوسرا گھر، جہاں استاد اور خواتین ٹیچرز بچوں کو ماؤں بہنوں کی طرح ملتی ہیں، بچے ان کا احترام کرتے اور انہیں آئیڈیل جانتے ہیں، ان کی ایک ایک ادا کو اپنے لئے مثال تصور کرتے ہیں، وہ گھر والوں کی بات پر عمل کریں یا نہ کریں، اساتذہ کے ہر قول و فعل کو اپنے لئے لازم قرار دیتے ہیں۔ بچوں کی یہ مادر علمی، ان کے لئے محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے، چھٹی کے وقت والدین اپنے بچوں کو پھول بچوں کو پھر سے لینے آتے اور ان کی بلائیں لیتے ہیں، کہ آخر وہ پانچ چھ گھنٹے بعد اپنے بچوں سے ملے ہوتے ہیں، اور ماں تو گھر میں انتظار کر رہی ہوتی ہے، اُس ملن کی تو دنیا میں کوئی مثال ہی نہیں۔ یہ سب کچھ روز کا معمول ہے، فطرت کا تقاضا ہے اور روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

ۛ میں سردی کی چھٹیاں ہونے میں چار روز باقی تھے کہ آرمی پبلک سکول میں 2014 تاریخ کے جبر نے اپنے جڑے گاڑ دیئے، یہی دن پاکستان کی تاریخ میں یوم سیاہ کی حیثیت سے موجود تھا، کہ پاکستان کا ایک حصہ اس سے الگ کر دیا گیا تھا، مگر یہ دوسرا بھیانک واقعہ پیش آیا، کہ ڈیڑھ سو سے زائد معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، وہ تو جرم آشنا بھی نہ تھے، انہیں تو دوسروں کو تکلیف دینے کا گُر بھی معلوم نہ تھا، وہ تو ظلم کرنے پر بھی قادر نہ تھے۔ ظالم اور سفاک قاتلوں نے اس قدر فائرنگ کی کہ کلاس روم خون سے بھر گئے، لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، فوجی آپریشن کے بعد دہشت گرد جہنم واصل ہوئے، مگر قوم کے دل پر ایسا چرکا لگا گئے کہ نہ زخم مندمل ہوگا، نہ خون رسنا بند ہوگا اور نہ ہی ان کی یاد کے دیئے نبجھیں گے۔ اس سانحے کا فطری نتیجہ یہی تھا کہ سکولوں اور تعلیمی اداروں کو سکیورٹی فراہم کی جائے، ان انتظامات کے ہونے تک حکومت نے سکولوں کو مہینہ بھر کے لئے بند کر دیا، منفی نتیجہ یہ نکلا کہ جنہیں دور دراز ہونے کی بنا پر سانحہ پشاور کا درست انداز میں اندازہ بھی نہیں تھا، وہ بھی خوفزدہ ہو گئے، کئی روز کی چھٹیوں کے بعد سکول جاتے ہوئے بچوں نے سوچا کہ کہیں دہشت گرد ہمارے ہی سکول میں نہ گھس آئیں۔ انتظامات تو جیسے کیسے ہونے تھے، قوم اپنے بچوں سمیت خوفزدہ ضرور ہو گئی۔

تمام سکولوں کو سرکاری طور پر احکامات جاری کر دیئے گئے، انہیں بتایا گیا کی سکیورٹی کے لیے کیا کیا اقدامات کرنے ہیں، بیرونی دیوار آٹھ فٹ اونچی ہونی چاہیے، مسلح گارڈ موجود ہو، اس کے ہاتھ میں وہ آلہ بھی ہو جس سے یہ جانچا جاسکتا ہے کہ کسی شخص کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو نہیں، کیمرے لگے ہوئے ہوں، گیٹ پر سکول میں داخل ہونے والے ہر فرد کا نام اور وقت وغیرہ درج ہو، پولیس اور متعلقہ ذمہ داروں کے نمبر سکول کے اندر مناسب مقامات پر لگائے جائیں۔ ان ہدایات پر عمل کروانے کے لئے حکومت نے ہر شہر میں اس کی متعلقہ انتظامیہ کو حکم دیا کہ وہ خود میدان میں اتریں اور سکیورٹی کے احکامات پر عملدرآمد کا جائزہ لیں، ایسے سکولوں کو سیل کر دیا جائے جو حکومت کی ہدایات پر عمل کرنے سے گمراہ ہیں۔ جو میٹل ڈیٹیکٹر اٹھارہ سو روپے میں مارکیٹ میں دستیاب تھا، وہ یار لوگوں نے پانچ ہزار تکٹ کا فروخت کیا، یہی عالم کیمروں کا تھا۔

حکومت نے سکولوں کی سکیورٹی کے سلسلہ میں جو احکامات جاری کئے وہ حکومت کی نگاہ میں تو بہت ضروری اور بروقت تھے، مگر بہت سے سکولوں کے لئے مسائل بھی تھے، مثلاً اگر سرکاری سکولوں پر نظر ڈالی جائے تو کون نہیں جانتا کہ بے شمار سکول دیگر بہت سی سہولتوں کے فقدان کے ساتھ ساتھ چار دیواری سے ہی محروم ہیں، ایسے میں کونسی سکیورٹی اور کیسی سکیورٹی؟ اس سے زیادہ مضحکہ خیز صورت کیا ہو سکتی ہے کہ بغیر چار دیواری والے سکول کو سکیورٹی گارڈ یا

دیگر اقدامات کے احکامات دیئے جائیں۔ ایک شہر کے اندر ایک ایسا ہائی سکول بھی تھا جو شہر کا ماڈل سکول تھا، اس کے گیٹ پر سکیورٹی کے مکمل انتظامات تھے، مگر اس کی جو دیوار بڑی سڑک کے ساتھ لگتی تھی وہ تین سے چار فٹ بلند تھی، سکول انتظامیہ کا جواب یہی تھا کہ حکومت فنڈ دے گی تو دیوار بن سکے گی۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ سکیورٹی گارڈ کا بھی ہے، سرکاری سکولوں کا یہی کہنا ہے کہ گارڈ تو حکومت نے ہی دینا ہے۔ ان سرکاری سکولوں کے بعد نجی تعلیمی اداروں کا معاملہ ہے، حکومت نے احکامات تو سب کو دے دیئے، مگر زیادہ تر سکول گلی محلہ میں کھلے ہوئے ہیں، جن کی آمدنی بھی اتنی ہے کہ بس ان کا گزارہ چل رہا ہے، ایسی صورت میں وہ ایک گارڈ یا دیگر اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ حکومت نے سکولوں کی کیٹیگری بھی بنائی، جس میں فیسوں اور تعداد کو مد نظر رکھا گیا۔ اس صورت میں حکومت کا دباؤ مخصوص وقت تک جاری رہا، اور کام ٹھنڈا ہوتا گیا۔ سانحہ پشاور کے موقع پر حکومت نے سکولوں میں مہینہ بھر کی چھٹیاں کردی تھیں، مگر وقت کی ساتھ ساتھ غم کی شدت کم ہوئی اور سکول کھل گئے، اب تقریباً تیرہ ماہ بعد ایک مرتبہ پھر دہشت گردوں نے کاری وار کیا، اب ان کا نشانہ سکول نہیں یونیورسٹی تھی، چار سہ یونیورسٹی میں حملے سے ایک پروفیسر اور دو طالبات سمیت تیس طلبہ نے جاں شہادت نوش کیا۔ اس غمناک واقعے کے بعد حکومتوں نے ایک مرتبہ پھر سکیورٹی کے لئے اپنے انتظامات کا از سر نو جائزہ لیا، اور اسی شد و مد کے ساتھ دوبارہ احکامات جاری ہونے لگے۔

یہ حکومت کا فرض بھی ہے اور فطری ضرورت بھی۔

سیکورٹی کے سلسلہ میں حکومتی اقدامات کو دیکھا جائے تو زمینی حقائق کچھ مختلف ہیں، پاکستان میں کونسی یونیورسٹی ہے، جو کسی چار دیواری میں محصور ہو، کئی مربع کلومیٹر زرعی زمینیں بھی یونیورسٹیوں کی ملکیت ہیں، اس وسیع تناظر میں دیواریں بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں یہ ستم بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دہشت گردوں نے جہاں بھی حملہ کیا، وہ ایئر بیس ہو یا پولیس کاتربیتی مرکز، عقبی دیوار کو پھلانگ کر ہی اندر آئے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے سکولوں کی سیکورٹی کو مکمل طور پر فول پروف بنانا ممکنات میں سے نہیں۔ فرض کیا کسی سکول میں چار دیواری اور دیگر بندوبست بھی مکمل ہیں، مگر چھٹی کے وقت جب بچے باہر آتے ہیں، ان کے والدین یا دیگر لوگ بچوں کو گھر لے جانے کے لئے جمع ہوتے ہیں، موقع پر سڑک بلاک ہو جاتی ہے، اگر خاتم بدہن ایسے میں کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو ذمہ داری کس کے کندھوں پر آئے گی؟ اب حکومت چونکہ سیکورٹی کے بندوبست والے معاملے کو ناقابل برداشت قرار دے رہی ہے، اس لئے حکومت پنجاب نے اپنے طور پر صوبہ بھر کے اضلاع کو تین کیٹیگریز میں تقسیم کر دیا ہے، اور اسی حساب سے ان کی سیکورٹی کے انتظامات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ چونکہ حکومت کا حکم ہے اس لئے مقامی انتظامیہ بھی حد درجہ جذباتی ہے۔

اس ساری صورت حال میں سب سے زیادہ ضرورت دہشت گردی کے خاتمے کی ہے، سکولوں کو بند نہیں کیا جاسکتا، مساجد میں جانے سے نمازیوں کو روکا نہیں جاسکتا، بازاروں میں لوگوں نے جانا ہے، دفاتر اور فورسز کے تربیتی مراکز یا دیگر مقامات کی مکمل حفاظت کرنا اور ہر جگہ پر سیکورٹی کے تمام عناصر کا پورا کر دینا ممکن نہیں۔ دہشت گردوں کے خاتمے کے لئے تعلیم کا عام کیا جانا ضروری ہے، ترقی کی لہر کو پسماندہ علاقوں کی طرف موڑنے کی ضرورت ہے، بے روزگاری کا خاتمہ ہو، بنیادی ضرورتیں دستیاب ہو جائیں، تب قانون کی عملداری کا اہتمام ہو، فنانس کے لوگوں کو قومی دھارے میں لایا جائے۔ دشمن کی خبر بھی رکھی جائے، دشمن کے ناپاک عزائم کو ناکام کرنے کے بندوبست کئے جائیں۔ پورے ملک کو پرامن بنانے کی ضرورت ہے، نہ کہ ہر شخص یا ہر ادارے کو مسلح کرنے کی۔ حکومت کے اقدامات اور ہدایات اپنی جگہ، مگر یہ صرف دل کو تسلی دینے والی بات ہے۔ کرنے کا اصل کام دہشت گردی کا خاتمہ ہے۔

ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا، یہ کام کئی مرتبہ پہلے بھی ہو چکا ہے، بچے صبح اٹھے، (یا اٹھائے گئے)، تیار ہو کر سفر کی صعوبت برداشت کر کے سکول پہنچے تو وہاں لگے نوٹس بورڈ کو اپنا منہ چڑاتا ہوا پایا۔ معلوم ہوا کہ آج فلاں مسئلے کی بنا پر حکومت نے چھٹی کردی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے یوم پیدائش کے موقع پر جب کہ کسی کو خواب خیال بھی نہیں تھا کہ چھٹی ہوگی یا نہیں، مگر حکومت رات گئے تک گومگو کا شکار رہی، خیبر والوں نے چھٹی کردی مگر پنجاب نے وفاقی حکومت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عین وقت پر چھٹی کا اعلان کر دیا۔ یہاں پہلی بات تو یہی قابل اعتراض تھی کہ علامہ اقبالؒ کے یوم پیدائش پر چھٹی کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی، اگر کوئی مجبوری آن ہی پڑی تھی تو قوم کو بر وقت آگاہ کر دیا جاتا۔ یہی کچھ سولہ دسمبر کو ہوا، اگرچہ سولہ دسمبر کی پاکستان کی تاریخ میں پہلے بھی بہت اہمیت تھی، مگر سانحہ پشاور کی پہلی برسی کے موقع پر حکومت نے چھٹی کا اعلان کر دیا، یہ چھٹی بھی ہاں ناں کا چکر چلتے ہوئے ہی ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے بچے سکولوں میں پہنچ بھی گئے، مگر وہاں چھٹی نے ان کا استقبال کیا۔ چھٹی کے ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ اس کی بروقت اطلاع نہ ہونا والدین کے لئے بہت کربناک مسائل پیدا کرتی ہے، بہت سے لوگ

سکول کا نوٹس بورڈ دیکھے بنا ہی بچوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، مگر اگلے ہی لمحے بچے کو معلوم ہوتا ہے کہ آج چھٹی ہے، تو اس کو واپس گھر لانے والا کوئی نہیں ہوتا، پکٹ اینڈ ڈراپ والوں کی بھی ایسی ہی مجبوری ہوتی ہے۔

اس سال سردیوں کی شدت بہت زیادہ ہے، بچوں کا صبح اٹھنا، سردی میں تیاری کرنا اور خون جمادینے والی ٹھنڈک میں سکول جانا نہایت ہی مشکل کام ہے، پھر سکول میں بھی ضروری نہیں کہ سردی کو بھگانے کا مناسب بندوبست ہو، کیونکہ گیس تنک موجود نہیں ہوتی، جس سے کسی حد تک ہیٹر لگا کر سردی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس جان لیوا سردی میں سکولوں میں چھٹیاں کر دینا بظاہر حکومت کا قابلِ تحسین قدم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت یا اس کے متعلقہ کارندوں کی حالات پر نظر ہونے لگی ہے۔ یعنی جہاں حالات نامناسب ہوں وہاں ان کے مطابق فیصلہ کر لینا اچھی خبر ہے۔ یہی فیصلہ حکومت مزید تین روز قبل کرتی تو زیادہ بہتر تھا۔ مگر افسوس یہ ہوا کہ یہ فیصلہ بھی بروقت قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ خبر ممکن ہے کہ حکومت نے رات کو ہی جاری کر دی ہو، مگر قوم کو اس وقت خبر ملی جب بچے سکولوں کو جانے کی تیاری میں تھے، بہر حال میڈیا کے پھیلاؤ اور آگاہی کی بنا پر لوگوں تک خبر تو بہت جلد پہنچ جاتی ہے۔ سردی کی چھٹیوں کا معاملہ نظر ثانی کے قابل ہے، حکومت ہر سال دسمبر کے آخری عشرہ میں سرکاری طور پر سردیوں کی چھٹیاں کرتی ہے، اس روایت پر دسیوں سالوں سے

عمل کیا جا رہا ہے، کسی نے کبھی نہیں سوچا کہ آیا ان دس روز میں سردی کی شدید لہر آتی بھی ہے یا نہیں، یا یہ کہ کیا جنوری میں دسمبر سے زیادہ سردی ہوتی ہے۔ اب دھند کا دور ہے، جب دھند کی لہر آتی ہے تو کئی روز تک نہیں جاتی۔ حکومت ایسے بھی تو کر سکتی ہے کہ دسمبر میں سردیوں کی سرکاری چھٹیاں نہ کی جائیں، ان چھٹیوں کو موسم کی شدت پر چھوڑ دیا جائے، جو نہیں ٹھہرتی سردی کی لہر کا آغاز ہو، آٹھ دس روز کی چھٹیاں کر دی جائی، جیسا کہ اب کیس، مگر اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بار بار چھٹیاں نہیں کرنی پڑیں گی۔

جنوری کے آخر میں اچانک چھٹیاں کر دینے کا فیصلہ کسی حد تک بہت اچھا ہے، کیونکہ سردی کی لہر بہت شدید ہے، مگر ان چھٹیوں کے اعلان کے ساتھ ہی پرائیویٹ سکولز نے مخالفانہ بیانات دیئے ہیں، ان چھٹیوں سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ سکول کھلتے ہی پنجاب ایگزیکیمینیشن کمیشن کے تحت پانچویں کلاس کا امتحان شروع ہو جائے گا، اس کے ختم ہوتے ہی آٹھویں کلاس کا امتحان شروع ہوگا۔ یوں جس کلاس کے پیپر سے ایک ہفتہ پہلے چھٹیاں ہو جائیں تو پانچویں کلاس کا بچہ گھر میں کیا تیاری کرے گا، نتیجہ کیا ہوگا، جبکہ پہلے ہی عوام کے بے شمار تحفظات موجود ہیں، گزشتہ برس بہت سے بچے PEC پانچویں کلاس میں فیل ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے کمیشن کے امتحان پر بھی بے شمار سوالات اٹھے تھے، مگر اب تو تیاری کا مناسب موقع ہی نہیں ملے گا، کیا

تیار ہی ہوگی؟ نتیجہ یہی۔ برآمد ہوگا کہ بہت سے بچے فیل ہو جائیں گے اور عوام پریشانی کے
عالم میں محکمہ تعلیم کے دفاتر کے چکر کاٹتے رہیں گے۔

آبادی کا پھیلاؤ، درختوں کا کٹاؤ پانی اور زرعی اجناس کی قلت

کوئی زمانہ تھا جب شہر بڑی بڑی فصیلوں میں بند ہوتے تھے، سرشام ہی زندگی شہروں کے اندر محصور (محفوظ) ہو جاتی تھی، بجلی کا عمل دخل کم تھا، غروب آفتاب کے بعد تاریکی کا راج ہو جاتا تھا۔ اندرون خانہ تو چراغ جلتے تھے، مگر ”سٹریٹ لائٹ“ کا تصور بہت کم تھا، تاہم ترقی یافتہ یا خوشحال شہروں میں تب بھی گلیاں سرکاری روشنیوں سے منور ہوتی تھیں۔ شور اور ہنگامے کا زمانہ نہیں تھا، آواز کو بلند کرنے کے آلات ایجاد نہ ہوئے تھے، اس لئے سکون ہی سکون تھا۔ محفلیں سجتی تھیں، مگر اس کی ساری رونق چار دیواری کے اندر ہوتی۔ شہر کی فصیل بلند و بالا ہوتی، مضبوط اور محفوظ ہوتی، اس کی

مزید حفاظت کے لئے پہریدار موجود ہوتے تھے۔ فصیل میں مختلف مقامات پر دروازے ہوتے تھے، ان سے اندر داخل ہوتے ہی بازار کا آغاز ہو جاتا، پھر تنگ گلیاں۔ ہر طبقے کا الگ محلہ ہوتا تھا، ہر محلے کا نام اس میں رہائش پذیر طبقے کے نام پر رکھا جاتا تھا۔ شہر کے بڑے دروازے خوبصورت اور مضبوط ہوتے تھے، پرانے شہروں میں اب بھی بہت جگہوں پر یہ دروازے موجود ہیں، بہت سے دروازے ایسے بھی ہیں، جو ابھی تک بہترین حالت میں موجود ہیں۔ ان شہروں کے باہر چاروں طرف باغات ہوتے تھے، جس سے نہ صرف یہ کہ شہر کا موسم بہت اچھا رہتا تھا، بلکہ وہ شہر کی پھلوں کی ضروریات کو بھی

پورا کرتے تھے۔ کھلے میدان بھی شہر سے باہر ہی ہوتے تھے، جہاں بازوق حکمرانوں کی ہدایت کے مطابق کھیلوں وغیرہ کا اہتمام ہوتا تھا، یہی مقامات سیرگاہ (تفریح گاہ) کا کام دیتے تھے۔ اسی طرح اہم دفتری عمارات بھی شہر سے باہر بنالی جاتی تھیں۔ یا پھر خود حکمرانوں کے محلات شہر سے باہر ہوتے تھے۔ یہ عام پرانے شہروں کا قصہ ہے۔ صدیوں پرانے دارلحکومتوں کی کہانی ذرا مختلف تھی، عام شہر فصیلوں کے اندر ہوتے تھے، مگر بادشاہوں کے محلات کی بنا پر شہر سے باہر بھی رونق ہوتی تھی، شہر سے باہر باغات اور کئی میل دور کوئی محل، دوسری طرف کئی میل دور کوئی سیرگاہ، اور تیسری طرف کئی میل دور کوئی مزار۔ یوں لوگوں کو شہر سے نکل کر باغات میں سے ہوتے ہوئے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔

پھر آبادیاں بڑھنے لگیں، محلے گنجان آباد ہو جانے کی بنیاد پر گھٹن کا شکار ہونے لگے، لوگ شہر سے باہر نکلنے لگے، باہر والے باغات کٹنے لگے، فصیلیں بوسیدہ ہو کر گرنے لگیں، دروازے مسمار ہونے لگے۔ شہر سے باہر (یعنی فصیل سے کوئی سو میٹر کے فاصلے پر بھی) جو زمین اب دس لاکھ روپے مرلہ میں کوئی فروخت نہیں کرتا، تب یہ زمین کوڑیوں کے بھاؤ ملی، بلکہ بہت سے لوگ خریدتے نہیں تھے، کہ جنگل میں کون جائے؟ مگر اب وہی جگہ شہر کے مرکز میں ہے۔ جس کسی نے ساٹھ ستر برس قبل ایک کنال زمین پانچ ہزار روپے میں خریدی تھی، اب

وہ دو کروڑ سے زائد مالیت کی ہے۔ شہر سے باہر نکلنے کا عمل بہت سست روی سے جاری تھا۔ مگر گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں زمین کو گویا پیر لگ گئے ہیں، اس کی بلند پروازی کی داستان طویل ہوتی جا رہی ہے، قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ بڑی بڑی کالونیاں معرض وجود میں آ گئی ہیں، اس کاروبار نے ایک صنعت کا درجہ اختیار کر لیا ہے، بڑے شہروں میں یہ کاروبار عروج پر ہے، اور اس کاروبار سے وابستہ لوگ شہر کے بڑے سرمایہ داروں میں شامل ہو چکے ہیں۔ جس کا یہ کاروبار چل نکلا ہے، اس کی پانچوں گلی میں ہیں اور سرسبز اہی میں، اس کاروبار میں عام آدمی بھی پیسے والا ہے۔ ان کالونیوں اور سوسائٹیوں کے معاملات کیا ہیں؟ یہ کہانی مختلف ہے۔ بہت بڑا کاروبار ہونے کی وجہ سے متعلقہ دفاتر کی مداخلت اور ان سے ڈیل کرنے کا انداز بھی مختلف ہے۔

نئی نئی ہاؤسنگ سکیموں نے گاہک کو متاثر کرنے کے لئے کالونی کی چار دیواری بنائی، خوبصورت گیٹ لگایا، محافظ کھڑے کئے، اچھی سڑکیں بنائیں اور پودے لگائے، تمام بنیادی سہولتوں کی دستیابی کا وعدہ کیا، یا فراہم کر دیں، اس لئے کامیابی ان کے قدموں میں آ گری۔ اب پرانے شہروں کو ”اندرون شہر“ کہا جاتا ہے، اگر ”بیرون شہر“ کو دیکھیں تو وہ میلوں تک پھیل گئے ہیں، جس کسی نے کسی شہر کو پندرہ، بیس برس بعد دیکھا تو وہ حیرت کے سمندر میں غرق ہو گیا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، وہ انگشت

بدنداں بیس سال پہلے کے مناظر کو تلاش کرتا رہا، خالی جگہوں پر پلازے کھڑے ہو گئے۔ باغ کی جگہ بڑی بڑی کوٹھیوں اور قیمتی رہائش گاہوں نے لے لی۔ حتیٰ کہ شہروں سے باہر دور تک لہلہاتی کھیتیاں بھی آبادیوں کے پاؤں تلے کچلی جا چکی ہیں، زرعی زمین تیز رفتاری سے کم ہو رہی ہے، جس کی جگہ پر آبادیاں ہی وجود میں آ رہی ہیں۔

اس بہت بڑی تبدیلی کو ہم ترقی کا نام دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ جہاں شاندار رہائشی سکیمیں بن رہی ہیں، ثابت ہوتا ہے کہ وہاں لوگ خوشحال ہیں، وہاں روپے کی ریل پیل ہے، وہاں لوگوں کا معیار زندگی بہت بلند ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے، مگر اس تبدیلی سے جو نقصانات سامنے آرہے ہیں، ان کی طرف بہت کم لوگ توجہ دے رہے ہیں، جب کسی سڑک کی توسیع کے لئے صدیوں پرانا درخت کاٹا جاتا ہے، اور اسے اونے پونے اور ملی بھگت سے فروخت کیا جاتا ہے، تو اس کے نقصان کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے، وہاں بہت سے پرندے بھی رہتے ہونگے، وہاں لوگ سائے کے لئے بھی بیٹھتے ہونگے، اس درخت سے آکسیجن بھی خارج ہوتی ہوگی، شہر کی آلودگی کم کرنے میں بھی وہ معاون ہوتا ہوگا، کاربن ڈائی آکسائیڈ میں کمی کا موجب بھی بنتا ہوگا۔ ایکٹ نہیں، جب ہزاروں پرانے درخت کاٹے جائیں گے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح زرعی زمین میں جب فصل کی بجائے عمارتیں اگ آئیں گی، تو انسان کھائے گا کیا؟ اس سے خوردنی اشیاء کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ جس

چیز کو ہم ترقی کا نام دے رہے ہیں، یہ ہمارے لئے تنزلی کا موجب بن جائیں گی۔
 شہروں کے پھیلاؤ میں خود شہروں کا جس قدر ہاتھ ہے، اس سے کہیں بڑھ کر اس میں
 دیہات والوں کا کردار ہے۔ چند برس قبل جب شہروں کا پھیلاؤ تیزی سے شروع ہوا،
 اس وقت دیہات سے لوگوں کا شہر میں منتقل ہونے کے رجحان زوروں پر تھا، ظاہر ہے
 اس کی بنیادی اور اہم وجہ یہی تھی کہ لوگ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوانا چاہتے تھے،
 ان کو صحت کی بنیادی سہولیات بہم پہنچانا چاہتے تھے، اسی رجحان کے پیش نظر دیہاتی
 شہروں میں منتقل ہوتے گئے، اور کالونیاں آباد ہوتی گئیں۔ شہروں کی جانب آنے والے
 آبادی کے اس ریلے کو روکنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ترقی کا رخ دیہات کی جانب بھی
 موڑا جائے، وہاں پختہ سڑکیں بنائی جائیں، سکول قائم کئے جائیں، ہسپتال کی سہولت دی
 جائے، اگر اسی قسم کی تمام ضرورتیں گاؤں میں پوری ہو جائیں تو شہروں میں منتقل
 ہونے والوں میں واضح کمی آسکتی ہے۔ جب سے شہروں میں بڑی کالونیاں بننے لگی ہیں،
 لوگوں کو آبادیوں سے ذرا دور رہ کر بھی رہائش رکھنے کی عادت پڑ رہی ہے، پہلے شہر
 سے چار کلومیٹر دور گاؤں کا شہر سے بہت فاصلہ گنا جاتا تھا، اور ماحول مختلف ہوتا تھا،
 مگر اب چھوٹے شہروں میں بھی پانچ سات کلومیٹر دور گاؤں سے لوگ شہروں میں
 شفٹ نہیں ہوتے، وجہ وہی ہے کہ انہیں پختہ سڑک دستیاب ہے اور موٹر سائیکل

وغیرہ کی صورت میں سواری بھی اس کے پاس موجود ہے۔

آبادی میں حد سے زیادہ اضافے کی وجہ سے ایک عجیب تضاد سامنے آ رہا ہے، یعنی کھانے اور رہائش کی ضرورتیں بڑھ رہی ہیں، اور یہ ضرورتیں پوری کرنے والی زمینیں کم ہو رہی ہیں، زراعت ویسے بھی زوال پذیر ہے، یہی وجہ ہے کہ زرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، دوسری جانب روزگار کے مواقع کم ہو رہے ہیں، جہاں کسی ملازمت کے لئے مڈل پاس بھرتی کیا جاسکتا ہے وہاں ایم اے پاس بھی درخواست گزار رہا ہوتا ہے۔ جہاں دس سیٹیں خالی ہوتی ہیں وہاں درخواست دینے والوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی ہے۔ آبادی کے پھیلاؤ کا ایک اور بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ زیر زمین پانی جو کہ بہت ہی تیز رفتاری سے کم ہو رہا ہے، (کیونکہ ہر گھر میں لال پمپ کے ذریعے پانی کھینچا جا رہا ہے) جو پانی تیس فٹ زیر زمین تھا اب وہ سو فٹ سے بھی نیچے جا چکا ہے، پانی کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ زیر زمین پانی صاف بھی نہیں رہا، بلکہ اس میں زہریلے مادے شامل ہو چکے ہیں۔ کیونکہ زمین کے اوپر موجود دریا خشک ہو رہے ہیں، جن کے اثرات زیر زمین پانی پر بہت ہی گہرے، خراب اور دور رس ہیں۔ سنگ و خشت کی ظاہری نمود و نمائش کو ترقی کہتے ہوئے آنے والے ۱۰ برسوں کی فکر بھی نہایت ضروری ہے۔

! گورنری کے لوازمات

گورنر پنجاب جناب رفیق رجوانہ نے اطلاع دی ہے، کہ پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف عوام میں اپنی حیثیت کھوپکی ہیں، مسلم لیگ کی مقبولیت کی وجہ سے بہت سے چیئرمین اور کونسلر مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ انہوں نے سکولوں کو سکیورٹی کو بہتر کرنے اور تعلیم اور صحت کے لئے نئے منصوبوں کی بھی خوشخبری سنائی۔ گورنر کو وفاق کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے، گورنر صدر پاکستان کا نمائندہ ہوتا ہے، اور صدر سربراہ مملکت کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں وزیر اعلیٰ حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان میں صدر وفاقی حکومت کے تابع ہوتے ہیں، انہیں حکومت ہی نامزد کرتی اور الیکشن میں کامیاب کرواتی ہے۔ تاہم گورنر کے لئے کسی ووٹنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ براہ راست حکومت کی مرضی سے گورنر ہاؤس کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ایک تو گورنر کے پاس اختیارات نامی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ صرف نام اور پروٹوکول کے مزے ہوتے ہیں، جب تک کوئی گورنر اپنی سیاسی حکومت کی خوشنودی کے لئے کام کرتا رہے گا، تب تک وہ اپنی حیثیت قائم رکھ سکتا ہے، جو نہی اس نے کوئی پر پُرزے نکالنے شروع کئے، اس کو فارغ کر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ گورنر کا عہدہ غیر سیاسی کہلاتا ہے، وہ عملی سیاست میں مداخلت نہیں کرتا، نہ ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے، مگر

اپنے ہاں یہ رواج بھی نہیں۔ اپنے موجودہ گورنر بھی روایت کو قائم رکھتے ہوئے خود کو مسلم لیگ ن کا کارکن قرار دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، بلکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ خود کو پارٹی کا کارکن اور قیادت کا ادنیٰ خادم قرار دیں گے تو ان کی نوکری قائم رہے گی، بصورت دیگر وہ بھی سابق گورنر کی طرح فارغ کردیئے جائیں گے۔

گورنر عہدے کے لحاظ سے زیادہ مصروف آدمی نہیں ہوتے، انہیں بعض دستاویزات وغیرہ پر دستخط کرنے کے علاوہ کوئی خاص کام نہیں کرنا پڑتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں دستخط کرنے یا کوئی منظوری وغیرہ دینے کے لئے نہ خود سے سوچنا پڑتا ہے اور نہ ہی کوئی مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گورنر کو ہر کام آسان کر کے دیا جاتا ہے۔ اسی لئے ایسے لوگوں کو گورنر کے لئے آگے لایا جاتا ہے جو نہ تو زیادہ سوچ بچار کے چکر میں پڑیں اور نہ ہی زیادہ بھاگ دوڑ کی فکر کریں۔ ان کے چونکہ اختیارات نہیں ہوتے اس لئے وہ خود کو مصروف رکھنے کے لئے پریشان ہوتے ہیں۔ عموماً گورنر کا عملہ ان کی یہ پریشانی دور کر دیتا ہے، وہ ہر روز صبح جہاں گورنر کے لئے واک، ورزش، طبی ناشتہ، ملاقاتوں، میٹنگز وغیرہ کی فہرست مرتب کرتا ہے، وہی انہیں بتایا جاتا ہے کہ فلاں فلاں تقریب میں بھی جانا ہے، یا فلاں تقریب گورنر ہاؤس میں، ہی منعقد کرنا ہے۔ یوں رات گئے تک گورنر صاحب کو فرصت نہیں ملتی

یوں وہ فارغ ترین فرد کی بجائے مصروف ترین عہدیدار قرار پاتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ گورنر زیادہ مصروف نہیں ہوتے، اس لئے سرکاری طور پر انہیں مصروف کر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی اگر کبھی موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ باہر نہ نکل سکیں، یا سفر ممکن نہ ہو، یعنی کوئی تقریب وغیرہ نہ سجائی جاسکے تو گورنر کے لئے کوئی ملاقات ہی تیار کر دی جاتہ ہے۔ جہاں انہیں کچھ مصروفیت مل جاتی ہے۔ اس ملاقات کو خبر کی صورت میں میڈیا کے لئے جاری کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو میڈیا کو خبر دینے کے لئے صاحب کا مستعد عملہ بھرپور تیاری اور مہارت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ میڈیا کے لئے ایسا پالیسی بیان دے دیا جاتا ہے، جو حسبِ حال بھی ہوتا ہے اور حکومت کی خوشنودی کا سامان بھی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہوتا کہ گورنر کو بھی اس بیان کا علم ہو کہ انہوں نے دیا ہے یا نہیں، آخر وہ عملہ کس کام کی تنخواہ لیتا ہے؟ موجودہ گورنر چونکہ اس عہدہ جلیلہ پر متمکن ہونے سے قبل ایوانِ بالا کے معزز رکن تھے، ظاہر ہے سینٹ کا ممبر اسی کو بنایا جاتا ہے، جو حکومت کا خاص آدمی ہو، مگر الیکشن میں اس کی کامیابی کے امکانات نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ گورنر صاحب اپنی اس اہم سیٹ کی بقا کے لئے وہ تمام لوازمات کو نگاہ میں رکھتے ہیں، جن سے ان کی مدت ملازمت کو طول مل سکے۔ رجوانہ صاحب کو چاہیے کہ وہ کراچی جانے کا کوئی بندوبست کریں اور گورنر سندھ سے وہ گیدڑ

سنگھی حاصل کرنے کی کوشش کریں جس سے تاحیات گورنری ملنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں، سیاہی خوشنودی بھی نہیں کرنا پڑے گی اور کام بھی بن جائے گا۔ امید ہے گورنر جوانہ پھلی فرصت میں یہ کام کریں گے۔

وہ بہاول پور کی ایک دور دراز تحصیل حاصل پور کے ایک گاؤں کا چھوٹا سا میندار ہے، اسی گاؤں کی ایک دوشیزہ نے اس کے ساتھ دل کا لین دین کر لیا۔ وہ دور لکھ گیا جب دیہات میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کی طرف دیکھتا تھا، یا دیکھتے ہوئے ”رنگے ہاتھوں“ پکڑا جاتا تھا، تو پورے گاؤں میں شور مچ جاتا تھا، اس عمل کو صرف لڑکی کے لئے ہی نہیں بلکہ لڑکے اور اس کے گھر والوں کے لئے بھی بدنامی کا سبب جانا جاتا تھا۔ رابطہ کرنے اور پیغام رسانی کے قصے بھی عجیب، نہایت ہی مشکل اور پرخطر تھے۔ اپنے ایک سابق فوجی حکمران پر ویز مشرف نے بھی اپنے ایسے ہی معاشقوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نانی کی جیب میں خط ڈال دیا کرتے تھے اور وہ مطلوبہ پارٹی جیب سے نکال لیا کرتی تھی۔ یہی کام یار لوگ خواتین سے بھی لیتے تھے، اور بچوں سے بھی۔ مگر اب زمانہ بدل چکا ہے، اب ہر ہاتھ میں موبائل ہے، اب اس قسم کے رابطے کے لئے ہر کوئی خود کفیل ہو چکا ہے۔ حاصل پور کی جوڑی کے بھی ایک دوسرے سے عہد و پیمان چلتے رہے۔ پھر اکٹ روز یہ ہوا کہ لڑکی کو معلوم ہوا کہ یار موصوف کی حاصل پور شہر میں بات پکی ہو گئی ہے۔ یہ خبر لڑکی پر تیر بن کر گری اور اس کے دل میں پیوست ہو گئی، اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، موقع پا کر اس نے اپنے (سابق) محبوب پر اس وقت تیزاب پھینک دیا

جب وہ رات آرام میں تھا، اس سے وہ بری طرح جھلس گیا، لڑکی کو گرفتار کر لیا گیا، مقدمہ بھی درج ہو گیا۔ یہاں واردات ذرا مختلف ہے، کہ تیزاب لڑکی نے پھینکا، جبکہ عموماً اس معاملے میں مرد حضرات زیادہ بدنام ہیں۔

دیہات ہوں یا شہر تیزاب گردی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، معاملہ تیزاب سے آگے بھی چلا جاتا ہے۔ محبت کے پروان نہ چڑھنے پر یہ دیوانے عجیب گل کھلاتے ہیں، یہ اسی کو جان سے بھی مار دیتے ہیں، جس پر زندگی وارنے کے وعدے کر رہے ہوتے ہیں، اسے بھینٹ تضا د کہیے یا انتقام کی آگ میں بھسم ہو جانے کے بعد حواس باختہ ہونے کی بات کیجئے، کہ دل جس کے لئے ہمیشہ دعا گو رہتا ہے، کہ اُسے کاٹنا بھی نہ چھیننے پائے، اسے گرم ہوا نہ لگے، اسے کوئی غم نہ ملے، اسے کوئی تکلیف نہ ہو، وہ پریشانیوں سے محفوظ رہے اور اس کی ذات کے لئے جتنی احتیاط اور اپنائیت ہو سکتی ہے، وہ دعاؤں، تمناؤں اور خوابوں کی صورت ہمہ وقت ساتھ رہتی ہے۔ مگر جب خوابوں کا بُت ٹوٹتا ہے، تو اس کے ٹکڑے تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں ملتے، بلکہ وہ کرچیوں کی صورت میں پھنسنے والوں کی انگلیوں کو پوروں کو لہو لہو کر دیتی ہیں۔ جب ایسا خواب ٹوٹتا ہے، تو وہ خواب ہی نہیں بلکہ دل ٹوٹ جاتا ہے، کہتے ہیں کہ دل کے آئینے میں بال آجائے تو کبھی صاف نہیں ہوتا اور جب دل ٹوٹ ہی جائے تو وہ کیسے جڑے گا؟

اپنے محبوب ترین فرد کو قتل کرنا، یا اس پر تیزاب پھینکنا انتقامی کارروائی کی انتہا ہے، جو لوگ یہ دونوں کام نہیں کر سکتے تو انتقام وہ بھی لیتے ہیں، مگر وہ مخالف فریق سے نہیں بلکہ خود سے۔ جب انہیں کسی سنگدل یا بے حس محبوب کی بے وفائی کا سامنا ہوتا ہے تو وہ خود سے انتقام لے لیتے ہیں، یعنی وہ دوسروں کو تکلیف دینے کی بجائے خود کشی کر کے انتقام کی آگ بجھا دیتے ہیں۔ یا پھر عمر بھر شادی نہیں کرتے، تاہم یہ کام مزید مشکل ہے، کیونکہ مرنے کے زندہ رہنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ایسی محبت اور اس کے لئے انتقامی کارروائی کے واقعات تو روزمرہ کا حصہ ہیں، وہ تو آئے روز دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں، مگر ہمیں ایسے انجام بد والے واقعات کو کم کرنے کے لئے بھی کوئی منصوبہ بندی تیار کرنی چاہیے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، اسے فطرت کا تقاضا تصور کر کے آنکھیں بند کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، فطرت کے تقاضوں کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ انسان مادر پدر آزاد ہے، جس کا لڑکا جس کی لڑکی سے چاہے معاشقے کرتا پھرے، جہاں چاہے مرضی سے آئے اور جائے، اور گھر والوں کے سر پر خاک ڈال کر اپنی زندگی کا فیصلہ خود ہی کرتا پھرے، والدین کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ان سے مشاورت کریں، مگر آزاد خیالی کی کسی قیمت میں حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ اگر ایک فریق کی اس کے والدین زبردستی شادی کرتے ہیں تو بہت سے ہیرو ایسے بھی ہیں جو ایک سے زائد معاشقے فرماتے اور زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تب بے وفائی

کاکس کو ذمہ دار قرار دیا جائے گا؟ اب کیا زندگی اُس لڑکی سے زندگی بھر انتقام نہیں لے گی؟

تعلیمی اداروں میں تبلیغی جماعت کے داخلے بند کئے جا رہے ہیں، یہ فیصلہ حکومت نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے کیا۔ چونکہ آجکل دہشت گردی کا سب سے بڑا خدشہ تعلیمی اداروں کو ہے۔ سفاک دہشت گردی کا پہلا حملہ سکول پر ہوا تھا، اور اب اسی قسم کی واردات باچا خان یونیورسٹی چار سدہ میں ہوئی ہے، جس کے بعد جہاں حکومتیں سکولوں کی سکیورٹی کے لئے دن رات ایکٹ کئے ہوئے ہیں، ادارے سیل کئے جا رہے ہیں، سکولوں میں ہفتہ بھر کی چھٹیاں کی گئیں۔ اب مزید اقدامات کے طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تبلیغی جماعت پر پابندی لگائی گئی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سکیورٹی سکولوں سے بھی مشکل ہے، کیونکہ بہت سے سکول محدود رقبے میں ہیں، جس کی بنا پر اسے چار دیواری کے حصار میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سکول کے باہر ایک گارڈ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر یونیورسٹیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی عمارتیں وسیع رقبے پر پھیلی ہوتی ہیں، یقیناً مستقبل کی منصوبہ بندی کے مطابق بہت ہی وسیع رقبہ کسی بھی یونیورسٹی کی بنیادی ضرورت ہے، ویسے بھی کھلے ماحول سے طلباء و طالبات کو ذہنی کشادگی اور آسودگی نصیب ہوتی ہے۔ اتنی وسیع جگہ پر چار دیواری کا تعمیر کرنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، پھر اس چار دیواری پر نظر رکھنا مزید ایک مسئلہ۔

اگرچہ یونیورسٹیوں میں قوم کے بچوں کی وہ اکثریت جاتی ہے، جنہوں نے اپنی تعلیم کے تمام مراحل طے کر لئے ہوتے ہیں، اور آخری ادارے میں وہ مستقبل کے سہانے خواب سجا کر میدانِ عمل میں اترنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ لڑکپن کی شوخیوں کو خیر باد کہہ رہے ہوتے ہیں اور اپنے مستقبل کے لئے سنجیدگی سے غور کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ وہ سب کچھ جان گئے ہیں، وہ زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکے ہیں، وہ آنے والے ماہ و سال کے اسرارِ پاپکے ہوتے ہیں، بلکہ یہاں بھی انہیں رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے، یہاں بھی اساتذہ وہی کردار ادا کر سکتے ہیں، جو پرائمری سکول کے ٹیچر نے کیا ہوتا ہے۔ وہاں انگلی پکڑ کے لکھنا سکھانے اور راہیں متعین کرنے کی بات ہوتی ہے، تربیت کرنے والے اساتذہ بچوں کی یادداشتوں سے چپک کر رہ جاتے ہیں، تو یہاں جذبوں اور دلوں کا رخ موڑنے کی عمر ہوتی ہے، استاد کو انگلی تو نہیں پکڑنی پڑتی، مگر اپنے فکر و عمل کے ذریعے میدان میں اترنے والے نوجوانوں کو نئے راستے ضرور دکھائے جاتے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں طلباء کے مفادات اور معاملات تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں، مذہب، سماج اور سیاست اس کے ذہن میں جگہ بنا چکی ہوتی ہے، مخلوط نظامِ تعلیم کی بنا پر سرگرمیوں میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ تمام دنیاوی معاملات کو نگاہ

میں رکھتے ہوئے مختلف معاملات میں جب لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں تو وہاں تنازعات کا جنم لینا فطری عمل ہے۔ ایسے میں دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے جتنے حربے ہو سکتے ہیں، ہر کوئی اپنی صوابدید، ذہنی سوچ اور مالی حالت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ یوں ان اداروں میں ہر نوع کے طلباء اور آزادی کی صورت میں غیر طلباء عناصر بھی اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہاسٹلوں میں مشکوک سرگرمیاں بھی جنم لینے لگتی ہیں۔ بوائز ہاسٹل میں مشکوک لوگ پائے جاتے ہیں، اسلحہ کی نمائش بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے، نشہ آور اشیاء پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف گرلز ہاسٹلوں میں بھی اسلحہ پایا جانے لگا ہے، لیپ ٹاپ کی چوری کی متعدد وارداتیں سامنے آتی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ ان کبھی اور ناقابلِ تحریر باتیں سامنے آتی ہیں۔ صدے والی بات یہ ہے کہ جامعات کی انتظامیہ تمام ترددعوں اور کوششوں کے باوجود اپنے ہاسٹلز کو بدقماش اور بیرونی عناصر سے خالی نہیں کروا سکے۔ یہ الگ داستان ہے کہ دہشت گردی کے ضمن میں اسلام اس قدر بدنام ہو چکا ہے کہ بے ضرر اور منظم تبلیغی جماعت کو بھی اداروں میں جانے سے روکا جا رہا ہے۔ تبلیغی جماعت کے بارے میں کسی کو کچھ بھی اختلاف ہو، کم از کم اسے دہشت گردی کے خدشے کے کھاتے میں لانا بلکہ سوچنا بھی زیادتی ہے۔ یہ لوگ سیاست، فرقہ پرستی اور دیگر کثافتوں سے تقریباً پاک ہوتے ہیں، تشدد پسند کسی بھی واقعہ میں ان کا ملوث ہونا ناممکن کے قریب ہی ہوتا ہے، ان لوگوں کی غیر جانبداری پر مستقل کاربند

رہنے کی وجہ ہی ہے کہ دنیا بھر میں امریکہ سمیت انہیں کہیں بھی مزاحمت کا سامنا نہیں
کرنا پڑتا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ تعلیمی اداروں سے غیر طلبہ عناصر کا خاتمہ کیا جائے، ان
کے ہاسٹلوں کا آپریشن کر کے اداروں کو اسلحہ سے مکمل طور پر پاک قرار دیا جائے،
بیرونی عناصر ہاسٹلوں میں کسی درجے کے دہشت گرد بن کر ہی رہتے ہیں، جو طلبا
وطالبات اور اساتذہ تک کو ہراساں کر کے اپنی دھونس جماتے ہیں۔

بھارتی اداکار انوپم کھیر پاکستان آنا چاہتے تھے، انہوں نے کراچی میں لٹریچر فیسٹیول میں شرکت کرنا تھی، مگر ان کے بقول پاکستان نے انہیں ویزا ہی نہیں دیا، جس کی بنا پر وہ نہیں آ سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ اب اگر ویزا مل بھی گیا تو بھی میں نہیں جاؤں گا۔ یہ خبر گردش میں تھی کہ بھارت میں پاکستانی ہائی کمشنر کا بیان سامنے آگیا، جس میں انہوں نے بتایا کہ ”... انوپم کھیر نے ایک انٹرویو میں پاکستان جانے کی بات کی تھی، مگر انہوں نے اس کے لئے درخواست نہیں دی، اس لئے پاکستان کا ویزا نہ دینے کا الزام درست نہیں“۔ انوپم کھیر بھارتی فلم انڈسٹری کے سینئر اداکار ہیں، ان کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر کردار کو اس انداز میں نبھاتے ہیں کہ اداکاری کا تصور ذہن میں نہیں آتا، بلکہ اصل کا گماں ہوتا ہے، دوسری خوبی ان کی یہ ہے کہ وہ ہر کردار کو خوب نبھاتے ہیں، جن میں خاص طور پر مزاحیہ اداکاری بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے کردار پر کسی خاص اداکاری کا لیبل نہیں لگنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مداحوں کی تعداد ان گنت ہے، ان کے چاہنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ پاکستان میں بھارتی فلم سٹاروں کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے کسی قسم

کے سروے وغیرہ کی ضرورت نہیں، ہمارے اخبارات، ہمارے ٹی وی چینلز اور ہمارے ڈرائیونگ رومز تک میں بھارتی اداکار موجود ہوتے ہیں۔ شوق اور پسند کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس عمر کے لوگ ہوں گے اپنے ماحول کو اسی قسم کی تصاویر سے سجایا جائے گا۔ پرانی بھارتی اداکاراؤں سے لے کر نئی سے نئی اداکارہ تک کی تصویر ہمارے ہاں دستیاب ہے، اگر کسی نے اس تصویر کو بہت نمایاں نہیں بھی کیا تو بھی کسی نہ کسی صورت میں انہیں اہمیت دی جاتی ہے۔ یہی عالم فلموں کا ہے، نجی سطح پر تو جس قسم کی فلم بھی پسند کی جائے، ہمارے ہاں کیبل پر بھی بھارتی فلمیں پوری آب و تاب کے ساتھ چلائی اور دیکھی جاتی ہیں۔ حجام کی دکان ہو یا چھوٹا موٹا ہوٹل، بھارتی فلم ہی سے دکان کی رونق بڑھائی جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ فلم میں خواہ پاکستان کو سر عام اور کھلم کھلا مغالطات سے ہی نوازا جاتا ہو، پاکستان کی بدنامی کی جارہی ہو، کسی فلم بین کے ماتھے پر شکن نہیں ابھرتی، کیونکہ ساتھ ہی اگلے منظر میں کسی حسینہ دل رُبا کی اٹھکیلیاں پچھلے والے غم (اگر کوئی محسوس کر بھی لے) کو بھلا دیتی ہیں۔

بہت سے بھارتی اداکار پاکستان آتے رہتے ہیں، یہاں انہیں کھلے دل اور کھلی بانہوں سے خوش آمدید کہا جاتا ہے، انہیں اخبارات میں کوریج ملتی ہے، ٹی وی چینلز کے لئے، انٹرویوز لئے جاتے ہیں، انہیں تقریبات میں مدعو کی جاتا ہے

مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ بہت سے نئے آنے والے یا والیاں حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتی ہیں، کہ اگر یہی دشمن ہے تو ایسے دشمن بھگوان ہر کسی کو دے۔ دوسری طرف پاکستان سے غلام علی یا کوئی اور سینئر فنکار بھارت جاتا ہے، تو اس کی آؤ بھگت کی بجائے اس سے نفرت کا ماحول پہلے سے ہی تیار کر دیا جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ میں جب غلام علی نے بھارت میں کنسرٹ کا پروگرام بنایا تو شیو سینا نے اسے بزور منسوخ کروانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ اسی دوران پاکستان کرکٹ بورڈ کی حد سے زیادہ کوشش تھی کہ پاک بھارت کرکٹ کا آغاز ہو جائے، اس سلسلہ میں پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین شہریار خان بھارت گئے تو وہاں بھی ان سے تضحیک آمیز سلوک کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ اسی طرح بھارت میں مسلمان اداکاروں پر بھی عرصہ حیات تنگ کرنے کی خبریں آنے لگیں۔

بھارتی تنگ نظری کو اگرچہ خود بھارت میں بھی مسترد کر دیا گیا، اور بیرونی دنیا سے بھی ان رویوں کی نفی کی گئی، اس ضمن میں بہت سے نامور بھارتی لوگوں نے بھارتی حکومت کی جانب سے ملنے والے ایوارڈ بھی واپس کر دیئے۔ بہت سے دانشوروں اور فنکاروں نے بھی تنگ نظری کے اس معاملے کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ مگر افسوس کہ پاکستانی قوم کے پسندیدہ اداکاروں میں ایک انوپم کھیر بھی تھے، جنہوں نے اس موقع پر اُن لوگوں کے حق میں واضح بیانات دیئے جو دونوں

ممالک کے درمیان دیواروں کو مزید بلند اور مضبوط کرنا چاہتے تھے، موصوف نے
پاکستان کے خلاف نفرت کی حمایت کر کے اپنے حامیوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی۔ اب
پاکستان آنے کے معاملے میں بھی صورت حال مشکوک ہی لگتی ہے، اگر وہ واقعی آنا
چاہتے تھے تو درخواست کے بغیر تو ویزا نہیں ملتا اور اگر صرف پاکستان کو بدنام کرنے
کے لئے ہی بیان دیا ہے، تو الگ بات ہے، تاہم پاکستانی قوم بہت مضبوط اعصاب کی
مالک ہے، دلوں سے کسی کو جلدی نہیں نکالتی۔

! درجہ چہارم اور اقتدار محل

درجہ چہارم؛

رحیم یار خان میں درجہ چہارم کے ملازمین نے احتجاجی ریلی نکالی، ان کا مطالبہ تھا کہ سکیل کی اپ گریڈیشن کی جائے، مہنگائی کی شرح کے مطابق تنخواہ میں اضافہ کیا جائے، اور ضروریات زندگی کے مطابق الاؤنس دیئے جائیں، تاکہ وہ معاشی پریشانیوں سے نکل کر اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھ سکیں اور ان کے دیگر مسائل حل کر سکیں۔ ریلی کے اختتام پر شرکانے اپنی قمیضیں اتار کر کان پکڑ لئے (واضح رہے کہ کان مرغان بن کر نہیں بلکہ کھڑے ہی پکڑے)۔ شرکاء سڑک پر لیٹ بھی گئے، اور انہوں نے حکومت کے خلاف اور اپنے مطالبات کے حق میں نعرے بازی بھی کی۔

درجہ چہارم کے ملازمین نے مطالبہ تو تنخواہ بڑھانے اور اپنے سکیل کی اپ گریڈیشن کا کیا ہے، مگر زمینی حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ دفاتر میں انسانوں والا رویہ نہیں رکھا جاتا، زیادہ تر افسران لوگوں کو مٹی کے بنے ہوئے پتیلے تصور کرتے ہیں، وہ گھنٹی بجاتے، ان کو احکامات جاری کرتے اور ضرورت پڑے تو سخت سست بھی کہتے ہیں۔ ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے، بسا اوقات یہ تبصرہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں، کہ یہ لوگ ہیں ہی

اس قابل۔ افسروں میں بہت ہی کم ایسے ہونگے جو اپنے ان سرکاری خدمتگاروں میں سے کسی کو حقیقی طور پر جانتے ہوں، انسانیت کے حوالے سے انہیں خبر ہو کہ ان کی خدمت میں ہر وقت موجود رہنے والے کے گھریلو حالات کیا ہیں، ان کے بچوں کی تعلیم کس حال میں ہے، ان کا گزر اوقات کیسے ہوتا ہے، ان کے مسائل کیا ہیں؟ یہ تمام باتیں شاید افسروں کے معلوم کرنے کی نہیں، کہ وہ خود بھی ”سسر کئے“ ہوتے ہیں، اور ان کے خدمتگار بھی گونگے ہوتے ہیں، جو حکم مل گیا عمل کرنا مجبوری ہے۔ یہ لوگ اپنے افسروں کو بہت ہی عقیدت سے دیکھتے اور ان کا حکم کارِ ثواب جان کر مانتے ہیں۔ افسر بدلتے رہتے ہیں، اور یہ سب کے ساتھ مخلص ہو کر کام کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کے احتجاج کا تعلق ہے، تو دوسروں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی ہمت پکڑی ہے، اگرچہ خبر جنوبی پنجاب کے آخری ضلع کی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ”کلاس فور ایسوسی ایشن“ پنجاب بھر میں موجود ہوگی۔ اگر انہوں نے کان پکڑے ہیں تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں، یہ ہر وقت افسر صاحب کے سامنے کان پکڑے رکھتے ہیں، جھائیں کھاتے اور بے عزتی کرواتے رہتے ہیں، اگر افسروں کے سامنے ان کی اہمیت ہے تو صرف اتنی کہ وہ ان کے زر خرید ملازم ہیں، ان کی کوئی خواہش نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ درجہ چہارم والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تیسرے درجے سے بھی نیچے ہیں، انہیں کسی مطالبے کا کوئی حق نہیں۔ حق تو انہیں ہے جو حکمران ہیں، جو افسر ہیں، جو بیوروکریسی کہلاتے ہیں اور جو مقتدر ہیں، مراعات ان کے لئے ہیں، سہولتیں

ان کے لئے ہیں، الاؤنس ان کے لئے ہیں، اختیارات ان کے پاس ہے، سب کچھ ان کا ہے اور ان کے لئے ہے۔ یہ لوگٹ کان پکڑیں اور جھاڑیں کھائیں۔
لرزنا اقتدار کے محل کا؛

قائد حزب اختلاف سید خورشید شاہ نے کہا ہے کہ اگر اپوزیشن جماعتیں مزدوروں کے ساتھ سڑکوں پر آگئیں، تو اقتدار کے محل لرز جائیں گے۔ وہ پی آئی اے کے احتجاجی ملازمین سے خطاب کر رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار تھی تو اس دور میں بھی پی آئی کے ملازمین کو اسی طرح لاٹھی چارج سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا، (تاہم اس وقت کسی مشکوک شخص نے فائرنگ کر کے ملازمین کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا) اس وقت بھی یقیناً مسلم لیگ ن وغیرہ نے اس تشدد کے خلاف احتجاج کیا ہوگا۔ یہ اپنے ہاں عام روایت ہے کہ ہر حکومت کے ایک جیسے ہی عمل اور اقدامات ہوتے ہیں اور ہر اپوزیشن بھی ایک جیسا مائنڈ سیٹ رکھتی ہے۔ باریاں بدل جاتی ہیں، مگر اقدامات اور بیانات نہیں بدلتے۔ چلیں خیر یہ تو حکومت اور اپوزیشن کی مجبوری ہے کہ اس نے اپنا اپنا کام کرنا ہے، اب حکومت نے اپنا کام کر دیا ہے، اب اپوزیشن کا فرض ہے کہ وہ اپنا کام کرے، یعنی مزدوروں کے ساتھ مل کر سڑکوں پر نکل آئے تاکہ اقتدار کے محل لرز جائیں، عوام بھی یہ نظارہ دیکھ سکے۔ اگر اپوزیشن مزدوروں کے ساتھ سڑکوں پر نہیں آتی، اور ایوان ہائے اقتدار نہیں لرزتے تو یہی جانا

جاہلے گا کہ حکومت اور الپوزیشن اندر سے ایک ہی ہیں۔

گزشتہ روز پاکستانی عوام نے کشمیریوں کے ساتھ اظہارِ بیچتی کا دن منایا۔ شہر شہر میں ریلیاں نکلیں، لوگ اپنی اپنی پارٹی کے جھنڈے اٹھائے سڑکوں پر نکل آئے، سیکڑوں موٹر سائیکلوں کی بیسیوں ریلیوں نے شہروں میں رونق لگائے رکھی۔ بہت سی سیاسی اور دیگر تنظیموں نے تقریبات کا اہتمام بھی کیا، جہاں دانشوروں، سیاستدانوں اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگوں نے کشمیر کے معاملے پر اپنے جذبات وغیرہ کا اظہار کیا۔ اور یہ بھی کہ پانچ فروری کو ایک طویل عرصے سے پورے ملک میں سرکاری تعطیل ہو رہی ہے۔ اس مرتبہ یہ چھٹی چونکہ جمعۃ المبارک کو تھی اس لئے چھٹی کے اثرات زیادہ ہی گہرے تھے، یعنی تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر اور بازار سب بند تھے۔ یوں ریلیوں کو سڑکوں پر چلنے میں مزید آسانی رہی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ وزیراعظم پاکستان نے اس موقع پر آزاد کشمیر کو نسل اور قانون ساز اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں اقوام متحدہ سے اس کی ناکامی کا جواب بھی طلب کیا، اور یہ بھی بتایا کہ مسئلہ کشمیر حل کئے بغیر پاکستان اور بھارت خوشحال نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو پاکستان اور بھارت کی قیادت کا امتحان قرار دیا، کہ اس کے حل کے بغیر دونوں ملکوں میں امن نہیں آ سکتا۔ پانچ فروری کو چھٹی ہونے کی

وجہ سے بہت سے سرکاری اداروں میں کشمیریوں کے ساتھ پہچتی کی تقریبات نہیں
 ہو سکیں، ان میں بہت سے ایسے ہیں جو وقت گزرنے پر خاموش رہیں گے اور بعض
 ادارے اس فرض کو اگلے دنوں میں ادا کر کے ثواب دارین کے حقدار قرار پائیں گے۔
 کشمیر کو قائد اعظم نے پاکستان کی شاہ رگت قرار دیا تھا، اور قیام پاکستان کے اولین ایام
 سے ہی کشمیر پر بھارتی تسلط کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے، وہاں کے عوام پاکستان کے
 ساتھ الحاق چاہتے ہیں اور وہاں کی حکومت اسے انڈیا کے ساتھ ہی ملا کر رکھنا چاہتی
 ہے۔ کشمیر کی بنیاد پر ہی پاک بھارت جنگیں بھی ہو چکی ہیں۔ اگرچہ کشمیر کا معاملہ اقوام
 متحدہ کے پاس ہے اور وزیر اعظم پاکستان کا یہ کہنا درست ہے کہ کچھ قراردادیں ایسی
 ہوتی ہیں، جن پر قرارداد کی سیاہی خشک ہونے سے قبل ہی عمل ہو جاتا ہے، اور بہت سی
 قراردادیں ایسی ہیں، جنہیں اقوام متحدہ نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا ہے۔ یہ اقوام متحدہ
 کی ساکھ کا معاملہ ہے، ساری دنیا تلخ ماضی سے نجات حاصل کر رہی ہے، بھارت سے مل
 جل کر بیٹھ کر مسائل حل کرنے کی خواہش ہے۔ لڑائی جھگڑے سے مسائل حل نہیں
 ہوتے۔ وزیر اعظم کا کہنا بجا، مگر یہاں اور بھی بہت سے مسائل ہیں، مثلاً یہ کہ پاکستان
 دنیا میں شاید کشمیر کے مسئلے کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہی نہیں ہو سکا، شاید بہت سے
 ممالک کو ابھی تک کشمیر کے تنازع کی درست سے خبر بھی

نہیں، کہ اصل مسئلہ ہے کیا، اور یہ کہ اس پر پاکستان کا کیا موقف ہے اور بھارت کیا کہتا ہے؟

دنیا کے سامنے پاکستان کی کمزور خارجہ پالیسی کھل کر سامنے آ جاتی ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو حقیقی نقشہ دکھایا اور بتایا ہی نہیں گیا، جس کی وجہ سے اسے مسئلے کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ مگر یہاں خود اقوام متحدہ کے ساتھ ساتھ اقوام عالم کی بے حسی کا منظر بھی سامنے آتا ہے کہ جب پوری دنیا گلوبل ویلج کا درجہ حاصل کر چکی ہے، تو کیا دنیا میں کسی بڑی آبادی کو زبردستی زیر دست رکھنے کا عمل قابلِ گرفت نہیں؟ ویسے بھی یہ کوئی نیا کیس نہیں، یا اقوام متحدہ کے لئے کوئی نیا امتحان نہیں کہ وہ کسی مشکل میں آجائیں، یہ تو منظور شدہ قرار دادوں کا مسئلہ ہے، اس پر عمل درآمد کروانے کی بات ہے، جہاں اقوام متحدہ کی بدینتی کا عمل دخل ہے، وہاں پاکستانی حکومتوں کی بھی کمزوریوں کی داستان سامنے ہے، اور وہیں پر بھارت کی دنیا کے ساتھ اپنے موقف کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے، کہ ہم دنیا کے سامنے کشمیر کو متنازع ثابت ہی نہیں کر سکے، جبکہ بھارت دنیا کو اس بات پر قائل کر چکا ہے کہ کشمیر بھارت کا اندرونی معاملہ ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ کس انداز میں اسے حل کرنا ہے۔ وزیراعظم پاکستان نے جن الفاظ میں اقوام متحدہ کو مسئلہ کشمیر یاد دلایا

ہے، وہ قابلِ تحسین ہیں، مگر اسی قسم کا لہجہ اور اسی طرح کے الفاظ اور اسی قسم کے موقف کی اس وقت بھی ضرورت ہوتی ہے، جب پاک بھارت قیادت اکٹھی ہوتی ہے، پاکستان نہ تو اقوام متحدہ سے اسی کی قراردادوں پر عمل کروانے میں کامیاب ہوا اور نہ ہی بھارت کو کشمیر کے متنازع تسلیم کروانے میں۔ ایسے میں ریلیوں اور تقریبات کس کام کی، ہر کام اس کے خاص مقام اور درست وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔

! چڑیا گھر اور مصنوعی جانور

گزشتہ دنوں ہمارے ہاں باہر سے کچھ مہمان تشریف لائے، ان کے پہنچنے کا وقت تو سہ پہر تین بجے کا تھا تاہم جب وہ چار بجے تک بھی نہ پہنچے تو ناچار ہم نے فون کیا، معلوم ہوا کہ وہ پہنچنے ہی والے ہیں مگر ان کی خواہش ہے کہ وہ پہلے چڑیا گھر جائیں، بڑے چھوٹوں کی خواہش کے پابند تھے، چنانچہ پہلے وہ چڑیا گھر گئے اور پھر ہمارے گھر آئے۔ ان دونوں گھروں میں کیا مماثلت پائی گئی؟ اس کا اندازہ تو مہمانوں نے ہی لگایا ہوگا، ہم نے ان سے اس بارے میں کچھ معلوم نہ کیا، تاہم چڑیا گھر کے بارے میں وہ خاموش نہ رہ سکے، انہوں نے چڑیا گھر کے ماحول اور جانوروں کی قلت کو تنقید کا نشانہ بنایا اور چڑیا گھر کی سیر کو ناپسندیدہ قرار دیا، ان کا کہنا تھا کہ ہر طرف ویرانی ہے، صفائی کا بھی مناسب انتظام نہیں ہے۔ دراصل پاکستان میں چڑیا گھروں کی بھی قلت ہے، اس لئے ان میں پائے جانے والے جانوروں کی بھی کمی ہے۔ اس وقت لاہور، اسلام آباد، کراچی اور بہاول پور میں چڑیا گھر ہیں۔ مندرجہ بالا صورت حال بہاول پور چڑیا گھر کی ہے۔

بہاولپور چڑیا گھر کا کیا بات کی جائے کہ لاہور کے بارے میں بھی ایسی ہی

خبریں آرہی ہیں، اور تسلسل کے ساتھ آرہی ہیں۔ جنگ کے کارٹونسٹ جاوید اقبال جو کہ حالات کی بھرپور عکاسی کرنے کے ہنر سے خوب آشنا ہیں نے اسی ضمن میں ایک کارٹون بنایا ہے، جس میں چڑیا گھر میں جانوروں کی قلت کی خبر ہے اور ایک ”جانور“ دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ ’جلدی کرو چڑیا گھر کھلنے کا وقت ہو گیا ہے‘۔ دراصل یہ جانور نہیں بلکہ چڑیا گھر کے اہلکاروں نے جانوروں کی کھالیں پہن رکھی ہیں۔ ظاہر ہے کارٹون کے لئے یہ تصور تو جاوید اقبال جیسے ذہین شخص کے ذہن میں ہی آ سکتا تھا، اب آگے چڑیا گھر انتظامیہ کی مرضی کہ وہ اس کی عملی جامہ پہناتے ہیں یا پھر حسبِ عادت و روایت نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر اسے مذاق تصور کیا جائے تو یقیناً کچھ نہیں ہوگا، اگر عمل کے بارے میں سوچا جائے تو کئی راستے نکلتے ہیں۔ تاہم انسان کو ”جانور“ بنانے کے راستے میں کئی رکاوٹیں آئیں گی، کئی مسائل کھڑے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ انسان کچھ ہی جانوروں کا روپ دھار سکیں گے، جن میں شیر، چیتا، رینگھ وغیرہ شامل ہوں گے، جبکہ ان سے چھوٹے جانور ’انسان‘ کے سائز سے چھوٹے ہوں گے، جن میں بھیڑیا، بلی، لومڑی وغیرہ آ سکتے ہیں۔ کچھ بڑے سائز کے جانوروں کا بھی مسئلہ ہی ہے، جن میں نیل گائے، زبیرا وغیرہ شامل ہیں، ہاں البتہ اونٹ بننے کے لئے دو افراد کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں، تاہم ٹانگیں ٹیڑھی کرنا اور بیک وقت حرکت کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، جس میں بے ترتیبی کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔ پرندوں کا تو احوال ہی دوسرا ہے، ان کے لئے تو انسان خود ذاتی طور پر

کچھ نہیں کر سکتا البتہ اپنی عقل کے ذریعے جانور بھی مصنوعی بنائے جاسکتے ہیں۔ سیل ڈال کر ریمورٹ سے اڑائے جاسکتے ہیں۔

شیر کی کھال تو مل جائے گی، اہلکار بھی تنخواہ پر رکھا جاسکتا ہے، جسے وہ پہنائی جائے گی، ویسے الگ سے اہلکار رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ چڑیا گھروں میں بہت سا عملہ ہوتا ہے، جسے کوئی کام نہیں ہوتا اور وہ فارغ ہی ہوتے ہیں) جس کارکن کو شیر کی کھال پہنائی جائے گی اس کی ڈیوٹی کافی سخت ہوگی، کیونکہ شیروں سے اٹھکیلیاں کرنا یار لوگوں کی عادت ہے، شیر اگرچہ ہر وقت پنجروں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، مگر جب وہ آرام کے لئے لیٹ جائیں تو لوگ انہیں چھیڑنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ اگر وہ مصنوعی شیر کو مسلسل تنگ کریں گے تو یہ شیر دھاڑے گا، جس سے اس کی اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے، یہ بھی بعید نہیں کہ کوئی ”شیر“ تنگ آمد جنگ آمد کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے جذباتی ہو کر سیر کرنے والے پر گالیوں کی بوچھاڑ ہی کر دے، جس سے چڑیا گھر انتظامیہ کا سارا پول ہی کھل جائے گا۔ خیر یہ تو لاہور کی بات ہے، یقیناً یہ کام لاہور والوں نے بھی کیا ہوگا، تاہم بہاول پور والوں نے یہ کام اب کیا ہے، وہ جانور جن کا وجود چڑیا گھر کے اندر سا لہا سال سے نہیں اور بچے اور بڑے انہیں دیکھنے کے لئے ترس گئے ہیں، انتظامیہ نے ان کا بندوبست چڑیا گھر سے باہر ہی سڑک پر کر دیا ہے، جن میں ہاتھی، زرافہ اور دیگر جانور شامل ہیں

سیر کرنے والے آئیں، باہر سے ہی جانوروں کے ساتھ سیلفیاں بنائیں، (کیونکہ جانور ایک ہی پوز بنا کر کھڑے ہیں، ملیں گے نہیں)۔ نہ ٹکٹ کا جھنجھٹ، نہ ویرانی کا طعنہ اور !! نہ جانوروں کی قلت کا رونا۔ شکریہ چڑیا گھر انتظامیہ

سٹوڈنٹس یونینز پر پابندی کو 32 سال مکمل ہو گئے، فطری طور پر آمریت ہر اس فرد سے خوفزدہ ہوتی ہے، جو آواز بلند کر سکتا ہے، نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مختلف حیلے بہانوں سے ایسی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے مخالف کو جیل میں ڈالنے کا نسخہ قدیمی اور آزمودہ ہے۔ وہ پرانے رہنما جو زبان و بیان کے بادشاہ تھے، ان کی حیاتِ عزیز کے بہت سے سال جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے، کتابیں لکھیں، جیل سے آئے، پھر کوئی تقریر کی اور اپنے اصلی گھر لوٹ گئے۔ بہت سے مخالفین ایسے ہوتے تھے جنہیں جابر حکمران جیل بھجوانے کی بجائے 'اوپر' بھجوانے کا بندوبست کرتے تھے۔ مختلف قسم کی پابندیوں کا سامنا بھی اُن لوگوں کو کرنا پڑتا تھا۔ تاہم حکومت مخالف گروپوں میں طلباء کی طاقت ایسی تھی جس سے کوئی بھی آمریت سخت پریشان رہتی تھی، ایوب خان کے زمانے میں یہ طلبہ تحریک ہی تھی جس نے بنیاد رکھی، پھر ہنگامے شروع ہو گئے اور انجامِ حکومت کے خاتمے پر ہوا۔ ایوب خان کے دورِ حکومت میں ہی طلباء تنظیموں نے خود کو مضبوط کیا۔ تاہم اب صرف آمریت پر الزام نہیں دھرا جاسکتا۔

طلبا ہی کسی بھی ملک کا مستقبل ہوتے ہیں، پہلے تمام بچوں کو سکول لانا، پھر

انہیں اچھی اور بھرپور تعلیم دینا اور ان کی تربیت کرنا حکومتوں اور اساتذہ کا کام ہوتا ہے، ان طلبہ کے پاس ہنر، تعلیم اور تہذیب جیسے ہتھیار ہونگے تو وہ ترقی، خوشحالی اور مستقبل کی نئی عمارت تعمیر کر سکیں گے، اگر وہ بے ہنر اور غیر تربیت یافتہ ہوں گے تو ان سے کس قسم کی تعمیر کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟ حکومتیں چونکہ سیاستدانوں نے چلائی ہیں، اور سیاست کے حقیقی رموز سے واقفیت کے لئے اسے پہلے سے ہی تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں میں یونین سازی اسی قسم کی ایک نرسری تھی، جہاں

سٹوڈنٹس کے الیکشن ہوتے تھے، مختلف پارٹیاں آئے سامنے آتی تھیں، اور نتیجے کے طور پر کچھ لوگ کامیاب ٹھہرتے تھے، اور سال بھر کے لئے وہ دیگر تمام سٹوڈنٹس کے نمائندہ بن کر خدمات سرانجام دیتے تھے، طلباء کو کسی مسئلے کا سامنا ہے تو وہ اپنے نمائندوں کے پاس جاتے تھے، یوں انفرادی یا اجتماعی مسائل کے حل میں آسانی پیدا ہو جاتی تھی۔

یونین کے دور میں ہر پارٹی چونکہ الیکشن جیتنے کی خواہش رکھتی تھی، اسی لئے کامیاب ہونے والی پارٹی کی سال بھر یہ کوشش اور خواہش رہتی کہ وہ طلباء کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں تاکہ اگلی مرتبہ بھی انہیں الیکشن کے موقع پر کسی قسم کی مشکل برداشت نہ کرنا پڑے۔ بہت سے تعمیری کام کئے جاتے تھے، تقریبات منعقد کی جاتیں، جن میں

تقریری مقابلوں کی فضا پیدا ہوتی، ایک دوسرے کی دلیل سننے اور اس کا جواب دینے کا حوصلہ اور صلاحیت پیدا ہوتی۔ ہنر مندی کے مقابلے ہوتے، کھیلوں کے میدان سجتے، تعلیمی مقابلہ

جات کا اہتمام کیا جاتا، مختلف ایشوز کے حوالے سے مخصوص دن اور ہفتے منائے جاتے، کبھی ہفتہ اخلاق ہوتا تو کبھی ہفتہ صفائی، کبھی اساتذہ کی عزت کا ہفتہ ہوتا تو کبھی باہمی احترام کی تربیت کا۔ طلباء ان تقریبات اور پروگراموں میں بہت دلچسپی سے حصہ لیتے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں میلے کا سماں ہوتا۔

ہر سال دسمبر کے اواخر میں باقاعدگی سے طلباء یونینز کے الیکشن ہوتے تھے، دلچسپ بات یہ کہ اُس زمانے میں سیاست میں پیسے کا عمل دخل نہ تھا، طالب علم کی صلاحیت اور پارٹی ٹکٹ ہی اس کے مقابلے میں کامیابی وغیرہ کی ضمانت ہوتا تھا۔ بہت سے دیہات کے عام اور غریب طلبہ بھی شہر میں آکر طالب علم لیڈر بنے۔ ان یونینز کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ قومی سیاست کے لئے یہ طلبہ ایکٹ نرسری کی حیثیت رکھتے تھے، یہی نرسیاں آگے جا کر تناور درخت کے طور پر پاکستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے، چونکہ اس نرسری کو بند ہوئے تین دہائیاں گزر چکی ہیں، اس لئے ان نرسیوں سے تیار شدہ پودے اب زندگی کی پانچویں دہائی یا اس کے بھی بعد والی دہائیوں میں موجود ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جو لوگ طالب علم لیڈر رہے ہیں، وہ اب بھی کسی حد تک اصولی سیاست کرتے دکھائی دیتے ہیں (اگرچہ پاکستان کی سیاست کے بہت سے منفی اثرات ان پر بھی پڑ چکے ہیں)۔ طلباء سیاست سے آگے آنے والے لیڈر اس وقت ہر جماعت میں

موجود ہیں، مگر اب یہ دروازے مکمل طور پر بند ہیں۔ سیاسی جماعتیں بھی دیگر امور میں مصروف ہیں اور شاید طلباء بھی تحریکیں چلا چلا کر مایوس ہو چکے ہیں، یا شاید اب وہ ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے، کیونکہ آئی ٹی نے سب کو مصروف کر دیا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ سٹوڈنٹس یونینز کے شدید مخالف ہیں، تاہم یونین کی خوبیاں خامیوں سے زیادہ ہیں۔ دوسرا یہ کہ اب بتیس برس مکمل ہوئے ہیں تو اگلے سال فروری میں 33 ہو جائیں گے اور اس سے اگلے 34 اور چل سو چل۔

ریحام خان کو بہت کم لوگ جانتے تھے، اسلام آباد میں تحریک انصاف کے دھرنے میں پورے پاکستان کی نگاہیں کینیڈینئر پر مرکوز تھیں، جہاں شام کو عمران خان نمودار ہوتے تھے، بہت سے دیگر حضرات کے بعد وہ بھی خطاب کرتے اور دیر گئے تک لوگ اپنے بند و بست کے ساتھ شب ببری کرنے چلے جاتے۔ کچھ سادہ اور سیدھے لوگ دھرنے والے مقام پر ہی قیام کرتے۔ اس گہما گہمی میں عمران خان نے حکومت سے دھاندلی وغیرہ کے مطالبات منوانے کے ساتھ ایک عوامی دلچسپی کی بات یہ کی کہ میں نے دھرنے کا یہ سٹیج اس لئے سجایا ہے کہ میری شادی ہو جائے۔ قوم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک خاتون ٹی وی چینل پر نمودار ہوئی، اس کے سر پر پی ٹی آئی کے پرچم کی پٹی بندھی تھی، اس نے بیاننگ ڈیل اعلان کیا کہ وہ ’فلاں‘ ہے اور عمران خان کے ساتھ شادی کی خواہاں ہے۔ وہ خاتون تو عمران خان کے حرم میں داخل نہ ہو سکی تاہم چند روز بعد ریحام خان کے بارے میں خبریں آنے لگیں اور قوم نے ان افواہوں میں رنگ بھرتے ہوئے دیکھا، یوں دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر عملی جامے میں دکھائی دینے لگی۔ دونوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے، مگر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دونوں میں

علحدگی ہو گئی، وجوہات جو بھی ہوں، بُرا ہوا، ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ عمران خان سے شادی کے بعد ریحام خان کے جاننے والوں کی تعداد میں یکدم لاکھوں لوگوں کا اضافہ ہو گیا، گویا ان کی مقبولیت کا ستارہ شہرت کے آسمانوں تک پہنچ گیا۔ اب پاکستان کیا دنیا میں پاکستان کے معاملات میں دلچسپی لینے والے افراد میں ریحام خان کا تعارف پکھیل گیا۔ اب ریحام خان مضمون لکھیں یا بیان دیں، ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، انہوں نے ایک تازہ بیان میں کہا ہے کہ ”سیاستدان سچ بھی بولے تو جھوٹ لگتا ہے، چند سیاستدانوں کی وجہ سے پاکستان میں سیاست بدنام ہے، سیاسی جماعتیں نظریات سے ہٹ کر کام کر رہی ہیں، جس کی بنا پر عوام میں مایوسی کی لہر اٹھ گئی ہے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ وراثتی سیاستدان ملک میں تبدیلی نہیں لاسکتے۔“۔ ملک کی ایک اہم خاتون ہونے کے ناطے ریحام کی بات سنی اور پڑھی جاتی ہے۔

یہ تو اندازہ نہیں لگایا جاسکا کہ ریحام خان نے یہ بیان کس پس منظر میں دیا ہے، آیا ان کے پاس سیاستدانوں کی کمزوریاں ہیں، یا سیاستدانوں کے دہرے معیار ان کے سامنے ہیں، کیونکہ پون سال انہیں بہت سے سیاستدانوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، یقیناً تجربے کی روشنی میں ہی بیان دیا گیا ہوگا۔ سیاستدان سچ بھی بولے تو جھوٹ کیوں لگتا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو سیاستدان ہی ہیں، کہ انہوں نے اپنے کردار اور اقوال کو کجا نہیں کیا، ان

کے قول و فعل میں تضاد ہے، وہ کبھی دل کی بات زباں پر نہیں لاتے، عوام سے کئے ہوئے وعدے نہیں نبھاتے، یہی وجہ ہے کہ لوگ سیاست کو جھوٹ کا دوسرا نام دیتے ہیں۔ کسی کو جھوٹا یا عیار قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے کہ ”بڑے سیاستدان بن گئے ہو“۔ کوئی فرد کسی سوال کا گول مٹول جواب دے دے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ”فلاں نے سیاسی بیان دیا ہے“۔ گویا جس بات کے ساتھ سیاست منسوب ہو جائے، اسے جھوٹ قرار دینے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آتی۔

سیاست دان اگر اپوزیشن میں ہیں تو ان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں، ان کا سب سے اہم کام حکومت پر ہر صورت میں تنقید کرنا ہوتا ہے، وہ کسی حالت میں بھی حکومت کی تعریف نہیں کر سکتے، اگر تعریف کریں گے تو سیاست کیسے کریں گے، کیونکر اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑا ماریں؟ حکومت کوئی بھی کام کرے، عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اس پر تنقید کر دی جاتی ہے، حکومت کی ہر پالیسی کی مخالفت اپوزیشن کا سیاسی فرض ہوتا ہے۔ حکومت کے خلاف جلوس نکالے جاتے ہیں، ریلیاں منعقد کی جاتی ہیں، ہنگامے اور دھرنے دیئے جاتے ہیں۔ اور اس وقت تضاد کھل کر سامنے آتا ہے جب حکومت والے لوگ اپوزیشن میں آتے ہیں اور اپوزیشن والے حکومت میں چلے جاتے ہیں، ایسے میں وہ دونوں فریق وہی کام کرتے ہیں تو ان کے مخالفین نے کئے ہوتے ہیں۔ پھر عوام کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کی پاسداری کا کوئی رواج نہیں، یہ وعدے فقط الیکشن جیتنے کے لئے کئے

جاتے ہیں، اور الیکشن میں کامرانی حاصل کر لینے کے بعد ان وعدوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے، بس اگلے الیکشن کی مہم میں ان سے دوبارہ گرد جھاڑ کر انہیں عوام کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے، یوں جھوٹ بولا اور مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے، واضح جھوٹ پر کوئی الیکشن نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی سیاستدان سچ بھی بولے تو سچ نہیں لگتا۔

دانش کیوں رویا؟

دانش کیوں رویا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب ہیٹ پہن کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور لاہور کے بغل میں یعنی محض 33 کلومیٹر دور کھیتوں میں ہیلی کاپٹر کو اتارنے کا حکم جاری کیا۔ دراصل وہ بھٹہ خشت پر خود چھاپہ مارنا چاہتے تھے، وہاں انہوں نے ایک تیرہ سالہ بچے کو بھٹے پر مزدوری کرتے دیکھا، نام اس کا محمد دانش تھا۔ صاحب بہت برہم ہوئے، بھٹہ مالک کی سرزنش کی، فرمایا، اس محمد دانش کو تو دانش سکول میں ہونا چاہیے تھا۔ بھٹے پر مزدوری کرنے والوں کے تمام تعلیمی اخراجات اٹھانے اور بچوں کو پڑھانے کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ڈالتے ہوئے آپ اگلے بھٹے پر چلے گئے۔ اسی طرح دو اور بھٹوں پر بھی گئے، تاہم وہاں سے کسی دانش کی مزدوری کی خبر نہیں آئی، شاید پہلے والوں نے دوسرے بھٹے والوں کو اطلاع کر دی ہوگی۔ وزیر اعلیٰ خود تو اب نکلے، اس سے قبل ان کے ہر کارے بھٹے بھٹے گئے، کسی کو سیل کیا اور کسی کی سرزنش، جرمانے بھی ہوئے اور کچھ گرفتاریاں بھی۔ سختی اس قدر تھی کی ڈی سی او اور اے سی نکل کھڑے ہوئے، یا جہاں جس افسر کی ڈیوٹی لگی وہ روانہ ہو گیا۔ اخبارات میں بے شمار اشتہار شائع ہوئے، محکموں کو خطوط پہنچے، بتایا گیا کہ بچے کو سکول داخل کروانے پر والدین کو دو ہزار روپے اور بچے کو ماہانہ ایک ہزار روپے دیئے جائیں گے۔

وزیر اعلیٰ نے دور دراز رہنے والے بچوں کے لئے ٹرانسپورٹ دینے کا بھی اعلان کیا۔ وزیر اعلیٰ اپنے ہیلی کاپٹر پر اچانک ”جیا بگا“ پہنچے تو ہر طرف ہلچل مچ گئی، بھٹے پر گئے تو وہاں چائلڈ لیبر کارٹکاب ہو رہا تھا، محمد دانش کے بارے میں انہوں نے قول تو جاری فرما دیا، مگر تصویر بتا رہی ہے کہ وزیر اعلیٰ اپنے ہاتھ سے دانش کو چھو رہے ہیں اور لینٹوں پر بیٹھا ہوا دانش رو رہا ہے۔ دراصل اس نے اس سے قبل ایسی صورت حال نہیں دیکھی تھی، یقینی طور پر اس نے ہیلی کاپٹر کو اتنا قریب سے پہلی مرتبہ ہی دیکھا ہوگا، اور میاں صاحب اور ان کی ٹیم کو بھی، یکدم نئی اور تبدیل شدہ صورت حال میں جب میاں صاحب بچے کے قریب تھے اور اسے چھو رہے تھے تو بچہ رو دیا۔ اگر وزیر اعلیٰ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں تو ذمہ داری ریاست کے سر ہی جاتی ہے، کہ نسلوں سے تعلیم سے بے بہرہ والدین جنہوں نے اپنے بچے کا نام دانش رکھ لیا تھا، انہوں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا ہوگا کہ ایک وزیر اعلیٰ ان کے پاس پہنچ جائے گا، مگر سوچنا یہ ہے کہ سا لہا سال سے مزدوری کرتے بچے جب پڑھنے کی عمر سے نکل جاتے ہیں، تو اس ظلم کا ذمہ دار کون ہے؟ اس بات کو بھی درست مان لیا جائے کہ ’دیر آید، درست آید‘ پھر بھی کیا اب حقیقی معانوں میں غریب اور معصوم بچوں کو چائلڈ لیبر سے نجات مل رہی ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہو رہا، اگر بھٹ جات کے

بارے میں وزیر اعلیٰ پنجاب نے یہ مہم شروع کر رکھی ہے، تو درست اقدام ہے، مگر بھٹ جات پر تو بہت ہی کم تناسب میں بچے ہیں، ان سے کہیں زیادہ بچے تو دیگر مقامات پر بھی مزدوری کر کے اپنے پیٹ کی آگٹ بھانے میں مصروف ہیں، اگر حکومت سے گئے بچے بھٹ خشت پر کام کرنے والے قابو نہیں آتے تو شہروں کی گلی گلی کی ورکشاپوں، ہوٹلوں اور دکانوں میں مزدوری کرتے لاکھوں بچوں کو کیسے سکول لایا جائے گا؟

پنجاب حکومت ہر سال آؤٹ آف سکول بچوں کو سکولوں میں لانے کے لئے مہمات چلاتی ہے، ممکن ہے کچھ بچے آتے بھی ہوں، مگر زیادہ تر جعلی بھرتیاں کر کے حکومت کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری طرف حکومت نے ایکٹ ہزار سرکاری سکول پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے حوالے کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس وقت اگر 80 لاکھ بچے ایسے ہیں جو سکول جانے کی عمر کے ہیں مگر کسی وجہ سے نہیں جا رہے تو ان کے لئے کیا بندوبست ہو رہا ہے، اگر تمام بچے سکولوں میں آ بھی جائیں تو سکولوں میں اس کے لئے جگہ اور گنجائش ہی نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ غیر رسمی تعلیم کی روایت قائم کی جائے، مخیر حضرات کو غریب بچوں کی تعلیم کے لئے تیار کیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت اپنے اربوں روپے کے دیگر منصوبے موخر کر کے بچوں کی تعلیم اور صحت پر لگا دیں تو ملک کی تقدیر سنور سکتی ہے۔ رہی محمد دانش کی ”دانش سکول“ جانے کی بات تو جناب

لاکھ میں سے اگر دس پندرہ ہزار بچے دانش سکول چلے جائیں گے تو پونے اسی لاکھ کا 80
بھی تو سوچیں؟ اگر سب کو برابر ہی تعلیم دے دیں تو موجودہ دانش سکولوں کے خرچے پر
سکولوں سے باہر تمام بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکتے ہیں، پھر سہارے محمد دانش
رونے کی بجائے پڑھ لکھ کر والدین کا سہارا بن سکتے ہیں۔

! تھانہ کروڑوں میں پکتا ہے

پولیس کے بارے میں چیف جسٹس آف پاکستان انور ظہیر جمالی نے کہا ہے کہ ”ایک ایک تھانہ کروڑوں میں بکتا ہے، پھر لوگ پیسے پورے کرتے ہیں...“۔ پولیس کا محکمہ کرپشن کے لحاظ سے اس قدر بدنام ہے کہ کوئی بھی سروے ہو، کرپشن میں سر فہرست اسی کا نام آئے گا، مستقل طور پر خود کو ایک اہم مقام پر قائم رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بہت سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے، پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ یہ کام کرنا پڑتا ہے، ہر اونچے نیچے پر دھیان دینا پڑتا ہے، ہر خامی اور خوبی پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ اس پورے بندوبست میں چھوٹی سی غفلت بھی اپنے مقام سے گرا سکتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پولیس پر کرپشن کے الزامات لگانا ایک فیشن ہے، جو اٹھتا ہے وہ بغیر ثبوت کے پولیس کو کرپٹ قرار دے دیتا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک زیادتی دکھائی دیتی ہے، کہ سنی سنائی باتوں کو حقیقت تسلیم کر کے کسی کو غلط کہہ دیا جائے، حق یہ بنتا ہے کہ پہلے ثبوت ہاتھ میں ہوں پھر بات کی جائے۔ مگر کیا کیجئے کہ پولیس کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سوائے کچھ حکومتی عہدیداروں اور چند سرکاری یا پولیس افسروں کے، کوئی طبقہ بھی پولیس کے لئے کلمہ خیر کہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ خود حکمران بھی کہ پولیس جن کی حفاظت کے لئے ہمہ وقت چوکس رہتی ہے، اور ان کی سخت

سیورٹی کا بندوبست کرتی ہے، وہ بھی پولیس پر برسنے اور سرزنش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حتیٰ کہ خود بڑے پولیس آفیسر بھی اپنی ہی پولیس کے خلاف بولتے اور ایکشن لیتے رہتے ہیں۔ محکمہ میں صاحبانِ کردار آٹے میں نمک کے برابر ہی ہونگے۔

بات ثبوت کی ہو رہی تھی مگر پولیس کا محکمہ ایسا ہے کہ اس کے بارے میں پوری قوم یکسو اور مطمئن ہو کر یہ سوچ رکھتی ہے کہ پاکستان میں کرپشن میں نمبر ایکٹ محکمہ پولیس ہی ہے۔ آوازِ خلق کو نثارہ خدا جاننے کے فارمولے کو تصور میں رکھا جائے تو یہاں یہ فارمولا پورے آب و تاب کے ساتھ عمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں میں بھی اکثر اوقات پولیس کے بارے میں شکایات منظر پر آتی رہتی ہیں اور عدالتیں معاملات میں ملوث پولیس افسران کی سرزنش کرتی رہتی ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ پولیس افسران جب اپنے ماتحتوں کے کئے کی سزا بھگتتے عدالت جاتے ہیں تو اس کے بعد بھی پولیس میں اصلاح کے عناصر دکھائی نہیں دیتے، اگر کسی کیس میں کسی معزز جج نے کسی پولیس افسر کو ڈانٹ پلائی یا کوئی سخت حکم دیا، یا آئندہ کے لئے کوئی وارننگ دی تو اگلے دنوں میں پھر وہی پولیس افسر اسی قسم کے کسی اور مقدمے میں کسی دوسرے جج کے روبرو پیش ہوتے ہیں، وہ بے عزتی کو کچھ نہیں جانتے۔ بلکہ عدالت سے وہ اپنے ذہن میں مدعی کے خلاف مزید انتقام بھر کر آتے

ہیں، اور باہر جا کر کسی اور طریقے سے یا کوئی دوسرا حربہ استعمال کرتے ہوئے، مدعی کو زچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔

چیف جسٹس آف پاکستان نے پولیس کے عمومی رویوں کی بات نہیں کی، بلکہ ایک خاص صفت کا ذکر کیا ہے، کہ سب سے اہم صفت اور خوبی یہی پائی جاتی ہے اور اسی کی بنا پر پولیس کرپشن میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ وہ ہے رشوت ستانی۔ پولیس جہاں رشوت لیتی ہے، وہاں وہ رشوت دیتی بھی ہے، بقول چیف جسٹس ایکٹ ایکٹ تھانہ کروڑوں میں بکتا ہے، یہ بات سو فیصد درست ہے، یقیناً پولیس میں چند افسران ایسے بھی ہونگے جو اپنی تعیناتی کے لئے خرچ نہیں کرتے، اسی لئے ایسے لوگوں کو 'کھڈے لائن' لگا دیا جاتا ہے، جو لوگ ہاتھ پاؤں مارنے والے ہیں، وہ کھڈے لائن کو سزا گردانتے ہیں، اس لئے وہ 'اوپر' لاکھوں روپے دے کر تعینات ہوتے ہیں اور فطری طور پر اس رقم سے کئی گنا زیادہ پوری کرتے ہیں، اگر انہوں نے روپے نہ کمانے ہوں اور دیانت داری سے کام کرنا ہو، تو انہیں تعیناتی کے لئے رشوت دینے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو جہاں بھی حکومت بھیج دے چلے جانا چاہیے۔ پولیس افسر یا اہلکار کسی تھانے میں تبادلے کے لئے، یا کسی 'منافع بخش' مقام کے لئے اپنا تبادلہ کرانے والے کو پیسے دیتا ہے تو رشوت لینے والے بھی یا تو حکومت میں ہوتے ہیں یا پھر اعلیٰ افسر۔ دوسری طرف پیسے لگا کر پورے کرنے والا کاروبار صرف تھانوں

میں ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام منافع بخش سرکاری اداروں میں یہی کام ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کاروبار میں خسارہ کے امکانات صفر فیصد ہیں، اسی لئے یہ کاروبار ترقی کے لحاظ سے بام عروج پر ہے۔

قائم علی شاہ شاید پاکستان کے بزرگ ترین سیاستدان ہیں، جن کی عمر اسی برس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کوئی سیاستدان ان سے بھی بزرگ ہوں، مگر عملی میدان میں وہی سب سے سینئر دکھائی دیتے ہیں۔ سیاست کھیل ہی ایسا ہے، جس میں جس کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے وہ نکھرتا جاتا ہے، اس کی توقیر اور وقار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس کی بات میں وزن ہوتا ہے، لوگ دھیان سے اس کی بات سنتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان لوگوں سے مشورے لئے جاتے ہیں اور ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سیاستدان جتنا بھی بزرگ ہو جائے وہ کبھی ریٹائر نہیں ہوتا، اس کی ریٹائرمنٹ کی عمر اس وقت آتی ہے جب وہ ضعیف ہو جائے، سیاسی دوڑ دھوپ کرنے کے قابل نہ رہے، یا خود کو آرام کی ضرورت محسوس کرے۔ مگر قائم علی شاہ کے بارے میں حالات مختلف ہیں، وہ زندگی کی اسی سے زائد بہاریں دیکھ چکے ہیں، اب بھی وہ ماشاء اللہ تندرست و توانا ہیں۔ وہ صرف سیاست ہی نہیں کرتے، حکومت بھی کرتے ہیں، یہ کارِ خیر وہ پہلی دفعہ نہیں کر رہے، اس سے قبل بھی وہ یہ اہم ذمہ داری نبھا چکے ہیں۔ اگر قائم علی شاہ سندھ کے وزیر اعلیٰ ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ بننے کے قابل ہیں، یعنی وزیر اعلیٰ کے لئے اگر کوئی میرٹ بنتا ہے تو وہ اس پر پورے اترتے ہیں

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ وزیر اعلیٰ نہ ہوتے۔ یہ بھی جمہوریت کا حسن ہی ہے کہ ایک طرف اکیس برس کا نوجوان ممبر اسمبلی بن سکتا ہے تو دوسری طرف تراسی برس کے بزرگ کو وزیر اعلیٰ بنایا جاسکتا ہے۔ ہماری منتخب اسمبلیاں جہاں قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہیں وہاں ہمارے سیاسی رہنماؤں کو ایک دوسرے سے سیاسی داؤ چچیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے، یوں نئے آنے والوں کی تربیت کا بندوبست بھی ہوتا رہتا ہے۔

اہالیانِ سندھ خوش قسمت ہیں کہ انہیں بزرگ ترین سیاستدان نصیب ہوا۔ جہاں تک سیاسی تجربے کی بات ہے تو جو انسان جس میدان میں کام کر رہا ہے، اس کا تجربہ اسے حاصل ہوتا جاتا ہے، اس ضمن میں سندھ کے گورنر عشرت العباد بھی بہت سے ریکارڈ قائم کر چکے ہیں، ایک تو انہیں سندھ کا طویل ترین دورانیے کا گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہو چکا ہے۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے پاکستان میں آنے والی تین قسم کی حکومتوں کے دور میں گورنری کر دی بھی ہے۔ پرویز مشرف نے انہیں گورنر بنایا تھا، مشرف نے اگرچہ اس دور کو ”جمہوری تھکا“ بھی لگایا ہوا تھا اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کو ساتھ ملا کر حکومت کی تھی، تاہم دور مشرف کا ہی گنا جاتا تھا۔ اس کے بعد پی پی کا دور آیا، زرداری حکومت نے بھی گورنر کی تبدیلی کی ہمت نہ کی، وفاق کی نمائندگی وہی کرتے رہے۔ ان دونوں حکومتوں نے اپنی آئینی مدت پوری کی، مگر آئین میں گورنر کے بارے میں

شاید کوئی مدت مقرر نہیں۔ اب تیسری حکومت اپنی آئینی باری لے رہی ہے، اور عرصہ پونے تین برس سے گورنر صاحب اب ممنون حسین کے نمائندے کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ یقیناً ان کے پاس کوئی ایسی گیدڑ سنگھی ضرور ہے جس کی بنا پر ہر حکومت ان کے تجربے وغیرہ سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لیتی ہے، اور یہ ریکارڈ طول پکڑتا جا رہا ہے۔

قائم علی شاہ اسم باسٹلی بھی ہیں، یعنی وہ سندھ میں اسی سال سے قائم ہیں، جب سے پی پی وجود میں آئی ہے، اس پارٹی میں موجود اور قائم ہیں، وزارت اعلیٰ کی کرسی پر قائم ہیں۔ ان تمام مقامات پر ان کا قیام بہت پرانا ہے، یہی ان کی خوبی ہے اور یہی ان کا ریکارڈ۔ مگر گزشتہ کچھ عرصے سے میڈیا اور خاص طور پر سوشل میڈیا میں ان کے بارے میں تضحیک آمیز تبصرے دیکھنے اور سننے کو مل رہے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی اچھی روایت نہیں، مذہب اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کی تضحیک نہ کی جائے، خاص طور پر بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر کیا کیجئے کہ ایک تو قوم بھی اب بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کی قائل نہیں رہی، نہ ہی احترام باقی ہے اور نہ ہی شفقت، دوسری طرف خود شاہ صاحب جیسے لوگ بھی حاسدین وغیرہ کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان کا مذاق اڑائیں۔ پہلے تو موصوف نے غلط اشعار پڑھنے کی روایت قائم کی، پھر شعر بھولنے بھی لگے اور اب نوبت یہاں تک آئی ہے کہ وہ باہر سے

آتے ہیں تو اپنی نشست کی بجائے کسی دوسرے کی کرسی پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ روز وہ اپوزیشن لیڈر کی کرسی پر بیٹھے تو اسمبلی میں قہقہہ گونج گیا، اب اپنے اوپر لوگوں کو مزید ہنسانے کی بجائے بہتر ہے، رخصت لے لیں، پھر دیکھیں کیسے ہنستے ہیں ممبران سندھ اسمبلی؟

! چولستان جیپ ریلی

گیارہویں چولستان جیپ ریلی اختتام کو پہنچی، ہفتہ بھر کی اڑائی ہوئی گرد بٹھنے لگی، قلعہ ڈیر اور کے قرب وجوار میں رہنے والے روہیلے اپنے گھروں کو واپس آنے لگے۔ حیرت کی کوئی نہیں، چونکہ جیپ ریلی کا انعقاد قلعہ ڈیر کے پہلو میں ہوتا ہے، اس لئے قلعہ کے ارد گرد آباد لوگ اپنے اہل خانہ کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، (سرکار کے اندازے کے مطابق) دو لاکھ لوگ ریلی دیکھنے آئیں گے تو چند کچے کچے گھروں کے میکنوں کی گنجائش نہیں بچتی۔ دوسرا یہ کہ قلعہ ڈیر وار کے ارد گرد کچھ کھاتے پیتے اور معقول رہائشی خود موجود رہتے ہیں، کیونکہ بہت سے ان کے ملنے والے ریلی دیکھنے آتے ہیں اور انہیں شرفِ میزبانی حاصل ہوتا ہے، بہت سے شائقینِ کارِ کاری افسران سے تعلق ہوتا ہے، اس رش کے موقع پر سرکاری افسر بھی وہاں کے مقامی لوگوں کو ہی اپنے مہمانوں کی میزبانی کا شرف بخش دیتے ہیں، یہ مقامی لوگ ایسی میزبانی کو اس لئے بھی قبول کرتے ہیں کہ بعد ازاں 'صاحب' سے کوئی کام وغیرہ نکلوانے میں کسی حد تک آسانی رہ جاتی ہے۔ یہاں کے غریب رہائشیوں سے گھر خالی کروا لیا جاتا ہے، اگر وہ پیار سے مان جائیں تو اچھا ہے، کچھ خوشامد بھی کر لی جاتی ہے، اگر نہ مانیں تو سرکاری طریقے سے دباؤ بھی ڈال دیا جاتا ہے، کیونکہ یہاں ہر اختیار رکھنے والے صاحب

نے اپنے مہمانوں کو ٹھہرانا ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں تو شامیانوں کا شہر
بساتے اور وہاں اپنی رونق لگاتے ہیں۔

ٹورازم ڈیپارٹمنٹ والوں کی یہ ریلی فروری کے درمیان سے قبل ہوتی ہے مگر اس کے
انتظامات بہت پہلے شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ بے شمار اجلاس منعقد ہوتے ہیں،
انتظامات کا جائزہ لیا جاتا ہے، ان کے لئے فنڈز مختص کئے جاتے ہیں، اور رات دن ایک
کر کے انتظامیہ یہ ایونٹ منعقد کروانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ قوم کو بتایا جاتا ہے کہ
اس سے چولستان کی تقدیر بھی بدل جائے گی، یہاں ترقی ہوگی، یہاں کے لوگوں کا معیار
زندگی بہتر ہوگا، لوگوں کو روزگار بھی ملے گا اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی میسر آئیں
گے۔ افسران کے یہ اقوال دلپذیر سنتے ہوئے ایک عشرہ اور ایک برس ہو گیا، مگر
چولستانیوں کی تقدیر نہیں بدلی، اس کی شاید بڑی وجہ تو یہی ہے کہ تقدیر حکمرانوں کے
نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ ریلی منعقد کرنے
والے وہاں کے رہائشیوں کی تقدیر بدلنا ہی نہیں چاہتے۔ اگر انسان کسی کام کی کوشش
کرے تو اللہ تعالیٰ راستہ نکال ہی دیتا ہے۔ گیارہ برس میں اس سال قلعہ کو جانے والی
سرک تعمیر کر دی گئی، (یہ سرک اگرچہ پہلے سے موجود تھی مگر حد سے زیادہ ٹوٹ
پھوٹ کا شکار تھی) لاکھوں لوگوں کے خوردونوش کے لئے ”فوڈ سٹریٹ“ کے علاوہ بھی
، بہت سے ’ہوٹل‘ قائم تھے، مٹی تو دھند کی طرح ہر جگہ پر چھائی ہوئی تھی

عام ضرورت کی تقریباً تمام چیزیں موجود تھیں۔

حکومت کا یہ کروڑوں روپے کا ایونٹ ہوتا ہے، ایک ایک بات کو مد نظر رکھ کر اخراجات کئے جاتے ہیں، مگر لاکھوں لوگوں کے لئے سہولیات کا اندازہ لگایا جائے تو نہ ہونے کے برابر تھیں، قدم قدم پر ٹریفک جام تھی، صحرا میں مٹی تو اڑنی ہوتی ہے، پانی کا بندوبست نہیں تھا۔ بیت الخلا بھی ڈھونڈے سے نہ ملتے تھے، تباہم فطرت کی گود بہت وسیع تھی۔ کچھ چوکوں پر ٹریفک پولیس تو دکھائی دی، مگر دوسری پولیس منظر سے غائب تھی۔ بد انتظامی کا شاہکار وہ منظر تھا جب ریلی کا آغاز ہوا۔ جہاں اونچے چپوترے پر مہمان وغیرہ بیٹھتے ہیں اور جہاں سے گاڑیوں نے سٹارٹ لینا ہوتا ہے، وہاں بھی عام گاڑیاں اور موٹر سائیکل آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔ ریلی کے روٹ پر دونوں طرف قطاروں میں ہزاروں لوگ کھڑے تھے، ٹریک میں کوئی سوار ہے یا پیدل بے نیازی سے پھر رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب ریلی کا آغاز ہو گیا تب بھی لوگوں کی ٹریک پر چہل قدمی میں کمی نہیں آئی اور ہر گاڑی کی آمد پر بھگدڑ مچتی تھی، گاڑی ہارن بجاتی تھی اور لوگ راستہ دیتے تھے، ہر کوئی اپنے موبائل اٹھائے تصویر بنانے کے لئے ٹریک کے قریب تر ہو جاتا تھا۔ پولیس یقیناً وی آئی پی پروٹوکول میں مصروف ہو گئی، ٹریک پر شائقین کا قبضہ آخر تک قائم رہا، اور گاڑیاں بریکیں لگاتی، ہارن بجاتی وہاں سے گزرتی رہیں۔ یہ ریلی بھی مکمل طور پر کامیاب رہی، اس پر کام کرنے

والے محکمے مبارک باد کے مستحق ہیں، اب ان تمام لوگوں کو ایک تنخواہ اضافی ملنی چاہیئے، جنہوں نے دن رات ایک کر کے اسے کامیاب کروایا ہے، رہ گئے چولستانی، تو وہ باقیات کی صفائی کریں اور دیکھیں کہ امراء کا طبقہ جب تفریح کے بعد واپس جاتا ہے تو کس طرح کی اور کتنی غلاظت باقی چھوڑ کے جاتا ہے؟ گیارہ برس سے چولستانی یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔

دھرتی کا قرض؟

گورنر پنجاب رفیق رجوانہ نے جنوبی پنجاب کی محرومیوں کی تصدیق کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا محرومیوں اور مسائل کے حوالے سے مقدمہ سو فیصد درست ہے، انہوں نے خود کو اس دھرتی کا مقروض قرار دیا اور محروم علاقے کو یہ خوشخبری بھی سنائی کہ میں یہ قرض اتارنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ملتان سے تھوڑا سا آگے چلے جائیں تو انسان اور جانور ایک ہی جگہ پانی پیتے نظر آتے ہیں، اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہسپتالوں پر مریضوں کا بوجھ بڑھتا ہے، میرا خواب ہے کہ میں علاقے میں صحت کے لئے کوئی پراجیکٹ شروع کر جاؤں، انہوں نے اس کے لئے ٹرسٹ بنانے اور لوگوں سے تعاون کی درخواست بھی کی، محرومیوں کو ختم کرنے کو بھی انہوں نے اپنا خواب قرار دیا۔ ملتان کے نشتر ہسپتال میں ہونے والی اس تقریب میں سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بھی موجود تھے۔

رفیق رجوانہ پہلے گورنر نہیں جن کا تعلق جنوبی پنجاب سے ہے، ان سے قبل بھی جنوبی پنجاب کے بہت سے گورنروں نے لاہور گورنر ہاؤس میں قیام کیا ہے اور بہت سی سرکاری دستاویزات پر اپنے دستخط ثبت کر کے انہیں قانون کا درجہ عنایت کیا ہے۔ حکومت کے بہت سے فیصلوں پر بھی بھی مہر تصدیق ثبت کر کے انہیں قانونی

شکل دی ہے۔ آئینی لحاظ سے اس عہدہ کی اپنی اہمیت ہے۔ جنوبی پنجاب سے لاہور کے گورنر ہاؤس کے ذریعے حکمرانی کرنے والوں میں نواب امیر محمد خان (کالاباغ)، غلام مصطفیٰ کھر، سجاد قریشی (والد شاہ محمود قریشی)، سردار ذوالفقار علی کھوسہ، لطیف کھوسہ، مخدوم احمد محمود اور اب رفیق رجوانہ شامل ہیں۔ معاملہ صرف گورنروں تک ہی محدود نہیں رہا، اس سے قبل اسی خطے سے سردار فاروق لغاری کو صدر پاکستان ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے، اسی علاقے سے یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بھی رہے ہیں، یہاں سے پاکستان کے وزرائے خزانہ اور وزرائے خارجہ بھی رہے، اسی علاقے سے قومی اسمبلی کو صاحبزادہ فاروق اور یوسف رضا گیلانی کی صورت میں سپیکر بھی میسر آئے۔ ان کے علاوہ بہت سی اہم وزارتوں کے قلمدان بھی اس خطے کے نمائندوں کے پاس رہے اور اب بھی ہیں۔

پہلے تو یہ اندازہ لگانے کی ضرورت ہے کہ جنوبی پنجاب میں محرومیوں کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ ستم مرکزی حکمرانوں نے ڈھایا ہے یا اس کے ذمہ دار جنوبی پنجاب کے سیاستدان خود ہیں۔ اس حقیقت سے انکار تو ممکن نہیں کہ جنوبی پنجاب کو ہمیشہ عہدے ملے۔ مگر یہ ستم بھی کم نہیں کہ زیادہ تر عہدے نمائشی تھے۔ اگر جنوبی پنجاب کو اب کم از کم ساتواں گورنر دستیاب ہے تو یہ عہدہ سو فیصد نمائشی ہے، بس گورنر ہاؤس ہے، پروٹوکول ہے اور دستخط کرنے والی ایکٹ مشین کی ذمہ داری ہے، دستخط بھی ایسے جن میں اپنی مرضی کو بھی کم ہی دخل ہے،

جو حکم اوپر سے آگیا، اس پر دستخط کرنا گورنر پر لازم ہے۔ تاہم گورنر کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ وہ صوبہ بھر کی یونیورسٹیوں کا سربراہ ہوتا ہے، چانسلر ہونے کے ناطے وہ خود کو مصروف رکھنے کے لئے یونیورسٹیوں کا دورہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ ایسے میں جب کسی اہم مقام پر بیٹھ کر بھی علاقے کے مسائل حل نہیں ہو سکتے تو محرومیاں تو آئیں گی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اس محروم خطے کے سیاستدان بھی اپنے حق کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتے، جو مل جائے اسی پر قناعت کر لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وسطی اور بالائی پنجاب کے لوگ سارے فنڈ لے جاتے ہیں اور یہاں کچھ نہیں ملتا۔

جہاں تک خواب دیکھنے کی بات ہے تو گورنر صاحب صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ گورنر ہاؤس میں بیٹھ کر تعبیر ممکن نہیں، اگر خوابوں میں رنگت بھرنے کی بات ہوتی تو چوہدری سرور بھی صوبہ میں پینے کے لئے صاف پانی کا خواب دیکھتے ہوئے ہی رخصت ہو گئے۔ دوسری طرف گورنر جوانہ نے یوسف رضا گیلانی کی تعریف بھی کی کہ انہوں نے کسی حد تک خطے کا قرض اتارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ گیلانی صاحب نے اپنے دور میں پورے جنوبی پنجاب کے بجٹ کا پچاس فیصد صرف ملتان پر لگا دیا تھا، ملتان بن گیا مگر پورا خطہ پھر بھی محروم ہی رہا۔ گیلانی سرکار نے نہ جانے کونسا قرض اتارا ہے؟ اگر جنوبی پنجاب میں انسان اور جانور ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں تو اس کی ذمہ داری بھی

انہی صدروں، وزیراعظموں، گورنروں اور وزیروں پر عاید ہوتی ہے، جو اپنے دور میں
پر وٹو کول اور مراعات سے تو لطف اندوز ہوتے رہے مگر محروم خطے کی جانب توجہ نہ
فرمائی۔ اب ایک بے اختیار عہدے پر متمکن ہونے کے بعد محرومیاں ختم کرنے کا دعویٰ
اور خواب ایک خواہش تو ہو سکتی ہے، عملی طور پر کچھ ممکن نہیں۔ ایسے بیانات محروم
عوام کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام دیتے ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا کانووکیشن تھا، مہمانِ خصوصی بہاول پور سے ہی تعلق رکھنے والے تعلیم کے وزیر مملکت انجینئر بلغ الرحمن تھے، ان کی معاونت کے لئے لاہور سے صوبائی وزیر تعلیم رانا مشہود خاص طور پر تشریف لائے تھے۔ تاہم اصل مہمانِ خصوصی گورنر پنجاب رفیق رجوانہ تھے، جو اپنی کسی مصروفیت کی بنا پر نہیں آ سکے۔ ان کی مصروفیت کیا تھی، یا انہیں کونسی ایسی ایرجنسی ہوئی کہ وہ اپنے ہی زیر نگرانی چلنے والی ایک جامعہ کی سالانہ تقریب میں نہ آئے، وہ تعلیم یافتہ اور علم دوست شخص ہیں، یقیناً انہیں اس کام سے بھی اہم کام ہوگا، ورنہ رجوانہ صاحب سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ مہمانِ خصوصی کا اعلان ہونے کے باوجود بھی نہ آئیں، کیا جانے انہوں نے گورنر ہاؤس میں کسی اجلاس کی صدارت کرنا ہو، ہو سکتا ہے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کرنی ہو، یا کوئی بھی مصروفیت ہو سکتی ہے، جس نے انہیں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول جانے سے ان کے قدم روک لئے؟ اگر ہمارے گورنر، کہ جو صوبہ بھر کی تمام جامعات کے چانسلر ہیں، ان کی اہم ترین تقریبات میں نہیں جائیں گے تو پریشانی والی بات تو ہے، تاہم اگر گورنر اس سے بھی اہم کسی پروگرام میں چلے گئے ہیں تو اور بات ہے۔

چانسلر کی عدم موجودگی میں یونیورسٹی انتظامیہ نے وفاقی وزیر مملکت برائے تعلیم اور صوبائی وزیر تعلیم سے کام چلایا۔ خیر یہ بھی کوئی کم اہم لوگٹ نہیں تھے، وزیر مملکت نے آخر وقت نکالا ہوگا، انہوں نے اسمبلی میں سوالوں کے جواب دینے ہوتے ہیں، وزارت داخلہ کے بہت سے اہم معاملات پر اسمبلی میں ممبران کو مطمئن کرنا ہوتا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے تقریبات میں شرکت کرنی ہوتی ہے، سیمینارز میں تعلیم کے فروغ کے لئے امید افزا گفتگو کرنا ہوتی ہے، لوگوں کو بتانا ہوتا ہے کہ اس وقت ملک میں ڈھائی کروڑ بچے سکولوں سے باہر ہیں، اور انہوں نے اسی قسم کی دیگر اہم ترین تقریبات میں جانا ہوتا ہے۔ ان کی علم دوستی ہی ہے کہ انہوں نے اپنی ان گول ناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر طلبہ و طالبات کو میڈل دیئے۔ یہی کچھ صوبائی وزیر تعلیم کا معاملہ ہے۔ لاہوری وزیر تفریح کے لئے ہی لاہور چھوڑتے ہیں، موصوف چونکہ بہاولپور آئے ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے ازراہ کرم و یمن یونیورسٹی کا دورہ بھی فرمالیا، تاکہ سند رہے۔ اس یونیورسٹی پر حکومتی توجہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

کانو وکیشن میں چونکہ سٹوڈنٹس کے لئے ڈرامہ سٹیج کرنا ہوتا ہے، ڈسپلن کا تقاضا ہے کہ میڈل کے حقدار تمام طلبا و طالبات کو ترتیب اور سلیقے سے میڈل کے لئے لایا جائے، اس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ وقت کتنا لگے گا، کس طرف سے آنا ہے، واپس کدھر سے جانا ہے۔ چنانچہ اسلامیہ یونیورسٹی میں بھی

ریہرسل کی گئی، تاکہ موقع پر پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تازہ صورت حال میں اگرچہ مہمانِ خصوصی اصل نہیں تھے، دوسرا ستم یہ ہوا کہ یونیورسٹی نے اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر میڈل کی تعداد شمار کرنے کا تکلف نہ کیا، جن سٹوڈنٹس کو بلایا گیا، انہیں بھی میڈل نہیں مل سکے، بہت سے سٹوڈنٹس سے میڈل واپس لے لئے گئے، کیونکہ کم تعداد کی بنا پر دوسروں کی خانہ پری کرنا مقصود تھا، ریکارڈ رکھنے کے لئے مہمانوں کے ساتھ فوٹو بنانا بھی یونیورسٹی کی مجبوری تھی۔ میڈل واپس لینے پر تو احتجاج ہونا ہی تھا، جن کو بلا کر دو روز ریہرسل کروا کر میڈل سرے سے دیئے ہی نہیں گئے ان کا احتجاج اور بچیوں کا رونا فطری بات تھی۔ دوسرے اضلاع سے آنے والی بچیوں کو میڈل نہ ملے تو ان کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس صورت حال میں جب سٹوڈنٹس نے احتجاج کیا اور سٹیج کی طرف لپکے تو دونوں وزراء نے انہیں صبر کی تلقین کی، انہیں برداشت کرنے کا کہا، مگر ہنگامہ مچا رہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو سٹوڈنٹس ذہن بنا کر آئے تھے، کہ انہیں میڈل ملے گا، وہ تصویر بنوائیں گے، اس کو فیس بک پر بھی ڈالیں گے اور ریکارڈ میں بھی رکھیں گے اور اگر مہمانِ خصوصی ذرا اہم آدمی ہو تو طلبا ان کے ساتھ لی گئی تصویر کو فریم کروا کے بھی رکھ لیتے ہیں۔ ہنگامے اور احتجاج کی دوسری وجہ یہ تھی کہ شاید طلبا کو یقین تھا کہ ان دونوں حضرات کے وعدے چونکہ سیاسی ہونگے، اس لئے ان پر عمل ہونے کے امکانات کم ہی ہیں۔ بہر حال میڈل تو مل ہی جائیں گے، مگر یونیورسٹی

انتظامیہ کے انتظامات قابلِ غور ہیں، آخر اتنے بڑے پروگرام کے لئے اتنا ناقص
بندوبست کیوں کیا گیا؟ مہمانوں کی تکریم کیوں کم کروائی گئی؟ وائس چانسلر صاحب مردم
بیزار آدمی ہیں، ان کے ارد گرد بھی شاید اسی طرح کے مشیر جمع ہیں، یہی وجہ ہے کہ
یونیورسٹی رہنکنگ میں نیچے سے نیچے جارہی ہے، یونیورسٹی کو کسی علم دوست، انسان
دوست دورانِ دلش سربراہ کی ضرورت ہے، ورنہ یونیورسٹی تماشا بنی رہے گی۔

پشاور سے احتجاج کی ایک خبر آئی تو خوشی کی عجیب سی لہر دوڑ گئی، یہاں فوری طور پر یہ اندازہ نہ لگائیے کہ اس خوشی کے پس منظر میں کسی کی سیاسی حمایت یا مخالفت کا فرما تھی، بلکہ خوشی احتجاج کے انداز پر ہوئی۔ بنوں سے ویلج ناظمین نے پشاور میں اسمبلی ہال کے باہر مظاہرہ کیا، اور جہاں مظاہرہ ہوگا وہاں دھرنا تو لازمی امر ہے، کیونکہ دھرنے کے ماہرین کی ہی وہاں حکومت ہے۔ ناظمین نے مطالبہ کیا کہ انہیں لوکل گورنمنٹ ایکٹ 2013ء کے مطابق اختیارات اور تنخواہیں دی جائیں، بہت سے ناظمین کے پاس دفتر بھی نہیں، ترقیاتی کاموں میں ٹھیکیداری نظام کو ختم کیا جائے، اور یہ بھی کہ مطالبات تسلیم ہونے تک احتجاج جاری رہے گا۔ خوشی اور دلچسپی کی بات یہ ہوئی کہ ناظمین نے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑا بھی ڈالا۔ دوسری طرف ٹیچنگ اسٹنٹس نے گورنر ہاؤس کے باہر احتجاج کیا اور دھرنا دیا، انہوں نے خود کو مستقل کرنے کا مطالبہ کیا، اور دھرنے کو بنی گالہ تک پھیلانے کی دھمکی بھی دی۔ ان دونوں دھرنوں اور احتجاجوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ پشاور کی ٹریفک بری طرح جام ہو گئی، گاڑیوں کی طویل قطاریں لگ گئیں اور عوام کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

دراصل آغاز میں مجھے اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ ناظمین نے بھنگڑا ڈال کر احتجاج کیا، یہ احتجاج کئی حوالوں سے دلچسپ ہے، اول یہ کہ اس میں نئی طرح ڈالی گئی، یعنی گلا پھاڑ نعرے، توڑ پھوڑ کلچر، گھبرائو جلاؤ انداز، لاشی چارج اور اسی قسم کے دیگر پریشان کن اور تکلیف دہ امور سے یہ احتجاج مختلف تھا۔ بس مطالبے بھی تھے اور وہ بھی ناپتے گاتے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ تحریک انصاف کی حکومت اگر پنجاب اور سندھ میں ناظمین چیئرمین کے لئے اختیارات کا مطالبہ کرتی ہے تو اپنے صوبے میں اس کا بندوبست کیوں نہ ہو سکا؟ اگر ہے تو یہ احتجاج کیوں ہوا، اپنی ساکھ بہتر کرنے کے لئے خیبر حکومت کو اس کی وضاحت ضرور کرنی چاہیے۔ یہاں یہ امر بھی اہم ہے کہ یہ مظاہرہ اسمبلی ہال کے سامنے کیا گیا۔ اس کا مقصد یہی ہو گا کہ حکمران طبقہ خود دیکھ سکے کہ اپنے حق کے لئے منتخب لوگ ہی سڑکوں پر آنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تاہم احتجاج کے اس مقام سے ایک فائدہ تو ہو جائے گا کہ یہ احتجاج میڈیا کی نظر میں آگیا، ویسے میڈیا کے لئے یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ ناظمین نے ڈھول اور بھنگڑے کے ذریعے احتجاج کیا۔ احتجاج کرنے والوں کا اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرے سے ان کا بھولپن بھی ظاہر ہوتا ہے، ناظمین کا خیال ہے کہ اپنی اسمبلیاں اس قدر با اختیار ہیں کہ وہ عوامی دلچسپی کے فیصلے کر سکیں؟ فیصلے وہی ہوتے ہیں جو حکومتی پارٹی اور اس کے اتحادیوں کی منشا کے مطابق ہوتے ہیں۔

اپنے اختیارات اور تنخواہوں کے مطالبے کی تو پنجاب میں بھی سخت ضرورت ہے،
 کیونکہ یہ دونوں چیزیں نہیں ہوگی تو بلدیاتی انتخاب میں حصہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔
 آپس کی بات ہے اگر اپنی صوبائی حکومتیں بلدیاتی نمائندوں کو معقول اعزازیہ عنایت
 کر دیں تو یہ لوگ بہت آرام سے اختیارات کے مطالبے سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ ویسے
 پنجاب میں تو چیئرمینوں وغیرہ کی مجال ہی نہیں کہ وہ اسمبلی ہال کے سامنے اپنی ہی
 حکومت کے سامنے احتجاج کی صدا بلند کر سکیں۔ یہاں ابھی تو آزاد پرندے اُڑا کر
 حکومتی دسترخوان پر دانہ بچکنے کے لئے آ رہے ہیں، نجی محفلوں میں اختیارات کی بات
 کرتے ہیں، کھل کر بات کرنے کی ہمت وہ نہیں کر سکتے۔ جو لوگ الیکشن سے قبل
 حکومتی پارٹی کی ٹکٹ کے لئے دیوانے ہوئے جاتے تھے اب ان کی کیسے مجال ہو سکتی ہے
 کہ وہ اسی طاقتور حکومت کے سامنے کھڑے ہو جائیں، اگر کسی کی آواز نکلی بھی سہی تو وہ
 اختیارات اور فنڈز وغیرہ کو بھول جائے۔ جس خوشی کا کالم کے آغاز میں ذکر کیا گیا تھا وہ
 یہی تھی کہ اب احتجاج ایسے ہوگا کہ احتجاج کرنے والے گھر سے نکلیں گے، ان کے آگے
 ڈھول پیٹا جائے گا، وہ خود اور ان کے ساتھی بھنگڑا ڈالا کریں گے، احتجاج کی جگہ پر پہنچ
 کر یہ لوگ اسی قسم کے تفریحی پروگرام کریں گے اور حکومت کو اگلی پیشی دے کر لوٹ
 آئیں گے۔ مگر خبر کی تفصیل سے یہی معلوم ہوا کہ وہاں دھرنا بھی ہوا، اور ٹریفک
 بلاک بھی ہوئی، لوگ گھنٹوں ٹریفک میں الجھے رہے اور گاڑیوں کی طویل قطاریں لگ
 گئیں۔ دوسری طرف ٹیچنگ اسٹنٹس نے

گورنر ہاؤس کے سامنے دھرنا دیا اور اگلا دھرنا بنی گالہ دینے کا اعلان کیا۔ یوں پشاور کے
دواہم مقامات پر ٹریفک شدید جام رہی، عوام پریشان رہے۔ خیبر حکومت سے ایک
درخواست کہ اگر اس نے اپنی سہولت بنانی ہے تو لوگوں کو احتجاج تک پہنچنے ہی نہ دے، اور
احتجاج کرنے والوں سے یہ عرض کہ وہ احتجاج کا وہی طریقہ اپنائیں جسے دیکھ کر لوگ
خوش ہوں، اور کام بھی بن جائے۔

گزشتہ چند روز سے پاکستان کا سب سے گرم ایٹو نیب ہے، کیوں نہ ہو کہ وزیراعظم میاں نواز شریف نے خود اس کی ابتدا کی ہے، اب اپوزیشن لیڈر سے لے کر دیگر سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں تک سب اس پر تبصرہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، اگر وزیراعظم نے نیب کو درست طریقہ اختیار کرنے اور بلاشبوت ہر کسی کے گھر میں جھانکنے سے روکا ہے، تو ان کے پاس یقیناً اس کے ثبوت ہونگے۔ مگر کیا کیجئے کہ اپنی سیاست حقائق اور سچائی کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتی، نہ ہی پارٹیاں اپنے منشور پر توجہ دیتی ہیں اور نہ ہی حکمرانوں یا اپوزیشن کے پاس کوئی لائحہ عمل ہے۔ بس بیانات اور ہنگامی منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کو ہی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ نیب کے بارے میں اگر سیاستدانوں کے بیانات ہی مرتب کر لئے جائیں تو کئی ضخیم مضمون معرض وجود میں آجائیں گے۔ ایک طرف تو اپوزیشن نے تنقید کے تیر چلانے شروع کئے ہوئے ہیں، جن میں اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ کا کہنا ہے کہ وزیراعظم اور میں نے مل کر ہی چیئرمین کا انتخاب کیا تھا۔ اب اس میں کیا خامی پیدا ہو گئی۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ حکومت اور اپوزیشن یہی چاہتے ہیں کہ نیب 'دوسروں' پر ہی ہاتھ ڈالے، اگر اس میں خود حکومتی پارٹی یا اس کے خاص لوگوں کا نام آتا ہے تو پھر نیب نا انصافی کر رہا ہے۔ اگر

دوسروں کو ہی پکڑے تو پھر وہ بہترین انداز میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے۔ نیب کی بات چونکہ وزیراعظم نے کی ہے اس لئے تمام حکومتی ارکان اور وزراء وغیرہ نے اس بیان کو فرض جان کر اس پر رائے زنی کا فیصلہ کیا ہوا ہے، اب بہت سے وزراء روزانہ نیب کے خلاف بیان دے کر اپنے قائد کے سامنے سرخرو ہوتے اور اپنے نمبر کچے کرتے ہیں۔

دوسری طرف پنجاب اسمبلی کے بارے میں خبر آئی ہے کہ ایوان مچھلی منڈی کا منظر پیش کرنے لگا، کیونکہ وہاں یہ بحث چھڑ گئی کہ اورنج لائن ٹرین ضروری ہے یا غیر ضروری۔ دونوں فریق اپنی اپنی انتہاؤں پر قائم رہے، اگر حکمران جماعت نے میسٹر وٹرین کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تو دوسری طرف اپوزیشن پارٹیوں نے بھی اس منصوبے کو یکسر مسترد کر دیا۔ معاملہ بحث و مباحثے سے شروع ہوا اور بات آپس میں الجھنے تک پہنچ گئی۔ بتایا گیا کہ اپوزیشن جتنا چاہے شور مچالے میسٹر وٹرین بن کر رہے گی۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا، کیونکہ جس منصوبے کا آغاز ہو چکا ہے اور جس پر اربوں روپے لگ بھی چکے ہیں، اس کا روکنا ممکن نہیں لگتا۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومتی پارٹی کے علاوہ اہل دانش بھی اس منصوبے کو بہت مناسب قرار نہیں دے رہے، ان کا کہنا ہے کہ اس منصوبے سے کم از کم لاہور کی تاریخی عمارات کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ مگر جب ترقی کی لہر اٹھتی ہے تو اس کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور

کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین کے تحفظات کے باوجود کام جاری ہے، حتیٰ کہ یہ بیانات بھی سامنے آرہے ہیں کہ جہاں کہیں عدالت نے حکم امتناعی جاری کر رکھا ہے وہاں بھی کام ہو رہا ہے۔

موجودہ وزیر اعلیٰ کو فعال ترین وزیر اعلیٰ قرار دیا جاتا ہے، خود موصوف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ایک دھیلے کی بھی کرپشن ثابت ہو جائے میں سیاست چھوڑ دوں گا، مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ میاں شہباز شریف کو 'میگا پراجیکٹس' کا بے حد شوق ہے، وہ لاکھوں کے یا چند کروڑ کے کسی منصوبے کا نام بھی نہیں سننا چاہتے، ان کی نگاہ میں منصوبے کا آغاز اسی وقت ہوتا ہے جب اس پر پچاس کروڑ یا ارب روپیہ لگتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اپنے ہاں سکولوں کی حالت کیا ہے، جہاں کلاس روم، واش روم اور چار دیواری نہیں ہوگی، وہاں بچے کیسے تعلیم حاصل کریں گے۔ کس کو نہیں معلوم کہ ہسپتالوں میں ضروری مشینری اول تو ہے ہی نہیں، اور اگر ہے تو قیمتی مشینری خراب پڑی ہے، ادویات کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، غریب ہسپتالوں کے باہر دھکے کھانے پر مجبور ہیں۔ غری رابطہ سڑکوں کی بجائے ہر سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، پینے کے صاف پانی کے پلانٹس کی کس قدر قلت ہے، یہ کتنے اور کہاں کہاں نصب ہونے چاہیے؟ کتنے لاکھ بچے سکولوں سے باہر ہیں، کتنے لوگ غربت اور مہنگائی کی بنا پر خود کشیوں پر مجبور ہیں؟ مگر کیا ہے کہ اپنے حکمرانوں کی نگاہ میں

پروٹوکول، مراعات اور بادشاہی انداز حکمرانی ہی سب کچھ ہے، یا پھر وہ میگا پراجیکٹس جو نسلوں کے مستقبل کی قربانی دے کر بنائے جائیں، یہ میٹرو، یہ دانش سکول، یہ لیپ ٹاپ اور دیگر منصوبے درست ہیں، مگر ان سے پہلے بھوک، ناخواندگی اور بیماریوں کے خاتمے کی ضرورت ہے۔

بہاولپور وزیر اعظم میاں نواز شریف کا دوسرا گھر ہے، یہ اطلاع خود میاں صاحب نے ہی قوم کو دی ہے۔ گزشتہ دنوں وہ اپنے دوسرے گھر آئے، اسی لئے انہوں نے اپنے دورے کو نجی قرار دیا۔ بہاول پور میں بھی ان کا کوئی گھر ہے یا پورا بہاول پور ہی ان کا گھر ہے؟ اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ لال سوہانزا نیشنل پارک کے قریب بہاولپور سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ریٹ ہاؤس ہے، جو بڑی نہر کے کنارے ہے، دوسری طرف لال سوہانزا جنگل ہے۔ اس ریٹ ہاؤس میں ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے، اور کنارے پر کچھ رہائشی کمرے ہیں، انہی میں سے ایک میاں صاحب کے زیر استعمال رہتا ہے۔ جب میاں صاحب وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اس ریٹ ہاؤس کو آباد کیا، اس کو بنایا سنوارا، وہ بھلے وقتوں میں اکثر یہاں تشریف لاتے، جنگل میں منگل کا ماحول پیدا کرتے، جھیل میں کشتی چلتی، کسی حد تک موسیقی کی محفل برپا ہوتی۔ یہاں سے کچھ ہی دور صحرا ہے، جہاں کیپ لگایا جاتا، خورد و نوش اور شکار کی کہانیاں معرض وجود میں آتیں۔ اسی زمانے میں بہاول پور شہر سے پی پی کے ایم پی اے منتخب ہو گئے، (اس کے بعد ایسا کبھی نہ ہوا) ایم پی اے نے اسمبلی کے اندر بھی میاں صاحب کو بہاولپور جانے کے طعنے دیئے، ان کے دوروں کو مشکوک قرار دیا، اپنی انہی کاوشوں کی مدد سے ایم پی اے صاحب

مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خیر یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں، عمر رفتہ کو لاکھ آوار دیں وہ نہیں لوٹتی، تاہم میاں صاحب باذوق انسان ہیں، کہ اچھے وقتوں کی یاد تازہ کرنے کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جس گھر کو آپ شرفِ میزبانی بخشے ہیں، وہ چولستانی علاقے سے ہی سے صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں، قبل ازیں ان کے والد گرامی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں، انہی سے بڑے میاں صاحب کی دوستی تھی، چند برس قبل وہ ٹیٹنگی وائرس کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ تاہم خلف الرشید کی عادتیں اپنے آبا سے ذرا مختلف ہیں، ان کے شوق بھی الگ ہیں، وہ لوگوں کی گندم کاٹنے کے مقدمات میں بھی پائے جاتے ہیں، وہ اپنی اسی قسم کی عادتوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ چونکہ میاں صاحب میرٹ پر کاربند رہنے والے لوگ ہیں اس لئے اگر ان کے ساتھی، یا ممبرانِ اسمبلی کے بارے میں خبریں زیادہ اچھی نہیں تو یوں جاننے کہ یہ ہوائیاں دشمنوں نے ہی اڑائی ہو گئی، کیونکہ میاں برادران کے تمام ساتھی بشمول رانا ثناء اللہ اور ان کے بہاول پوری میزبان بہت ہی معصوم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے نیب کے بارے میں بہاولپور آ کر بیان دیا، معصوم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے 'معصوم' بیوروکریٹس کی حمایت میں نیب کو محتاط رہنے کا حکم صادر کیا، اور حکم یہ بھی دیا کہ اگر نیب نے اپنا طریقہ کار درست نہ

کیا تو اس کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔ حاسدین کا خیال ہے کہ نیب میں میاں، برادران اور ان کے بہت سے قریبی (مگر معصوم) دوستوں کے کیس بھی ہیں، اسی لئے نیب کو قبلہ درست کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

میاں صاحب کا اصلی دوسرا گھر نہ جانے کونسا ہے، کیونکہ وہ لاہور میں بھی رہائش پذیر ہیں، رائے ونڈ میں بھی ان کا غریب خانہ ہے، اسلام آباد میں بھی وہ سرکاری گھر میں رہتے ہیں، سعودی عرب بھی ان کا گھر ہے، برطانیہ میں بھی ان کے برخوردار کاروبار کرتے ہیں، یوں یہ اندازہ لگانا بھی آسان نہیں کہ ان کا پہلا گھر کونسا ہے اور دوسرا کونسا؟ یہاں تو بات پانچ چھ تک پہنچی ہوئی ہے، ممکن ہے اب وہ چین اور ترکی کو بھی اپنا دوسرا گھر قرار دیتے ہوں۔ خیر ان کی مرضی جس کو دوسرا قرار دیں اور کس کو تیسرا۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ تمام گھروں کو دوسرا ہی قرار دے دیں۔ اگرچہ وزیراعظم کا یہ دورہ نجی گنا جاتا ہے، مگر اسی میں انہوں نے نیب کے خلاف انقلابی بیان دیا، جس کی بازگشت بہت دنوں تک سنائی دیتی رہے گی۔ یہیں پر انہوں نے ستلج کنارے ایکٹ جھیل کے لئے ساٹھ کروڑ روپے کا اعلان کیا، انہوں نے چولستان میں قلعہ موج گڑھ کی تعمیر و مرمت کا حکم بھی صادر فرمایا۔ لال سوہانرا نیشنل پارک کی حالت پر اظہار ناراضی بھی کیا اور اس کی بہبود کے لئے احکامات بھی جاری کئے۔ جب وہ اپنے میزبان کے گھر بہاول پور شہر میں کھانے کی دعوت میں تشریف لے گئے تو

پورے علاقہ کو سیل کر دیا گیا، گھر کے قریب ہی بچیوں کا ایک سکول ہے، جہاں سکیورٹی
کی پابندیوں کی وجہ سے طالبات اور ان کی ٹیچرز کو چھٹی کے بعد دو گھنٹے تک جلسے بے جا
میں رہنا پڑا، کیونکہ باہر جانے کے تمام راستے بند تھے۔

! مرتخ پر آلو کی کاشت

اہل عالم کے لئے خوشخبری ہے کہ اب مرتخ پر بھی آلو کاشت کئے جائیں گے، اس سلسلہ میں امریکی خلائی ادارہ ناسا اور آلوؤں کے بین الاقوامی مرکز (سی آئی پی) سے تعلق رکھنے والے ماہرین مرتخ پر آلو اگانے کا تجربہ کریں گے۔ اس مقصد کے لئے سائنسدانوں نے آلوؤں کی مختلف قسمیں منتخب کی ہیں، جنہیں مرتخ کی سطح جیسے حالات میں کاشت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کامیابی کی صورت میں اس سیارے پر سبزی کاشت کرنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ آلو دنیا کی نقد آور فصلوں میں اہم حیثیت رکھتا ہے، دنیا بھر میں آلو کی اپنی مانگ اور اہمیت ہے۔ آلو کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے محاوروں کی زینت بھی بنایا گیا ہے، تاہم اس کی شکل چونکہ بس گول مٹول سی ہوتی ہے، یعنی اس کی بناوٹ میں نہ تو کوئی ترتیب ہے اور ہی انفرادیت اس لئے اس کی تمام تر مقبولیت کے باوجود اسے شاعروں نے اپنا موضوع سخن نہیں بنایا، ورنہ بہت سی سبزیاں جیسی بھی ہوں، ان کی شکل بہت منفرد اور خوبصورت ہوتی ہے، گو بھی، بھنڈی، گاجر، کرلی، پیٹنگن وغیرہ جس سبزی کو بھی دیکھ لیں خوبصورت رنگ اور شکل کی حامل ہیں، مگر آلو بیچارے کا رنگ ہے نہ ڈھنگ۔

اس سب کچھ کے باوجود آلو کی اہمیت تمام سبزیوں سے زیادہ ہے، یہ بہت سی

سبزیوں میں ڈال کر اُن کی رونق بڑھائی جاتی ہے، معاملہ سبزیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اسے گوشت میں بہت اہتمام کے ساتھ ڈالا جاتا ہے۔ آلو کی اہمیت کے پیش نظر کبھی اس کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے اور کبھی یہی قیمت زیر زمین چلی جاتی ہے۔ کبھی یہی آلو بھارت سے درآمد کرنے پڑتے ہیں تو کبھی پاکستان کے اپنے آلوؤں کی قیمت اُسے روپے سے اوپر چلی جاتی ہے۔ آلو کے ساتھ کچھ بھی نہ پکایا جائے تو صرف آلو ہی شوربا ڈال کے بنائے جاسکتے ہیں، گلی گلی میں چپس کی رٹڑھیاں بچی ہیں، جو آلوؤں کو تازہ بتارہ تل کر لوگوں کی کھانے کے لئے مہیا کرتے ہیں، چپس کا رواج بھی عام ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر ہی شاید سائنسدانوں نے آلو کا انتخاب کیا ہے، ورنہ دیگر سبزیوں میں اتنی کشش اور خصوصیات نہیں ہیں کہ انہیں آلو پر ترجیح دی جاتی، بیٹنگن کو دیکھ لیجئے، بھنڈی کی مثال لے لیجئے، گاجر کو دیکھ لیجئے، ان جیسی اور بھی بہت سی سبزیاں دیدہ زیب بھی ہیں اور ان پر محنت اور خرچہ بھی بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ آلوؤں کے لئے مرنخ پر کھاد کی ہزاروں بوریاں لے جانی پڑیں گی، اس کے بعد کیڑے مار ادویات کی سپرے کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ تاہم بہت سے لوگوں کے دہرے کا مسئلہ نہیں بنے گا، کیونکہ اب انسانوں کی جگہ پر میشنری سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ چونکہ مرنخ پر کاشت کے لئے جانے والے آلو کی اقسام منتخب کر لی گئی ہیں، اس

لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کسی قسم کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں، یہ معرکہ باہر کی دنیا نے خود ہی سر کر لیا ہے، تاہم اگر ناسا والے مناسب تصور کریں تو کچھ ماہرین پاکستان سے حاصل کر لیں تو ان کی مہربانی ہوگی، پاکستان بھی چونکہ آلو بہت مہارت سے اور بہت زیادہ کاشت کیا جاتا ہے، اس لئے ماہرین کی یہاں کوئی کمی نہیں۔ چونکہ آلو کی مرنج پر کاشتکاری میں امریکہ کا ہاتھ ہے، اس لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مرنج پر کاشت ہونے کے بعد آلو سستا ہو جائے گا، پاکستان امریکہ کا اہم اتحادی ہے، اس لئے یہ بھی امید ہے کہ اس آلو میں سے پاکستان کو بھی معقول حصہ ملے گا۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان آلوؤں کو زمین تک لانے کے لئے زیادہ مصنوعی ذرائع نقل و حمل استعمال نہیں کرنے پڑیں گے، بلکہ مرنج سے زمین کی طرف آلوؤں کی پٹیاں لڑھکادی جائیں گی، اور وہ کشش ثقل کے ذریعے بغیر کسی ذریعے کے زمین پر پہنچ جائیں گے۔ البتہ ان کے لئے علاقے کا تعین کرنا ضروری ہوگا، یہ نہ ہو کہ مرنج سے گر کر سمندر میں ہی غرق ہو جائیں، یا شمالی علاقہ جات کے پہاڑوں پر ہی گر کر غاروں میں کھو جائیں۔ امید ہے حکومت مرنج کے آلوؤں کے لئے کوئی اقتصادی راہداری ضرور تیار کرے گی، تاکہ پاکستان کو مرنجی آلوؤں میں اس کا حصہ دیا جاسکے۔ مرنج سے آنے والے آلوؤں کی یقیناً مانگ بھی زیادہ ہوگی، اس لئے حکومت ہر علاقے اور ہر طبقہ کے عوام کے لئے اسے قابل قبول بنانے پر سببڈی دینے کا اعلان کرے، امید

ہے آلوؤں کی کامیاب کاشت کے بعد عتے کی فصل کا بھی مرتخ پر اہتمام کر لیا جائے، اگر
اس میں کامیابی ہو گئی تو پاکستان سے لازمی ایسے صنعتکاروں کا وفد مرتخ پر لے جایا جائے
جو وہاں شوگر ملز قائم کرنے کا بندوبست کرے۔

ماں سے محبت ضرب المثل ہے، نہ اس پر کسی کو انکار ہے اور نہ ہی یہ کسی حوالے سے متنازع ہے۔ ماں کی محبت کا ایک تقاضا اس کی زبان ہے، بچے فطری طور پر ماں کی زبان بولتے ہیں، ماں اپنے بچے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسی عمر کی بچی بن جاتی ہے، تو تلی زبان میں باتیں کرتی ہے، اور اس لیے سے خوب لطف اٹھاتی ہے۔ اب یہ روایت چل نکلی ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو اپنی زبان کی بجائے اردو یا انگریزی سکھانے کی کوشش کرتی ہیں، ماؤں کو نہ جانے کس نے بتا دیا ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ دوسری زبانیں بولیں گی تو وہ زبانیں سکھ سکیں گے، اور یہ بھی کہ یہ زبانیں بولنے سے انسان زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے۔ مادری زبان بولتے ہوئے احساسِ شرمندگی ہوتا ہے، کسی پڑھے لکھوں کی محفل میں اپنی مادری زبان بولتے ہوئے انسان پریشان، احساسِ کمتری کا شکار اور شرمندہ ہوتا ہے۔ مائیں انہی احساسات کے پیشِ نظر دوسری زبانوں پر زور دیتی اور وہی سکھانے کے چکر میں رہتی ہیں۔

اردو ہماری قومی زبان ہے، قومی زبان ہونے اور اس کے پیچھے عدالتِ عظمیٰ کے واضح احکامات کے باوجود یہ سرکاری زبان کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکی۔ دلچسپ

بات یہ ہے کہ اپنے موجودہ حکمران انگریزی کے بہت دلدادہ بھی نہیں، بلکہ اگر وہ اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیتے تو خود ان کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ اردو کی ناقدری اور پذیرائی نہ ہونے کے باوجود پاکستان کے عوام کی بہت بڑی اکثریت اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان کی بجائے اردو سکھاتی ہے۔ یہ معاملہ بہت تحقیق طلب ہے اور کا ایک سروے لازمی ہونا چاہیے کہ سال بہ سال کتنے لوگ ہیں جو اپنی مادری زبان کو خیر باد کہہ رہے ہیں، اور ہر عشرے میں مادری زبان کتنے فیصد پیچھے چلی جاتی ہے؟ اگر مادری زبان کا خود ماؤں نے ہی قتل عام جاری رکھا تو کوئی بعید نہیں کہ کچھ ہی عرصہ میں یہ زبانیں اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ ایک طرف اردو خود اپنے مخالفین کے پے در پے حملوں کی زد میں ہے، اس کو سرکاری زبان بنانا تو دور کی بات ہے، اس کی اصلی شکل بحال رکھنا بھی ایک مسئلہ ہے، وہاں ہمارے ہر گھر میں اردو کا راج ہے، جو والدین کوئی مقامی زبان بولتے تھے، اب وہ اپنے بچوں کے ساتھ اردو ہی بولا کرتے ہیں، مادری زبان سے تو ان کے بچے مکمل طور پر اجنبی ہو ہی گئے، اردو سے بھی درست طریقے سے آشنا نہ ہو سکیں گے، کئی دادیاں بیچاری تو اپنے پوتوں اور نواسوں وغیرہ کے ساتھ اردو بولنے میں بہت دقت محسوس کرتی ہیں اور گلابی قسم کی اردو بولتی ہیں، مگر کیا کریں کہ ان کی بہو یا بیٹا انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اُدھر ایلٹ کلاس کی خواتین اپنے بچوں سے مادری زبان تو رہی ایک طرف انگریزی کے علاوہ کوئی زبان نہیں بولتیں۔

زبانوں کی تبدیلی کا عمل برق رفتاری سے جاری ہے، برصغیر میں تو مادری زبانوں کو ایک بہت بڑا جھٹکا اس وقت لگا، جب دسیوں زبانیں بولنے والے اور بہت سے لہجوں والے اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر گئے، اور جہاں جا اور آ کر وہ آباد ہوئے، وہاں انہیں ہر طرف دوسری زبانیں اور لہجے ملے۔ کسی کی زبان بھی خالص نہ رہی۔ جہاں مسلمانوں یا ہندوؤں کی اکثریت تھی، وہاں سے بہت کم لوگوں نے ہجرت کی۔ وہاں کسی حد تک زبان خالص رہ گئی، مگر ایسے علاقے نہایت ہی کم تھے۔ زبانوں میں، ملاوٹ کی ایک وجہ تو اپنا علاقہ چھوڑنا تھا،

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ہمسایوں کے اثرات مرتب ہونا فطری بات ہے، اگر دس گھر پنجابی بولنے والوں کے تھے تو وہاں ایک یا دو وارد بولنے والے بھی آ گئے۔ تقسیم سے قبل تو بھارت میں ہر ریاست یا ہر ضلع کی اپنی بولی کا خاص لہجہ تھا، مگر یہاں آتے ہی تمام لوگ گلدستے کی مانند ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے۔ پھر جن کی اکثریت تھی، اسی کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی چڑھ گیا۔ اس ہجرت کے سب سے زیادہ اثرات پنجاب پر مرتب ہوئے، سندھ دوسرے نمبر پر رہا، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں اس سے بھی کم لوگوں نے ہجرت کی، اسی لئے ان علاقوں میں ابھی تک مقامی زبانیں پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔ مادری زبان نہ بولنے کا ایک بہت بڑا نقصان تو یہ بھی ہے کہ مقامی زبانیں اپنا وجود کھو رہی ہیں، جب والدین اپنی اولاد کے ساتھ اپنی زبان نہیں بولیں گے تو آنے

والے چند سالوں میں معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا، دوسری طرف جب کسی بچے کو
مادری یا مقامی زبان آتی ہوتی ہے تو اردو وغیرہ سیکھنے میں چند روز ہی لگتے ہیں، وہ کسی
خاص استاد سے نہیں معاشرے سے سیکھتا ہے، مگر اکثر مادری زبان سے محروم رہ جاتا
ہے۔

سید یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی کا قومی سیاست میں اہم کردار ہے۔ جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے یہ دونوں حضرات بہت اہم عہدوں پر کام کر چکے ہیں، ایک پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے تو دوسرے خارجہ امور کے وزیر رہے۔ دونوں نے ایک دو مرتبہ پارٹی تبدیل کرنے کا ذائقہ بھی چکھا، دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے تجربہ کار سیاست دان ہیں۔ زبان و بیان پر دونوں کو بہت حد تک قدرت حاصل ہے، اگرچہ اس معاملے میں شاہ محمود قریشی کے پوائنٹ کچھ زیادہ محسوس ہوتے ہیں، تاہم یہ امر پیش نظر رہنا بھی ضروری ہے کہ گیلانی سرکار نے اپنے جیل کے دور میں ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے۔ یوسف رضا گیلانی نے صحافت میں ایم اے کر رکھا ہے، خاندانی پس منظر کی بنا پر صحافت کی بجائے سیاست میں آ گئے، ان کے پاس سیاست میں کامیابیوں کی طویل فہرست ہے۔ شاہ محمود نے باہر سے تعلیم حاصل کی، وہ نہایت متحرک سیاستدان ہیں۔ گزشتہ روز دونوں مذکورہ سیاستدانوں کا ایک ایک بیان شائع ہوا تو ان کی باتوں کے لفظی اور معنوی مطالب عجیب اور دلچسپ معلوم ہوئے۔ یوسف رضا گیلانی نے ایک تقریب سے خطاب میں نیب کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”... نیب صاف ستھرے سیاستدانوں کی پگڑیاں نہ اچھالے...“۔

نیب کے بارے میں وزیر اعظم میاں نواز شریف کے بہاول

پور میں دیئے ہوئے بیان کی بازگشت پوری قوت سے جاری ہے، ہر سیاستدان اور دانشور نے اپنے طور پر اس بیان پر تبصرہ کیا ہے۔

نیب پر آجکل ہر خاص و عام تبصرہ کر کے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ملا رہا ہے، خاص طور پر مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی نے نیب کو تنقید کا نشانہ ضرور بنایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے پی پی پی کو نیب سے خطرات تھے تو اب شاید مسلم لیگ ن بھی اس کی گرفت میں آرہی ہے، ویسے بھی پی پی پی کو فرینڈلی اپوزیشن کا طعنہ سہنا پڑ رہا ہے، مختلف مخالفانہ بیانات کے باوجود نیب کے معاملے میں دونوں پارٹیوں نے ایک مرتبہ پھر ایک بیج پر ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ گیلانی کے بیان میں بہت گہرائی ہے، اور اس کے بہت سے پہلو ہیں، اس سے ایک تاثر تو یہ ابھرتا ہے کہ نیب تحقیق پر مبنی کرپشن کا سراغ لگانے کی بجائے پگڑیاں اچھالنے کا کاروبار کر رہا ہے، گویا اس کا کام احتساب نہیں بلکہ لوگوں کو ہراساں اور بے عزت کرنا ہے۔ دوسرا یہ کہ صاف ستھرے سیاستدانوں کی پگڑیاں نہ اچھالے، یعنی جو سیاستدان صاف ستھرے نہیں ہیں، ان کی پگڑیاں اچھال لی جائیں۔ چونکہ صاحب موصوف خود بھی نیب کی زد میں ہیں اس لئے نیب کے خلاف بیانات کے ریلے میں اپنا حصہ ملانے کا بہترین موقع تھا، جو گیلانی نے حاصل کیا ہے۔ صاف ستھرے سیاستدانوں میں یقیناً گیلانی خود بھی شامل ہیں۔ پوری قوم کو معلوم ہے کہ وہ بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں

وزارتِ عظمیٰ کے دور میں ان کے سولوں کی قیمت اسی لاکھ تک بھی بتائی جاتی تھی، ظاہر ہے اتنے قیمتی کپڑے پہن کر تو انسان صاف ستھرا ہی دکھائی دیتا ہے، دیگر سیاستدان بھی بظاہر تو بہت صاف ستھرے بن کر منظر پر آتے ہیں، نیب کا فرض ہے کہ ایک سابق وزیراعظم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے انہی سیاستدانوں کو ہاتھ ڈالے یا بس انہی کی پکڑیاں اچھالے جو صاف ستھرے نہیں رہتے۔

شاہ محمود قریشی چونکہ شاہ رکن عالم کے گدی نشین ہیں، وہ ایک عرصے سے سالانہ عرس کے موقع پر اپنے مریدوں سے خطاب کرتے آرہے ہیں، وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھنے والے مقرر ہیں، انہوں نے بھی اپنے تازہ بیان میں نیب کو ہی موضوعِ بیان بنایا ہے، کہتے ہیں کہ ”... ن لیگ اور پی پی پی نیب کے ”دانت“ نکالنا چاہتی ہیں..“۔ دانت بھی محاوروں میں استعمال ہونے والا اہم ہتھیار ہے، دانت نکالے بھی جاتے ہیں اور دکھائے بھی، پیسے بھی جاتے ہیں اور کھٹے بھی کئے جاتے ہیں، اور بعض اوقات توڑے بھی جاتے ہیں۔ مگر قریشی صاحب نے جوشِ خطابت میں نیب کے دانت نکالنے کی بات کی ہے، دانت نکالے تو صرف درندہ صفت چیزوں کے جاتے ہیں، یا اُن کے جو دوسروں کو دانتوں کاٹنے والا ہو۔ ظاہر ہے نیب دانتوں کی بجائے ہاتھوں سے ملزم کو پکڑتا ہے، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس کے لئے عام سادہ ہاتھ کی بجائے آہنی ہاتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ نیب کی گرفت اور اس کے نام سے خوفزدہ ہونے کے حوالے سے تو دانتوں کی بات درست ہے،

مگر دانت نکالنے کی بات نیب پر فٹ نہیں بیٹھتی۔ تاہم نیب کو حقیقی معانوں میں
دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دینے کی ضرورت ہے، اور ہر کرپٹ فرد اس کی زد
میں آنا چاہیئے، اگر پسند نا پسند کا معاملہ آگیا تو ساکھ صفر ہو کر رہ جائے گی۔

! سیاسی جماعتوں کے اندر کی جمہوریت

جمہوریت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا، اتنی گہرائی میں کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے ہاں فوجی حکومتیں بھی خود کو جمہوری ہی کہتی رہیں، ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ہر فوجی اقتدار میں ایک نہ ایک مسلم لیگ موجود رہی، یا یوں جانے کہ ہر فوجی حکمران نے یا تو نئی مسلم لیگ بنالی یا کسی بنی بنائی پر دستِ شفقت رکھ دیا۔ دوسرا یہ ہوا کہ زیادہ تر بلدیاتی انتخابات بھی فوجی حکومتوں میں ہی ہوئے، اگر ایوب خان ان کے بانی تھے تو مشرف دور میں بلدیاتی نظام بہترین طریقے سے چلتا رہا۔ (موجودہ جمہوری حکومت کو ہی دیکھئے کہ اول تو بلدیاتی الیکشن کروانے پر رضا مندی نہ دکھائی گئی، اور جب الیکشن کروایا تو نمائندے بے اختیار)۔ اس صورت میں کسی بھی فوجی حکومت کو غیر جمہوری نہیں کہا جاسکتا۔ اور جب سیاسی یعنی جمہوری جماعتوں کی حکومت کی بات کی جاتی ہے، تو وہاں نہ تو بلدیاتی الیکشن دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی طلبہ یونین کے بارے میں کوئی جمہوری رویہ اپنایا جاتا ہے۔ مخالفین کو نیب کی گرفت میں لانے کا الزام بھی حکومتوں پر لگتا رہتا ہے۔ جمہوریت ایک بہت ہی مشکل طرزِ سیاست ہے، دوسرے کی رائے سننا اور بعض اوقات اسے تسلیم بھی کرنا پڑتا ہے، اس پر اضافہ یہ کہ اکثریت کی بات کو ماننا اور اس کا احترام کرنا ان لوگوں کے لئے خاص طور پر مسئلہ ہے، جو خود کو عقلِ کل

سمجھتے ہیں اور دوسروں کی بات کو اہمیت نہیں دیتے۔

پاکستان کی سیاست میں جمہوریت کو آزادی سے پہنچنے نہیں دیا گیا، یہاں کم و بیش تیس برس تک فوجی حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ جمائے رکھا۔ باقی وقت بھی سیاسی لوگ اگر حکومت میں آگئے تو خوفزدہ ہی رہے کہ نہ جانے کس وقت ان کو گھر بھیج دیا جائے۔ اسی خوف کی کیفیت میں وہ حکومت کر رہے ہوتے تھے کہ ایک غیر فوجی ڈنڈا بھی ان کے سر پر لگ جاتا تھا، جسے ضیاء دور میں متعارف کرایا گیا اور عرف عام میں اسے اٹھاون ٹو بی کا نام دیا گیا۔ اس بدوق کے ذریعے بھی بہت سے وزیراعظموں کو ان کی منتخب حکومتوں سے محروم کیا گیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ آیا سیاسی جماعتیں خود جمہوریت پسند ہیں؟ کیا انہوں نے خود اپنے اندر جمہوری روایات کو فروغ دیا ہے، کیا ان کے اندر تسلسل کے ساتھ الیکشن ہوتے ہیں، اور ان کے نتیجے میں مرکز اور صوبائی عہدیدار منتخب ہو کر سامنے آتے ہیں؟ ظاہر ہے ایسا ہر گز نہیں۔ گزشتہ قومی الیکشن سے قبل الیکشن کمیشن آف پاکستان نے سیاسی جماعتوں کو اپنے اندرونی الیکشن کروانے کا پابند کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں تمام جماعتوں نے اپنے الیکشن کروائے، اور الیکشن کے نتائج اور اپنے منتخب عہدیداروں کے نام کمیشن کو بھجوائے۔

گزشتہ روز پلڈاٹ نے ایکٹ سروے جاری کیا ہے، جس میں سیاسی جماعتوں کے اندرونی الیکشن کے بارے میں انکشافات کئے گئے ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ کونسی پارٹی کس قدر جمہوریت پسند ہے؟ اس میں جماعت اسلامی کو پہلا نمبر دیا گیا ہے، نیشنل پارٹی دوسرے، تحریک انصاف تیسرے نمبر پر ہے، اس ضمن میں مسلم لیگ ن سب سے کم جمہوری پارٹی ہے۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ زیادہ تر سیاسی جماعتوں کی مقبولیت ان کے لیڈروں کی مرہونِ منت ہے۔ اس سروے سے ایکٹ بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ ہماری سیاسی جماعتوں میں جمہوریت نہیں شخصیت پرستی کی روایت عام ہے، اور مسلم لیگ ن کو تو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس پارٹی کا نام ہی پارٹی لیڈر کے نام پر رکھا گیا ہے، مسلم لیگ (ن) یعنی نواز۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے نام کی پارٹی ہے، وہ اسے اپنی مرضی سے ہی چلاتے ہیں، کیسے الیکشن؟ کونسے اجلاس؟ اور کیسی مشاورت؟ فردِ واحد کی مرضی کے مشیر۔ دوسری طرف جمعیت العلمائے اسلام اور ایم کیو ایم کا نمبر آخری سے پہلا ہے۔ جن پارٹیوں میں داخلی جمہوریت کمزور ہے، ستم دیکھئے کہ وہی عوام میں سب سے زیادہ مقبول ہیں، جو لوگ خود دوسرے کی بات کو اہمیت نہیں دیتے، اور مشورہ نہیں کرتے، رائے نہیں لیتے، عوام انہی کو اپنا قائد منتخب کرتے ہیں، اس سے عوام کے جمہوری رویے کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جو انسان خود اپنے اوپر کسی قانون اور قاعدہ کو لاگو نہیں کرتا، وہ دوسروں کو اس پر عمل کرنے کے لئے کیسے کہتا ہے؟ پلڈاٹ کا یہ سروے عوام اور مقبول عام حکمرانوں دونوں کے لئے

لحہ فکریہ ہے، کسی فرد واحد کی پارٹی میں رہ کر سیاست کرنا غلامی کی ایکٹ جدید شکل ہے۔ اسی لئے ایسے حکمران بادشاہوں کی سی عادتیں اپنالیتے ہیں، وہ خود کو بادشاہ کیوں نہ سمجھیں، پارٹی میں کسی کو معمولی سے اختلاف رائے کی بھی مجال نہیں۔ یہ سروے اپنی جمہوری سیاست کے چہرے پر بد نما داغ کی صورت سامنے آیا ہے۔

! دُور بینی کو لاحق خطرات

درست ہی کہتے ہیں، انسان اپنی جیب سے پیسہ خرچ کرتا ہے اور اپنے لئے غم خریدتا ہے، چاہے وہ اخبار کی شکل میں ہو یا ٹی وی کیبل کی صورت میں۔ پریشان کن خبر آئی ہے کہ ”... تیس برس میں دنیا کی نصف آبادی کی دور کی نظر خراب ہو جائے گی۔ تقریباً پانچ ارب لوگ 2050ء تک زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکیں گے، اس سے اندھے پن میں سات گنا اضافہ ہو سکتا ہے، دور کی نگاہ کی کمی اندھے پن کی پانچویں بڑی وجہ ہے، اس کی وجہ میں دن کی روشنی میں کمی اور کمپیوٹر، ٹی وی اور موبائل سکرین پر زیادہ وقت صرف کرنا شامل ہے، بچوں کو آؤٹ ڈور کے لئے بہت کم وقت دیا جا رہا ہے، ماہرین نے والدین کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بچوں کی نظر باقاعدگی سے چیک کروائیں، انہیں باہر کھیلنے کے لئے بھیجیں، الیکٹرانک آلات کے استعمال کو محدود کریں۔ اس وقت دنیا کے دو ارب افراد کی دور کی نظر خراب ہے...”۔

ویسے تو یہ پوری دنیا کا معاملہ ہے اور جب ایسا وقت آئے گا، تو ہم میں سے بہت سے لوگ موجود ہی نہیں ہوں گے۔ یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آیا ایسی تحقیقات حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں یا پھر میڈیا کے کسی زرخیز ذہن کی پیداوار ہے؟ اگر اس سائنسی تحقیق کو درست مان لیا جائے تو اس کے سدِ باب کی کوشش

ہونی چاہیے۔ اگرچہ تحقیق میں اس مسئلے کا حل بھی بیان کیا گیا ہے، سورج کی روشنی کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور الیکٹرانک آلات کے کم استعمال کی بات کی گئی ہے۔ چونکہ یہ خبر برطانیہ سے آئی ہے اس لئے سورج کی روشنی کا مسئلہ وہاں تو ہو سکتا ہے مگر پاکستان میں ایسا قطعاً کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ہاں تو گرمی بھی شدید ترین ہوتی ہے۔ مگر جہاں تک الیکٹرانک آلات کا تعلق ہے تو نئی نسل اس کی اس قدر دلدادہ ہے کہ وہ ان آلات کی دوری برداشت ہی نہیں کر سکتے، اپنی اپنی عمر کے مطابق بچے ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل کا استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ یہ کام مسلسل کرتے ہی رہتے ہیں۔ گھنٹوں ٹی وی کے سامنے بیٹھتے ہیں، وہاں سے اٹھے تو کمپیوٹر پر کام کرنے، فلمیں دیکھنے اور گیم کھیلنے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں سے فرصت پاتے ہی وہ موبائل پر پیغامات لینے اور دینے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔

ان الیکٹرانک آلات کے بہت زیادہ استعمال کی وجہ ہی ہے کہ اب بچے بھی نظر کا چشمہ لگائے پھرتے ہیں، ان کو عینک کو سنبھالنا بھی نہیں آتا، مگر مجبوری ہے کہ اس کے بغیر ان بچوں کی محرومی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ بچوں میں کبھی سر درد کی شکایت پیدا ہوتی ہے اور کبھی نگاہ کے دھندلانے کی شکایت، کبھی وہ کلاس میں لگے بورڈ کو درست طریقے سے نہیں پڑھ سکتے، مگر بد قسمتی یہی ہے کہ آئی ٹی کی ترقی کا یہ بندوبست نئی نسل کے لئے وبال بن رہا ہے، جہاں یہ

بچوں کی نظر پر اثر انداز ہو رہا ہے، اسی طرح ان کے اذہان بھی اس کی منفی اثر انگیزی سے محفوظ نہیں ہیں۔ ان آلات سے بچوں کی جان چھڑوانا اب ناممکن ہوتا جا رہا ہے، یہ ایک نشہ کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اہم بات یہ کہ حالات نے اس نشہ کو لازمی قرار دے رکھا ہے، اس کی مخالفت کا مطلب ترقی اور تباہناک مستقبل سے دور رکھنا ہے۔ مگر اس حقیقت کو تو کمپیوٹر اور موبائل ایجاد کرنے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا استعمال ضرورت کے مطابق اور محدود ہونا چاہیے، ہر وقت کے استعمال سے بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگلے تیس برس کا دعویٰ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا گیا ہوگا، معاملات جس طرف کو جا رہے ہیں، ان کی رفتار کیا ہے اور آنے والے وقت میں اس رفتار میں کس قدر اضافہ ہوگا اور اس کی منزل کیا ہوگی۔ مگر ستم یہ بھی ہے کہ ہم لوگ حال سے بھی نگاہیں پھراتے ہیں، اس وقت بھی اگر دور کی نگاہ کا جائزہ لیا جائے تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی دور کی نگاہ کمزور ہے، مگر انہوں نے نہ کبھی اس کا نوٹس لیا ہے، نہ اس کی فکر کی ہے اور نہ ہی انہیں کوئی پریشانی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نظر زیادہ تیز رفتاری سے کمزور ہوتی ہے اور مسائل میں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے ہاں قریب کی عینک کا رواج تو کسی حد تک زیادہ ہے، کہ کچھ لکھنا یا پڑھنا پڑتا ہے، مگر دور کا کام دھونس سے ہی چلا لیا جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم

ترین نعمت کی قدر کی جائے، احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں اور ہر وقت معائنہ کروا کر
اس نور کو محفوظ کیا جائے۔

! تشدد کا شکار خواتین اور مردوں کے لئے ٹریکنگ کڑے

مرد حضرات ہوشیار ہو جائیں، اور محتاط بھی، پنجاب اسمبلی نے مردوں کو قابو کرنے کے لئے بل کی منظوری دے دی ہے۔ اس بل کے مطابق ”... عورت کو تشدد کر کے گھر سے بے دخل نہیں کیا جائے گا، تاہم تشدد کرنے والے مرد کو دو روز کے لئے گھر سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ عورت پر تشدد کا ارتکاب کرنے والے مرد کو عدالتی حکم پر ٹریکنگ کڑے بھی لگائے جاسکیں گے، کڑے اتارنے پر مردوں کو سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تشدد کا شکار خواتین کے لئے شیلٹر ہومز بھی تیار کئے جائیں گے جہاں ان کو اور ان کے بچوں کو رہائش و خوراک کی سہولت بھی میسر ہوگی۔ خواتین کو خال فری نمبر دیا جائے گا جس پر تشدد کی صورت میں ڈسٹرکٹ پروٹیکشن کمیٹی کو اطلاع دی جائے گی۔ مصالحت کے لئے سینٹر بھی قائم کئے جائیں گے، خواتین کے تحفظ کے لئے ضلعی افسر کسی بھی گھر میں کسی بھی وقت داخل ہو سکے گی، اس افسر کو گھر میں داخل ہونے سے روکنے پر مرد کو چھ ماہ قید اور پانچ لاکھ روپے تک جرمانہ ہوگا، تاہم غلط شکایت کرنے پر خاتون کو بھی سزا بھگتنا پڑے گی...“۔

خواتین پر تشدد بظاہر تو ایک جاہلانہ عمل تصور کیا جاتا ہے، اس تصور کے پختہ ہونے کی شاید یہی وجہ ہے کہ یہ کام زیادہ تر جاہل لوگ ہی کرتے ہیں۔

مگر یہ شکایت بہت تعلیم یافتہ یا مہذب لوگوں کے بارے میں بھی آ جاتی ہے، اس معاملے میں چونکہ سیاستدان ہر وقت منظر پر ہوتے ہیں، اس لئے انہی کی خبریں گردش کرتی ہیں، بیوروکریسی اور سرمایہ داروں کے ہاں بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، تاہم وہ ایک تو تعداد میں کم اور بہت سے پردوں میں ہوتے ہیں۔ پنجاب اسمبلی کا بل کسی حد تک سنجیدہ اور ضروری ہے اور کسی حد تک دلچسپ اور مزاحیہ بھی۔ تشدد کا شکار عورت کو تو گھر سے بے دخل نہیں کیا جائے گا، مگر مرد کو بے دخل کیا جائے گا۔ یہ ٹریڈنگ کڑے عدالت کے حکم پر کس وقت لگائے جائیں گے، جس وقت عورت پر تشدد کے بعد اسے گھر سے نکالا جائے گا تو کڑے پہنا دیئے جائیں گے کہ اس پر نگاہ رکھی جائے کہ وہ اپنے گھر کا غم ہلکا کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کہاں جاتا ہے، شاید اس طریقے سے یہ راز بھی کھل جائے کہ مرد کے کون سے مشیر ہیں جو اُسے عورت پر تشدد کرنے پر آمادہ کرتے یا اکساتے ہیں۔

ٹریڈنگ کا معاملہ بہت عجیب ہے، اگرچہ یہ کڑے مرد کو عدالت کے حکم پر پہنائے جائیں گے، مگر کس شکایت پر؟ یقیناً کوئی خاتون اپنے شوہر پر الزامات لگائے گی، جس کی بنا پر مرد کو غصہ آئے گا اور نوبت تشدد تک پہنچے گی۔ اس سلسلہ میں اگر مرد قصور وار نہیں تو اسے ٹریڈنگ کڑے (الیکٹرانک ہتھکڑی) پہنا کر عورت اور مرد میں یقینی نفرت کے بیج بوئے جائیں گے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ

عورت کو گھر سے بے دخل تو نہیں کیا جاسکے گا، مگر اس کے لئے شیلٹر ہوم تعمیر کر دیئے جائیں گے (؟)۔ جو نہی کوئی مرد اپنی عورت پر تشدد کا ارادہ کرے گا وہ فوراً نال فری کال ملا کر اپنے تحفظ کے لئے ضلعی افسر کو بلا لے گی، اگر مرد نے افسر کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا تو اسے قید اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ تشدد کرنے والا غریب آدمی قید تو بھگت لے گا تاہم پانچ لاکھ روپے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے ہونگے، لہذا غریب ایسی حرکتوں سے باز آجائے تو بہتر ہے۔ جہاں تک امیر کا معاملہ ہے، وہاں تک ضلعی افسر برائے تحفظ خواتین کا پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوگا، جتنا سوچا جا رہا ہے۔ قانون پر عمل درآمد ہو جائے تو سب کچھ ممکن ہے، اگر صرف قانون بنا کر وقت ہی پاس کرنا ہے، تو یہ مظلوم لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے اور قانون سازی کے نام پر مذاق کے مترادف ہے۔

بل میں اس طرف شاید دھیان نہیں دیا گیا، (اس میں یقیناً بے عزتی کا خوف ہی کارفرما ہوگا) کہ اگر کوئی عورت اپنے مرد پر تشدد کرتی ہے تو اس سلسلے میں قانون کیا کہتا ہے، کیا ٹریکنگ کڑے تشدد کرنے والی اور مرد کو گھر سے بے دخل کرنے والی خاتون کو بھی پہنائے جائیں گے، یا یہ قانون صرف مردوں کے لئے ہی ہے۔ ایک عرصہ قبل اسی طرح اسمبلی میں بل پیش ہونے پر کسی معزز ممبر نے عورت کے تشدد کی بات کی تھی، تو اسے (غیر سنجیدہ روایت کے مطابق) خوب مذاق اور

تفحیک کا نشانہ بنایا گیا تھا، تاہم یہ بل صرف عورتوں پر تشدد کے بارے میں ہے، ایک

دفعہ اس پر عمل ہو جائے، مار کھانے والے مردوں کے بارے میں پھر دیکھا جائے گا۔

!! وزیراعظم رات دن سوچتے رہتے ہیں

اخبار کی شہ سُرخ تھی ہی کچھ ایسی، اس میں کشش تھی، کچھ احساس تھا، امید تھی، خواہش تھی اور کچھ حسرت بھی۔ یہ سُرخ وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے بیان پر مشتمل تھی، جو انہوں نے مظفر آباد میں قومی صحت پروگرام کے افتتاح کے موقع پر دیا تھا۔ انہوں نے بڑی درد مندی سے پاکستان کے حالات کی نقشہ کشی کی کہ وہ کس قسم کا پاکستان دیکھنا چاہتے ہیں، ”... پاکستان میں ہر چیز اچھی ہونی چاہئے، ہم اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں، پاکستان غریب ملک ہے، اس کی آبادی بیس کروڑ ہے، کاش ہم بھی تیزی سے ترقی کریں، یہاں سے بیماری اور غربت کا خاتمہ ہو، ہم چلتے ہوئے طبقے کے لئے روزانہ سوچتے ہیں، کس طرح ان کی مصیبتوں کو کم کیا جائے، ہم دن رات سوچتے ہیں، کہ آپ کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کی جائیں، یہاں سڑکیں بنیں، بجلی کے کارخانے لگیں، دہشتگردی کا خاتمہ ہو، سب سے بڑا منصوبہ غریبوں کی فلاح ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں اتنے وسائل دے کہ حکومت تمام لوگوں کو علاج معالجے کی سہولت فراہم کر سکے، علاج کے لئے غریبوں کی جائیدادیں بکتے دیکھی ہیں، اب ایسا نہیں ہوگا، سیاست کو ہم عبادت سمجھتے ہیں...“۔ اسی اخبار کے صفحہ اول اور آخر کی کچھ دیگر سرخیاں یوں تھیں؛ ”چار خواتین سمیت پانچ افراد کی خودکشی“۔ کاروبار میں نقصان پر تین

بچوں سمیت زہر پی لیا، باپ بیٹی جاں بحق، دو کو بچا لیا گیا۔“ ”سڑکوں کی تعمیر میں کروڑوں کی خوردبرد، اور نچ لائن ٹرین کا ٹھیکیدار اور پی ڈی ڈبلیو ڈی کے افسران دس روزہ جسمانی ریمانڈ پر نیب کے حوالے۔“ ”دانش سکولوں میں کروڑوں کے گھپلے، لوٹی ہوئی رقم واپس لی جائے گی، وزیر تعلیم پنجاب۔“ یہ ایکٹ اخبار کی ایکٹ روز کی سرخیاں ہیں، اگر تفصیل میں جائیں تو ایسی ہی نہ جانے اور بھی کتنی خبریں ہیں، یہ ایکٹ روز کا معمول نہیں، بلکہ ہر روز یہی کچھ ہوتا ہے، بس نام اور مقام کا فرق ہوتا ہے۔

پسے ہوئے طبقوں کے لئے کس قدر خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان کا وزیر اعظم اور ان کی ٹیم دن رات، صبح شام بلکہ ہر وقت اپنے عوام کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں؟ یہ وزیر اعظم نے بتا دیا، جن کا اوپر ذکر ہے۔ مگر ان کی سوچ، ان کا عمل اور ان باتوں کا نتیجہ سب کچھ مختلف ہے۔ وزیر اعظم کی بیان کردہ تمام باتیں کاش کے زمرے میں آتی ہیں، وہ کہتے ہیں کاش ایسا ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ کاش وہ ایسا کرتے۔ پسے ہوئے طبقے کو پیسے کے ذمہ دار کون ہیں؟ اس کا شافی جواب حکومت کے پاس یہی ہوگا کہ ’سابق حکومت‘۔ ہر حکومت تمام تر خرابیوں کا ملبہ سابق حکومت پر ہی ڈالا کرتی ہے۔ سابق حکومت کا ایکٹ چکر ہے جو مسلسل چل رہا ہے۔ پسے ہوئے طبقے کے لئے دن رات سوچا جاتا ہے، ان کی مشکلات آسان کرنے کی خواہش بھی ہے، مگر کیا کیجئے کہ وسائل

نہیں ہیں، جن کی بنا پر عوام کے لئے طبی اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جاسکیں، عوام کو بنیادی سہولتیں دی جاسکیں۔ عوام خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ ان کے منتخب کردہ حکمران کس قدر سادگی سے اپنے معاملات کو چلا رہے ہیں، انہوں نے اپنے اخراجات کو کتنا محدود کر رکھا ہے، فضول خرچی اور مراعات کو وہ ملک اور عوام دشمنی تصور کرتے ہیں، غیر ضروری بیرون اور اندرون ملک دوروں کو انہوں نے اقتدار میں آتے ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ اگر کبھی مجبوری میں کسی ملک جانا بھی پڑ جائے تو عام مسافر کی طرح چار پانچ ضروری افراد پر مشتمل وفد ہی باہر جاتا ہے۔

سیاست کو عبادت قرار دیا جاتا ہے، جو افراد رات دن غریب عوام کے لئے ہی سوچتے رہیں گے تو ان کا یہ عمل عین عبادت ہی تو کہلائے گا، چونکہ حکمرانوں کے پاس وسائل نہیں ہیں، اس لئے وہ صرف سوچ سکتے ہیں، خواہش کر سکتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ ارادہ کر سکتے ہیں، کیونکہ عمل تو پیسے سے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں ارادے اور نیت کا ثواب مل جائے گا۔ اس دورے میں وزیراعظم کی صاحبزادی مریم نواز بھی موجود تھیں، وزیراعظم نے صحت کے لئے ان کی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کیا، یوں نیکی کرنے والے اور اس نیکی کو سراہنے والے باپ بیٹی، دونوں ہی ثواب دارین کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ وزیراعظم نے اپنے دل کی بات کہہ دی، اب پسے ہوئے طبقے اور غریب عوام کا کام ہے کہ وہ دعا

کریں اللہ تعالیٰ میاں صاحب کو کچھ وسائل بھی عطا فرمادے، تاکہ میاں صاحب عوام
کی جتنی، تعلیمی اور بنیادی سہولتوں کے لئے کچھ منصوبے بنا سکیں، عوام کے لئے آسانیاں
پیدا کر سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے وسائل نہ دیئے تو پھر غریب عوام صبر کریں، اور نصیب
کا لکھا سمجھ کر برداشت کر لیں۔

آوارہ کتے اور بکریاں کریں۔ ان کا نہ کوئی گھر ہوتا ہے نہ ٹھکانا، نہ ان کا کوئی مالک ہوتا ہے اور نہ کسی سے وفاداری کے تقاضے نبھانے پڑتے ہیں۔ یاروں دوستوں کے ساتھ گلیوں میں پھرا کرتے ہیں، پارکوں میں گھومتے ہیں، سردیوں میں کھلی دھوپ کے مزے لیتے ہیں، اور گرمیوں میں پارکوں کے اندر ہی گہرے سائے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ موسم خوشگوار ہوتا ہے تو یہ باہر نکل آتے ہیں۔ ٹولیوں کی صورت میں گھومتے ہیں، اٹھکیلیاں کرتے ہیں، ایک دوسرے سے لچھتے اور کشتیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں، بعض اوقات گراؤنڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتے چلے جاتے ہیں، اور کبھی آرام سے لیٹ جاتے ہیں۔ یہ کتے بہت موٹے تازے اور صحت مند ہوتے ہیں، شاید اس لئے کہ انہیں کوئی غم نہیں ہوتا، نہ کسی کی حفاظت کی ذمہ داری اور نہ کھانے پینے کے لئے کسی کی محتاجی اور انتظار، نہ کسی کی پابندی اور نہ کوئی مجبوری۔ بھاگتے، کھیلتے، اچھلتے کودتے کتوں کے پاس سے کوئی مسافر پیدل یا سواری پر گزرتا ہے تو یہی کتے ازراہ مذاق ان کے پیچھے بھی بھاگ لیتے ہیں، ظاہر ہے ایسے میں مسافر بہت ہی گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، اور کتوں کا مذاق کئی دفعہ سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے جب وہ گرتے پڑتے مسافر کو کاٹ بھی لیتے ہیں۔

آوارہ کتوں کے کاٹنے کی خبریں ہر روز اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ کبھی ان کتوں کو باؤلا بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جب یہ آوارہ یا باؤلے کتوں کے کاٹے کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ہسپتالوں میں کتوں کے کاٹے کی ویکسین ہی موجود نہیں۔ یہ جواب صرف دیہاتی بنیادی طبی مراکز سے ہی نہیں ملتا، چھوٹے شہروں کے ہسپتالوں میں بھی اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں سال بھر میں ایک لاکھ 74 ہزار 411 افراد کو کتوں نے کاٹ لیا۔ طبی امداد کے لئے جب انہیں ہسپتال لے جایا گیا تو ان کے علاج معالجہ پر 63 کروڑ لاکھ روپے خرچ ہو گئے، رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان اخراجات پر حکومت نے سر 80 پکڑ لیا۔ ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز نے سیکریٹری لوکل گورنمنٹ سے رابطہ کر لیا ہے۔ اب ان کتوں کی تلفی کے لئے موثر اقدامات اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ صوبائی حکومت نے ضلعی حکومتوں کو انسدادی کاروائیاں تیز کرتے ہوئے آئندہ تلف کئے جانے والے کتوں کی تصاویر بھجوانے کے حکم بھی دیا ہے۔ کتوں کی تلفی کے لئے ظاہر ہے مزید لاکھوں روپے کے فنڈ جاری کئے جائیں گے، اپنے پورے نظام میں چونکہ کمیشن وغیرہ کی مکمل گنجائش ہے، اور یہی ایک کام ہے جو مکمل دیانتداری سے سرانجام پاتا ہے، اس لئے تلف ہونے والے کتوں کی تصاویر سے کتوں کی تعداد کی گنتی میں آسانی رہے گی، اور اسی حساب سے اخراجات کی رقم

کی ادائیگی کی جائے گی۔

کتوں کی تلفی کے لئے یقیناً ضلعی کمیٹیاں معرض وجود میں آئیں گی، اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ ہر کمیٹی کی سربراہی کا بوجھ مقامی ڈی سی او کو ہی اٹھانا ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کے سیکریٹری کے فرائض ٹی ایم او کے سپرد ہونگے۔ حکومت کو اس اہم ترین مسئلے کو بہت سنجیدگی سے لینا چاہیے، اس لئے ضروری ہے کہ کمیٹی میں مقامی منتخب نمائندوں کو بھی نمائندگی دی جائے، ایک ایم پی اے اور ایک کسی یو سی کا چیئرمین بھی اس میں شامل ہو تو بہتر ہے۔ آگے مزید ذیلی کمیٹیاں بھی بنانی پڑیں گی جن میں نئے منتخب کونسلر شامل ہونگے۔ کیونکہ بیوروکریسی ایسے معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دیتی، اس لئے منتخب نمائندوں کو ہی اپنے عوام کو کتوں سے بچانے کی تدابیر اختیار کرنا ہونگی۔ مقامی نمائندوں کا یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ اپنے علاقے سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کہاں کہاں کتے زیادہ پائے جاتے ہیں، اور ان کی تلفی کس طریقے سے ممکن ہے۔ یہ کونسلر وغیرہ چونکہ ڈی سی او کے ماتحت ہی کام کریں گے اور فنڈز وغیرہ کے لئے انہی کے محتاج ہونگے۔ اگر کونسلروں کو ہی یہ ذمہ داری سونپ دی جائے تو بہت بہتر رہے گا۔ اگر فی کتا کچھ رقم مقرر کر دی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، اس سے جو فرد جتنے مارے گئے کتوں کی تصاویر ظاہر کر دے گا اسے اسی حساب سے ادائیگی کر دی جائے۔ مگر یہ تصویر والا معاملہ بھی

مشکوٰۃ ہی ہے، کیونکہ آئی ٹی کے زمانے میں کتوں کی تصویریں بنانا کوئی مشکل نہیں، اور ایک ہی کتے کے مختلف پوز بنا کر تصاویر بھی بنائی جاسکتی ہیں۔ اگر حکومت اس مہم کو مزید تیز اور موثر بنانا چاہتی ہے تو کچھ وزراء کو بھی ”مکتمار مہم“ کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے، یا پوری کابینہ کو مختلف علاقے تقسیم کئے جاسکتے ہیں، اس سے آوارہ کتے بھی ختم ہو جائیں گے اور وزراء کو بھی مصروفیت مل جائے گی۔

سردار اختر مینگل کا یہ بیان نیا نہیں کہ حکمران بلوچستان سے ٹنوں کے حساب سے سونا نکال کر لے جا رہے ہیں، وہ ہمارے بچوں کو جوتے تو دیں۔ یہ بیان ایکٹ جملہ ایکٹ علامت ہے، جس کا ذکر بلوچستان کے سیاستدان کرتے رہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں سے وسائل لے جا کر ہمیں اس کے متبادل کچھ نہیں دیا جاتا۔ بلوچستان کے لوگوں کا یہ دیرینہ مطالبہ ہے، جو وہ ہر حکومت سے کرتے ہیں۔ یہ مطالبہ ایسے ہی وجود میں نہیں آگیا، یقیناً اس کے پیچھے حقائق اور سچائی بھی ہے، جس کے لئے کسی سروے یا تحقیق کی ضرورت نہیں، ہر چیز منجشم سر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ معاشی ترقی کے سارے سرچشمے 'اوپر' سے پھوٹتے ہیں، پانی بھی مشرق سے مغرب ہی سفر کرتا ہے، پہاڑوں سے برف پگھل کر میدانوں سے ہوتی ہوئی سمندر میں گرتی ہے۔ یہی عالم ترقیاتی منصوبوں کا بھی ہے کہ وہ اسلام آباد اور لاہور سے فرصت پائیں تو کسی اور شہر یا علاقے کی طرف توجہ دیں۔ پورے ملک کی ترقی انہی دو شہروں میں ہو رہی ہے، جو فنڈز تقسیم ہو کر لاکھوں کا بھلا کیا جاسکتا تھا، وہ سارے فنڈ یہی دو شہر کھا رہے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جب ان محروم علاقوں نے کبھی اپنا حق مانگنے کی کوشش کی تو انہیں غدار قرار دے دیا گیا، یا دشمن کا آلہ کار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، یا ملک دشمنی کا الزام تھوپ دیا گیا۔

کسی نے یہ تکلف نہ کیا کہ چلنا نہ والے کی تکلیف تو پوچھ لیں۔

محرومیوں کا مسئلہ مسلم ہے، یہ کام جنوبی پنجاب سے ہی شروع ہو جاتا ہے، اور مزید آگے سفر کرتے جائیں، ترقی کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ مگر اس دوڑ میں پیچھے رہ جانے کی وجہ جہاں اپنے حکمران ہیں، جنہوں نے صرف اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر دارالحکومتوں کو ہی بنایا سنوارا ہے، اور دور دراز علاقوں کے مسائل و معاملات سے آنکھیں بند ہی رکھی

ہیں، وہیں غیر ترقی یافتہ علاقوں کے لوگوں کی غلطی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنا حق مانگنا اور بعض اوقات دباؤ ڈال کر حق حاصل کرنا کوئی خامی یا غداری یا ملک دشمنی نہیں۔ اپنے ہاں یہ الزامات عموماً حکومت مخالف لوگوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں،

سب سے بڑی محب وطن پارٹی حکومتی پارٹی ہوتی ہے اور ملک کی سب سے مخلص جماعت بھی وہی ہوتی ہے، اپوزیشن کی اکثر جماعتیں قابل گرفت ہوتی ہیں۔ محروم علاقوں کے سیاسی قائدین کا قصور ہے کہ وہ اپنے حقوق کے حصول میں کیوں ناکام رہے۔

خاص طور پر اس وقت ان سے حق کون چھینتا ہے جب وہ خود کسی محروم صوبے کے حکمران ہوتے ہیں؟ ستم تو یہ ہے کہ صوبائی حکومت ہی اپنے سے پہلے جانے والوں کو ذمہ دار ٹھہرا دیتے ہیں۔ وہ یہ بیان دے کر اپنا سارا ملبہ مرکزی حکومت یا پنجاب حکومت یا پھر اپنی ہی سابق حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔

بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نواب ثناء اللہ زہری کے بارے میں مصدقہ ذرائع کی جانب سے
 خبر آئی تھی کہ وہ اپنے سپیشل طیارے پر دعویٰ تشریف لے گئے، جہاں انہوں نے پاکستان
 سپر لیگ کا فائنل میچ دیکھا۔ متعدد ارکان صوبائی اسمبلی اور اعلیٰ سرکاری حکام کی بھی
 سرکاری خرچ پر میچ دیکھنے جانے کی اطلاعات ہیں۔ بلوچستان کے سابق (نصف دور کے)
 وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالملک ایکٹ سادہ انسان تھے، ان کے دور میں کرپشن یا عیاشی تک کی
 کوئی خاص خبر سامنے نہیں آئی، وہ عام لوگوں میں عام آدمی کی طرح ہی رہتے تھے۔ مگر
 موجودہ وزیر اعلیٰ چونکہ نواب ہیں، اس لئے وہ سادگی وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔ اگر یہ
 لوگ اس قدر سادہ ہوتے، یا اپنے عوام کے اتنے خیر خواہ ہوتے تو بلوچستان ترقی کیوں
 نہ کر چکا ہوتا، یا کم سے کم اس قدر پسماندہ نہ ہوتا۔ بلوچستان میں صرف دو طبقے ہی
 رہتے ہیں، ایک نہایت امیر اور دوسرے نہایت غریب۔ امیروں کے پاس مال و دولت
 اور مراعات کا اندازہ لگانا مشکل ہے، دوسری طرف غریبوں کی زندگی حسرت اور
 مجبوریوں میں ہی گزرتی ہے، وہ ترقی، تعلیم اور آسودگی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ
 ظلم صرف بلوچستان کے سردار اور سیاسی قائدین ہی نہیں ڈھالتے کہ وہ اقتدار میں ہوتے
 ہیں مگر ان کے عوام ترقی اور خوشحالی سے محروم رہتے ہیں۔ یہ کام ہر غریب اور پسماندہ
 علاقے میں ہوتا ہے، شاید وہ علاقے پسماندہ بھی اسی وجہ سے رہتے ہیں کہ ان کی
 قیادت مخلص نہیں ہوتی۔ جہاں تک سرکاری خرچ پر عیاشی کا معاملہ ہے، تو اس بہت ہی گنگنا
 میں تمام حکمران اور ان کی

اولادیں بھی ہاتھ دھوتی ہیں، پنجاب میں وزیر اعلیٰ کے ایم این اے صاحبزادے بھی ہیلی
کاپٹر استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ پروٹوکول میں اپنی حدود سے ہمیشہ تجاوز کرتے ہیں،
کسی سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

بورے والا کے ایک گاؤں کے پرائمری سکول کی دو استانیوں آپس میں الجھ پڑیں، پہلے تو
 تو میں میں ہوئی، پھر بات طعن و تشنیع تک پہنچی اور آخر میں نوبت ہاتھ پائی تک
 آ گئی۔ استانیوں نے یہ منظر بچیوں کے سامنے ہی پیش کیا، کیونکہ ان کے اکٹھے ہونے کا
 مقام یہی ایک سکول ہی تھا، ورنہ گھروں میں ان کا اکٹھا ہونا مشکل تھا۔ بچیاں اس
 صورت حال کو دیکھ کر گھبرا گئیں، تاہم ان میں سے ایک نے بچیوں کو چھٹی کر کے گھر
 وں کو جانے کی رخصت بلا درخواست عنایت فرمادی۔ ظاہر ہے دیہاتی سکول تھا،
 بچیاں خود ہی قرب و جوار میں واقع گھروں میں پہنچ گئیں۔ استانی صاحبہ نے سکول کو
 تالا لگایا اور وہ بھی گھروں کو چلی گئیں۔ اگلی صبح جب بچیاں سکول آئیں تو سکول کو تالا
 لگا دیکھ کر واپسی کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہ تھا، تاہم تیسری استانی پہنچی (ظاہر
 ہے وہ تاخیر سے ہی آئی ہوگی) تو گیٹ پر لگے تالے نے اسے بھی پریشان کر دیا، تاہم
 سرکاری ملازمت کے دباؤ کی وجہ سے موصوفہ نے ساتھ والے بوائز پرائمری سکول میں
 بیٹھ کر چھٹی کے وقت کا انتظار کیا۔ بتایا گیا ہے محکمہ تعلیم کے ضلعی افسران کو اس تالہ
 بندی کی اطلاع کر دی گئی۔ وجہ اس تالا بندی کے پیچھے لڑائی کی یہ بتائی جا رہی ہے کہ ان
 دو میں سے ایک استانی نے روزانہ دو بچیوں کی ذمہ داری لگا رکھی تھی کہ وہ باری

بدل بدل کر استانی کے گھر کا کام کیا کریں۔ یہ سلسلہ جاری تھا، اس استانی کا دیگر کے ساتھ روزانہ ہی جھگڑا رہتا تھا۔ اگرچہ والدین پہلے ہی اس صورت حال سے پریشان تھے، مگر تالا لگنے پر انہوں نے بھی شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔

یہ خبر اگرچہ بذاتِ خود بھی بہت اہم اور دلچسپ ہے، مگر ایسے وقت میں جب حقوق نسواں بل کو پنجاب اسمبلی سے پاس ہوئے ابھی تین روز بھی نہیں ہوئے، بلکہ گورنر صاحب نے آج ہی اس بل پر دستخط ثبت فرما کر اس کی حتمی منظوری دی ہے۔ ایسے میں دو خواتین کی لڑائی اور تالا بندی کے معاملات نے نئے سوالات کھڑے کر دیئے ہیں۔

اگرچہ استانیوں کی یہ لڑائی کارِ سرکار میں مداخلت کے زمرے میں بھی آتی ہے، کیونکہ سرکاری عمارت کو تالا لگا دینا بھی ایک جرم ہے، اس کی سزا جو بھی ہوگی وہ تو استانیاں بھگتیں گی، مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیا قوم کی یہ خواتین معمار پنجاب اسمبلی میں منظور ہو جانے والے بل کے کسی ضمن میں آتی ہیں یا نہیں؟ اگر ایک خاوند اپنی بیوی کو ڈانٹے، یا اس پر ہاتھ اٹھائے، یا اس کا معاشی استحصال کرے، تو اس کو عورت کی شکایت پر عدالت کے سامنے پیش ہونا پڑے گا، اگر وہ مندرجہ بالا جرائم میں سے کسی کا مرتکب ہوا ہے تو اسے گھر سے بے دخل کر دیا جائے گا، (تاہم یہ کام عورت کے ساتھ نہیں ہوگا) مرد کو گھر سے نکالتے وقت اس کے ہاتھ کی کلائی میں ایک عدد

ٹریکنگ کڑا بھی پہنایا جائے گا، تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ وہ گھر سے نکالے جانے کے بعد کہاں جاتا ہے، اس کی سرگرمیاں کیا ہیں، اور وہ کس سے مشاورت کرتا ہے جس کے نتیجے میں اپنی بیوی پر ظلم ڈھاتا ہے؟

اگرچہ یہاں بھی ”نسواں“ کے حقوق ہی مجروح ہوئے ہیں، ہاتھ پائی بھی خواتین میں ہی ہوئی ہے، مگر یہاں معاملہ مختلف ہے، کہ ستم ڈھانے والا مرد نہیں تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مرد عورت پر ہاتھ اٹھائے تو قابل گرفت ہے، اور اگر عورت عورت پر ہاتھ اٹھائے تو اس سلسلے میں قانون خاموش ہے۔ امید ہے کہ اس واقعہ کے بعد پنجاب اسمبلی کے اگلے اجلاس میں حقوق نسواں بل میں مزید ترمیم کروادی جائے گی۔ کام آسان اس لئے ہے کہ رہنمائی کے لئے ایک بل پہلے سے موجود ہے، اسی میں نام پتہ تبدیل کر کے اسے قابل عمل بنا دیا جائے گا، بس اضافہ اس قدر ہوگا کہ مرد کی بجائے اگر کوئی خاتون بھی دوسری پر تشدد کرے تو اسے بھی وہی سزا دلوائی جائے جو مردوں کو دی جانی ہے۔ یہ بھی کہ بس چند لاکھ روپے کے خرچ پر ایک روز کے لئے اجلاس بلایا جاسکتا ہے، کورم وغیرہ تو پہلے بھی کم ہی پورا ہوتا ہے۔ مگر اس میں ایک اور قباحت آجائے گی، وہ یہ کہ اگر کسی عورت کو سزا ہوگئی تو اس کے تحفظ کے لئے کونسا قانون سامنے آئے گا، خیر اس اہم معاملہ کے لئے بھی اسمبلی غور کر سکتی ہے، اور اسمبلی میں موجود خواتین سے مشورہ کر سکتی ہے کہ آیا خواتین کی آپس کی

لڑائی میں قانون کو حرکت میں آنا چاہیے، یا خواتین کا احترام کرتے ہوئے برداشت
سے ہی کام لینے کی ہدایت کر دی جائے گی۔

نجی تعلیمی اداروں کے بارے میں ترمیمی بل

تعلیم انسان کا بنیادی حق ہے، چونکہ عوام کو بنیادی حقوق کی فراہمی کا فریضہ ریاست کے سر ہوتا ہے، اس لئے یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی جس طرح جان، مال، صحت وغیرہ کی ذمہ دار ہے، اسی طرح تعلیم بھی اسی کے ذمے ہے۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان میں ایسے نہیں۔ تیس چالیس برس قبل تک پاکستان میں تعلیم جو کچھ بھی تھی، وہ حکومت کے ہاتھ میں تھی، سرکاری سکول ہی ہوتے تھے، وہاں خواہ ضروری سہولتیں ہوں یا ان کا فقدان ہو، سکول چلتے تھے، کسی سکول میں چار دیواری نہیں تو کسی میں فرنیچر کا تصور نہیں، حتیٰ کہ کسی میں کمرے تک نہیں، درختوں کے نیچے گھر سے لایا ہوا تھیلہ بچھا کر بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ طلبہ و طالبات کی تعداد بھی معقول ہوتی تھی۔ (موجودہ سرکاری ملازمت کے آخری عشرے کے زیادہ تر لوگ ٹاٹ سکولوں کے تعلیم یافتہ ہیں) استاد بھی محنت کرتے تھے، کسی حد تک علم بھی ہوتا تھا اور نتائج بھی اب سے بہتر تھے۔ سرکاری سکولوں کی مانیٹرنگ بھی بہت بہتر تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ معاملہ کمزور ہوتا گیا، لوگوں میں آگاہی پیدا ہوتی گئی، آبادی بھی بڑھتی گئی، سکولوں کا معیار کم ہوتا گیا، یوں سرکاری سکول کم پڑتے گئے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نجی سکولوں کا رجحان فروغ پذیر ہوا۔ اگرچہ نجی سکول اس سے قبل بھی موجود تھے،

مگر بھٹو سرکار نے نجی سکولوں کو قومیا لیا تھا، جس کی بنا پر نئے سکول بنانے والے خوفزدہ بھی تھے اور سابق سکول مالکان مایوس بھی۔ مگر حکومتوں کی مسلسل عدم توجہی کی وجہ سے سرکاری سکولوں پر عوام کا اعتماد اٹھتا چلا گیا، آبادی اور کمزوری کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے نجی سکول سامنے آتے گئے۔

نجی سکولوں کا پھیلاؤ؛

نجی سکولوں کی ابتدا سے ہی کئی قسمیں ہیں، گلی محلے میں چند روپے فیس سے سکول کھولے گئے، دوسری طرف سرمایہ دار بھی اس میدان میں کود پڑے اور بڑے سکول معرض وجود میں آ گئے، جنہوں نے بعد ازاں اپنی بے شمار برائیاں قائم کر لیں اور اس وقت پاکستان میں سیکڑوں کی تعداد میں ان کی شاخیں موجود ہیں۔ اب بڑے پیمانے پر انفرادی نجی سکول قائم کرنا نہایت مشکل کام ہے، کیونکہ ہر طرف فرنچائزز نے دھوم مچا رکھی ہے اور مارکیٹ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں بے شمار نئی فرنچائزز قائم ہوئی ہیں، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کا سکول کھلتے ہی عوام دوسرے انفرادی یا نسبتاً کمزور سکولوں سے اپنے بچے نکلواتے ہیں اور فرنچائزز کے سکول میں جا داخل کرواتے ہیں۔ عوام کی دلچسپی کے پیش نظر ان سکولوں نے عوام سے من مانی فیسیں وصول کرنے کا بندوبست کیا، مختلف مددات میں فیس اکٹھی کرنے کی مہم شروع کی۔ حتیٰ کہ اب

بات لاکھوں روپے تک پہنچ چکی ہے، جس میں بہت بڑے سکولوں کی ڈوئیشن فیس ہی دسیوں ہزار ہے، ٹیوشن فیس کے علاوہ بھی بہت سے سلسلے ہیں جہاں سے رقم حاصل کی جاتی ہے اور آخر میں بھاری بھر کم بل والدین کے ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ والدین کو سب معلوم ہوتا ہے کہ کس سکول کی کتنی فیس ہے، وہ سوچ سمجھ کر ہی ادھر کا رخ کرتے ہیں، اور اپنی مرضی سے ہی بچے کو وہاں داخل کرواتے ہیں، مگر انہیں صدمہ اس وقت پہنچتا ہے جب آئے روز ان کی فیسوں میں بغیر کسی پیشگی اطلاع یا بغیر ضرورت کے اضافہ ہو جاتا ہے، یا فیس میں کوئی نئی مد شامل ہو جاتی ہے۔ فرنیچائزروں اور بہت بڑے سکولوں کا عالم یہ ہے کہ وہ عالیشان عمارتوں میں قائم ہیں اور ان کی آمدنی کروڑوں روپے ماہانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہی لوگوں اور اداروں کی دیکھا دیکھی اب بہت سے پیسے والے لوگ اسی کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے کے ترجیح دیتے ہیں، وہ تعلیم کو عبادت جان کر نہیں، کاروبار سمجھ کر سکول بناتے اور بھاری فیسیں وصول کرتے ہیں۔

پنجاب اسمبلی کا نیا ترمیمی بل؛

گزشتہ برس گرمیوں کی چھٹیوں کے موقع پر والدین نے نجی سکولوں کے خلاف اس بات پر احتجاج کیا تھا کہ ان سکولوں کی فیسوں کو بے قابو ہونے سے روکا جائے۔ جس پر عدالت عالیہ نے چھٹیوں کی فیس یکمشت لینے سے منع کر دیا تھا،

اس موضوع پر بات ذیل کی سطور میں کریں گے، تاہم اس سال فروری میں نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے قبل ہی پنجاب اسمبلی نے نجی سکولوں کی فیسوں کے حوالے سے متفقہ طور پر بل منظور کیا ہے، جس کے مطابق نجی سکول اپنی مرضی سے فیس میں اضافہ نہیں کر سکیں گے، اس کے لئے انہیں رجسٹریشن اتھارٹی سے تین ماہ قبل اجازت لینا ہوگی، اجازت کی صورت میں بھی وہ کل فیس میں پانچ فیصد اضافہ کر سکیں گے، خلاف ورزی کرنے والے سکول کو 20 ہزار یومیہ سے لے کر بیس لاکھ روپے تک جرمانہ کیا جائے گا۔ جس سکول نے گزشتہ برس سے زیادہ فیس وصول کی اسے فیس ایڈجسٹ کرنا پڑے گی یا پھر واپس۔ داخلہ، سکیورٹی یا لیبارٹری وغیرہ کی مد میں کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔ سکول والدین کو کسی مخصوص مقام سے یونیفارم، نصابی کتب یا دیگر مواد کے خریدنے کے لئے پابند نہیں کر سکیں گے۔ سکول رجسٹر نہ کروانے کی صورت میں تین سے چالیس لاکھ روپے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

معاملہ رویے کا؛

نجی تعلیمی اداروں کی مخالفت میں پوری قوم متحد ہے، وزیراعظم سے لے کر ایک ریڑھی والے تک نجی تعلیمی اداروں پر منفی تبصرے کرتے پائے جاتے ہیں، ان کے خلاف اظہارِ نفرت کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیا جاتا۔ غم و غصے کی نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ کبھی ٹھنڈے دل سے ان کے بارے میں سوچنے کا تصور

بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لوٹ مار کا الزام ہر کسی کی زبان پر ہے۔ مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے، کیونکہ ہم لوگ اونٹ اور بھیڑ کو ایک ہی لاکھی سے ہانکنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جن سکولوں کی فیسیں ڈالروں میں ہیں، یا جو لاکھوں روپے سالانہ فیسیں لیتے ہیں، ہماری حکومتیں اور اسمبلیاں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑتیں، کیونکہ اول تو وہ خود بھی اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں، یا پھر ممبران اسمبلی پر بہت زیادہ اثر انداز ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام بڑوں کے بچے بھی بڑے سکولوں میں ہی پڑھتے ہیں۔ کونسا وزیر یا سیکریٹری یا کوئی ممبر اسمبلی ہے جس کا بچہ کسی بڑے سکول میں نہیں پڑھتا۔ دراصل بڑے نام والے سکولوں میں لوگ صرف نام کمانے کے لئے پڑھتے ہیں، کسی کی قسمت اچھی ہوئی تو وہ باری لگا لے گا اور پارا اترنے میں کامیاب ہو جائے گا، ورنہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے ملازمت تو کرنا نہیں، سٹیڈس کوکے چکر میں اعلیٰ سے اعلیٰ سکول میں داخلہ لے کر سوسائٹی میں کالر اونچے کر کے دکھاتے پھرتے ہیں، کہ ہمارے بچے فلاں سکول میں زیر تعلیم ہیں۔

بہت سے لوگ اس موارنے پر ناراض ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی امیر شخص کسی بہت اچھے ہوٹل میں کھانا کھاتا ہے، کسی بہت اچھی مارکیٹ سے کپڑے خریدتا ہے، جوتے ہمیشہ برانڈڈ پہنتا ہے، دیگر گارمنٹس اور خوشبوؤں کا انتخاب بھی غیر ملکی اشیا میں سے کرتا ہے، سواری پچاس لاکھ سے زیادہ قیمت کی رکھتا ہے، گھر

پانچ کروڑ سے زیادہ مالیت کا پسند کرتا ہے، سال میں ایک دو مرتبہ بیرونی ممالک کے دورے کرتا ہے، تو اسے کسی بھی موقع پر کسی بھی چیز کے منگے ہونے کا گلہ نہیں ہوتا، نہ وہ دکاندار سے بحث کرتا ہے، نہ فائو سٹار ہوٹل کی انتظامیہ سے الجھتا ہے، نہ لاکھوں کی شاپنگ پر مہنگائی کو کوستا اور احتجاج کرتا ہے۔ وہ یہ تمام کام سکول پہنچ کر ضرور کرتا ہے، وہ فیسوں پر احتجاج کرتا ہے، کتابوں اور دیگر فنڈز پر اعتراض کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ سکولوں والے بھی فینسیں اچانک اور اکثر بڑھا دیتے ہیں، جس سے والدین کو فطری طور پر دھچکا لگتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بہت سی فینسیں غیر ضروری بھی ہوتی ہیں۔ مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اپنے ہاں ڈاکٹر بھی بہت منگے ہیں، ہسپتال بھی حد سے زیادہ منگے ہیں، وہاں احتجاج نہیں ہوتا، بلکہ لوگ شوق سے وہاں جاتے ہیں کہ انہیں ڈاکٹر پر اعتماد ہوتا ہے۔ اس سارے تضاد کی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم لوگ تعلیم کو اپنی ترجیح نہیں سمجھتے۔

سکولوں کی کیٹیگری؛

اس قانون سازی میں ایک بڑا مسئلہ سکولوں کی کیٹیگری کا ہے، حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام سکولوں کی کیٹیگری مقرر کرے۔ ایک ایسے سکول مالک سے میری بہت پرانی شناسائی ہے جس کے سکول کی فیس ہزار بارہ سو ہے، ان کے لاکھوں روپے والدین کی طرف بقایا جاتے ہیں، جب فیس کا تقاضا کیا جاتا ہے تو وہ اپنے بچے

کو کسی اور سکول میں داخل کروا لیتے ہیں، یوں اس فیس کے ساتھ بھی ان کا گزارہ مشکل سے چل رہا ہے۔ دوسری طرف فیسوں کی ریکوری کا معاملہ بھی بہت تکلیف دہ ہے کہ گزشتہ برس عدالت کے حکم پر گرمی کی چھٹیوں کی فیس یکمشت لینے سے منع کر دیا گیا، مگر والدین چھٹیوں میں ہر مہینے کی فیس کسی صورت جمع نہیں کرواتے، زیادہ تر سکول کرائے کی عمارات میں قائم ہیں، سوانہیں تین ماہ آمدنی نہیں ہوئی، چھٹیوں میں والدین نے فیس جمع نہیں کروائی اور چھٹیوں کے بعد یکمشت ان کے پاس تھی نہیں۔ اس سب کچھ کے ساتھ ستم یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین فیس کو ترجیح نہیں بناتے۔ پانچ سات سو روپے والے سکول میں بھی فیسوں کی ادائیگی کا یہی عالم ہے، جب کہ والدین کے پاس اچھا موٹر سائیکل اور ہاتھ میں ٹچ موبائل بھی ہوتا ہے، مگر چند سو روپے فیس دینے میں وہ ٹال مٹول سے کام لیتے رہتے ہیں۔ نئے بل میں سکولوں کو لاکھوں روپے جرمانہ کی باتیں بھی اس بات کی چغلی کھاتی ہیں کہ پنجاب اسمبلی کے معزز ارکان کی نگاہ صرف انہی سکولوں پر ہے جہاں خود ان کے یا بیوروکریسی کے بچے زیر تعلیم ہیں۔ وہ چونکہ بھاری فیسیں ادا کرتے ہیں، اس لئے جرمانے بھی لاکھوں میں ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہی قانون کلی محلے کے سکول پر بھی لاگو کیا جائے تو وہ اپنے اثاثے فروخت کر کے ہی یہ جرمانہ ادا کر سکے گا۔

سرکاری سکولوں کی نجکاری؛

پنجاب حکومت نے اپنے ایکٹ ہزار پر انٹری نجی شعبہ کو دے دیئے ہیں، یہ سکول بنیادی طور پر تو پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے حوالے کئے گئے ہیں، جس نے آگے سکول جینز، این جی اوز، فاؤنڈیشن پارٹنر سکولز اور بعض کو انفرادی طور پر سکول الاٹ کر دیئے ہیں، اب یہی لوگ سرکاری سکول چلائیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر پرائمری اور ہائر سیکنڈری سکول نجی شعبہ کو دینے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ وجہ اس تبدیلی کی

یہ ہے کہ یہ سرکاری سکول اپنی فرائض ادا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے تھے۔ دوسری طرف نجی شعبہ کے سکولوں کے لئے مسائل پیدا کئے جا رہے ہیں۔ قانون تو ان سکولوں کے لئے بن رہے ہیں، جن سے اشرافیہ پریشان ہیں، ستم یہ ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کو ان سکولوں میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے داخل کرواتے ہیں، مگر اس طرح پھنس وہ سکول بھی جاتے ہیں، جو نہ تو ”لوٹ مار“ کے زمرے میں آتے ہیں، اور نہ ہی ان کی فیسیں اتنی ہیں کہ وہ ”مافیا“ کہلا سکیں۔

دیگر قانونی پابندیاں؛

پنجاب اسمبلی کے نئے ترمیمی بل میں نجی سکولوں کو اس بات کا بھی پابند کیا گیا ہے کہ وہ یونیفارم، نصابی کتب یا دیگر اشیاء کے لئے کسی خاص دکان کا بندوبست نہ کریں۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سکول مالکان مذکورہ

بالا دکانوں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں، بہت ہی کم ہونگے جو ایسا نہیں کرتے۔ مگر یہ حقیقت بھی غور کے قابل ہے کہ اگر ان چیزوں کے لئے کوئی دکان مخصوص نہیں کی جائے گی تو ہر بچے کی یونیفارم دوسرے سے مختلف ہوگی، اسی طرح نجی سکولوں میں کتابیں مختلف پبلشرز کی شائع کردہ ہوتی ہیں، ہر دکان پر ہر پبلشر کی کتب نہیں ہوتیں، اس طرح والدین کو عظیم خواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح رجسٹریشن اتھارٹی سے تین ماہ قبل اجازت لے کر پانچ فیصد فیس بڑھانے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اگر کسی سکول کی فیس محض پندرہ سو ہے تو وہ سال میں 75 روپے اضافہ کر سکے گا، وہ بھی اجازت ملنے کی صورت میں۔ حالانکہ مکان کا کرایہ اور دیگر اخراجات کی مد میں کم از کم دس فیصد اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سکول چونکہ حکومت کا بوجھ بانٹ رہے ہیں، اس لئے انہیں سہولتیں دینے کی ضرورت ہے۔ نجی سکولوں کو دبانے کے لئے والدین کے تبرع، دانشوروں کی رائے اور حکومتی رویے اجتماعی طور پر ایکٹ ماحول بنا رہے ہیں، نتیجہ یہ نکلے گا کہ آنے والی نسل اساتذہ کی عزت اور احترام کے قصے صرف کتابوں میں ہی پڑھا کریں گے، کیونکہ ابھی تک بچے عزت صرف سرکاری سکولوں کے اساتذہ کی کرتے ہیں، نجی سکول اس نعمت سے سراسر محروم ہیں، یہ زوال پوری قوت سے جاری و ساری ہے۔ مسائل کے حل اور تجاویز؛

حکومت چونکہ خود تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے میں ناکام ہو چکی ہے، اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ نجی شعبہ کی سرپرستی کرے۔ تاہم سکولوں کو بار بار فیسیں بڑھانے سے روکنا بہت ضروری تھا۔ اسی طرح یہ اضافہ کسی حساب میں رہنا چاہیے، تاہم پانچ فیصد بہت کم ہے۔ یہ کیا جاسکتا ہے کہ پانچ ہزار سے زائد فیس لینے والے سکول کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنے خرچے پر ایکٹ نجی سکول قائم کرے، جس میں غریب بچوں کو مفت تعلیم دینے کا بندوبست کیا جائے، کتاہیں حکومت فراہم کر دے، جبکہ اساتذہ اور عمارت کے کرائے کی مد میں ہونے والا خرچہ نجی سکول پر ڈال دیا جائے۔ دوم؛ فارم ہاؤسز، بڑی گاڑیوں کے مالکان، صنعتکاروں، بڑے تاجروں، وزراء اور اسی قسم کے دیگر لوگوں کو بھی پابند کیا جائے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق نجی سکول قائم کریں اور ان کے اخراجات خود برداشت کریں۔ اس طرح غریب بچوں کو معیاری تعلیم میسر آجائے گی۔

پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن؛

پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ذریعے حکومت اس وقت لاکھوں بچوں کو مفت اور معیاری تعلیم مہیا کر رہی ہے، اس میں غریب سے لے کر عام متوسط طبقے تک کے بچے زیر تعلیم ہیں، مگر گزشتہ برس سے فاؤنڈیشن نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ پرائمری حصہ میں صرف مستحق (یعنی غریب) بچے ہی داخل ہونگے، مہنگائی کے عالم میں عام سرکاری ملازم بھی اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہے، مگر نئے حکم کے

مطابق ان لوگوں کو اپنے بچے مجبوراً نجی سکولوں میں ہی داخل کروانے پڑیں گے، جو کہ ان کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اب چونکہ حکومت نے اپنے تمام پرائمری اور ہائر سیکنڈری سکول فاؤنڈیشن کو دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو اسی طرح حکومت اپنے تعلیمی معیار پر واپس آجائے تو حکومت کو نجی سکولوں سے پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ مگر ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر فاؤنڈیشن نے بھی سرکاری رویے اپنا لئے اور اپنے من پسند لوگوں کو آگے لانا شروع کر دیا تو اسے بھی ایک سرکاری ادارے کے طور پر ہی جانا جانے لگے گا، جبکہ اس وقت فاؤنڈیشن کی نیک نامی قائم ہے، مگر پھیلاؤ کے بعد اسے سنبھالنا بہت ضروری ہوگا۔

! عام آدمی کی خوشحالی

عام آدمی کے لئے لوٹنے کی جائے ہے، اسے خوشی سے پھولا نہیں سامنا چاہیے، مارے خوشی کے ایسی دھماکے ڈالنی چاہیے کہ اسے 'حال' چڑھ جائیں اور اسے دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ رہے۔ اگر اس نے اپنے ہوش نہیں کھوئے تو اسے کسی کروٹ سکون نہ مل سکے گا، سکون حاصل کرنے کا دوسرا واحد طریقہ یہ ہے کہ عام آدمی وزیراعظم کی بات پر یقین کر لے اور سکون پائے۔ وزیراعظم نے فرمایا ہے کہ "عام آدمی کی خوشحالی کے لئے کوشاں ہیں"، یہ خوشخبری وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف نے اپنی قوم کو سنائی ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ملک کی کئی مشکلات حل ہو گئی ہیں، باقی بھی کر لیں گے"۔ انہوں نے دو برس بعد بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کی بھی خوشخبری سنائی۔ اگر عام آدمی کی خوشحالی کے لئے خود وزیراعظم اور ان کے ساتھی کوشاں ہیں، تو عام آدمی کو اور کیا چاہیے؟ ہر کسی کے یہ نصیب کہاں کہ وزیراعظم اور کوئی وی وی وی آئی پی کسی کے بارے میں سوچے، اُسے تو مارے خوشی کے رات بھر نیند نہیں آنی چاہیے۔ عام آدمی کو اس قدر اہمیت بھلا کب ملی تھی، جتنی اس دور میں ملی ہے۔ ہم عام آدمی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ وہ اب وزیراعظم کی نگاہوں میں ہیں۔ اور عام آدمی کی جانب سے وزیراعظم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت

میں سے چند لمحات نکالے اور عام آدمی کی بہبود کے لئے استعمال کئے۔

ہمارے دانشور یا تنگ نظریہ نے ”عام آدمی“ کو ہوا بنائے رکھتے ہیں، جب بھی کسی عظیم حکومت نے عام آدمی کے حق میں کوئی بات کی، یا اس کی بہبود کے لئے کسی منصوبے کے بارے میں سوچا تو یہ دانشور ”عام آدمی“ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور یہ باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حکومت کے منصوبوں کا آخر کس عام آدمی پر فرق پڑا ہے؟ کسی کو ایسا عام آدمی کبھی نہیں ملا، جو پٹرول مہنگا ہونے پر مہنگائی کے اثرات سے محفوظ رہا ہو، مگر حکومت ایسا ہی بتایا کرتی ہے اور اپنے کبے پر اصرار بھی کرتی ہے، ایسا کرنا حکومت یا اس کے نمائندوں یا ترجمانوں کا کام ہوتا ہے، اسی کو سرکاری سچ کہا جاتا ہے۔ مگر وزیر اعظم نے عام آدمی کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا، بلکہ نہایت چچا تلا بیان دیا ہے کہ اس کی خوشحالی کے لئے کوشاں ہیں۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ انسان کو کوشش کرنی چاہیے، کوشش کامیاب بھی ہو جاتی ہے اور گاہے ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے، مگر بہت ہی اچھی اور خوبصورت بات یہ ہے کہ اپنے عوام بہت آرام سے اس بات کو تسلیم کر کے بہت جلد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کام نہیں ہوا، کوئی بات نہیں، چلیں فلاں صاحب نے کوشش تو کی ہے نا

وزیر اعظم نے تو بہت سی مشکلات کے حل کی خوشخبری سنا دی، اور باقیوں کے حل

کی امید بھی دلا دی، مگر ستم یہ ہے کہ نہ مہنگائی کم ہوئی، نہ بے روزگاری میں کمی آئی، نہ خود کشیوں سے جان خلاصی ہوئی، نہ سٹریٹ کرائم میں کوئی کمی ہوئی، نہ شرح خواندگی میں اضافہ ہوا، نہ اکثر بچے سکولوں میں داخل ہو سکے، نہ اکثر مریضوں کو صحت کی سہولتیں بہم پہنچیں، نہ پاکستانی عوام کی اکثریت کو پینے کے صاف پانی کی فراہمی ممکن بنائی جاسکی، نہ ان کا کاروبار مستحکم ہو سکا۔ نہ بے شمار کروڑ پتیوں کو ٹیکس نیٹ ورک میں لایا جاسکا، نہ کرپٹ لوگوں کے گرد آہنی حصار باندھا جاسکا، نہ غیر ملکی قرضوں میں کمی کا تصور پیدا ہوا، نہ حکمرانوں کی سکیورٹی، پروٹوکول اور مراعات کے نام پر عیاشیوں میں ذرا بھی کمی آئی۔ نہ تھانوں اور دفاتر سے رشوت ستانی میں کمی آئی، نہ ٹھیکیداری نظام میں کمیشن مافیا کے کاروبار میں ایک ڈھیلے کی لچک پیدا ہو سکی، نہ لوگوں کی عزت میں اضافہ ہوا۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ آج کل حکمران بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر اکتفا نہیں کرتے، اب وہ باقاعدہ اشرافیت کرتے ہیں، غیر ملکی دوروں میں زیادہ تر کا مقصد سیر سپاٹا ہی ہوتا ہے، کچھ عالمی تناظر میں ضروری بھی ہوتے ہیں، مگر زیادہ تر فرمائشی ہی ہوتے ہیں، اپنے وزیراعظم اپنے موجودہ دور حکومت میں ساٹھ سے زیادہ دورے فرما چکے ہیں، امید ہے آنے والے باقی وقت میں وہ اتنے ہی دورے مزید فرما کر ایک ریکارڈ بھی قائم کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارا عام آدمی حکمرانوں کے ہیلی کاپٹروں کو دیکھ کر، ہوٹر والی گاڑیوں کے آگے پیچھے بھاگ

کر بہت خوش ہوتا ہے، اس لئے وہ عوام کو اسی طرح خوش کرنے کا بندوبست کرتے

رہتے ہیں۔

کالم کا عنوان پڑھ کر کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کن کی بیگمات کو خط لکھے جارہے ہیں، آیا خود کسی کے اپنی بیگم کو لکھے گئے خطوط کی بات ہے، یا یہ حرکت کوئی دوسرا ہی کر رہا ہے۔ اگر خود کوئی اپنی ہی بیگم کو خط لکھتا ہے، تو اس کی بھی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، یعنی وہ خود گھر سے باہر ہوگا جو بیگم کو خط لکھے گا، اپنی خیر خیریت بتائے گا اور بیگم کی خیریت نیٹک مطلوب (چاہے) گا، یا کسی اہم پیش رفت وغیرہ سے آگاہ کرے گا، یا بیگم اپنے میکے گئی ہوئی ہے تو اسے مزید کچھ دن کے لئے اُدھر ہی قیام کا درخواست نما مشورہ دے گا، یا ایسا ماحول بتائے گا کہ وہ درخواست پر عمل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ بد قسمتی سے یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی بیگم کو آخری خط ہی لکھا جا رہا ہو، کہ اس کے بعد راہیں جدا ہو جائیں۔ تاہم اپنی بیگم کو جتنے خط بھی لکھے جائیں وہ ممکن ہیں، مگر وہ خط جو بیگم بننے سے پہلے لکھا جاسکتا ہے، اس کا شادی کے بعد کوئی امکان نہیں ہوتا۔ پہلے انسان ہواؤں میں اڑتا، آسمان سے تارے توڑتا، زمین و آسمان کے قلابے ملاتا، ہوائی قلعے تعمیر کرتا، خیالی پلاؤ پکاتا اور تصورات کی دنیا میں گم ہوتا ہے، اس لئے اپنی ہونے والے بیگم کے نام اس کا خط بھی مبالغہ آرائیوں پر مبنی ہوتا ہے، دوسری طرف جس کو خط لکھا جاتا ہے

اس کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ خط میں مبالغہ آمیزی ہی ہو۔ بیگمات کو جس خط کا یہاں ذکر ہونے جا رہا ہے، یہ اپنی نہیں دوسروں کی بیگمات ہی ہیں، مگر ان کے شوہران نامدار کو قطعاً کسی پریشانی یا غلط فہمی کا شکار ہونے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ خط حکومت کی طرف سے ہے۔ دراصل بھارت میں دہلی حکومت نے بالی وڈ کے اداکاروں شاہ رخ خان، گووند، اے دیوگن اور ارباز خان کی بیگمات کو خط لکھے ہیں، جن میں اداکاروں سے پان اور تمباکو وغیرہ کی تشہیر میں کام نہ کرنے کی اپیل کی گئی ہے۔ ایسے ہی خطوط دہلی حکومت نے خود اداکاروں کو بھی لکھے تھے، مگر کسی پر عمل ہوتا دکھائی نہیں دیا۔ اب ان کی بیگمات کو بتایا گیا ہے کہ ان پروڈکشن سے کینسر جیسے موذی امراض پیدا ہونے کے خطرات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ اکثر اوقات نوجوان اپنے من پسند فلمی ستاروں کو ماڈل تصور کر کے ان کے لائف سٹائل کو اپناتے ہوئے ایسی مضر صحت پروڈکشن کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔

جن بھارتی فلمی ستاروں کے نام لیے گئے ہیں، صرف انہی کی بیگمات کو خط لکھنے کے پیچھے بھی مختلف داستان ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے دیگر اداکار اس قسم کے اشتہار میں کام ہی نہیں کرتے، جس سے نئی نسل میں کسی قسم کی خرابی کے امکانات پیدا ہوں، دوسرا یہ کہ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے نامور

اداکار بھی ہیں، جن کو یہ خط نہیں لکھا گیا، کیونکہ وہ بیگم جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ جن اداکاروں کی بیگمات کو خط لکھے گئے ہیں، حکومت نے ان کی معلومات حاصل کر لی ہوگی کہ آیا وہ اداکار اپنی بیگمات کے کہنے سے باہر کسی صورت نہیں جاسکتے۔ یہ اداکار ”تم کو جو ہو پسند وہی بات کہیں گے.. دن کو اگر تم رات کہو، رات کہیں گے“ کی عملی تصویر ہیں۔ وہ ہر قدم اپنی زوجہ کے مشورے اور بعض اوقات اشارے سے ہی اٹھاتے ہیں۔ جب دہلی حکومت کا خط اُن تک پہنچے گا، تو معاملہ سیدھا ہو جائے گا، کمپنیوں سے جو معاہدہ ہو گیا وہ تو پورا کرنا ہوگا، تاہم آئندہ احتیاط کریں گے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کسی خاوند کی ڈوریں اپنی بیگم کے ہاتھ میں نہ ہوں، ایسے میں معاملہ الٹ ہو جائے گا، نہ بیوی روک سکے گی اور نہ وہ رکیں گے۔

دہلی حکومت کا فیصلہ بہت عجیب ہے، اگر بھارتی فلموں کو دیکھیں تو ان میں یہ پان سگریٹ تو بہت چھوٹی چیزیں ہیں، وہاں تو شراب بھی عام ہے، بلکہ سر عام ہے، سگریٹ بھی ایکشن فلموں کا لازمی جزو ہے، ایسے میں اشتہاروں پر پابندی لگوانے سے فلموں میں تبدیلی تو ممکن نہیں، اور جہاں تک اثرات مرتب ہونے کی بات ہے، تو ہیر و توبختے ہی فلم سے ہیں، فلمی کردار ہی کو آئیڈیل تصور کر کے اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں، چونکہ دہلی حکومت فلموں سے ان برائیوں کو ختم نہیں کر سکتی، لہذا اگلی نسل کو ان چیزوں سے بچانا بھی

ناممکن ہے، حکومت نے بیگمات کو خطوط لکھ کر آخری کوشش کر لی ہے، اب آخری راستہ

صبر کا ہی پختا ہے۔

ایم کیو ایم اور..... الزامات

کہنے کو تو مصطفیٰ کمال نے کمال کر دیا، جذبات میں اشکوں کا تڑکا بھی خوب لگایا، سوال اٹھائے اور لاکاراء بھائی کو صاحب بنا دیا۔ قائد کے کردار کے کچھ نئے پہلو بھی قوم کے سامنے والکے۔ 'را' کے ایجنٹ ہونے کا الزام تو ہزاروں مرتبہ پارٹی پر لگ چکا، صرف الزام ہی نہیں، بات ثبوت اور یقین تک بھی پہنچ چکی۔ کمال کا مہذب لوگوں کو تمیں برس میں جاہل بنا دینے کا الزام، قائد کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے مشورہ، لاشوں پر سیاست کرنے کے ہنر سے آشنائی کا ذکر، حکومتوں سے نکلنے اور دوبارہ واپس آنے کا شرمناک کردار، رابطہ کمیٹی کی الطاف کے ہاتھوں مسلسل تذلیل، رات کو گالی بکنے اور صبح معافی مانگ لینے کی روایت، نوجوانوں کو دہشت گرد بنانے کا الزام، زندگی اور موت کا ٹھیکہ الطاف کو دینے کی بات، رابطہ کمیٹی کا سب کچھ جانتے ہوئے بھی کارکنوں سے مسلسل جھوٹ بولنے کا رویہ۔ ان تمام الزامات میں کوئی بھی نیا نہیں، اور یہی جواب ایم کیو ایم کے رہنماؤں نے مصطفیٰ کمال کی پریس کانفرنس کے جواب میں دیا ہے، اور کہا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی سازشیں ناکام ہو گئی، تمام الزامات جھوٹے ہیں، جواب دینے کی ضرورت نہیں، ایم کیو ایم کامیڈیا ٹرائل کیا جا رہا ہے، الزامات گھٹیا اور پرانے ہیں۔ ان تمام پرانے الزامات ایک نئی بات کھل کر سامنے آئی

ہے کہ قائد تحریک کی کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے ان کے لئے دن اور رات میں کوئی فرق نہیں، اسی وجہ سے ان کو تقریر وغیرہ میں بھی دقت پیش آتی ہے۔

الزامات تو واقعی نئے نہیں، مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ الزامات لگانے والا آدمی ضرور نیا ہے، اور وہ ایسا آدمی ہے جسے ایم کیو ایم نے لاکھوں میں ایک منتخب کر کے کراچی کی نظامت کا تاج اس کے سر پر رکھا تھا، اس کو اس قابل جانا تھا اور اس پر اعتماد کیا تھا۔

اگر کوئی بدنام قاتل یا بھتہ خور رینجر کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اس قسم کے بیانات دیتا ہے تو اس کے بارے میں کہنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوتی کہ یہ بیان دباؤ میں دیا گیا ہے، مگر جب گھر کا ایک بھیدی اپنی مرضی سے ہی لٹکا ڈھائے گا تو حالات مختلف ہوں گے۔

چونکہ ایم کیو ایم کی قیادت کے پاس ان سوالوں کے جوابات نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے یہ جواب دینا ہی مناسب جانا کہ کوئی جواب ہی نہ دیا جائے۔ تاہم یہ کہا کہ اگر کچھ لوگوں نے ’را‘ سے رابطہ کیا یا فنڈ لیا، تو ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں، یہ الزام کو تسلیم کرنے والی بات ہی ہے۔ ایم کیو ایم کے رہنماؤں کی یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ الزامات پرانے اور گھٹیا ہیں۔ یقیناً ایسے ہی ہے، الزامات پرانے تو ہیں ہی، گھٹیا اس لئے ہیں کہ جن پر الزام لگایا جا رہا ہے، ان کا کردار بھی گھٹیا ہی ہے۔

اس پر لیس کا نفرنس کے بعد یہ شکوک و شبہات بھی سراٹھارہے ہیں کہ آیا مصطفیٰ کمال نے یہ قدم خود اٹھایا ہے یا یہ کام کسی کی شہ پر کیا جا رہا ہے، ان پر بھی یہ الزام لگ رہا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ ان سے سب کچھ کروا رہی ہے۔ سابق ناظم کراچی کی جانب سے اس الزام کو مسترد بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ خیال بھی یہاں سراٹھاتا ہے کہ آخر دسیوں سالوں سے یہ لوگ پارٹی کے ساتھ ہیں، اس کے کارکن بنے، پھر قیادت کے منصب تک پہنچے، پھر ”بابائے کراچی“ کے عہدہ جلیلہ پر متمکن ہوئے، آخر ایم کیو ایم کی یہ خرابیاں اس وقت ان کے سامنے کیوں نہیں آسکیں، انہیں اپنے قائد کی عاداتِ بد کا پہلے علم کیوں نہیں ہوسکا، انہیں قائد کے حکم پر حکومتوں میں شامل ہونے اور نکلنے کے انداز اس وقت کیوں برے نہ لگے، ’را‘ کے ایجنٹ ہونے کے الزام پر ہی تو چوبیس برس قبل کراچی میں آپریشن کلین اپ ہوا تھا، قائد کی شراب نوشی اور بھتہ خوری انہوں نے اتنا عرصہ کیوں برداشت کئے رکھی؟ آخر کوئی بات تو اندر کی بھی ہوگی، ناراضی کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی۔ اگر یہ واقعی ضمیر کا فیصلہ اور خوفِ خدا کا کرشمہ ہے تو بہت خوب ہے۔

آئینے کی طرح شفاف اور سورج کی طرح روشن ان الزامات کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کراچی کے عوام نے ایم کیو ایم پر مکمل بھروسہ کیا ہے۔ ہر الیکشن میں اس پر یہ الزام لگتا تھا کہ دھاندلی کے ذریعے کامیابی

ملتی ہے، مگر گزشتہ قومی اسمبلی کے ضمنی الیکشن میں اور اب بلدیاتی الیکشن میں یقیناً کوئی
دھاندلی نہیں ہوئی، تب بھی ایم کیو ایم نے بھاری اکثریت حاصل کی ہے۔ لمحہ فکر یہ ہے
کہ جمہوریت کی برکات سے 'را' کے ایجنٹ، قاتل، بھتہ خور اور اسی قسم کی دیگر
خصوصیات کے حامل لوگ کراچی کی قسمت کے مالک ہیں۔

چڑیاں کہاں جائیں؟

ہمارے گھر کے باہر کی چھوٹی دیوار پر بوگن بیل نے اپنے قدم جما رکھے ہیں، بیل پرانی ہونے کی بنا پر اسے زیادہ پھیلنے سے کاٹنا پڑتا ہے، یوں سردیوں میں اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے، جیسے صدیوں پرانی خشک شاخیں ہیں، تاہم ان کے کسی کونے میں کچھ شگوفے بھی پھوٹتے رہتے ہیں، خزاں کی رخصتی پر بہار نے اُن خشک ٹہنیوں میں بھی رنگ بھر دیا ہے، اب وہاں سے بھی نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ ان بیلوں کے قریب ہی شیشم کے دو درخت ہیں، جو ہیں تو کافی پرانے، مگر بس زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، سڑک سے پار بھی درخت ہیں، یوں گرمیوں میں کچھ سائے اور ٹھنڈک کا احساس ضرور رہتا ہے۔ نماز فجر سے واپس پہنچتا ہوں تو یہاں چڑیوں نے خوب رونق لگا رکھی ہوتی ہے، بوگن بیل کی خشک شاخوں کا رنگ بھی چڑیوں جیسا ہی ہے، وہ ایک شاخ سے دوسری پر پھدکتی، اچھلتی اور چھوٹی چھوٹی اڑائیں بھرتی شور کرتی ہیں۔ ان کی چوں چوں کا شور کانوں کو بہت بھاتا ہے، میں چند لمحے وہاں رک جاتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی اس خوبصورت نعمت اور تحفے سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

بوگن بیل کی ویران شاخوں پر چڑیوں کا پھدکنا اس وجہ سے بھی ہے کہ خاتونِ اول نے روز کا معمول بنا رکھا ہے، کہ وہ صبح ناشتے کے بعد چڑیوں کو کچھ نہ

کچھ خوراک ڈالتی ہے، بعض اوقات تو اپنے حصے کی روٹی میں سے ہی کچھ بچا کر باہر روانہ ہو جاتی ہے۔ دن میں یہ کاروائی دو سے تین مرتبہ ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ خاتون ابھی باہر صحن میں نکلی، چڑیوں نے درجہ بدرجہ درخت یا تیل سے نیچے آنا شروع کیا۔ اس نے خوراک ڈالی اور چڑیاں اس کے قدموں کے قریب ہی زمین پر اتر آئیں، یہی منظر اسے سکون دیتا ہے، وہ اللہ کی اس مخلوق کی خوشی کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ کبھی مجھے بھی یہ فریضہ سرانجام دینے کا حکم مل جاتا ہے، اور میں بھی ثواب دارین کی غرض سے چڑیوں کو دانہ ڈالنے چلا جاتا ہوں، مگر یہ دلچسپ واقعہ ہوتا ہے کہ مجھے دیکھ کر چڑیاں شاخوں سے نیچے نہیں آتیں، حتیٰ کہ نیچے کی طرف سفر بھی شروع نہیں کرتیں، میں دانہ وغیرہ ڈال کر واپس آتا ہوں تو وہ بعد میں اپنا کام کرتی ہیں۔ خاتون خانہ چونکہ روزانہ ان کی خدمت کرتی ہے، اس لئے وہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں صرف چڑیاں ہی نہیں آتیں، ایک دو بلبل نما پرندے بھی اتر آتے ہیں، اور اپنی قسمت کا دانہ دنگا چٹک لیتے ہیں، اس کے علاوہ کئی لالیاں بھی وہاں آ جاتی ہیں۔ ساتھ والے گھر کی طرف سے ایک بلی بھی گھات لگا کر بیٹھی ہوتی ہے، جو زمین پر ریگنے کے انداز میں چڑیوں کی طرف بڑھتی ہے، مگر اسے کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس میں سب سے بڑی رکاوٹ ہم لوگ ہوتے ہیں۔

اگر عام اور سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو ان مناظر میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا، مگر غور کیا جائے تو ایک طرف ان پرندوں کی خوراک کی کہانی ہے تو دوسری طرف ان کی اپنی زبان سے شکریے کی داستان ہے، یہ صبح اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی اور اس کی دی ہوئی خوراک پر اس کا شکر ادا کرتی ہیں، اور ہم لوگ اس سارے منظر سے سکون حاصل کرتے اور ذہنی آسودگی پاتے ہیں۔ ہماری گلی کے کونے پر ہی ایک پارک ہے، جس کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی سڑک (راستہ) مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، کچھ ہی عرصہ قبل یہاں ٹف ٹافل سے خوبصورت راستہ بنایا گیا تھا، نہ جانے وہ ٹاسیلیں کہاں گئیں۔ پارک اگرچہ چھوٹا ہے، اور سابق نظامت دور میں یہاں کے ناظم نے ناجائز قابضین سے جگہ خالی کروانے کا کام کیا تھا، اس میں واک کرنے کے لئے ٹریک بھی تھے، (نام کی حد تک اب بھی ہیں) تین طرف سے راستہ تھا، درمیان میں فوارہ تھا، روشنیوں کا بندوبست تھا، بیٹھنے کے لئے جگہ جگہ مضبوط بنچ پڑے تھے، مگر اب درمیان والے راستوں، بنچوں، گیٹوں اور بجلی کے کھمبوں کے علاوہ یہاں کچھ بھی نہیں۔ شام کو بچے کھیلتے ہیں تو گرد و غبار آسمان سے باتیں کر رہا ہوتا ہے، روشنی کا تصور قصہ پارینہ بن چکا ہے، گھاس نامی چیز کا یہاں تصور نہیں، پارک کا بیرونی ٹریک مٹی سے اور کھڈوں سے اٹھا ہوا ہے، جہاں مٹی والے خراب راستوں والی موٹر سائیکل ریلی منعقد کی جاسکتی ہے۔ پانی کا عمل دخل یہاں نہیں۔ چڑیاں کہاں جائیں، بلبل کہاں بولے، لوگوں کو تازہ ہوا کہاں سے دستیاب ہو، مقامی

حکومتوں کے ذمہ داران کو خوابِ خرگوش سے کون جگائے؟

پہلے بیان پڑھتے ہیں، بعد میں اس میں سے پوری کوشش کر کے امید کا تریاق کشید کریں گے۔ ”بین الصوبائی و زرائے تعلیم کا نفرنس کا بہت سالوں بعد آغاز کر دیا ہے، اب یہ کانفرنسز پورے ملک میں منعقد ہو گئی، ہم کسی بین الاقوامی ایجنڈے پر نہیں اپنے اہداف پر کام کر رہے ہیں، کوئی صوبہ اپنی حد تک نصاب میں کسی صوبائی شاعریا، ٹری شخصیت کو شامل کر سکتا ہے، مگر قومی سطح پر نصاب ایکٹ ہونا چاہیے، پنجاب تعلیم پر مختص کردہ بجٹ کا توے فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے، جبکہ دیگر صوبوں میں صورت حال مایوس کن ہے، اگر سرکاری سکولوں میں بہتر تعلیمی سہولیات فراہم کر دی جائیں تو ان میں طلباء کی تعداد بڑھائی جاسکتی ہے، گزشتہ ایک سال میں پانچ فیصد بچے نجی سکولوں سے سرکاری سکولوں میں داخل ہوئے، دو کروڑ سے زائد بچوں کا سکول سے باہر ہونا ہماری نیندیں اڑانے کے لئے کافی ہے، ہمارا ہدف ہے کہ کوئی ایک بچہ بھی سکول سے باہر نہیں رہنا چاہیے، بد قسمتی سے پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جو کہ تعلیم کی فراہمی کے اہداف کے لحاظ سے پسماندہ ترین سطح پر ہیں، پاکستان اپنے کل ڈی جی پی کا صرف دو فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے، جو کہ بہت افسوسناک ہے، ہم بہت جلد اس شرح کو بڑھائیں گے۔“۔ یہ بیان وزیر مملکت برائے تعلیم و تربیت انجینئر بلخ الرحمن کے خطاب

سے لیا گیا ہے، جو انہوں نے تعلیمی اہداف کی دو روزہ صوبائی کانفرنس سے کیا۔

پاکستان میں اگرچہ وفاق کی سطح پر تعلیم کا محکمہ نہ ہونے کے برابر ہے، اگر ہے بھی سہی تو اس کے پاس کوئی خاص اختیارات وغیرہ نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے لئے مکمل وزیر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اور وزیر مملکت سے ہی کام چلا لیا گیا ہے تاہم خود کو مصروف رکھنے کے لئے وزیر موصوف سیمینار وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر وزیر صاحب کے بیان پر غور کیا جائے تو اس میں کوئی بھی ایسا کام نہیں جس پر عمل کیا گیا ہو، یہ تمام باتیں حکمرانوں اور متعلقہ وزیر کی خواہشات بھی ہو سکتی ہیں، (خواہشات کا معاملہ بھی دل کے خوش رکھنے کے لئے بیان کیا جا رہا ہے، ورنہ ہمارے حکمران اپنی خواہش کو سب سے پہلے عملی جامہ پہناتے ہیں)۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی باتیں محض سیاسی بیانات ہی ہوتے ہیں، جو کہ عوام کو خوش یا مطمئن کرنے کے لئے ہوتے ہیں، اور عوام بھی اراہ عقیدت اپنے حکمرانوں کی باتوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ’قومی نصاب ایکٹ ہونا چاہیے‘، یہ حکومت کا بیان بھی ہے اور قومی سوچ رکھنے والے تمام پاکستانیوں کا بھی، بلکہ یہ اس بات پر یہ طبقے مکمل یکسو اور متحد و متفق ہیں کہ وفاقی وزارت تعلیم کو کسی بھی قیمت پر ختم نہیں ہونا چاہیے، اور اگر صوبائی خود مختاری کی آڑ میں تعلیم کو بھی تقسیم کر لیا تو پورے ملک کو متحد رکھنے والی کوئی چیز باقی نہیں بچے گی۔ مگر اس بات کا

اظہار کرنے کے باوجود موجودہ حکومت کو قائم ہوئے تین برس ہونے کو ہیں، کسی نے اس اہم ترین معاملے پر توجہ نہیں دی۔ اگر تعلیم کو دوبارہ مکمل وزارت کی صورت میں بحال نہیں کیا جاسکا تو چاروں صوبوں میں ایک نصاب کا وعدہ یا خواہش کا کیا ہوا؟ یہی کہ بہت جلد اس پر عمل ہو جائے گا؟

دو کروڑ سے زائد بچوں کا سکول سے باہر ہونا وزیر (یا حکومت) کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی ہے۔ اس جذبے کو بھی سیاسی بیان سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ جس بات سے انسان کی نیند اڑتی ہے، وہ اس کو اپنی اولین ترجیح بناتا ہے، دن رات اس کے لئے منصوبہ بندی کرتا ہے، سرکھپاتا اور وسائل اس میں جھونک دیتا ہے، بھلا کونسا گھر ہے، جہاں بچے بھوک اور پیاس سے مر رہے ہوں اور گھر کا سربراہ وہاں نیا موٹر سائیکل لا کر کھڑا کر دے۔ کسی کی والدہ بیمار ہو اور وہ اپنی جمع پونجی کسی اچھے ہوٹل پر کھانا کھانے میں لگا آئے۔ کسی کے تن پر کپڑے نہ ہوں اور وہ گھر میں اے سی لگالے۔ ظاہر ہے سب سے پہلے سب سے اہم کام کیا جاتا ہے، بھوک، بیماری اور دیگر سخت مجبوریوں پر پہلے خرچ کیا جاتا ہے، اگر دو کروڑ سے زائد بچوں کے سکول سے باہر ہونے سے حکمرانوں کی نیند اڑتی ہے، تو جناب ان بچوں کو سکول لا کر مزے کی نیند سوئیں، مگر تلخ حقیقت کا کیا کریں کہ خود وزیر کی زبانی ہم کل ڈی جی پی کا دو فیصد بھی تعلیم پر خرچ نہیں کر رہے، وزیر صاحب نے ان باتوں پر افسوس کا اظہار کر دیا

ہے، آئیے ہم بھی افسوس کر رہیں اور آرام کی نیند سوئیں۔

دُم پر پاؤں؟

آجکل سب سے اہم ایٹو جو اخبارات کی زینت بن رہا ہے وہ ”دُم پر پاؤں آنے“ کا ہے۔ مسلم لیگ ن، تحریک انصاف اور پیپلز پارٹی کے کسی نہ کسی لیڈر کا یہ بیان کسی نہ کسی شکل میں شائع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ محاورے کی بناوٹ سے ہی معلوم ہوتا ہے، کہ اگر آپ کسی کی دم پر پاؤں رکھیں گے، یا کسی کی دم پر پاؤں آجائے گا تو اس کے کیا جذبات ہونگے؟ دُم پر پاؤں آنے سے ظاہر ہے جانور کو تکلیف ہوتی ہے، اور پریشانی میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہونی چاہیے کہ جس جانور کی دم پر پاؤں آیا ہے، یا رکھا گیا ہے، وہ کس فطرت کا مالک ہے، اب اگر گائے یا بھینس کی دم پر پاؤں رکھا جائے گا تو ان کا رد عمل کیا ہوگا، اور اگر کسی کاٹنے والے جانور کی دم پر پاؤں آئے گا تو اس کے جذبات کیا ہوں گے؟ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی دم چھوٹی ہوتی ہے، ان پر پاؤں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، ان میں بھیڑ بکری یا اونٹ وغیرہ بھی شامل ہیں، یوں یہ جانور دم پر پاؤں آنے کے محاورے سے ہی مستثنا قرار پاتے ہیں۔ دم پر پاؤں آنے سے معصوم جانور کسی رد عمل کا اظہار نہیں کر سکتے اور بس بلبلا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دیہات میں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بعض اوقات کچھ بیل بیٹھ بھی جاتے ہیں، یہ ایک بیماری ہی تصور کی جاتی ہے، جن بیلوں کو بیٹھنے

کی عادت ہوتی ہے، ان میں یہ بڑی خرابی گئی جاتی ہے۔ ایسے بیل کو اٹھانے کے لئے عموماً اس کی دم پر ہی زور دیا جاتا ہے، بعض اوقات اس کو مروڑا جاتا ہے، اور بعض کسان تو اس بیل کی دم کو دانتوں سے کاٹتے (یعنی دباتے) بھی ہیں، جس کی تکلیف سے بیل پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تو اشرف المخلوقات بنایا ہے، مگر اپنی عادات سے مجبور ہو کر اس نے خود کو جانوروں سے تشبیہ دینے کی روایت قائم کر رکھی ہے۔ پاکستان کی اس وقت حکمران جماعت کا انتخابی نشان شیر ہے، شیر کو اس انداز میں ابھارا جاتا ہے، کہ کسی جلے یا تقریب میں باقاعدہ یہ نعرے لگائے جاتے ہیں کہ ”دیکھو دیکھو کون آیا؟ شیر آیا شیر آیا۔“ یوں ’شیر‘ سینہ تان کر تقریب میں خفیہ اور مخصوص دروازے سے داخل ہوتا ہے، ہاتھ کھڑا کر کے لوگوں کو نعروں کا فخریہ جواب دیتا ہے، پھر گرجتا، رستا بھی ہے، دھاڑ بھی لیتا ہے، نعروں اور تالیوں کی گونج میں واپس چلا جاتا ہے۔ الیکشن کے زمانے میں ان کے بعض امیدواروں نے اصلی شیر بھی کرائے وغیرہ پر حاصل کر لئے تھے۔ شیر کو بہادری کی علامت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جانوروں کی عادات کے مطابق یا ر لوگوں نے انسانوں کو بھی اسی نام سے پکارنے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ جس کو چاہا اسے گیدڑ بنا دیا، جس کے بارے میں خیال آیا اسے لومڑی قرار دے دیا، بلی بلی کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں، کئی اور چوپایوں یا دوسرے جانوروں کے

نام سے بھی لوگوں کو یاد کیا جاتا ہے، جس سے انسانیت کی تفحیک کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ بات جانوروں تک محدود نہیں، بہت سے پرندے بھی اچھے اور برے معانوں میں یاد کئے جاتے ہیں، کسی کو شاہین کہا جاتا ہے تو کسی کو گدھ سے ملا دیا جاتا ہے، کوئی بلبل ہے تو کوئی کوا۔

بات دُم پر پاؤں آنے سے شروع ہوئی تھی، اپنے سیاستدانوں نے اب شرفِ انسانیت کو خیر باد کہہ دیا ہے، فخریہ جانوروں کی صفات کو اپناتے اور دوسروں کو طعنہ دیتے ہیں، وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اشرف المخلوقات ہی نہیں بنایا، بلکہ انسانوں کی قیادت کا منصب بھی انہیں ودیعت فرمایا ہے، کیا ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے سیاستدانوں کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ ایک دوسرے کو جانور قرار دیں اور ان کی دُم پر پاؤں رکھ کر انہیں چیخنے چلانے پر مجبور کریں۔ اگر یہ مقابلہ جاری رہا تو اس میں حصہ لینے والے تمام سیاستدان ہی دُم والے ہونگے، جو ایک دوسرے کی دم پر پاؤں رکھیں گے اور اس کی بلبلاہٹ سے لطف اندوز ہونگے۔ قوم کا بھی اللہ ہی حافظ ہے کہ اس نے ایسے رہنما منتخب کئے ہیں، جو قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے، ملک کو خوشحال اور رفاہی ریاست بنانے، عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے، ملک سے کرپشن ختم کرنے کی بجائے جنگل کا ماحول بنا رہے ہیں، جہاں قانون بھی جس کی لائٹھی اس کی بھینس کا ہو اور جہاں رہتے بھی صرف جانور ہوں تاکہ ایک

دوسرے کی دم پر پاؤں رکھنے میں آسانی رہے

!.. قصہ واش روم کا

ملک اقبال چنڑ امداد باہمی کے صوبائی وزیر ہیں، ان کا تعلق بہاول پور سے ہے، وہ مسلسل تیسری مرتبہ الیکشن میں کامیابی سمیٹ چکے ہیں۔ ان کا شمار مسلم لیگ کے ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو میاں برادران کی جلاوطنی کے دور میں بھی ان کے وفادار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نہ صرف صوبائی وزارت سے نوازا جاتا ہے، بلکہ وہ الیکشن کے زمانے میں پارٹی سے امیدواروں کا انتخاب کرنے والی کمیٹی کا بھی حصہ ہوتے ہیں۔ مقامی طور پر ان کی بہت سی برادری بھی موجود ہے۔ گزشتہ روز انہوں نے کسی کام کے سلسلہ میں اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر قیصر مشتاق سے ملاقات کے لئے رابطہ کیا، معلوم ہوا کہ رئیس الجامعہ وفاقی دارالحکومت گئے ہوئے ہیں، واپسی پر ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ مقررہ وقت پر وزیر موصوف وائس چانسلر کے دفتر پہنچے تو ان کی کرسی خالی تھی، معلوم ہوا کہ وہ واش روم میں ہیں۔ ملک اقبال نے انتظار کیا، سیکنڈ منٹوں میں اور منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہونے لگے، تشویش میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہونے لگا۔ جب معاملہ طویل پکڑ گیا تو وزیر صاحب نے 15 پر اطلاع کروائی، تاکہ واش روم کا دروازہ کھولنے اور رئیس الجامعہ کو باہر نکلنے کی سہیل کی جائے۔ چونکہ معاملہ بہت ہی بڑے گریڈ کی حامل شخصیت کا تھا اس لئے پولیس کے بھی نسبتاً بہتر گریڈ والے افسر

آگئے، مگر دروازہ نہ کھلا۔ اس دوران یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس کے ہیڈز بھی وہاں موجود تھے۔ تشویش کی لہر تو مسلسل قائم رہی، تاہم دروازہ بزور بازو کھولنے کی منصوبہ بندی نہ ہو سکی۔

اس دوران صوبائی وزیر بھی وائس چانسلر کے دفتر میں ہی ان کے واش روم سے نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے حالات کی طوالت اور کسی حد تک کشیدگی کے پیش نظر ماحول کا رنگ بدلنے کے لئے نئی منصوبہ بندی کی اور وزیر کو اطلاع دی کہ وائس چانسلر صاحب بغداد الجدید (شہر سے باہر یونیورسٹی کے بڑے کیمپس) چلے گئے ہیں۔ یہ یونیورسٹی انتظامیہ کی اپنے سربراہ کی مشاورت کے بغیر ایک نہایت ہی مضحکہ خیز دلیل تھی، ملک صاحب وکیل بھی ہیں، دل ہی دل میں اس دلیل پر حیرت زدہ بھی ہوئے ہونگے۔ تاہم انہوں نے مزید کچھ دیر وائس چانسلر کے واش روم سے نکل آنے کا انتظار کیا اور ملاقات سے محرومی کا غم دل میں بسائے اور ہزار وسوسے آنکھوں میں سجائے گھر چلے گئے۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق وائس چانسلر مزید کچھ تاخیر کے بعد واش روم سے برآمد ہو گئے۔ ان کی واش روم میں موجودگی کا دورانیہ تین گھنٹوں سے زیادہ وقت پر محیط تھا۔ اس بات کی تحقیق و تصدیق نہیں ہو سکی، کہ وہ تنہا ہی برآمد ہوئے یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ان کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے موجود تھا، تاہم یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بیٹھ کے مانے ہوئے استاد ہیں، نہ جانے تنہائی

سے فائدہ اٹھا کر کوئی مسئلہ ہی حل کرنے بیٹھ گئے ہوں، یا کوئی نیا فارمولا ہی ایجاد کر رہے ہوں؟ یہ بات اگرچہ کچھ احباب مذاق سمجھتے ہیں یا کچھ لوگ مذاق میں یہی بات کہہ دیتے ہیں، مگر اس میں کسی حد تک حقیقت بھی ہے، بہت سے تخیلات کو اُس روم میں چلا ملتی ہے اور ذہن میں نئے تصورات سراٹھانے لگتے ہیں۔

یونیورسٹی انتظامیہ اپنا موقف آہستہ آہستہ ہی دے گی، تاہم کہا گیا ہے ملک اقبال نے کسی بات پر وائس چانسلر پر دباؤ ڈالا، انکار پر سیکڑوں کارکن اکٹھے کر لئے اور دفتر پر دھاوا بول دیا۔ بہت سی باتیں اور بھی سامنے آرہی ہیں تاہم تصدیق شدہ نہیں۔ قبل ازیں بھی وائس چانسلر نے بہاول پور کے لوگوں کا تقریباً سماجی مقاطعہ ہی کر رکھا ہے، وہ نہ کسی سے ملتے ہیں اور نہ ہی اس قسم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، ایک صوبائی وزیر کو لفٹ کروانے کا احوال قارئین نے جان لیا، ویسے تو اپنے وزراء وغیرہ میں بھی اتنا ہی دم ہے کہ افسر یا اداروں کے سربراہ ملاقات کا وقت دیں یا نہ انہی کی مرضی۔ ان منتخب نمائندوں اور بعد ازاں وزیر بن جانے والوں کی عزت افزائی کرنے والے افسروں وغیرہ کے پیچھے آخر کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟ اسلامیہ یونیورسٹی کے وی سی آفس میں ہونے والے اس افسوسناک ڈرامے میں آخر کس کی سُبکی ہوئی، کون بے عزت ہوا؟ گزشتہ دنوں یونیورسٹی نے کانووکیشن کیا تھا، مگر نہ مہمان (چانسلر

یونیورسٹی، گورنر) نے آنا مناسب جاننا اور نہ ہی میڈل موجود تھے۔ اگر وائس چانسلر
میں انتظامی صلاحیت نہیں ہے تو انہیں تدریس کے کام پر لگا دیا جائے تو بہتر ہے، تاکہ
ایک جامعہ تباہی سے محفوظ رہ سکے۔

ملک گیر مہم؟

بات پھر جگالی پر آ جاتی ہے، بنیادی طور پر تو یہ جانوروں کا کام تھا، اب جانوروں کی دیکھا دیکھی حضرت انسان نے بھی یہ شغل اپنا لیا ہے۔ صرف جگالی پر ہی کیا موقوف، انسان نے جانوروں جیسے بہت سے دیگر کام بھی شروع کر رکھے ہیں، حتیٰ کہ کئی کاموں میں جانوروں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ مگر کالم نگار کیا کرے، کہ معاشرے اور ماحول کے مزاج کے مطابق ہی تنخیل کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ جب پورا معاشرہ، حکومتیں اور دیگر طبقات اپنے اعمال کے لحاظ سے ہر روز جگالی کرتے ہیں، دس برس قبل کے اخبار اٹھا لیں، وہی خبریں، وہی کالم، ویسے ہی تجزیے۔ سب کچھ وہی، بس چہرے اور مقام تبدیل ہوتے ہیں۔ قوم کو بتایا جاتا ہے کہ ملک بھر میں دو کروڑ سے زائد بچے سکولوں سے باہر ہیں، یہ بھی سب کو علم ہے کہ ان میں سے تقریباً اسی لاکھ بچوں کا تعلق پنجاب سے ہے، یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ تعلیم حکومت کی اولین ترجیح ہے، کون نہیں جانتا حکومت کا کل ڈی جی پی کا دو فیصد بھی مشکل سے تعلیم پر خرچ ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ قوم کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حکومت سکولوں سے باہر تمام بچوں کو سکول لانے کا عزم کر چکی ہے۔ تاہم اس مرتبہ یہ عزم وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ یا کسی وزیر تعلیم نے نہیں دہرایا، اب کے یہ فریضہ منصوبہ بندی، ترقی و اصلاحات کے وفاقی وزیر جناب احسن اقبال

نے نبھانے کے اعلان کیا ہے۔

یکم اپریل سے تیس اپریل تک پرائمری کی عمر کے تمام بچوں کو سکول لانے کے لئے ملک گیر مہم کا فیصلہ کیا گیا ہے، وزیر موصوف نے ازراہ عقیدت اس مہم کی قیادت کا علم وزیراعظم اور صوبوں میں وزرائے اعلیٰ کے ہاتھ میں تھایا ہے۔ مہم میں ماہرین تعلیم، سول سوسائٹی، میڈیا، مقامی کمیونٹی اور سیاستدانوں کو شامل کیا جائے گا۔ تمام صوبائی حکومتوں اور ضلعی انتظامیہ کو 22 مارچ تک ہوم ورک مکمل کر لینے کی ہدایت کردی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اس مہم کے ذریعے ملک کو جہالت کے اندھیروں سے چھٹکارا دلایا جائے گا۔۔۔۔ حکومت اس ضمن میں کیا اقدامات کرتی ہے، یہ تو آنے والے چند روز میں ہی علم ہو سکے گا، مگر اس موقع پر سابق تجربات سے روشنی حاصل کرنا بھی حکومت کا فرض ہے، اگر صرف کاغذی کارروائی کرنا مقصود ہے، تو یہ عمل مستقل جاری ہے، حکومت نے ہمیشہ سب اچھا ہی کہا، اور قوم کو یہی بتایا کہ اب جہالت کی تاریکی کے بارے میں لوگ کتابوں میں ہی پڑھا کریں گے، کہ ایسا بھی کوئی زمانہ گزرا ہے، مگر عملی طور پر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس مہم میں وزرائے تعلیم کا کوئی کردار دکھائی نہیں دیتا۔

، سکول جانے کی عمر کے تمام بچوں کو سکول لانے کے لئے سروے کروائے جاتے ہیں

اساتذہ کو ذمہ داری سونپی جاتی ہے، کہ وہ گھر گھر جا کر بچوں کے والدین کو قائل کریں کہ وہ بچوں کو سکول بھیجیں۔ رکاوٹ کیا ہے، حکومت بھی جانتی ہے، بہت سے بچے ایسے ہیں جن کے والدین کے پاس وسائل ہی نہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم پر خرچ کریں، یا پھر وہ تعلیم کو اس قدر اہمیت ہی نہیں دیتے جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں۔ ذرا بڑی عمر کے بچے غریب والدین کے لئے کچھ نہ کچھ کما لاتے ہیں، کچھ محنت مزدوری کر کے اور کچھ بھیک مانگ کر۔ سکول سے باہر بچوں کو تلاش کرنا جوئے پیسہ لانے کا قصہ نہیں، نہ ہی اس کا عظیم کے لئے کسی فرہاد کی ضرورت ہے، شہروں کے مضافات میں ذرا جھانک کر دیکھئے تو ہزاروں بچے سکولوں سے باہر دکھائی دیں گے۔ کوئی چائلڈ لیبر کا شکار ہیں تو کوئی کام سیکھ رہے ہیں، کوئی گلیوں میں آوارہ پھر رہے ہیں تو کوئی جرم کی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ سرکاری سکولوں کے اساتذہ جھوٹے سچے نام لکھ کر اپنے افسروں کو خوش کر دیتے ہیں کہ ہم نے اتنے داخلے کر لئے۔ چونکہ داخلے جعلی ہوتے ہیں اس لئے سکول سے باہر بچوں کی تعداد میں کمی کے تصور میں بھی رنگ نہیں بھرا جاتا۔ حکومت کے پاس سکولوں کی کہانی بھی عجیب ہے کہ بہت سوں کے پاس نہ عمارت ہے نہ سہولتیں، یہ مہم چلا کر بچے داخل کہاں کئے جائیں گے؟ ہاں پنجاب حکومت کے پاس پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی صورت میں ایک کشش ضرور ہے، جس طرح حکومت بہت سے سرکاری سکول فاؤنڈیشن کو دے رہی ہے، اس سے اتنی لاکھ بچوں میں سے چند لاکھ مزید سکولوں میں آجائیں گے، تاہم یہاں حکومت کے

لئے بہتر ہے کہ وہ فاؤنڈیشن کو ایک خود مختار ادارہ ہی رہنے دے، سرکاری ادارہ نہ بنائے۔ اس مہم کی کامیابی کے لئے پوری قوم کو اس مہم کا سرگرم حصہ بنایا جانا بھی ضروری ہے۔

وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کے صاحبزادے حسین نواز بڑے عرصے کے بعد پاکستان تشریف لائے ہیں، چونکہ وہ پاکستان سے باہر کاروبار کرتے ہیں، اور ان کے والد اور چچا پاکستان میں حکمرانی کا طویل تجربہ رکھتے ہیں، اس لئے یار لوگ چھوٹے میاں صاحب کے بیرون ملک کاروبار پر انگلیاں اٹھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔ فطری طور پر یہی بحث منظر پر آئی ہے، کہ آخر باہر کی دنیا میں اربوں ڈالر کا کاروبار کیسے شروع ہوا؟ یہی الزام ہے، اور اسی کی بنا پر مناظرے کے چیلنج منظر عام پر آ رہے ہیں۔ فریقین کی طرف سے یہ چیلنج قبول بھی کیا جا رہا ہے، اس سب کچھ کے باوجود اس مناظرے کا انعقاد ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مناظرے کا منظر بھی عجیب ہوتا تھا، پہلے ایک دوسرے کو چیلنج کیا جاتا، منادی کروائی جاتی، وقت اور تاریخ مقرر ہوتی، اشتہار شائع ہوتے، تیاریاں مکمل ہوتیں۔ یہ مناظرہ مختلف مذاہب کے درمیان ہوتا تھا۔ معاملہ کس قدر مہذب تھا کہ مناظرے اور مخالفت کے باوجود حالات پر امن رہتے تھے۔ مذاہب سے فارغ ہوئے تو یہ کام علمائے کرام نے آپس میں شروع کر دیا، یعنی ایک فرقے کا دوسرے کے بارے میں نظریات کا اظہار۔ یہیں سے آپس میں لڑنے کی کہانی کا آغاز ہوا۔ یہیں سے مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملا۔ اس قسم کی مناظروں کی (مذہبی) اختلافی

رجحان رکھنے والے لوگوں میں بہت مقبولیت ہوتی تھی، ایک عرصے تک تیاریاں ہوتیں، اور بہت سے لوگ مقررہ مقام اور تاریخ کو جمع ہوتے، اور اپنے پہلوانوں کو لڑاتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، فتح یاب ہونے اور شکست کھانے والے اپنے اپنے حالات کے مطابق واپس چلے جاتے۔ اسی قسم کا ”مناظرہ“ کسی زمانے میں سٹیج پر گانے کا بھی ہوتا تھا، پنجاب کے دو بڑے لوگ گلوکار عالم لوہار اور عنایت حسین بھٹی فنکار ہوتے اور لوگ رات بھر ان کے گانے سنتے تھے، تاہم یہ لوگ آمنے سامنے نہیں بلکہ الگ الگ ڈیرہ جماتے تھے۔

اب دو سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کو مناظرے کا چیلنج دے کر دلچسپ صورت حال پیدا کر دی ہے۔ مگر یہاں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اگر حسین نواز نے عمران خان کو چیلنج دیا ہے کہ وہ ہمارے (میاں برادران کے) کاروبار کے بارے میں الزامات لگائیں، ان کا ثبوت دیں اور جواب حاصل کریں، اور اپنے اوپر لگنے والے الزامات کے جوابات بھی دیں۔ مگر عمران خان نے ایک جلسے میں خطاب کے دوران نیب کے سامنے یہ سوال اٹھایا ہے کہ وہ پنجاب کے ڈاکوؤں پر کب ہاتھ ڈالے گی، اور یہ بھی کہ پیسہ کس کی جیب میں جا رہا ہے، اس کا حساب نیب نے ہی لگانا ہے۔ نندی پور، میٹرو اور انج ٹرین کی بھی تحقیقات ہونی چاہیئیں، حسین نواز کے مناظرے کے جواب میں عمران خان کا کہنا ہے کہ وزیراعظم کا بیٹا تو مراد سعید کے ساتھ مناظرے کا بھی اہل نہیں۔ ہماری سیاست کی یہ ایک روایت ہے کہ

بڑے کے مقابلے میں کسی چھوٹے کو لایا جاتا ہے، جس کا سب سے اہم مقصد بڑے کو
 بے عزت کروانا ہوتا ہے۔ دیہات میں کسی وڈیرے نے کسی پڑھے لکھے یا مناسب
 آدمی کی مخالفت کرنی ہوتی تھی تو اس کے مقابلے میں کسی بہت ہی کمتر آدمی کو کھڑا
 کر دیا جاتا تھا (یہ روایت اب بھی قائم ہے) حکومتوں میں بھی یہ دیکھنے کو ملتا ہے، کہ
 کسی بھی بڑے سیاستدان کو جب بے عزت کروانا مقصود ہو تو اپنے ترجمانوں کی ذمہ
 داری لگا دی جاتی ہے کہ ان کا کوئی بھی بیان مخالفانہ تبصرے سے خالی نہ جانے پائے۔
 پنجاب کے دو اہم ترجمان مستقل یہی فریضہ نبھانے میں مصروف ہیں کہ عمران خان کے
 ہر بیان پر انہوں نے ہی جواب دینا ہے۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اپنا کام کرتے رہتے
 ہیں، مگر اُن کو ذاتی طور پر کوئی جواب نہیں ملتا۔ یہ کلچر ہر پارٹی میں موجود ہے، حفظ
 مراتب کا خیال کوئی نہیں رکھتا۔ اصولی طور پر اپنے ہمہ پلہ لوگوں سے ہی سینگ اڑانے
 چاہیے۔ خیر مناظرہ ہو یا نہ ہو، یقیناً ہوگا بھی نہیں، مگر عوام یہ جاننا چاہتے ہیں کہ
 حکمران خود تو سرتاپا مراعات کی دلدل میں غرق ہو چکے ہیں، ان کی اولادیں پاکستان
 میں رہنا یا یہاں کا روبرار کرنا بھی پسند نہیں کرتیں، ان کے پیسے کا حساب لگانے کی کسی
 کوجرات نہیں، یا یوں کہیے کہ اس حساب وغیرہ تک رسائی کسی کے بس کا روگٹ نہیں،
 تو ان کی لڑائی میں عوام کو کیا فائدہ ملے گا۔ حکمرانوں سمیت ہر سیاستدان خود کو دیانتدار
 اور ملک کا مخلص ہی ظاہر کرتا ہے، مگر یہ 'مخلص' لوگ اپنے مفلس عوام کی حالت پر
 کیوں توجہ نہیں دیتے، ایکٹ

!... منظرہ عوام اور حکمرانوں کا بھی ہو جائے

غریب خوشیاں منائیں، خوشی سے پھولے نہ سائیں، بھنگڑے ڈالیں، چاہیں تو اسی مستی میں لوٹ پوٹ بھی ہو سکتے ہیں، لوٹ پوٹ مٹی پر ہوں یا بستر پر، یہ ان کی صوابدید پر ہے۔ ان کے لئے خوشخبری ہے کہ حکومت پاکستان نے غریبوں کے بارے میں ایک انقلابی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے، یہ قدم پندرہ برس بعد اٹھایا جا رہا ہے۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان میں غربت کے بارے میں سروے کیا جائے، دیکھا جائے کہ پاکستان میں کتنے غریب ہیں۔ وزارت خزانہ کا کہنا ہے کہ یہ سروے بین الاقوامی معیار کا کروایا جائے گا۔ غربت کا معیار پرکھنے کے لئے دو چیزوں کا خیال رکھا جائے گا، اول، آمدنی۔ دوم، غذائیت۔ کہا جاتا ہے کہ گزشتہ سروے میں جو کوئی 2150 کیلہ نر روزانہ استعمال کرتا تھا، اسے غریب گنا جاتا تھا، اب 2350 کیلہ نر روزانہ استعمال کرنے والوں کو غریب تصور کیا جائے گا۔ دوسری طرف یہ بات بھی زیر غور ہے کہ ایک سے دو ڈالر روزانہ کمانے والوں کو غریب قرار دیا جائے گا۔ اس سروے کے بارے میں حتمی تاریخ وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف دیں گے۔ حکومت عوام کو غریبوں کے بارے میں عموماً کچھ نہ کچھ معلومات دیتی رہتی ہے

قوم کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پاکستان میں چالیس فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس لکیر کے بارے میں اندازہ نہیں کہ اس کا حساب کتاب کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم؟ خبر میں یہ تو بتایا گیا ہے کہ یہ سروے عالمی معیار کا ہوگا، گویا پاکستان کے غریب بھی خود نہ سہی کم از کم اپنے بارے میں ہونے والے سروے میں بین الاقوامی برادری کا حصہ بن سکیں گے، وہ بھی فخر کر سکیں گے کہ وہ عالمی دھارے میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس طرح پاکستانی حکمران بھی فخر سے کہہ سکیں گے کہ انہوں نے اپنے ملک کے غریبوں کا معیار زندگی بلند کر دیا ہے۔ تاہم خبر سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غربت کے بارے میں معلومات لے کر اور غریبوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر اور یہ جانچ کر کہ کونسا غریب غربت کے کس درجے پر ہے، حکومت کونسا قدم اٹھائے گی جس سے ان کی غربت دور ہو جائے گی، یا اس میں کمی واقع ہو جائے گی؟ ان کی آمدنی بڑھانے کے لئے کونسے اقدام کئے جائیں گے؟ ان کی کیلرےز کے لئے ان کے لئے کونسی غذا تجویز کی جائے گی؟ ان کا معیار زندگی مزید بلند کرنے کے لئے کونسا میگا پراجیکٹ شروع کیا جائے گا؟ یقیناً سب کچھ حکومت نے سوچ رکھا ہوگا، اسی لئے تو یہ سروے ہونے جا رہا ہے۔ پاکستان میں مردم شماری تو شاید نہ ہو سکے، مگر 'غریب شماری' ہی سہی۔

حکومت ملک میں غریب شماری ضرور کرے، اس کے لئے سوچے ہوئے منصوبوں پر عمل

بھی ضرور کرے، کیونکہ حکومت نے جو کرنا ہوتا ہے، وہ کر ہی گزرتی ہے، کیونکہ وہ اپنے فیصلوں کو ہی حرفِ آخر قرار دیتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر ”امیر شاری“ کا بھی فیصلہ کر لیا جائے تو غربت کو کچھ افاقہ ہو جائے گا۔ پاکستان میں ٹیکس دہندگان کے بارے میں بہت سے تبصرے ہوتے رہتے ہیں، بے شمار اہل ثروت ٹیکس ہی نہیں دیتے، وہ ٹیکس نیٹ ورک میں ہی شامل نہیں، وہ گوشوارے ہی نہیں بھرتے۔ ہمارے بہت سے معزز ارکان پارلیمنٹ بھی ٹیکس نہیں دیتے۔ حکومت دعوے کرتی اور دھمکیاں دیتی رہتی ہے، کہ یوں کر دیں گے ووں کر دیں گے، مگر ہوتا کچھ بھی نہیں۔ شاید حکومت ایسے لوگوں کو پکڑنا اور ان سے ٹیکس لینا ہی نہیں چاہتی، بس جو ہتھے چڑھ جائے اسی کو نچوڑنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ٹیکس دینے کے قابل کون ہے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے کسی سائنس کی ضرورت نہیں، گاڑیاں موجود ہیں، غریب خانے ہیں، کاروبار ہیں، اگر نہیں تو ٹیکس نہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ اگر ان لوگوں کو ٹیکس نیٹ میں نہیں لایا جاتا تو اس کے پیچھے کسی نہ کسی کا ہاتھ تو ہوگا؟ اور اگر حکومت ہمت کرے کہ امراء سے ٹیکس لے لے اور غریبوں کے لئے وسائل پیدا کرے تو مسئلے کا حل خود ہی نکل آئے گا۔ مگر ہوگا یہی کہ حکومت اول تو غریبوں کا شمار ہی نہیں کرے گی اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو ان کے لئے کوئی منصوبہ نہیں بنے گا۔ دوسری طرف امراء سے ٹیکس کا سلسلہ شروع نہیں ہو سکے گا، اگر یہ بھی ہو گیا تو بھی ٹیکس کی رقم غریبوں تک نہیں پہنچ پائے گی، کیونکہ حکمرانوں کو اپنی عیاشیوں کے لئے بے حد و حساب

دولت چاہیے۔ سادگی کے نعرے وہ لگاتے ہیں، مگر عمل کے لئے قوم کو مشورے دیتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود غریبوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، وہ خوش ہوں کہ حکومت اور اپوزیشن کی سیاست ان غریبوں کی وجہ سے ہی تو چمکتی ہے۔

! معاملہ مردوں کے کڑے پہننے کا

خواتین کو تحفظ دیئے جانے کے نئے بل پر ٹوٹو میس میں جاری ہے، عمل ہونا تو بعد کی بات ہے، معاملہ کسی حد تک مذاق کی نذر ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے تو مولانا فضل الرحمن نے ممبرانِ پنجاب اسمبلی کو مشورہ دیا کہ وہ گلے میں ”نرن مرید“ کا کارڈ لٹکا لیں۔ ابھی موصوف کے بیان کی بازگشت سنائی دے ہی رہی تھی کہ آزادی خواتین کے ہمنواؤں نے زورِ قلم آزمانا شروع کر دیا، ابھی ان کے دلائل جاری ہی تھے کہ رانا ثناء اللہ، جو کہ بل مذکور کے محرک ہیں، نے حسبِ روایت ایکٹ بیان داغا کہ عمران خان بھی اس قانون کی زد میں آ سکتے تھے اور انہیں بھی سزا پہنایا جاسکتا تھا، (گویا وہ خوش قسمت ٹھہرے کہ یہ نوبت نہیں آئی)۔ چوہدری شجاعت اور پرویز الہی نے بھی کچھ تاخیر سے ہی سہی یہ بیان جاری کر کے ثوابِ دارین حاصل کرنے کی کوشش کر لی ہے، اور وزیر اعلیٰ کے بارے میں یوں گویا ہوئے ہیں کہ ”شہباز شریف کو قانون بنانے سے قبل اتنا سوچ لینا چاہیے تھا کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں کڑے پڑ سکتے ہیں۔“

اُدھر شہباز شریف نے مولانا فضل الرحمن کو فون کر کے اس قانون میں ترمیم کا اشارہ دیا ہے، جواب میں مولانا صاحب نے بتایا ہے کہ بات شہباز شریف سے آگے بڑھ چکی ہے۔ تاہم وزیر اعلیٰ پنجاب نے کہا ہے کہ میں ”خادم“ ہوں مذہبی جماعتوں کو منا لوں گا۔

عام خاتون کی بات تو اور ہے، اپنے ہاں بیوی کے نام پر بھی بھرپور مذاق کیا جاتا ہے، بہت سے لکھنے والے ایسے ہیں، جو ہمیشہ خود کو 'جورو کا غلام' ہی ظاہر کرتے ہیں۔ ضمیر جعفری کا قول ہے کہ 'بیوی کی ہر بات سن لو، مگر مرضی اپنی کرو'۔ کرنل محمد خان ہوں یا ابن انشاء یا پھر مشتاق احمد یوسفی، مزاح نگاروں نے خود کو خاتون خانہ کے رعب میں ہی ظاہر کیا ہے، اس کا ذکر احترام سے کیا ہے، اس کے ہر حکم کی تعمیل کا اشارہ دیا ہے۔

یوں جاننے کہ اگر کوئی خود کو سب سے زیادہ رن مرید ظاہر کرتا ہے تو وہ ہمارا مزاح نگار ہے۔ اس سے ایکٹ باریکٹ نکتہ یہ بھی برآمد ہوتا ہے، کہ وہ لوگ جہاں لوگوں کو خوش کرنے کے لئے الفاظ کو مزاح میں ڈھالتے ہیں، وہاں وہ خود کو مذاق کے لئے پیش کر کے دوسروں کے مذاق کا نشانہ بھی بنتے ہیں، تاہم باریکٹ بین قاری ایسے مصنفین کی نکتہ آفرینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنے ہاں یہ روایت بھی پائی جاتی ہے کہ اگر کسی نے باتوں ہی باتوں میں خاتون خانہ کے حق میں کوئی بات کر دی تو یار لوگوں نے اس کے گلے میں رن مریدی کا طوق ڈالنے میں ایک لمحہ کی تاخیر سے بھی کام نہ لیا۔ جب بات مذاق میں نہ ہو رہی ہو تو عام حالات میں رن مریدی ایک بہت طعنہ ہے۔

عورت کے بنا تو کائنات ادھوری ہے، مگر ہم لوگ اس سے بہت حد تک امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ بعض لوگ اب بھی بیٹی کی پیدائش سے پریشان ہو جاتے ہیں، خاص طور پر جب صرف بیٹیاں ہی ہوں یا زیادہ

بیٹیاں ہو جائیں، تو گھر میں لڑائی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اگر خاندان زیادہ غریب ہو اور بد قسمتی سے جہالت کا عمل دخل بھی ہو تو یہی بیٹیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے رحمت قرار دیا ہے اور ان کی صحیح پرورش کرنے پر انہیں جنت کی نوید سنائی ہے، ان کی وجہ سے گھریلو لڑائی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ معاملہ خود کشی یا پھر علیحدگی وغیرہ تک پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے بد قسمت (بد بخت) لوگ بیٹیوں اور بہنوں کو ان کا وراثتی حق بھی نہیں دیتے، وہ دنیا کی لالچ میں نہ صرف اپنی بیٹی یا بہن کا حق مارتے ہیں اور اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔

مگر یہاں معاملہ کچھ گڑبڑ سا ہے۔ رانا ثناء اللہ کا اندازہ ہے کہ اگر یہ قانون ریحام بیگم کے ہوتے بن جاتا تو عمران خان کو کڑے پہننے پڑتے۔ اس میں کسی اور کا نہیں، رانا صاحب کا قصور ہے، وہ قانونی طریقے سے عمران خان کو قابو نہ کر سکے۔ مگر معاملہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ اب چوہدری پرویز الہی بھی میدان میں آگئے اور بتایا کہ شہباز شریف کو سوچ لینا چاہئے تھے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں کڑے پڑ سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب کی یہ بات قابل غور ہے، کیونکہ چوہدری صاحب میاں شہباز شریف کو بہت پرانا جانتے ہیں، بہت حد تک گھر کے بھیدی بھی ہیں، یقیناً شہباز شریف نے نئے حالات کو مد نظر رکھ کر ہی قانون بنوایا ہوگا، ورنہ اپنے پاؤں پر خود کون کلہاڑی مارتا ہے۔

! جدید اور ترقی یافتہ پاکستان

وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے ملک کو جدید اور ترقی یافتہ بنانے کی ترکیب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”خواتین کو نظر انداز کر کے جدید اور ترقی یافتہ ملک نہیں بن سکتے...“ آئی ٹی کے زمانے میں جبکہ دنیا ایک کلک پر سامنے آ جاتی ہے، ہم ملک کو جدید اور ترقی یافتہ بنانے کے فارمولے تلاش کر رہے ہیں، دانشور، اپوزیشن یا عوام وغیرہ جو بھی سوچیں وہ اپنی جگہ مگر دراصل وہی سوچ کام دیتی ہے، جو خود حکمران سوچتے ہیں، وہ زیادہ مشاورت کے قائل بھی نہیں، جو بات ان کے ذہن میں سما جائے وہ عمل کرنے کی ہر قیمت کو شش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیگر لوگ مخالفت کرتے رہ جاتے ہیں اور حکمران عمل کر گزرتے ہیں۔ ویسے جن لوگوں کی حکومت ہوتی ہے، اگر وہ بھی اپنی مرضی نہ کر سکیں تو حکومت کا کیا فائدہ؟ موجودہ حکومت چونکہ ملک کو ترقی یافتہ بنانے کی علمبردار ہے، جس کے لئے حکومت کی سب سے زیادہ توجہ سرکس بنانے، بسیں اور ٹرینیں چلانے پر ہے۔ اسی کو ترقی اور اسی کو جدت قرار دیا جا رہا ہے۔ تاہم اب پنجاب حکومت نے خواتین کو مزید باختیار بنانے اور ’محفوظ‘ رکھنے کے لئے قانون سازی کی تو ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ جس کے لئے تمام مذہبی جماعتوں نے اس قانون کو واپس لینے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں مولانا فضل الرحمن نے

وزیراعظم سے ملاقات کی تھی، اور حکومت نے اس میں ترمیم وغیرہ کا وعدہ بھی کیا ہے، مگر معاملہ کسی فیصلے کا منتظر ہے۔

میاں نواز شریف کا تازہ بیان پنجاب اسمبلی سے منظور ہونے والے بل اور اس پر مولانا فضل الرحمن کی ان سے ملاقات کے تناظر میں ہی محسوس ہوتا ہے۔ خواتین کو برابری کی سطح پر لانا حکومت کا خواب ہے، جس کے لئے اسمبلیوں سے لے کر ملازمت کے مواقع تک خواتین کے کوٹے مقرر کئے جا رہے ہیں۔ وزیراعظم نے خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے قائداعظم کا حوالہ بھی دیا ہے۔ تحریک پاکستان ہو یا قیام پاکستان خواتین کا کردار ہمیشہ نمایاں اور واضح رہا ہے۔ خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا اور پاکستان کا حصول ممکن ہو سکا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی خواتین کا کردار بہت نمایاں ہے، ایک طرف محترمہ فاطمہ جناح نے پاکستان کی صدارت کے لئے الیکشن لڑا تو دوسری طرف بے نظیر بھٹو دو مرتبہ پاکستان کی وزیراعظم بھی رہیں، یوں یہ کہنا بالکل بے جا ہے کہ پاکستان میں خواتین کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہت سے حلقوں سے خواتین باقاعدہ الیکشن لڑ کر منتخب ہوتی ہیں، اور وزارتوں کے قلمدان سنبھالتی ہیں۔ سابق دور میں قومی اسمبلی کی سپیکر بھی ایک خاتون تھیں۔ پاکستان سٹیٹ بینک کی گورنر بھی خاتون رہ چکی ہیں، دیگر بہت سے اداروں اور محکموں میں خواتین اہم فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ اب سابق حکومت سے کوئٹہ سسٹم میں اضافہ ہونے پر بہت سی

خواتین اسمبلیوں میں بھی پہنچ رہی ہیں، اور سرکاری اور نجی کاروباری اداروں میں بھی خواتین کی تعداد قابل ذکر ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود یہ کہنا بھی حقیقت پسندی نہیں کہ ہم خواتین کو نظر انداز کر کے جدید اور ترقی یافتہ ملک نہیں بن سکتے، جس ملک کی وزیراعظم یا سپیکر اسمبلی خاتون رہی ہو، وہاں خواتین کو نظر انداز کرنے کی بات درست نہیں، ویسے یہ بات بھی درست نہیں کہ صرف خواتین کو ترقی یافتہ بنا کر ہی ملک ترقی یافتہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے حکمران چونکہ مغرب کو دیکھتے ہیں کہ وہاں عورت اور مرد تمام معاملات اور معمولات زندگی میں برابر ہیں، آزاد ہیں، خود مختار ہیں، شاید یہی ترقی کا راز ہے، مگر اسی آزادی اور خود مختاری کا نتیجہ ہے کہ وہاں خاندانی نظام دم توڑ چکا ہے، وہاں رشتوں کا تقدس اور پہچان کا وجود نہیں، وہاں میاں گرل فرینڈ اور بیوی بوائے فرینڈ رکھنے میں آزاد ہیں۔ صرف اسی آزادی کو ترقی کہنا ہے تو الگ بات ہے، اگر حقیقی ترقی کا اندازہ لگانا ہے تو وہاں کے حکمرانوں اور لوگوں کی دیانتداری کا خیال بھی کریں، ان کی ایمانداری اور محنت کا اندازہ بھی لگائیں، صفائی نصف ایمان کا ہمیں بھی حکم ہے، مگر اپنے ہاں کیا عالم ہے؟ اخلاقیات بھی وہاں سے سیکھیں، تعلیم، صحت اور بنیادی ضرورتوں کی عوام تک رسائی کا خیال بھی کریں۔ ریاست کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچیں، سادگی اور بچت کا بھی کچھ حساب رکھیں، کرپشن

کے خاتمے کے بارے میں بھی کوئی اندازہ لگائیں۔ پروٹوکول کا موازنہ کریں، سرکاری
سطح پر عیاشیوں اور مراعات کا بھی تناسب رکھیں۔ ہم نے ان سے کچھ نہیں سیکھا، اگر سیکھا
ہے تو صرف یہ کہ خواتین کو آزادی دلائیں گے، باہر لائیں گے اور ترقی کی شاہراہ پر
گامزن ہو جائیں گے۔

پنجاب اسمبلی کے بارے میں ایک تحقیق سامنے آئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ الیکشن کے موقع پر منتخب ہونے والے ارکان میں سے 164 معزز ارکان ایسے ہیں جنہوں نے پونے تین برس میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایوان میں ادا نہیں کیا، نہ علاقے کے مسائل کی بات کی، نہ کسی سنگتے مسئلے پر کوئی تحریک جمع کروائی، نہ کسی اہم ایٹھ پر کوئی سوال کیا۔ بس خاموشی کو ہی اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، اور محض اپنی حاضری کے عوض خزانے پر بوجھ بنے رہے۔ جمہوریت میں عوام کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ بتائیں کہ ان کی ضرورتیں کونسی ہیں جو حکومت پورا کر سکتی ہے، اور ان کے کونسے حقوق ہیں جو انہیں ملنے چاہیئیں؟ ان تمام مسائل کے حل کے لئے الیکشن ہوتے اور ممبران منتخب ہوتے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ فلاں پارٹی کو ہی ووٹ دے، دباؤ وغیرہ کی روایت بہت کم جاگیر دارانہ نظام میں رہ گئی ہے، شہروں اور قصبات میں یہ وبا نہیں ہے، ویسے بھی ووٹ کی پرچی پر مہر لگاتے وقت کوئی دیکھ نہیں رہا ہوتا۔ گویا اس سلسلہ میں عوام آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں، بلکہ یہ الیکشن ہی کا موقع ہوتا ہے، جب عوام کو کچھ نخرہ وغیرہ کرنے کا موقع میسر آتا ہے، اس کے بعد تو یہ نمائندے اگلے الیکشن میں ہی دوبارہ دکھائی دیتے ہیں۔

اگر اتنے سارے نمائندوں نے اسمبلی میں کوئی کردار ہی ادا نہیں کیا، تو ان سے کوئی
 باز پرس ہوئی؟ باز پرس کرے بھی کون، خود وزیر اعلیٰ بھی سال بھر میں ایک دو مرتبہ
 ہی اسمبلی کو رونق بخشتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وزراء اور پارٹی کے ممبران اسمبلی کو زیادہ
 فکر نہیں ہوتی، وزیر اعلیٰ ہوں تو یہ لوگ بھی چہرہ دکھانے، نمبر ٹانگنے وہاں پہنچ جائیں۔
 اسمبلی میں پونے تین برس تک ایک لفظ بھی نہ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ ان صاحبان کو
 اپنے حلقے کے عوام کی کوئی پرواہ نہیں، دراصل یہاں کسی کو بھی کسی کی پرواہ نہیں۔ اگر
 وزیر اعلیٰ اسمبلی میں نہیں آتے اور ان کے معزز ممبران تین تین سال ایک لفظ بھی
 اسمبلی میں نہیں بولتے تو بھی عوام ناراض نہیں ہوتے، ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں
 ابھرتی، اگر ایسا ہوتا تو ووٹر آگے بڑھ کر ضرور اپنے نمائندے سے معلوم کرتے کہ
 جناب ہم نے آپ کو خاموشی کا روزہ رکھنے کا مینڈیٹ نہیں دیا تھا۔ جن حلقوں کے
 نمائندہ اسمبلی میں اپنے حلقے کے مسائل بیان کرتے، قانون سازی میں مشورے دیتے،
 کسی مسئلے کی تائید یا اس پر تنقید کرتے یا صوبے کی بہتری کے لئے منصوبہ بندی میں حصہ
 لیتے ہیں، ان کے حلقوں کے عوام کے سر بھی فخر سے بلند ہوتے ہیں۔
 معاملہ خاموشی پر ہی ختم نہیں ہوتا، اور یہ خاموشی صرف پنجاب اسمبلی میں ہی

نہیں ہے، قومی اسمبلی کے ارکان نے (حسب روایت) اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے مطالبہ پر ایک کر لیا ہے، یہ لوگ کہنے کو تو ایک دوسرے کے سخت مخالف ہوتے ہیں، ملکی اور عوامی مفاد میں بھی کم ہی اکٹھے ہوتے ہیں، مگر جب تنخواہوں میں اضافہ کی بات ہو تو آپس میں شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ایسی جذباتی ہم آہنگی اور کسی موقع پر دیکھنے میں نہیں آتی۔ قومی اسمبلی میں معزز ارکان نے شور مچایا کہ ہماری تنخواہیں بلوچستان اسمبلی کے ارکان کے برابر کی جائیں، ہم ساٹھ ستر ہزار روپے لیتے ہیں تو وہ لاکھوں روپے۔ ارکان نے بات سپیکر پر اور سپیکر نے وزارت خزانہ پر ڈال دی۔ بات سیکریٹری اسمبلی تک پہنچی تو سپیکر نے بتایا کہ ان کی تنخواہ تو مجھ سے بھی چار گنا زیادہ ہے۔ عوام کے لئے یہی معلومات کافی ہیں، کہ ہمارے ارکان کی تنخواہیں کتنی ہیں، اور بیوروکریسی کی کتنی؟ اور یہ بھی کہ یہ تمام لوگ نہایت خاموشی اور یکسوئی سے عوام کی خدمت میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں، عوام کی بہبود اور فلاح کے لئے منصوبہ سازی کرتے ہیں، تاہم اس ساری محنت میں یہ ضروری نہیں کہ وہ اسمبلی اجلاس میں بھی پہنچیں اور کورم پورا ہو سکے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پورے پانچ سال اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نکالیں، بس مراعات ہوں، تنخواہ ہو اور کچھ استحقاق و اختیارات، تاکہ الیکشن پر خرچ کئے جانے والے کروڑوں روپے پورے کئے جاسکیں۔ اپنی اسمبلیوں میں بہت سے ارکان ایسے ہیں جو ایوان میں تشریف ہی نہیں لاتے، مگر ان کی ”دیہاڑی“ بھی نہیں ماری جاتی، کیونکہ ملی بھگت

سے ان کی حاضری لگ جاتی ہے اور دیہاڑی مل جاتی ہے۔ قوم کی خیر ہے ان معزز
نمائندوں کی آمدنی میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔

ابھی قومی اسمبلی کے معزز ارکان کا تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ جاری ہی تھا، ابھی وہ اپنی تنخواہ بلوچستان کے ارکان اسمبلی کے برابر کروانے کے متنی تھے، ابھی وہ اپنی تنخواہیں جج صاحبان کے برابر کرانے کا مطالبہ کر رہے تھے، ابھی وہ اپنی تنخواہ کو سیکریٹریوں کے برابر کرنے کا مطالبہ دہرا رہے تھے کہ اسمبلی میں ایکٹ اور معاملہ پیش آگیا۔ دراصل اپنے معزز ارکان ہر اس فرد کے برابر تنخواہ کا مطالبہ جڑ دیتے ہیں، جو ان سے زیادہ تنخواہ لے رہا ہوتا ہے۔ اسے استحقاق کا نام دیا جاتا ہے، کیونکہ یہی لوگ پاکستان کے عوام کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں، یعنی ان کے لئے قانون سازی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، اس لحاظ سے ان کا رتبہ واقعی بہت بلند بنتا ہے۔ مگر جمہوریت کا حُسن یہی ہے کہ ان کے لئے انتخاب کے لئے کوئی خاص میرٹ نہیں ہوتا، بس وہ مطلوبہ حد تک تعلیم یافتہ ہو، کردار میں اگر کچھ جھول ہو تو اس پر بھی کام چل جاتا ہے، صلاحیتوں میں کچھ کمی بھی برداشت ہو جاتی ہے، بس پیسہ ہو، پارٹی ہو، برادری ہو۔ ان کا سب سے بڑا میرٹ عوام کے سامنے خود کو پیش کرنا اور ان سے ووٹوں کی درخواست کرنا ہوتا ہے۔ عوام نے جس پر نظر کرم کردی وہی ان کا قائد قرار پاتا ہے۔ اسمبلیاں بڑی باختیار ہوتی ہیں، وہ جس کا چاہیں حال احوال طلب کر سکتی ہیں، قومی اسمبلی میں گزشتہ

روز اپنے کرکٹ ہیروز کی آمدنی کی تفصیل پیش کی گئی۔ یہاں یہ سوال بھی سر اٹھاتا ہے کہ خود معزز ممبران کی آمدنی کے گوشوارے طلب کرتے کرتے متعلقہ حکام بے بس ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ بہت سے معززین کی رکنیت بھی معطل کرنی پڑتی ہے، رکنیت کا یہ تعطل کوئی اہمیت نہیں رکھتا، نہ اس سے آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے، نہ استحقاق کو کوئی ٹھیس پہنچتی ہے، نہ اختیارات میں خلل آتا ہے، نہ ان کی اہلیت پر کوئی حرف آتا ہے، حتیٰ کہ بعض ارکان تو معطلی کے ایام میں بھی اجلاس میں تشریف لے جاتے ہیں۔ قومی اسمبلی میں کرکٹ ہیروز کی آمدنی کا احوال واقعی بہت سے لوگوں کے لئے حیران کن ثابت ہوگا۔ اپنے کرکٹرز نے گزشتہ دو برس میں مجموعی طور پر 91 کروڑ روپے کمائے۔ ان میں حفیظ نے پہلا نمبر حاصل کیا، ان کی آمدنی ساڑھے سات کروڑ رہی، سرفراز چھ کروڑ تیس لاکھ، مصباح پانچ کروڑ تیس لاکھ، ظہر اور شہزاد پانچ پانچ کروڑ، آفریدی ساڑھے چار کروڑ، یونس، جنید، اجمل سوا چار کروڑ اور آگے سے آگے چل سو چل۔ ہمارے ارکان قومی اسمبلی نے یہ آمدنی دیکھ لی ہے، یقیناً بہت سے ارکان حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے ہونگے، بہت سوں کو پچھلے ہی اس آمدنی کا اندازہ ہوگا۔ اب کوئی بعید نہیں کہ اپنے معزز ارکان حکومت اور سپیکر سے یہ مطالبہ کر دیں کہ ان کی تنخواہ کرکٹرز کے برابر کی جائے، اگر اچھلنے کودنے اور کھیلنے سے اس قدر آمدنی ہو سکتی ہے، تو

رات دن

سر کھپا کر اور غور و فکر سے اپنی ذہنی توانائیاں جلا کر ملک کے لئے قانون بنانے والوں کی آمدنی تو اس بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ امید ہے اسی اجلاس میں ارکانِ اسمبلی اپنی تنخواہوں کے بارے میں نئی حکمتِ عملی تیار کریں گے۔ اگر اپنے کرکٹ چھ میچ ہار جانے کے بعد کوئی ایکٹِ دو جیت لیتے ہیں، تو وہ ہیرو ہی قرار پاتے ہیں، اگر ارکانِ اسمبلی بھی سال بھر میں فارغ رہنے کے بعد دو چار قانون سازیاں کر لیں تو کافی ہونی چاہیئیں۔

وزیرِ اعظم نے ارکانِ اسمبلی پر زور دیا ہے کہ وہ ملک و قوم کی خدمت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں، کیونکہ ہمارا مقصد عوام کی زندگیوں میں سماجی اور معاشی انصاف برپا کرنا اور جمہوریت کو استحکام دینا ہے، جہاں لوگوں کو مساوی مواقع میسر ہوں۔ وزیرِ اعظم نے یہ زور اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نہیں دیا، بلکہ چند ارکان کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو انہوں نے بات چیت میں یہ فرمودات جاری کئے۔ اب معزز ارکان کیا کریں، تنخواہیں ان غریب لوگوں کو بہت کم ملتی ہیں، کہ بہت سے لوگوں کی تنخواہ ان سے زیادہ ہے، اور کام سب سے زیادہ لیا جاتا ہے، عوام کی خدمت میں کوئی کسر تو یہ لوگ پہلے بھی اٹھا نہیں رکھتے، نہ ان کے پاس اختیارات ہیں، نہ فنڈز، نہ مناسب تنخواہ اور نہ ہی آرام کے مواقع۔ کرکٹ کے لئے اپنے ٹی وی توڑنے، جذبات میں بہت آگے تک چلے جانے اور سارے کام چھوڑ کر کرکٹ میچ کو زندگی موت کا مسئلہ بنانے والے عوام

اسپنے ہیروز کی آمدنی دیکھیں اور ملک کے حالات دیکھیں۔ دراصل یہ حکمرانوں کا ہی لائحہ
عمل ہے کہ اس کا فوکس میگا پراجیکٹس پر ہی ہے، ایک طرف کروڑوں اربوں اور
دوسری طرف بھوک اور صرف بیانات۔

گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ کوئی ایٹو ہی نہیں، مگر اپنے میڈیا اور عوام و خواص کی نجی محفلوں کو دیکھا جائے تو یہ اہم ترین معاملہ تھا، جس پر ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق تبصرے کر رہا ہے۔ سابق فوجی حکمران پرویز مشرف پاکستان سے باہر چلے گئے، ان پر کئی مقدمات قائم تھے، جن میں آئین سے غداری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ انہوں نے زیادہ تر عدالتوں سے حاضری سے استثنا حاصل کر رکھا تھا۔ ہمارے خیال میں ان کے پاکستان سے علاج کی غرض سے باہر چلے جانے کی خبر اہم اس لئے نہیں، کہ وہ حقیقی معنوں میں بیمار تھے ہی نہیں، کیونکہ جب وہ پاکستان سے روانہ ہوئے تو وہ نہایت اطمینان کے ساتھ گئے، پر سکون رہے، تکلیف کا احساس تک نہیں ہوا، دیئے جاتے ہی انہوں نے سگار سلگا کر اپنے سیاسی ساتھیوں سے میٹنگ کی، آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا، پاکستانی محبت کرنے والے عوام کو بتایا کہ وہ تندرست ہوتے ہی پاکستان لوٹ آئیں گے، وہ کس قسم کی تندرستی چاہتے ہیں، اس کا علم نہیں۔ ان کی باہر جانے کی خبر کی اہمیت اس لئے بھی نہیں کہ وہ پہلی مرتبہ نہیں گئے، اس سے قبل بھی وہ باہر رہ کر پیکر وغیرہ دے کر آمدنی کماتے رہے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ اندر رہیں یا باہر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہاں بھی وہ آزاد ہی تھے، ٹی وی چینلز پر چھپاتے تھے، بیان دیتے تھے،

ملاقاتیں کرتے تھے، یہی کچھ باہر جا کر بھی ہوگا تو ہونے دیں۔

مشرف کی اس روائی پر تقریباً تمام ہی سیاست دانوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، چونکہ یہ سیاسی معاملہ تھا اس لئے تمام سیاسی قائدین کا اس موقع پر بیان دینا بنتا تھا، خواہ انہیں سیاسی دکانداری چمکانے کا نام ہی دیا جائے۔ سب سے پہلا ہنگامہ بلاول زرداری نے برپا کرنے کی کوشش کی، کہ مشرف بے نظیر قتل کیس میں بھی ملوث تھا، گویا حکومت نے بے نظیر کے قاتل کو باہر جانے دیا، اسی تناظر میں پی پی احتجاج وغیرہ بھی کر رہی ہے۔ حکومت مختلف حیلے بہانے کر کے خاموشی اختیار کرنے کے موڈ میں ہے، شاید اس لئے بھی کہ اس کے پاس کوئی معقول جواب یا جواز بھی نہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ جواب دیئے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ چوہدری ثار علی خان نے بھی ظاہر زبان سے کاروائی کے چند جملے نکالے اور قوم کو آگاہ کیا کہ حکومت نے یہ اقدام عدالت کے فیصلے کی روشنی میں کیا ہے۔ حسب روایت پرویز مشرف کے (نصف) ہم نام پرویز رشید میدان میں اترے اور قوم کو بتایا کہ یہ واقعہ طویل عدالتی کاروائی کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا ہے، اس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ بھی اس فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ لگتا ہے کہ اب مشرف گئے۔ عمران خان نے اپنا حصہ ملائے ہوئے کہا کہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا۔ جماعت اسلامی کے امیر سراج الحق نے کہا ہے کہ

طاقتور ملزموں پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔ بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عبدالملک بلوچ نے ٹرائل کے بغیر مشرف کے باہر جانے پر تنقید کی ہے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ نے کہا ہے کہ ثابت ہو گیا کہ یہاں امیر کے لئے قانون اور ہے اور غریب کے لئے اور۔ قومی اسمبلی میں اپوزیشن نے بھی شدید احتجاج کرتے ہوئے کہا ہے کہ آئین کے آرٹیکل 6 پر عمل کرنے کے دعویدار خود ہی آمر کے سہولت کار بن گئے۔ رانا ثناء اللہ نے بھی اپنی عادت کے عین مطابق بیان دیا کہ اگر کسی عدالت نے وارنٹ جاری کئے تو مشرف کو انٹرپول کے ذریعے واپس لایا جائے گا۔

اس ضمن میں ایک اہم ترین بیان احمد رضا قصوری کا ہے، ان کا شمار مشرف کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مشرف حکومت سے ڈیل کر کے گئے ہیں، جس کی تفصیلات بہت جلد سامنے آجائیں گی۔ گویا حکومت کا یہ بیان کہ وہ عدالت کے فیصلے کی روشنی میں باہر گئے ہیں، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ سب لوگوں کے بیان اپنے اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق ہیں، اگر پی پی اب احتجاج کر رہی ہے تو اس نے اپنے دور میں مشرف پر مقدمات کو انجام تک کیوں نہیں پہنچایا، گارڈ آف آنر دیتے ہوئے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ رہی مسلم لیگ ن تو اقتدار کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی، اور نہ ہی اپنے لئے حالات خراب کرنا چاہتی ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا، ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، یہاں قانون طاقتور

کے ہاتھ کی پھڑکی ہے، وہ جب چاہے، چاہے، چاہے گھما دے

کسان سے زیادہ وقت کی پابندی اور بروقت کام کرنے کا تصور دوسرے شعبوں میں بہت ہی کم ہے۔ موسم کی شدتوں سے لڑتا، راتوں کو جاگتا، دنوں کی گرمی برداشت کرتا کسان اپنی کھیتی اور فصل کی دیکھ بھال کے لئے ہر وقت چوکنا رہتا ہے، پانی کی باری ہے تو راتوں کی نیند قربان کر دیتا ہے۔ جب اس کی فصل تیار ہوتی ہے تو اس کی محنت کا صلہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہلہا رہا ہوتا ہے، خوبصورت فصلوں کی صورت میں اس کے خواب سامنے تاحد نگاہ نظر آتے ہیں، پھر وہ خواب سمیٹتا اور فصل برداشت کرتا ہے، اسی پر اس کی ترقی کا دار و مدار ہے، اسی پر اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کو جاری رکھنا ہے، اسی فصل پر اپنی بچی کی شادی کرنا ہے، اسی پر دیگر اخراجات کا بندوبست کرنا ہے۔

کسان جب اپنی فصل کے تیار ہونے پر آنکھوں میں خواب سجا لیتا ہے تو اسے دو قسم کے دھڑکے ستاتے اور اس کی نیندیں اڑاتے رہتے ہیں، اول؛ موسم، کہ جس کی شدت بھی فصل کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے، اگر بارش بروقت ہو جائے تو فصل کے لئے سونا اور بے وقت بارش فصل کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دوم؛ فصل کی قیمت، جو کہ موسم اور قسمت پر نہیں، حکومت کی پالیسیوں پر منحصر ہوتی ہے۔

عموماً ہوتا یہی ہے کہ کسان کو اس کی مرضی کی بات تو دور کی ہے، اس کی ضرورت کی قیمت بھی نہیں ملتی، فصل پر اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگایا جائے تو وہ فصل کی قیمت سے بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ یوں کسان ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ کسانوں کا ایکٹ، ٹرامنڈلہ یہ بھی ہے کہ ان کی کوئی یونین نہیں، وہ آپس میں متحد نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز اقتدار کے ایوانوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ تاہم اب کسانوں کو اپنے مطالبات منوانے کا ڈھنگ آ رہا ہے، اب وہ بھی ریلیاں نکالنے لگے ہیں، انہیں بھی دھرنوں کا سلیقہ آنے لگا ہے، وہ بھی سیمینار منعقد کرنے لگ گئے ہیں۔ کسانوں کی انہی کوششوں کے پیش نظر چند ماہ قبل وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے کسانوں کے لئے ایکٹ، ٹرامنڈلہ کا اعلان کیا تھا، جس میں چھوٹے کسانوں کو امداد دینے کے ساتھ کھادوں وغیرہ کی قیمتوں میں کمی کا اعلان بھی شامل تھا۔ کہنے کو تو یہ اربوں روپے کا ٹیکج تھا، مگر اونٹ کے منہ میں زیر اہی ثابت ہوا۔

اب وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے بھی ایک زرعی کانفرنس میں کسانوں کے لئے سوارب روپے کے ٹیکج کا اعلان کیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ ”... زرعی کانفرنس ایک روایتی کنونشن نہیں ہے، بلکہ ایک سنجیدہ فورم ہے۔ جس نے زراعت کی ترقی اور فروغ کے لئے ٹھوس لائحہ عمل طے کرنا ہے۔ زمین زرخیز اور کسان جفاکش ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم آج بھی زراعت کے شعبے میں پیچھے ہیں، اور اسے صحیح معانوں میں ترقی دینے میں ناکام ہیں، کبھی کپاس کی پیداوار میں

پاکستان بھارت سے آگے تھا، باسستی چاول کی مارکیٹ پر پاکستان کی اجارہ داری تھی،
 پاکستان دنیا کا چوتھا دودھ پیدا کرنے والا ملک ہے، لائیو سٹاک کے حوالے سے شاید
 پاکستان دسواں بڑا ملک ہے، لیکن آج ہم پیچھے جا چکے ہیں، پوری دنیا میں درخت لگانا
 صنعت بن چکی ہے، ہمارے ہاں جنگل ختم ہو رہے ہیں، ہمیں اس اہم کانفرنس کے ذریعے
 ان سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے۔ کاشتکار دن رات محنت کر رہا ہے، لیکن فی ایکڑ پیدا
 وار میں اضافہ نہیں ہوا، ریسرچ ادارے اپنا مطلوبہ کام نہیں کر رہے، جس کے باعث
 کاشتکاروں کو مشورے دینے کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ زرعی منصوبہ سازوں، حکومت،
 زرعی تحقیقاتی اداروں اور یونیورسٹیوں کو مل کر اپنا کردار ادا کرنا ہے، ہم نے گنے کے
 کاشتکاروں کے مفاد کا تحفظ کیا اور انہیں ایکٹ سوا سی روپے فی من کے حساب سے گنے کی
 قیمت کی ادائیگی یقینی بنائی۔ زراعت کی ترقی اور چھوٹے کسانوں کی خوشحالی کے لئے کم
 نرخوں پر زرعی لوازمات کی فراہمی بھی ضروری ہے، چھوٹے کاشتکاروں کو جدید
 ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنا ہوگا، کہ وہ پیداوار میں کس طرح اضافہ کر سکیں۔ کاشتکاروں
 کی فلاح و بہبود اور خوشحالی ہمارا ایجنڈا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ تمام باتیں اگر کسی اپوزیشن لیڈر یا
 کسی کسان رہنما نے کی ہوتیں تو اور بات تھی، خود وزیر اعلیٰ کی زبان سے عجیب لگتی
 ہیں۔ خود حکمران ہی اپنی زراعت اور دیگر معاملات کے زوال پر اظہار افسوس کریں تو
 ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟ کسانوں کو سستی بجلی، سستی کھاد درکار ہے، ان کی فصلوں
 کو مناسب قیمت پر خریدنے کی

ضرورت ہے، ورنہ یہ رہنمائی گمراہ ہو گئی تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا محال ہو جائے گا۔

پون صدی اُدھر کا قصہ ہے، لاہور کے منٹو پارک میں مسلمانانِ ہند کا ایک اجتماع ہوا، انگلہزوں سے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، اگرچہ اس آزادی کے خواہشمند ہندو بھی تھے، مگر مسلمان ذرا مختلف قسم کی آزادی چاہتے تھے، یعنی صرف انگلہزوں سے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں سے بھی آزاد ہونا چاہتے تھے، اس کے لئے انہوں نے الگ وطن کا مطالبہ بھی کر رکھا تھا، جس کی بنیاد مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما علامہ اقبالؒ نے دس برس قبل رکھ دی تھی، اس میں نظریہ بھی بتا دیا تھا، تقسیم کی وجہ بھی اور اس الگ ملک میں شامل ہونے والے علاقے بھی۔ اس اجتماع میں الگ وطن کے مطالبے پر مبنی ایک قرار داد بھی منظور کی گئی، جسے بعد میں قرار دادِ پاکستان کا نام دیا گیا۔ اسی قرار داد کو بنیاد بنا کر مسلمانوں نے نئے جوش و جذبے سے قیامِ پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا، اور محض سات برس میں قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ کہا گیا کہ دنیا کا یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے۔

مسلمانوں نے خود تحریک چلائی تھی، اس لئے وہ ذہنی طور پر ہجرت کے لئے تیار

تھے۔ ہجرت ایک مشکل ترین کام ہے، جس میں انسان اپنی کل کائنات، گھر بار، جمع پونجی، کاروبار، کھیت کھلیان، مویشی اور ہر قسم کی جائیداد چھوڑ کر اجنبی راہوں کا مسافر بننا پڑتا ہے، منزل کیا ہوگی، گھر کیسا ہوگا، سامان زیست دستیاب ہوگا یا نہیں، روزگار کیا ہوگا، زندگی کی گاڑی کو کیسے چلایا جائے گا؟ کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ آنے والا وقت کیسا ہے؟ یہی ہوا، یہاں ہر چیز چھوڑ جانے کا غم تو الگ تھا، مگر مشرقی پنجاب کے سکھوں کے ہاتھوں قتل و غارت گری کا جو بازار گرم ہوا، اس منظر کو مسلمانوں نے کسی خوفناک خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، خون کی روشنائی سے نہ جانے کتنی کہانیاں لکھی گئیں، دردناک انجام کتنوں کے نصیب میں ہوا، اور کتنے جان اور آبرو بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے؟ یہاں آ کر بھی حالات مہاجرین کے ہاتھ میں نہ تھے، بے سروسامانی نے کمر توڑ کر رکھ دی تھی، نہ سرکاری وسائل تھے اور نہ ہی ذاتی طور پر کسی کی پوزیشن ایسی مستحکم تھی کہ وہ اپنی زندگی کو کسی مناسب ڈگر پر چلا سکے۔ اگر کچھ حالات بہتر تھے تو ان لوگوں کے جو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ پھر وہاں سے آنے والوں میں سے بھی چالاک اور عیار لوگوں نے جائیدادیں اپنے نام کر والیں، بہت سے جعلی کلیم کروائے، وہاں جس کا چھوٹا سا کاروبار تھا، یا وہ مناسب زمیندار تھا تو یہاں دونوں کی قسمت بدل گئی، امیر غریب ہو گئے اور غریب امیر بن گئے۔

یہ بہت بڑی معاشرتی تبدیلی تھی، کہ لوگوں کو صدیوں سے آباد علاقوں سے اٹھ کر اجنبی شہروں اور دیہات میں آباد ہونا پڑا، اور وہ بھی اس صورت میں کہ بہت سے لوگوں کی اصل حالت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی، کوئی اپنا سارا مال و دولت پیچھے چھوڑ آیا، تو کوئی اپنے پیاروں کے خون سے نئی مملکتِ خداداد کی بنیادوں کو پہنچ آیا، اور کسی کی آبرو وہاں رہ گئی اور وہ زندہ لاش کی صورت میں پاکستان آ گیا۔ یہ تبدیلیاں معمولی نہ تھیں، ان سے نسلوں پر اثرات مرتب ہوئے۔ بات یہاں بھی ختم نہ ہوئی، سرکاری دفاتر میں اثر و رسوخ رکھنے والے بہت سے اہلکاروں نے بھی اپنا کام دکھایا اور اپنی مالی حالت بہتر کرنے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد ایک ظلم کا نیا دور شروع ہوا، اپنے حکمرانوں نے اقربا پروری، لوٹ مار، کرپشن، مراعات، پروٹوکول اور عیاشیوں کا جو سلسلہ شروع کیا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، اور اب اس میں حد سے زیادہ شدت آچکی ہے۔ محکموں میں کرپشن لازم و ملزوم ہو چکی ہے، کمیشن کا کلچر اس قدر فروغ پذیر ہو چکا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں کمیشن ہی وہ واحد کام ہے جو نہایت دیانتداری سے ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ امن کا معاملہ اپنی جگہ، یہاں سکون بھی کم ہی میسر ہے۔ سب اچھا کہنا، تعمیر و ترقی کو عوام کی خوشحالی کہنا بجا نہیں، کیونکہ دولت چند ہاتھوں میں آچکی ہے اور غربت کی لکیر سے نیچے بسنے والے، یا روز مرنے اور روز جینے والے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ کبھی تو 23 مارچ ایسا بھی آئے کہ ہم

”اس روز کو ”یومِ تجدید

کے طور پر منائیں اور ایک نئی قرار داد منظور کریں، جس میں حکمران کرپشن، عیاشیاں
چھوڑنے اور قوم کو تعلیم، صحت سمیت بنیادی سہولیات بہم پہنچانے اور عوام دیانتداری
سے محنت کرنے، تہذیب اور سلیقہ مندی سیکھنے اور دوسروں کو برداشت کرنے کا اقرار
کریں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

! امتحان میں جعل سازی

ملتان کے مسلم لیگی ممبر پنجاب اسمبلی رانا محمود الحسن کا بیٹا عبداللہ محمود نے جماعت نہم کا امتحان دے رہا تھا، بیالوجی کا پرچہ اسے کچھ مشکل محسوس ہوا، تو اس نے اپنے کسی ساتھی کی خدمات حاصل کیں، یوں علی وارث نے اصل امیدوار کی جگہ پر بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کیا، یہ کہانی الگ ہے کہ اس کاروائی کے سہولت کاروں کو کوئی پوچھے گا یا نہیں؟ معاملات کو مشکوک پا کر سپرنٹنڈنٹ امتحان کے سوالات کے جوابات درست نہ مل سکے، شک یقین میں بدل گیا۔ صاحب نے ملزم کو پکڑ کر حوالہ پولیس کر دیا۔ جب میڈیا نے لوگوں نے بورڈ کے متعلقہ افسران سے رابطہ کیا تو فون بند پائے گئے۔ تاہم ذرائع یہ خبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ بورڈ افسران پر دباؤ شروع ہے، اور دباؤ ڈالنے والوں کی فہرست طویل ہوتی جا رہی ہے، جن میں دو وفاقی اور دو صوبائی وزراء کے نام شامل ہو چکے تھے، مقامی طور پر تو اور بھی بہت سے لوگ ہونگے۔ تاہم عدالت نے جعل سازی کا اتکاب کرنے والے ملزم کو جیل روانہ کرتے ہوئے پولیس سے اصل ریکارڈ طلب کیا ہے۔ کیونکہ عدالت کو درخواست دی گئی تھی کہ ملزم بے قصور ہے، اس کو بے گناہ قرار دیا جائے۔

یار لوگ ناراضی کا اظہار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ کیا ہوا، ایک بچے سے چھوٹی

سی غلطی ہو گئی، اسے اچھالنے کی کیا ضرورت ہے، اور ویسے بھی ایک معمولی غلطی کسی ایک بچے سے ہوئی ہے، پوری حکومتی مشینری یا حکمران سیاسی جماعت تو اس میں ملوث نہیں؟ درست ہی کہتے ہیں، بات چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتی ہے، اور بگڑتے بگڑتے بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے، معمولی چوری اور معمولی بد تمیزی ڈاکو اور بد معاش بنادیتی ہے، پہلی ہی گیند پر کوئی چھکا نہیں لگاتا۔ جس بچے کی جگہ پرچہ حل کیا جا رہا تھا وہ خاندانی سیاستدان ہیں، امیدوار کے والد صاحب پنجاب اسمبلی کے معزز ممبر ہیں اور انہوں نے نہایت معقول سیاسی بیان جاری کیا ہے، فرمایا، ”.. عبداللہ کا فعل خاندان کے لئے بدنامی کا سبب بنا، یہ اس کا ذاتی فعل تھا، اس کی اسے سزا ملنی چاہیے، ہم نے ہمیشہ قانون اور ضابطے کو مد نظر رکھا ہے..“۔ اگر اس بیان کے بعد بھی کسی کو یہ شک رہ جاتا ہے کہ اپنے ممبران اسمبلی قانون کی پاسداری نہیں کرتے تو یہ شک زیادتی اور ظلم ہے۔ اب ہم سب کو عوامی نمائندے کی بات پر یقین کر لینا چاہیے، کیونکہ لاکھوں لوگوں کا نمائندہ سرسر میڈیا جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔ مگر کیا کیجئے کہ اپنے ایم پی اے صاحب تو اپنے بچے کو قانون کے مطابق سزا دلوانے کے لئے تیار ہیں، مگر ان کے ساتھی اس بات کو برا جانتے ہیں کہ اگر ایک حکومتی ممبر اسمبلی کے بچے کو بھی سزا ہو گئی تو ہمارا حکومت میں رہنے کا کیا فائدہ؟ بھینسیں بھینسوں کی بہنیں ہوتی ہیں، واقعی اگر رانا صاحب نے کسی سے بھی نہیں کہا تو بھی ان کے ساتھیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیٹی بھائی کا مسئلہ

حل کروائیں۔ ورنہ دوستوں کی محفل میں رانا صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دوستوں کو خود خیال کرنا چاہیے، اب میں خود جا کر ان سے کہتا پھروں؟ اسی فارمولے کے تحت ان کے دوست ان کی مدد کو آٹکے ہیں، دیکھیں کوششیں کیا رنگ دکھاتی ہیں۔

پرچہ حل کرنے والے کو تو جیل بھیج دیا گیا، مگر جس کا پرچہ تھا، یعنی جو اصل ملزم تھا، اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوتا ہے، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اپنے ہاں یہ عام روایت ہے کہ طاقت ور کے لئے الگ قانون ہوتا ہے اور کمزور کے لئے الگ۔ حکمرانوں کے دعووں کو ایک طرف رکھ کر اندازہ لگایا جائے تو ایسی بہت سی مثالیں آئے روز سامنے آتی رہتی ہیں۔ تازہ مثال پرویز مشرف کے باہر جانے کی ہے، اس سے قبل چھوٹی اور عام مثالیں تو بہت ہیں، بگڑے امیر زادے اگر کسی کو قتل بھی کر دیتے ہیں تو اس کے لئے بھی تناویلیں تلاش کر لی جاتی ہیں، مقتول پارٹیاں اپنے پیارے کی جدائی کو حکم خداوندی تصور کر کے برداشت کر لیتے ہیں۔ دراصل ہوتا تو دباؤ ہے، مگر زبان سے ظاہر نہیں کیا جاتا، زبانِ حال سے سب عیاں ہو جاتا ہے۔ متعلقہ سپرنٹنڈنٹ کی ہمت کی بھی داد دینی چاہیے، غری بات یہ ہے کہ ابھی تک سپرنٹنڈنٹ پر سختی نہیں آئی۔ خیر جو بھی ہوا، یا جو بھی ہونے والا ہے، ہوگا وہی جو عام روایت ہے، معاملات پر مٹی ڈال دی جائے گی۔ اسی طرح امیروں کے بچے جعلی طریقے سے اچھے نمبر حاصل کرتے

رہیں گے اور قوم کے سر پر مسلط ہوتے رہیں گے۔ جعلی امتحان، جعلی قیادت، قوم کا اللہ

حافظ۔

! پاکستان میں اقلیت

بلاول زرداری نے، جنہیں ان کی خواہش پر بھٹو بھی لکھا اور بولا جاتا ہے، ہندو برادری کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”.. بھارت میں ایک مسلمان کو صدر بنایا جاسکتا ہے تو پاکستان میں اقلیتی نمائندے کو کیوں اعلیٰ عہدہ نہیں دیا جاسکتا.. ہم پاکستان میں یکساں قانون نافذ کریں گے... مذہب کی زبردستی تبدیلی کو روکنا بہت ضروری ہے... مشرف اور بے نظیر کے لئے الگ الگ پاکستان نہیں بنایا جاسکتا، دونوں کو ایک ہی پاکستان میں رہنا ہے...“۔ بلاول زرداری پاکستان پیپلز پارٹی کے لئے امید کی آخری کرن کی حیثیت رکھتے ہیں، جب سے پارٹی زوال پذیر ہوئی ہے، تب سے قوم کو یہی بتایا جاتا ہے، کہ بس بلاول کے آنے پر انقلاب آجائے گا۔ موصوف کبھی باہر جاتے ہیں تو ان کی واپسی پر بھی قوم کو بھرپور سیاسی تبدیلی کی نوید سنائی جاتی ہے۔ اب آنے والے دنوں میں ان کو جنوبی پنجاب میں جلسہ ہونے کو ہے، جو کہ محروم احمد محمود رحیم یار خان میں منعقد کرنے جارہے ہیں، بتایا جا رہا ہے کہ جنوبی پنجاب میں سیاسی حالات کی کایا پلٹ جائے گی، اور پی پی پی ہی خطے کا مستقبل ہے۔ یہ سب کاروائیاں سیاست کا حصہ ہیں، قوم کو امید اور توقع پر رکھا جاتا ہے، مایوسی سیاست میں گناہ کبیرہ کا درجہ رکھتی ہے۔ بلاول زرداری نے بھی اپنی پارٹی اور موجود رہنماؤں

کی توقع پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ وہ جلسوں میں بالکل عوامی انداز میں تقریر کرتے ہیں، اپنی والدہ ماجدہ کے اندازِ خطابت کو اپناتے اور اپنے جیالوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔ عوامی جذبات کو ابھارنے کے ہنر آزماتے ہیں۔ ان کے خطاب سے یہ اندازہ کم ہی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ باہر کی دنیا سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں، یا وہ دنیا کی تہذیب اور آداب سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مقامی سیاست کی طرح دوسروں کو لکارنے اور ان کے اٹلے سیدھے نام لے کر ہی اپنے کارکنوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ پارٹی کے لوگوں کے مزاج کو تبدیل کرنے کی بجائے، انہیں وقت کے ساتھ ڈھالنے کی بجائے، خود ان کے انداز میں ڈھل چکے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے نوجوان چیئرمین کا تارہ بیان ان کے اپنے نظریات پر بھی مبنی ہے اور ان کی پارٹی کی ترجمانی بھی۔ پاکستان کے کسی بھی سیاسی، سماجی حتیٰ کہ مذہبی رہنماؤں میں سے بھی کسی کو اقلیتوں کو برسرِ کے انسان سمجھنے میں اعتراض نہیں، بلکہ اسلام میں اقلیتوں کے حقوق ہر کسی سے زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان لیڈر اقلیتوں کے حقوق کی علمبرداری کے ساتھ ان کے مذہبی تمواروں میں بھی شرکت کرتے رہتے ہیں، چند ماہ قبل وزیراعظم پاکستان نے بھی ہندوؤں کے ایک تموار دیوالی پر خود پر رنگ پھینکنے کا مطالبہ کیا تھا، مگر انہیں علم نہیں تھا، یا پھر یاد نہیں تھا کہ رنگ ہولی پر پھینکے جاتے ہیں،

دیوالی پر نہیں۔ مسیحی برادری کے مذہبی تہواروں میں مذہبی رہنما خیر سگالی کے جذبے کے تحت جاتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں زبردستی مذہب کی تبدیلی کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے بلاول صاحب کو اس قدر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی کسی کو زبردستی مذہب تبدیل کرانے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے لئے یقیناً پہلے سے قانون موجود ہے، عمل کروانے والا چاہیے۔

مارچ کو تو نظریہ پاکستان کا مہینہ قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ 23 مارچ کو یہی قرار داد منظور کی گئی تھی، کہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن حاصل کیا جائے گا۔ پاکستان واحد ملک ہے جو ایکٹ الگ اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ پھر اس کا آئین بنا بنتے بگڑتے آخر 1973ء میں معرض وجود میں آنے والا آئین ہی حتمی قرار پایا، اگرچہ وہ ترامیم کی دو درجنیں پوری کرنے کو ہے، مگر اس کی اصل وہی ہے۔ اب بلاول نے اپنے نانا کے اس کارنامے پر پانی پھیرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو وہ خود اپنی سیاست کا راستہ تیار کر لیں۔ ویسے بھی بے شمار اعلیٰ عہدوں پر اقلیتوں کے ممبران جلوہ گر رہے ہیں، بھگوان داس کا معاملہ تو تازہ ہے، وزیروں مشیروں کی کہانیاں اس کے علاوہ ہیں۔ بلاول صاحب اگر پاکستان میں بھی اقلیت کے نمائندے کو کسی اہم ترین عہدے پر دیکھنا چاہتے ہیں، تو اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ بھارت نے اگر کسی مسلمان کو صدر

بنایا تو پاکستان نے اسی کے ہم منصب ڈاکٹر قدیر کو کس قدر خوار کیا، اگر عبدالکلام کو
صدر بنایا جاسکتا ہے تو کیا ڈاکٹر قدیر کو نہیں بنایا جاسکتا؟ پاکستان میں اقلیت کی اپنی اہمیت
ہے، اس پر سیاست کرنے کی گنجائش نہیں۔

جنوبی پنجاب کی یونیورسٹیوں کا معاملہ عجیب ہے، ملتان کی بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ہے تو سابق وائس چانسلر خواجہ علقمہ کو اکتوبر 15ء کو گرفتار کر لیا گیا تھا، وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ موصوف نے لاہور میں زکریا یونیورسٹی کا غیر قانونی کیمپس منظور کیا ہے، رات کے پچھلے پہر گھر میں گھس کر پولیس نے کمانڈو ایکشن کیا اور سابق ریکس الجامعہ کو قابو کر کے ہتھکڑیاں لگا کر گئیں اور جیل بھیج دیا گیا۔ رجسٹرار کا نام بھی اسی کرپشن میں تھا، تاہم ان کی ضمانت ہو گئی۔ سابق وی سی تقریباً پانچ ماہ تک سرکاری مہمان رہنے کے بعد گزشتہ دنوں رہا ہوئے، انہوں نے رہائی کے بعد میڈیا کا سامنا کرتے ہوئے کہا کہ نیب میں واقعی اصلاحات کی ضرورت ہے، انہوں نے مقدمات کا سامنا کرنے کا اعلان بھی کیا۔ یوم پاکستان کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ یوم پاکستان کا درس یہ ہے کہ مسلم لیگ کو متحد ہو جانا چاہیے، اگر ان کا اتحاد نہ ہو تو انجام بنگلہ دیش جیسا ہوگا۔ خواجہ علقمہ نے بتایا کہ لوگ مجھے جیل میں ملنے اس لئے نہیں آئے کہ وہ اپنی پارٹی اور نیب سے خوفزدہ تھے، اگرچہ میں مسلم لیگی ہوں، مگر صرف یوسف رضا گیلانی جیل میں ملنے آئے، وہی شیر ہیں۔ جیل میں وہ نئے تجربات سے روشناس ہوئے، قید کے دنوں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا بھی عندیہ انہوں

نے دے دیا ہے۔

بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طاہر امین نے بھی یوم پاکستان کے حوالے سے دو تقریبات سے خطاب کیا، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں وہ مہمان مقرر تھے، اور اگلے ہی روز وہ خود اپنی یونیورسٹی میں میزبان۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مشتاق قیصر اور دیگر انتظامیہ پر نہ جانے کس آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے کہ وہ اول تو یونیورسٹی میں غیر نصابی سرگرمی کرتے نہیں، اگر کبھی موڈ بن ہی جائے تو اس میں کسی کو پروگرام کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ یہی حال یوم پاکستان کی تقریب کے ساتھ بھی ہوا، بس دو چار لوگوں کو ہی دعوت دی گئی، اور نشستوں پر ان کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں، تاکہ کوئی بن بلایا مہمان نہ آنے پائے۔ ایسی تقریبات کا مقصد دو طرح کے لوگوں کو آگاہی دینا ہوتا ہے، اول؛ طلبہ و طالبات۔ دوم؛ وہ لوگ جو بات سنیں اور آگے پہنچائیں، مگر یہاں موخر الذکر کا تصور کم ہی ہے۔ پروگرام کو خفیہ رکھنے کے مضمرات کی تو سمجھ نہیں آ سکی، تاہم اتنا تو سب کو ہی علم ہے کہ جامعات کا کام جہاں تحقیق کرنا ہوتا ہے، وہاں وہ اپنے معاشرے، ماحول اور خطے کے لئے تھنک ٹینک کا کردار بھی ادا کرتی ہیں، وہ ہر شعبے کے لئے اداروں اور لوگوں کو رہنمائی فراہم کرتی ہیں، کیونکہ کتابیں تو جامعات میں پڑھائی جاسکتی ہیں، مگر عمل کی دنیا جامعہ کی چار دیواری سے باہر آباد ہوتی ہے،

یونیورسٹی کے جس شعبہ کو بھی دیکھ لیں، اس کا تعلق فطری طور پر باہر کی دنیا سے ہوتا ہے، کیونکہ اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلباء و طالبات نے عمل کے میدان میں نکل کر اپنے شعبوں کو ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعبوں سے تعلق رکھنے والے بڑے لوگوں کو دعوت دے، تاکہ سٹوڈنٹس بھی بڑوں کے تجربات سے استفادہ کر سکیں۔ مگر اپنے ہاں اور ہی روایت ہے، نہ کسی کو بلایا جاتا ہے اور نہ چار دیواری سے باہر کسی کو رہنمائی دی جاتی ہے۔ زکریا یونیورسٹی کی تقریب میں معروف اور صاحب طرز کالم نگار ہارون الرشید اور کالم نگار و شاعر خالد مسعود خان بھی مدعو تھے۔ رئیس الجامعہ ڈاکٹر طاہر امین کا کہنا تھا کہ پاکستان لسانیت، اقربا پروری، صوبائی عصبیت جیسی مصیبتوں میں گھر چکا، گزشتہ دس برس میں شہر ہزار پاکستانی دہشت گردی کی بھیمنٹ چڑھ گئے، اور ہم سب لوگ قیام پاکستان کا مقصد بھول بیٹھے ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر جب سے تشریف لائے ہیں، انہوں نے بہاول پور کے عوام کو قبول نہیں کیا، شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ بھی ان کے ساتھ شیر و شکر نہیں ہو سکے، بلکہ فریقین میں ایکٹ خلا ہے، جو کم ہونے کا نام نہیں لے رہا، یا انتظامیہ کم کرنا نہیں چاہتی۔ اگر ملتان یونیورسٹی میں دو معروف کالم نگار خطاب کر سکتے ہیں تو بہاول پور کے لوگوں

کا بھی اپنی یونیورسٹی پر بہت سہا حق ہے، یہاں کے لکھاریوں کا بھی دل چاہتا ہے کہ کسی دانشور کی باتیں سنیں۔ اپنی ہی مادرِ علمی سے اجنبی بن کر رہنا کتنا تکلیف دہ عمل ہے۔ جامعات میں ایسی تقریبات بلا مبالغہ آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہیں، اور اگر مسیحا ہی آکسیجن بند کرنے کا اہتمام کر دے تو زندگی، کس قدر اجیرن ہو جائے گی۔

! تخت لاہور سے بغاوت

بلاول زرداری نے تخت لاہور کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے، یہ انقلابی فیصلہ انہوں نے جنوبی پنجاب کے آخری ضلع رحیم یار خان میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ ”... جنوبی پنجاب کو ہر صورت میں صوبہ بنایا جائے گا، قوم تخت لاہور والوں سے ان کے مظالم کا حساب لے گی ... بغاوت کے انجام کی بھی مجھے خبر ہے ... وزیراعظم کا کسان تحکک پٹواریوں کی نذر ہو چکا ہے .. پی پی نے اس خطہ میں ریکارڈ ترقیاتی کام کروائے .. یہاں سے صدر، وزیراعظم، وزیر خارجہ، وزیر خزانہ، سپیکر قومی اسمبلی، گورنر اور وزیر اعلیٰ دیئے ... اور نچ ٹرین اور میٹرو بس پر استعمال ہونے والا بجٹ پورے جنوبی پنجاب کے بجٹ سے زیادہ ہے ... خطے کی محرومیاں بی بی کا پیٹا ہی ختم کرے گا .. قربانی دینا صرف بھٹو جانتا ہے ...“۔ لکھی ہوئی تقریر کو پون گھنٹہ تک گرج برس کے کرنا (پڑھنا) کافی مشکل کام ہے، جو انہوں نے اپنی روایتی تربیت کی بنا پر خوب نبھایا۔

جنوبی پنجاب میں مخدوم احمد محمود کی مالی پوزیشن کی طرح سیاسی پوزیشن بھی کافی مستحکم ہے۔ ایک طرف تو ان کے ایک کزن سندھ سے آئے اور ان کے لئے

کروڑوں کا محل بنایا گیا، جہاں انہوں نے قیام کیا اور اپنے مریدوں کو درس دے کر وائے۔
 پیر پگڑا کے دورے کے چند ہی روز بعد مخدوم صاحب نے اپنی پارٹی کے چیئر مین بلاول
 زرداری کے لئے جلسہ سجا یا تو ان کے دوسرے کزن یوسف رضا گیلانی نے ان کے
 ساتھ بھرپور معاونت کی۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے دو چار حلقے مخدوم صاحب کی مٹھی
 میں ہوتے ہیں، مشرف دور میں جہانگیر ترین بھی یہیں سے ہی ایم این اے منتخب ہوئے
 تھے۔ اس لئے جنوبی پنجاب میں ایک بہتر جلسہ کرنے کے لئے جمال دین والی (رحیم یار
 خان) بہترین جگہ تھی۔ اپنے چیئر مین کے ساتھ پارٹی قیادت بھی موجود تھی، خصوصی
 طیارے اور بہت سی سکیورٹی اور بلٹ پروف گاڑیاں بھی۔ بلاول اگرچہ باہر کے پڑھے
 لکھے ہیں، مگر ان کو سیاسی تربیت دینے والوں نے انہیں اسی رنگ میں رنگ لیا ہے، جس
 میں مقامی عوام خوش ہوتے ہیں۔ لوگوں کو منصوبہ بندیوں، سلیقہ شعاریوں، اصول
 پرستیوں وغیرہ کی بجائے بڑھکیں، دوسروں کو لکارنا، الزامات کی بوچھاڑ کرنا، پگڑیاں
 اچھالنا اور دوسروں پر چھینٹے اڑانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اگر وہ عوام کو زبان کی بجائے
 عمل کی سیاست کی طرف لاتے تو حالات مختلف ہوتے۔ سندھ حکومت میں وہ انقلابی
 تبدیلیاں کر سکتے تھے۔ مغرب میں پڑھنے اور دنیا کو دیکھنے کے نتیجے میں حاصل ہونے
 والی اچھی باتوں کو سندھ حکومت میں نافذ کر سکتے تھے، مگر وائے ناکامی

جنوبی پنجاب کی محرومیوں کی داستان بہت طویل ہے، یہ بھی شک نہیں کہ پی پی کے دور میں مندرجہ بالا اعلیٰ ترین حکومتی عہدے جنوبی پنجاب کے حصے میں آتے رہے ہیں۔ مسلم لیگ ن کی حکومت نے بھی یہاں سے گورنر دیئے ہیں، جن میں سے ایک اب بھی موجود ہیں، اول تو یہ عہدہ نمائشی ہے، اس کے پاس اختیارات نہیں، دوسری بات یہ کہ اگر صدر اور وزیراعظم بھی جنوبی پنجاب سے رہے ہیں اور پھر بھی خطہ محروم ہے، تو کچھ غور کرنا چاہیے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ گیلانی کے دور میں جنوبی پنجاب کے بجٹ کا ٹرا حصہ ملتان شہر پر لگا دیا گیا تھا۔ یہی کچھ موجودہ پنجاب حکومت کر رہی ہے، کہ سارا بجٹ لاہور پر لگ رہا ہے، جنوبی پنجاب کے حصے میں ’پھوک‘ ہی آ رہا ہے۔ جہاں تک جنوبی پنجاب کو صوبہ بنانے کا تعلق ہے، اس ضمن میں مسلم لیگ ن اور پی پی دونوں سیاست ہی کر رہی ہیں، یعنی سیاسی بیان ہی دے رہی ہیں۔ چند برس قبل تک بہاول پور صوبہ کی بحالی کی تحریک چلتی رہی ہے، جس میں ایک اہم فریق مخدوم احمد محمود بھی تھے، دوسرے محمد علی درانی اور تیسرے نواب آف بہاول پور۔ مگر قومی الیکشن میں عوام نے ان تینوں فریقوں کو اہمیت نہیں دی۔ احمد محمود اس سے پہلے ہی گورنر بن چکے تھے اور دوسرے دونوں خاموشی کی بُل مار کر مراکے میں چلے گئے تھے۔ پی پی کا حکومتی دور گزر چکا ہے، انہوں نے صوبہ بحال نہیں کیا، ن لیگ کا اب دور ہے، صوبہ بحال نہیں ہو رہا، اس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ دونوں چاہتے ہی نہیں۔ رہ گئی بغاوت تو یہ اپنے کارکنوں کے جذبات، ٹرھکانے کی حد تک ایک کوشش

ہو سکتی ہے، مگر عمل سے اس نعرے کا بھی دور کا تعلق نہیں۔ آخری بات یہ کہ خطے کی محرومیاں بی بی کا پیٹا دور کرے گا تو ماضی کچھ اور بتا رہا ہے، خود بی بی کی بھی دو مرتبہ حکومت رہ چکی ہے، ایک مرتبہ گیلانی سرکار بھی، اگر محرومیاں تب دور نہیں ہوئیں تو اب کونسی گیدڑ سنگھی آزمائی جائے گی؟

انسان کو لطف اندوز ہونے کے لئے سیر گاہوں اور پارکوں سے زیادہ بہتر کونسی جگہ دستیاب ہے؟ گھر کے ماحول سے تھوڑا سا باہر نکل کر انسان کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے، اس سے اس کا ذہن کشادہ ہوتا اور دباؤ سے آزادی میسر آتی ہے۔ کسی دور دراز تفریحی یا سیاحتی یا پر فضا مقام پر اگر ہر کوئی نہیں پہنچ سکتا تو اپنے شہر کے کسی قریبی یا بڑے پارک میں جانا نہ تو زیادہ مشکل ہے اور نہ ہی زیادہ مہنگا۔ یہی وجہ ہے کہ پارکوں، چڑیا گھروں وغیرہ پر اتوار اور جمعہ کو معمول سے زیادہ رش ہوتا ہے، بہت سے لوگ کھانا وغیرہ تیار کر کے پارکوں میں جاتے اور وہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ پارکوں میں جانے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہاں آنے والے لوگوں میں بچوں اور خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ذہنی سکون اور تصوراتی ماحول کو دیکھ کر پیارے بچے تیلیوں کی طرح اُڑاریاں مارتے پھر رہے ہوتے ہیں، اور جب وہاں چار سُو پھول اور پھولوں پر منڈلاتی تتلیاں بھی ان کے ہم رکاب ہوں تو ماحول کی خوبصورتی اور حُسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں عام شہروں میں پارکوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی ہے، اور لوگ وہاں رونق افروز ہوتے ہیں۔ ہم لوگ اپنے ہاں پارکوں کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں، یہ رونا غلط بھی نہیں ہوتا، چونکہ اپنے ہاں پارک بہت

کم ہیں، اس لئے جو پارک بہت اچھے ہیں وہاں رش حد سے زیادہ ہوتا ہے۔
 لاہور کے گلشن اقبال پارک میں ہونے والے خود کش دھماکے نے ہر دل کو دہلا کر رکھ
 دیا ہے، الفاظ نہیں ملتے، جن کی مدد سے واقعے کی مذمت کی جائے۔ جب نام ہی گلشن
 اقبال ہو، تو گلشن کو دیکھنے یا سیر کرنے تو لوگوں کا آنا بنتا ہے، اور وہ بھی چھٹی والے
 دن، ہزاروں لوگ وہاں گھوم پھر رہے تھے، کہ ایک دھماکے نے دھرتی کو ہلا کر رکھ
 دیا۔ بارود کی آگ کم ہوئی، دھواں ٹھہرا، خون اور خاک میں تڑپتی لاشوں کو ہسپتال
 پہنچانے کی بات شروع ہوئی، ایمر جنسی نافذ ہو گئی، ہسپتال شہیدوں اور زخمیوں سے
 اٹ گئے۔ کوئی نامراد تباہی پھیل گیا، وہ تو اپنے انجام کو پہنچا، سیکڑوں گھروں کو رلا گیا۔
 ہسپتالوں کے اعداد و شمار کے مطابق شہید ہونے والوں کی تعداد شہر سے زائد ہے، اور
 زخمی تین سو سے زیادہ۔ کتنے پھول مرجھائے، کتنے کملائے، کتنی تسلیاں مسلی گئیں؟
 پارک میں تو بڑے چھوٹے سب ہی خوش ہوتے ہیں۔ مگر بچے اور خواتین ہی زیادہ
 نشانے کی زد میں آئیں۔ کتنے گھرا جڑے، کتنے خاندان تباہ ہوئے، کتنے بچے یتیم اور کتنے
 والدین بے اولاد ہو گئے؟ ان کا حساب کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ جو والدین اپنے بچے
 کے پاؤں میں لگنے والے کانٹے کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے، انہیں اگر اپنے بچوں کی
 لاش اٹھانی پڑے تو ہمت کیسے ہوتی ہے؟ اور اس پر کیا میتھتی ہے؟ کسی پر اچانک آفت
 آجانے پر بھی بہت پریشانی ہوتی ہے

مگر جب انسان کسی ماحول کے مزے لے رہا ہو اور ایسے میں کوئی واقعہ رونما ہو جائے تو اس کی تکلیف یا صدمہ دو چند ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں دہشت گردی کی لہر کئی سالوں سے جاری ہے، تاہم گزشتہ برس سے آپریشن ضربِ عضب کی وجہ سے اس لہر کی شدت میں بہت حد تک کمی آچکی ہے، مگر کئی ماہ کے بعد ایک آدھ ایسا دھماکہ ہو جاتا ہے، جو نہ صرف پرانے زخموں کو تازہ کرنے کا سبب بنتا ہے، بلکہ ایسے نئے زخم بھی لگا جاتا ہے، جن کی تکلیف اور نشان زندگی بھر انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ ضربِ عضب سے قبل تو آئے روز یہ صدمہ قوم کو برداشت کرنا پڑتا تھا، تاہم اب ان میں کمی ضرور آئی ہے، مگر کبھی کبھار ہونے والے سانحات بھی کیا کم ہیں؟ سردیوں میں باچا خان یونیورسٹی چارسدہ میں ایسی ہی ایک واقعہ ہوا، اب یہ ایک ”گلشن“ میں ”پھولوں“ کو تار تار کر دیا گیا۔ کتنی مائیں اس میں شہید ہو گئیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے دہشت گرد مسلمان ہیں، انہیں مسلمان کہنا اسلام اور مسلمانی کی توہین ہے، مسلمان تو جان بوجھ کر کسی ذی روح جاندار کو نہیں مار سکتا، چہ جائیکہ وہ بچا سیوں لوگوں کو شہید کر دے۔ جان کی حرمت پر کون بات کر سکتا ہے؟ جس نے ایک انسان کی جان لی اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا۔ اگر گلشن اقبال میں موجود کچھ لوگوں کو ایک مشکوک شخص دکھائی دے رہا تھا، تو اس کے بارے میں پولیس یا انتظامیہ کو اطلاع کیوں نہ کی گئی؟ ویسے بھی ایسے

مقامات پر پولیس کا تعینات ہونا ضروری ہے، اگر وی آئی پیز سے کچھ سپاہی بچ رہیں تو انہیں عوام کی حفاظت پر مامور کیا جاسکتا ہے۔

رانا مشہود کے تعلیمی اہداف؟

رانا مشہود نے تعلیم کے علاوہ باقی تمام وزارتیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تعلیم کی وزارت کی ذمہ داری بہت بھاری ہے، میں اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ اضافی وزارتیں چھوڑنے کے لئے انہوں نے وزیر اعلیٰ کو خط لکھ دیا ہے، سکولوں میں تعلیمی سرگرمیوں اور سہولتوں کی فراہمی کو انہوں نے اپنا ہدف بیان کیا ہے۔ تعلیم کے علاوہ ان کے پاس ہائر ایجوکیشن، سیاحت، آرکیالوجی اور کھیلوں کی وزارتیں ہیں۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات بھی کی ہے۔ اس خبر میں کئی خبریں بین السطور بھی ہیں، دراصل اپنے ہاں جتنے فیصلے ہوتے ہیں، ضروری نہیں ہوتا کہ وہ خود ہی کئے جائیں، دراصل کوئی اور فیصلہ کرتا اور حکم دیتا ہے، بس کچھ پردہ رکھ کر بیان یہ دے دیا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے خود اور اپنی مرضی سے کیا ہے۔ چونکہ خبر میں یہ بتایا گیا ہے کہ رانا مشہود نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات بھی کی تھی، اس سے یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کیا نہیں گیا کروایا گیا ہے۔

فیصلہ رانا صاحب کا ہے یا وزیر اعلیٰ کا، اس کو کچھ دیر کے لئے نظر انداز کر

دیا جائے تو بھی یہ بہت اہم فیصلہ ہے، تعلیم کی وزارت واقعی بہت بھاری ہے، رانا صاحب نے اس کے علاوہ بھی بہت سا وزن اٹھا رکھا تھا، اب دیگر وزارتوں کو اتنا پھینکنے سے یقیناً وہ ہلکے پھلکے ہو گئے ہوں گے۔ اپنے ہاں حکومتوں کو وزارتیں بڑھانے اور اپنے ممبران کو اکاؤنٹنٹ کرنے کی روایت عام ہے، مگر اس روایت کی آبیاری بھی ہمیشہ ہوتی رہتی ہے کہ بہت سی وزارتیں وزیراعظم یا وزیراعلیٰ اپنے پاس ہی رکھ لیتے ہیں، بچی کھچی اپنے من پسند وزیروں کو دے دیتے ہیں۔ اگر رانا مشہود کے زیر سرپرستی دیگر وزارتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی وزیر بہت سی وزارتوں کو بیک وقت نہیں سنبھال سکتا، ایک ہی فرد پر زیادہ بوجھ ڈالنے سے وزیر کا تو کچھ نہیں جاتا البتہ وزارتوں کے پلے کچھ نہیں بچتا۔ سیاحت کا پاکستان (یا پنجاب) میں کیا حال ہے؟ آرکیالوجی کس حال میں ہے؟ کھیل کس انجام کو پہنچ رہا ہے؟ ہائر ایجوکیشن کی عالمی اداروں کے سامنے کیا پوزیشن ہے؟ یقیناً یہ تمام وزارتیں زوال پذیر ہیں، توجہ چاہتی ہیں، انہیں آکسیجن کی ضرورت ہے، اور انہیں آکسیجن دینے کا اہتمام کرنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

اگر رانا مشہود نے تعلیم کو بھاری وزارت جان کر اس کے ساتھ انصاف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو یہ بہت بڑی خبر ہے۔ حکومت تعلیم کو اپنی اولین ترجیح بھی قرار دیتی ہے، حکومت اس بات کا بھی خوب ادراک رکھتی ہے، کہ تعلیم کا

سرکاری سرپرستی میں حال کیا ہے؟ خادم اعلیٰ دانش سکول کا افتتاح کرتے ہوئے حاضرین کو بتاتے ہیں کہ سرکاری سکول ایسے ہیں جن میں دروازے نہیں، عمارت نہیں، فرنیچر نہیں، حتیٰ کہ استاد بھی نہیں (وغیرہ وغیرہ)۔ جناب! اگر یہ چیزیں نہیں تو ان کے ہونے کا کون ذمہ دار ہے، کس کا فرض ہے کہ وہ سرکاری سکولوں میں یہ تمام سہولتیں بہم پہنچائے؟ یقیناً حکومت کا ہی کام ہے، مگر کیا کیجئے کہ ترجیح نہیں۔ اب اگر رانا مشہود نے تعلیم کی تنہا وزارت کا بوجھ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو قوم خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی، تعلیم کے ساتھ انصاف ہوتا دیکھ کر جہالت کی تاریکیاں از خود بھاگ نکلتی ہیں۔ مجبور ہو جائیں گی، ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے میں کچھ بھی تاخیر نہ ہوگی۔ کیونکہ تعلیم کو ہی ترقی کا راستہ بتایا جاتا ہے۔ عمران خان نے کہا ہے کہ مٹی گارے سے نہیں، قومیں تعلیم سے بنتی ہیں۔

رانا مشہود کا تعلیم کی وزارت کا بوجھ اٹھانے کے بعد ارادہ ہے کہ سکولوں میں تعلیمی سرگرمیاں بہتر کی جائیں، سکولوں میں سہولیات فراہم کی جائیں۔ بس جلدی میں تو انہوں نے یہی دو ترجیحات اور ہدف بیان کئے ہیں، ممکن ہے دیگر وزارتیں چھن جانے کے بعد جب وہ ذہنی طور پر فراغت پائیں گے اور آسودگی حاصل کریں گے تو دیگر بھی بہت سے اہداف ان کے سامنے آ جائیں گے۔ سکولوں میں نصاب کیا اور کیسا ہونا چاہیے، کس کو نصاب میں داخل کرنا اور کسے وہاں سے

نکالنا ہے؟ کس نصاب سے ملک ترقی اور قوم تہذیب کی راہ پر چل سکتی ہے؟ بچوں کو مفت کتابیں کس مہینے میں فراہم کرنی ہیں؟ سکولوں میں تعلیمی معیار کا جائزہ کس طرح لینا ہے؟ سکولوں میں دی گئی سہولتوں کو کس طرح استعمال کرنا اور محفوظ رکھنا ہے؟ سکولوں سے باہر لاکھوں بچوں کو سکول کیسے لانا ہے؟ بچوں کو طوطا بنانے کی بجائے بہترین قوم کیسے بنانا ہے؟ امید ہے رانا صاحب بہت جلد یہ منصوبہ بندی کر لیں گے اور پنجاب حقیقی اور اصلی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔

لیجے جناب، اب بہاول پور صوبہ بحال ہو کر ہی رہے گا، کیونکہ مشرف دور کے وزیر اطلاعات و نشریات محمد علی درانی نے کشتیاں جلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اگرچہ موصوف نے مشرف حکومت کے خاتمے کے بعد اپنے لئے نئی مصروفیت ڈھونڈی اور بہاول پور صوبہ کی بحالی کا بیڑہ اپنے توانا کندھوں پر اٹھالیا تھا، خطے کی محرومیوں کا بھی انہوں نے بہت گہرائی میں جا کر اندازہ لگایا، تحقیق سے بہت سے خفیہ گوشوں کو تلاش کیا، پھر علاقے کا دورہ کیا، آگاہی مہم چلائی، تقریبات منعقد کیں اور بہاول پور صوبہ بحالی کی نیم مردہ تحریک میں نئی روح پھونک دی۔ میڈیا سے اپنی وزارت وغیرہ کی وجہ سے تعلقات بہت اچھے اور مضبوط تھے، اس لئے انہیں اخبارات اور چینلز میں خوب کوریج ملی۔ رابطے اور میڈیا میں آنے کے لئے انہوں نے نئے سے نئے طریقے اختیار کئے۔ ان کی دیکھا دیکھی بہاول پور سے مزید دو گروہ بحالی صوبہ کی تحریک میں دوبارہ فعال ہو گئے، ایک مخدوم احمد محمود اور دوسرے نواب صلاح الدین عباسی۔ تاہم یہ منظر بھی اہالیانِ بہاول پور نے دیکھا کہ تینوں گروپ ایک ٹکاتی ایجنڈے پر کام کر رہے تھے، مگر تینوں کبھی اکٹھے نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ گزشتہ الیکشن میں بہاول پور صوبہ کی بحالی کی کوئی تحریک اپنا امیدوار کھڑا نہ کر سکی، اگر کسی نے یہ نعرہ لگایا بھی سہی تو عوام نے اس پر کوئی

خاص توجہ نہیں دی۔

محمد علی درانی کی برپا کردہ تحریک کا نتیجہ ہی تھا کہ پورے بہاول پور (ڈویژن) میں اس تحریک کے متوالے اٹھ کھڑے ہوئے، محرومیوں کے ایڈیٹرز پر سرگرمیاں ہونے لگیں، دوسرے گروپوں کی جانب سے بھی آل پارٹیز گول میز کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں اور ماحول گرم ہو گیا۔ ایک عرصہ تک محمد علی درانی کو تلخ و ترش سوالوں کا سامنا رہا، آپ نے اپنے دورِ حکومت میں یہ کارِ خیر کیوں سرانجام نہ دیا، ”اب جبکہ آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں تو کیوں یہ مطالبات دہرا رہے ہیں“، وغیرہ وغیرہ۔ مگر درانی نے نہایت ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریک جاری رکھی اور بہت حد تک اپنی ساکھ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ درانی کے لئے اس لئے بھی راستہ ہموار ہو گیا کہ ان کا آبائی علاقہ بھی بہاولپور ہی ہے، انہوں نے اپنے اس تعلق کو خوب ابھارا اور اس سے لوگوں کو جذباتی کرنے کا کام لیا۔ کبھی اپنے آبائی قبروں سے ناتا جوڑا تو کبھی خود بھی اسی علاقے میں مرنے جینے کی باتیں کیں۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے ان کی باتوں کو آخر تک قبول نہیں کیا، مگر زیادہ تر لوگ ان سے متاثر ہوئے، اور ان کی تحقیق اور کاوشوں پر تو کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ درانی کی ان کوششوں کا دوسرا اور اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پنجاب اسمبلی میں صوبہ کی بحالی کی قرارداد منظور ہو گئی، مسلم لیگ ن کی حکومت سے یہ توقع نہیں تھی، مگر سیاست میں سب

کچھ ممکن ہوتا ہے، وفاقی اسمبلی میں کیس جانا تھا، پی پی کی وفاقی حکومت کی بنائی جانے والی کمیٹی پر اس قدر اختلافات سامنے آئے کہ معاملہ سرد خانے کی نذر ہو گیا۔

گزشتہ قومی انتخابات کے بعد سے اب تک محمد علی درانی پھر منظر سے غائب تھے، لوگ ان کے وعدوں، دعووں اور نعروں کو یاد کرتے تھے، تاہم کچھ عرصہ قبل پھر طلوع ہوئے، مگر تقریبات، سرگرمیوں، احتجاجوں، ریلیوں، پریس کانفرنسوں وغیرہ میں نہیں، صرف اپنی 'پارٹی' کے اجلاسوں میں۔ بس چند روز بعد خبر آ جاتی ہے، کہ انہوں نے فلاں لوگوں کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے یہ کہا وہ کہا۔ ایسی ہی ایک خبر سامنے آئی ہے، جس میں درانی صاحب کی جانب سے یہ مزید دعویٰ کیا گیا ہے کہ ”... اب صوبہ بحالی کے ساتھ خطے کی محرومیاں بھی دور کروائیں گے ... ہماری خاموشی کو کمزوری سمجھا گیا ... اب کشتیاں جلا کر تحریک کو آگے بڑھانے کا وقت آ گیا ہے ...

اسلام آباد، لاہور کے لئے میگا پراجیکٹس اور بہاول پور کے لئے محرومیاں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ... اب نہ رکنے والی تحریک کا آغاز کیا جائے گا...“۔ علاقے کے عوام زیادہ پریشان نہ ہوں، درانی نے کشتیاں جلانے کے وقت کے آنے کی خبر دی ہے، یہ نہیں کہا کہ کشتیاں جلا دی ہیں، اس لئے عوام خاطر جمع رکھیں وہ آتے جاتے رہیں گے، سیاستدان کو خود کو زندہ رکھنے کے لئے بہت سے پاؤں بیلنے پڑتے ہیں، اور ایسے معاملات میں

محمد علی درانی کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ تاہم مقامی لوگوں کے لئے یہ خوشخبری موجود ہے کہ اب بحالی صوبہ کے ساتھ محرومیوں کے خاتمے کی کوشش بھی ہوگی۔ لوگ امید کے چراغ تھامے سیاستدانوں کے پیچھے چلتے رہیں، کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہو جائے گا، خواہ وہ سیاستدانوں کی کامیابی کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟

جشنِ دوستی نے اپنی نئی پارٹی بنانے کے اعلان کر دیا ہے، پارٹی کا نام تو ”عوامی راج پارٹی“ ہوگا، مگر اس سے بھی اہم اس پارٹی کا انتخابی نشان ہے، جو کسی دلچسپی سے خالی نہیں، وہ ہے جھاڑو۔ بھارتی دارالحکومت دہلی میں کامیاب ہونے والی ”عام آدمی پارٹی“ کا انتخابی نشان بھی جھاڑو ہی ہے۔ اپنی پارٹی کے اعلان کے لئے انہوں نے نیشنل پریس کلب اسلام آباد کا انتخاب کیا، وہ جانتے تھے کہ جو خبر اسلام آباد میں بنتی ہے، اسی کی اہمیت ہوتی ہے اور اسی کی کوریج۔ لگے ہاتھ انہوں نے اپنا منشور بھی پیش کر دیا، تاکہ کراچی والی سرکار کی طرح یہ نہ ہو کہ کئی روز تک نو مولود پارٹی کا نام تلاش کرنے میں گزر جائیں، پھر انتخابی نشان پر غور شروع ہو جائے، پھر پارٹی پر جم کی بات چل نکلے۔ ایسا نہیں ہوا، بلکہ دوستی نے ہوم ورک کے ساتھ کام کیا اور پارٹی کا نام، انتخابی نشان اور کسی حد تک منشور بھی بیان کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ملک کو ناخواندگی، غربت، بے روزگاری، نا انصافی جیسے چیلنجز درپیش ہیں۔ انہوں نے صدارتی نظام کی حمایت کی کہ صدر کو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونا چاہیے۔ وی آئی پی کلچر اور بدعنوانی کا خاتمہ ان کی پہلی ترجیح ہوگی، ان کی جماعت عدالتی، تعلیمی، بلدیاتی نظام، پولیس، لیبر اور ٹیکس کے نظام میں تبدیلیاں کرے گی۔ کرپشن

پر سزائے موت دی جائے گی، انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی پارٹی جنوبی پنجاب کے محروم عوام کی آواز بن کر ابھرے گی۔

جشنید دستی خبروں میں رہنے کے ہنر سے خوب آشنا ہیں، دوسری طرف میڈیا کو بھی دستی جیسے لوگوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ دستی اپنی کارکردگی اور کاروائیوں کی بنا پر میڈیا میں ان ہی رہتے ہیں۔ جب انہوں نے معزز ارکانِ اسمبلی پر کچھ مخصوص نوعیت کے مشروب وغیرہ نوش جاں کرنے کے الزامات لگائے تھے تو بہت لے دے ہوئی تھی، ان کے بیان پر تنقید کی گئی تھی، استحقاق کے مجروح ہونے کا اظہار کیا گیا تھا، بیان پر سخت گرفت کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، تحقیق کے لئے کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا تھا، کیونکہ درحقیقت ان کی باتیں درست تھیں۔ جشنید دستی جس علاقے سے قومی اسمبلی

کے مسلسل ممبر منتخب ہو رہے ہیں، اس کے بارے میں شاید بالائی پنجاب والوں کو درست اور تفصیلی معلومات ہی نہ ہوں۔ مظفر گڑھ مردم خیز خطہ ہے، مگر اس کا شمار پنجاب کے پسماندہ ترین اضلاع میں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیلاب ہو یا کوئی آفت، مظفر گڑھ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے، اپنے وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف بھی ترکی کے حکمرانوں کے ذریعے بہت سے فنڈ اس علاقے کی غربت اور پسماندگی دور کرنے کے لئے استعمال کرواتے ہیں۔

ایک نہایت پسماندہ، غریب اور ناخواندہ ضلع سے ایک 'عام' آدمی کا مسلسل منتخب ہونا کوئی معمولی بات نہیں، وہ کھر برادران اور دستی صاحبان کو سیاست سے آؤٹ کر کے ممبر منتخب ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک بہت ہی باریک نکتہ قابل غور ہے کہ جاگیر داری نظام میں جکڑے ہوئے لوگوں نے کس طرح ایک غریب اور عام آدمی کو مستقل اپنا قائد مقرر کر لیا، کم آبادی والے دور دراز ووٹرز کس طرح کھروں اور دستیوں وغیرہ کو چھوڑ کر جمشید دستی کو اپنا بھروسہ ماننے پر تیار ہوئے۔ عوام نے دراصل انہیں اپنے ہر غم اور خوشی میں موجود پایا۔ دستی نے بھی عوام کی خدمت عوامی انداز میں ہی کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وی آئی پی کلچر کے خاتمے کے لئے ہمیشہ جذباتی رہتے ہیں، جس نے اپنی جڑیں بہت گہری اور مضبوط کر رکھی ہیں۔ وہ ہر موقع پر اپنے عوام کے شانہ بشانہ موجود ہوتے ہیں۔ گزشتہ عرصے میں انہوں نے قومی اسمبلی کے دو حلقوں سے کامیابی حاصل کر کے بڑے بڑوں کو حیران کر دیا تھا۔ جب تجزیہ نگار بڑے اور تعلیم یافتہ شہروں کے ووٹرز کے انتخاب کی بات کرتے ہیں تو ان کے مقابلے میں مظفر گڑھ کے لوگوں کا انتخاب دیکھتے ہیں تو ان لوگوں کی آگاہی اور انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا، وہ جانتے ہیں کہ ہم نے اس آدمی کو منتخب کرنا ہے جو ان میں سے ہے، اس علاقے کے لوگ سیاسی پارٹیوں کی اجارہ داری اور جاگیر داری نظام کو مسترد کر کے دستی جیسے لوگوں کو منتخب کر کے خود کو تعلیم یافتہ اور کچھ کرنے والے ثابت کر رہے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود ایک سیاسی پارٹی بنانا ایک

بڑا کام ہے، محدود وسائل اور محدود علاقے کے لوگوں پر مشتمل پارٹی کی کامیابی کے

زیادہ امکانات نہیں ہوتے۔ تاہم دستی کے کرپشن کرنے والوں کو سزائے موت اور

دیگر مسائل کو جھٹرو سے صفائی کرنے کا عمل (یا خواہش) قابلِ تعریف ہے۔

موسم میں گرمی کی شدت کی وجہ ہی ہوگی کہ مسجد انتظامیہ نے مغرب کی نماز مسجد کے ہال کی بجائے باہر صحن میں کروانے کے فیصلہ کیا۔ ہمارے گھر کے ساتھ والی مسجد بہت بڑی ہے، اس میں ہر نماز میں سیکڑوں نمازی اپنے خالق کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں، مغرب کے وقت باہر صفیں دیکھ کر تبدیلی کا احساس تو ہوا، مگر طویل و عریض صحن میں دس بارہ صفیں تھیں، ہمیں تیسری صف میں جگہ ملی، ویسے تو کھڑے ہوتے ہی محسوس ہو گیا تھا کہ صف مٹی سے کس قدر آلودہ ہے، مگر جب سجدے کا وقت آیا تو قیام بھول گیا، یعنی مٹی جو کہ ہاتھوں اور پیشانی وغیرہ کو محسوس ہو رہی تھی، تاہم وہی کپڑوں پر بھی لگی، اس معاملے میں دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس صف سے مخصوص قسم کی بو بھی آرہی تھی، جو کسی چیز کے بارش یا اوس وغیرہ میں پڑی رہنے سے آتی ہے۔ یعنی یہ صفیں دن رات یہیں بچھی رہتی ہیں، رات کی نمی اور دن کی مٹی سب اپنی جان پر برداشت کرتی ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی، اگلی دو چار صفوں کے بعد والی صفیں جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی تھیں، یعنی خراب، گرد آلود اور ٹوٹی ہوئی صفیں، جن کے یا تو پاؤں والی جگہ صف نہیں تھی، فرش پر کھڑے ہونا پڑتا تھا، یا پھر سجدہ کی جگہ فرش تھا۔ اللہ معاف فرمانے والا اور

نمازیں قبول فرمانے والا ہے، ہمارا ذاتی تاثر نماز کی کراہت کا ہی تھا۔ امام نے نماز سے سلام پھیرا تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے، انہوں نے بتایا کہ پورے کا پورا دین ہماری زندگیوں میں کیے آئے گا، اس کے لئے کس قسم کی محنت کی ضرورت ہے، اس کے بارے میں بقیہ نماز کے بعد بات ہوگی۔

اس مسجد میں نمازیوں کے رش کی ایک وجہ زیادہ آبادی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ مسجد سے ملحق ایک مدرسہ بھی ہے، جس کے اساتذہ اور طلباء اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، اور تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ کہ یہ مسجد تبلیغی جماعت کا مرکز بھی ہے۔ اگرچہ یہ مرکز اب دوسری مسجد میں منتقل ہو گیا ہے، مگر اس مسجد میں جماعتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں مسجد کے صحن کے آخر تک بستر پڑے تھے، نمازیوں کی نماز کے وقت کوئی ترتیب نہیں بنتی تھی، اگرچہ ان لوگوں کا بندوبست کافی منظم ہوتا ہے، مگر بہت سی بے ترتیبی اور بے تدبیری دیکھنے کو ملی۔ جب کبھی زیادہ جماعتیں آجائیں تو فجر کی نماز میں عجیب سا ماحول ہوتا ہے، راستے میں کھانے کی چیزوں کے ٹکڑے وغیرہ پڑے ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک میں کھجور کی گٹھلیاں عام پائی جاتی ہیں، فجر کی نماز میں پاؤں میں چچیپاٹ محسوس ہو تو جان لیجئے کہ رات کسی روزہ دار نے شربت نوش جاں کیا ہوگا، جس کا کچھ حصہ صف پر گر گیا۔ یا سالن وغیرہ بھی گر سکتا ہے۔ فروٹ کے چھلکے، جن میں کیلا بھی شامل ہے، بعض اوقات مسجد کے صحن یا برآمدوں

میں پڑے ہوتے ہیں۔

تبلیغی جماعت پاکستان کی سب سے اہم جماعت ہے جسے حکومتوں، اداروں وغیرہ کی نظر میں بے ضرر قرار دیا جاتا ہے، ایک طنز بھی ان پر کی جاتی ہے، کہ ان سے کسی کو کوئی خطرہ نہیں، یا یہ زمین کے نیچے کی بات کرتے ہیں یا آسمان سے اوپر کی۔ اس گہری طنز میں کچھ حقیقت بھی ہے، کہ یہ لوگ انسانیت کی اصلاح کا بیڑہ تو اٹھاتے ہیں، مگر دنیا کی بہتری کے لئے بہت سے اقدام نہیں کرتے، جو دنیا اور آخرت دونوں کے لئے ضروری ہیں۔ جب نماز کے بعد ایک بھائی کھڑے ہو کر دین میں پورے کے پورے داخل ہونے کی بات کرتے ہیں، تو وہ یہ بات بھی خوب جانتے ہیں کہ دین کے داعی ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا تھا، یعنی آدھا ایمان تو اس وقت مکمل ہو جاتا ہے، جب انسان صفائی کا اہتمام کر لیتا ہے، مگر بد قسمتی سے یہاں صفائی پر دھیان کم ہی جاتا ہے۔ یہ کسی ایک مسجد کا مسئلہ نہیں، پاکستان بھر میں مساجد کی بھاری تعداد ایسی ہے، جن میں صفائی کا فقدان ہوتا ہے، اگر مسجد خوبصورت اور چمکیلی بھی ہے تو اس کے واش روم کی حالت غیر ہی ہوتی ہے، بدبو اور غلاظت کا مسجد کے واش روم میں وجود کوئی اچھے کی بات نہیں، کسی کے دروازے ٹوٹے ہوئے ہیں تو کسی کے دروازے مقفل ہیں۔ جو تیاں سلیقے سے اتارنے کا بندوبست بھی محدود ہے، ایک دوسری کے اوپر جو تیاں اتار کر نمازی اندر تشریف لے جاتے ہیں۔ اگر کسی نے اپنی مناسب سی

جوتی وہیں اتار دی تو ممکن ہے واپسی پر موجود ہی نہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے اوپر جوتے سمیت کتنے لوگ گزر کر اس کی شکل بگاڑ چکے ہوتے ہیں۔ مسجد کو تو ہر لحاظ سے صفائی اور سلیقے کا نمونہ ہونا چاہیے۔

رضار بانی پاکستان کے اہم ترین ادارے کے سربراہ ہیں، جب کبھی صدرِ مملکت پاکستان سے باہر تشریف لے جاتے ہیں تو ایوانِ بالا کے چیئرمین ہی صدر پاکستان کے منصبِ جلیلہ پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ گزشتہ روز جب وہ اپنے قائدِ سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے سلسلہ میں گڑھی خدا بخش گئے ہوئے تھے، میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ”... قانون سب کے لئے برابر ہے تو عدالتیں اس سے ہٹ کر فیصلے کیسے کر رہی ہیں.. آرٹیکل 6 جمہوریت کے دفاع میں ناکام رہا، کوئی آرٹیکل بے مقصد ہو تو اسے نکال کر آئین کا بوجھ کم کر دینا چاہیے.. آرٹیکل 6 اور بے نظیر قتل کے ملزم کو ملک سے باہر جانے دینا مذاق ہے..“۔ مشرف کا ملک سے جانا ایک واقعہ تو ہے، مگر اس کا اچھالا جانا صرف سیاست ہی کہلائے گا، کیونکہ پاکستان میں ایشوز کو اکثر اوقات اپنی سیاست چمکانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مشرف کے باہر جانے کو زیر بحث لانے سے کسی بھی ادارے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور چند روز کی اُڑی ہوئی دھول اول تو بیٹھ ہی چکی ہے، ورنہ بہت جلد بیٹھ جائے گی۔

رضا ربانی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے تو ان کی بات سنی جاتی ہے، وہ اس امر سے
 بخوبی آگاہ ہیں کہ اپنے پیارے آئین میں کیا کچھ ہے، اور کتنے کچھ پر عمل ہوتا ہے؟ آئین
 کے بارے میں منفی بات کرنا قابلِ گرفت اور لائقِ مذمت عمل ہے، مگر حقیقت یہی
 کچھ ہے کہ قانون سب کے لئے برابر نہیں ہے، اپنے ہاں غریب اور امیر کے لئے قانون
 مختلف ہے۔ طاقت ور قتل بھی کریں تو چھوٹ جاتے ہیں، کمزور آہ بھی بھرے تو دھر لیا
 جاتا ہے۔ قاتل مقتول کو دباؤ میں لا کر 'باعزت' بری ہو جاتے ہیں۔ آئین کا آرٹیکل 6
 غداری کے خاتمے کے لئے بنایا گیا تھا، مگر یہاں ہم یہ فیصلہ کرنے سے ہی قاصر ہیں کہ
 غدار کون ہے؟ یہاں جو طاقت ور ہے وہ ہی اپنے مخالفین کو غدار قرار دے دیتا اور
 اس کے لئے عدالتیں سجا کر سزا کا اہتمام کر لیتا ہے۔ اگر مشرف پر غداری کا مقدمہ تھا تو
 گزشتہ آٹھ برس میں وہ باہر کیسے رہے، آتے جاتے کیسے رہے؟ ٹی وی چینلز پر جلوہ
 گری کیسے دکھاتے رہے؟ اور یہ بھی کہ اگر وہی بے نظیر کے اصل قاتل ہیں تو پی پی نے
 اپنے دور حکومت میں انہیں باہر کیوں جانے دیا؟ مگر کیا کیجئے کہ سیاست کا تقاضا یہی ہے
 کہ ہر موقع کو غنیمت جان کر اس پر سیاست کی جائے۔
 آئین کے کس آرٹیکل پر عمل ہوتا ہے، اس بات کا قوم کو کوئی علم نہیں۔ مگر اتنا معلوم
 ہے کہ جس آرٹیکل سے کسی حکمران یا ان کے طاقتور مخالف پر حرف آتا ہو، وہ آرٹیکل
 ناقابلِ عمل قرار پاتا ہے، وہ صرف تمبرکٹ کے لئے یا مخالفین کو قابو کرنے کے لئے
 آئین کا حصہ رکھا جاتا ہے، تاکہ اس مقدس دستاویز کو

اپنے مفاد اور مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اب تو قوم آرٹیکل 25 سے بھی آگاہ ہو چکی ہے، جس میں قوم کے بچوں کی تعلیم کی بات کی گئی ہے، اور بتایا گیا کہ ”مفت اور لازمی تعلیم ہر بچے کا حق ہے، اور یہ بھی کہ یہ حق ریاست کے ذمے ہے کہ وہ عوام تک پہنچائے۔“ مگر یہ بھی قوم کو اچھی طرح علم ہے، کہ اس قسم کے حق پر صرف بیان باری کی جاتی ہے، یا پھر مہمل اور بے جان قسم کی مہمات چلائی جاتی ہیں، یا مہنگے اخباری اشتہارات جاری کر کے یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ ہم نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح عوام کو صحت، حفاظت، امن، صفائی سمیت تمام بنیادی سہولتیں دینا بھی ریاست کا فرض ہے، مگر اپنے ہاں یہ فرائض کوئی سرانجام نہیں دیتا۔ اپنی حکومتیں اگر آئین کے کسی آرٹیکل کو دل و جان سے قبول کرتی اور ان پر عمل کرتی ہیں، وہ آرٹیکل ہیں جن کے تحت انہیں مراعات نصیب ہوتی ہیں، انہیں پروٹوکول دیا جاتا ہے، انہیں تاحیات سہولتیں میسر آتی ہیں۔ ایسے آرٹیکل اعلیٰ حکومتی عہدوں کے لئے عیاشی کا باعث ہوتے ہیں، مثلاً صدر مملکت کی حیثیت اور اختیارات کسی سے پوشیدہ نہیں، مگر صدر کی ذات پر ہونے والے اخراجات و مراعات وغیرہ کا حساب لگایا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وزیراعظم، ایوانوں کے سربراہوں یا نمائندگان کی مراعات وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ اگر رضا ربانی کی بات مان کر آئین سے انتظامی دفعات نکال دی جائیں تو آئین خالی ہو جائے گا، یا اس میں صرف وہی دفعات رہ جائیں گی جو حکمرانوں کی عیاشی کا موجب بنتی ہیں۔ آئین کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے

ہیں تو وہ دفعات نکالیں جو قوم اور خزانے پر مہلکی بوجھ ہیں، مگر ایسا کون کرے گا؟

کرپشن کے الزامات

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا، ایسے الزام تو اپنے سیاستدان ایکٹ دوسرے پر ہمیشہ لگاتے رہتے ہیں، بلکہ وطن عزیز کی سیاست میں اپنی کارکردگی پر بات کم کی جاتی ہے، دوسروں کی خامیوں پر زیادہ توانائیاں صرف کی جاتی ہیں، پارٹیوں کے اندر دوسروں کے عیب تلاشنے کے لئے پوری ٹیمیں موجود ہیں، جن کا کام یہی ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ الیکشن وغیرہ کے موقع پر جب اپنی تمام جماعتوں کو اپنا اپنا منشور پیش کرنا چاہیے، وہاں وہ مخالف کی پگڑی اچھالنے میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ اب تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، دوسروں پر کچھڑا اچھالنے کے لئے اب کوئی خاص وقت مقرر نہیں، جب جس کا دل چاہے ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ قوم کو اپنے قائدین کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں کہ ان کی کارکردگی کیا ہے، اور وہ ملک وملت کی خدمت کس طرح کر سکتے ہیں یا کیسے کرتے ہیں؟ ان معلومات کا سیاستدانوں کو بھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا، کیونکہ عوام اپنے محبوب رہنماؤں کی کسی بات کا برا نہیں مناتے، کیا ہوا کرپشن کرتا ہے، یا دیانتداری میں کچھ کمی ہے، یا مال وغیرہ بنا لیا ہے، یا کچھ زیادتیاں وغیرہ کر جاتا ہے، کیا ہوا، آخر لیڈر ہے۔

اگر پانا مالیکس نے پوری دنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا کر دیا ہے تو کیا ہوا؟ اس سے قبل وکی لیکس نے بھی ایک مرتبہ اسی طرح تہلکہ مچایا تھا، اس سے کیا ہوا؟ ہمارے ہاں سیاستدان ایک دوسرے کی مخالفت میں اس کی جائیداد اور کاروبار باہر ہونے کے معاملے کو ایشو بنا کر سیاست کرتے ہیں، مگر نتیجہ تو کوئی بھی نہیں نکلتا۔ پاکستان میں کرپشن کے معاملے میں سب سے زیادہ بدنامی پیپلز پارٹی کے حصے میں آتی ہے، خاص طور پر سابق صدر آصف زرداری کو کرپشن کے حوالے سے مختلف نام دیئے گئے۔ موجودہ حکومت نے ہی اپنے دور حکومت میں آصف زرداری کو سا لہا سال جیل میں رکھا، مگر کرپشن کا کوئی ثبوت برآمد نہ ہوا، ایک ایک کر کے تمام مقدمات اپنا وجود کھوتے گئے اور موصوف تمام مقدمات سے باعزت بری ہوتے گئے۔ تاہم یہ کہانی الگ ہے کہ باعزت بری ہونے والوں نے جس قدر جیل کاٹی اس کا ارالہ کون کرے گا؟ نیب، احتساب عدالتیں اور بھی نہ جانے کون کونسے ادارے ہیں جو کرپشن کو پکڑنے کے دعویدار ہیں، مگر کرپشن ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، ہر دور میں سابق دور کے لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے، یہ تماشا کچھ روز ہی جاری رہتا ہے، عدالتیں، میڈیا، پیشیاں اور جیلیں۔ پھر باعزت رہائی۔

اب پاکستانی سیاستدانوں کو ایک دوسرے پر مزید باتیں کرنے کا موقع میسر آگیا

ہے، گویا ان کی بہت ہی پرانی باتوں کو ثبوت مل گیا، گویا ان کے پرانے الزامات کی تصدیق ہو گئی، ان کا کہا سچ ثابت ہو گیا۔ گویا اب حکومت کے پاس کوئی جواز نہیں رہا کہ وہ مزید اپنا کاروبار حکومت جاری رکھ سکیں۔ مگر ہوگا اب بھی وہی، جو پہلے ہوتا آیا ہے، یعنی الزامات، بیانات، اعتراضات اور آخر میں بات کا ٹھنڈا ہو جانا، معاملات پر مٹی پڑ جانا، الزامات کا ختم ہو جانا۔ چند برس بعد پھر کوئی اور ”لیکس“ برآمد ہوگی، وہ نئے انکشافات کرے گی، لوگ حیران ہوں گے، مخالفین خوش ہوں گے، اپنے پریشان ہونگے اور آخر بات آئی گئی ہو جائے گی۔ یوں جانے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی کنکری گرتی ہے اور لہروں کے باریک دائرے کناروں تک جاتے ہیں اور پانی میں پھر سکون آ جاتا ہے، یہ سلسلہ جاری ہے۔

حکمرانوں کی مراعات ہی کم کرپشن نہیں، ان کے قومی خزانے سے اٹھنے والے اخراجات بھی لاکھوں روپے ماہانہ ہوتے ہیں، قومی خزانے سے ان کے پرنٹنگ اور آفس سٹشوں پر اس قدر خرچ کیا جاتا ہے کہ اس رقم کا کچھ حصہ بھی اگر سکولوں، ہسپتالوں، پینے کے صاف پانی اور دیگر سہولتوں کے حصول پر لگا دیا جائے تو قوم کی حالت بدل جائے، رشوت ستانی اور کمیشن مافیا کا تو کوئی حساب ہی نہیں، جن لوگوں کے بچے بیرونی ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کے ٹیکس کا حساب کسی نے کیا لگانا ہے کہ اکثر ٹیکس ہی نہیں دیتے، بیورو کریٹ کروڑ پتی

ہیں، کونسا پٹواری اور تحصیل دار ہے جو کروڑ پتی نہیں۔ مگر کیا کیجئے، کوئی کرپٹ پکڑا نہیں جاتا، کیونکہ وزیراعظم، ان کی اولاد اور دیگر لوگوں سے لے کر ایکٹ پٹواری تک کی کسی کرپشن کا کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں، جب ثبوت نہ ہو تو جان لیجئے کہ اس نے کرپشن کی ہی نہیں۔ وزیراعظم نے عدالتی کمیشن بنانے کا حکم دے دیا ہے، امید ہے بہت جلد ان کو بے گناہی کا پروانہ مل جائے گا۔

ہم عوام کدھر جائیں، ہم اور ہماری پوری قیادت غصے میں ہے، ایک دوسرے سے الجھ رہی ہے، الزامات لگائے جارہے ہیں، جوابات دیئے جارہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ ٹی وی کھولیں یا اخبار پڑھیں، انسان کے جسم میں چلنے والے خون کی گردش تیز ہوتی جاتی ہے۔ پاناما لیکس نے صرف پاکستان میں ہی تہلکہ نہیں مچایا بلکہ دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے حکمرانوں کے خلاف کاروائیاں بھی شروع ہو چکی ہیں، ایک آدھ مستعفی بھی ہو چکے ہیں، باقیوں کے خلاف احتجاج بھی ہو رہے ہیں، پاکستان میں بھی ایسا ہی ہے، کیونکہ سیاستدانوں کو تو ایسے مواقع کی تلاش ہوتی ہے، اب اپنے ہاں بھی اپوزیشن اس ایک ایجنڈے پر متحد ہے، کہ ہم تو کب سے یہ الزام دہرا رہے تھے، کسی نے سنا نہیں، یا پوچھا نہیں، یا کوئی متاثر نہیں ہوا۔ مگر اب یہ معاملہ سازش نہیں بلکہ عالمی تنازع بن چکا ہے، اب حکمرانوں کا جواب دینا بنتا ہے۔ اگرچہ وزیراعظم نے اپنے ایک نشری نماخطاب میں اپنے معاملے کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے، اور ایک سابق جج کی نگرانی میں کمیشن بنانے کی نوید بھی سنائی ہے، مگر اپوزیشن مطمئن ہونے پر آمادہ نہیں، جواب ہے کہ موجودہ جج کی نگرانی میں کمیشن بنایا جائے۔

پاناما لیکس نے دنیا کے بہت سے بڑے لوگوں کی

منی لائڈ رنگ اور خفیہ کاروبار وغیرہ کی باتیں سامنے لا کر عوام کو مزید پریشان کر دیا ہے۔

حکومت کی مخالفت میں عمران خان نے بھی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، اور حکومتی ارکان نے عمران کو۔ ان بیانات سے بھی عوام کو بہت حد تک ذہنی کشیدگی کا شکار ہونا پڑ رہا ہے، کہ اب اگر احتساب نہ ہوا اور کمیشن نے درست رپورٹ نہ دی تو اب اسلام آباد کے ڈی چوک کی طرف نہیں، رائے ونڈ کی طرف رخ کیا جائے گا۔ عمران خان نے اپنا روٹ کیوں تبدیل کیا، اس کی تو خبر نہیں، تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اب وہ آب و ہوا کی تبدیلی چاہتے ہیں، یا انہوں نے یہ خبر بھی سن لی ہوگی کہ اسلام آباد کے ڈی چوک میں اب پارک بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، تاکہ وہاں احتجاج کی گنجائش ہی نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ بہت سیاست کرنے کے بعد انسان کبھی مذہب کی جانب مائل ہو جاتا ہے، عمران نے یہ بھی مناسب سمجھا ہوگا ایک تو مولانا طارق جمیل صاحب سے ملاقات ہو جائے گی، دوسرا وزیراعظم پر دباؤ کی صورت بن جائے گی، یعنی ایک ہی تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ انہوں نے ن لیگ والوں کو ایک مشورہ بھی دیا ہے، اگرچہ ن لیگ والے عمران کے مشورے کو سننے کے بھی روادار نہیں، تاہم جب مشورہ یہ ہو کہ پارٹی والے اپنے لیڈر سے حساب مانگیں، تو یا تو عمران خان بھولے ہیں، یا پھر ن لیگ کے کارکنوں کو بھولا تصور کرتے ہیں، یہاں تو عالم یہ ہے کہ پارٹی کے

منتخب ممبران اسمبلی بھی اپنے قائدین سے ملنے اور بات کرنے کو ترستے ہیں، ان بیچاروں کی کیا مجال کہ وہ اپنے لیڈروں سے کوئی سوال بھی کر سکیں؟ اگر مارگریٹ تھیچر اور ٹونی بلیئر کو پارٹی نے نکال دیا تھا تو ن لیگ کیوں نہیں پوچھ سکتی۔ عمران یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ برطانیہ ہے اور یہ پاکستان، لیڈروں کے سامنے سوال نہ کر سکتا بھی جمہوریت کا محسن ہی ہے۔

جذباتی ماحول میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے اورنج ٹرین سے متعلق ایک سیمینار سے خطاب کیا، اول سے آخر تک وہ جذبات کی رو میں بہتے رہے۔ اورنج ٹرین کے مخالفین کو انہوں نے انوکھا چیلنج کیا، کہا کہ اگر قیامت تک بھی مجھ پر کرپشن ثابت ہو جائے تو قبر سے نکال کر مجھے پھانسی دے دی جائے۔ انہوں نے مخالفین سے عدالتوں، میدانوں اور پہاڑوں میں مقابلہ کرنے کا اعلان بھی کیا، پیچاروا اور مرشد نرپر گھومنے والے مخالفین کو انہوں نے عام آدمی کا دشمن قرار دیا، جو غریب کا بھلا نہیں چاہتے۔ اپنے جذبات میں مزید رنگ بھرنے کے لئے انہوں نے ڈاکس سے ہٹ کر میز پر زور زور سے مکے بھی رسید کئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جتنی دیر سیمینار کی تیاری ہوئی، اس کا انعقاد ہوا اور وزیر اعلیٰ وہاں سے تشریف نہیں لے گئے، اس مقام سے دور دور تک ٹریفک جام رہی، یقیناً وہاں عام آدمی نہیں ہونگے۔ جذبات کی کہانی چلی ہے تو پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن نے پانا مایکس کے معاملے میں تحریک التوا جمع کروانے کی اجازت نہ

دینے پر احتجاج کیا، اس دوران انہوں نے حکومت مخالفانہ نعروں پر مشتمل فلیکسز نکالے اور لہرانے شروع کر دیئے، جس پر سپیکر نے نہایت برہمی کا اظہار کیا اور آئندہ تمام ارکان کی تلاشی لے کر اسمبلی میں آنے کے احکامات بھی جاری کئے، خواتین کے پرسوں کی بھی تلاشی لی جائے گی، اس کے بعد کیا ہوگا، آنے والے دنوں میں پتہ چلے گا۔

! قوم سے خطاب

قوم سے خطاب ایک روایت ہے، وقت تھا جب ریڈیو پر حکمران وقت قوم سے خطاب کیا کرتا تھا، بار بار یاد دہانی کروائی جاتی تھی، لوگ ریڈیو (اور جہاں کہیں ٹی وی تھا) کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اپنے صدر یا وزیر اعظم کا قوم سے خطاب نہایت توجہ سے سنتے تھے۔ خطاب کی ضرورت اس وقت پیش آتی تھی جب یا تو حکمران نیا بنا ہوتا تھا، یا پھر کوئی اہم مسئلہ ہوتا تھا جس کی وضاحت کرنا ضروری جانا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس خطاب میں بہت سے اہم فیصلے اور اعلانات قوم کو سننے کو ملتے تھے۔ اب چونکہ الیکٹرانک میڈیا نے اس قدر پذیرائی اور عوام تک رسائی حاصل کر لی ہے کہ وزیر اعظم وغیرہ کے قوم سے خطاب کی ضرورت ہی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں صدر کا ذکر کرنا ویسے بھی مناسب نہیں کہ اپنے جمہوری نظام میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں، رہ گیا پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس، تو اس میں صدر کا خطاب بھی ایک روایت ہے اور ایک عرصہ تک اس خطاب پر (پارلیمنٹ میں) بحث جاری رہتی ہے۔ تاہم صدر کے قوم سے خطاب کی نوبت اس وقت آتی ہے جب صدر ذرا اور طرح کا ہو، یعنی سیاستدان نہ ہو، اور اختیارات بھی زیادہ تراسی کے پاس ہوں۔ فوجی حکومتوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

اب وزیراعظم کا قوم سے خطاب اچانک ہی برآمد ہو جاتا ہے، ادھر سے کوئی آندھی اٹھی، ادھر صاحب نے مائیک سنبھال لیا۔ آج کل قوم سے خطاب کو ایک مزاحیہ پروگرام بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ وزیراعظم نواز شریف کے قوم سے جس خطاب کو بھی دیکھ یا سن لیں، اس میں ”چاہیے“ کی تکرار ہوتی ہے، قوم کو انہی امور سے آگاہ کیا جاتا ہے جن سے وہ پہلے سے ہی باخبر ہوتے ہیں، بلکہ بعض معاملات میں تو حکومت سے بھی زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ مثلاً قوم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر طرف لاقانونیت ہے، رشوت کلچر عام ہے، تھانے میں لوگوں کی عزت کرنے والا کوئی نہیں، تعلیم کی حالت خراب ہے، ڈاکٹر ڈیوٹیوں پر نہیں جاتے، سکولوں میں سہولتوں کا فقدان ہے، کرپشن کی خبریں بھی بتائی جاتی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں اور ظالموں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اگر ایسے خطاب پر ایک جملے میں تبصرہ کیا جائے تو وہ جملہ یہ ہوگا کہ ”یہ تقریر کسی اپوزیشن لیڈر کی زبان سے ادا کی گئی معلوم ہوتی ہے۔“

گزشتہ دنوں دنیا بھر کے امراء کے بارے میں پاناما لیکس نے یہ خبر دی ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی دولت غلط طریقوں سے غیر ممالک میں جمع کروا رکھی ہے، چھپا رکھی ہے، کاروبار میں لگا رکھی ہے۔ پاکستان کے وزیراعظم

میاں نواز شریف اور ان کی اولادوں کا ذکر بھی اس میں شامل ہے۔ چونکہ یہ رپورٹ دنیا میں ہنگامہ برپا کر چکی ہے، اس لئے اس کے پاکستان میں بھی اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اگرچہ وزیراعظم نے سابق جج کی سربراہی میں کمیشن قائم کرنے کا وعدہ فرما لیا ہے، مگر اول تو مخالفین کو سابق جج والی بات بھائی نہیں، جج کا موجودہ ہونا ضروری ہے، دوسرا یہ کہ وزیراعظم نے اپنی ہی مرضی کے مطابق والا کمیشن بھی تاحال قائم نہیں کیا۔ تاہم اس دوران انہوں نے پی ٹی وی پر نمودار ہو کر قوم سے اپنے خطاب میں اپنی اور اپنی اولاد کی صفائیاں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے اوپر یہ الزامات کئی دہائیوں سے لگائے جا رہے ہیں۔

وزیراعظم سے قوم کے خطاب کے بعد تحریک انصاف نے بھی پی ٹی وی کو مراسلہ جاری کیا ہے، جس میں پارٹی کے چیئرمین عمران خان کے قوم سے خطاب کے بندوبست کرنے کی تیاری کا کہا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پی ٹی وی قوم کے ٹیکسوں سے چلنے والا ادارہ ہے، اس پر جتنا حق نواز شریف کا ہے اتنا ہی عام آدمی کا بھی ہے۔ اُدھر اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ نے بھی عمران کے خطاب کی حمایت کی ہے۔ جماعت اسلامی کے امیر سراج الحق نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا دونوں اشخاص کے ساتھ مجھے بھی خطاب کا موقع دیا جائے۔ پی ٹی وی نے چونکہ پاناما لیکس کا بلیک آؤٹ کیا ہے، اس لئے تنقید کا سامنا ہو رہا ہے۔ پی ٹی وی نے عمران کو

بھی یہ موقع دینے سے انکار کر دیا ہے، یقیناً دوسرے لوگوں نے بھی اگر کوئی خط وغیرہ لکھا تو جواب ہی ملے گا، پہلے بھی قوم کے دیئے ہوئے ٹیکسوں کی کمائی حکمران ہی کھاتے ہیں، اب بھی وہی اس سے مستحق ہیں، کوئی اور نہیں۔ وزیراعظم کے علاوہ اگر کوئی قوم سے خطاب کر سکتا ہے، تو وہ ہے جس کا مخاطب ہوتا ہے ”اے میرے عزیز وطنو!“۔

شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ پنجاب حکومت نے مزید جدت سے کام لیتے ہوئے SMS سروس کے اپنے عوام کو ٹیکس ڈے کی آگاہی مہم چلائی۔ دس اپریل کو ٹیکس ڈے بتایا گیا اور اسی تاریخ کو اخبارات میں اشتہار بھی دیا گیا، جس کی عبارت کچھ یوں تھی، ”ٹیکس امانت.. ترقی و خوشحالی کی ضمانت... آپ بطور ٹیکس دہندہ امین ہیں، علم، روشنی، ترقی اور خوشحالی کے۔ اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی پر فخر کریں، اور ٹیکس ڈے پر اپنے بہتر کل کے لئے ٹیکس ادا کرنے کا عزم کریں..... پنجاب ریونیو اتھارٹی، حکومت پنجاب، قوم کی اس امانت کو دیانت، شفافیت اور جدت کے ذریعے خوشحالی کے وسائل میں بدلنے کے لئے کوشاں“۔ یقیناً اول الذکر مواصلاتی اشتہار تو ہر اس فرد تک بار بار پہنچا ہوگا جو موبائل کی سہولت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ بات بھی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ حکومت کے توجہ دلانے پر ہر ذی شعور پاکستانی کے دل میں ترقی، خوشحالی، بہتر مستقبل وغیرہ جیسی باتوں نے بھرپور اثر بھی کیا ہوگا، کس کی خواہش نہیں کہ وہ خوشحال بھی ہو جائے، ترقی بھی کرے اور یہ بھی کہ اس کا مستقبل بھی محفوظ اور بہتر ہو جائے۔ مگر یہاں اس حقیقت سے بھی نگاہیں نہیں چرائی جاسکتیں کہ تمام تر احساسات کے باوجود نہ تو اپنی قوم ٹیکس دینے پر

آمادہ ہوتی ہے اور نہ ہی اپنی حکومتوں کے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ وہ ٹیکس وصولی کا بندوبست کر سکیں۔

اس بات میں بھلا کیا شک ہو سکتا ہے کہ حکومتیں ٹیکسوں پر ہی چلتی ہیں، اور ملک کی ترقی و خوشحالی کے منصوبے بھی اسی صورت میں بن سکتے ہیں اور ان پر عمل ہو سکتا ہے، جب حکومت کے پاس آمدنی کے ذرائع موجود ہوں۔ اپنے ہاں ٹیکس دہندگان اور ٹیکس لینے والوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ دو طرح کے خاص مسائل ہیں جن کی وجہ سے ٹیکس کو ایک متنازع معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ یہاں ٹیکس لینے کے لئے کوئی فارمولا نہیں، جس کی لاشیٰ اس کی بھینس کا رواج ہے۔ انکم ٹیکس کے اہلکار نکلتے ہیں، جس دکان یا جس ادارے میں ان کا دل چاہے داخل ہو جاتے ہیں اور ٹیکس کے بارے میں ایک نوٹس تھما دیتے ہیں، چونکہ ٹیکس کے گوشوارے اور اس ضمن میں حساب کتاب بہت الجھا ہوا اور مشکل ہوتا ہے، ٹیکس ادا کرنے کے لئے جیب سے پیسے بھی نکالنے پڑتے ہیں، اس لئے ٹیکس دہندہ پر یہ نوٹس کسی ڈرون حملے سے کم نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں، پہلی یہ کہ مذکورہ اہلکار کی جیب گرم کی جائے، دوسرا یہ کہ کسی نہ کسی طریقے سے گوشوارے میں اثاثے اور آمدنی چھپانے کا بندوبست کیا جائے۔ سو کوئی ایک صورت ضرور نکل آتی ہے۔ خود حکومتوں کے اعلانات کے مطابق لاکھوں لوگ ٹیکس نہیں دیتے، تاہم حکومتیں ان ٹیکس دہندگان کی تفصیل

یا تعداد نہیں بتاتی جو ٹیکس دینے کی پوزیشن میں نہیں، مگر گوشوارہ انہیں بھی بھرنا پڑتا ہے، کیونکہ وہ لوگ انکم ٹیکس کے اہلکاروں کے چنگل میں پھنس چکے ہوتے ہیں۔ بہت سے کاروبار ایسے ہوتے ہیں، جن کی آمدنی سے بمشکل گزارہ چلتا ہے، مگر محکمے کے آہنی شکنجے سے وہ بچ کر نہیں جاسکتے۔

اگر حکومت کا خیال ہے کہ وہ موبائل پر میسج دے کر اور اخباری اشتہار کے ذریعے کسی کو ٹیکس دینے پر آمادہ یا قائل کر لے گی، تو خام خیالی ہے، ویسے یہ بات یقینی ہے کہ حکومت کو بھی اس حقیقت کا علم ہے، کہ ٹیکس کس طرح کشید کیا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت کو ایسے افراد ملتے ہی نہیں جو ٹیکس دینے کے قابل ہیں مگر دیتے نہیں، تو یہ بھی حیرت کی بات ہے۔ سڑکوں پر چلتی پھرتی گاڑیاں، کالونیوں میں خوبصورت مملات، بازاروں میں چمکتی ہوئی دکانیں، بڑے بڑے ادارے، بے شمار ملازمین۔ یہ تمام چیزیں سامنے ہیں، ان سے پوچھا جاسکتا ہے کہ جناب یہ اخراجات کہاں سے ہوتے ہیں، آمدنی کتنی ہے، کیا اس کا ٹیکس دیا؟ مگر افسوس کہ پوچھنے والے کی نیت صاف نہیں ہوتی۔ ایک اور اہم ترین بات یہ ہے کہ عوام سے ایک ایک چیز کی مد میں ٹیکس نہجوڑا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عوام ٹیکس سے اس لئے بھی چلتے ہیں کہ ٹیکس نہجوڑ تو لیا جاتا ہے، مگر اس کا استعمال ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی پر کم اور حکمرانوں اور بیوروکریسی وغیرہ کی مراعات اور عیاشیوں پر زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جو

افراد ٹیکس دینے کے قابل ہیں، انہیں ٹیکس نیٹ ورک میں لایا جائے اور حکومت اپنی مراعات وغیرہ میں واضح کمی کرے تو ملک خوشحال ہو سکتا ہے، ورنہ خوشحالی مقتدر طبقوں تک ہی محدود رہے گی۔

ناممکن نہیں، نصف ہزار کے قریب ایوانِ زیریں میں سے اخلاقیات کمیٹی کے لئے دو چار معزز ارکان مل ہی جائیں گے، اگر اس میں ایوانِ بالا کو بھی شامل کر لیا جائے تو یقینی طور پر بہت سے ایسے بہتر لوگ دستیاب ہو جائیں گے جو اخلاقیات کمیٹی کے ممبر بننے کے مستحق ہوں گے۔ اس اخلاقیات کمیٹی کی تجویز وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے دی ہے۔ ہوا یوں کہ وہ پاناما لیکس کی رپورٹ کے بعد اپوزیشن کی باتیں سن کر اس قدر تنگ آئے کہ انہوں نے الزامات کی تردید کے ساتھ ساتھ اپوزیشن کے بعض لوگوں پر بھی تنقید کی، اور انہیں دیگر باتوں کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ زیادہ الزامات لگانے کی بجائے اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اپوزیشن نے اس مشورے پر عمل کیا ہے یا نہیں، مگر چوہدری صاحب کی یہ تجویز بہت اچھی ہے کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام ارکان کی اخلاقیات کا جائزہ لے، تمام ارکان اپنے اثاثے ظاہر کریں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ خود کو احتساب کے لئے سب سے پہلے پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔

چوہدری صاحب کی اس تجویز پر ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر پاکستان کے سب

سے اہم ادارے کے لوگوں کو اخلاقیات سکھانے کے لئے کمیٹی بنائی جائے گی تو پوری قوم کا عالم کیا ہوگا؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ اخلاقیات کی ضرورت ہمارے قانون سازوں کو بھی ہے، دراصل ہمارے منتخب نمائندے عوام کا عکس ہی تو ہوتے ہیں، جیسے عوام ہونگے ویسا ہی نمائندہ منتخب کریں گے۔ اخلاقیات میں کیا کچھ ہوگا؟ اس کا ذکر چوہدری صاحب نے نہیں کیا، تاہم اتنا مطالبہ کیا ہے کہ تمام نمائندے اپنے اثاثے ظاہر کریں۔ کتنی بے بسی کہ پاکستان بھر سے چند سو لوگ جن کو احتساب وغیرہ کی کئی بھٹیوں سے گزر کر آگے آنا پڑتا ہے، الیکشن کمیشن کی چھان بین بھی ہوتی ہے، مگر عجیب بات ہے کہ منتخب ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ فلاں صاحب نے اپنے اثاثے چھپائے تھے، جس کی وجہ سے ان کی رکنیت معطل یا ختم کر دی گئی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو الیکشن کمیشن نے کونسی چھان بین کی، اور مخالفین نے کیا اعتراضات اٹھائے؟ منتخب نمائندوں کے بارے میں ایک لفظ 'امین' کا بھی استعمال ہوتا ہے، گویا جس نے جھوٹ بولا وہ امین نہیں ہو سکتا۔ مگر بد قسمتی سے اپنی پارلیمنٹ میں اثاثے چھپانے اور اسی قسم کی جعل سازیوں میں بے شمار لوگ ملوث پائے جاتے ہیں۔ کسی کی تعلیمی اسناد جعلی ہیں تو کسی نے الیکشن کے اخراجات کو دوسرا رنگ دے کر خود کے لئے جائز قرار دے لیا۔ کوئی بے کار، بے گھر اور بے در قرار پایا تو کوئی اپنی بیوی یا دیگر لوگوں کے گھروں میں رہتے اور دوسروں کی ہی سواریاں استعمال کرتے ہیں۔

بات صرف اثاثوں کے چھپانے تک ہی محدود نہیں، یہ لوگ اسمبلیوں میں نہ جا کر، یا
 بہت زیادہ چھٹیاں کر کے بھی غیر اخلاقی کام کا ارتکاب کرتے ہیں، اخلاقیات کا تقاضا ہے
 کہ قوم نے آپ کو ہزاروں ووٹ دے کر منتخب کیا، لاکھوں روپے الیکشن پر اچاڑے
 گئے، حکومت معزز ممبران کو تنخواہ دیتی اور پارلیمنٹ کے اجلاسوں پر کروڑوں روپے
 خرچ کرتی ہے۔ ایسے میں کوئی صاحب اگر تشریف نہیں لاتے، یا پھر آتو جاتے ہیں، مگر
 اپنی زبان سے ایک جملہ بھی ادا نہیں فرماتے تو یہ بھی غیر اخلاقی اور غیر قانونی عمل
 ہے۔ یہ لوگ چونکہ بہت حد تک با اختیار ہوتے ہیں، اس لئے یہ اپنے اختیار کا غلط
 استعمال بھی کرتے ہیں، کمیشن مافیا کا حصہ بھی بنتے ہیں اور جہاں تک بن پڑے
 اقربا پروری سے بھی کام لیتے ہیں۔ اخلاقیات کمیٹی اس بات کا بھی جائزہ لے کہ پارلیمنٹ
 لاجز میں ان معززین کی سرگرمیوں پر جو مخالفین آواز اٹھاتے رہتے ہیں، ان کی کیا حیثیت
 ہے؟ آیا ان کے الزامات میں کچھ جان ہے، یا پھر اپنے معزز ممبران کی اخلاقی حیثیت
 بہت مضبوط اور مستحکم ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ ایسی کمیٹی کبھی تشکیل نہیں پاسکے گی، کیونکہ
 اپنے پاؤں پر کلہاڑی کوئی نہیں مارتا۔ مگر ایسا ہونا ضروری ہے، کیونکہ آخر کب وقت
 آئے گا کہ دیانتدار قیادت ہی ملک کی باگ ڈور سنبھالے، ملک کو لیروں اور اسی قسم
 کے مافیائوں سے نجات ملے۔ تمام تر خواہشات اور اعلانات وغیرہ کے باوجود یہ کمیٹی
 نہیں بنے گی، اول تو اس

تجھیز کو زیر غور ہی نہیں لایا جائے گا، بصورت دیگر اس پر عمل کی نوبت نہیں آئے گی، یہی ہماری بد قسمتی ہے۔ ایسی تجھیز ایک اہم حکومتی وزیر کی طرف سے آنا مزید خوش آئند ہے۔

! اردو، سرکاری زبان، صدر کا اقدام

اردو کے چاہنے والے خوش ہو جائیں، خبر معلوم ہونے کے بعد وہ خوشی سے لوٹ پوٹ بھی ہو سکتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماں۔ اگر ان کا کوئی اور بھی رد عمل ہو تو اس پر بھی کوئی قدغن نہیں، کیونکہ نہ تو خواب دیکھنے پر پابندی لگائی جاسکتی ہے اور نہ ہی اظہار رائے کے راستے میں کوئی رکاوٹ پسند کی جاتی ہے۔ ہمارے جیسے اردو کے چاہنے والے بہت سے ایسے بھی ہیں، جو انگریزی نہ آنے کی بنا پر اردو کی حمایت میں رات دن ایکٹ کئے ہوئے ہیں۔ خیر یہ بھی کوئی بری بات نہیں، اردو کی حمایت تو کرتے ہی ہیں نا! خبر یہ ہے کہ اب اردو کو سرکاری زبان قرار دینے میں آخری رکاوٹ بھی دور ہونے کو ہے، ہی تحقیق بعد میں ہوتی رہے گی کہ آخر اردو کے راستے میں رکاوٹیں کیوں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کو دور کیوں نہیں کیا جاتا، مگر فی الحال خوشخبری یہ ہے کہ اب معاملہ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین کے ہاتھ میں آگیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان بنانا آئینی تقاضا ہے، اس میں پہلے ہی خاصی تاخیر ہو چکی ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے کام کی رفتار تیز کی جانی چاہیے۔ انہوں نے یہ گفتگو وزیراعظم کے مشیر اور قومی تاریخ اور ادبی ورثہ ڈائریکشن کے سربراہ عرفان صدیقی سے بات چیت کرتے ہوئے کی۔ مشیر صاحب صدر مملکت سے ملاقات کے لئے ایوان

صدر تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر عرفان صدیقی نے بتایا کہ اسلام آباد میں اس ضمن میں ایک میلے کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔

گزشتہ دنوں ہی حکومت نے اعلیٰ سطح پر ”یوم دستور“ منایا ہے، اس موقع پر پارلیمنٹ ہاؤس کو برقی قتموں سے روشن کیا گیا تھا، سیمینار بھی ہوئے اور سابق صدر زرداری اور دیگر لوگوں نے دستور کے حق میں بیانات وغیرہ دے کر اپنا فریضہ ادا کیا۔ اس روز پاکستان میں دستور کے بانیوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا، ان کی خدمات کو سراہا گیا، شاید دستور پر عمل کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا گیا ہو۔ تاہم یہ ضرور بتایا گیا کہ جو لوگ دستور کے مخالف ہیں وہ دراصل غدار ہیں۔ دستور کا دن تو منایا گیا مگر دستور کیا کہتا ہے، اس پر کوئی غور نہیں ہوا، اس لئے اس پر عمل کرنے کے معاملے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ دستور میں مراعات وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سی شقیں ہیں، جن میں مفت تعلیم کے بارے میں بھی کچھ رائے موجود ہے، صحت کے لئے سہولتوں کی بات بھی ہے، عوام کو بنیادی سہولتیں دینے کا حکومتی وعدہ بھی اپنی جگہ قائم ہے، تاہم حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دستور پر عمل کرے، مگر زیادہ مصروفیات کی بنا پر انہیں صرف انہی شقوں پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے، جن میں حکمرانوں اور بیوروکریسی وغیرہ کے لئے مراعات کا ذکر ہوتا ہے۔ دیگر شقیں طاقِ نسیاں پر دھری ہیں، گرد تو اُن پر نہیں پڑے گی کیونکہ اسلام آباد اور

وہ بھی پارلیمنٹ کے ایوانوں میں گرد کا عمل دخل کہاں اور کیسے ہو سکتا ہے؟

اردو کو سرکاری زبان قرار دینا بھی چونکہ آئین کا حصہ ہے، اور اب صدر مملکت نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کارِ خیر میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے حکومتی ایوانوں میں ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے میں صرف آئین کا حکم ہی موجود نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں عدالت عظمیٰ کے مسلسل احکامات کے بعد بہت مشکل سے حکومت نے اس پر عمل کرنے کا اشارہ دیا۔ مگر عمل کی نوبت نہ آئی۔ عرفان صدیقی کے ہوتے ہوئے اگر حکومتِ وقت اب بھی اردو کو سرکاری زبان قرار نہیں دیتی تو اس کا مطلب یہی لیا جائے گا کہ اس کے بعد اردو کے سرکاری زبان بننے کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔ یہاں حکومت کی جانب سے اردو کے راستے میں رکاوٹوں کی بات کا تذکرہ بہت ضروری ہے، اپنے وزیراعظم انگریزی مجبوری کی صورت میں ہی بولتے ہیں، یا یوں جاننے کہ بس گزارہ ہی کرتے ہیں، اس صورت میں انہیں اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے لئے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا، اب اگر اردو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی مزید طاقتور ہاتھ ہوں گے، جو مختلف حیلے بہانوں سے اردو کو روک رہے ہیں۔ اب صدر مملکت نے بھی

تاخیر کا نوٹس لے لیا ہے، وہ دن دور نہیں جب اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

وزیراعظم میاں نواز شریف طبی معائنے کی غرض سے برطانیہ پہنچ چکے ہیں، معائنے کے نتیجے میں اگر کچھ علاج ضروری ہو تو یقیناً وہ بھی وہیں پر کروایا جائے گا۔ ہر انسان اپنی معاشی حالت کے مطابق ہی اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے، یوں انسان درجہ بدرجہ زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کی مالی حالت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ دنیا کے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیکٹ اپ کروائیں، جہاں علاج کی تمام تر جدید اور حیران کن سہولتیں حاصل ہوں۔ وزیراعظم پر ہی کیا موقوف، ہر کھاتا پیتا آدمی علاج کے لئے باہر جاتا ہے۔ علاج یا تعلیم کے لئے بیرون ملک جانا کوئی جرم نہیں، نہ ہی طعنہ ہے، کیونکہ جہاں کوئی سہولت بہترین دستیاب ہو، انسان اُدھر کا ہی رخ کرتا ہے، شرط وہی ہے کہ جس کی جیب میں پیسہ ہوگا وہی باہر جائے گا۔ پاکستان میں باہر جا کر چیکٹ اپ کروانے یا علاج کی غرض سے باہر جانے کے عمل پر بہت تنقید کی جاتی ہے۔ جس روز وزیراعظم لندن کے لئے خصوصی طیارے سے روانہ ہوئے، لاہور میں اسی روز بنگ ڈاکٹرز نے احتجاجی مظاہرہ کیا، انہوں نے اپنے مطالبات میں دو مختلف باتوں کا ذکر کیا، اول یہ کہ اگر اپنی حکومت تمام تر طبی سہولتیں پاکستان میں فراہم کر دے تو انہیں علاج کے لئے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں، سب کچھ پاکستان میں ہو سکتا ہے۔

دوم، تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ یگ ڈاکٹرز کے احتجاج کی وجہ سے سڑک بھی بلاک ہوئی، ایک طرف ڈاکٹرز احتجاج کر رہے تھے تو دوسری جانب وہ شہری سراپا احتجاج تھے، جو ٹریفک کے جام ہو جانے کی وجہ سے پھنسے ہوئے تھے، ایسے میں یقیناً کوئی بہت جلدی میں ہوتا ہے، کوئی مریض ہوتا ہے، کسی بچے کا پیپر ہوتا ہے، کسی نے کسی تقریب یا دفتر میں بروقت پہنچنا ہوتا ہے۔

یگ ڈاکٹرز کے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں، کچھ مسائل ماسٹڈ سیٹ کی وجہ سے بھی موجود ہیں، بعض معاملات میں حمایت اور مخالفت کا عنصر زیادہ اثر انداز ہو جاتا ہے اور مطالبے کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ یگ ڈاکٹرز کا قضیہ پنجاب میں ہی ہے، دوسرے صوبوں میں اس کی بازگشت زیادہ سنائی نہیں دیتی۔ گزشتہ سالوں میں ان لوگوں کی ہڑتال بہت طول پکڑ گئی تھی، صوبائی حکومت ان کے مطالبات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی، ان کی ملازمت سے چھٹی کروانے کی منصوبہ بندی بھی سامنے آئی تھی، تاہم بعد ازاں کچھ لو کچھ دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے معاملات قابو میں آ گئے تھے۔ اب یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ سراٹھاتا رہتا ہے اور حکومت کے لئے سر درد کا موجب بنا رہتا ہے۔ سڑکیں بلاک کرنے اور جھوم جھوم کر نعرے لگا کر اپنے مطالبات پیش کرنے سے یقیناً وہ حکومت کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے، یہ الگ بات ہے کہ حکومت نے بھی اپنی رٹ قائم رکھنا ہوتی ہے، کیونکہ ساکھ کا

معاملہ ہوتا ہے۔ احتجاج تو چونکہ حق ہے، مگر ایسا بھی کوئی قانون ہونا چاہیے، جس کے مطابق احتجاج بھی ہو جائے، دوسروں کو پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے، اپنا حق مانگتے ہوئے دوسروں کا حق چھین لینا کوئی انصاف نہیں۔

دیگر مطالبوں کے علاوہ بنگ ڈاکٹرز نے ایک بات بہت سچے کی کی، کہ اگر حکمران پاکستان میں طبی سہولتیں بہم پہنچائیں تو انہیں اور دوسرے لوگوں کو علاج کے لئے باہر نہ جانا پڑے۔ یقیناً حکومتوں کے پاس اپنی کارکردگی اور صحت کے میدان میں کئے گئے اقدامات کی طویل فہرست موجود ہوگی، وہ ہسپتالوں میں فراہم کی جانے والے مشینری اور مفت ادویات کا تذکرہ بھی کریں گے، مختلف امراض کے علاج کے لئے نئے ہسپتال یا بڑے ادارے یا شعبے قائم کرنے کی بات بھی ہوگی، ڈاکٹروں کی تعیناتی اور سہولتوں کی فراہمی کا ذکر بھی ہوگا۔ دراصل حکومتوں کی نگاہ میں 'سب اچھا' ہوتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر کبھی کسی ہسپتال وغیرہ کا دورہ پڑ جائے تو سہولیات اور ناکارہ مشینری دیکھ کر حکمران سب پا بھی ہو جاتے ہیں۔ سب اچھا نہیں ہے، ہسپتالوں میں ضروری مشینری بھی موجود نہیں، جدید مشینری کو استعمال کرنے کی بجائے وہ پڑے پڑے خراب ہو رہی ہے۔ ہسپتالوں کے نظام میں خرابیاں اس قدر زیادہ ہو چکی ہیں کہ عام آدمی کے علاج کی سہولتیں بھی بعض اوقات دستیاب نہیں ہوتیں۔ بات سادہ ہے

اگر حکمران کسی چیز کو اپنی ترجیح بنالیں اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کریں تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ ان کی ترجیح اپنی مراعات، پروٹوکول اور مفادات ہیں۔

پاکستان میں ماہر ڈاکٹرز کی کمی نہیں، اگر انہیں جدید مشینری بہم پہنچائی جائے تو سب کچھ پاکستان میں ہو سکتا ہے، کروڑوں کے اخراجات بھی بچ سکتے ہیں۔

بلدیاتی الیکشن، آخری مرحلہ

بالآخر عدالتِ عظمیٰ نے فیصلہ سنائی دیا۔ ضلع، تحصیل کے چیئرمین اور میئرز کا انتخاب خفیہ رائے شماری کے ذریعے ہوگا۔ عدالت کے ریٹائر کس سو فیصد درست ہیں کہ حکومت ہر کام عدالت پر چھوڑ دیتی ہے، خود کچھ نہیں کرتی۔ موجودہ حکومت کے الیکشن میں عوام کے ساتھ وعدوں میں ایکٹ اہم وعدہ بلدیاتی الیکشن کا بھی تھا۔ مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا؟ کے مصداق حکومت نے بہت سے وعدے لپٹا پٹت ڈال دیئے اور نئی ترجیحات پر کام شروع کر دیا، ساتھ ساتھ قوم کو یہ بھی بتایا جاتا رہا کہ ہم نے الیکشن میں کئے گئے تمام وعدے پورے کر دیئے ہیں۔ بلدیاتی الیکشن کی اہمیت سے انکار نہیں، تاہم جب یہ معاملہ عدالتِ عظمیٰ میں پیش ہوا تو بھی حکومت کے کانوں پر جوں نہیں رہ گئی، پھر عدالت نے الیکشن کروانے کے احکامات جاری کئے تو بھی ٹال مٹول سے کام لیا گیا، دوبارہ حکم دیا تو مردم شماری اور حلقہ بندیوں کو جواز بنا کر انکار کیا گیا، پھر حکم ملا تو ملکی حالات کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا کہ امن وامان کی صورت حال نامناسب ہے، جس کی بنا پر الیکشن کروانے سے قیمتی انسانی جانوں کے تلف ہونے کے خدشات ہیں۔ پھر ایسا وقت آیا کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو توہینِ عدالت کا نوٹس لینا پڑا، خدا خدا کر کے حکومت نے الیکشن کروانے کا فیصلہ کر لیا۔ قبل ازیں بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کی

حکومتوں نے الیکشن کروادے تھے، معاملہ صرف پنجاب اور سندھ کا تھا۔

بلدیاتی الیکشن ایک طرف تو جمہوریت کی بقا کی ضمانت ہوتے ہیں، اس کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عوامی نمائندے سامنے آتے ہیں جو اپنے گلی محلے کے حقیقی مسائل سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں، تیسرا فائدہ یہ کہ مرکزی یا صوبائی حکومتوں پر سے کام کا بوجھ کم ہو جاتا ہے، تقسیم کار سے تمام کام اچھے طریقے سے سرانجام پا جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ مرکزی یا صوبائی حکومتوں کو اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ ضمنی یا بلدیاتی الیکشن میں ہمیشہ حکومتی پارٹی کے لوگ ہی کامیاب ہوا کرتے ہیں، لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ جن کی حکومت ہے، اسی کا بندہ جیتے گا تو اسے فنڈز وغیرہ مل سکیں گے، ورنہ جیتی ہوئی نشست کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ عوام کی اسی سوچ کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ حکومتی پارٹی ہی اکثریت حاصل کرتی ہے، تحصیلوں، ضلعوں اور دیگر کارپوریشنوں میں اسی کی حکومت بنتی ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود یہ راز کبھی فاش نہیں ہو سکا کہ آخر حکومتیں بلدیاتی الیکشن سے خوفزدہ کیوں رہتی ہیں، کیوں انہیں اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گلی محلے میں ان کے مخالفین ہی کامیاب نہ ہو جائیں، شاید اس لئے کہ وہ اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوتے، انہیں اپنے منصوبوں پر اعتماد نہیں ہوتا، انہیں اپنی خدمات پر بھروسہ نہیں ہوتا۔

پنجاب اور سندھ حکومت نے بلدیاتی الیکشن تو جیسے تیسے کروا دیئے، ہزار جتن کئے کہ ایسا نہ کرنا پڑے، مگر عدالت کے سامنے ایک نہ چلی، عوام کو بھی حکومت کے اس فرار کا علم ہو چکا تھا، تاہم مقامی سطح پر حکومتی اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ تو ہر جگہ موجود ہیں، اور چھوٹے الیکشن میں کامیابی کے ایسے ہی گھر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا، سوائے چند ایک مقامات کے اکثر علاقوں میں حکومتی پارٹیوں نے معرکہ مار لیا، سندھ میں کراچی میں ایم کیو ایم اور بدین میں ڈاکٹر ذوالفقار مرزا کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں ملا، ہر طرف صوبائی حکومت کی کامیابیوں کے جھنڈے ہی گڑے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی کچھ پنجاب میں ہوا، سوائے رحیم یار خان کے اکثر اضلاع میں حکومتی پارٹی کی اکثریت زیادہ واضح انداز میں دکھائی دے رہی ہے۔ الیکشن تو ہو چکے، اکثریت اور اقلیت کا بھی اندازہ ہو گیا، مگر منتخب لوگوں کو اختیار دینے کی کہانی 'آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا' کے مصداق ہے۔ ایم کیو ایم وغیرہ تو اختیارات کے لئے ہر طریقہ استعمال کرنے کے موڈ میں ہے، مگر پنجاب اور سندھ میں جہاں اکثریت حکومتی پارٹیوں کے پاس ہے، وہاں کوئی اختیارات کا مطالبہ کر کے عہدوں کی دوڑ سے باہر ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ حکومت نے 'خوئے بد را بہانہ بسیار' کی صورت ایک رکاوٹ یہ بھی پیدا کی کہ ضلعی، تحصیل چیئرمین اور میئر وغیرہ کے الیکشن میں 'شو آف پیئڈ' کا طریقہ اپنایا جائے گا، سپریم کورٹ نے آج حکم

جاری کر کے یہ رکاوٹ بھی دور کر دی ہے کہ یہ الیکشن قومی الیکشن کی طرح خفیہ رائے
شماری کے ذریعے ہی کیا جائے۔ اب دیکھئے حکومت کونسی نئی رکاوٹ تلاش کرتی ہے۔ یا
پھر بلدیاتی نمائندوں (جن میں سے اکثر ان کے اپنے ہیں) کو مقامی اقتدار سونپ کر
بلدیاتی الیکشن کا سارا کریڈٹ خود لینے کی مہم چلاتی ہے۔

جنازہ ہمارے ایک قریبی دوست کا تھا، ہم مقررہ وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے، بہت سے لوگ ٹولیوں میں کھڑے جنازے کے انتظار میں تھے، اور گپ شپ میں وقت گزار رہے تھے۔ ہمارا دوست کچھ عرصہ قبل ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا، بہت چاک و چوبند اور خود کو مصروف رکھنے والا انسان تھا، سماجی خدمات اس کے خون میں شامل تھیں، وہ لوگوں کے کام کروانے کے ہنر سے بخوبی آشنا تھا۔ ناراض ہونا یا غصہ کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا، ہر کسی سے محبت کا رشتہ تھا۔ ہر سال ربیع الاول میں ایک خوبصورت روحانی تقریب سجانا اس کی دیرینہ عادت تھی۔ پروگرام کے بعد ’لنگر‘ کا بندوبست ہوتا، اس تقریب میں بہت سے بڑے اور بچے شامل ہوتے تھے۔ یہ مت جانئے کہ ہمارا وہ دوست ریٹائر ہوا تو بوڑھا یا ضعیف انسان تھا۔ دیکھنے میں وہ بچپن سے اوپر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بس ایک روز فجر کی نماز پڑھ کر لیٹا اور پھر نہیں اٹھا۔ وہ سرائیکی زبان کا شاعر تھا اور ایک کتاب کا مصنف بھی۔ محافل سجانے، تقریبات کرنے اور سرکاری ملازمت کی وجہ سے اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جنازے میں ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔

جنازے کے وقت سے چند منٹ قبل میت گھر سے باہر لائی گئی، کلمہ طیبہ کی گونج میں ایک ہنگامہ سا مچا، ہر طرف گرد اڑنے لگی۔ کچھ سکون ہوا تو لوگوں نے مرحوم کے آخری دیدار کا قصد کیا اور میت کی چارپائی کی جانب چڑھائی کر دی۔ بے ترتیبی اور بے تدبیری سے یہ رسم بھی ادا ہوئی۔ جنازے کا وقت ہوا تو لوگوں نے قطاریں درست کرنا شروع کیں، کسی قطار سے کچھ لوگوں کو آگے اور کچھ کو پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیا، تاکہ قطار سیدھی دکھائی دے، یہ کام تقریباً ہر قطار میں ہوا۔ کسی طرف سے قطاروں کی تعداد شمار کرنے کی ہدایت ہوئی، قطاریں طاق ہوں، بارہ ہو گئی ہیں تو کچھ لوگ تیرھویں قطار میں چلے جائیں۔ ایک مولانا اپنے فلسفے کے مطابق کچھ گفتگو فرما رہے تھے، ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ انتظامیہ کو کسی کا انتظار ہے، مجھے جب اشارہ ہوگا میں گفتگو ختم کر دوں گا۔ وقت ہو گیا، جنازہ شروع نہ ہوا، مولانا نے گفتگو سمیٹ دی، نیت کا طریقہ بتا دیا، حتیٰ کہ جنازہ میں کیا کچھ پڑھنا ہے وہ بھی پڑھ کے سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ باتیں تو میں نے کی ہیں، مگر جنازہ ایک بہت ہی تعلیم یافتہ شخصیت پڑھائے گی، جو کہ مقامی مگر خطے کے سب سے بڑے کالج کے ایک معلم ہیں۔ اس کے بعد کہ جنازہ پڑھے جانے میں کوئی کمی نہیں تھی، مولانا کے اشارے پر ”اللہ ھو“ کا ورد شروع ہو گیا، یہ عمل طول پکڑتا گیا، ورد کرنے والے گردن کو بھی مخصوص انداز میں گھماتے اور ہلاتے تھے، اور جھوم جھوم جاتے تھے۔ بات اتنی آگے بڑھی کہ لوگ پریشان ہونے لگے۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جانب سے پولیس کا حفاظتی دستہ برآمد ہوا، انہوں نے گاڑی ایک طرف لگا دی، چند لمحوں بعد جنازہ گاہ کے سامنے سے دھول اڑاتی ہوئی پرچم والی سرکاری اور کالی گاڑی گزری۔ گاڑی رکی تو اس میں سے چھوٹے وفاقی وزیر یعنی میاں بلین الرحمن برآمد ہوئے، ان کا جنازہ گاہ میں اتارنا تھا کہ ”اللہ ھو“ کا ورد اپنی منزل کو پہنچا، گویا انتظار ہی وزیر صاحب کا تھا۔ اگر وزیر صاحب نے جنازے میں آنا ہی تھا تو انہیں اتنا معلوم ہونا چاہئے کہ جنازے کا وقت نماز کی طرح مقرر ہوتا ہے، اس میں کسی کے لئے انتظار نہیں کیا جاتا، اس لئے اس قسم کے پروگراموں میں انہیں بروقت آنا چاہیے۔ مگر شاید بروقت آنے سے ان کا وقت بھی زیادہ لگتا ہے، اور ان کی اہمیت بھی نہیں بنتی۔ شرکاء میں سے ایک تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ وزیر لوگ رابطے میں ہوتے ہیں، کہ اب جنازہ تیار ہے آپ تشریف لے آئیں۔ بات یہاں بھی ختم نہیں ہوئی، مولوی صاحبان نے جہاں پہلے معمول سے ہٹ کر معاملہ کیا، وہاں دعا میں عجیب پھلجھڑیاں چھوڑیں، ایک بڑے کالج کے پروفیسر صاحب سے یہ توقع بھلا کون کر سکتا ہے کہ وہ جنازے کی دعا کے موقع پر بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت کی تلقین کریں، بلکہ دعا کریں۔ لوگوں کے صبر کا امتحان اس وقت لیا گیا جب وزیر مملکت کی سربلندی اور ترقی وغیرہ کے لئے بھی دعائیں شروع ہو گئیں، وزیروں کا اقبال تو پہلے ہی بہت بلند ہوتا ہے، مگر یہ مولوی حضرات تو

معاملہ کو اس قدر اچھا لیتے ہیں کہ زمین آسمان آپس میں ملتے دکھائی دیتے ہیں، یعنی جنارہ سے قبل اور جنارہ کے بعد کے تمام معاملات میں سب سے اہم شخصیت وزیر صاحب ہی تھے، گویا اللہ معاف فرمائے یہ تقریب ہی وزیر صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی؟

ملتان، سب سیکریٹریٹ؟

اہالیانِ جنوبی پنجاب خوش ہو جائیں کہ گورنر پنجاب ملک رفیق رجوانہ نے اُن کو ایکٹ خوشخبری سنا دی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ”جنوبی پنجاب کے لئے ملتان میں سب سیکریٹریٹ بنانے کے لئے بھرپور کاوشیں کر رہے ہیں، دو تین ماہ میں ایڈیشنل سیکریٹری کا تقرر ہو جائے گا، اس سے جنوبی پنجاب کے عوام کو ریلیف حاصل ہو گا۔“ جنوبی پنجاب کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ ہم محرومی کا شکار ہیں، اور یہ بھی کہ اس محرومی کی ذمہ داری حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ حکومتوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے محروم علاقوں کے لئے بہت سے ترقیاتی کام کئے ہیں، یا کرتے ہیں، یا کر رہے ہیں، یا کریں گے، حکومتوں کے پاس دوسری اور اہم دلیل یہ ہے کہ جنوبی پنجاب میں بہت سے افراد کو کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ ملتا رہتا ہے، اس ضمن میں ایسے افراد کی فہرست بارہا اس کالم کا حصہ بن چکی ہے، جن میں وزیراعظم، سپیکر قومی اسمبلی، گورنر اور بہت سے اہم وفاقی وزیر شامل ہیں۔ اس طرح اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو حکومتی موقف ہی درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اہم عہدوں کی موجودگی میں بھی اگر کوئی علاقہ محرومی کا شکار ہے تو پھر اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اب جنوبی پنجاب کی ترقی اور عوام کے مسائل کے حل کے لئے اگر ملتان میں گورنر کا سب سیکرٹریٹ قائم ہو رہا ہے، تو پہلے اس کی ضرورت کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ گورنر کا عہدہ ایک آئینی تقاضا ہونے کے ساتھ ساتھ محض ایک نمائشی عہدہ ہے، جس کے اختیارات صرف کاغذی ہیں، یعنی گورنر کے دستخطوں تک محدود ہیں، اسمبلی نے کوئی قانون پاس کر دیا تو گورنر نے اس پر دستخط کرنے ہوتے ہیں، صوبہ بھر کی یونیورسٹیوں کے چانسلر کی حیثیت سے طلباء و طالبات کی ڈگریاں بھی ان کے دستخطوں کی محتاج ہیں، مت جانے کہ ہزاروں طلباء و طالبات کی ڈگریوں پر وہ رات دن ایک کر کے دستخط کرتے ہیں، بلکہ ان کے دستخطوں پر مشتمل ایک مہر بنوالی جاتی ہے، جو ڈگری پر ثبت کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کبھی حکومت کی مجبوری یا ایمر جنسی ہو تو کوئی آرڈیننس وغیرہ بھی جاری کروایا جاتا ہے، جو گورنر کے ہی دستخطوں سے قابل عمل ہوتا ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے عناصر ہونگے، جہاں گورنر کے دستخط کی ضرورت ہوتی ہے، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ گورنر کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے۔ ان کی دوسری اہم مصروفیت یا ذمہ داری تقریبات میں شرکت کرنا ہے، پنجاب بھر کی جامعات میں جانا ان کے فرائض میں شامل ہے، ممکن ہے کہ وہ جامعات کے معیار اور معاملات کا جائزہ بھی لیتے ہوں اور ان کی کارکردگی پر بھی بات چیت کرتے ہوں، ان کی آؤٹ پُٹ کا احوال جانتے ہوں، اور آخر میں صورت حال کو اطمینان بخش قرار

دیتے ہوں۔

اگر گورنر جوانہ یہ کہیں کہ ملتان میں سب سیکریٹریٹ بننے سے عوام کو ریلیف ملے گا تو اس بیان کی حیثیت ایک روایتی کاروائی سے زیادہ کچھ نہیں، عوام کا بھلا گورنر سے کیا تعلق؟ اور گورنر کا مسائل کے حل سے کیا واسطہ؟ نہ وہ منصوبے بنانے کے مجاہد ہیں، نہ وہ منصوبوں پر عمل کروانے کے اختیارات رکھتے ہیں۔ اگر ایک گورنر وفاق کا نمائندہ ہوتا ہے تو اپنے ہاں وفاق پنجاب حکومت کو اپنے نمائندے کے ذریعے بال برابر بھی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا، اور نہ ہی گورنر اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ پنجاب حکومت کو ہدایات دیں۔ ایک سراسر غیر سیاسی عہدہ دار ہونے کے باوجود اپنے ہاں ہر گورنر نہ صرف اپنے پارٹی قائدین کا بھرپور شکر گزار ہوتا ہے بلکہ پارٹی پروگراموں میں شرکت اور کارکنوں کو گورنر ہاؤس میں دعوتیں وغیرہ دیتا اور خود ان کے ہاں پروگراموں میں شرکت کرتا ہے۔ موجودہ گورنر بھی اس خوبی میں دوسروں سے پیچھے نہیں۔ گورنر خوب جانتے ہیں، اور اب عوام بھی اس معاملے سے خوب آگاہ ہو چکے ہیں کہ گورنر کے پاس ایسے کوئی اختیارات نہیں ہوتے جن سے عوام کو ریلیف مل سکے، البتہ ملتان میں بننے والی میٹرو سروس کی تشہیر اور اس کے لئے بیان بازی کو گورنر اپنے کھاتے میں ڈال کر اپنے بیانات کو مزید جاندار بنا سکتے ہیں۔ کسی حد تک اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ وہ کچھ ترقیاتی فنڈ حاصل کرنے میں بھی

کامیاب ہو جائیں، تاہم یوسف رضا گیلانی کی طرح وہ فنڈ بھی ملتان میں لگے گا، جنوبی
پنجاب کا اکثر علاقہ ”کچے“ کا منظر ہی پیش کرتا رہے گا۔ ترقیاتی منصوبے تو ملتان سے
آگے ڈیرہ غازی خان تک نہیں پہنچنے پاتے، جس کا خمیازہ حکومتوں کو بھگتنا پڑتا ہے، کبھی
عوام کے غضب کی صورت میں اور کبھی ’چھوٹو گینگوں‘ کی صورت میں۔

خادم حسین جب بھی میرے پاس آتا ہے، مجھے کالم کے لئے کوئی نہ کوئی ایٹو مل جاتا ہے، شاید وہ بھی اسی دن آتا ہے جس روز اس کے پاس کوئی نہ کوئی اہم بات ہوتی ہے۔ حساس ہونا کسی کی وراثت نہیں، بہت سے عام لوگ بھی بہت حساس ہوتے ہیں، اور بسا اوقات بہت دانش اور حکمت کی باتیں بھی کر جاتے ہیں، خادم کا مزاج بھی ایسا ہی ہے۔ اس کی باتوں میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی بعض آپ بیتیاں بھی کالم کا موضوع بن جاتی ہیں۔ اس نے مجھ سے ایک سڑک کے بارے میں معلوم کیا کہ آیا میرا وہاں سے ایک دو روز میں گزر ہوا ہے یا نہیں، میرے اقرار پر اس نے نیا سوال داغا کہ فلاں جگہ پر آپ نے فلاں لیڈی ڈاکٹر کا کلینک دیکھا ہے، میرے انکار پر اس نے ٹھنڈی آہ بھری، ایک اہم سڑک پر ایک خوبصورت سے گھر کو کلینک کا درجہ دیا گیا تھا اور بہت ہی دلکش انداز میں کلینک اور ڈاکٹر کا نام درج کیا گیا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ فی زمانہ دکان اسی صورت میں چمکتی ہے، جب وہ اچھی جگہ پر ہو، اس کی تزئین و آرائش کا خوب بندوبست ہو اور اس کی پبلٹی بھی بہترین طریقے سے کی جائے۔ اس نے میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس مہنگے علاقے میں اس قدر اخراجات کے پیچھے کیا فلسفہ ہے؟ ظاہر ہے ایک لیڈی ڈاکٹر میٹرنٹی ہوم چلا رہی ہیں، یہاں زرنگی کے

معاملات درپیش ہوتے ہیں، زچہ بچہ کی نگہداشت کی جاتی ہے، اور اپنی سروسز کے نام پر ہی لوگوں سے رقم وصول کی جاتی ہے۔ ”یہ روایتی باتیں ہیں“، اس نے کہا، ”اور یہ جاننا بھی آپ لوگوں کا فرض ہے کہ مریضوں سے وصولی کتنی ہوتی ہے اور ان کے اخراجات کس قدر اٹھتے ہیں؟“

مسئلہ یہ ہے کہ خادم حسین سمیت ہر فرد صحافیوں کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ جب بات ان تک پہنچ جائے گی تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اس نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”مگر مجھے جس بات کا صدمہ کھائے جا رہا ہے وہ کچھ اور ہے“، میں اس کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا، چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے بتانا شروع کیا، ”... تقریباً آٹھ دس سال قبل مجھے بھی اسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تھا، تب موصوفہ کلینک اور جگہ پر تھا۔ اس نے زچگی کے بارہ ہزار روپے لئے تھے، میں نے نئی زندگی اور مجبوری کے عالم میں اس رقم کا بندوبست کیا تھا۔ ڈاکٹر نے چند منٹ ہی دیئے، ایکٹ ننھا فرشتہ ہمارے حوالے کیا اور گھر کی راہ لی، رات کے تقریباً گیارہ کا وقت تھا۔ ہم لوگ ابھی مسرت و فرحت کے لمحات سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ کلینک کی نرس (عمر کے اعتبار سے وہ نرس کی والدہ کے برابر تھی، سچ تو یہ ہے کہ وہ ویسی دائی تھی) ہمارے کمرے میں خیر سگالی دورے پر آئی، کہ کاروائی بھی ہو جائے اور ’مٹھائی‘ بھی مل جائے۔ بے نیازی میں ہی اس نے معلوم کیا کہ بچہ ’سیلپیڈا‘

تو نہیں ہو رہا، گویا ایسا ہو رہا تھا، اسی کی جانب اس کا اشارہ تھا۔ اس نے نیک مشورہ دیا کہ اسے ہسپتال لے جائیں کیونکہ اسے آنکھیں کی کمی ہو رہی ہے اور وہ یہاں دستیاب نہیں۔ اس کے بعد ہم بڑے ہسپتال گئے، کہاں کہاں گئے، کیا کیا بتی، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بچہ بہت کمزور تھا، ذرا بڑا ہوا تو محسوس ہوا کہ وہ ہماری باتوں پر توجہ نہیں دیتا، جب بیٹھنے کی عمر کو پہنچا تو معمول سے کمزور تھا، ڈاکٹر نے ہمیں زار داری میں صدمے کی خبر سنائی کہ آپ کا بچہ ”من موجی“ ہوگا۔ تقریباً چار سال کی عمر میں اس نے چلنا شروع کیا، اب وہ خود کھانے پینے سے بھی قاصر ہے، چلنے میں بھی پاؤں کے اگلے حصے پر وزن ڈال کر چلتا ہے، پورا پاؤں نیچے نہیں لگاتا، دماغی طور پر بھی مکمل تندرست نہیں، خود واش روم بھی نہیں جاتا، گھر میں اس کے لئے ہمیں مسلسل ایک فرد کو ڈیوٹی دینا پڑتی ہے، ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے، وہ بہت حد تک دوسروں کو پریشان کر کے رکھتا ہے۔ باتیں بتاتے بتاتے اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں، مستقل صدمے کے آثار... اس کے چہرے سے عیاں تھے، وہ زبانِ حال سے مجھ سے یہ سوال کر رہا تھا کہ یہ عظیم الشان میسر نئی ہومز ہمارے جیسے لوگوں کے خون پسینے کی کمائی سے بن رہے ہیں، کیا سہولتیں مکمل نہ کر کے بچوں کو مستقل معذور کرنے کا جرم قابلِ معافی ہے؟

گزشتہ روز ہمیں اپنے شہر کی لائبریری جانے کے اتفاق ہوا، یہ کوئی عام لائبریری نہیں، اس کی عمارت ہی اس قدر عالیشان ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ اس کو تعمیر ہوئے نو دہائیاں ہو چکی ہیں، گویا صدی کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ اس کا بڑا بلند، روشن اور ہوادار ہال ہے، جس کے فرش سے چھت تک کشادگی اور خوبصورتی جھلکتی ہے، چھت بہت بلند ہے جس کی وجہ سے اس عمارت میں گرمی کا احساس بھی نہیں ہوتا، بانوے برس قبل تعمیر ہونے کی وجہ سے روشن اور ہوادار تو ہے ہی، اس عمارت کے گرد برآمدہ ہے، جس سے جہاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے وہاں اس میں پائے جانے والے موسم میں بھی خوشگوار تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اس عمارت کے کونوں میں مینار بھی ہیں، جو اس کے طرز تعمیر کے اسلامی تشخص کا ثبوت ہیں۔ اس عظیم الشان عمارت کے ارد گرد خالی جگہ ہے، جس میں گھاس اور درخت موجود ہیں۔ لائبریری انتظامیہ نے بعض برآمدوں میں قالین بچھوا رکھے ہیں، جن پر بیٹھ کر مختلف تعلیمی اداروں کے طلبہ پڑھتے ہیں۔ یہ خوبصورت ذکر خیر سینٹرل لائبریری بہاولپور کا ہے، یہ پنجاب بھر میں دوسری بڑی لائبریری ہے۔

لائبریری میں کسی سکول کے بچے بھی آئے ہوئے تھے، چیف لائبریرین رانا جاوید

اقبال نے بچوں اور ان کے اساتذہ سے بات چیت کی، انہوں نے کتاب کی اہمیت بیان کی، کتاب سے محبت اور دل لگانے کا کہا، اور بتایا کہ جو مزہ کسی کتاب کو کھول کر ترتیب سے پڑھنے کا ہے، وہ کمپیوٹر وغیرہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ کتاب کو جب چاہیں بغیر کسی ڈیٹا، بنا بجلی اور بندوبست کے بغیر پڑھا جاسکتا ہے، مگر کمپیوٹر کے لئے لوازمات چاہئیں ہوتے ہیں، انہوں نے کمپیوٹر کی ضرورت اور اہمیت کی بات بھی کی، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اساتذہ ہی بچوں کو کتابوں کی جانب راغب کر سکتے ہیں، پہلے وہ خود اس ماحول سے مطمئن اور متاثر ہوں اور پھر اس کے بعد بچوں کو اس کی طرف لائیں تاکہ بچوں میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا جاسکے۔ انہوں نے وہاں موجود سکول اور اس کے اساتذہ کو پیشکش کی کہ وہ لائبریری آیا کریں، بلکہ الحاق کریں ہم آپ لوگوں کو مفت خدمات فراہم کریں گے، اور کتابیں ایٹھ کیا کریں گے۔

کتاب سے دوری کا ماتم تو ہم سب ہی کرتے ہیں، کتاب کی طرف قارئین کا رجحان پہلے سے بھی کم ہوتا جا رہا ہے، کتابوں کا معیار بھی شاید گرتا جا رہا ہے، اسی لئے کتابوں کے دور کا بستر گول ہوتا جا رہا ہے، لائبریریاں آنے والوں کی راہوں میں پلکیں بچھائے کھڑی ہیں، کتابیں منتظر ہیں کہ کوئی آئے، ان پر پڑی گرد جھاڑے، انہیں کھولے اور کچھ فیض پائے، یہ مائل بہ کرم کھڑی عمارتیں اور ان میں تہہ در تہہ پڑی کتابیں کسی سائل کے انتظار میں ہیں، مگر کیا کریں

کوئی فیض حاصل کرنا ہی نہیں چاہتا۔ بس وہ لوگ جو کسی تحقیقی کام میں ضروری کتابوں کی تلاش میں ہوتے ہیں، یا وہ لوگ جو کچھ ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں، یا پھر کچھ سٹوڈنٹس جو امتحانات وغیرہ کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں انہیں یہاں مناسب ماحول مل جاتا ہے۔

کتابوں سے دور رہنے کا رونا اپنی جگہ، پہلی بات تو یہ ہے کہ کتابوں سے اپنی قربت ہی کب تھی جو اس قدر دوری ہو گئی ہے، دوسری اور اہم وجہ یہ ہے کہ جب سے آئی ٹی نے اپنا کام دکھایا ہے، تب سے کتاب کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، بہت ساری معلومات نیٹ سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ مگر جو مطالعہ انسان کے دل و دماغ کو کشادہ اور روشن کرتا ہے، سوچ کی نئی راہیں کھولتا ہے، حکمت کے راستے دکھاتا ہے، تنگ نظری اور گھٹن سے نجات دلاتا ہے، وہ کمپیوٹر سے حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے لئے کتاب سے کسب فیض ہی کرنا پڑے گا۔ مگر اصل المیہ یہ ہے کہ کتابوں کے مطالعہ کی کہانی تو دور کی بات ہے، ہماری نئی نسل کمپیوٹر اور موبائل سے ہی معلومات اور ریسرچ کی کوئی گہری کھوج لگانے کے چکر میں ہے، پرانے لوگ اور پرانی کتابیں اور پرانی باتیں سب دقیانوسی معاملات ہیں، جن پر چل کر ترقی کی منازل حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چند ضروری معلومات کے علاوہ ہر وقت نیٹ اور کمپیوٹر وغیرہ سے کھیلنا یا موبائل سے پیغام رسانی اور فیس بک پر گھنٹوں وقت ضائع کرنا خود کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔

مگر

مطالعہ کی عادت کیسے ڈالی جائے، مطالعہ کے لئے ماحول کیسے دیا جائے، ان باتوں پر غور
اور عمل کرنے کی ضرورت ہے، جو کہ نہیں ہو رہا۔ جب عمل نہیں ہوگا تو نروال کو روکنا
ممکن نہیں ہوگا۔

چھوٹو گینگ، پنجاب حکومت کی ناکامی، پولیس کی نااہلی، عوام کدھر جائیں؟

عین ممکن ہے کہ ان سطور کے شائع ہونے تک چھوٹو گینگ کا قلع قمع ہو چکا ہوگا، جنوبی پنجاب کے آخری اور پسماندہ اضلاع میں کچے کا علاقہ ڈاکوؤں سے پاک ہو چکا ہوگا۔ کچے اور قرب و جوار کے پکے کے باسی بھی اپنی عزت، جان اور مال کی امان پائیں گے، سکون کا سانس لیں گے، حکومت اور پولیس کو کوسنے اور پاک فوج کو دعا کیں دیں گے۔ چھوٹو گینگ نے ایک عرصہ سے راجن پور اور رحیم یار خان کے ملحقہ علاقوں میں دہشت پھیلارکھی تھی، آئے روز قتل اور اغوا، برائے تاوان کی خبر آ جاتی تھی، یہ گینگ علاقے میں دہشت اور خوف کی علامت جانی جاتی ہے۔ پولیس نے متعدد مرتبہ آپریشن کیا، مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اب بھی آپریشن کا آغاز تو پولیس نے ہی کیا تھا، مگر حسبِ روایت ناکامی ہی مقدر بنی، مگر اب معاملہ اس قدر آگے بڑھ چکا تھا کہ حکومت کی ناکام واپسی کا مطلب یہی تھا کہ چھوٹو گینگ کو الگ ریاست کا پروانہ دے دیا جائے۔ اسی لئے یہاں فوج بلانا پڑی۔ کیونکہ ہر حکومتی ناکامی پر فوج ہی طلب کی جاتی ہے۔ یہاں جرائم پیشہ لوگوں کی پناہ گاہ ہونے کی بنا پر شمالی وزیرستان میں ”ضرب عضب“ کے بعد سے پیدا ہونے والی صورت حال کے اثرات یہاں بھی دیکھے گئے، وہاں سے بچ نکلنے والے دہشت گردوں نے بھی ان ٹھکانوں کو اپنی کمین گاہ بنالیا، جس کی وجہ

سے بھی یہاں آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔ اب ڈاکوؤں نے یرغمالی پولیس اہلکاران کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہوا ہے، امید ہے فوجی آپریشن میں معاملات قابو میں آجائیں گے۔

گینگ کیوں بنتے ہیں؟

چھوٹو گینگ کیسے وجود میں آیا؟ اس سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے ہاں عموماً ڈاکوؤں وغیرہ کو ہیر و بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے، فلموں کو دیکھ لیں، کسی ڈاکو کی تاریخ پڑھ لیں، معلوم ہوگا کہ وہ بہت ہی شریف اور اچھا انسان تھا، حالات کی ستم ظریفی نے اسے بد معاش بنا دیا۔ اس میں بہت حد تک حقیقت بھی ہوتی ہے، مگر ہمیشہ ایسے نہیں ہوتا۔ چھوٹو تو چند برس پہلے تک راجن پور کی منتخب شخصیات کا دستِ راست بھی تھا۔ اپنے ہاں جاگیر داروں کو اپنی حفاظت کے لئے یا دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے چند بدوق، بردار اپنے ساتھ رکھنے پڑتے ہیں، چھوٹو کی حیثیت بھی ایسے ہی تھی، تعارف اور بات آگے بڑھی، پولیس سے بیٹنگیں بڑھیں، وہ پولیس کا مخبر بن گیا، پھر جرائم کی دنیا میں اترنے میں اسے پولیس کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جب گینگ کے ٹھکانے پر حملے کئے گئے تو یہ جواب ملا کہ اغوا شدہ پولیس اہلکاروں کو نہیں چھوڑا جائے گا، کیونکہ ہمیں یہاں تک پہنچانے والی پولیس ہے، جو جرائم میں باقاعدہ ہماری معاونت کرتی تھی اور باقاعدہ حصہ بٹورتی تھی۔

ڈاکو بنانے کے عوامل میں بے روزگاری بھی شامل ہے، پولیس تشدد اور معاشرے کی ناہمواریاں بھی اس کی وجہ ہیں، تاہم بد معاش اور ڈاکو صرف مظالم سہتے سہتے ہی نہیں بنتے، بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شوقیہ اس طبقے کا حصہ بن جاتے ہیں، یوں جب بہت سے لوگوں کے مفادات آپس میں جڑ جاتے ہیں تو گینگ وجود میں آتا ہے۔

!کچے کا علاقہ

کچے کے علاقے کے بارے میں شہروں، دور دراز اور بالائی علاقوں میں بیٹھے ہوئے لوگ درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ انہیں اس بات کا علم نہیں کہ دریائے سندھ راجن پور کے ان علاقوں میں کس طرح سیلاب کے دنوں میں پھیل جاتا ہے، وسیع علاقہ زیر آب آنے کی وجہ سے زیادہ تر علاقہ عوام کے زیر کاشت نہیں آتا، کیونکہ نہ وہ جگہ ہموار ہوتی ہے، اور نہ ہی محفوظ۔ کچے کے علاقے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نہ سڑکیں ہوتی ہیں اور نہ مناسب راستے۔ شہروں سے کچے کی جانب جاتے ہوئے پہلے پہل تو سڑکیں اور فصلیں دکھائی دیں گی، مگر جوں جوں دریا قریب آتا جاتا ہے، یہ دونوں چیزیں منظر سے غائب ہوتی جاتی ہیں۔ اس ویران اور دشوار گزار علاقے کو ہمیشہ سے جرائم پیشہ لوگوں نے اپنی آماجگاہ بن رکھا ہے۔ اب وہاں نہ صرف یہ کہ چھوٹو گینگ کا قبضہ ہے، بلکہ انہوں نے پختہ مورچے بھی بنا رکھے ہیں، دریا یہاں چونکہ زیادہ پھیلاؤ میں

ہوتا ہے، اس لئے اس کی کئی شاخیں بھی بن جاتی ہیں، اسی طرح دو شاخوں کے درمیانی حصہ کو چھوٹو گینگ نے اپنی ریاست بنا رکھا ہے۔ یہ جزیرہ نما علاقہ کچھ جہال کہلاتا ہے، اس کی لمبائی تقریباً نو کلو میٹر اور چوڑائی ڈھائی کلو میٹر ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پولیس نے کشتیوں پر بیٹھ کر جزیرے کی جانب پیش قدمی کی تھی اور جس کے نتیجے میں ساتھ پولیس اہلکار شہید اور چوبیس یرغمال بنائے گئے تھے۔

آپریشن کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

اگر کسی مسئلے کو بروقت قابو کر لیا جائے تو بعد میں مسائل پیدا نہیں ہوتے، زندگی تندرست گزرتی رہتی ہے، خرابی کی صورت میں اول اول پر ہیز سے کام چل جاتا ہے، اگر بات مزید بڑھ جائے تو دوائی کی ضرورت پڑتی ہے، جب کام دوائیوں سے بھی باہر ہو جائے تو پھر آپریشن سے مسئلہ حل کیا جاتا ہے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ متاثرہ عضو ہی کاٹنا پڑ جاتا ہے۔ راجن پور میں کچے کے علاقے میں ڈاکوؤں کو قابو کرنے کے لئے بات آپریشن تک پہنچ گئی، نوبت یہاں تک پہنچی کیسے؟ اس کے پیچھے سالوں کی داستانیں ہیں اور سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت اور پولیس کی ہے، سیاستدانوں کا ہاتھ بھی رد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ سرپرستی کے بغیر ایسی کاروائیاں آسان نہیں ہوتیں۔ ڈی سی اور راجن پور کے بقول اس آپریشن میں ڈیڑھ ہزار فوجی، تین سو رینجرز اور سولہ سو پولیس

اہلکار حصہ لے رہے ہیں۔

پولیس آپریشن کی ناکامی کی وجوہات

چھوٹو گینگ ہو یا کوئی اور، پولیس کے پاس ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی بھی مناسب بندوبست نہیں ہوتا۔ اب بھی یہی ہوا، کہا جاتا ہے کہ جب پنجاب پولیس کے سربراہ نے ہر قیمت پر یہ آپریشن کرانے کا فیصلہ کیا تو مقامی پولیس کے کچھ لوگوں نے انہیں مناسب تیاری وغیرہ کی طرف توجہ دلائی، پرانا (کسی حد تک ناکارہ) اسلحہ اور مناسب منصوبہ بندی کے بغیر آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا، مگر صوبہ کی پولیس کے سربراہ نے یہ عزم کر رکھا تھا، انہوں نے کہا کہ اگر آپ لوگ نہیں جانا چاہتے تو میں خود آگے جا کر لڑوں گا۔ ان کی دوسری خواہش پوری نہ ہو سکی، چنانچہ اہلکار اگلے مورچوں پر موت کے منہ میں اور آئی جی صاحب لاہور کے ٹھنڈے دفتر میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اگرچہ آپریشن کے مختلف مراحل میں موقع پر موجود رہ کر اپنے اہلکاروں کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی، مگر زمینی حقائق مختلف تھے۔ سات اہلکاروں کی شہادت ہی ایک المیہ نہ تھا، دودرجن ساتھیوں کی یرغمالی ہی تکلیف دہ نہ تھی، اسلحہ بھی کم تھا، پرانا بھی اور کھانے پینے کی اشیاء کی کمی کی خبریں بھی عام ہیں، وہ اہلکار کسی تیاری کے بغیر موت کے منہ میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اوپر سے انہیں بھوک پیاس کا سامنا بھی تھا۔ مزید شرمناک صورت حال یہ ہوئی کہ ڈی پی اور راجن پور

اور چھوٹو کی گفتگو کا ریکارڈ بھی منظر عام پر آیا، جس میں ڈی پی او نے چھوٹو کے ترلے کئے اور لاشیں اور یرغمالی واپس کرنے کی درخواست کی، اسے بہادر مرد قرار دیا۔ جواب میں چھوٹو نے چوکیاں خالی کرنے کا حکم دیا، اگرچہ حکومتی حلقوں نے اس گفتگو کو جعلی قرار دیا۔

پولیس کی اس آپریشن میں ناکامی کی ایک وجہ نہیں۔ اپنے ہاں پولیس کے معاملات ہمیشہ متنازع رہے ہیں۔ حکومتیں پولیس کی اصلاح کے دعوے کرتی ہیں، براہ راست بھرتیاں کی جاتی ہیں، ان کی تربیت کا مستقل بندوبست ہوتا ہے، ان کی تنخواہوں میں معقول اضافہ ہو چکا ہے، ان کو بہت حد تک جدید سواری اور اسلحہ کی دستیابی کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے، مگر پولیس کو کبھی بھی پیشہ ورانہ مہارتیں حاصل نہیں ہو سکیں، وہ دیسی طریقے سے ہی اپنے کاروبار ملازمت کو چلاتے ہیں۔ حکومتیں پولیس کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں، جن کی وجہ سے عوام کی جان و مال کی بجائے پولیس حکمرانوں کے جان و مال کی محافظ ہے۔ اگر کبھی کہیں احتجاج یا جلسہ وغیرہ ہے، تو اس کے باہر پولیس اہلکار باقاعدہ سوئے ہوئے پائے جاتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ نہ ان کو آرام ملتا ہے اور نہ ڈیوٹی کے اوقات متعین ہیں۔ ان کی تربیت میں انہیں چاک و چوبند بنانے کا عمل سست ہے، اگر ایلپیٹ فورس وغیرہ میں کچھ تیزی ہے تو اس کا استعمال بھی کرنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اب اگر فوج آپریشن کر رہی ہے تو اس میں کامیابی

کے امکانات سو فیصد ہیں، مگر اس آپریشن کی صورت میں اہم مجرموں کو زندہ گرفتار کیا جانا کافی مشکل کام ہے، شاید حکومت بھی ایسا نہیں چاہتی، کیونکہ جب ملزم گرفتار ہوتے ہیں تو وہ بہت سے اہم انکشافات بھی کرتے ہیں، جن سے حکمرانوں کی ہی سبکی ہوتی ہے، کراچی میں یہی کچھ ہو رہا ہے، ریجر جس فرد پر ہاتھ ڈالتی ہے، وہ 'را' کی معاونت کا اعتراف کرتا ہے۔ یہاں کچے میں بھی ڈاکوؤں کے پاس پایا جانے والا اسلحہ بھارتی ہے، گویا یہاں بھی 'را' اپنا کام دکھا رہی ہے۔

! پولیس مقابلے

آئے روز اخبارات اور میڈیا پر پولیس مقابلے کی رودادیں آئی ہوتی ہیں، ان میں جگہ، افراد اور واقعہ مختلف ہوتا ہے، مگر سنووری ایکٹ ہی ہوتی ہے، اس میں ذرہ بھر فرق نہیں ہوتا۔ بتایا جاتا ہے کہ ملزموں کو پیشی پر، یا فلان مسئلے کی نشاندہی کے لئے لے جایا جا رہا تھا، راستے میں ملزم کے حامیوں نے اپنے ساتھیوں کو چھڑوانے کے لئے حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں ملزم پولیس مقابلے میں جان کی بازی ہار گئے۔ ایسے مقابلے میں کبھی کسی پولیس اہلکار کو معمولی زخم بھی نہیں آتا، ظاہر ہے جب اہتمام کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا تو کسی کو خراش کیسے آئے گی۔ مگر اس عمل کو بھی ستم ظریفی کہیے کہ جب کبھی اصلی پولیس مقابلہ ہوتا ہے، تو ڈاکو یا جرائم پیشہ لوگوں کا ایک آدھ فرد مارا جاتا ہے

یا ایکٹ دوزخی ہو جاتے ہیں، مگر پولیس کا کوئی نہ کوئی اہلکار ضرور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقابلوں میں بھی پولیس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ جب واسطہ راجن پور کے کچے جیسے اصلی پولیس مقابلے سے ہو تو پھر نتیجہ کیا ہوگا، سب کے سامنے ہے۔ کچے کے یہ علاقے طویل عرصے سے ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہیں۔ یہاں جب بھی اصلی مقابلے ہوئے تو پولیس کے افسران سمیت اہلکاران شہید ہوتے رہے۔

! خون رائیگاں نہیں جائے گا

خون انسان کے اثاثوں میں قیمتی ترین اثاثہ ہے، اور جب کوئی اس کا نذرانہ پیش کر دے تو اس کے بارے میں عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ ”شہیدوں کا خون رنگ لائے گا“ یا شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔“۔ پنجاب پولیس کے سربراہ مشتاق سکھیرا نے ”پولیس کے شہدائے بھی یہی محاورہ استعمال کیا ہے۔ پنجاب حکومت نے موقع کی مناسبت اور اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کے لئے فوری طور پر ان شہدائے اہل خانہ کے لئے پچاس پچاس لاکھ روپے امداد دینے کا اعلان کر دیا ہے، گھر کے لئے بھی پیسے دیئے جائیں گے اور لواحقین میں سے کسی ایک کو ملازمت بھی دی جائے گی۔ شہید کے ورثا کی امداد ریاستی فریضہ ہے، جو اپنی حکومت خوب نبھاتی ہے، پنجاب میں اکثر مقامات پر مظلوم کے گھر وزیر اعلیٰ خود پہنچ جاتے ہیں اور پانچ لاکھ کاحیک بھی دے آتے ہیں، تاہم جس وجہ سے

کسی کی جان گئی اس کے سبز باب کے لئے حکومت نے کم ہی توجہ دی ہے۔

آئی جی پنجاب کا اپنا مزاج ہے، وہ تیز رو وزیر اعلیٰ پنجاب کی 'گڈ بکس' میں بھی ہیں، ظاہر ہے جو پسند ہوگا، عہدہ اسی کو ملے گا۔ آئی جی کا کچے کے علاقوں کے مسائل کا ذاتی تجربہ بھی ہے، کیونکہ وہ کچے کے علاقوں میں اپنی ملازمت کے دنوں میں افسر رہ چکے ہیں۔ جب وہ بہاول پور میں آر پی او تھے تو انہوں نے اپنے آفس کے باہر سے گزرنے والی مصروف سڑک کو عوام کے لئے (دفتری اوقات میں) نوگو ایریا بنا دیا تھا، وہاں سے بھاری ٹریفک پر پابندی تھی، جو چار کلو میٹر چکر کاٹ کر ایکٹ جیل، ایکٹ گرلز کالج اور ایکٹ گرلز ہائی سکول کے سامنے واپس آتی تھی، جہاں ٹریفک کے جام ہونے کے مناظر مستقل صورت اختیار کر گئے تھے۔ وہ نوگو ایریا کی فطرت سے خوب آشنا ہیں، راجن پور کے کچے میں پولیس اہلکاران کی شہادت اور دیگر کو مشکل میں پھنسانے کی زیادہ تر ذمہ داری انہی پر لاگو ہوتی ہے۔

! حکومتی دعوے

وزیر اعلیٰ پنجاب چونکہ بے حد جذباتی انسان ہیں، پنجاب کے ہوم منسٹر بھی وہ خود ہی ہیں، ان کا انداز حکمرانی یہ ہے کہ وہ ہر کام خود کرنے کے قائل ہیں، شاید دوسروں پر اعتماد نہیں کرتے، یا دوسروں کو مخلص نہیں جانتے، یا ان کے

خیال میں دوسرے لوگوں میں یہ کام کرنے کی صلاحیت نہیں۔ رانا ثنا اللہ بھی بارہا یہ کہہ چکے ہیں کہ پنجاب میں کوئی نوگو ایریا نہیں، اس لئے یہاں رینجرز وغیرہ کے آپریشن کی کیا ضرورت ہے، رہے پنجاب کے آئی جی پولیس، وہ خوب جانتے ہیں کہ وہی بات کرنی چاہیے، جو میاں صاحب کو پسند ہو، تاکہ صاحب کا موڈ خراب نہ ہو، سو وہ ایسا ہی کرتے ہیں، مضبوط گرفت، گڈ گورنس اور اسی قسم کے دیگر دعووں کی قلعی کچے کے علاقے میں کھل گئی ہے، اللہ نہ کرے اگر کسی اور علاقے میں بھی ہاتھ ڈالا گیا اور صورت حال یہی رہی تو کیا پنجاب کی صفائی فوج سے کروائی جائے گی؟

سر کو بی کیسے کی جائے؟

کسی علاقے میں جب کوئی بد معاش سراٹھاتا ہے، تو اسے شہ اس بات سے ملتی ہے کہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں، اسی لئے اس مزاج کے لوگ اس کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہاں ستم یہی ہے کہ جب قانون کھنی کا آغاز ہوتا ہے، تو مقامی پولیس، انتظامیہ حتیٰ کہ معاشرہ معاملے کو زیر بحث تو لاتا ہے، کچھ لوگ اندر ہی اندر سے صورت حال سے کُڑھتے رہتے ہیں، مگر جس نے ایکشن لینا ہوتا ہے، وہ مجرمانہ غفلت سے کام لیتے ہیں، یوں یہ چھوٹی سی بیماری بڑھتی جاتی ہے، پھر لاعلاج ہو جاتی ہے۔ اگر اس طرح کے معاملے کو شروع ہی سے قابو کر لیا جائے تو اتنے بڑے نقصانات سے بچا جاسکتا ہے۔

! تعلیم اور ترقی

اس قسم کے حالات پیدا ہونے میں بہت بڑی معاونت علاقے کے معاشرتی حالات بھی کرتے ہیں، کچے کے علاقے ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے محفوظ پناہ گاہیں ہیں۔ یہاں ترقی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، کیونکہ میلوں کے میل یہاں ریتلا اور ویران علاقہ ہوتا ہے، جہاں نہ فصل ہو سکتی ہے اور نہ آبادی، کیونکہ ہر سال پانی نے یہاں سے پھیرا ڈالنا ہوتا ہے۔ اگر یہاں ترقیاتی کام کئے جائیں گے تو وہ بھی دریا برد ہونے کے امکانات ہیں۔ مگر اتنا خیال کیا جانا ضروری ہے کہ جب تک وسائل کی منصفانہ تقسیم نہ ہوگی، اس وقت تک مسائل بڑھتے رہیں گے۔ ڈیرہ غازی خان پنجاب کا پسماندہ ترین ڈویژن ہے، یہاں جاگیر داری نظام کی جڑیں بہت مضبوط ہیں، لغاری، مزاری، کھوسے، دریشک، کھر، دستی، گورچانی اور بھی بے شمار قبائل آباد ہیں۔ جاگیر داری علاقوں میں ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہی بڑے اپنے علاقوں میں ترقیاتی کام نہیں ہونے دیتے، سڑکیں اور سکول نہیں بننے دیتے، تاکہ لوگ پڑھ لکھ کر ان کے مقابل نہ آکھڑے ہوں۔ جبکہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس روایت میں بہت حد تک سچائی بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ ان علاقوں سے پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدوں تک بھی لوگ پہنچے ہیں، اب بھی اہم عہدوں پر جلوہ گر ہیں۔ مگر اب جاگیر داری نظام کی گرفت بہت حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے، خاص طور پر شہروں میں

۔ اس کے باوجود تعلیمی لحاظ سے بھی یہ علاقہ پسماندہ ترین ہی ہے، یہی حال صحت اور ترقی اور بنیادی ضرورت کی دوسری چیزوں کے بارے میں ہے۔ جب ان علاقوں کے لوگ حکومتوں کو لاہور میں کھربوں روپے کے میگا پراجیکٹ بنتے دیکھتے ہیں تو ان کے جذبات میں منفی عناصر ابھرتے ہیں، بہر حال جرم کی دنیا کا راستہ روکنے کے لئے ترقی کا رخ بھی ایسے علاقوں کی طرف موڑنا بہت ضروری ہے۔

چھوٹو گینگ کی کہانی کی تفصیل قوم نے جان لی، اب اس کے محرکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ گینگ کیوں پیدا ہوتے ہیں، قوم کا جینا کیوں دو بھر کرتے ہیں، لوگوں کی آبرو اور جان و مال سے کیوں کھیلتے ہیں، کیوں اتنے سفاک ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کو قتل کرتے، تارواں کے لئے اغوا کرتے اور تباہی و بربادی کا موجب بنتے ہیں؟ اس کے پیچھے سب سے اہم عنصر ماحول ہے، غربت، ناخواندگی، اور جاہلیت مل کر لوگوں کو جرائم پیشہ بنا دیتے ہیں، جرم کی دنیا میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلا واسطہ پولیس سے پڑتا ہے، اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پولیس اپنے رویوں سے عام آدمی کو بھی ڈاکو بنانے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہوتی ہے۔ جو لوگ ایک مرتبہ کسی چھوٹے موٹے جرم میں بھی تھانے میں پہنچ جائیں، تو پولیس اس کا یہ حشر کرتی ہے کہ وہ تھانے سے نکلتے وقت ہی شرافت کا خول اتار پھینکتا ہے، اور اس عزم مصمم کے ساتھ باہر آتا ہے کہ اب اگر کوئی کام کرنا ہے تو وہ یہ کہ قانون شکنی کو شعار بنانا ہے، قانون سے ٹکر لینی ہے اور پولیس جہاں بھی دکھائی دے، اس پر حملہ کرنا اور اسے نقصان پہنچانا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک ہی قبیل کے لوگ باہم اکٹھے ہوتے جاتے ہیں اور گینگ بن جاتا ہے، اس کے بعد یہی کچھ ہوتا ہے، جو راجن پور کے کچے کے علاقہ میں ہوا۔

اگر چھوٹو گینگ کا سربراہ غلام رسول پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ اس کا انجام کیا ہوتا؟ یہ سب کو خبر ہے، اسے اول تو راستے میں ہی پار کر دیا جاتا، اگر جیل کی ہوا کھانا پڑتی تو وہ کسی پیشی میں ہی پھڑکا دیا جاتا، قوم کو بتایا جاتا کہ ہم چھوٹو اور اس کے ساتھیوں کو عدالت لے جا رہے تھے کہ راستے میں اس کے ساتھیوں نے حملہ کر دیا، اور ملزم کو چھڑوانے میں کامیاب ہو گئے، پولیس نے ملزم کو بازیاب کروانے کی کوشش کی تو مزاحمت کے دوران چھوٹو اور اس کے ساتھی ہلاک ہو گئے، (جو لوگ چھڑوانے آئے تھے ان کے بارے میں خبر گول ہو جاتی ہے، یا وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں)۔ پولیس کی یہ کہانی مستقل ہے، ہر موقع پر یہی سٹوری گھڑی جاتی ہے۔ پولیس کے ایسا کرنے کی وجوہات ہیں، اول یہ کہ اس کہانی کے پیچھے یہ فلسفہ ہوتا ہے کہ عدالتیں ایسے لوگوں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچاتیں، جن کی بنا پر وہ دوبارہ باہر آ کر ماحول خراب کرتے ہیں، دوم یہ کہ اگر ایسے لوگوں کو پولیس راستے سے نہ ہٹائے تو اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ پولیس کے بہت سے راز فاش کر سکتے ہیں۔ اب چھوٹو چونکہ پولیس کے قابو نہیں آیا، اس لئے فی الحال تو وہ زندہ بچ گیا ہے، دیکھیں وہ جیل سے پیشی پر جاتے ہوئے بھی بچ نکلا تو پولیس کے بارے میں بہت سے رازوں سے پردہ اٹھائے گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ گلی گلی میں چھوٹو گینگ موجود ہے، فرق یہ ہے کہ کوئی بڑے پیمانے پر ہے اور کوئی چھوٹے پیمانے پر۔ یہ سب کچھ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کی بنا پر ہوتا ہے، گویا سب سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دی جائے کہ ایسی خرابیاں پیدا ہی نہ ہوں جو بعد میں بڑی مصیبتوں کا روپ دھار لیں۔ اس کے لئے جہاں تعلیم کی اہمیت کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اسے عام کرنا ضروری ہے وہاں حکمرانوں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ معاشی ناہمواریوں کو بھی کم کرے۔ ایک طرف اربوں کھربوں کی باتیں ہیں اور میٹروپولیٹن کے بعد میٹرو اور نچ ٹرین چلنے کو ہے، تو دوسری جانب سڑکیں ہی نہیں، ہیں تو نہایت خستہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار۔ ہسپتال ہیں تو ڈاکٹر نہیں اور ادویات ندارد۔ سکول ہیں تو اساتذہ نہیں اور سہولتوں کا فقدان۔ قانون ہے تو صرف کچھ کمزوروں اور چند غریبوں کے لئے۔ ایسے میں چھوٹو نہیں پیدا ہونگے تو کیا سائنسدان پیدا ہونگے؟ حکومتیں ایک جانب تمام وسائل صرف دارالحکومتوں میں ہی جھونک رہی ہیں، دوسرا ستم یہ کرتی ہیں کہ دور دراز کے علاقوں کا حال ہی معلوم نہیں کرتیں، کہ وہاں ان بادشاہوں کی رعایا کس قسم کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس سے نفرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور انتقامی کاروائیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ پولیس کی اصلاح کے دعوے دم توڑ چکے ہیں، اس کو دیئے گئے اسلحے کی قلعی بھی کھل گئی ہے، اس کی تربیت اور دہشت گردی کے خلاف ان کی کوششوں کے مناظر بھی قوم نے دیکھ لئے ہیں۔ پولیس دراصل ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے ہے بھی نہیں

بلکہ یہ حکمرانوں اور وی آئی پی کلچر کے فروغ کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ نظام میں
بہتری لانے کے لئے کوئی لائحہ عمل بھی دکھائی نہیں دیتا۔

!آئیے احتساب کریں... مگر

آئیے احتساب کریں، سفاک احتساب، کڑا احتساب، بے لاگت احتساب، غیر جانبدار احتساب۔ کسی سے کوئی رعایت نہ ہو، کسی سے بے انصافی نہ ہو، کسی سے ظلم بھی نہ ہو اور کوئی احتساب سے بچتے بھی نہ پائے۔ آئیے احتساب کریں، خود سے آغاز کریں، پہلے اپنا احتساب کریں۔ اب قوم نے احتساب کرنے کی ٹھان لی ہے، اب لگتا ہے کہ ہم لوگ احتساب کر کے ہی رہیں گے، کیونکہ ہم نے جان لیا ہے کہ احتساب سے ہی زندگی ہے۔ اب ہم جینے کا تہیہ کر لیا ہے، اب ہم جی کر ہی رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ احتساب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، اس جادو کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی بول رہے ہیں، ہو کر رہے گا احتساب۔ ”کر کے رہیں گے احتساب۔“ ہم شاید یہ کام ابھی نہ کرتے، ”مگر ہمیں مختلف ”لیکس“ نے اس کام کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ اب انتظار کی گھڑیاں لد گئیں، اب چکر دینے اور ٹال مٹول کرنے والے اپنی دکان بڑھا چکے، اب لوٹ مار کرنے والے منہ چھپاتے پھریں گے، کرپشن کرنے والوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی، احتساب کے مخالف بھی اپنا سامنہ لے کر رہ جائیں گے۔ احتساب تو ہو کر رہے گا، مگر اس کام میں کچھ تبدیلی کرنا ہوگی، وہ یہ کہ احتساب ضرور ہو مگر پہلے دوسروں کا۔ اپنے بارے میں خیالات کچھ اور ہیں، کیونکہ ہمارا احتساب تو پہلے بھی بہت دفعہ ہو چکا ہے، لوگ پہلے بھی ہمیں ووٹ دیتے رہے ہیں

پہلے بھی ہماری حکومتیں آتی جاتی رہی ہیں، پہلے بھی ہم عوام کی خدمت کرتے رہے ہیں، مخالفوں کی حکومتیں بھی آئیں اور جاہلوں کی بھی، مگر ہمیں عوام نے اپنے اعتماد کا ووٹ دیا۔ اس سے بڑا احتساب اور کیا ہوگا۔

پاناما لیکس کی بات ہے تو ایسے الزامات بھی پہلے لگتے رہے ہیں، پہلے بھی دامن شفاف تھا اب بھی ہے۔ اور ہمارے وزیر اعلیٰ تو میز پر مکوں کی بارش کر کے بارہا دہرا چکے ہیں کہ کرپشن کا ایک روپیہ بھی ثابت ہو جائے تو ”نام بدل دینا“ ”پھانسی لگا دینا“ ”لٹکا دینا“۔ سیاست چھوڑنے کی اطلاع، گھر چلے جانے کی خبر اور بھی نہ جانے کون کون سی دھمکیاں ہیں جو اپنے نام پر دی جا رہی ہیں۔ موجودہ حکومت کے حالیہ اقتدار میں تین برس پورے ہونے کو ہیں، کس تھانے میں کرپشن ختم ہوئی، کس دفتر میں رشوت کا بازار ٹھنڈا ہو گیا، کونسا کمیشن مافیاتائب ہو کر دیانت داری پر ٹل گیا۔ درست ہی تو کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں کمیشن ہی ایک ایسا کام ہے جو نہایت دیانتداری سے ہوتا ہے، کیونکہ ہر محکمے میں کمیشن کی مد میں رقم کی فیصد طے ہوتی ہے، اور وہ مطلوبہ آدمی کو مل جاتی ہے۔ ممکن ہے کچھ ملازمتوں کو میرٹ کے دائرے میں لایا گیا ہو، مگر ابھی تک بے شمار ملازمتیں ہیں جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے، ہمارے بے شمار معزز ممبران اسمبلی لوگوں کے کام کروانے اور ان کو روزگار کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے ان سے لاکھوں روپے بٹورتے ہیں، بعض اوقات ایسا

بھی ہوتا ہے کہ یہ روپیہ بھی کام نہیں دیتا، یعنی رقم دی مگر کام نہ ہوا۔

سرکاری گاڑیوں کے بے دریغ استعمال کو اپنے حکمران کرپشن قرار نہیں دیتے، ان کے خیال میں یہ مراعات کا حصہ ہے، کہ کسی بھی سطح کا افسر اپنی سرکاری گاڑی جس وقت اور جہاں مرضی لے جائے اسے مکمل آزادی حاصل ہے، مہینہ بھر میں کتنا پٹرول استعمال ہوا، فیملی کی کتنی سیریں ہوئیں، ان کی شاپنگ، بچوں کو سکول پہنچانا اور دوستوں تک کی گاڑیوں میں سرکاری پرچی سے پٹرول ڈلوانا ایک معمول کی بات ہے۔ قریبی یا ساتھ والے ضلع میں ذاتی رہائش ہونے کی بنا پر سرکاری گاڑی روزانہ لے جانا کوئی پریشانی والی بات نہیں۔ روزانہ کا حساب لگایا جائے تو یقیناً کروڑوں روپے روزانہ کرپشن ہو رہی ہے۔ مگر اپنے حکمران ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔ ان کی مصروفیات اور بھی بہت ہیں۔ اپنے ہاں تعمیرات کا حال دیکھ لیں، سڑک بنتی ہے، اور چند برسوں میں بیٹھنا یا ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہے، پھر بھاری فنڈ سے اس کی مرمت کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ دھندہ مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خیر اب احتساب شروع ہے، کیونکہ اب اپنے سپہ سالار نے بھی اس کارِ خیر کا آغاز کر دیا ہے، تمام سیاستدان بھی ایک دوسرے کو یہی مشورہ دے رہے ہیں کہ پہلے خود سے احتساب کا آغاز ہونا چاہیے، تاہم سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ احتساب کا مطالبہ کرنے والا ہر فرد دوسرے سے ہی احتساب کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آئیے ہم بھی احتساب کریں

مگر دوسروں کا۔

دس روز کے اندر خادم حسین کا یہ دوسرا چکر تھا، اسے دیکھتے ہی مجھے وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف کے قوم سے خطاب یاد آ گئے کہ ایک ماہ میں تین مرتبہ انہوں نے قوم کو اعتماد میں لیا، آنے والے وقت میں بھی نہ جانے انہیں ایک ماہ میں کتنے خطاب کرنے پڑیں۔ مگر خادم حسین کا موڈ قومی امور پر بات کرنے کا نہیں تھا، اگرچہ اس کی نگاہ بڑے الیٹوز پر بھی رہتی ہے، اور وہ اہم معاملات پر سوال اٹھاتا رہتا ہے، مگر اکثر وہ چھوٹے اور بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتا ہے، جن کا تعلق عوام کے مسائل اور لوگوں کے رویوں سے ہوتا ہے۔ خادم حسین نے ماسٹرز کیا ہوا ہے، اور وہ ایک نجی ادارے میں کام کرتا ہے، اس کو اپنے کام کی اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے کہ وہ کھینچ سمیٹ کر اپنے اخراجات پورے کرتا ہے۔ نہایت ہی سلیقہ مند اور حساس طبیعت ہونے کی بنا پر اس نے اپنی چھوٹی ملازمت کے آغاز میں ہی معمولی بچت کی عادت اپنائی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک بینک کا انتخاب کیا، اور سرمائے کو بڑھاوا دینے کے لئے اس نے بچت اکاؤنٹ کھلوا یا۔ بینک نے اسلامی بینکنگ کے بارے میں اس کو متاثر کیا اور وہ خود بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ جب منافع فکس نہ ہو تو اسے جائز ہی قرار دیا جائے

اس کی آج کی آمد بھی بینک کے بارے میں ہی تھی، اس کا کہنا تھا کہ بینک ایکٹ کرشل ادارہ ہوتا ہے جو اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کو سروسز فراہم کرتا ہے، ہر کسٹمر کے ساتھ نرم خوئی سے بات کرنا، اس کو معقول معلومات فراہم کرنا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا بینک اہلکاروں کا فرض ہوتا ہے۔ دو روز قبل کسی دوست نے اس کے اکاؤنٹ کے ذریعے کچھ پیسے منگوائے، شام ہو چکی تھی، اس نے فون کر معلوم کرنا چاہا کہ آیا میرے اکاؤنٹ میں پیسے آگئے ہیں یا نہیں، تاکہ اگلی پارٹی کو بتایا جاسکے۔ فون نہیں سنا گیا۔ پھر وہ بھاگم بھاگ خود بینک پہنچا کہ اس کے دوستوں کو انتہائی جلدی تھی۔ بینک بند ہو چکا تھا، تاہم دستک دے کر گارڈ سے اکاؤنٹ کی صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر اندر سے وعدہ فردا ہی برآمد ہوا۔ اس نے اپنے اکاؤنٹ کا یقین دلانے کے لئے چیک بک بھی دکھائی، مگر دال نہ گئی۔ تقریباً سوا گھنٹہ بعد اس کے دوست نے فون کر کے بتایا کہ میں بینک کے اندر ہوں، فون کر کے اکاؤنٹ کی صورت حال معلوم کر لیں۔ یہ دل ہی دل میں حیران ہوا کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو تو معلومات بھی نہیں ملیں، مگر تیسرا فرد اندر تک پہنچ گیا، وہ بھی سوا گھنٹہ بعد۔ بینک والوں کا یہ کیسا رویہ ہے؟

اگلے روز خادم صاحب بینک پہنچ گئے، بڑے صاحب تو نہ تھے، ان سے چھوٹے صاحب سے بات کی، انہیں کل کی روداد سنائی، اپنی حساسیت کا رونا رویا، احتجاج کرنا چاہا، یہ بھی کہ گاہک سب برابر ہونے چاہئیں۔ مگر اسے بتایا گیا کہ اگر سوا گھنٹہ بعد کوئی آیا تھا تو ہمارا بڑا کسٹمر ہوگا، ہمارے لئے سب برابر نہیں ہو سکتے، ایک بندہ روزانہ لاکھوں کا کاروبار کرتا ہے اور ایک سال بھر میں دس بیس ہزار جمع کرواتا ہے، تو دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی دوران بینک کا ایک اور اہلکار وہاں کسی کام کے لئے آیا اس نے بھی فیصلہ کن انداز میں بتایا کہ ہم سب کو برابر نہیں رکھ سکتے۔ خادم نے اپنے دوست کے آئے ہوئے پیسوں کا چیک کاٹا اور اس کے بعد بچنے والا اپنا بیلنس معلوم کیا، چند ہزار روپے پڑے تھے، اس نے ان کا بھی چیک کاٹا، اب اس کا اکاؤنٹ خالی تھا، منیجر نے چند ہزار روپے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، آپ اپنا اکاؤنٹ کلوز تو نہیں کر رہے، خادم حسین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے پوری روداد مجھے سنائی، میں نے اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا، اور بینک عملے پر اس کی تنقید میں اس کی تائید کی۔ اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بینک عملہ مجبور ہے، وہ اسی کو سلام کرے گا جس کی جیب گرم ہوگی۔ اگرچہ انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ سب انسانوں کو برابر جانا جائے، مگر دنیا داری کا تقاضا ہے کہ اس کی عزت کی جائے دنیا جس کی جیب میں ہوتی ہے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خادم حسین جب بھی میرے پاس آئے گا، اس کا حالِ دل سننے کے بعد میری

کوشش ہوگی کہ ہر دفعہ اس کی حساسیت میں کچھ کمی کا اہتمام کروں، بے حسوں کے ہجوم
میں چند حساس لوگ تو دم گھٹنے سے ہی مرجائیں گے، آ کیجن کون دے گا، کہاں سے
آئے گی؟

حکومت کی عوامی رابطہ مہم؟

سوال اٹھتے ہیں، اور اٹھائے بھی جاتے ہیں، اپوزیشن ہمیشہ سوال اٹھاتی رہتی ہے، مگر جب سوال اٹھانے والے خود وزیراعظم پاکستان ہوں تو سوال کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ میاں نواز شریف نے اپنے قوم سے خطاب میں جہاں اپنی بہت صفائی دیں، خود کو احتساب کے لئے پیش کیا، کمیشن بنانے کے لئے چیف جسٹس آف پاکستان کو خط لکھنے کا اعلان کیا، وہاں بہت سے سوالات بھی کئے۔ کیا مخالفین الزامات ثابت نہ کرنے پر قوم سے معافی مانگیں گے؟ جب ایک آمر نے ایک منتخب حکومت کو ختم کیا تھا تو یہ لوگ سپریم کورٹ کیوں نہیں گئے؟ آئین توڑنے والوں کا احتساب کیوں نہیں ہوا؟ منتخب وزیراعظم کو کال کو ٹھڑی میں ڈالا گیا، جھکڑیاں لگائی گئیں۔ وزیراعظم کے سوالات میں ہی جوابات بھی پوشیدہ ہیں۔ وزیراعظم خوب جانتے ہیں کہ جب کسی ایک وزیراعظم کو اقتدار سے ہٹایا جاتا ہے تو مخالفین کی دراصل دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہوتی ہے، وہ تو خود ہی چاہتے ہیں۔ فوجی آمریت کہ حمایت میں دوسروں کو گلہ دینے سے قبل یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ کیا کبھی ہم نے خود تو یہ کام نہیں کیا؟ اگر خود سیاست کا سفر بھی ایک فوجی حکمران کی انگلی پکڑ کر شروع کیا تھا، تو دوسروں پر اعتراض اچھا نہیں لگتا۔

میاں نواز شریف نے اپنی تقریر میں قوم کو یہ بھی بتایا کہ میں کسی سے ڈرتا نہیں، قوم اس سے قبل یہ جملہ بھٹو اور مشرف کی زبان سے سن چکی تھی۔ کسی کی کرسی مضبوط تھی تو کسی کو طاقت کا زعم تھا۔ نتیجہ یہی ہوا کہ آخر کار طاقت اپنے انجام کو پہنچی۔ جہاں تک میاں صاحب کی جلاوطنی کا تعلق ہے تو یہ ایک معاہدے کے تحت عمل میں آئی تھی، اگر جلاوطنی زبردستی ہوئی تھی تو سعودی عرب سا لہا سال رہنے کے باوجود مشرف کے خلاف ایک جملہ بھی ادا نہ کرنے کا مطلب کیا تھا؟ انہوں نے سعودی عرب پہنچتے ہی صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں کی؟ انہوں نے کیوں پاکستانی میڈیا کو باور کروایا کہ انہیں زبردستی باہر پھینکا گیا ہے؟ بلکہ ہوا یہ کہ وہ ایک عرصہ تک خاموشی اختیار کئے بیٹھے رہے۔ اور جب معاہدہ اپنے انجام کے قریب پہنچا تو انہوں نے حرکت کرنا شروع کی۔ اور اہم ترین سوال یہ کہ آئین توڑنے والے فوجی ڈکٹیٹر کو آپ نے اپنے تین سالہ موجودہ اقتدار میں کونسی سزا دلوا دی؟ اگر یہ کام کسی اور حکومت نے نہیں کیا تو یہ بات قابلِ اعتراض تھی، مگر آپ کی اپنی حکومت نے بھی اس ضمن میں کوئی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ موصوف کو 'عداری' وغیرہ کے مقدمات میں جیل تک جانے کی نوبت نہیں آئی، صرف نظر بندی سے کام چل گیا، حتیٰ کی ٹی وی چینلز پر کھل کر بات چیت کرنے اور سیاسی تبصرے کرنے میں بھی انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور آخر کار جب وہ گزشتہ دنوں ملک سے باہر چلے گئے تو حکومت نے پرانے احسان کا بدلہ یہی اتارنا مناسب جانا کہ انہیں محفوظ راستہ

دیا جائے۔

اتوار کے روز تین اہم سیاسی جماعتوں نے سیاسی قوت کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا، تحریک انصاف اسلام آباد میں رونق افروز ہوئی، لاہور میں جماعت اسلامی نے کرپشن کے خلاف اپنی مہم میں رنگت بھرنے کے لئے دھرنا دیا اور کراچی میں نو مولود پاک سر زمین پارٹی نے اپنی طاقت کا پہلا مظاہرہ کیا۔ اپوزیشن کے پاس اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اسی قسم کی مصروفیات ہوا کرتی ہیں، کبھی ممبر شپ شروع کر دی، کبھی کوئی مہم چلا دی، کبھی کسی بات پر احتجاج کر لیا اور کبھی کارکنوں کی تربیت کا اہتمام کر لیا۔ مگر جب حکومت بھی سیاسی پارٹیوں کی طرح جلسے کرنے پر اتر آئے تو جان لیجئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اب سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو دیکھ کر حکومت نے بھی جلسوں کا اعلان کر دیا ہے، اب حکمران اپنی کارکردگی اپنے عمل سے نہیں، اپنے نعروں سے ظاہر کریں گے، اب وہ جلسوں میں عوامی زبان بولیں گے، دوسروں کو لکاریں گے، چیخیں گے، دھاڑیں گے۔ کارکن نعرے لگائیں گے، لیڈروں کو سر پر بٹھائیں گے۔ حکمرانوں کا یہ کام نہیں، وہ حکومت کریں، ان کو تعلیم، صحت، پینے کا صاف پانی اور بنیادی سہولتیں دیں، ان کی جان مال کی حفاظت کی ذمہ داری نبھائیں، عوام کو میسٹر و بسیں اور اورنج لائن ٹرین بھی دیں، ساتھ ہی ساتھ بجلی کی فکر بھی کر لیں۔ حکمرانوں کا عوام میں جانے کا فیصلہ اس لحاظ سے

اچھا ہے کہ اب ممکن ہے کہ کچھ لوگوں سے ان کے حکمران ہاتھ بھی ملا لیں، کچھ لوگوں کو اپنے حکمرانوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی مل جائے۔ مگر اس پوری سرگرمی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عوامی رابطہ دراصل الیکشن مہم ہی ہے۔

کرپشن کے خلاف معاشرتی تحریک؟

کرپشن کے خلاف طوفان برپا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئینی سربراہ جناب ممنون حسین نے بھی اس میں حصہ ملا کر ثوابِ دارین حاصل کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صدر صاحب کے تحیل کو قبول فرمائے، عمل کی توفیق وہ جسے چاہے دے سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ صدر نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”... دہشت گردی کی طرح کرپشن نے بھی ملک کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے، اس سے نہ صرف قومی وسائل کا ضیاع ہوتا ہے، بلکہ معاشرہ بے چینی اور ہیجان کا شکار بھی ہوتا ہے۔ کرپشن کی ایک وجہ تو لالچ ہے، اس کے علاوہ اخلاقی اور روحانی تربیت کی کمی بھی اس کی بنیاد بنتی ہے۔ اب کرپشن کے خلاف معاشرتی سطح پر بھرپور تحریک چلانے کی ضرورت ہے...“۔ صدر مملکت کے فرمودات قابلِ غور ہیں، مگر پریشانی یہ ہے کہ غور کرنے والا کوئی نہیں۔ موصوف کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمرانوں کو اس بات کا مکمل احساس ہے کہ کرپشن ہو رہی ہے اور یہ بھی کہ یہ ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ہے، اتنی ہی نقصان دہ ہے جس قدر دہشت گردی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دہشت گردی کے خلاف جس طرح آپریشن ضربِ عضب کا فرما ہے، اسی قسم کی بیماری کے لئے اسی طرح کا آپریشن درکار ہے۔ اگر صدر صاحب کے بقول دہشت گردی اور کرپشن برابر نقصان دہ ہیں تو پھر انہوں نے

ان کا علاج کیوں مختلف بتایا ہے، ایک مرض کے علاج کے لئے آپریشن اور وہ بھی ایسا کہ جس میں فوج پوری قوت کے ساتھ کوشاں ہے، دہشت گردوں کی سرکوبی کے لئے بہت سے جوان بھی جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں، مگر دوسری طرف کرپشن کے خلاف آپریشن کی بجائے معاشرتی سطح پر تحریک چلانے کی بات کی جا رہی ہے۔ مرض ایک سا ہے، تشخیص بھی ایک سی ہے، علاج بھی ایک سا ہی ہونا چاہیے۔

بھرپور ”معاشرتی تحریک“ کی وضاحت جناب صدر نے نہیں کی، قوم کے لئے آسانی ہو جاتی، وہ کس طرح اس تحریک کا حصہ بنے اور کونسی خدمت سرانجام دے کہ اس کی تحریک کے نتیجے میں کرپشن کا خاتمہ بالآخر ہو جائے۔ ممکن ہے اب حکومتی کارندے ان کے فرمان کی روشنی میں اس تحریک کے خال و خد قوم کے سامنے لائیں، معلوم ہو، کہ تحریک کون چلائے گا، اس کا لائحہ عمل کیا ہوگا، اس کی ترتیب کیا ہوگی، آیا وہ گلی محلے سے شروع ہوگی یا اس کا آغاز اسلام آباد کے صدارتی محل سے ہوگا، اس کی ابتدا تخت لاہور سے ہوگی، یا کسی دور دراز علاقے سے شروعات ہوں گی۔ پھر اس تحریک میں کوئی قائد بھی ہوگا یا ہر حکومتی عہدیدار اپنے مقام پر اس کی قیادت کرے گا، اور عوام کو کرپشن کے نقصانات سے آگاہ کرے گا۔ معاشرتی تحریک سے یہ مراد بھی لی جاسکتی ہے کہ پورا معاشرہ ہی اپنے طور پر اس تحریک کا علمبردار اور سرخیل ہو۔ اگر پورا معاشرہ ہی کرپشن کے خلاف محرک کے طور پر سامنے آجائے تو یہ پریشانی ہوگی کہ

آخر وہ کس کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ ویسے تو آجکل بھی یہی کچھ ہو رہا ہے، تمام سیاستدان اس بات پر نہ صرف یکسو ہیں بلکہ تحریکیں چلا رہے ہیں کہ کرپشن کا خاتمہ ہونا چاہیے، سب کا احتساب ہونا چاہیے، اکثر نے خود کو احتساب کے لئے پیش بھی کر دیا ہے، مگر افسوس کہ کسی نے ان کی اس پیشکش کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا۔

صدرِ مملکت نے کرپشن کی ایک یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کی کمی ہے۔ صدر صاحب کا کام مرض اور اس کی وجہ بتانا تھا، سوانہوں نے بتا دیا، کرپشن کرنے والوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت کون کرے گا؟ یہ فیصلہ قوم خود کرے۔ قوم کو بھی کچھ سوچنا چاہیے اور کوئی فیصلہ کرنے چاہیے، ہر کام حکمرانوں پر ہی نہ چھوڑتے جائیں، حکمران بے چارے کیا کچھ کریں، انہوں نے انتظامی کام بھی کرنے ہوتے ہیں۔ بہتر تو یہی تھا کہ تربیت کا کام صدر خود سنبھال لیتے، کچھ فراغت میں کمی آتی، کچھ مصروفیت میسر آتی۔ کرپشن کے خلاف تحریکوں کی تو اس وقت کوئی کمی نہیں، جماعت اسلامی کے سراج الحق کچھ عرصہ سے یہ تحریک چلائے ہوئے ہیں، عمران خان نے بھی اس کا اعلان کر دیا ہے، عوام بھی یہی کچھ چاہتے ہیں، مگر جو لوگ کرپشن کر رہے ہیں وہ کسی تحریک کا حصہ نہیں بن رہے، نہ بن سکتے ہیں۔ مقتدر طبقات کرپشن کرتے رہیں اور بے اختیار معاشرہ تحریک چلاتا رہے، نتیجہ سامنے ہے۔

ہسپتالوں میں پولیس چوکیاں؟

اب ہسپتالوں میں پولیس چوکیاں بنیں گی، محکمہ صحت کے صوبائی ذمہ داران نے تمام سرکاری ہسپتالوں کے سربراہوں کو مراسلے جاری کر دیئے ہیں۔ وجہ اس انتہائی قدم کی یہ بتائی جا رہی ہے کہ ڈاکٹروں اور مریضوں کے لواحقین میں آئے روز تلخ کلامی ہوتی رہتی ہے، اور بعض اوقات بات کچھ آگے بھی بڑھ جاتی ہے، فریقین کے درمیان لڑائی جھگڑوں کی نوبت آئی رہتی ہے، اس تلخی کے خاتمے کے لئے ضروری جانا گیا کہ ہسپتالوں میں پولیس کی چوکیاں ہی قائم کر دی جائیں تاکہ بصورت جھگڑا پولیس کو طلب کیا جاسکے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ جھگڑے کے موقع پر پولیس پہلے سے ہی موجود ہو، اور جھگڑا ہوتے ہیں اس کا قلع قمع کر دے۔ چونکہ ان چوکیوں کا مطالبہ اور بندوبست خود محکمہ صحت کے اعلیٰ افسران نے کیا ہے، یقیناً انہیں پنجاب کے وزیر صحت (جو ہیں کہ نہیں ہیں) سے اجازت ضرور لی ہوگی، اس لئے فریق اول یعنی ہسپتال انتظامیہ وغیرہ تو اس پر کوئی اعتراض کر نہیں سکتی، رہ گئے مریضوں کے لواحقین تو ان سے کس نے پوچھنا ہے، یا ان کی رائے کی کیا اہمیت ہے؟

، ہسپتالوں میں مریضوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، وہ تو سب کے سامنے آئینہ ہے

ڈاکٹر کا خیال ہوتا ہے کہ وہ صبح سے مریض دیکھ دیکھ کر تھک چکا ہے، اب آرام ہونا چاہیئے، مریض کے لواحقین کہتے ہیں کہ صرف ہمارا مریض تو ضرور دیکھ لیا جائے، پھر خواہ آرام ہی کیوں نہ کیا جائے۔ ویسے بھی ڈاکٹروں کے لئے تمام مریضوں کے کیس ایکٹ جیسے ہی ہوتے ہیں، وہ روز ہی مریضوں کو تڑپتا بھی دیکھتے ہیں، آپریشن بھی کرتے ہیں، اور بد قسمتی سے مرتا بھی دیکھتے ہیں، لہذا وہ مریض کے مرض کی حد تک جذبات میں نہیں آتے، دوسری طرف مریض کے لواحقین کے لئے اس کا کیس اہم ترین ہوتا ہے، اور ایمر جنسی ہوتی ہے، ان کا خیال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کی معمولی غفلت بہت خراب نتیجے تک پہنچا سکتی ہے۔ فریقین میں یہی خلیج حائل ہوتی ہے، اور اس کے ختم ہونے کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز ہسپتال کے مختلف وارڈز میدانِ جنگ بنے ہوتے ہیں۔ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں عموماً پہلے ڈاکٹروں کا ہی بھاری رہتا ہے، کیونکہ اول تو بہت سے ڈاکٹر ہی موقع پر پہنچ جاتے ہیں، ان کے علاوہ چار سو ہسپتال کا عملہ ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے، ان میں سے جو بھی قریب ہوتا ہے وہ کھنچا چلا آتا ہے، اور اپنے باس کو بچانے کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

پولیس چوکیوں سے ہسپتالوں والے اور کام بھی لے سکتے ہیں، وہ یہ کہ آج کل یلگ ڈاکٹرز کا احتجاج بہت زوروں پر جا رہا ہے، یہ صرف آجکل کی بات نہیں، آئے روز یہی کچھ ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آؤٹ ڈور ڈاکٹر موجود نہیں

کیونکہ یگ ڈاکٹرز ہسپتال پر ہیں، مریض رلتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ یہ ڈاکٹرز ہسپتالوں سے احتجاج شروع کرتے ہیں اور باہر بڑی سڑکوں پر آکر ٹریفک روک دیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ حکمرانوں پر احتجاج کا اثر اسی وقت ہوتا ہے، جب سڑکیں بلاک کی جائیں، حکومت کے خلاف نعرے لگائے جائیں۔ یہ لوگ سڑک پر آتے ہیں تو قدرتی طور پر ٹریفک جام ہو جاتا ہے، پھر لوگوں کو جو حال ہوتا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، عموماً ٹریفک جام ہونے کی صورت میں سب سے اہم اور حساس بات یہی کی جاتی ہے کہ اس ماحول میں ایبولینسنز بھی رکی رہیں، کبھی یہ خبر بھی آ جاتی ہے کہ اس میں ایک مریض دم توڑ گیا، یہ منظر نامہ ہمہ قسم کی ٹریفک بلاک کا ہے) اور جب یہ معلوم ہو کہ ٹریفک روکنے والے خود مسیحا ہیں تو قوم اور بھی پریشان ہو جاتی ہے، کہ جس کو انسانیت کی جان بچانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر کے ڈاکٹر بنایا جاتا ہے، وہی انسانیت کی موت کا سبب بن رہا ہے۔ یہ وقت بھی آنا تھا۔ اب یہ پولیس چوکیاں جہاں مریضوں کے لواحقین کی سرکوبی کا فریضہ سرانجام دیں گی، وہاں یہ یگ ڈاکٹرز کو قابو کرنے کے کام بھی آئیں گی۔ اگر پولیس چوکیوں کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو یہ کام یونیورسٹیوں میں بھی کیا جاسکتا ہے، جہاں اکثر طلبہ آپس میں جھگڑتے اور ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔ پولیس کی خوش بختی ہی جاننے کہ ابھی تک اس پر اداروں کو اعتماد ہے، کہ اس کی موجودگی میں جھگڑے اور ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔ یہ معلوم نہیں کہ پولیس کا قانون پر عملداری اور ڈسپلن کی وجہ سے امیج بنا ہوا

ہے، یا جھگڑے اس لئے کم ہوں گے کہ متاثرین کو اس بات کا ڈر ہوگا کہ معاملہ پولیس
تک پہنچ گیا تو نئے عذاب میں آجائیں گے۔

! کچن یا صوفہ کا بینہ

کچن کا بینہ کا نام نہ جانے کس نے ایجاد کیا ہے، ممکن ہے وزیر اعظم یا چند وزیر بیٹھ کر کچھ گپ شپ کرتے ہوں اور کھانا وغیرہ کھاتے ہوں اور محفل کے برخاست ہونے تک ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر غور ہو چکا ہوتا ہو، ملک کو کیسے چلانا ہے، دنیا کے ساتھ معاملہ کیسے کرنا ہے، اپوزیشن کو قابو کس طرح کرنا ہے اور اپنی مقبولیت میں اضافہ کا کیا بندوبست کرنا ہے؟ یہ سب کچھ میٹنگ کے آخر تک مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ جب چند بڑے حکومتی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں تو کھانا پینا تو ایک لازمی جزو ہے۔ کسی بھی کابینہ کے مختصر مگر خاص لوگوں کے باہم مشورے کو ہی کچن کابینہ کے معروف نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاہم اندر کی کہانی کبھی سامنے نہیں آئی کہ آیا یہ لوگ کچن کے معاملات میں بھی گفتگو کرتے ہیں یا نہیں، گھر میں کیا پکاتا ہے، کون پکاتا ہے، کون کون سی ڈش گھر میں زیادہ پسند کی جاتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اپنے حکمران کھانے پینے کا خاص شغف رکھتے ہیں، وہ اپنی پسند کی چیزیں دور دور سے منگواتے اور اپنے لذت کام و دہن کا اہتمام کرتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جہاز وغیرہ بھی استعمال کرنا پڑ جاتا ہے تو کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ اس لئے کچن کابینہ کا نام صرف کچن کے نام پر ہی بدنام نہیں بلکہ عملی طور پر اجلاسوں میں کچن

کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اب ایک اور اصطلاح سامنے آئی ہے، اسے ”صوفہ کابینہ“ کہا گیا ہے، اس سے قبل ڈرائیونگ روم سیاست کا ذکر ہوتا تھا، لوگ ٹھنڈے ڈرائیونگ رومز میں بیٹھ کر قوم کے مقدر کے فیصلے کرتے تھے، ایسے اجلاس پر ہمیشہ تنقید کی جاتی ہے۔ تاہم صوفہ کابینہ کوئی خاص اور نئی اصطلاح نہیں، شاید یہ نام مغرب سے چرایا گیا ہے، کہ برطانیہ میں بھی ایسا ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے۔ پاکستان میں کابینہ کے اجلاس کے لئے کوئی تاریخ وغیرہ مقرر نہیں ہوتی، جب کسی اہم ایٹھنے سر اٹھایا اور حکومت نے مشاورت کی ضرورت سمجھی تو کابینہ کا اجلاس طلب ہو گیا، عموماً ایسے اجلاس کثیر المقاصد نہیں ہوتے۔ مگر جب دار و مدار مختصر دوستوں پر ہونے لگے، تو بات کچن کابینہ تک پہنچ جاتی ہے، کابینہ کے اجلاس کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو اپنے ہاں بھی یہی حال ہے، چار ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر کابینہ اپنے اجلاس کے بغیر ہی چل رہی تھی، پاناما لیکس کا دھماکہ ہوا تو وزیراعظم کی طبیعت پر پہلے تو بہت گراں گزرا، انہوں نے معاملہ کو دل پر لے لیا، اور لندن اپنے میڈیکل چیک اپ (خرابی کی صورت میں علاج) کروانے تشریف لے گئے۔ واپسی پر انہوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ کسی مشیر کے مشورے پر قوم سے خطاب بھی دے مارا، جس میں ایسے سوالات بھی اٹھائے جو اپوزیشن والوں کو اٹھانے چاہئیں تھے۔ تیسرا اہم کام

یہ کیا کہ اپوزیشن کی تقلید میں جلسوں وغیرہ کا اہتمام بھی ہو رہا ہے، اور سب سے اہم اور خاص کام یہ کیا کہ کابینہ کا اجلاس طلب کر لیا جسے طلب ہوئے مہینوں گزر چکے تھے۔ اپنے ہاں کابینہ، ممبرانِ اسمبلی اور پارٹی کے عہدیداران کی قسمت اس وقت کھلتی ہے، جب حکومت کسی گرداب میں الجھ جاتی ہے، جب تک راوی چین لکھ رہا ہوتا ہے، اس وقت تک کسی کی کوئی فکر نہیں ہوتی، جو نہی مشکل وقت آیا معاملہ الٹ ہو گیا۔ گزشتہ برس جب تحریک انصاف نے اسلام آباد میں دھرنا دیا تھا، تو وزیراعظم ایک سال کے ریکارڈ وقفے کے بعد ایوان بالا تشریف لے گئے، انہوں نے ایوان کا مشترکہ اجلاس طلب کیا اور اجلاس میں آنا بھی شروع کر دیا، اپنے دفتر میں وزراء اور ارکانِ اسمبلی سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ بہت سے معاملات ایسے آتے رہتے ہیں، جن کے بحران کے موقع پر کابینہ کا اجلاس بلایا جانا ضروری تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا، کابینہ کے معزز ارکان سے مشورے لینے کا موقع ضائع کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اپنے معزز ارکان کابینہ میں ہیں بھی چند لوگ جو مشورہ دے سکتے ہیں، ورنہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہر قسم کے فیصلے پر تائید ہی کرنا ہوتی ہے، یہی ان کی ڈیوٹی ہے، وہ اس سے رائی بھر رو گردانی نہیں کر سکتے۔ اگر کابینہ کا اجلاس نہیں بلایا جاتا تو ممبران کو اس بات کا علم تو ہوتا

ہے کہ ملک (بلکہ حکومت) کن مسائل سے دوچار ہے اور اس کے حق میں بیانات کا
کس طرح سلسلہ جاری کرنا ہے، کہ سننے اور دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ جب کا بینہ
ارکان کی کوئی رائے ہی نہیں، تو اجلاس کی کیا ضرورت؟

بیماری ہر انسان کے ساتھ لگی ہے، مولانا فضل الرحمن کی طبیعت خراب ہو گئی، ہسپتال میں ان کا میڈیکل ہوا، رپورٹس کلیئر آنے پر انہیں ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا، ڈاکٹروں نے انہیں مرغن اور چٹخارے کھانے سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

مولانا فضل الرحمن سے وزیراعظم میاں نواز شریف کی ملاقات کی وجہ صاف ہے کہ جب حکومت مشکل میں ہوتی ہے، تو ہاتھ پاؤں مارنے ہی پڑتے ہیں، کیونکہ ڈوبنے والا تو تنکے کا سہارا چاہتا ہے، دیگر کی طرح میاں صاحب کی بھی یہ خوبی ہے کہ وہ مشکل وقت میں ان لوگوں کو خاص شرف قبولیت بخشا جاتا ہے، جو عام دنوں میں ملاقاتوں کو ترستے رہتے ہیں۔ اگرچہ مولانا فضل الرحمن کا تعلق اس طبقے سے نہیں، جسے ملاقات کے لئے زیادہ انتظار کرنا پڑے، مگر پانا مالیکس کے ہنگامے میں جہاں کئی ماہ بعد کا بینہ کا اجلاس ہو گیا، وہاں مولانا فضل الرحمن سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مولانا نے حسب توقع پانا مالیکس پر وزیراعظم سے اظہارِ بیچتی کیا، اور سلطنتِ پاکستانیہ کے چلانے میں ان سے تعاون کی یقین دہانی کرائی، اس بات کی بھی تائید کی گئی کہ مخالفین ملکی ترقی کا راستہ روکنے کے درپے ہیں۔

مولانا کے معدے میں درد اٹھا تھا، جس کے لئے ہسپتال تک جانا پڑا۔ درد اٹھنا بھی فطری بات ہے، مگر اس کے پیچھے بھی ایک اہم بات ہے کہ وہ وزیراعظم سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ گویا اس ملاقات میں ایسی کوئی بات ہوئی کہ جس کے نتیجے میں درد ہوا، کیا باتیں ایسی تھیں؟ یا لذتِ کام و دہن کے اہتمام میں کوئی ایسی چیزیں تھیں، جن کا وزن معدہ برداشت نہیں کر سکا۔ اس بات کی تحقیق ہونی چاہیے، کہ وزیراعظم کے عملہ نے مولانا کو کیا کھلایا، جو ان کے معدے پر گراں گزرا؟ آیا یہ چیزیں خود وزیراعظم نے بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں یا صرف مولانا نے ہی ان پر ہاتھ صاف کئے۔ اگر دونوں نے خورد و نوش کا عمل اکٹھے ہی مکمل کیا، تو آخر کیا وجہ ہوئی کہ ایک کا معدہ سب کچھ ہضم کر گیا اور دوسرے کے معدے میں ہلچل مچ گئی۔ یہاں نکتہ داں قارئین سے درخواست ہے کہ کسی مہمان کی موجودگی میں کھانے پینے کا مطلب پانا ماہ لیکس ہرگز نہ نکالیں، اس سے مراد چائے پانی وغیرہ ہوتا ہے، جو مہمانداری کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ صرف مہمان کے پیٹ میں درد ہوا ہے، اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں، کہ جو چیزیں کھائی گئیں، ان کے سلسلے میں میزبان کا 'ٹیسٹ' تو ڈویلپ ہوا ہوتا ہے، کیونکہ میزبان نے تو ہر کسی کے ساتھ بیٹھ کر روز ایسی چیزیں کھانی ہوتی ہیں، ان کا معدہ انہیں برداشت بھی کرتا ہے۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر کھایا گیا؟ ممکن ہے وزیر اعظم نے اپنے مہمان عزیز کے لئے بہت تکلف کیا ہو، وہ جانتے ہیں کہ مولانا کا تعلق اس قبیلے سے ہے جو کھانے پینے کے معاملہ میں بخل کو کفرانِ نعمت تصور کرتے ہیں، ہر چیز کو رغبت سے کھانا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ان کی روایت ہے۔ اس تکلف میں یقیناً کوئی چیز ایسی بھی ہوگی، جو دوسری چیزوں کے ساتھ مناسب مرکب نہ بنا سکی ہو، اور اس کی کیمیا گری میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہو، کیونکہ سائنس کی دنیا میں بعض اوقات ایک چیز دوسری سے مل کر کوئی نئی ایجاد ہی سامنے لے آتی ہے۔ ہو سکتا ہے وزیر اعظم نے اپنے مہمان کے لئے مہمان ہی کی پسند کی کوئی خاص چیز منگوائی ہو، مہمان اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں ڈوب گیا ہو۔ تاہم جو کچھ بھی ہے، کم از کم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی چیز طبی لحاظ سے مناسب نہیں تھی، یا کوئی چیز اپنی طبی عمر پوری کر چکی تھی، یا کوئی چیز پرانی تھی۔ ہر چیز کا مناسب میڈیکل چیک اپ ہوتا ہے، ٹھیک ہے اس کام کے لئے چیزوں کو، سرطانہ نہیں بھیجا جاتا، یہاں کے مقامی ڈاکٹروں پر ہی بھروسہ کر لیا جاتا ہے، مگر کھائی جانے والی اشیاء کی صحت کی ضمانت ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ تشریح ہے کہ اگر مولانا کو مرغین اور چٹنکارے دار کھانوں سے روک دیا گیا ہے تو ان کی زندگی میں رونق کیا رہ جائے گی؟ خبر میں بتایا گیا ہے کہ انہیں شوگر جیسی کڑوی مرض بھی لاحق ہے، ایسے میں زندگی پھینکی تو پہلے ہی تھی، اب اس میں سے نمک مرچ بھی نکل جائے گا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کے

معدے کو جلد صحت بخشنے، (آمین) ویسے مولانا کو بھی چاہیے کہ آئندہ وزیراعظم کی دعوت میں اشیائے خوردونوش پر خاص توجہ فرمالیا کریں، تاکہ ایسا واقعہ دوبارہ رونما نہ ہو سکے، وزیراعظم کی جانب سے بھی یقیناً اس اہم خبر پر انکوائری کمیشن قائم ہو چکا ہوگا، جو تین ماہ میں اس کی رپورٹ پیش کر دے گا۔

میں نے وفاقی وزیر مملکت کی ایک تقریب میں کی جانے والی گفتگو اخبار میں پڑھی، خبر پڑھ کر مجھے دیہات کا زمانہ یاد آگیا۔ گرمیوں کے موسم میں لوگوں کے پاس بہت فرصت ہوا کرتی تھی، بس گیارہ بارہ بجے دن کے بعد کوئی کام نہیں ہوتا تھا، اور شام کو پانچ بجے سے پہلے تک لوگ درختوں کے نیچے دیکے رہتے، ٹیوب ویلوں، راجا ہوں، نلکوں اور کھالوں میں نہاتے اور گیلے کپڑے اوپر لے کر سو جاتے، گھنے درختوں تلے ان کے مویشی بندھے ہوتے اور ایسے ہی ماحول میں ان کی چارپائیاں پڑی ہوتیں۔

دیہاتیوں کی مصروفیات ہوتی کیا ہیں، کھیتوں میں ہل چلانا، مویشیوں کو چارہ ڈالنا اور کھیتوں کو پانی لگانا۔ اگرچہ دیگر فصلوں کے چننے کا بندوبست اور کئی فصلوں کے برداشت کی مصروفیات بھی ہوتی ہیں، تاہم یہ سب کچھ اب مشینی ترقی نے قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ دیہاتیوں کی مصروفیات بھی شہریوں جیسی ہی ہو چکی ہیں۔ دیہات میں صرف کسان ہی گرمیوں میں فارغ نہیں ہوتے، بلکہ مویشی بھی پوری دوپہر فراغت میں ہی گزارتے ہیں، اس دوران جب یار لوگ گہری نیند بھی سو جاتے ہیں، ایسے میں مویشی ایک کام کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں، وہ ہے جگالی۔ کیا بھینس، کیا گائے، بیل ہو یا بکری، ایک ہی کام پر لگے ہوئے ہیں، کبھی اونگھ بھی

لیتے ہیں، کبھی کسی مکھی وغیرہ کے تنگ کرنے سے دُم کو حرکت دیتے ہیں، جب بیٹھ کر تھک جاتے ہیں تو کچھ دیر کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں تو کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔

جگالی وہ کام ہے جس میں نہ وقفہ ہے اور نہ رکاوٹ، اس میں بیٹھنے اور اٹھنے کی بھی پابندی نہیں، جس صورت میں چاہیں، جگالی کرتے جائیں۔ جگالی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس سے جانور تھکتا نہیں، یقیناً یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے، اور جب کوئی کام فطرت کے خلاف کیا جائے تو انسان ہو یا حیوان اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ جب ہم کوئی بات بار بار کرتے ہیں اور تکرار پر اصرار کرتے ہیں تو یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کی جگالی کی جارہی ہے۔ یہ جگالی ہر طبقہ کرتا ہے، ہم کالم لکھنے والے جگالی نہ کریں تو کالم لکھنا ممکن نہ رہے، کیونکہ ہمارے سامنے وہی ایشوز ہوتے ہیں، جو ہر روز دہرائے جاتے ہیں، وہی کرپشن، وہی مراعات، وہی عیاشیاں، وہی پمٹ سیاہا، وہی سوال، وہی جواب، وہی دعوے، وہی وعدے۔ سب کچھ وہی، سب کچھ جوں کا توں، سب کچھ حسبِ سابق، سب کچھ ویسے کا ویسے۔ اگر اپوزیشن حکومت پر مختلف الزامات لگاتی ہے تو حکومت بھی روایتی جواب دیتی ہے۔ دلائل کا زور کم، دعووں اور جواب دعووں کی کہانی زیادہ۔ کرپشن کرنے اور اسے ثابت کرنے کی جگالی۔ پسماندگی کے رونے اور ترقیاتی کاموں کی فراوانی کی جگالی، بے روزگاری اور روزگار کے مواقع کی

جگالی، ناخواندگی، سکولوں میں سہولتوں کے کم ہونے کی جگالی، تعلیمی ترقی اور دانش سکولوں کے قیام کی جگالی۔

جنوبی پنجاب میں محرومیوں کی جگالی، جنوبی پنجاب میں ترقیاتی کاموں کے جال بچھانے کے دعووں کی جگالی۔ لوڈ شیڈنگ کا ہنگامہ، لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کے اعلان کی جگالی۔ پاناما لیکس کے دعوے اور ان سے ایک جنہش میں نکل باہر کھڑے ہونے کی جگالی۔ اپوزیشن کے جلسے، حکومت کے جوابی جلسے بھی جگالی۔ سو وہ کونسا کام ہے جو جگالی کی ذیل میں نہیں آتا، کون سا طبقہ ہے جو مویشیوں کی طرح جگالی نہیں کرتا۔ ہم صحافی، وہ سیاستدان، وہ مذہبی رہنما، وہ این جی اوز اور دیگر تمام طبقات اپنے اپنے مقام پر رہ کر جگالی میں مصروف ہیں، بس خوراک میں کچھ تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر جگالی ہر صورت میں ہوگی۔ بات چلی تھی اپنے معزز وزیر مملکت برائے تعلیم میاں بلغ الرحمن کی ایک تقریب میں بات چیت سے اور پہنچ گئی جگالی تک، جو ہم سب کرتے ہیں۔ جگالی کو ایک طرف کریں، ایسے ہی موضوع خراب کرنے والی بات ہے۔ وزیر مملکت نے دیگر کے ساتھ دو بہت اہم باتیں کیں، ایک یہ کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ بارہویں جماعت تک قرآن پاک با ترجمہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، جس پر بہت جلد عمل شروع ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ پاکستان میں بہت سے بچے سکولوں سے باہر ہیں انہیں بہت جلد سکولوں میں لانے کی منصوبہ بندی جاری ہے۔ چونکہ یہ دونوں باتیں ایک معزز

وزیر مملکت نے فرمائی ہیں، اس لئے سچ ہی ہو گئی، تاہم ”بہت جلد“ والی بات حوصلہ
افزا ہے، ورنہ عوام تو یہی بات اس سے قبل بھی سیکڑوں مرتبہ سن چکے ہیں۔ میں نے
کالم لکھ دیا ہے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے، ورنہ مزید جگالی کی گنجائش
ابھی باقی تھی۔

! بندہ مزدور کے اوقات

محنت کشوں کے لئے کس قدر دلی طمانیت کی بات ہے کہ یکم مئی کو پوری دنیا انہیں یاد کرتی ہے، ان کے لئے تقریبات منعقد کی جاتی ہیں، ریلیاں نکالی جاتی ہیں، سیمینارز کا اہتمام کیا جاتا ہے، مذاکرے ہوتے ہیں، ہر بات کی تان مزدوروں سے اظہارِ یکجہتی پر ٹوٹتی ہے۔ اخبارات اپنے رنگین ایڈیشن شائع کرتے ہیں، چینلز خصوصی پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔ مزدوروں کے مسائل اجاگر کئے جاتے ہیں، ان مسائل کے حل کی بات کی جاتی ہے، مزدوری کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل دینے کی ہدایات کو یاد کیا جاتا ہے، ہاتھ سے کام کرنے والوں کی عظمت کا ذکر کیا جاتا ہے، ایسے مواقع پر مزدور رہنما میدان میں آتے اور اپنے جذبات سے قوم کو آگاہ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب انسان 'لیڈر' بن جاتا ہے تو وہ روایتی مزدور نہیں رہتا۔ مزدور بیچارے کے پاس اتنا وقت کہاں سے آیا کہ وہ لیڈریاں کرتا پھرے، اس کے پاس تو اس قدر وقت بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے استحصال کے خلاف کسی احتجاجی ریلی میں ہی شرکت کر سکے۔ اسے اپنے وقت کو بہترین طریقے سے استعمال کرنا ہوتا ہے، اور وہ کام ہے صرف مزدوری۔ وہ نہ اپنے کام سے غفلت کر سکتا ہے اور نہ ہی ڈنڈی مار سکتا ہے، ایسا کرنا خود اس کی ذات کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ نہ وہ موسم کا پابند ہے

اور نہ موسمیاتی شدت کا۔

مزدور کیا جانے کہ عالمی دن کیا ہوتے ہیں؟ ان کی اہمیت کیا ہے؟ اور ان کا فائدہ کیا؟ ان سے کیا حاصل ہوتا ہے اور ان کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہ عجیب دن ہے کہ جس کے بارے میں یہ منایا جاتا ہے وہ اپنے پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر سڑکوں پر روڑا کوٹنے، سارا دن مشقت کرنے، اپنی کمر پر وزن اٹھانے، اور دستی گاڑیوں کو کھینچنے دھکیلنے میں مصروف رہتا ہے، نہ وہ اخبار پڑھتا ہے، نہ وہ پڑھا لکھا نہیں، وہ ٹی وی نہیں دیکھ سکتا کہ دن میں اسے فرصت نہیں، اور نہ ہی اسے ٹی وی دیکھنے کے مواقع دستیاب ہیں۔ چنانچہ دن بھر کی مزدوروں کے عالمی دن کی سرگرمیوں سے وہ آگاہ نہیں ہوتا۔ تاہم ممکن ہے کہ کسی مزدور رہنما کی کسی دلیل وغیرہ کی روشنی میں حکومت کوئی ایسا قدم اٹھانے کا سوچ لے، جس سے مزدوروں کو کوئی فائدہ مل سکتا ہو۔ مگر ایسا بھی بہت کم ہوتا ہے۔ اگرچہ مزدور بچوں کا عالمی دن اس سے الگ ہے، مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ چائلڈ لیبر میں کمی کا کوئی تصور نہیں، جتنی مہمات چلائی جاتی ہیں، جتنے اعلیٰ سطحی اجلاس بلائے جاتے ہیں، جتنے فنڈز ان پر لگائے جاتے ہیں، اور ان کے معاملے میں جتنے دعوے کئے جاتے ہیں، وہ تمام جھوٹ کے زمرے میں آتے ہیں، لاکھوں بچوں میں چند ایک ہی کی قسمت ہی چمکتی ہوگی، اور ان کا مستقبل سنورتا ہوگا۔

محنت کشوں کی حالت جوں کی توں ہے، ان کی اجرت کے معاملات بھی فاسٹل نہیں ہو سکے۔ حکومت اگر بتاتی ہے کہ مزدور کو کم از کم اجرت کتنی ملنی چاہیے، تو یہ اجرت دلوانے کا ذمہ دار کون ہے؟ شاید حکومت کو یہ بات یاد نہیں رہتی، وہ بس اعلان کرنے کے بعد بری الذمہ ہو جاتی ہے کہ ہم نے مزدوری بڑھانے کا اعلان تو کر دیا ہے، آگے مزدور جانے اور اس کی قسمت۔ عالمی یوم مزدور اں کے موقع پر حکمرانوں کو ان کی معاشی اور سماجی حالت کو بہتر کرنے کے بارے میں کچھ غور بھی کرنا چاہیے۔ اول تو حکومت کی مقرر کردہ اجرت کوئی دیتا نہیں، بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا اپنا کاروبار ہی اس مقام تک ہوتا ہے کہ مزدور کو چھ سات سو روپے روزانہ تک ہی دے سکتا ہے، اور بعض اوقات اس سے بھی کم۔ مزدور کی اس قسم کی حالت بھی دیکھئے، جو چھوٹے چھوٹے نجی اداروں میں ملازمت کرتے ہیں، ان کی یومیہ اجرت عام مزدور سے بھی کم ہوتی ہے، بسا اوقات ادارہ بھی افورڈ نہیں کرتا۔ مزدور کا استحصال تو بہر صورت نہیں ہونا چاہیے، مگر حکومت کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو کسی حد تک تو کنٹرول کرے کہ مزدور انہیں خریدنے کی پوزیشن میں آجائے۔ انہیں تعلیم اور صحت وغیرہ کی سہولتیں تو مفت ہی میسر آنی چاہئیں، اس کے علاوہ بجلی، پٹرول اور خورد و نوش کی اشیائے دامت و مستطاب ہونی چاہئیں، تاکہ وہ کم آمدنی میں بھی اپنا گزارہ کر سکے۔ حکمرانوں کے میگا پراجیکٹس اور غریب عوام کے لئے ان

کے دعوے غریبوں کے دلوں پر تیسر چلاتے ہیں۔ غریب کا نام تو استعمال کیا جاتا ہے، مگر
عملی طور پر اس کی مجبوریوں اور ضروریات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

جنوبی پنجاب کی ترقی؟

وزیر اعلیٰ نے اپنا فرض پورا کر دیا، انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا، جس کے بارے میں کئی دہائیوں سے سیاستدان اور دانشور سرکھپاتے آئے تھے، کوئی اس راز تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ آخر جنوبی پنجاب والے ترقی سے کیوں محروم ہیں؟ وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ ”... دھرنوں کے شوقین دراصل جنوبی پنجاب کو ترقی کرتا نہیں دیکھنا چاہتے...“۔

انہوں نے یہ بیان جنوبی پنجاب کے شہر رحیم یار خان میں انڈسٹریل سٹیٹ کی تقریب کا افتتاح کیا، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس بیان کے بعد وہاں موجود لوگوں اور اس کے بعد اخبار سے یہ خبر پڑھنے والوں نے دھرنے والوں سے حساب مانگا یا اسے کچھ عرصہ کے لئے موخر کر دیا۔ وزیر اعلیٰ نے یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ دھرنے والوں کو تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں کہ وہ میدان میں سرگرم ہو کر آئے ہیں، اس سے قبل تو عرصہ دراز سے پنجاب میں مسلم لیگ ن کی ہی حکومت رہی ہے، تو دھرنوں سے قبل جنوبی پنجاب میں یہ کارِ خیر کیوں رو بہ عمل نہیں ہوا۔ دھرنے والوں سے پہلے جنوبی پنجاب میں کونسی ترقی ہوئی ہے جو دھرنے والوں یا اسی قسم کے اور ملک دشمن عناصر کی وجہ سے رک گئی ہے۔

پنجاب کے حکمرانوں کے پاس جنوبی پنجاب کی ترقی کے لئے بہت سے دلائل ہیں، دیکھیں
 ہر سال سیلاب کے دنوں میں لاکھوں (شاید کروڑوں) روپے کا فنڈ باہر سے آتا ہے،
 متاثرین کی مدد کی جاتی ہے، ان کے لئے گھر بنائے جاتے ہیں، ان کو ضرورت کی اشیاء
 مہیا کی جاتی ہیں، ان کو اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے فنڈز دیئے جاتے ہیں،
 ہسپتال اور سکولوں کا اہتمام ہوتا ہے، سڑکوں کی تعمیر ہوتی ہے، وزیر اعلیٰ اور بعض
 اوقات وزیر اعظم بھی دورے کرتے ہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ ایسے مواقع پر اکثر
 کیمرے جھلی ہوتے ہیں اور صاحب کے جاتے ہی بندوبست اکھاڑ لیا جاتا ہے)۔ ترکی اور دیگر
 ممالک کی مدد سے بہت سے کام کروائے جاتے ہیں۔ حکمران صرف یہی نہیں کرتے، جب
 کسی اہم مہم کا آغاز کرنا ہوتا ہے تو وہ عموماً جنوبی پنجاب کا انتخاب ہی کرتے ہیں، مثلاً
 میاں شہباز شریف نے اپنے گزشتہ دور میں لوڈ شیڈنگ کے خلاف ”کیمرے
 آفس“ (عرف عام میں جنہیں ٹینٹ آفس کہا جاتا ہے، قائم کئے تھے) ان کا افتتاح بھی
 جنوبی پنجاب کے اہم ضلع بہاول پور سے کیا تھا۔ انہوں نے سب سے زیادہ دانش سکول
 جنوبی پنجاب میں بنائے۔ ایک دانش سکول پر تقریباً ستر کروڑ سے زائد روپے خرچ
 ہوئے، اور وہاں داخل ہونے والے تمام بچے غریب الغریاء ہیں۔ ان پر کروڑوں
 روپے ماہانہ خرچہ آ رہا ہے۔ مگر ان غریبوں کی تعداد آؤٹ آف سکول کل بچوں کے
 مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ نہ ہی اس تناسب سے کل شرح خواندگی
 میں معمولی اضافے کے امکانات ہیں۔

جنوبی پنجاب کے ڈیرہ غازی خان ڈویژن کا حال دیکھ لیں، کہنے کو یہاں یونیورسٹی اور میڈیکل کالج اور بھی نہ جانے کون کونسے تعلیمی ادارے قائم ہیں، مگر عملی طور پر حالت افسوسناک ہے، نہ شہر کی حالت، نہ ترقی کے اثرات، نہ عوامی سہولتیں۔ پورے خطے میں صحت کا عالم یہ ہے کہ مظفر گڑھ میں جب ترکی کے قائم کردہ ہسپتال کا افتتاح میاں شہباز شریف نے کیا تو ساتھ ہی اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لودھراں ہسپتال میں ہم نے نئی مشینری بھیجی، وہ استعمال نہیں ہوئی، اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پرانی تھی، ہمیں ڈوب مرنا چاہیے۔ جنوبی پنجاب کے ایکٹ شہر ملتان میں میٹرو بس سروس کا آغاز بھی ہو رہا ہے۔ یہی جنوبی پنجاب ہے جہاں کے عوام کے دلوں میں یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ اسماں قیدی تخت لاہور دے۔“ اسی جنوبی پنجاب میں چھوٹو گینگ بھی ہوتی ہے۔ اسی ”جنوبی پنجاب میں نہری پانی کی بھی بے حد کمی ہے، یہاں کے لوگوں کو صرف تقریروں سے دلا سے دیئے جاتے ہیں، یہاں کے لوگوں کو جذباتی نعروں سے متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکمران کچھ غلط بھی نہیں کرتے، جب یہ لوگ محرومیوں اور مسلسل نظر انداز کرنے کی پالیسی کے باوجود حکمرانوں کے ساتھ ہیں تو انہیں یہاں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس میں جہاں حکمرانوں کے مظالم شامل ہیں، وہاں خطے کے عوام کی بے حسی اور غلامانہ ذہنیت کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ گزشتہ دنوں وزیر اعلیٰ نے راجن پور کا دورہ بھی کیا اور چھوٹو

گینگ کے ہاتھوں شہید ہونے والے پولیس اہلکاروں کے گھر گئے، بچوں کو گود اٹھایا،
تصاویر بنوائیں اور تقریر کی ”یہاں ہسپتال میں غریب کا علاج نہیں ہوتا، امیر تو باہر
علاج کروانے چلا جاتا ہے، مگر غریب لہڑیاں رگڑتا رہتا ہے، ہم ایکٹ ہی صف میں
کھڑے ہو گئے محمود وایاز کی کیفیت پیدا کر دیں گے ..“۔ خدایا! یہ کس دنیا کی بات
ہے، اور کون کر رہا ہے؟؟

اپوزیشن کا مقابلہ کرنے کے لئے اب وزیراعظم بھی اپنے کسی مشیر کے کہنے پر میدان میں نکلے ہوئے ہیں۔ مقابلہ بنتا نہیں تھا، کیونکہ یہ مقابلہ صرف الیکشن سے قبل تک ہوتا ہے۔ بعد میں تو ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مجت جاتا ہے۔ الیکشن کے بعد حکومت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے ظاہر کرے کہ ملکی ترقی میں کیا بہتری آئی، نظام تعلیم میں کیا تبدیلی آئی، ماحول کتنا بہتر ہوا، معاشرے کے حالات میں کتنی بہتری ہوئی، لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہوا؟ عوام کو کس قدر سہولتیں میسر آئیں، ان کی ضرورتیں پوری ہوئیں یا نہیں؟ الیکشن میں کامیابی سے محروم رہ جانے والوں کا اپنا طریقہ ہوتا ہے، وہ حکومت کے کام پر تنقید کرے، اگر جمہوریت کے اصولوں کو مد نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپوزیشن کی تنقید مثبت ہونی چاہیے، تنقید برائے تنقید سے اصلاح کے پہلو نہیں نکلتے۔ اگر اپوزیشن کی تنقید خرابیوں کو دور کرنے کے مشورے دینے کی ہے، تو جان لیجئے کہ اپوزیشن ملک و قوم کی حمایت میں کام کر رہی ہے، اگر تنقید صرف بیانات کی حد تک ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو بہتر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

اپوزیشن کو موقع چاہیے ہوتا ہے کہ حکومت سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو کہ اپوزیشن اس پر تنقید کے ڈوگرے، رسائے۔ اپوزیشن کے پاس ایسے ماہرین ہوتے ہیں، جو بہت باریکی سے حکومت کے کاموں کا جائزہ لیتے اور ان پر تنقید کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حکومت کے پاس بھی ہوتے ہیں، بلکہ ایک مکمل وزارت اسی کارِ خیر کے لئے موجود ہوتی ہے کہ اپوزیشن حکومت پر جو اعتراضات کرے، ان کا ”مدلل اور شافی“ جواب دینا اسی وزارت کے ذمے ہوتا ہے۔ فریقین کے لئے ایسے لوگ اس لئے بھی ضروری ہوتے ہیں کہ نہ جانے کس جماعت کو کب حکومت مل جائے اور کسی کو کب اقتدار سے محرومی کا صدمہ برداشت کرنا پڑ جائے۔ مگر بد قسمتی سے بعض اوقات حکومت ایسی دلدل میں پھنس جاتی ہے، جس پر اپوزیشن کو پوائنٹ سکورنگ کا بھرپور موقع میسر آ جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں سے پانامہ لیکس کے ہنگامے نے تمام معاملات کو دھندلا کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ وزیر اعظم میاں نواز شریف کا ذاتی طور پر اس میں نام نہیں، مگر ان کے بچوں کی سرپرستی کا الزام انہی پر عائد ہوتا ہے۔ جواب دینے کی بجائے پہلے تو ان پر اس قدر نفسیاتی دباؤ پڑا کہ انہیں میڈیکل چیک اپ کروانا پڑا۔ جس کے لئے وہ خصوصی طیارے کے ذریعے لندن گئے، اس چیک اپ پر اپوزیشن نے کوئی خاص ہنگامہ نہیں کیا، اس کی ایک ہی وجہ ہے وہ یہ کہ اپنے بہت سے اپوزیشن لیڈر بھی چیک اپ اور علاج کے لئے باہر ہی جاتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں عوام نے بہت سی باتیں کیں، جن میں سب سے اہم یہ تھی کہ ملک پر سالہا سال سے حکومت کرنے والوں نے

کوئی ہسپتال بھی اس معیار کا نہیں بنایا کہ جہاں ان لوگوں کا میڈیکل چیک اپ ہی ہو سکے۔ حکمرانوں کے لئے یہ بات اگرچہ لمحہ فکریہ تھی، تاہم حکمرانوں نے اس پر فکر مندی کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ یہ اعتراض تو عوام کا ہے، عوام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب اپوزیشن نے اگر جلے جلوس کا سلسلہ شروع کیا ہے، تو حکومت اپنے عمل سے ان کا جواب دیتی۔ پانامہ لیکس کے لئے اگر وزیراعظم نے سپریم کورٹ آف پاکستان کی نگرانی میں کمیشن بنانے کے لئے خط لکھ دیا ہے، تو اپوزیشن کو اس معاملے میں اعتماد کرنا چاہیے۔ مگر وزیراعظم کا بھی یہ کام نہیں کہ وہ بھی اپنا دفتر اور ذمہ داریاں چھوڑ کر اپوزیشن کے لوگوں (خاص طور پر تحریک انصاف کے قائد عمران خان) کو ہی واحد ایجنڈے کے طور پر ڈیل کریں۔ اپوزیشن کے اعتراضات کا جواب ان کے وزیر دے رہے ہیں، وزیراعظم نے قوم سے بہت خطاب بھی فرمالیئے ہیں۔ شاید ان تمام چیزوں سے وزیراعظم کی تسلی نہیں ہوئی، اور شاید انہیں مزہ بھی نہیں آیا، کیونکہ ”... اپوزیشن والے جانتے نہیں، ان کا واسطہ کس سے پڑ گیا ہے، ہم گیدڑ بکھبھکیوں سے ڈرنے والے نہیں، آپ کے کہنے پر گھر چلے جائیں، یہ منہ اور مسور کی دال، ہم عوام سے مینڈیٹ لے کر آئے ہیں.. یہ ہے نیا پاکستان، پرانے پاکستان والے پشاور بیٹھے ہیں، یاد دہرنے دے رہے ہیں..“۔ وزیراعظم کا یہ انداز ٹی وی پر تو نہیں دیکھا جاسکتا، یہ لکار

اکھاڑ بچھاڑ تو جلسوں میں ہی ممکن ہے، مگر وزیراعظم کے شایان شان نہیں۔ سیاستدان
آپس میں الجھے ہوئے ہیں، سب نام تو عوام کی بہبود کا ہی لیتے ہیں، اور عوام نے ہی سب
کو کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے، عوام نے ہی ان کو مولا جٹ بنایا ہوا ہے، نتیجے میں پرستے بھی
عوام ہی ہیں۔

خواتین کو اپنی ملکیت قرار دینے والے ہوشیار ہو جائیں، اب بلاول زرداری بھی میدان میں آگئے ہیں، انہوں نے مرد سیاستدانوں کے لئے ایک ٹویٹ کیا ہے، جس میں خواتین کے بارے میں مردوں سے کچھ گزارشات کی گئی ہیں۔ اگرچہ بلاول زرداری کے مخاطب سیاستدان مرد ہیں، مگر تاثر تمام مردوں کے بارے میں ابھرتا ہے۔ موصوف نے سیاستدانوں کے نام ٹویٹ میں کہا ہے کہ ”پیارے ساتھیو! خواتین کو اپنی ملکیت قرار دینا بند کر دیں، براہ مہربانی خواتین کا حوالہ ”ہماری خواتین“ کہہ کر دینا چھوڑ دیں، خواتین کوئی جائیداد نہیں کہ جن کی ملکیت کا دعویٰ کیا جائے، یہ کامانہ ہے، براہ مہربانی ایسا کر کے ہمیں شرمندہ نہ کریں...“۔ یہاں 2016 ملکیت کے لفظ کے پیچھے ایک مکمل نفسیات کار فرما دکھائی دیتی ہے، کہ سندھ کے جاگیردار ہر چیز کو اپنی ملکیت بنا کر ہی رکھنا پسند کرتے ہیں، بلاول چونکہ باہر کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے انہوں نے مذکورہ بیان اپنی تعلیم کے زیر اثر دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے ہاں عورت کو ملکیت سمجھا جاتا ہے، ان کی تعلیم کا تقاضا ہے کہ عورت کو ملکیت نہ جانا جائے۔ ویسے تو سیاست کے معاملہ میں بلاول مکمل پاکستانی سیاستدان ہیں، اسی طریقے سے للکار، الزامات کا وہی انداز، مولا جٹ کا وہی سٹائل، حقائق سے اسی طرح آنکھیں چرانا، بے

سروپا کی اسی طرح ہانکنا۔ اپنی سیاست میں مخالف کو لکارا نہ جائے تو عوام اپنے لیڈر سے خوش نہیں ہوتے۔ یوں بلاول صاحب بھی مجبوریوں کے چکر میں دہرے روپ کے ساتھ اپنے عوام کے سامنے آتے ہیں۔ وہ سیاست کے اصولوں کو بھی جانتے ہیں اور پاکستانی سیاست کو بھی خوب پہچانتے ہیں، ضرورت کے مطابق دونوں پر ہی عمل بھی کرتے ہیں۔

سیاستدان تو نہ جانے اس معاملے میں کیا رد عمل دیں گے، مگر ہم اس بات کے حق میں نہیں کہ عورت کو ملکیت قرار نہ دیا جائے۔ اگر ایک گھر ہے تو ہر رشتہ دوسرے کی ملکیت ہے، ماں ہے تو اس کی اولاد، اولاد ہے تو اس کے والدین اور اجداد، بہن ہے تو بھائی، الغرض جتنے بھی رشتے ہیں وہ سب ملکیت ہیں، یہی وجہ ہے کہ اولاد اپنے والدین کو ’ہمارے والدین‘ ہی کہتے ہیں، والدین اپنی اولاد کو ’میری‘ یا ہماری ہی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ خاوند اپنی بیوی کو ’میری بیگم‘ اور بیوی اپنے خاوند کو ’میرا خاوند‘ ہی کہتی ہے۔ صرف یہی نہیں، سگے بہن بھائیوں سے لے کر سزن سسٹم تک بھی تمام لوگ ’میرے‘ یا ’ہمارے‘ ہی ہوتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بلاول صاحب ہی دے سکتے ہیں کہ اپنی عزیز رشتہ دار خواتین کو ’ہماری خواتین‘ نہ کہا جائے تو اور کس نام سے پکارا جائے؟ وہ اپنی بہنوں کو یقیناً میری بہنیں ہی کہتے ہوں گے، اور ان کی بہنیں بھی یقیناً ہمارا بھائی ہی کہتی ہوں گی، ان کا بھائی سلامت رہے، وہ اپنے بھائی کو

ہمارا نہ کہیں تو کیا کہیں؟ یہ تو کئے رشتوں کی بات ہے، اپنے مشرقی معاشرے میں تو تمام خواتین کو احترام کی اسی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جس سے اپنے خاندان کی خواتین کو۔ ہمارے دیہات میں اگر کوئی بہو بیاہ کر آتی تھی تو اسے گاؤں کی بہو تصور کیا جاتا تھا، اور جب کسی کی بیٹی کی شادی کسی اور گاؤں میں ہو جاتی تھی تو وہ پورے گاؤں کی بیٹی ہی کہلاتی تھی۔ یوں رشتے کا وہ تقدس قائم ہوتا تھا کہ رشک آتا تھا۔

شاعری بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے، کہ ایک وقت آتا ہے جب انسان ”نؤ میرا“ میں تیری“ کی پوزیشن میں آ جاتا ہے۔ شاعری میں اس قسم کی ملکیت کا بڑا ہی واضح تصور موجود ہے، اور اگر انسان ایک دوسرے کو اپنی ملکیت قرار نہ دے تو اصل اور گہرا اعتماد حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ایک دوست بھی دوسرے کو ”میرا“ کہتا ہے تو اس سے بھی ملکیت کا تاثر ابھرتا ہے۔ اس سے دوسرے پر بھروسے کی انتہا ہوتی ہے کہ انسان خود کو دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے۔ بلاول زرداری کا اپنا کیس ذرا مختلف بھی ہے، ابھی ان کی زندگی میں ایسی خاتون شخصیت کی آمد نہیں ہوئی جنہیں وہ ”اپنی“ قرار دے سکیں، یوں ابھی ان کا ذاتی تجربہ بھی نہیں ہے، امید ہے جلد ہی وہ وقت آ جائے گا جب وہ اس ملکیت کے معاملے کو جان لیں گے۔ اگر مرد سیاستدان خواتین کے لئے ”ہماری خواتین“ کا حوالہ استعمال کرتے ہیں تو ہماری خواتین بھی اپنے بھائی بندوں کے لئے

ہمارے مرد“ کی اصطلاح ہی استعمال کرتی ہیں۔ بہر حال بلاول نے ٹویٹ کر دیا ہے،”
باقی رہا سیاستدان مردوں کا رد عمل تو دیکھیں وہ موصوف کے ٹویٹ سے متاثر ہوتے ہیں
یا اپنی پرانی دھن میں مگن رہتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمن اگرچہ وزیراعظم کے جلسے میں شرکت کرنے بنوں گئے تھے، جنہیں میاں صاحب نے ازراہ کرم میزبان قرار دیا۔ مگر جلسے کی زبان دیگر جلسوں سے بالکل منفرد اور انوکھی تھی۔ سیاسی جلسوں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں مقررین حاضرین کو متاثر کرنے کے لئے نئے نئے تخیلات پیش کرتے ہیں، ورنہ ایک ہی جلسہ میں ایک ہی ایٹوپر بہت سے مقررین خطاب کریں گے تو اس میں یکسانیت کی وجہ سے بوریت کا عنصر غالب ہو سکتا ہے۔ نیا تخیل مقررین کی خوبی ہوتی ہے، اور یہی دلچسپی شرکاء کو جلسہ گاہ کی جانب کھینچ کر لے جانے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ بنوں والے جلسے میں جہاں وزیراعظم نے پانامہ لیکس کا بھی ذکر کیا اور خود کو احتساب کے لئے پیش کرنے کی پیش کش کو دہرایا، وہاں ’مخالفین‘ کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا، انہوں نے نئے پاکستان والوں کو لکارا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خیبر پختونخوا کے لوگ سنہری خوابوں کے جھانے میں آگئے، صوبے کے دوروں کا مقصد نیا خیبر پختونخوا دیکھنا تھا مگر ٹوٹی سڑکیں، پرانے سکول، ناکارہ ہسپتال دیکھ کر دکھ ہوا۔ وزیراعظم چونکہ اسلام آباد اور لاہور میں ہی زیادہ وقت گزارتے ہیں، اس لئے انہیں پنجاب یا پاکستان کے دیگر علاقوں کے ہسپتالوں، سکولوں اور سڑکوں وغیرہ کی صورت حال سے زیادہ آگاہی

نہیں۔

اس جلسہ میں ایک نئی تہدیلی دیکھنے کو ملی، وہ تھی مولانا فضل الرحمن اور ان کے سابق وزیر اعلیٰ خیبر پختونخوا اکرم درانی کی جلسے میں کی گئی تقاریر۔ مولانا نے دیگر بھی بہت سی باتیں کیں مگر ”سو گزرتہ، سرے پر گرہ“ کے مصداق ان کا سب سے اہم جملہ یہی قرار دیا گیا، جس میں انہوں نے فرمایا ”جو لوگ اپنے صوبے میں چوہوں سے ڈر گئے ہیں وہ پنجاب کے شیروں کا کیا مقابلہ کریں گے؟“ مولانا کا یہ جملہ جہاں وزیراعظم کے لئے بہت ہی حوصلہ افزا تھا، وہاں مولانا کے حامیوں میں بھی کسی حد تک پریشانی کا موجب ضرور بنا ہوگا، کیونکہ مولانا اس مقام پر ضرور فائز ہیں جہاں وہ دوسرے سیاستدانوں کی تعریف اس حد تک کر دیں کہ بات چوہوں اور شیروں کے مقابلے تک پہنچ جائے۔ ایسے جملے کسی سیاسی جماعت کے عام لیڈر تو اپنے رہنما کے سامنے کر سکتے ہیں، مگر کسی دوسری پارٹی کے سربراہ کا ایک کے سربراہ کے بارے میں اس قسم کے الفاظ کا استعمال حیران کن تھا۔ مولانا فضل الرحمن اس قدر آگے کیوں گئے، اس کی تین وجوہات ہیں، اول یہ کہ وہ وزیراعظم کی حمایت میں تقریر فرما رہے تھے، ان کے پانامہ لیکس پر پردہ ڈالنے میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ دوم یہ کہ وہ ایک ایسے مخالف پر اپنا غصہ اتار رہے تھے جس نے خیبر میں مولانا کی پارٹی کی حکومت پر کامیابی حاصل کر لی تھی، تیسری یہ کہ وہ حکومت کے اتحادی ہیں۔

مولانا فضل الرحمن سے قبل ان کی پارٹی کے وفاقی وزیر اکرم درانی نے بھی اپنے خطاب میں بہت قیمتی جملے ادا کئے، انہوں نے کہا کہ ”وزیراعظم ہمیں حکم دیں، ہم جمہوری طریقے سے خیبر پختونخوا کی حکومت کو گرا کر ایک ماہ میں اپنی حکومت قائم کر دیں گے۔ یہاں بھی دو اہم تحیل کار فرما ہیں، اول یہ کہ ”وزیراعظم حکم کریں“۔ یقیناً“۔۔

وزیراعظم ہونے کے ناطے وہ اکرم درانی کے لیڈر ہیں، اور جب کوئی کارکن اپنے لیڈر کے حکم ماننے اور اشارے کا انتظار کرنے پر آجائے تو جان لیجئے کہ وہ اپنے لیڈر کا دیوانہ ہے، یا جانثار ہے، اس جملے سے وفاداری کا تاثر بھی سامنے آتا ہے۔ ویسے اپنی پارٹی کے لیڈر کی موجودگی میں ’حکم‘ کی اجازت طلب کرنا بڑی ہمت کی بات ہے۔ دوم یہ کہ درانی صاحب کی یہ خواہش کہ حکومت کو گرا سکتے ہیں، محض ایک خواب ہے، جس کے پورے ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم ایک ماہ مانگنے کا مطلب شاید یہی تھا کہ میاں صاحب کی مدد طلب کی جائے گی اور ان کے مخصوص طریقوں سے حکومت سازی کا کام کیا جائے گا۔ لیکن طریقہ جو بھی اپنایا جائے یہ کام ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم جو چیز اس جلسے میں دکھائی دی، وہ بہت بڑی تبدیلی تھی، کہ ایک پارٹی نے حکومت کے ساتھ رہنے کی قیمت میں ایسے ایسے جملے اپنی تقریر میں ادا کئے کہ ان کی پارٹی کے لوگ بھی پریشان ہو گئے۔ ایسی روایت اس سے قبل کم ہی دیکھنے میں آتی ہے، اور وہ بھی ایک مذہبی جماعت کے رہنما جو

حق گوئی“ وغیرہ کے بہت قائل ہوتے ہیں۔ یہاں تو ایسا ہی محسوس ہوا کہ دونوں ”
مولانا حضرات کے قائد اب میاں نواز شریف ہی ہیں، یا پھر اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے
ایسے ہنر آزمائے جاتے ہیں۔

! بھینس کے آگے میں

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین ملتان آئے تو ان کے روٹ پر بھینسیں چڑھ آئیں، سکیورٹی اہلکاروں اور متعلقہ حکام کی بھرپور اور فوری کوششوں سے بھینسوں کو سڑک سے ہٹا دیا گیا، انتظامیہ نے سکھ کا سانس لیا۔ کلمہ شکر ادا کیا گیا کہ یہ بھینسیں صدر صاحب کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی یہاں سے گزر گئیں، اگر یہ بھینسیں صدارتی قافلہ گزرتے وقت وہاں سے گزر رہی ہوتیں تو سوچئے کیا بنتا؟ یہ بہت اہم معاملہ ہے، اب نہ سہی، آئندہ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، چلیں یہ تو صدر مملکت کا قافلہ تھا، بھینسیں ہوں یا بکریاں یا کوئی انسان نما مخلوق، ایسے قافلوں کے سامنے آجائے تو مسائل پیدا کرتی ہیں۔ یہ تو صدر تھے کہ کوئی ایکشن نہیں لیا گیا، اگر ایسا کبھی وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم کے قافلے کے ساتھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ سب سے پہلے مقامی پولیس افسران کو معطل کیا جائے گا، اس کے بعد انکوائری سٹینڈ ہوگی، جس میں محکمہ لائیو سٹاک کے افسران کی شامت آئے گی، مقامی انتظامیہ سے بھی پوچھ گچھ ہوگی، بعید نہیں کہ ان میں سے کسی ناپسندیدہ فرد کو معطل بھی کر دیا جائے۔ اور آخر میں بھینسوں والوں کی باری آئے گی، کہ شہر میں بھینسیں کیا کر رہی تھیں؟ یہ سب کچھ اب بھی ہونا چاہیے، تاکہ آنے والے وقت کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جاسکیں۔ چونکہ گورنر

پنجاب کا تعلق ملتان سے ہی ہے، اس لئے ان کے لئے یہ خاص امتحان ہے، کہ اسلام آباد کی بلندیوں سے اترنے والے صدر پاکستان ملتان آکر کیا سوچیں گے، یہاں بھینسیں بھی قابو نہیں آتیں اور پروٹوکول میں خلل اندازی کا ارتکاب کرتی ہیں۔ اس اہم ایٹو کے حل کے لئے حکومت کو سر جوڑ کر بیٹھنا پڑے گا۔ یہ تجویز بھی ہو سکتی ہے کہ بھینسوں کو شہر بدر کر دیا جائے، ویسے یہ کارِ خیر وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ کہانی پھر وہیں پر آ جاتی ہے۔ ایک مشورہ یہ بھی ہے کہ اگر شہر میں کچھ بھینسیں بچ رہیں تو ان کی تربیت کا بندوبست کیا جائے، اس کے لئے محکمہ لائیو سٹاک کو چاہیے کہ وہ وفاقی وزارتِ تعلیم سے رابطہ کرے، کیونکہ یہ وزارت اب صرف ٹریننگ کے فرائض ہی سرانجام دیتی ہے، امکان غالب یہی ہے کہ یہ لوگ انسانوں کی تربیت کے فرائض انجام دے چکے ہونگے (کیونکہ کافی عرصے سے اور بہت جوش و خروش سے یہ کام جاری ہے)۔ بھینسوں کے آگے پیس بجانے کا بندوبست بھی کیا جاسکتا ہے، تاکہ وہ مصروف رہیں اور روٹ متاثر نہ ہو۔

صدر کی آمد کی بنا پر دوسری طرف بھی سڑک پر ٹریفک جام تھی، مسافر پریشان تھے، کسی نے بچوں کو سکول سے لینا تھا، تو کسی نے خاص کام کے لئے دوسری جگہ پہنچنا تھا، اسی میں رش میں ایک ایمبولینس بھی پھنسی ہوئی تھی، گاڑی کے آگے جانے کا راستہ نہیں تھا، پولیس نے بیرئیر لگا کر راستہ روک رکھا تھا، مریض کے واسطے سے پولیس کی منت، سمجھت کی گئی، مگر گاڑی کو آگے نہ جانے دیا گیا

مریض کے ساتھیوں نے اسے سٹریچر پر ڈال کر بیرہ سُر کر اس کروانے کی کوشش کی تو پولیس نے وہ بھی ناکام بنا دی۔ آخر درد سے کراہتے مریض کو انسانی بیساکھیوں کے ذریعے لے جایا گیا۔ چونکہ صدر کے پروٹوکول اور سکیورٹی کا تقاضا تھا کہ تقریب کے مقام اور تمام راستوں کو بلاک کر دیا جائے، چنانچہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے ایسا ہی کیا گیا۔ دیگر روٹوں پر لوگوں کو کون کونسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا یہ رپورٹ نہیں ہوئیں۔

صدر مملکت کی سکیورٹی نے جب بھینسوں کو سڑک سے ہٹانے کے بعد انتظامیہ نے ابھی سکھ کا سانس لیا ہی تھا کہ پروٹوکول کی ایکٹ گاڑی نے چلنے سے جواب دے دیا۔ اس گاڑی کو دھکا لگانے والوں کی کمی نہ تھی، کہ پوری انتظامیہ دستیاب تھی، چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ صدر ہوں یا گورنر، یہ لوگ بلاشبہ وفاقی حکومت یعنی میاں نواز شریف کی مہربانیوں نے نتیجے میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ گورنر صوبے میں وفاق کا نمائندہ ہوتا ہے، یعنی گورنر صدر نے نمائندہ ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں گورنر پنجاب کہ جن کا تعلق ملتان سے ہی ہے، بھینسوں کے معاملے میں کیا قدم اٹھاتے ہیں، شہر کی صفائی کا خیال کس طرح رکھتے ہیں، اپنے باس کے حفاظتی جلوس میں خراب گاڑیوں کا کیا بندوبست کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ عوام نما مخلوق جو سڑکوں پر ہجوم کر دیتی ہے، اس کا مستقل کیا علاج سوچتے ہیں؟ یہ سوالات صرف گورنر کے سوچنے کے

نہیں، صوبائی انتظامیہ کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے، ان تمام مخلوقات کو قابو کرنے کے
لئے سخت اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

! تنازع خواتین کے احترام کا

سوال یہاں بھی اٹھتے ہیں، تحریک انصاف کے جلسے میں خواتین پر پبل پڑنے والے درندے کون تھے؟ آیا وہ پی ٹی آئی کے جنونی ہی تھے، یا کسی اور نے سازش کر کے اپنے لوگ بھیجے تھے؟ بات نکلتے نکلتے نکلتے نکلتی، پہلے صرف یہ خبر آئی کہ اسلام آباد والے جلسے میں خواتین پر حملہ ہوا، اس کی بازگشت بعد میں سنائی دی، پھر کچھ متحرک تصاویر بھی منظر عام پر آ گئیں۔ اس کے بعد تمام تر پریشانیوں اور بندوبست کے باوجود لاہور میں بھی یہی کچھ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے تصاویر بھی سامنے آنے لگیں، کچھ کے چہرے پہچانے بھی جانے لگے، معاملہ چونکہ متنازع لوگوں کا تھا، اس لئے اس کا اٹھایا جانا فطری امر تھا۔ چینلز نے بھی تصاویر دکھائیں، وزیر داخلہ نے بھی تصاویر کو نادر اتکٹ پہنچانے کا اعلان کیا، اور ملزمان کے گھرتک پہنچنے کی خبر سنائی۔ وزیراعظم نے بھی ایکشن لیا اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ چند روز تک معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا، کیونکہ اپنے ہاں ایشوز بہت زیادہ ہوتے ہیں، یکے بعد دیگرے چلے آتے ہیں، اس لئے جب ایک آ جاتا ہے تو پہلے والا منظر سے ہٹ جاتا ہے، اگر بہت بڑا ہو تو چند روز میں منظر سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اگر خواتین پر حملے والے ایشو کو اٹھایا جا رہا ہے تو یہ ہے بھی اٹھائے جانے کے لائق، کیونکہ کوئی تو کسی مظلوم کی

آواز بنے۔ یہ آواز اٹھانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ سیاسی نہیں انسانی مسئلہ ہے، انسانیت کے ناطے غیر انسانی کام کرنے والوں کی نشاندہی کرنا، انہیں گرفتار کرنا اور قرار واقعی سزا دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ریاست کی رٹ قائم کرنے کی ذمہ داری مسلم لیگ ن پر ہے، حکومت انہی کی ہے اور تحریک انصاف کی براہ راست نگرانی بھی انہی سے ہے۔

قوم نے منظر دیکھا کہ بہت سے نوجوان خواتین پر حملہ آور ہیں، اور بہت برے طریقے سے جھپٹ رہے ہیں، یوں جیسے گدھیں اپنی خوراک پر گر رہی ہوتی ہیں۔ غیرت، حمیت اور انسانیت سے عاری یہ لوگ کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے، ایک ہنگامہ سا برپا تھا اور موقع کو غنیمت جانتے ہوئے یہ کاروائی کر دی گئی۔ ٹی وی کیمروں نے کسی حد تک ملزمان کو پہچاننے کی کوشش کی، جن کی تصاویر چوہدری ثار نے نادرا کو بھیجنے کا اعلان کیا ہے۔ یہاں اس بات کو ایک طرف رکھیں کہ یہ جلسہ کس کا تھا اور ملزمان اپنے تھے یا پرائے؟ مسئلہ یہ ہے کہ آخر ہم لوگ خواتین کا احترام کرنے میں اس قدر بخیلی سے کام کیوں لیتے ہیں اور اگر موقع مل جائے تو کس درندگی کے ساتھ حملہ آور بھی ہو جاتے ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ ہماری خواتین ہی اپنے بھائی بندوں کے درمیان محفوظ نہیں، ان کے ساتھ رہنے، چلنے پھرنے والے بھی دراصل بھیڑیے ہی ہیں، جو صرف موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ ہماری ذہنی غلاظت کی عکاسی کرتا ہے، اس کی

جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

ایک طبقہ فکر کا یہ بھی خیال ہے کہ خواتین کا اس طرح جلسوں میں جانا بذاتِ خود آئیل مجھے مار“ کہنے کے مترادف ہے۔ صبح سے ہی ہمارے ٹی وی چینلز بہت سی ”خواتین کی تیاری کے مراحل دکھا رہے تھے، کہ کس طرح بیوٹی پارلرز کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں اور تیاری کے بعد جلسہ میں یہ خواتین کس طرح اچھل اچھل کر ناچ رہی ہیں، اور لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا فطری تقاضا ہے کہ یہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ کوئی بھی انسان اگر بن سنور کر نکلتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ اسے لوگ دیکھیں گے۔ بہت سے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں، جو گھر میں دھوٹی پوش ہوتے ہیں، ہوائی چپل پہنتے ہیں، مگر جب وہ دفتر یا کسی تقریب میں جاتے ہیں تو سوٹ بوٹ کے ساتھ۔ یہی عالم خواتین کا ہے۔ سچ دھج کے نکلنے کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ دوسرے دیکھیں، ورنہ سادگی ہی بہتر ہوتی ہے۔ اسلام کا نام لیتے ہم شرماتے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلام کے نام پر چڑ جاتے ہیں، اسلام نے عورت کو محرم کے بغیر باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔ مگر ہم اس عمل کو عورت کی آزادی کے منافی جانتے ہیں۔ ظاہر ہے جب اسلام کی بات ہوگی تو امن اور سلامتی کی بات ہوگی اور جب اپنی مرضی کی کہانی ہوگی تو پریشانیاں اور مسائل کا سامنا ہوگا۔ جہاں خواتین کا اس قدر بن سنور کے نکلنا اور اچھل کود کا اہتمام کرنا غلط ہے

اسی طرح ان پر حملہ کرنے والوں کا اقدام بھی قابل گرفت جرم ہے۔

چیف جسٹس آف پاکستان انور ظہیر جمالی نے قوم کے جس اجتماعی رویے اور عمل کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ قابلِ غور ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ”اہم معاملات میں ہماری حکومت، اپوزیشن اور عوام مل کر بھی متفقہ لائحہ عمل تیار نہیں کر سکتے، یہ ایک المیہ ہی ہے.... الزام تراشی کا کلچر بڑھ رہا ہے، ہر شخص حقوق کی بات تو کرتا ہے، مگر اپنے فرائض کی طرف نہیں دیکھتا۔ ملک میں طویل مدتی منصوبہ بندی کی روایت موجود نہیں...“۔ اپنے ہاں تو یہی رواج ہے کہ اگر حکومت نے کوئی بات کی ہے تو اپوزیشن کی جانب سے اس کی مخالفت کرنا ہی سیاست کا چلن ہے اور یہی روایت۔ دوسری طرف اگر اپوزیشن نے کوئی مثبت تنقید بھی کر دی ہے تو حکومت اور اس کے وزراء نے ان کی مخالفت کرنا اپنا فرضِ عین جان لیا ہے، خواہ اس پر عمل سے ملک و قوم کا بھلا ہی نکلتا ہو۔ اگر ہماری حکومت، اپوزیشن، عوام اور دیگر ادارے ملک میں دہشت گردی کے خلاف متحد ہوئے ہیں تو ان کا نہیں، فوج کا کمال ہے۔ اب ملک میں کرپشن کے خلاف مہمات کی کہانی چلی تھی تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رہ گئی۔ اس کی بڑی اور اہم وجہ یہی ہے کہ کرپشن اوپر سے نیچے تک مقتدر لوگوں کے خون میں رچ بس چکی ہے۔ جو لوگ کرپشن سے محفوظ ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

اگر کرپشن کا ذکر ہے تو اس کا حل بھی نکالنا چاہیے۔ جب حل نکالنے اور کرپٹ مافیا کو پکڑنے کی بات ہوتی ہے، تو ہر فرد دوسرے کو پکڑنے کی بات کرتا ہے۔ پاناما لیکس کی کہانی کیا رنگ لائے گی، کسی کو خبر نہیں، تاہم وزیر اعلیٰ پنجاب ہمیشہ بہت ہی زور دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک پائی کی کرپشن بھی ثابت ہو جائے تو میرا نام تبدیل کر دیں، یا مجھے پھانسی دے دیں (وغیرہ) مگر کون سا دفتر یا محکمہ ہے جہاں کرپشن کا بازار جوں کا توں گرم نہیں؟ پٹواری سے سیکریٹری تک بھاری اکثریت اس دھندے میں ملوث ہوتی ہے، مگر حکمران ہیں کہ مان کر نہیں دے رہے۔ پاناما لیکس کے سلسلے میں ایک جانب سے اپوزیشن کا دباؤ ہے تو دوسری طرف حکومت نے نیا لائحہ عمل یہ تیار کیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ وزیراعظم پارلیمنٹ میں پاناما لیکس کے بارے میں وضاحت نہیں کریں گے، تاہم ان کے بچے کمیشن کے سامنے پیش ہوں گے۔ حیرت کی بات ہے کہ وزیراعظم نے پاناما لیکس کا دباؤ کم کرنے کے لئے ٹی وی پر قوم سے خطاب کیا، انہوں نے مخالفین کے مقابلے میں مختلف شہروں میں جلسے کر دیئے، ان کے وزراء بیانات دے رہے ہیں، مہینوں بعد کا بینہ کا اجلاس منعقد ہو گیا، اتحادی جماعتوں سے مشاورت ہو رہی ہے، مگر پارلیمنٹ میں وضاحت نہیں ہوگی۔ حیرت اس بات پر بھی ہے کہ اگر کوئی مخالف جلسہ کرے یا دھرنا دے، یا احتجاج کرے تو کہا جاتا ہے کہ جو مسئلہ ہے وہ پارلیمنٹ میں آ کر بیان کیا جائے، مگر جب اپنی باری آتی ہے

(تو بتایا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کے سامنے وضاحت نہیں کی جائے گی)؟

چیف جسٹس نے قانون پر عمل داری کی ذمہ داری کی بات کی ہے۔ اپنے ہاں قانون کی کہانی بھی عجیب ہی ہے، قانون کا وجود ہے تو سہی، مگر یہ دوسروں اور غریبوں کے لئے ہے، طاقتور جس طرف چاہتا ہے قانون کا رخ موڑ لیتا ہے، یہاں تو قتل بھی کر کے بدنام کوئی نہیں ہوتا اور غریب معمولی جرم میں ڈھک دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کے مطابق قانون پر عمل درآمد تو دور کی بات ہے، یہاں قانون کھنی بھی ایک فیشن ہے، وہ یا تو کوئی کسی زعم میں کرتا ہے یا بہت سے لوگ انتقاماً جرم کرتے ہیں یا جہالت کی بنا پر قانون کھنی کی جاتی ہے۔ یہ تمام قانون شکنیاں جب زیادہ بڑھ جاتی ہیں، تو پورا معاشرہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔ بہ حیثیت معاشرہ ہم اپنے فرائض سے بھی غافل ہیں، دوسروں سے ہم صفائی، ایمانداری اور بہتری کی توقع رکھتے ہیں، خود ہم گندگی بکھیرتے، بے ایمانی کرتے اور دوسروں کو عملی نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ اگر ہم سب لوگ مل کر تہیہ کر لیں کہ اپنی گلی محلے میں گندگی نہیں گرانی، دوسروں کی تکالیف کا خیال رکھنا ہے، کسی کو نقصان نہیں پہنچانا، غریبوں کی مدد کرنا ہے، غریبوں کی مدد کر کے ان کے بچوں کو تعلیم دلوانے اور ان کے علاج وغیرہ میں ان کا ساتھ دینا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشرہ مثالی نہ بن جائے۔ اور اگر اپنے مقتدر طبقے یہ فیصلہ کر لیں کہ کرپشن کی بجائے ہم نے خدمت کرنا ہے تو معاشرے میں

امن قائم ہو جائے۔ اسی طرح حکومتیں بھی طویل مدتی منصوبے بغیر کرپشن کے مکمل
کریں تو ملک خوشحالی اور امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

! کرپشن اور احتساب

گلتا ہے کہ کرپشن کے غبارے سے بہت جلد ہوا نکل جائے گی، کیونکہ اپنے ہاں جن سیاستدانوں یا بیوروکریٹس وغیرہ پر کرپشن کے الزامات لگ رہے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ کلیئر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر حکمرانوں کی کرپشن پر نگاہ ڈالی جائے تو وزیراعظم میاں نواز شریف نے خود کو احتساب کے لئے پیش کر دیا ہے، اب چیف جسٹس آف پاکستان کمیشن بنائیں یا نہ بنائیں یہ ان کی مرضی۔ دوسری طرف اپوزیشن کا احتجاج بھی جاری ہے، وزیراعظم کے خود کو احتساب کے لئے پیش کرنے کے بعد اب نہ جانے مخالفین کیا چاہتے ہیں؟ دوسری طرف اپوزیشن کے رہنماؤں خورشید شاہ، عمران خان اور دیگر نے بھی یہی کہا ہے کہ احتساب پہلے خود سے شروع کیا جائے، اس سلسلے میں ان لوگوں نے خود کو احتساب کے لئے پیش کر دیا ہے۔ یوں تمام سیاستدان خود کو احتساب کے لئے پیش کر چکے ہیں۔ الیکشن کمیشن میں ان کے اثبات بھی موجود ہیں، جنہیں پڑھ کر پہلی نگاہ میں تو انسان کی ہنسی چھوٹتی ہے، اور کچھ ہی دیر بعد رونے کو دل کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بہت سے سیاسی قائدین بے گھر، بے در اور بے کار ہیں۔ کوئی اپنی بیوی کے گھر میں رہتا ہے، تو کوئی اپنے بیٹے کی گاڑی استعمال کرتا ہے۔ اس صورت حال سے الیکشن کمیشن بھی مطمئن ہے اور محکمہ انکم ٹیکس بھی۔

جب وزیراعظم سمیت تمام سیاستدانوں نے خود کو احتساب کے لئے پیش کر دیا ہے تو پھر نہ جانے شور کس بات کا ہے، ہنگامہ کیوں برپا ہے، مطالبہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر وزیراعظم نے خود کو احتساب کے لئے پیش کر دیا ہے تو ان کا احتساب کیوں نہیں ہوتا، یہاں یہ سوال بھی سر اٹھاتا ہے کہ احتساب کرے کون؟ اور اس کو احتساب کرنے کی درخواست کون کرے گا؟ اور اگر اپوزیشن کے رہنما خود کو احتساب کے لئے پیش کر رہے ہیں تو ان کا احتساب کرنے اور ان کی اس خواہش کی تکمیل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اگر ہمارے سیاستدانوں نے خود کو احتساب کے لئے پیش کر دیا ہے اور کوئی ادارہ یا فرد آگے بڑھ کر ان کا احتساب کرنے پر رضامند نہیں ہے، یا احتساب کرنے کا آغاز نہیں کر رہا تو نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس سے یہ فرض کر لیا جائے گا کہ ہم نے تو خود کو احتساب کے لئے پیش کیا ہے، مگر کوئی احتساب کرتا ہی نہیں، گویا ہمارا احتساب ہو چکا، ہمیں شفاف دامن کا سرٹیفیکیٹ مل چکا۔ اب حکمرانوں اور مخالفین کو چاہیے کہ وہ احتساب کے ضمن میں خاموشی اختیار کریں، کیونکہ اب کوئی تیسرا فرد ان کا احتساب کرنے کے لئے آگے نہیں آیا، آخر کب تک یہ معصوم لوگ انتظار کی سولی پر لٹکے رہیں گے، اگر ان کا احتساب کیا جانا مقصود ہے تو ہو جانا چاہیے، اور اگر کوئی احتساب کرنے والا ہی نہیں، یا کرنے کے لئے تیار ہی نہیں، تو پھر یہ رٹ بند ہونی چاہیے۔ ایک دوسرے کا

احتساب کرنے اور خود کو اس کارِ خیر کے لئے پیش کرنے کے علاوہ کرپشن کے خلاف
مہمات بھی گردش میں ہیں، ابھی اگر کوئی احتساب کے لائق ہی نہیں تو کونسی کرپشن؟
کہاں کی کرپشن؟

ملک کو چلنے دیا جائے، ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں،
زرِ مبادلہ کے ذخائر پُر ہیں، فی کس آمدنی میں معقول اضافہ ہو چکا ہے، غربت کم ہو
چکی ہے جس کے نتیجے میں غریب بھی خاتمے کے قریب ہیں، حکومتی کوششوں سے امید
ہے غریب اور غربت دونوں اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائیں گی۔ جب سے سیکریٹری خزانہ
، بلوچستان مشتاق ریسانی کے گھر سے خزانہ برآمد ہوا ہے

کرپشن کے متعلق عجیب سے خیالات آنے لگے ہیں۔ اب اس بات پر یقین کرنا واجب
ہو گیا ہے کہ خزانے بھرے ہوئے ہیں، اور یہ بھی کہ سیاستدانوں کے ساتھ بیوروکریسی
کے خزانے بھی لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی ان کا افشا ہونا باقی
ہے۔ نہ جانے کتنے بیوروکریٹس کے گھر قومی خزانے کے روپ دھارے ہوئے ہیں، اور
کتنے مقتدر طبقے کتنے خزانوں کے مالک ہیں؟ کرپشن صرف نوٹ گھر رکھ لینے یا انہیں خفیہ
طریقے سے باہر بھیج دینے کا نام بھی نہیں۔ اگر مری میں وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ
کی تزئین و آرائش پر 43 کروڑ روپے خرچ ہو رہے ہیں تو اسے کیا نام دیا جائے گا؟ اگر
یہ کرپشن کے زمرے میں نہیں

آتا تو خود پر کروڑوں روپے خرچ کرنا قانونی طور پر جائز ہے۔ حکمرانوں وغیرہ کو چاہیے کہ وہ اپنی مراعات پر توجہ دیں، اگر اس میں بہتری آ جاتی ہے تو انہیں مزید لوٹ مار کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

! واپڈا کے دھکے

اس نے بجلی کے بلوں کا پلندہ میز پر رکھا اور پسینہ پونچھتے ہوئے پانی کا گلاس طلب کیا۔ خادم حسین جس دفتر میں کام کرتا ہے، وہ دو منزلہ ہے، لہذا بجلی کے بھی دو ہی میٹر کام کر رہے ہیں۔ گزشتہ گرمیوں میں بارش میں ان کا تھری فیس میٹر جل گیا تھا، تاہم واپڈا ٹیم نے میٹر کو بند پایا تو اتار کر لے گئے۔ آفس کی طرف سے خادم حسین ہی اس قسم کے معاملات کو ڈیل کرتا ہے، وہ فوری طور پر واپڈا کے دفتر گیا اور بتایا کہ دیکھا جاسکتا ہے کہ میٹر اتارنے سے پہلے والے مہینے میں بھی ریڈنگ موجود ہے، مطلب یہ کہ میٹر پہلے سے خراب نہیں تھا۔ معاملہ حل نہ ہوا، ایم این ٹی والے آئے، انکواری ہوئی اور واپڈا ٹیم نے اُن کی دلیل تسلیم کر لی، میٹر لگانے کا وعدہ کر کے چلی گئی، ڈیمانڈ نوٹس ادا کر دیا گیا۔ دن ہفتوں تک پہنچے اور ہفتے مہینوں تک، انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں، واپڈا آفس کے چکر بڑھتے رہے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ بہت جلد میٹر لگا دیا جائے گا، بس میٹر پہنچنے ہی والے ہیں، کبھی وعدہ ذرا لمبا ہو جاتا۔ کبھی صاف جواب مل جاتا کہ میٹر آئے گا تو لگائیں گے۔

، دفتر کا سارا نظام ایکٹ میٹر پر ہی چلتا رہا، جس کے ایکٹ سے زیادہ نقصان تھے

اول یہ کہ وہ میٹر سنگل فیر تھا، اس پر لوڈ زیادہ پڑ رہا تھا، واپڈا کے قانون میں یہ بھی جرم ہے، دوسرا یہ کہ لوڈ زیادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ بجلی استعمال ہوتی تھی اور ریڈنگ ایک حد سے زیادہ ہو جانے کی بنا پر اس کا ٹیرف ہی مختلف ہو جاتا ہے، یوں بل بہت زیادہ آتا ہے۔ جو میٹر واپڈا کے قبضے میں ہے، اس کا بھی استعمال کے بغیر ہی کچھ نہ کچھ بل آتا رہا۔ گزشتہ روز ایک مرتبہ پھر خادم حسین سال بھر کے بل اٹھا کر ایس ڈی او واپڈا کے دفتر گیا، انہیں بتایا گیا کہ میٹر نہیں ہے، آئے گا تو لگائیں گے۔ وہ مزید بڑے افسر یعنی ایکسٹینسٹن واپڈا کے پاس گیا اور انہیں گزشتہ برس والی کہانی یاد دلائی، اور تازہ صورت حال سے بھی آگاہ کیا۔ ایکسٹینسٹن نے ایس ڈی او کو فون کیا، انداز کچھ جذباتی تھا، نہ جانے اصلی تھا یا روایتی۔ تاہم حکم ہوا کہ ایس ڈی او آفس چلے جائیں۔ اب یہ دوبارہ ایس ڈی او کے آفس پہنچے اور مزید تازہ صورت حال سے آگاہ کیا، صاحب نے میٹر انسپکٹر اور اس نے اپنے مزید کسی ماتحت کو طلب کیا، کس نے اتارا تھا یہ میٹر، اب کہاں ہے؟ سوال اور جواب ادھر دفتر میں ہی ایک دوسرے سے الجھتے رہے، نہ کوئی سوال نمایاں ہو سکا اور نہ کوئی جواب برآمد ہوا۔ آخر خادم حسین کا پیاناہ صبر لبریز ہونے کو آیا، ایس ڈی او سے معلوم کیا کہ جناب آخر مسئلے کا حل کیا ہے، یا جیسا کہ ایکسٹینسٹن نے کہا ہے کہ اگر میٹر نہ لگے تو دوبارہ میرے پاس آجائیں۔

بتایا گیا کہ میٹر تو نہیں ہے، تاہم ہمیں دو گھنٹے کی مہلت دیں، میٹر انسپکٹر صاحب فیلڈ میں گئے ہیں، واپس آجائیں تو آپ کے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالتے ہیں۔ انہی دو گھنٹوں کے وقفے میں خادم حسین میرے پاس چلا آیا۔ غم غلط کرنے، واپڈا کا نصف غصہ مجھ پر اور کچھ واپڈا پر اتارنے اور کچھ غصہ پی جانے کے لئے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ بل زیادہ آنے، میٹر اتر جانے اور لوڈ شیڈنگ وغیرہ ہونے کی صورت میں اگر غصہ پی لیا جائے تو گرمی سے کافی افاقہ ہو جاتا ہے، کیونکہ گرمی کو گرمی ہی مارتی ہے۔ مگر میری بات زیبہ داستاں کے ضمن میں تو آ سکتی ہے، چنانچہ زمینی حقائق کے مطابق اسے پسند نہیں آئی۔ میرے مزاج سے وہ بھی خوب آشنا ہے، اس لئے اکثر اوقات وہ بھی برا نہیں مناتا، مگر جب وہ زیادہ پریشان یا غصہ میں ہو تو میں بھی احتیاط ہی کرتا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ آپ نے کبھی بجلی کے بل کو الٹا کر دیکھا ہے، اس کا جواب تھا کہ سامنے کا صفحہ دیکھ کر ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں، مزید کسی بات کی ہوش ہی نہیں رہتی۔ تاہم میں نے اسے بجلی بچانے کے بارہ سنہری اصول بتائے، یہ پیش کش میں نے اپنی طرف سے نہیں کی بلکہ بل کی پشت پر یہ ساری تحریر موجود ہے۔ بارہ اصولوں میں بجلی کم استعمال کرنا، فالتو بتیاں بجھا دینا، اہم اوقات میں بجلی کا کم استعمال کرنا وغیرہ شامل تھیں۔ میری بات

ابھی جاری ہی تھی کہ اس نے ٹوک کر مجھے بتایا کہ واپڈا اور آپ میں کوئی فرق نہیں،
کیونکہ جہاں میسٹر ہی نہیں وہاں مزید بجلی بچانے کا سوال ہی کیا ہے؟ اس نے بل اٹھائے
اور واپڈا کے مزید دھکے کھانے کے لئے روانہ ہو گیا۔

سابق وزیراعظم پاکستان سید یوسف رضا گیلانی کے بیٹے علی حیدر گیلانی نے کہا ہے کہ ”.. جب میں قید میں تھا تو آزادی کی دعا کیں مانگتا تھا، اب میں آزاد ہوں اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی، میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے کہ میں داڑھی نہیں منڈواؤں گا، اور نماز کی پابندی کروں گا۔“۔ کامل تین برس ادھر جب پاکستان میں قوم انکیشن کی مہم اپنے آخری مراحل میں داخل ہو رہی تھی، علی حیدر گیلانی کو مہم کے دوران ہی اغوا کر لیا گیا تھا۔ اغوا کے بعد نہ اغوا کنندگان کے مطالبات کا علم ہو سکا تھا، اور نہ ہی مغوی کی کوئی خبر آئی تھی، بس کبھی کبھی دھمکیوں بھرے خطوط یا فون ضرور آتے رہتے تھے۔ تاوان افواہوں کی صورت میں گردش میں تھا، گزشتہ روز اچانک علی حیدر کی واپسی کی اطلاع سے پورا ماحول خوش گوار حیرت میں ڈوب گیا، جس نے سنا اس نے خوشی سے کلمہ شکر ادا کیا، یہ تو عام لوگوں کی کہانی تھی، گیلانی کے اہل خانہ اور دوست احباب کی حالت کیا ہوگی؟ پھر قوم نے دیکھا کہ نہایت ہی وی آئی پی طریقے سے گیلانی کو پاکستان لایا گیا، افغانستان کے اعلیٰ حکام نے انہیں الوداع، پاکستان کے اعلیٰ حکام نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ کیسے برآمد ہوئے، کیسے رہائی ممکن ہوئی، ایسے سوالات عموماً وقت کی گرد سے قصہ ماضی بن جاتے ہیں اور ان پر وقت کی گردش

اس قدر زیادہ پڑ جاتی ہے کہ وہ دب کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارا اس وقت موضوع ان کی رہائی کے اسباب اور طریقے جاننا نہیں، اور وہ ہمارے بس کا روگ بھی نہیں۔

یہ ایک فطری بات ہے اور اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب حق میں اکثر مقامات پر کرتے دکھائی دیتے ہیں، یعنی اس صورت حال کی نقشہ کشی کی جا رہی ہوتی ہے، جس میں جب اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی بھی تکلیف دیتا ہے، خواہ وہ بیماری کی صورت میں ہو، یا رزق کی تنگی کی صورت میں یا کسی اور شکل میں، جب تکلیف ہوتی ہے تو انسان اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہے، وہ دعائیں مانگتا اور منتیں مانتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اگر اس کا مسئلہ حل کر دے تو وہ اس کے بدلے میں فلاں نیکی کا کام کرے گا، یقیناً اللہ تعالیٰ کسی چیز کا محتاج نہیں، یہ سارے بند و بست اس نے انسان کی آسانی اور سہولت کے لئے کر رکھے ہوتے ہیں، اپنے ہی دیئے گئے رزق میں سے اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو ثواب بھی دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے ان کے مسئلے بھی حل کرتا ہے۔ یہ معاملہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں ہے، بلکہ کافروں کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ جب انہیں تکلیف یا پریشانی پہنچتی تھی تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہی یاد کرتے تھے۔ مگر یہ کہانی الگ ہے کہ مشکل سے نکلنے کے بعد ان کا رویہ کیا ہوتا ہے؟ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے اور انہیں ہدایت عطا فرما دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو

وہ لوگ مشکل سے نکل جانے کے بعد اللہ کے بندے بن جاتے ہیں، اسی کی نعمتوں کا شکر بجالاتے ہیں۔

علی حیدر گیلانی نے بھی تین سال مشکل اور کرب میں گزارے ہیں، ان کی زندگی یقیناً رسک پر ہی تھی، کسی کو کسی بات کا یقین نہیں تھا، گھر والوں کو علم نہیں تھا کہ پٹا واپس آئے گا بھی یا نہیں؟ اب وہ اچانک واپس آ گیا ہے، جہاں ہر کوئی حیرت کے سمندر میں غرق ہے تو یہ بات بھی بہت سے لوگوں کے لئے حیران کن ہی ہوگی کہ موصوف نے خود کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تین برس اللہ تعالیٰ سے کی جانے والی دعاؤں کا نتیجہ اس کے حق میں برآمد ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے مراد پوری کر دی تھی، اب وعدہ نبھانے کا وقت گیلانی کا تھا، سوانہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے، کہ وہ دائرہ نہیں منڈھوائیں گے اور نماز کی پابندی کریں گے۔ فیصلہ تو انہیں یہی کرنا چاہیے تھا، تین برس کی مشکل کا یہی جواب تھا، مگر فی الحال یہ جذباتی فیصلہ ہے، جس ماحول اور جس پارٹی اور جن حالات میں انہوں نے وقت گزارنا ہے، وہ ان کے راستے میں ضرور رکاوٹیں پیدا کریں گے، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مندرجہ بالا عوامل میں سے کوئی ارادنا انہیں اچھے کاموں سے منع کریں گے، بلکہ ماحول کا اثر اور اس کی جکڑ بندیاں بعض اوقات ایسی ہو جاتی ہیں، کہ آہستہ آہستہ انسان راہیں تبدیل کر لیتا ہے۔ علی گیلانی کے سوچنے کی ایک اور بات بھی ہے وہ ہیں

معاملات، دین صرف نماز اور واٹر می میں ہی پوشیدہ نہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ
چھوٹے گیلانی کو استقامت نصیب فرمائے، آمین۔

ناشتے کی میز پر پہنچا تو وہاں ایک کاغذ پڑا پایا، جس پر سات سوال تحریر تھے، بیگم نے اپنے روایتی انداز میں اس چٹ کی مختصر وضاحت یہ فرمائی کہ ناشتہ سے پہلے ان سوالوں کے جواب چاہیئیں۔ میں نے تمام سوالوں کو غور سے پڑھا، ان سوالوں میں کوئی بھی نیا نہیں تھا، تاہم یہ شرط ذرا کڑی تھی کہ ”تمام سوالوں کے جواب لازمی ہیں۔“

دراصل گزشتہ رات ٹی وی پر بیگم نے اپوزیشن کے وہ سات سوال دیکھ لئے تھے جو انہوں نے وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے لئے تیار کئے ہیں، کہ وہ اسمبلی میں آئیں گے تو ان سے معلوم کئے جائیں گے۔ میں نے بیگم کو سمجھایا کہ میرے اور میاں نواز شریف کے معاملات کا آپس میں کوئی نسبت تناسب نہیں بنتا، وہ ملک کے وزیراعظم اور میں ایک گوشہ نشین، کہ میرا دعویٰ ہے کہ میرے ہمسائے مجھے نہیں جانتے۔ پھر وہ اسمبلی میں صرف اس وقت جاتے ہیں جب ان پر کوئی مشکل آتی ہے، اور میں گھر سے باہر اس وقت نکلتا ہوں جب کسی مشکل میں ہوتا ہوں۔ عجب تضاد ہے کہ میرا ہر وقت گھر پڑے رہنا بھی ناگوار ہے۔ میری ایک نہ سنی گئی، تمام توجہ فہرست سوالات پر مرکوز کرنے کا حکم دیا گیا۔

میرے جیسے طالب علموں کے لئے سوالات کا پرچہ حل کرنا ایک مشکل ترین کام

ہوتا ہے، خاص طور پر جب اکثر سوالوں کے جواب نہ آتے ہوں۔ مشکل میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ممتحن بھی سر پر کھڑا ہو۔ سچ جانے ممتحن قریب بھی آجائے تو میرا ہاتھ رک جاتا ہے، خواہ مجھے کچھ آتا بھی ہو۔ بہر حال تازہ پرچہ ملاحظہ فرمائیے؛ ۱: آج ناشتہ کس چیز سے کیا جائے گا؟ ۲: دوپہر کو کیا کچے گا؟ ۳: کل کے لئے کون سے کپڑے استری ہونگے؟ ۴: مالک مکان کرایہ کا تقاضا کر رہا ہے، نصف ماہ گزر چکا ہے۔ ۵: شدید گرمی کا توڑ کیا ہوگا، کوئی منصوبہ بندی؟ ۶: اپنا گھر آخر کب بنے گا؟ ۷: بچے کی میٹرک میں اردو میڈیم ٹیوشن کا آخر کار بندوبست کیا اور کب ہوگا؟ ان میں سے زیادہ سوال تو زیادہ مشکل نہ تھے، اور کئی سوالوں کا جواب ایک جملے کی بجائے ایک لفظ میں بھی موجود تھا، تاہم اس رویے سے مسئلے کے حل ہونے کی بجائے بگڑنے کا زیادہ خدشہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ ان سوالوں کا آپس میں دور کا بھی تعلق نہیں، کہیں فوری طور پر ہونے والا ناشتہ ہے تو کہیں سالوں میں بننے والا مکان، کہیں گرمی کا توڑ ہے تو کہیں اردو میڈیم ٹیوشن کا مسئلہ۔ مگر بیگم بضد کہ سوالوں کے جواب دیئے جائیں۔ یہ طے تھا کہ معقول جواب آنے کی صورت میں ناشتہ طے گا۔

جواب مختصر ہوتے یا طویل، مسئلہ یہ ہے کہ ایک جواب سے بھی کئی سوال نکلنے کے امکانات تھے، بہت غور و خوض کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ معاملہ کو

ٹرانا ہی بہتر ہے، کہا، سوچ کر جواب دوں گا! چونکہ کئی سوال فوری نوعیت کے بھی
 تھے، اس لئے اپنے جواب کو ہی غیر تسلی بخش پایا۔ تاہم ساتھ ہی پہلا ضمنی سوال برآمد
 ہوا کہ جب سوچ لیں تو بتا دینا، ناشتہ بھی تب ہی مل جائے گا۔ میں مزید سوچ میں پڑ
 گیا، ”یہ ناشتہ بھی عجیب چیز ہے، روزانہ ہی صبح سویرے اس سے واسطہ پڑتا ہے، جب صبح
 ہی معاملہ الجھ جائے تو دن کیسے گزرے گا؟ اسی طرح ”آج کیا پکایا جائے“ والا ایٹو تو
 بہت ہی چڑا دینے والا ہے۔ بھی مردوں کا اس سے کیا تعلق، خواتین خود فیصلہ کریں۔
 مگر کرایہ تو آخر مردوں نے ہی لا کر دینا ہے، اور مہینہ صرف تیس دن میں پورا ہو جاتا
 ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے ابھی چند روز قبل ہی تو کرایہ ادا کیا تھا۔ گرمی کا توڑ وہ شخص کیا
 کر سکتا ہے، جو مہینے بھر کا کرایہ بروقت ادا نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی منصوبہ بندی وسائل
 سے جھڑی ہوئی ہوتی ہے، اگر وسائل ہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے، نہیں تو کوئی سوچ نہیں
 آتی۔ یہ سوال بھی عجیب ہے کہ آپ ناشتہ کرنے بیٹھیں اور سوال یہ ہو کہ اپنا گھر کب
 بنے گا؟ بھی جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ یہ اردو میڈیم کی کہانی بھی کیسی خستہ اور
 بد حالی کا شکار ہے کہ اس کی کوئی ٹیوشن بھی دستیاب نہیں، انگلش میڈیم کی اکیڈمیاں گلی
 گلی میں موجود ہیں، حیرت کی بات ہے کہ پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کو دو لفظ
 انگلش کے نہیں آتے، مگر پڑھنی انگلش میڈیم ہی ہے۔“ میں ان سوالات اور ان کے
 جوابات کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، کہ اچانک گھڑی پر نظر پڑی، دفتر سے تاخیر

ہورہی تھی، میں نے اجازت چاہی اور دفتر روانہ ہو گیا، چلیں ایک ناشتہ والے سوال
سے توجہ جان چھوٹی، مگر واپسی پر باقی چھ سوالوں سے فرار کب تک؟

پشاور کے چوہوں نے خوب دھوم مچا رکھی ہے، آئے روز کسی نہ کسی کو کاٹ لیتے ہیں، عوام تو پریشان ہیں ہی، وہاں کی حکومت بھی پریشانی میں مبتلا ہے۔ چند روز قبل چوہے مارنے کے عوض انعام وغیرہ کا اعلان کیا گیا تھا، پھر خبر آئی کہ چوہے مارنے پر طے شدہ انعام نہیں ملا، ایسے معاملات کو سیاسی مخالفین خوب اچھالتے ہیں، سوانہوں نے اپنا کام کیا۔ چوہے مارنے سے مسئلہ حل نہ ہوا، یعنی سارے چوہے نہیں مارے گئے، کہ لوگوں کو چوہوں کے کاٹنے کی وارداتوں میں اضافے کی خبریں آنے لگیں۔ عوام اور حکومت کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی اثناء میں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات پرویز رشید نے خیبر پختونخوا حکومت پر طنز کا تیر چلایا، ”جو حکومت چوہوں کو قابو نہیں کر سکی، وہ ملک کیسے چلائے گی...“۔ اور پی ٹی آئی کے زخموں پر مزید نمک یوں چھڑکا گیا کہ بنوں میں وزیراعظم پاکستان کے جلسے میں تازہ تعلقات بحالی پر مولانا فضل الرحمن نے خطاب کیا تو میاں نواز شریف سمیت تمام مسلم لیگی بھی حیرت زدہ رہ گئے، انہیں توقع نہیں تھی کہ مولانا فضل الرحمن وزیراعظم کی تعریف اور محبت میں اس حد تک سفر کر جائیں گے۔ ان کا جو جملہ اخبارات میں شہ سرخی کے لئے منتخب کیا گیا وہ یہ تھا کہ جو خیبر پختونخوا میں چوہوں سے ڈر گئے، وہ پنجاب میں ’شیروں‘ کا”

کیا مقابلہ کریں گے؟“۔

ابھی خیبر پختونخوا حکومت پر طنز کے تیر برس ہی رہے تھے کہ اسلام آباد میں پارلیمنٹ لاجز میں بھی چوہوں کی موجودگی کی اطلاع آئی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک معزز رکن قومی اسمبلی کو بھی ایک چوہے نے کاٹ لیا ہے۔ اس خبر کے سامنے آنے سے اب کم از کم حکومتی ارکان کو پہلے اپنی چارپائی کے نیچے ڈنڈا گھمانا پڑے گا، تب جا کر دوسروں پر تنقید کرنے کا ماحول پیدا ہو سکے گا۔ خیر اپنے ہاں یہ روایت عام ہے کہ اپنے آپ میں کوئی خامی ہونے کے باوجود بڑی ہمت سے اسی قسم کی خرابی پر دوسروں پر تنقید کرنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی جاتی۔ اتنا ضرور ہے کہ جب پشاور کے چوہوں کو قابو کرنے کے لئے صوبائی حکومت پر اعتراض کیا جائے گا تو وہ بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے پارلیمنٹ لاجز کے چوہوں کا ذکر چھیڑ دیں گے، یہ طعنہ وفاقی حکومت کے لئے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگرچہ پارلیمنٹ لاجز میں چوہوں کی موجودگی کی خبر نئی نہیں، یہاں ہمیشہ سے ہی چوہے موجود ہیں، یہ الگ بات ہے کہ یہ کبھی زیادہ ہو جاتے ہیں اور کبھی کم۔

تازہ خبر صرف پارلیمنٹ لاجز میں چوہوں کی موجودگی کی ہی نہیں، بلکہ بتایا گیا کہ ایک معزز رکن کو چوہے نے کاٹ بھی لیا ہے۔ خبر سے یہ اندازہ نہیں

ہو سکا کہ ان خاتون رکن کا تعلق کس صوبے سے ہے، اگر وہ خیبر پختونخوا سے تعلق رکھتی ہیں تو اور بات ہے، کیا جانے کہ یہ چوہے سوگھنے کی مخصوص طاقت کے ذریعے خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو پہچان لیتے ہوں، وہ جہاں بھی جائیں تو یہ بھی ان کے پیچھے جاسکتے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت قابل غور ہے کہ پاکستان کے کونے کونے میں اگر کوئی ایک قوم کے لوگ پائے جاتے ہیں تو وہ بیٹھان بھائی ہیں، اب اگر پشاور کے چوہے اُن کے پیچھے ہو لئے تو وہ پورے ملک میں پکھیل جائیں گے۔ اگر وہ خاتون ایم این اے کسی اور صوبے سے تعلق رکھتی ہیں تو بھی معاملہ سنگین ہے، کہ چوہوں نے خیبر پختونخوا سے باہر بھی قدم رکھ دیا ہے، اب اس کو قابو کرنا بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ پارلیمنٹ لاجز تو بذاتِ خود وفاق کی علامت ہے، چوہوں کا وہاں تک پہنچ جانا حکومت کے لئے بھی بہت خطرناک ہے۔ پارلیمنٹ لاجز کے چوہے بھی یقیناً پشاور کے چوہوں کی طرح صحت مند ہی ہونگے، کیونکہ انہیں بہت ہی بہتر خوراک میسر ہوگی۔ نفیس اور اہم لوگوں کا جھوٹا کھانا اور انواع و اقسام کے پھل وغیرہ یہاں دستیاب ہوتے ہیں، اور اگر کسی انسان کو ہی کاٹنا پڑ جائے تو بھی عام آدمی نہیں، لاکھوں لوگوں کے نمائندہ کو کاٹنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہ چوہے چونکہ خاص ہیں، اس لئے خاص مقام پر رہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت ان کے ساتھ کیا ہاتھ کرتی ہے، یا رائے عامہ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ خیبر پختونخوا حکومت نے وفاق کے خلاف سازش کرتے ہوئے چوہے اسلام آباد بھیج دیئے ہیں۔ چوہوں کا

خاتمہ اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ انہوں نے اب غریبوں کے علاقے چھوڑ کر
امیروں کے ایوانوں کو اپنا مسکن بنا لیا ہے، غریبوں کی سطح پر آنا حکومت اور اشرافیہ یہ
کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔

مزید لیکس؛

پانامہ لیکس کا معاملہ طول پکڑتا جا رہا ہے، وزیراعظم میاں نواز شریف کے خاندان کا مسئلہ ابھی اسمبلی میں لانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں، ابھی سات سوالوں کا پرچہ تیار کیا جا رہا تھا، ابھی زور خطا بت اور اپنی سی دلیلیں تلاش کر کے میڈیا میں جگہ بنائی جا رہی تھی کہ اپوزیشن کے بارے میں بھی پانامہ لیکس کی خبریں برآمد ہونے لگیں۔ ایک طرف پانامہ لیکس سے آف شور کمپنیوں کے مالکان کی دوسری قسط جاری ہوئی، جس میں اپوزیشن کے بھی کئی لوگ منظر پر آ گئے، دوسری طرف تحریک انصاف کے قائد اور حکومت کے سب سے سرگرم مخالف عمران خان نے خود اپنی ایک آف شور کمپنی کا اعتراف فرمادیا، یہ کمپنی 33 برس پرانی ہے، انہوں نے اس کے قیام، فلیٹ کی خریداری اور اس کو فروخت کر کے پاکستان میں سرمایہ لانے کی بات کر کے خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر معاملہ تحقیق طلب ہے، کہ آخر دال میں کالا تو ضرور ہے۔ ادھر گجرات کے چوہدریوں کا نام بھی بسلسلہ مونس الہی اس فہرست میں شامل ہے، اور تو اور ڈاکٹر قدیر خان کے خاندان کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اگرچہ بعض رشتہ داروں سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا، مگر معاشرے کو مطمئن کرنا

آسان کام نہیں۔

اب جبکہ اکثر لوگ پانامہ لیکس میں ملوث دکھائی دیتے ہیں، جو فحش رہے ہیں نہ جانے اگلی اقساط میں منظر عام پر آجائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پانامہ لیکس سے فحش نکلنے والے بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں، جو اور بہت سے معاملات میں کرپشن میں ملوث ہوں۔ کیونکہ کرپشن صرف پانامہ لیکس کے ذریعے ہی نہیں کی گئی، اس کارِ خیر کی انجام دہی کے اور بھی ہزار راستے ہیں۔ جن حضرات کو پانامہ لیکس کے ذریعے شہرتِ دوام حاصل نہیں ہو سکی، وہ بھی دل چھوٹانہ کریں، کوشش کریں پاکستان میں بھی اس قسم کے مواقع موجود ہیں، بلوچستان کے سیکریٹری خزانہ کی مثال بھی ان کے سامنے ہے۔ پانامہ لیکس کا انجام یا نتیجہ جو بھی ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ عوام کی اپنے سیاسی قائدین سے محبت میں کمی کا باعث نہیں بن سکتی۔

جائزہ؛

وزیر اعظم میاں نواز شریف ڈیرہ اسماعیل خان میں جلسہ سے خطاب کریں گے، جلسہ کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے مولانا فضل الرحمن خود اپنے آبائی شہر پہنچ گئے۔ اب دراصل محبتوں کا عروج ہے، یہی موقع ہے کہ ایکٹ دوسرے سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ مولانا کو اتحادی ہونے کے باوجود جس طرح ترسائے گا

وزارتیں دی گئی تھیں، اسی طرح ان کو ملاقاتوں کا وقت بھی اسی رفتار سے ملتا رہا۔ مگر اب چونکہ پانامہ لیکس کی سختی سر پر سوار ہے، جس کے لئے وزیراعظم کو اپنے ساتھیوں اور اتحادیوں کو قریب کرنے کی ضرورت ہے، لہذا ایک خاص منصوبہ بندی پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ دونوں حضرات ایک دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مرتبہ مولانا اپنے خطاب میں کیا لب و لہجہ اپناتے ہیں، بنوں جلسے جیسا خطاب کرتے ہیں یا اپنے آبائی علاقے کے لئے کوئی اور رخ ظاہر کرتے ہیں، زورِ خطابت عمران خان کی سیاست کے خلاف صرف کرتے ہیں، یا ساتھ میں میاں صاحب کی تعریفوں کے پُل بھی باندھتے ہیں، یا پھر اپنی سیاست اور پارٹی کے بارے میں بھی کچھ وضاحت فرمائیں گے؟

خوش بخت مسافر؛

ملتان ایئر پورٹ پر ایک مسافر کو گرفتار کر لیا گیا، وہ مدینہ منورہ جا رہا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے ارمانوں سے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ گرفتاری کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے سامان میں سے 420 گرام ہیروئن برآمد ہو گئی۔ مسافر کا نام اللہ دتہ بتایا گیا ہے، کوئی بعید نہیں کہ اسے بیوقوف بنا کر اس سے یہ کام لیا جا رہا ہو، یا وہ خود ہی سادگی کے بھیس میں یہ خدمت سرانجام دے رہا ہو۔ جیسا بھی ہوا، وہ خوش قسمت ہی قرار پائے گا کہ پاکستان میں پکڑا گیا، یہاں

کسٹم یا پولیس وغیرہ والے کچھ ہیروئن آپس میں تقسیم کر لیں گے، ممکن ہے ملزم کو کچھ سزا بھی ہو جائے، مگر وہ مسافر خوش قسمت ہی قرار پائے گا کیونکہ یہاں تو کبھی نہ کبھی چھوٹ جائے گا، سعودیہ میں تو سر قلم کرواتے ہی بنتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک میں اب بد عنوانی کیوں نہیں چل سکتی؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا ہے کہ ”ملک میں اب بد عنوانی نہیں چل سکتی، قومی دولت لوٹنے والا ہر شخص پکڑا جائے گا، الزام تراشی کی بجائے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔“ آج کل سربراہ مملکت بہت جذباتی ہیں، کرپشن اور کرپٹ لوگوں کے خلاف وہ سخت ناراض ہیں، گزشتہ روز بھی انہوں نے ایک تقریب میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ ”... پانامہ لیکس کا معاملہ قدرت کی طرف سے اٹھا، کئی بڑے نام بھی لپیٹ میں آئیں گے، کرپشن اور سفارش کلچر نے کارکردگی کو متاثر کر دیا، پرانے وقتوں میں بے ایمان لڑکے کو لڑکی کا رشتہ نہیں ملتا تھا۔“۔

آجکل ہر کوئی اپنا دھندہ چھوڑ کر کرپشن کے پیچھے پڑا ہوا ہے، باتیں بیان سے ذرا آگے بڑھ کر عمل تک آگئی ہیں، پانامہ لیکس ہنگامہ لیکس کی صورت اختیار کر چکی ہے، اب چونکہ اکثر لوگ اس میں شامل ہو چکے ہیں، اس لئے اس کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ ایک ہی الزام ہے جو تمام لوگ ایک دوسرے پر لگا

رہے ہیں، اور جس پر بھی الزام لگ رہا ہے، وہ ذرا بھی نہ خود پریشان ہے، نہ شرمندہ۔
 معاملات جوں کے توں چل رہے ہیں، کاروبار دنیا رکا نہیں۔ یہ کالم شائع ہونے تک قومی
 اسمبلی کا ”تاریخی“ اور ”ہنگامی“ اجلاس ختم ہو چکا ہوگا، کون جانے کی کوئی نتیجہ برآمد
 ہوگا بھی یا نہیں، یا کیا نتیجہ نکلے گا؟ فتح کس کی ہوگی، سرخرو کون ہوگا، ناکامی کا احساس
 کس کو ہوگا؟ امکان غالب یہی ہے کہ یہ ”تاریخی“ اجلاس نہ تو کوئی تاریخ بنا سکے گا، اور
 نہ ہی کسی فیصلے تک بات پہنچے گی۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ یہ ایٹو پوری قوم کی توجہ کا
 مرکز بن گیا۔ آیا اس ہنگامہ آرائی سے کرپشن میں کوئی کمی واقع ہوگی؟ یا اس کے نتیجے
 میں کرپٹ لوگ نئے جوش و جذبے کے ساتھ دوبارہ منظر عام پر آجائیں گے؟
 صدر پاکستان کو ”ایمان“ کی حد تک یقین ہو چکا ہے کہ ملک کے مسائل کا خاتمہ ہو
 جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صدر صاحب کا ایمان اور بھی زیادہ پختہ ہو جائے،
 انہیں اور بھی یقین ہو جائے کہ مسائل کا خاتمہ بالکل قریب ہے۔ ان کی دعائیں رنگ
 بھی لے آئیں، وہ نیک اور بزرگ آدمی ہیں، چونکہ سیاست میں کم ہی رہے ہیں اس
 لئے ان پر کرپشن وغیرہ کے الزامات بھی نہیں ہیں۔ مگر پاکستان قوم ابھی تک ایمان کی
 اس منزل کو نہیں پہنچ سکی، جس مقام بلند پر ممنون حسین صاحب پہنچ چکے ہیں۔ پاکستانی
 قوم کو اپنی کم فہمی، بے بصیرتی

اور دیگر کمزوریوں کی بنا پر ہر طرف کرپشن ہی دکھائی دیتی ہے، قوم تو حکمرانوں کی
 مراعات کو جو کہ لاکھوں روپے ماہانہ تک ہوتی ہیں، ان میں بھی کرپشن کی جھلک نظر
 آتی ہے، قوم کو تو حکمرانوں کا پروٹوکول اور روٹ لگانے میں بھی کرپشن ہی دکھائی دیتی
 ہے، جب سڑکیں گھنٹوں بند کردی جاتی ہیں اور پریشان حال عوام سڑکوں پر ہر قسم کے
 موسم کی شدت کو برداشت کر کے اپنے قائدین کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہتے ہیں،
 اس دوران مختلف کلمات کی گردانیں دہرائی جاتی ہیں، جنہیں یار لوگ مختلف نام دیتے
 ہیں، اور جب وہ گزر جاتے ہیں تو عوام شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ عوام کو تو سرکاری دفاتر
 میں اسی طرح رشوت کا بازار گرم ملتا ہے، جس طرح عشروں قبل تھا، اسی طرح دفاتر
 کے چکر لگانے پڑتے ہیں، اسی طرح تھانوں میں بے عزتی کروانی پڑتی ہے، اسی طرح
 چھوٹی بڑی بیوروکریسی مراعات کی آڑ میں لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں،
 عوام دیکھتے ہیں کہ سرکاری گاڑیوں کو نہایت بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے، سالانہ
 اربوں روپے کی کرپشن اسی مد میں ہو جاتی ہے۔ اگر صدر مملکت کہتے ہیں کہ ”ملک میں
 اب بدعنوانی نہیں چل سکتی“ تو نہ جانے کس طرح کہتے ہیں۔ انہوں نے بدعنوانی کے
 کارخانے بند کروا دیئے ہیں، ابھی تو پاناما لیکس کا ہنگامہ ختم نہیں ہوا، تو بدعنوانی کو
 دیس نکالا کیسے دے دیا گیا۔ یہاں تو ارکان اسمبلی بھی اپنے اثاثے چھپا لیتے ہیں، یہاں تو
 بہت سے ممبران اسمبلی اور سرکاری افسران کی ڈگریاں بھی جعلی ہوتی ہیں، یہاں تو
 وزیراعظم

اور عمران خان سمیت بہت ذمہ دار لوگ اسمبلی جانے کو توہین تصور کرتے ہیں، یہاں
صدر اور وزیراعظم ہاؤسز کے اخراجات لاکھوں روپے ماہانہ ہیں۔ صدر صاحب! آپ
نے کونسے اقدام کر لئے ہیں کہ ملک میں اب بدعنوانی نہیں چل سکتی؟

! موت کی سیلفی

سرائے عالمگیر سے خبر آئی ہے کہ ایک نوجوان نے کسی جگہ سانبپ دیکھا تو اسے پہلا خیال یہ آیا کہ کیوں نہ اس کے ساتھ ”سیلفی“ بنالی جائے۔ اپنے تخیل میں رنگ بھرنے کے لئے اس نے اپنا موبائل نکالا اور سیلفی بنائی، وہ اپنی کارکردگی پر بہت خوش ہوا، مزید ورائٹی پیش کرنے کے لئے اس نے ایک اور سیلفی لی، پوز بدلتے گئے اور سیلفیاں بنتی گئیں، حتیٰ کہ معاملہ دسویں سیلفی تک جا پہنچا اور بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی، کیونکہ سانبپ کے ساتھ اس قدر سیلفیاں بنانے کے بعد نوجوان کا اعتماد کافی بحال ہو چکا تھا۔ اسی بڑھتے ہوئے اعتماد کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیلفیوں کا سلسلہ دوسری دہائی تک نہ پہنچ سکا، سانبپ نے بے تکلف ہوتے ہوئے نوجوان کو ڈس لیا اور یہی سیلفی نوجوان کی زندگی کا آخری عمل تھا، جسے وہ لے کر اپنے رب کے حضور پیش ہوگا۔ گزشتہ روز اسی قسم کی ایک خبر مظفر گڑھ سے بھی آئی، کسی انتہائی خطرناک کنارے پر کھڑے ہو کر سیلفی بناتے ہوئے نوجوان اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دریا کے گہرے پانیوں کی نذر ہو گیا، سیلفی کی منزل کے حصول میں زندگی کا خاتمہ کر بیٹھا۔ سیلفی نہ بنی، زندگی کا سفر بھی تمام ہوا۔

جب سے زندگی نے آئی ٹی کی سواری شروع کی ہے، رفتار قابو سے باہر ہو چکی ہے۔ کمپیوٹر تو دور کی بات ہے، موبائل میں کچھ آپشنز کو 'ٹچ' کریں، آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں سیلفی بنائی، کچھ آپشنز دیئے اور اپنی تصویر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس تیز رفتاری کے علاوہ آئی ٹی نے انسانی حواس پر بھی قبضہ کر لیا ہے، اور اس سے تیسرا کام یہ ہوا کہ اصطلاحیں بھی تبدیل ہو کر رہ گئی ہیں، محاورے بھی بدل گئے ہیں۔ اگر کبھی فرصت پا کر کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو سے بھی بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو کے محاورے اور ضرب الامثال کی کہانی دھندلا ہی نہیں رہی، منظر سے غائب ہو رہی ہے۔ بے شمار اصطلاحیں آتی اور ختم ہوتی جا رہی ہیں، لوگ آئی ٹی کی زبان بولنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تبدیلی صدیوں یا دہائیوں کی نہیں، بلکہ ایک آدھ عشرہ میں بات یہاں تک پہنچ گئی ہے، خاص طور پر نوجوان نسل کے ہاتھ جب سے موبائل آئے ہیں انہیں ایک لمحے کی فرصت نہیں، ان کی پسلی ترجیح ایس ایم ایس، واٹس ایپ، فیس بک اور دیگر سرگرمیاں ہیں۔ انہی آلات کی مدد سے انہوں نے اردو کو انگلش میں لکھنا شروع کر دیا ہے، شارٹ ہینڈ کی روایت عام ہو چکی ہے، لفظ مکمل نہیں لکھا جاتا۔ گویا موبائل سے صرف سیلفیاں ہی نہیں بنائی جاتیں۔

سیلفی کی ٹرم بھی نئی برآمد ہوئی ہے، آپ اپنے موبائل سے اپنی ہی تصویر بنا

سکتے ہیں، چہرے کے زاویے جیسے بھی بنائیں، تصویر کسی جاندار کے ساتھ بنائیں یا بے
 جان کے ساتھ، چڑیا گھر میں بندر کے ساتھ بنائیں یا کسی ویران جگہ پر سانپ کے
 ساتھ، کوئی پریشانی نہیں۔ تاہم سیلفی سے ایک بہت اہم رویہ سامنے آتا ہے، جسے عرفِ
 عام میں خود نمائی کہتے ہیں، اپنے ہاں یہ روایت بھی زور پکڑ چکی ہے کہ کسی بھی موڈ
 میں بیٹھے ہوئے یار لوگ سیلفی بناتے ہیں اور اگلے ہی لمحے اسے سوشل میڈیا کی مندر
 کر دیا جاتا ہے، اور پھر 'لائک' اور 'کمنٹس' کی کہانی شروع ہوتی ہے، بات آگے
 بڑھتی جاتی ہے، یوں ایک نئی اور طویل مصروفیت کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ خود نمائی کوئی
 قابلِ تحسین عمل تو ہے نہیں، لائک اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ لینے بھی ہوتے ہیں۔
 بہت سے لوگ اپنی پوسٹ کو دوسروں کے اکاؤنٹ میں ٹیگ بھی کر دیتے ہیں، جو کہ
 بذاتِ خود ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ گویا یہ ایک بے مقصد قسم کی مصروفیت ہے، جس
 میں ہماری نئی نسل کی بھاری اکثریت مگن ہو چکی ہے۔ خود نمائی کے خود غرضانہ عمل
 کے ساتھ اپنا اور دوسروں کا وقت بھی ضائع کیا جاتا ہے۔ سیلفی کو منفرد اور دلچسپ
 بنانے کے لئے بہت پاؤں پیلے جاتے ہیں، جن کی دو تارہ مثالیں کالم کے آغاز میں دی گئی
 ہیں۔ موت کے منہ میں جا کر سیلفی بنانا کونسا تاریخی کارنامہ ہے، یا کونسی خوبی ہے کہ
 جس کی بنا پر کسی نوجوان کا نام دنیا میں روشن ہو جائے گا، اس کے والدین اور آنے والی
 نسلیں ان پر رشک اور فخر کر سکیں گی۔ یقیناً ایسی موت پر ہر کوئی ہمدردی نہیں افسوس کا
 اظہار کرتا ہے۔

یا یوں کہیے کہ ایسی موت خود کشی کے مترادف ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے
نوجوان بچوں کو قیمتی موبائل دیتے وقت انجام سوچ لیا کریں، کیونکہ موبائل اصلی
موت کی جگہ اخلاقی موت کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

! اداکارہ میرا اور انگلش ٹیچر

اداکارہ میرا کی انگلش کا مسئلہ بھی حل ہونے کو ہے۔ کوٹ مٹھن کے ایک ٹیچر نے، جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، نہایت دردِ دل کا اظہار کرتے ہوئے میرا کو انگلش پڑھانے کی حامی بھری ہے، ان کا کہنا ہے کہ ”... میرا کی ٹوٹی پھوٹی انگلش سے پاکستان کی ہر جگہ سبکی ہوتی ہے، اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اداکارہ میرا کی انگلش درست کی جائے، میں اس سلسلے میں میرا کو لاہور جا کر انگلش کا تلفظ ٹھیک کرواؤں گا، اور ٹیوشن فیس بھی نہیں لوں گا۔“ آئے روز ٹی وی چینلز موصوفہ کی انگلش ناظرین و سامعین کو سناتے اور مذاق اڑانے کا اہتمام کرتے تھے، بات کو بار بار دہرایا جاتا، سیاق و سباق سے ہٹ کر سوال کیا جاتا اور مضحکہ اڑانے کا بندوبست کیا جاتا۔ اگرچہ گزشتہ دنوں انہوں نے ایک چینل کو بتایا بھی کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے تعلیم پر توجہ مرکوز نہیں رکھ سکیں، اس لئے ان کی انگلش کمزور ہے، مگر انہیں چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ شاید اب میرا کی سنی گئی ہے اور انہیں گھر بیٹھے ٹیوٹر میسر آ گیا۔ اپنے ہاں انگلش کی کہانی عجیب ہے، جسے دو جملے بولنے آتے ہیں وہ دیگر تمام لوگوں سے، ارفع گنا جاتا ہے، اس کی شخصیت اور قابلیت کی دھاک بیٹھ جاتی ہے

اسے اہمیت دی جاتی ہے۔ تقریبات میں کسی وی آئی پی کے آنے پر ایسے لوگوں کو کمپیئرنگ کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے، کسی بریفنگ وغیرہ کا موقع ہو تو انہی کو آگے کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف انگریزی کبھی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی، وہ بھی چھٹی کلاس سے، جب بچے ہر قسم کے ماحول کو سمجھنے لگتے تھے، مگر اب انگلش میڈیم کا دور آگیا ہے، قوم کو انگلش کی افادیت بتائی جاتی ہے کہ دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے،

اب عالمی برادری کے بغیر زندگی گزارنا محال ہے، اسی لئے ابتدا سے ہی بچوں کو انگریزی پڑھائی جائے، وہ بھی مضمون نہیں، بلکہ ذریعہ تعلیم ہی انگریزی ہو۔ زمینی حقیقت جو بھی ہو اپنے معاشرے میں انگلش میڈیم سے بڑا مذاق اور کوئی نہیں، جن لوگوں کو خود انگریزی کا تلفظ اور لہجہ درست انداز سے ادا کرنا نہیں آتا وہ بھی انگلش میڈیم میں ٹیچر ہیں۔ دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ جب یہ آدھے تیز آدھے بیٹے بچے گھر پہنچتے ہیں تو ان کے والدین بعض اوقات تو اردو سے بھی نابلد ہوتے ہیں، چہ جائیکہ وہ اپنے بچوں کی انگلش میڈیم کتابوں اور سکول کے کام کا جائزہ لے سکیں، یوں بچے سکول کا کام گھر میں مناسب طریقے سے نہیں کر سکتے۔ چونکہ پاکستان میں انگریزی درست لہجے سے بہت ہی کم اداروں میں پڑھائی جاتی ہے، اس لئے عوام کو انگلش میڈیم بنانے کا حتمی فیصلہ زیادہ سود مند نہیں ہو رہا۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں بچے سکول کے قریب بھی نہیں پکھٹکے، انہیں آسانی دینے کی بجائے مشکل میں ڈالنا کوئی دانشمندی کی

بات نہیں، مگر اپنے حکمران زمینیں حقائق اور عوام کی رائے جاننے کی کب کوشش کرتے ہیں، وہ کب پوچھتے ہیں کہ انہیں ہسپتال، سکول، سڑک چاہیے، یا حکمرانوں کے میگا پراجیکٹس؟

بات چلی تھی میرا سے، اور پہنچ گئی میگا پراجیکٹس تک۔ اب بال میرا کی کورٹ میں ہے، وہ جنوبی پنجاب کے پسماندہ ترین ضلع کے دور دراز علاقہ کے ایک ٹیچر کی پیشکش قبول کرتی ہیں یا نہیں؟ معاملہ صرف میرا تک ہی محدود نہیں، بے شمار اہم لوگ ایسے ہیں جو انگریزی سے کئی کتراتے ہیں، دور کیوں جاییں، اپنے حکمرانوں اور سیاستدانوں کو ہی دیکھ لیجئے، سوائے ان کے جو حقیقی معانوں میں انگلش میڈیم سکولوں سے فارغ التحصیل ہیں، یا جنہوں نے بیرون ملک سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے، باقی ممبران اسمبلی اور دیگر اہم لوگوں کی انگریزی کا یہی عالم ہے۔ میرا کے لئے تو یہ ابھی آسانی پیدا ہو گئی ہے کہ ٹیچر خود گھر آکر پڑھائیں گے، انہیں کہیں جا کر کسی استاد کی خدمات حاصل نہیں کرنی پڑیں گی، اس کے ساتھ ہی دوسری اہم خبر یہ بھی ہے کہ وہ ٹیوشن فیس بھی نہیں لیں گے۔ یہاں ایک اور خیال بھی آتا ہے کہ آخر پسماندہ علاقہ کے ایک ٹیچر کو کیا سوچا جی ہے کہ وہ لاہور بھی جائے گا، وہاں رہے گا، خود خرچہ کرے گا اور میرا کو مفت پڑھائے گا، کہیں دال میں کالا تو نہیں، کہیں ٹیچر صاحب سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر بات آگے تو نہیں بڑھانا چاہتے؟ کوئی شادی وادی کا خواب

تو آنکھوں میں نہیں سجائے پھر رہے؟ اب میرا کافر مل ہے کہ وہ مفت یوشن پڑھ کر اپنی
انگریزی بہتر کرنے سے قبل خوب تحقیق کر لیں کہ ٹیچر صاحب کے اصل عزائم کیا ہیں؟

! ریلوے کی اپ گریڈیشن

خواجہ سعد رفیق کا شمار ان چند گئے چُنے وزراء میں ہوتا ہے، جن کی کارکردگی عام آدمی کو دکھائی بھی دیتی ہے۔ ان کے آنے سے قبل بلاشبہ ریلوے آخری سانسیں لے رہی تھی، سٹیشن ویران تھے، کالونیاں اجڑ گئی تھیں، بہت سے علاقوں میں ریل کا پہیہ مکمل طور پر رک چکا تھا، چھوٹی لائنوں پر ریلوے سٹیشن کھنڈرات کی صورت اختیار کر چکے تھے، عمارات کا ملبہ بھی یار لوگ اتار کر اپنے غریب خانوں میں استعمال کر چکے تھے، لائنیں اکھڑنا شروع ہو چکی تھیں، مال گاڑیوں کی صورت ہی لوگ بھولتے جا رہے تھے، تعمیر و مرمت کا کام ٹھپ ہو چکا تھا، عام ریلوے سٹیشنوں پر بھی مسافر دکھائی نہیں دیتے تھے، صفائی کا نظام ختم اور رونقیں مانند پڑ چکی تھیں۔ خواجہ صاحب نے ریلوے کو نئی زندگی دی، اوپر بیان کی گئی خامیوں میں بہت حد تک کمی آئی، یہ کہنا کہ ریلوے کا نظام اب ایسا ہو گیا ہے کہ اس پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی، بالکل بے جا ہے، ابھی بے شمار کرنے والے کام پڑے ہیں، ابھی بحالی کی نصف سے زیادہ گنجائش اور ضرورت ہے۔ خواجہ سعد رفیق نے اگر یکسوئی سے محنت جاری رکھی تو ریلوے کی مزید ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ گزشتہ دنوں بہاولپور ریلوے سٹیشن کی 'اپ گریڈیشن' کی تقریب میں وزیر موصوف تشریف لائے تھے، بتایا گیا کہ

ریلوے کی آمدن اسی برس کے آخر تک 35.50 ارب روپے ہو جائے گی۔ بہاول پور سٹیشن کی تعمیر مئی میں ہی شروع ہوگی، اس عمارت پر 27 کروڑ 84 لاکھ روپے لاگت آئے گی۔ دفاتر، انتظار گاہیں، پارکنگ، کینے ٹیریا، مسجد، اور ضرورت کی دیگر چیزیں اس عمارت کا حصہ ہوں گی۔ تقریباً تو ریلوے سٹیشن کی اپ گریڈیشن کی تھی، مگر خواجہ صاحب نے حسب معمول زیادہ وقت عمران خان کے خلاف محاذ آرائی میں گزارا۔ جلسہ کی صورت میں حاضرین کی خواہش کے مطابق ہی الفاظ استعمال کئے، جلسہ کو بھی گرمایا اور میڈیا کی مرکزی خبروں میں بھی اپنا حصہ ملایا۔

وزراء کی کارکردگی میں یہ عنصر بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، جو وزیر اپنے وزیراعظم کی حمایت میں جس قدر زیادہ بات کرے گا، جتنے دلائل تلاش کر کے لائے گا، جتنے نئے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے گا، مخالفین پر نئے الزامات تراشے گا، وزیراعظم پر کئے گئے مخالفین کے حملوں کا جس قدر جواب دے گا، تو جانا جائے گا کہ اسی وزیر کی کارکردگی سب سے اچھی ہے۔ اور اگر وزیر ایسا ہو کہ اس کی وزارت کی کارکردگی بھی بہتر ہو، اور مخالفین کے جواب دینے والی صلاحیت بھی بہترین ہو تو ایسے وزیر کی کیا بات ہے، خواجہ سعد رفیق کا تعلق اسی قسم کے وزراء سے ہے۔ اگرچہ یہ ایک فطری بات ہے کہ اپنے وزیراعظم کی حمایت میں وزراء خاموش نہیں رہ سکتے، مگر اپنے فرض کا خیال بھی رہنا چاہیے، کیونکہ وزارت کا قلمدان کسی کی حمایت یا مخالفت کے لئے نہیں متعلقہ محکمہ

کی بہتری کے لئے استعمال کیا جانا چاہیے۔ خاص طور پر جب کسی چیز میں توازن ہی قائم نہ رہے، تو توجہ ہٹ جاتی ہے۔

خواجہ سعد رفیق کی ہمت ہے کہ وہ اپنے وزیراعظم کی حمایت میں بھی اپنی پوری توانائیاں صرف کر رہے ہیں اور اپنی وزارت پر بھی مناسب توجہ دے رہے ہیں۔ اپ گریڈیشن کسی ایک سٹیشن کی نہیں ہو رہی، بہت سے سٹیشن اس فہرست میں شامل ہیں، تاہم اس اپ گریڈیشن سے ایک چیز کا احساس ہوتا ہے، کہ خواجہ صاحب پر بھی میاں شہباز شریف کا کچھ اثر ہو گیا ہے، جیسے وزیراعلیٰ پنجاب عام کام کو ہاتھ ہی نہیں ڈالتے، وہ صرف میگا پراجیکٹس کے قائل ہیں، اسی طرح ریلوے میں ابھی بے شمار اصلاحات کی ضرورت ہے، گاڑیوں کی بحالی، وقت کی پابندی، جن روٹس پر گاڑیوں کی ٹریفک معطل ہو چکی ہے ان کی بحالی، جہاں ریلوے سٹیشن کی عمارتیں ہی ختم ہو گئی ہیں ان کی تعمیر۔ اور سب سے بڑھ کر ریلوے کی زمینیں واگزار کروانا۔ بہاول پور ہی کی مثال لے لیں، سٹیشن سے شاید ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہی ہوگا کہ ریلوے لائن سے دس بیس فٹ پر ایک پختہ (کنکریٹ والی) چار دیواری تعمیر ہو رہی ہے۔ کتنی آبادیاں ریلوے لائن کے ساتھ آباد ہیں، کتنی زرعی زمینیں مافیا کے قبضے میں ہیں۔ اسی تقریب میں وزیر صاحب نے بتایا کہ جب ریلوے کی زمینوں پر قبضہ چھڑوانے کی بات ہوتی ہے تو ایک ہی وکیل صاحب سامنے آ جاتے ہیں، تو جناب اگر کوئی وکیل مافیا کی حمایت میں کھڑا ہے تو اسے

قوم کے سامنے لایا جائے، دراصل ان قبضوں کے پیچھے سیاسی لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سے قبضہ چھڑوانے کی بجائے اچھے لوگ بھی مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

! تنخواہوں میں اضافہ اور پٹ سیا پا

جمہوریت چونکہ حکم خداوندی ہے، اس لئے اس کے علمبردار اپنے لئے جو بھی قانون بنا لیں وہ باختیار ہیں، ویسے بھی جو شخص خود قانون ساز ہے، اسے کسی کی کیا محتاجی ہو سکتی ہے۔ وطن عزیز میں جمہوریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، اس کے تمام تر ثمرات ہم سب لوگ سمیٹ رہے ہیں، اگر حکمرانوں اور معزز ارکانِ اسمبلی کے فرموداتِ عالیہ کا باریکی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمہوریت کا اصل فائدہ تو عوام کو حاصل ہو رہا ہے، انہیں الیکشن کے موقع پر اپنی اپنی پسند کے قائدین منتخب کرنے کا موقع دستیاب ہو جاتا ہے، وہ ووٹ دینے کے یادگار لحظات سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں، انتخابی مہم کے دوران وہ جذباتی ہو کر اپنے قائد کو کاندھوں پر اٹھانے کا فریضہ بھی نبھا دیتے ہیں۔ عوام کو اور کیا چاہیے۔ پھر پانچ برس وہ آرام کیا کریں، کیونکہ اتنے ہی عرصے کے بعد دوبارہ الیکشن کے میدان میں اترنا ہوتا ہے، یوں تب تک وہ تازہ دم ہو چکے ہوتے ہیں۔

معزز ارکانِ پارلیمنٹ ایکٹ عرصہ سے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کا مطالبہ کر رہے تھے، کسی نے فرمایا ہماری تنخواہیں اسمبلی کے سیکریٹری کے برابر بھی نہیں، کسی نے کہا ہمیں اتنی تھوڑی تنخواہ کے چیک پر دستخط ثابت کرتے ہوئے بھی شرم

آتی ہے۔ استحقاق کے حامل ان لوگوں نے مطالبہ کس سے کرنا ہے، دستِ سوال کس کے سامنے پھیلانا ہے، کس کے سامنے آنکھیں جھکا کر قرض مانگنا ہے (ویسے سیاست میں قرض لیتے وقت آنکھیں جھکائی نہیں جاتیں) یہ تو خود با اختیار لوگ ہیں، انہوں نے تو عوام کا لانعام کے لئے خود قانون سازی کرنی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی کبھی مراعات و مفادات کی کہانی بنتی ہے، یہ سب اکٹھے ہو جاتے ہیں، سارے محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کوئی بندہ رہتا ہے، نہ خادم اور نہ ہی بندہ نواز، نہ کریشن کرنے والے پریشان ہیں اور نہ ہی کریشن کے خلاف تحریکیں چلانے والے۔ 70 ہزار تنخواہ ہے، معاملہ دولا کھٹک پہنچے گا، یہ بات تنخواہ کی ہے، مراعات اس کے علاوہ ہیں اور اس سے زیادہ ہیں۔ سپیکر وغیرہ کا معاملہ ان سے بھی دگنا ہے۔

ستم ظریفی اور تضاد ملاحظہ فرمائیے کہ پندرہ بیس ہزار روپے تنخواہ لینے والے سرکاری ملازمین ہر سال مئی کی تہی دوپہروں کو ہر شہر کی سڑکوں پر ”پسٹ سیاپا“ کی سالانہ تقریبات منعقد کرتے ہیں، ماتمی جلوس نکلتے ہیں، حکمرانوں کی علامتی قبریں بنائی جاتی ہیں، تب جا کر ان کے منہ میں پانچ سے دس فیصد اضافے کا زیرِ اڈالا جاتا ہے۔ مگر ان معزز ارکان اسمبلی میں دس فیصد بھی ایسے نہیں ہونگے جو اپنے اخراجات چلانے کے لئے تنخواہ کے محتاج ہوں۔ یہاں تو کروڑوں روپے الیکشن پر لگائے جاتے ہیں، ان کے پاس بڑے گھر اور بڑی

گاڑیاں ہوتی ہیں، بہت سوں کی تعلیمی اسناد جعلی اور ٹیکس چوری کی وارداتیں عام ہوتی ہیں۔ کتنے ہیں جو الیکشن کمیشن یا انکم ٹیکس میں اپنے اثاثے چھپاتے ہیں۔ پھر دوسری طرف آئیے، اگر ان معزز غریبوں کی تنخواہ میں اضافہ ہونا ہی چاہیے تو کیا یہ عمل بھی کوئی قانونی حیثیت رکھتا ہے کہ تنخواہ لینے والے سے یہ بھی پوچھا جائے کہ جناب جس نوکری کی تنخواہ لیتے ہو، کیا ڈیوٹی پر جانے کے بھی ارادے ہیں یا گھر بیٹھ کر تنخواہ لینے کی روایت پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر معزز ارکان میں سے بہت سے بہت دن اسمبلی میں قدم نہیں رکھتے تو وہ ٹی اے ڈی اے کس حیثیت میں وصول کرتے ہیں؟ وزیراعظم بحرانوں کے علاوہ اسمبلی کا رخ نہیں کرتے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کسی یونیورسٹی یا کسی اور بڑے ادارے کا سربراہ کئی کئی ماہ تک اپنے آفس نہ جائے اور پوری تنخواہ مع مراعات وصول کر لے تو اس کے اوپر کے کسی ادارے کو اس کے فعل پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہی کام اسمبلیوں میں بھی ہو رہا ہے، وزیراعظم اور وزراء سے لے کر بہت سے ارکان بہت کم اسمبلی میں جاتے ہیں، وہ کیسی تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ اور پھر بہت سے ارکان سالہا سال سے اسمبلی کے اندر ایک لفظ تک نہیں بولتے، ان کی تنخواہ کس مد میں جاتی ہے، اس طرح کے کاموں پر کوئی شرم نہیں آتی البتہ چیک پر دستخط کرتے وقت شرم آتی ہے۔ رہی قانون کی بات تو کتنے فیصد ارکان اسمبلی اس قابل ہیں کہ وہ قانون سازی جیسا مشکل اور اہم ترین کام کر سکیں۔ قوم تعلیم، علاج، صاف پانی اور دیگر

سہولتوں کو رو رہی ہے، ہمارے نمائندے اپنے سیاہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر
اپنے مفادات کے لئے باہم شیعر و شکر ہو رہے ہیں۔ کیا ان طاقتور اور بااختیار لوگوں کی
مراعات کھلی کر پشن نہیں؟

حافظ صاحب ہمارے ہمسائے ہیں، بزرگ اور شفیق ہیں، اہم بات یہ کہ ہمارے نگران مالک مکان بھی وہی ہیں۔ کئی روز سے مجھے یاد فرما رہے تھے، کل صبح ہی میں حاضر ہو گیا، حال احوال کے بعد وہ اصل حال کی طرف آئے، ”ایک خاتون ہمارے گھر کام کرتی تھی، ان کے عزیزوں نے اس کی شادی کا بندوبست کیا، مگر شادی کی پیچھے سازش تھی، ماحول ’وٹ سٹ‘ کا بن گیا، اُن کی خاتون پر تشدد ہوتا تو بدلہ اس سے لیا جاتا۔ خواتین پر تشدد کے نئے قانون کے مطابق خاتون نے پولیس کو بھی اطلاع دی، مگر اپنی پولیس نے قوانین کو اتنی جلدی قبول نہیں کرتی، ویسے بھی پرانے قوانین میں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں، پولیس کے لئے سب سے موثر قانون جیب گرم کرنے کا ہے، اس قانون کے سامنے تمام قوانین جواب دے جاتے ہیں۔ اس خاتون کے ساتھ بھی یہی ہوا، بہر حال معاملہ طلاق پر ختم ہوا۔ اس لڑکی نے میری مرحومہ بیوی کی بہت زیادہ خدمت کی تھی۔“ یہ بتاتے ہوئے حافظ صاحب کی آواز رندھ گئی۔ اس کا والد فالج کا مریض ہے، بھائی ناہنجار ہیں اور والدہ گھروں میں کام کر کے اتنا نہیں کما سکتیں کہ گھر چلا سکے۔ مدعا یہ تھا کہ میں خاتون کو کہیں چھوٹا موٹا کام دلوانے میں ان کی مدد کروں۔

میں اپنے دفتر واپس آیا تو بجلی کے بل میرے حوالے کئے گئے، جس میٹر کا بل ایک دو ہزار آتا تھا، وہ دس ہزار آیا تھا، میں جانتا ہوں کہ بل جو بھی آئے وہ ادا کرنا ہی پڑتا ہے، اگر ناجائز بھی ہے تو اسے بھرنے کے احکامات ملتے ہیں، بعد میں درجی کا وعدہ ہوتا ہے جو کبھی ایفا نہیں ہوا۔ میں سوچ میں پڑ گیا، کہ ایک دم کئی گنا زیادہ بل کیوں آگیا۔ میں اسی شش و پنج میں بیٹھا تھا کہ اخبار آگیا۔ پاکستان کے محترم وزیر اعظم میاں نواز شریف ایک مرتبہ پھر لندن چلے گئے تھے، جہاں انہوں نے اپنے سٹیٹس کے مطابق ڈاکٹروں سے میڈیکل چیک اپ کروانا ہے، ان سے یہ سرٹیفیکیٹ لینا ہے کہ آیا میں پاکستان میں اپنی انتخابی مہم جاری رکھوں یا کچھ آرام کروں۔ وہاں ان کی سیاسی ڈاکٹروں سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ چند روز پاکستان کے کشیدہ ماحول سے دور رہ کر وہ ذہنی آسودگی حاصل کر سکیں گے۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ وہ صرف پاکستان کے وزیر اعظم ہی نہیں، لندن میں ان کا گھر ہے، ان کے بچوں کا کاروبار ہے، گویا لندن ان کا دوسرا گھر ہے۔ وہ جب چاہیں لندن جاسکتے ہیں، وہ جاتے بھی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس آنے جانے پر خرچ ہوتا ہے، خصوصی طیارہ جاتا ہے، چیک اپ پر خرچہ اٹھتا ہے۔ ایک دورے کے لاکھوں روپے کہاں سے آتے ہیں، ظاہر ہے عوام کے ٹیکسوں سے۔ اور جب کسی کا بجلی کا بل ایک ہزار کی بجائے دس ہزار آئے گا تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس کا باقی نو ہزار میاں صاحب کے بیرونی خرچے پر استعمال ہو رہا ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے صارفین

اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ملائے اور ثوابِ دارین پاتے ہیں۔ یہ خرچہ آئینی طریقے سے استعمال ہوتا ہے اس لئے اس پر کسی کے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

مجھے کچھ دیر کے لئے تو حافظ صاحب کی سنائی ہوئی کہانی بھول گئی، مگر جب کچھ ہوش آیا تو میں نے سوچا کہ اس خاتون کا قصہ کوئی منفرد نہیں، یا معاشرے میں دو چار ہی ایسے قصے نہیں، بلکہ یہ معاملہ تو گلی گلی میں موجود ہے، معاشرے میں لاکھوں بچے یتیمی کی زندگی گزار رہے ہیں، خواتین بیوگی اور مائیں بے اولادی کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ معاشرے کے معذور، مجبور، یتیم، بے آسرا لوگوں کا وارث کون ہے؟ کیا ان سب کی کفالت کی ذمہ داری ریاست کی نہیں؟ کیا ریاست کا فرض نہیں کہ وہ لوگوں کی تعلیم، صحت اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری اٹھائے، ان کی کفالت خود کرے؟ مگر اپنے ہاں تو ایسے مجبور اور بے سہارا خاندانوں کی تعداد لاکھوں میں ہے، جو لڑکیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گزار رہے ہیں، جن میں سے بے شمار نوجوان معاشرے کا ناسور بن جاتے ہیں۔ بے شمار خواتین مجبوریوں کے ہاتھوں خار دار راہوں پر چل نکلتی ہیں، کتنے لوگ ہیں جو نشہ کی لت میں مبتلا ہو کر خود کو تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ مگر اپنے حکمران خواہ وہ کرپشن کے دشمن ہوں، انہوں نے ایکٹ دھیلے کی کرپشن نہ کی ہو، وہ صوبے اور قوم کے خادم ہی کیوں نہ ہوں، ان کا پروٹوکول اور مراعات ہی اس قدر ہیں

کہ ان کے ملک اور صوبے کے لوگوں کا خون نچوڑ نچوڑ کر ہی حکمرانوں کو عیاشیاں مہیا کی جاتی ہیں۔ اگر بل زیادہ آئیں گے تو بھی ان کا اضافی حصہ حکمرانوں کی ضرورتوں کو ہی پورا کرے گا، ایسے میں حاکمیتوں کی دادرسی کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے؟

اچھی حکمرانی کا خواب؟

نہ جانے اقربا پروری اور سفارشی کلچر کب ختم ہوگا اور ملک میں اچھی حکمرانی آئے گی۔۔۔ یہ ریمارکس چیف جسٹس آف پاکستان انور ظہیر جمالی کے ہیں، جنہیں آئے روز۔۔۔

نئے سے نئے مقدمات سے واسطہ پڑتا ہے، عوام کے نئے مسائل ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں، حکومتی مظالم کی نئی نئی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ چیف جسٹس کا تجربہ اس قدر ضرور ہو جاتا ہے کہ اچھے برے کی پہچان کرنا ان کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ اچھی حکمرانی کو پوری قوم ترس گئی ہے، اگر کوئی کسی حکمرانی سے مطمئن ہے تو صرف وہ لوگ جو حکمران پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا موقع بھی آتا ہے کہ انسان کسی بات کو غلط سمجھ رہا ہوتا ہے مگر اس کی سیاسی مجبوری ہوتی ہے کہ اسے اپنی حکومت کے اس عمل کی تعریف کرتے ہی بنتی ہے۔ حکمران کوئی ظالمانہ قدم بھی اٹھائیں تو ان کی پارٹی کے حامی ان کے حق میں دلائل نکالتے دکھائی دیتے ہیں۔ صدمہ تو اس وقت ہوتا ہے جب حکومتی پارٹی کسی علاقے کا استحصال کر کے کسی دوسرے علاقے یا شہر کو ترقی کی راہوں پر گامزن کیا جا رہا ہوتا ہے، اور اسی محروم رکھے جانے والے علاقے کے پارٹی رہنما اپنے قائدین کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہوتے ہیں، ان کی ہر ادا کو درست اور ضروری قرار دے رہے ہوتے ہیں۔

ستم یہ ہے کہ کوئی حکمران یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اقربا پروری یا سفارش وغیرہ میں ملوث ہے، اور یہ کہ وہ خود کو ہمیشہ اچھی حکمرانی کے دعوے دار ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ چیف جسٹس نے موجود حکمرانوں کے تناظر میں ہی بات کی ہے۔ مگر اپنے حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ وہ خود کو پاکستان کے سب سے بہتر حکمران قرار دیتے ہیں، عوام بلاشبہ ان کی تائید کرتے ہیں، یعنی وہ ان کو ووٹ دیتے ہیں تو کوئی حکمران بنتا ہے۔ اسی عوامی تائید کو ہی وہ احتساب بھی قرار دیتے ہیں، کہ اگر ہم عوام کو پسند نہ ہوتے اور کرپشن وغیرہ میں ملوث ہوتے تو عوام ہمیں ووٹ کیوں دیتے۔ گویا عوام کے ووٹ کا مطلب حکمرانی کا سرٹیفیکیٹ بھی ہے اور اس بات کا مینڈیٹ بھی کہ وہ اپنے وٹرن کے مطابق منصوبہ بندی کریں اور ملک کا نظم و نسق چلائیں۔ ہو تو یہی کچھ رہا ہے، ایک دھیلے کی کرپشن ثابت کرنے کی صورت میں نام تبدیل کر دینے کی اجازت، یا پھر قیامت تک کرپشن ثابت ہو جانے کی صورت میں قبر سے نکال کر پھانسی دینے کی بات۔ ان میں سے کچھ بھی ممکن نہیں۔ جن باتوں کا چیف جسٹس نے ذکر کیا ہے، ان کو تو کوئی کرپشن تصور ہی نہیں کرتا، خالص میرٹ کے دعوے بھی موجود ہیں اور اپنے من پسند لوگوں کو مراعات دینا، ان کے لئے ترقی کے مواقع فراہم کرنا انہیں ٹھیکوں وغیرہ میں ایڈجسٹ کرنا عام سی باتیں ہیں۔ ان بیماریوں سے دور رہ کر حکمرانی کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔

گزشتہ روز لاہور کے ایک شہری نے وزیر اعظم کے غیر ملکی دوروں کے خلاف عدالت عالیہ میں درخواست گزاری ہے کہ یہ دورے بے مقصد کئے جا رہے ہیں، ان پر اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگایا جائے، ان میں اپنے خاندان اور دوست احباب کو دوسرے ملکوں کی سیر کروائی جاتی ہے۔ اگر واقعی وزیر اعظم کے غیر ملکی دوروں کا حساب کیا جائے تو ان میں بہت سے سیر سپاٹوں کی ذیل میں آتے ہیں، حتیٰ کہ علاج یا میڈیکل چیک اپ کے لئے باہر جانا بھی گڈ گورنس نہیں۔ اگر ہمارے وسائل اتنے زیادہ ہیں، اور ہم بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں تو ہم اپنے ہی ملک میں اس سطح کے ہسپتال کیوں قائم نہیں کر سکتے کہ ہمارے حکمران اور دیگر سرمایہ دار لوگ ملک کے اندر ہی چیک اپ اور علاج کروانے کی پوزیشن میں آجائیں۔ حکمرانوں، بیوروکریسی اور ارکان پارلیمنٹ کی مراعات پر نگاہ ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ملک کے بہت زیادہ وسائل حکمرانوں کی عیاشیوں پر ہی خرچ ہو جاتے ہیں۔ کرپشن مراعات کے علاوہ ہے، اگر حکمران ذاتی طور پر یہ فریضہ نہیں نبھا رہے تو ان کی ناک کے نیچے بہت سے لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ اگر واقعی ملک میں کرپشن کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے، میرٹ کا دور دورہ ہے، انصاف اور احتساب کا عمل جاری ہے، عوام تو بنیادی سہولتیں میسر ہیں، تو پھر ملک ترقی کی منزل تک کیوں نہیں پہنچ سکا؟ یا پھر یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ بہت سی کمیاں کوتاہیاں موجود ہیں، جنہیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ جانے

اقربا پروردی، سفارشی کلچر کب ختم ہوگا اور اچھی حکمرانی کب آئے گی؟

مئی 16ء کو انہیں اس جہانِ فانی سے کوچ کئے نصف صدی ہو گئی۔ والی ریاست 24 بہاولپور نواب سر صادق محمد خان خامس کو اپنے محسنِ کردار کی وجہ سے ”محسنِ پاکستان“ بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے اخبارات کا جائزہ لیا، ٹی وی چینلز پر نگاہ رکھی، مگر اکاؤنٹ چینلز نے بمشکل چند لمحے اس خبر کو اپنے ناظرین کو دکھانا پسند کیا۔ اخبارات دیکھے تو چند بیانات دے کر شہیدوں میں نام لکھوانے والوں کے علاوہ کوئی خاص سرگرمی دکھائی نہ دی۔ شہر کی جانب دیکھا، تو اسلامیہ یونیورسٹی اور آرٹ کونسل کی تقریبات کے علاوہ کسی نے اپنے محسن کو یاد نہ کیا۔ اسلامیہ یونیورسٹی کا غلام محمد گھوٹوی ہال کبھی بہاول پور کا اسمبلی ہال بھی رہا تھا، اس لئے وہاں تقریب بنتی تھی۔ ایکٹ آدھ کالم شائع ہوا اور ایسے ہی ایکٹ آدھ رپورٹ۔ قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کی مالی حالت سے کون واقف نہیں، ویران دفاتر، وسائل سے تہی دست، کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات کاغذات کو آپس میں نہتی کرنے کے لئے پن بھی دستیاب نہ ہوتی تھی، ایسے میں کانٹوں سے کام لیا جاتا تھا، جہاں کا من پن نہ ہوگی، وہاں کاغذ کی دستیابی اور دیگر فرنیچر کا کیا عالم ہوگا؟ ایسے میں نواب بہاول پور نے پورے پاکستان کے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا بندوبست کیا۔ قائد اعظم بحیثیت گورنر جنرل پاکستان

تشریف لائے تو جس گاڑی پر وہ حلف برداری کی تقریب کے لئے گورنر جنرل ہاؤس پہنچے وہ بھی نواب صادق خان عباسی کی ہی تھی۔ کراچی میں انہوں نے قائد اعظم اور بعد ازاں محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا محل پیش کر دیا تھا۔

یہ ہندوستان کی ریاستوں کے واحد نواب تھے جن کے پاس جنرل کا عہدہ تھا اور فوجی اعزازات بھی تھے۔ یوں وہ پیش ورائہ کمانڈر بھی تھے۔ انہوں نے بلوچ رجمنٹ کے نام سے ایک ڈویژن فوج کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں پاکستان کی فوج میں ضم ہوئی اور جو اپنی شناخت ابھی تک قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی طرح بعد ازاں انہوں نے سرحدوں کی حفاظت کے لیے ڈنرٹ ریجنرز کی تشکیل دی۔ سر صادق خان کا دور اقتدار 31 سال پر محیط ہے اس دوران نظم و نسق کا خوب نظام موجود تھا۔ تعلیمی نظام، جوڈشمری ڈھانچہ، اکاؤنٹنٹ جنرل، اپنا ڈاک سسٹم قائم کیا گیا۔ حکومتی مشینری چلانے کے لیے اپنے کسی رشتہ دار کو عہدہ نہ دیا بلکہ اہلیت کی بنیاد پر ذمہ داری دی گئی۔ احتساب کا نظام موجود تھا۔ عوامی شکایت سننے کے لیے دربار کا اہتمام کیا جاتا۔ مذہبی رواداری بھی موجود تھی۔ فیصد ہندو، سکھوں کو تمام بنیادی حقوق میسر تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل محمود کرمانی کو 13 برطانیہ نے فوجی اعزازت سے نوازا تھا۔ لیکن جب انہوں نے تقسیم ہند کے وقت ہندو اور سکھوں کے قافلے پر قاتلانہ حملہ کرایا اور عورتوں کو مال غنیمت کے طور پر تقسیم کرایا تو اس پر نواب نے ان کو سزا دی۔ بہاولپور

ریاست سے اڑھائی لاکھ ہندو اور سکھوں کا انخلا ہوا تھا تو ان کے مقابلے میں نو لاکھ
 مہاجرین کو آباد کیا گیا۔ جو مال و اسباب ہندو، سکھ چھوڑ کر گئے تھے ان پر مقامی آبادی
 کو قبضہ نہیں کرنے دیا بلکہ ان کو مہاجرین کے اندر تقسیم کیا گیا۔ اسلامی ریاست کو
 سرسبز بنانے کے لیے ستلج و پٹی معاہدہ ہوا جس کے لیے 12 کروڑ روپے کا قرض لیا گیا
 ۔ جس کو 1986 تک ادا کرنا تھا۔ لیکن اس قرضہ کو 25 سال قبل 1950 میں واپس
 کر دیا۔ 1927 سے 1951 تک بہاولپور ریاست کا دفاعی بجٹ ایکٹ کروڑ روپے کے لگ
 بھگ ہوا کرتا تھا جو 1952-53 میں صوبہ سرحد کے سالانہ بجٹ کے برابر تھا۔
 نواب سر صادق خان نے متعدد رفاہی اداروں کی بنیاد رکھی۔ ان اداروں کی متعدد
 عمارتیں آج بھی شاہکار ہیں۔ جامع مسجد الصادق بنائی۔ سعودیہ عرب میں حاجیوں کے
 لیے رہائش گاہیں بنائی گئیں۔ جامعۃ الازہر کی طرز پر جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔
 عباسیہ سکول، ڈیرہ نواب ہائی سکول، صادق و ویمین کالج، صادق گرلز ہائی سکول تعلیمی
 اداروں کی بنیاد رکھی۔ ان کے علاوہ بہاولپور کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ مختلف شہروں
 میں 12 رفاہی اداروں کی معاونت کی جاتی تھی۔ پیرامیڈیکل سکول بنایا گیا، ریاست
 میں تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ہر مسجد کو سکول بنادیا گیا، خوبصورت عمارت پر مبنی
 سنٹرل لائبریری بنائی گئی۔ ڈرننگ اسٹینڈیم، چڑیا گھر بنائے گئے۔ ہندوستان میں

موجود 600 ریاستوں میں سے بہاولپور واحد اسلامی ریاست تھی جس نے سب سے پہلے پاکستان میں نہ صرف شامل ہونے کا اعلان کیا بلکہ لاکھوں مہاجرین کو آباد کیا۔ بہاول پور میں نواب دور کی پُر شکوہ تعلیمی اداروں سمیت دیگر عمارتیں عوام کو حسرت سے دیکھتی اور اپنے محسن کو بھلا دینے پر زبانِ حال سے افسوس کر رہی ہیں۔

جناب اسحاق ڈار نے پاکستانیوں کی زندگیاں اجیرن بنانے کی خبر دے دی ہے، مگر اُن لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جو ٹیکس دیتے ہیں، انہوں نے زندگی اجیرن بنانے کا اعلان ان لوگوں کے لئے کیا ہے جو ٹیکس نہیں دیتے۔ یہ خبر تو عام ہے کہ پاکستان میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ٹیکس نیٹ میں شامل نہیں۔ اسحاق ڈار نے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ نئے ٹیکس نہیں لگائے جائیں گے۔ اگرچہ یہ خبر خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جانے کی ہے، مگر کیا کیجئے کہ حکومتی دعووں اور وعدوں پر یقین کرنا بھی اتنا آسان نہیں۔ ہر بار بتایا جاتا ہے کہ نئے ٹیکس نہیں لگیں گے، مگر وہ لگ جاتے ہیں۔ اسحاق ڈار حکومت میں وزیراعظم کے بعد اہم ترین فرد ہیں، ان کی اہمیت کی دواہم وجوہ ہیں، ایک یہ کہ وہ خزانے کے وزیر ہیں، دوسرا یہ کہ وہ وزیراعظم کے قریبی عزیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاناما لیکس کے ہنگامے کے بعد جب وزیراعظم میاں نواز شریف اپنے میڈیکل چیک اپ کے لئے لندن تشریف لے گئے تھے تو اُن کی غیر موجودگی میں قوم کو یہی بتایا گیا تھا کہ اسحاق ڈار ہی معاملات کی نگرانی کریں گے۔ اسحاق ڈار کی باتیں ظاہر ہے عام آدمی کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتیں، کیونکہ حساب کتاب اور بجٹ کی گتھیاں سلجھانا عام آدمی کا کام بھی نہیں۔ بجٹ کو ہمیشہ الفاظ کا گورکھ دھندہ کہا جاتا ہے

جس کی عوام کی اکثریت کو سمجھ نہیں آتی۔ اشیائے ضرورت کی قیمتیں بڑھنے، مہنگائی کا طوفان آنے اور غریب کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے کے باوجود قوم کو بڑے ہی اعتماد کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ ان اقدامات کا عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا ”عام آدمی“ تلاشِ بسیار کے باوجود کبھی کسی کو نہیں مل سکا۔ عام آدمی پر اثر انداز ہونے کا معاملہ تو ابھی کچھ دن بعد آئے گا، مگر بجٹ سے قبل کی خبر یہ ہے کہ ٹیکس نہ دینے والوں کی زندگی اجیرن بنا دی جائے گی۔

ڈار صاحب! یہاں اجیرن زندگیوں کا بوجھ اٹھانے والوں کی پہلے ہی بہتات ہے، کبھی آپ کو پروٹوکول، مراعات اور بے حد و حساب سہولتوں سے فرصت ملے تو آپ دیکھیں کہ ہر روز کے اخبارات میں کس قدر خود کشیوں کی خبریں آتی ہیں، کتنے لوگ ہیں جو سڑکوں اور عوامی مقامات پر بھیک مانگ رہے ہیں، کوئی فرد کسی مارکیٹ وغیرہ کے سامنے رکتا ہے تو ایک منٹ کے اندر اس کے سامنے دستِ سوال دراز ملتا ہے۔ ایسے خواتین و حضرات معہ بچگان (بھکاری بھی میدان میں آچکے ہیں جو صاف ستھرے) کپڑے پہن کر سڑک کے کنارے تادیر کھڑے رہتے ہیں، اور رات دیر گئے منظر سے غائب ہوتے ہیں، بعض خواتین کے پاس تو ایک سے تین تک بچے بھی ہوتے ہیں، جو یا کبھی بیٹھے ہوتے ہیں یا اکثر سوئے ہوئے ہی ملتے ہیں۔ کبھی باہر کی حقیقت کو سنجیدگی سے محسوس کیجئے جہاں کروڑوں بچے سکول

کا منہ دیکھنے کی پوزیشن میں ہی نہیں، دراصل تعلیم کے لئے بجٹ موجود نہیں، اگر ہے تو وہ میگا پراجیکٹس کا حصہ ہے۔ لیپ ٹاپ لٹانے اور دانش سکول بنانے کے لئے ہے۔ کبھی آؤٹ آف بجوں کو دیکھیں، ان کی آنکھوں میں جھانکیں، ان کو سکول لانے کے دعوے خاک ہو چکے ہیں۔

آپ ٹیکس نادہندگان کی زندگی اجیرن ضرور کیجئے، مگر یہاں تو نصف سے زیادہ آبادی کی زندگیاں پہلے سے ہی اجیرن ہیں، ان کے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور اوپر سے بجلی کے بے پناہ بل آجاتے ہیں، ان کو ایکٹ ایکٹ چیز پر ٹیکس دینا ہوتا ہے۔ ٹیکس نادہندگان تو آپ لوگوں کی ناک کے نیچے بھی بیٹھے ہوتے ہیں، خود ارکان اسمبلی بھی اس معاملے میں اثاثے چھپاتے ہیں، کہتے ہیں جو ٹیکس کے گوشوارے اس وقت جمع کرواتے ہیں جب ان کی رکنیت معطل ہو جاتی ہے۔ ٹیکس نادہندگان کو پکڑنا کونسا مشکل ہے، بہت بڑے گھر، بہت بڑی گاڑی اور بہت بڑا کاروبار دیکھ کر حساب لیجئے، سب کچھ سامنے آجائے گا، مگر ان میں بہت سے لوگ آپ کے اپنے ہونگے، اس لئے معاملہ پر پردہ ڈالنا پڑتا ہے۔ سرمایہ داروں کو گردن سے پکڑ کر ٹیکس نیٹ میں لائیے، مگر ان کی زندگی بھی آپ اجیرن نہیں بنا سکتے، وہ ٹیکس وصولی والے محکمے کے اہلکاروں کی جیب گرم کر کے بچ نکلیں گے۔ ہاں یہاں ان کی زندگی بھی اجیرن ہے جو اپنے گھر کے اخراجات بمشکل پورے کرتے ہیں اور انکم ٹیکس والے ان کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ ڈار صاحب ! ٹیکس

ناوہندگان کی زندگیاں اجیران نہ بنانے کی بجائے ان سے ٹیکس وصول کیجئے۔ پھر ٹیکس کی آمدنی اپنی عیاشیوں اور مراعات پر لگانے کی بجائے ملک اور عوام کی بہبود پر لگائیے۔

! قیام امن میں صحافت کا کردار

اب تو اس بات کے زیر بحث آنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہا کہ میڈیا ابلاغ کے ساتھ ساتھ رائے سازی میں اہم ترین کردار ادا کر رہا ہے۔ اکیسویں صدی اپنے ساتھ جدید ٹیکنالوجی کا سیلاب لے کر طلوع ہوئی۔ انسان صرف ٹیس، برس ہی پیچھے مڑ کر دیکھ لے تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ جائیں۔ میڈیا کے پھیلاؤ کے بہت سے فائدے بھی ہیں، مگر مقابلہ بازی کی صورت حال نے ہر طرف سنسنی پیدا کر رکھی ہے، جو چینل بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سنسنی خیزی کا سخت مخالف ہے، اس کارِ خیر میں اپنا حصہ وہ بھی ملاتا ہے، کیونکہ جب مقابلہ ہی سنسنی خیزی کا ہو تو پھر کون اور کیوں پیچھے رہے گا؟ ان ہنگامہ خیز حالات میں عام خبر بھی ہیجان انگیز ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دل اور بلڈ پریشر کے مریضوں کو ڈاکٹر خبریں دیکھنے اور اخبار پڑھنے سے پرہیز کا مشورہ ہی دیتے ہیں۔ دوسری جانب ستم یہ ہے کہ وطن عزیز جس خطے میں واقع ہے وہاں دہشت گردی اور بد امنی نے اپنے بچے نہایت مضبوطی سے گلاز رکھے ہیں۔ معاملہ صرف ایک یا دو ملکوں کا نہیں، بات براعظموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے میں لوگوں کو امن کا درس کون دے، عوام کو برداشت کی بات کون سکھائے؟ ظاہر ہے میڈیا اس میں سب سے آگے ہے، یہی وجہ ہے کہ میڈیا کو رہنما کردار ادا کرنا چاہیے۔

میڈیا میں سب سے اہم کردار صحافی کا ہوتا ہے، وہی خبر تلاش کرتا اور وہی اس کو رنگ اور رُخ دیتا ہے، وہی اس کی نوک پلک سنوارتا اور وہی اس کو میزائل کی مانند بعض اوقات تباہ کن بنا دیتا ہے۔ صحافیوں کو ہر جگہ ایک نہایت ہی معتبر پلیٹ فارم دستیاب ہوتا ہے، جسے عرف عام میں پریس کلب کہتے ہیں۔ پریس کلب جہاں صحافیوں کی آواز بنتا ہے، ان کے مسائل کا حل تلاش ہے، ان کے لئے علاج اور رہائش کی سہولتوں کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہاں یہی ادارہ صحافیوں کے لئے تربیتی ادارے کا کام بھی کرتا ہے۔ کوئی بھی ادارہ یا اس میں کام کرنے والے افراد اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے اور ان کی کاوشیں ثمر بار نہیں ہو سکتیں، جب تک اُن کی تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے۔ گزشتہ دنوں بہاولپور میں بھی ایک سہ روزہ ایسی ہی تربیت گاہ کا اہتمام کیا گیا۔ تربیت گاہ کے روح رواں تو اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ ماس کمیونی کیشن کے سربراہ ڈاکٹر ظفر اقبال تھے، جو وقتاً فوقتاً شرکا سے گفتگو کرتے رہتے تھے، ان کے علاوہ گوگل یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر منصور اکبر کنڈی، ڈاکٹر اکرم رانا، آصف علی بھٹی، متین حیدر اور عدیل وڑائچ نے بھی ٹریننگ میں لپکھ دیئے۔ مقامی طور پر انتظامات برادر م جنید نذیر ناز نے سنبھال رکھے تھے۔ چونکہ یہ پروگرام پریس کلب کے پلیٹ فارم پر ہو رہا تھا، اس لئے بہاول پور پریس کلب کے صدر توصیف احمد بھی ہمہ وقت

موجود رہے۔

مقررین کا کہنا تھا کہ میڈیا قیام امن، مسائل کے حل اور سماجی رویوں میں تبدیلی پر اثر انداز ہوتا ہے، جس کے لئے صحافیوں کو ذمہ دارانہ صحافت کی تربیت کی ضرورت ہے۔

میڈیا کو تنازعات کو ہوا دینے کی بجائے صلح جو کا کردار ادا کرنا چاہیے، تاکہ سماجی شعبے میں مسائل میں کمی واقع ہو سکے۔ میڈیا کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شہر و دیہات کے بہت سے لوگ اپنی معلومات کا دار و مدار میڈیا پر ہی کرتے ہیں، بلکہ اکثریت کا یہی خیال ہے۔ کیونکہ ٹیکنالوجی کی ترقی سے میڈیا کو عوام تک پہنچنے، ایجنڈا ترتیب دینے اور لوگوں کی خواہشات پر اثر انداز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے میڈیا کا فرض ہے کہ وہ محتاط اور ذمہ دارانہ صحافت کرے اور اپنے قارئین، ناظرین اور سامعین کو مثبت اور حق پر مبنی خبریں پہنچائے۔ اگرچہ اس راہ میں بے شمار مشکلات بھی آتی ہیں، مگر ہر طرف سے بچ بچا کر اور سلیقے سے خبریں حاصل کی جائیں۔ لوگوں کو سیاسی عمل سے دور رکھنے اور اظہار کی آزادی نہ دینے سے بھی تنازعات جنم لیتے ہیں، آزاد اور غیر جانبدار میڈیا مباحثے کا پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے، جس سے سنسنی خیزی کی بجائے باہمی مشاورت، امن اور برداشت کا ماحول دستیاب ہوتا ہے۔ مذہب اسلام بھائی چارے کا درس دیتا ہے، کسی بھی اسلامی مملکت میں اقلیتوں کے حقوق کا اسی طرح خیال رکھا جاتا ہے،

جس طرح خود اس ملک کے اپنے شہریوں کا۔ اسلام زبردستی کا نہیں محبت اور اخوت کا
دین ہے۔ مقامی سطح پر ایسی تربیت گاہوں کی بڑی ضرورت ہے، اگر صحافی اپنی ذمہ داری
احسن طریقے سے سرانجام دے گا تو معاشرے پر اس کے مثبت اور خوش گوار اثرات
مرتب ہونگے۔

لاہور میں ٹریفک کے جدید نظام پر عمل درآمد کا آغاز ہو گیا ہے، بتایا گیا ہے کہ اب ٹریفک وارڈنز اور خفیہ کیمروں کی مدد سے ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ہاتھ ڈالا جائے گا، جس چوٹ پر وارڈن نہیں ہونگے وہاں خلاف ورزی کرنے والوں کی خفیہ کیمرے سے تصویر لی جائے گی، وارننگ لیٹر گھروں کے پتے پر ارسال کیا جائے گا، معافی نہیں ملے گی۔ دوسری طرف یہی کیمرے وارڈنز کی بھی نگرانی کریں گے۔ جس کے لئے شہر میں پچاس کیمرے لگا دیئے گئے ہیں، ویبکی لینس سیل بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کارروائی کے تحت اب تک پانچ ہزار شہریوں کو خط لکھے جا چکے ہیں۔ آئندہ خلاف ورزی کرنے والوں کا ڈیٹا ایکسائز کو بھی فراہم کیا جائے گا، گاڑی فروخت کرنے کے بعد ٹرانسفر کرتے وقت پورا جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ خبر سے یہ معلوم نہیں ہوا کہ جن پانچ ہزار شہریوں کو خط لکھے گئے ہیں، ان کا کیا جواب آیا، یا انہیں دی گئی وارننگ کیا رنگ لائی، یا پھر جرمانہ ان کے کھاتے میں جمع ہو گیا، جو کبھی گاڑی فروخت کرتے ہوئے انہیں قومی خزانے میں جمع کروانا ہوگا۔ وارڈن ہوں یا کیمرہ، ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرنے پر اس کے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوگا؟ اگر یہ پتہ ایکسائز والوں سے لیا جائے گا جو گاڑی کے کاغذات بنواتے وقت لکھوایا گیا تھا، تو بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو آئے روز اپنا پتہ

بدلتے رہتے ہیں، کیونکہ جن لوگوں کے ذاتی گھر نہیں ہوتے وہ یقیناً خانہ بدوشوں کی طرح مختلف گھروں میں قیام کرتے سفر جاری رکھتے ہیں۔ ایسے میں بے شمار خط تو کسی پتہ کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے گلیوں میں دھکے کھاتے رہیں گے۔ جن پچاس ہزار شہریوں کو یہ خط بھیجے گئے ہیں، ان میں سے نہ جانے کتنے لوگوں کو ملے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو اپنے گھر تبدیل کر چکے ہیں؟

یقیناً ٹریفک انتظامیہ نے اس معاملے میں تمام فول پروف انتظامات مکمل کئے ہوں گے، بڑے سر جوڑ کر بیٹھے ہونگے، یہ فیصلے ہوئے ہونگے، یہ اندازہ لگایا گیا ہوگا کہ نئے نافذ ہونے والے بندوبست سے کتنے لوگ قانون کی گرفت میں آئیں گے؟ پہلے سے معاملہ بہتر ہوگا یا کچھ عرصے کے بعد اس منصوبے کو چھوڑ کر کوئی اور بندوبست شروع ہو جائے گا؟ تاہم اس کے ساتھ ٹریفک وارڈنز کی نگرانی والی بات زیادہ پائیدار دکھائی دیتی ہے، ان کے لئے نہ سڑک کا مسئلہ، نہ ایکسائز کے محکمے کا چکر۔ بس سامنے بیٹھے کارکردگی کا پول کھل جایا کرے گا، موصوف ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے، چالان کر رہے تھے، یا کچھ دیگر مصروفیات تھیں۔ (تاہم وارڈن سسٹم میں کوتاہیاں دیگر ٹریفک پولیس سے بہت کم ہیں)

قانون پر عمل درآمد کی بات ہے، تو یہ وارڈن اور کیمرے ان نوجوانوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جن کی ابھی ڈرائیونگ کی عمر نہیں ہوتی اور وہ بڑی، بڑی

گاڑیاں اور موٹر سائیکل سڑکوں پر بھگاتے دکھائی دیتے ہیں، آئے روز حادثات کا موجب بنتے ہیں، قیمتی جانیں ضائع ہوتی ہیں، ان کے بارے میں قانون تو یقیناً خاموش نہیں، مگر قانون پر عمل کروانے والے عموماً خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی نوجوان کو روکنے پر اگلے ہی لمحے وہ قیمتی موبائل نکالتا اور کسی کا نمبر ملا کر وارڈن کو اس پر بات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے میں اگر کسی نوجوان کی بڑی کار کی نکر سے کوئی بے گناہ راگیر مارا بھی گیا، تو اس کو پوچھنے والے بھی مشکل میں آ جاتے ہیں۔

بڑے اور طاقتور لوگ قانون کی کمزور رسیوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ کیمرے اور وارڈن اُن گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا کیا کریں گے جو درجنوں کی تعداد میں روزانہ چوری ہوتے، یا چھین لئے جاتے ہیں؟ کیا وہ ان کے اصل مالکان کو واپس مل سکیں گے، یا وہ مستقل ہی ہضم ہو گئے؟ اور پھر یہ کیمرے اور وارڈن اس منظر کی رپورٹ بھی کسی کو پیش کریں، جس میں وی وی آئی پی پروٹوکول میں ٹریفک روک دی جاتی ہے، متبادل راستوں پر ٹریفک جام کا کیا حال ہوتا ہے، لوگ کس طرح پریشان ہوتے ہیں اور ٹریفک بلاک کروانے والی شخصیت کو کس طرح بددعائیں دیتے ہیں؟ یہ تمام امور بھی ان خفیہ کیمروں کی نگاہ میں ہوتے تو ہیں، مگر ان کی روک تھام کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ جس نے یہ مسائل حل کرنے ہیں، دراصل مسائل پیدا کرنے والے وہ خود ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مسائل حل کرنے کا واحد طریقہ قانون پر عمل درآمد ہے، اگر عمل نہیں ہوگا تو نہ کیمرے کام آئیں

گئے، نہ وارڈن کچھ کر سکیں گے اور نہ ہی خطوں سے کوئی تبدیلی آئے گی۔

! سگریٹ نوشی، ایک فیشن ایک بیماری

عالمی دن تو ایک روز کے لئے منایا جاتا ہے، تقریبات ہوتی ہیں، سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں، صدر اور وزیراعظم کے پیغامات بھی ضروری ہوں تو جاری کر دیئے جاتے ہیں، کہیں واکٹ بھی ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے پروگرام ہوتے ہیں، تاکہ اس دن کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ اکثر قومی دن واقعی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں منانے والے باقی اہم اور ضروری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دن صرف ایک روز ہی نہیں منایا جانا چاہیے، اس کی ضرورت تو ہر روز ہوتی ہے۔

یہی سب کچھ سگریٹ نوشی کے عالمی دن کے موقع پر بھی ہوا۔ ماہرین نے سگریٹ کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی۔ کسی نے اسے کینسر کی وجہ بتایا تو کسی نے خون کاڑھا کرنے کی وجہ، کسی نے اسے پھیپھڑوں کے لئے زہر قاتل کہا تو کسی نے نشہ کی علامت اور ابتدا بتایا۔ یہ بھی کہ سگریٹ چالیس بیماریوں کی جڑ ہے۔ بتایا گیا کہ دنیا میں ہر سال ایک لاکھ کے قریب افراد سگریٹ نوشی کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ اطلاع بھی دی گئی کہ سگریٹ نوشی کے بڑھتے ہوئے رجحان میں پاکستان چوتھے نمبر پر ہے۔ کہا گیا کہ عام نارمل آدمی سے سگریٹ نوش کی عمر چودہ برس تک کم رہ جاتی ہے۔ اس دن کے موقع پر یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ سگریٹ نوشی کے خلاف مضمون کو نصاب میں بھی شامل کیا جائے۔

ہزار جتن کئے جاتے ہیں۔ چند برس قبل تک قوم کو یاد ہے کہ سگریٹ کے اشتہارات کو ٹی وی پر اس جوش و خروش سے دکھایا جاتا تھا کہ سگریٹ کا کش لگا کر نوجوان کوئی بھی معرکہ سر کرنے کی پوزیشن میں آ جاتا تھا، بڑی بڑی مشکلات سے صرف ایک ہی جست میں نکل جاتا تھا، دریاؤں کے سینے چیر کر پار اتر جاتا تھا، پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتا تھا، ناممکنات کو ممکن بنا دیتا تھا۔ مگر پھر صحت کے حوالے سے حکومت نے انگریزی لی اور طے ہوا کہ اشتہاروں کی آمدنی والا نقصان برداشت کر لیا جائے گا، مگر اس زہر کو گلیسر بنا کر لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا۔ یہ بلاشبہ حکومت کا احسن اقدام تھا، جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اس پر عمل تو ہوا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، اشتہار کے زمانے میں سگریٹ کی ڈبیا پر سگریٹ کے مضر صحت ہونے کا جملہ تو لکھا جاتا تھا، مگر اب اضافہ یہ ہوا کہ ڈبیا پر ہی سگریٹ کے ذریعے منہ کے کینسر ہونے کی تصاویر شائع ہوتی ہیں، جو نہایت کراہت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی پریشان کن ہیں۔ عام آدمی اس قسم کی تصویر والی چیز خریدنے سے پرہیز ہی کرتا ہے۔ ہزار ڈرائیں، بیماریوں کا یقین دلائیں، عمر میں کمی کی خبر دیں، کینسر جیسے موذی مرض کی بات کریں، یا پھر یہ کہ اپنی جیب سے خرچ کر کے زہر خریدا جاتا ہے، اور عام یا غریب آدمی بھی پیسوں کا دھواں بنائے اڑا دیتا ہے، مگر سگریٹ نوش ہیں کہ کسی کا اثر نہیں لیتے، کسی کی بات پر

کان نہیں دھرتے، زہر پئے جارہے ہیں۔

دراصل سگریٹ کی کسی زمانے میں ایسی تصوراتی منظر کشی کی گئی ہے، کہ لوگوں کے دلوں سے چپک کر رہ گئی ہے، سگریٹ پینے کا انداز ہی وہ دلکش چیز ہے، جس کی بنا پر بہت سے لوگ سگریٹ شروع کرتے ہیں اور بعد ازاں اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی بڑے اور مقبول آدمی کو جب اس کے چاہنے والے سگریٹ پیتے دیکھتے ہیں تو تقلید کو ضروری جانتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف سگریٹ کو دانشوری اور تصورات کی دنیا میں جانے کا ذریعہ جانا جاتا ہے، شاعر ہوں یا دانشوران میں سے اکثر سگریٹ کے رسیا ہوتے ہیں، جب میز پر چائے کی پیالی کے ساتھ ایک سگریٹ سلگایا جاتا ہے، اور کاغذ پر کسی افسانے کا آغاز کیا جاتا ہے، چائے سے اٹھتی بھاپ اور سگریٹ سے اٹھتا دھواں ایک ماحول بنا دیتا ہے، تخیلات کو چلا ملتی ہے، نئے نئے تصورات ابھر کر سامنے آتے اور دھوئیں کے بادل میں مضمون کا خاکہ بناتے ہیں۔ سگریٹ پینا بھی ایک فن ہے، شاید اس فن سے بھی بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ سگریٹ کی دکانوں کے باہر کم عمر کے نوجوان سگریٹ نوشی کرتے دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ سگریٹ سر عام فروخت ہوتی اور پی جاتی ہے، اس کے باوجود اسے نوجوانوں کے لئے اچھا نہیں سمجھا جاتا، گھر سے مخالفت ہوتی ہے، مگر جب چوری چھپے یہ عادت بن جائے تو اس سے جان چھڑوانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کم عمر نوجوانوں اور عوامی مقامات پر سگریٹ

نوٹشی پر پابندی ہے، مگر قانون وی جس پر عمل ہو۔

پانامہ لیکس کی تحقیقات وغیرہ کے لئے بنائی جانے والی کمیٹی میں چوتھے اجلاس تک بھی ڈیڈ لاک ختم نہیں ہو سکا۔ قوم پریشان ہے کہ پانامہ لیکس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ حالانکہ پہلے کونسا کام ہے جو قوم سے پوچھ کر کیا جاتا ہے، یا جس میں عوام کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ حکمران ہوں یا خفیہ ہاتھ، ہر کام اپنی مرضی سے ہی کرتے ہیں۔ حکمرانوں کو کوئی میگا پراجیکٹس بنانے ہوں، یا کسی نے حکومتوں کے اندر تبدیلیاں لانی ہوں، سب کچھ ملکی مفاد میں عوام سے چھپا کر ہی کیا جاتا ہے۔ کمیٹی کا رخ کیوں نہیں بن رہا، کوئی راستہ سجھائی کیوں نہیں دے رہا، جزوی باتوں پر بحث و مباحثہ ہی کیوں جاری رہتا ہے؟ اس کی ایک اہم اور خاص وجہ یہ ہے کہ تحقیقات اس پارلیمانی کمیٹی کا کام ہے ہی نہیں۔ ان معزز ارکان کو کیا علم کہ معاملے کی تحقیق کیسے کرنی ہے؟ اس کام کے لئے تو عدالتِ عظمیٰ نے بھی کسی حد تک جواب دے دیا ہے۔ پہلے پہل جب وزیراعظم نے اپنے اوپر اچانک آپڑنے والی آفت کو ٹالنے کے لئے سپریم کورٹ کو کمیشن بنانے کا خط لکھا تو اس وقت بھی اپوزیشن کے خاص قانونی ماہر چوہدری اعترار احسن نے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ یہ کام عدالت کا نہیں، اس کے لئے عالمی سطح کے ماہرین کی ضرورت ہے، جو تحقیق کر کے کسی نتیجے پر پہنچیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر

یہ پارلیمانی کمیٹی کیا کرے گی، کوئی مہارتیں یا ذرائع ہیں جن کی مدد سے یہ لوگ تحقیق کریں گے؟

پارلیمانی کمیٹی یہ طے کرے گی کہ اس نے کیا کرنا ہے؟ کچھ کرنا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ جب سرکار کے کسی کام کے لئے کمیٹی تشکیل دے دی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ پارلیمنٹ کی قائمہ کمیٹیوں کو ہی دیکھ لیجئے، ارکان منتخب ہوتے ہیں، اجلاس ہوتے ہیں، ٹی اے ڈی اے بنتے ہیں، ایک معقول عرصے کے بعد سفارشات تیار ہوتی ہیں، (تاکہ تب تک کچھ جیب خرچ نکل سکے) ریکارڈ دیکھا جاسکتا ہے کہ ایسی سفارشات پر اتنا ہی عمل درآمد ہوتا ہے، جسے اونٹ کے منہ میں زیرِ اقرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب حکومت پر کسی قسم کا اعتراض اٹھتا ہے تو حکومت اس کا فوری حل یہی نکالتی ہے کہ ایک عدد کمیٹی بنا دی جاتی ہے، جس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بس سفارشات تیار کیا کرے۔ کسی بھی کمیٹی کا قیام گویا ٹال مٹول کی پالیسی پر عمل درآمد کرنا ہوتا ہے۔ اب پانامہ لیکس پر بھی کمیٹی بن گئی ہے، اس کے چار اجلاس ہو چکے ہیں، کمیٹی نے اب تک ایک بات یہ طے کی ہے کہ کمیٹی کا کوئی سربراہ نہیں ہوگا۔ نہ جانے پروگرام کی ابتدا کون کروائے گا، معاملات کو کون سمیٹے گا، بحث کو آگے کون چلائے گا؟ شاید کسی کو وارنٹہ منیٹر کا نام دے دیا جائے گا۔

اس اہم ترین کمیٹی نے ایک اور فیصلہ یہ کیا ہے کہ یہ کسی نتیجے تک نہیں پہنچی، صرف ایک دوسرے پر اعتراضات اور احتجاج تک ہی معاملہ لٹکا ہوا ہے، خواجہ سعد رفیق کے جذبات کے خلاف اپوزیشن کے ارکان نے احتجاج کیا۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ عمران خان اور بلاول زرداری اس ٹی او آر کے خلاف بیان دینے سے گہر کریں۔ ظاہر ہے کمیٹی کے ممبران نے اور کرنا بھی کیا تھا، سیاسی باتیں ہی کر سکتے ہیں، وہ انہوں نے کیں اور ابھی تک کر رہے ہیں، جس پانامہ پر اپوزیشن نے اور بعد ازاں حکومت نے بھی پورا ملک سر پر اٹھا لیا تھا، اب تک قوم کو یہی بتایا جا رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو جائے گی، دریا کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ یہاں اپنی عملی شکل میں دکھائی دے رہا ہے، یعنی پورے ملک کا ہنگامہ اب اس کمیٹی کی میز تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اور کمیٹی کی کارکردگی بھی بس وہ جزوی اور سطحی مخالفانہ کاروائیوں تک محدود۔ اس کمیٹی نے ایک اور قابل ذکر کام بھی کیا ہے، وہ ہے اپنے وزیراعظم کے لئے دعائے صحت کا اہتمام۔ یہ کام ویسے تو پوری قوم نے کیا ہے، اس کی خبر بھی اسی انداز میں آئی ہے، یہ کمیٹی چونکہ اہم ہے، اس لئے دعا سمیت اس کا ہر عمل اہم ہے۔ قوم خاطر جمع رکھے، یہ کمیٹی بھی کسی نہ کسی نتیجے تک ضرور پہنچ جائے گی، بشرطیکہ کسی ایجنڈے کے تحت کام شروع کر دے، فی الحال تو پوائنٹ سکورنگ اور گپ شپ ایجنڈا ہے، اس کا نتیجہ تاحال

صرف ”ڈیڈ لاک“ کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔

! یہ خطاب لاجواب

صدر ممنون حسین کے اہم ترین خطاب کی عوام کے لئے ایک فیصد بھی اہمیت نہیں، عوام ایسے آئینی اور قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بارے میں کوئی معلومات اور دلچسپی نہیں رکھتے، کیونکہ یہ ان کی ضرورت ہی نہیں۔ عوام کی کیا بات کی جائے کہ ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندے اگر اسمبلی کے اجلاسوں میں نہیں جاتے، یا جاتے ہیں تو ایک لفظ نہیں بولتے، اپنے علاقے کے مسائل حل کروانے کی کوشش نہیں کرتے، عوام نے کبھی اپنے نمائندوں سے ان کے فرائض کے بارے میں استفسار نہیں کیا، وہ نمائندے نہ جانے کس کے سامنے جوابدہ ہیں؟ عوام کی اپنی نفسیات ہے، وہ جس معاملے کو چاہیں، اس میں دلچسپی لیں، جسے چاہیں نظر انداز کر دیں۔ مگر یہاں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں موجودہ حکومت کا تیسرا پارلیمانی سال مکمل ہونے پر صدر کا سالانہ آئینی خطاب سننے کے لئے 70 فیصد سے بھی کم ارکان موجود تھے۔ اجلاس میں وزرائے اعلیٰ اور گورنر سندھ بھی شریک نہیں ہوئے، کئی وزراء بھی موجود نہ تھے۔ بتایا گیا ہے کہ ان میں سے چند معزز شخصیات وزیر پاکستان میاں نواز شریف کی عیادت کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں۔ تاہم اتنی بڑی تعداد میں غیر حاضری ہر کسی کے لئے حیران کن ہے۔

ممنون حسین پاکستان کے صدر ہیں، سربراہ حکومت نہیں، سربراہ مملکت۔ حکومت میں
 تو بے شمار مخالفتوں کا سامنا ہوتا ہے، طرح طرح کی حزب اختلاف ہوتی ہے، اور بعض
 اوقات وزیراعظم بننے والا فرد کا سٹ کئے گئے ووٹوں میں بہت ہی کم تناسب پر ہوتا ہے۔
 یہ الگ بات ہے کہ اسمبلی میں پہنچنے والوں کی اکثریت سے وہ وزیراعظم بن جاتا ہے۔
 مگر صدر تو ملک کا آئینی سربراہ ہوتا ہے، وہ تو پورے ملک کے خواص و عام کا سرپرست
 ہے، مگر یہاں یہ ہوتا ہے کہ صدر صاحب اپنے خطاب میں ایک فریق بن جاتے ہیں،
 انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اپوزیشن حکومت پر تنقید کرتے وقت قائداعظم کا یہ
 فرمان ذہن میں رکھے کہ اپوزیشن یا کوئی اور منتخب حکومت پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی
 کوشش نہ کرے، اسے بلاجواز تنقید کا نشانہ نہ بنائے۔ تاہم صدر نے مثبت تنقید کو قابل
 قبول بتایا۔ یہ الگ بات ہے کہ کس تنقید کو صدر اور ان کی حکومت مرضی مسلط کرنے
 والی تنقید کہتی ہے اور کس تنقید کو 'مثبت' قرار دیا جاتا ہے۔ شاید یہ اسی قسم کا معاملہ
 ہے کہ اپنے ہاں اب فرینڈلی اپوزیشن کا کلچر بھی فروغ پا چکا ہے، بلکہ ایک طعنہ بن چکا
 ہے۔ یہ کام گزشتہ حکومت کے دور سے شروع ہوا ہے، ابھی تک کسی حد تک جاری
 ہے۔ صدر نے حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے وہ کام بھی شمار کروائے جو موجودہ
 حکومت نے اپنے تئیں عوامی بہبود کے ضمن میں شروع کر رکھے ہیں۔ واضح رہے کہ
 کسی کام کی تحسین کرنا اور بات ہوتی ہے اور اس کام کو بطور کارنامہ خوبی بنا کر شمار کرنا
 اور بات۔ صدر کی تقریر سے یہی محسوس

ہو رہا تھا کہ وہ حکومت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ صدر کے پانامہ لیکس اور بلوچستان پر امریکی ڈرون حملے کا ذکر گول کرنے پر اپوزیشن نے احتجاج کیا۔

اپنے خطاب میں صدر نے کہا کہ خواتین کو قومی دھارے میں لائے بغیر پائیدار ترقی ممکن نہیں، اس سلسلے میں انہوں نے مشورہ دیا کہ پرائمری تعلیم تک صرف خواتین اساتذہ ہی ہونی چاہئیں۔ صدر کا فرمایا ہوا یقیننا حکم کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے اب مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس حکم کی تعمیل میں دن رات ایکٹ کر دیں گی، پہلے سروے ہوگا، کتنے پرائمری سکول ہیں، پہلے سے ان میں کتنی خواتین اساتذہ موجود ہیں، مزید کتنی گنجائش ہے، اور یہ بھی کہ اس میں جو مرد اساتذہ کام کر رہے ہیں، ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا؟ انہیں گھر بھیجا جائے گا یا کسی اور سکول میں ایڈجسٹ کیا جائے گا؟ اسی طرح صدر نے انتہا پسندی کے اسباب جاننے کا بھی بڑی فکر مندی کے ساتھ احساس کیا، انہوں نے تجویز دی کہ اس مقصد کے لئے غیر جانبدار، غیر سیاسی علما اور سماجی علوم کے ماہرین پر مشتمل گروپ تشکیل دیا جائے، ظاہر ہے اب حکومت کو یہ فرض بھی نبھانا ہے، بہت سے غیر جانبدار ماہرین اکٹھے کئے جائیں گے، جو انتہا پسندی کے اسباب تلاش کریں گے۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کو شروع ہوئے عشرے گزر گئے، صدر صاحب، اب اسباب تلاش کرنے نکلے ہیں۔ انتہا پسندی بہت نازک ایٹھ ہے

دیکھیں اب حکومت اس مسئلے کے حل کے لئے کس طرح رات دن ایکٹ کرتی اور صدر کا حکم بجالاتی ہے؟ بہر حال صدر نے خطاب کر کے اپنا فرض پورا کر دیا ہے، اب اس خطاب پر بحث کا مرحلہ ہے، اور حکومت کے لئے یہ پریشانی کا مرحلہ بھی کہ اجلاس کی حاضری اتنی کم کیوں رہی؟

!اقتصادی سروے اور گدھے

پاکستان میں بسنے والے انسانوں کی کل تعداد کتنی ہے؟ اس کا درست اندازہ نہیں لگایا جاسکا، کیونکہ مردم شماری ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ تاہم گزشتہ روز پیش کئے جانے والے اقتصادی سروے میں یہ مسئلہ حل کر دیا گیا، معاملہ صرف مردم شماری تک محدود نہ رہا، بلکہ خُمر شماری، گھڑ شماری کے ساتھ ساتھ بھینسوں، بھیڑوں، بکریوں، اور اونٹوں وغیرہ کی تعداد بھی بتائی گئی ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ پاکستان میں موبائل فون کی سہولت 13 کروڑ 14 لاکھ صارفین کو حاصل ہے۔ 19 کروڑ سے زائد آبادی کے ملک میں ایک ہزار اڑتیس لوگوں کے لئے ایک ڈاکٹر کی سہولت ہے۔ ایک ہزار چھ سو تیرہ لوگوں کے لئے ہسپتالوں میں ایک بستر ہے۔ کل آبادی میں مرد عورتوں سے زیادہ ہیں۔ جبکہ بارہ کروڑ کے قریب شہروں میں اور باقی دیہات میں رہائش پذیر ہیں۔ اقتصادی سروے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زراعت رو بہ زوال ہے، کپاس کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے، ٹیکس میں اضافہ ہوا ہے اور سرمایہ کاری میں بھی۔ اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ ہمیں تو بس یہیں تک سمجھ آیا، تشویش والی خبر یہ ہے کہ گدھوں کی تعداد کیا ون لاکھ بتائی گئی، یہ تعداد گزشتہ برس پچاس لاکھ

تھی۔ چونکہ اقتصادی سروے حکومت کا پیش کردہ ہے، وہ بھی جناب اسحاق ڈار نے بذاتِ خود پیش کیا ہے، اس لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں بچتی۔ ظاہر ہے حکومت نے اپنے ذرائع سے سروے کروایا ہوگا، ان کے لوگ گاؤں گاؤں گئے ہوں گے، تب جا کر گدھوں کی گنتی کو آخری شکل دی گئی ہوگی۔ ممکن ہے آؤٹ آف سکول بچوں کی گنتی کی طرح گاؤں میں کسی ایک گدھے والے کے پاس بیٹھ کر حکومتی اہلکار نے دیگر گدھا مالکان کا اندازہ لگا لیا ہو، اور فرضی تعداد ہی جمع کر لی ہو۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ اپنے ہاں بے شمار معاملات فرضی ہی ہوتے ہیں۔ پالتو گدھوں کی گنتی نسبتاً آسان ہے، کہ ایک ایک گاؤں میں گدھا مالکان سے ان کی تعداد لے لی جائے، مگر جو گدھے لاوارث ہی پکھرے کے ڈھیروں پر اپنی خوراک کی تلاش میں دیکھے جاتے ہیں، ان کی گنتی کون کرے گا؟ یا ممکن ہے کسی گاؤں میں پالتو گدھوں کے ساتھ آوارہ گدھوں کی بھی فرضی تعداد لکھ دی گئی ہو۔

گدھوں کا معاملہ اس لئے تشویشناک ہے کہ گزشتہ برس (2015) میں اس خبر نے پورا سال تہلکہ مچائے رکھا کہ گدھوں کا گوشت بڑے بڑے ہوٹلوں پر فروخت کیا جا رہا ہے، اس امر کا انکشاف اس وقت ہوا جب جگہ جگہ گدھے کی کھال فروخت ہوتے دیکھی گئی، کسی جگہ گدھا ذبح کرتے ہوئے لوگ گرفتار ہوئے، تو کسی جگہ گوشت پکڑا گیا۔ پریشانی اور کراہت نے ہر طرف سے آگھیرا۔ بڑے ہوٹلوں پر کھانا

کھانے والے بڑے لوگ بھی شاید پریشان ہو گئے، ورنہ اس قسم کی چھوٹی موٹی باتیں ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ جب یہ تشویش حد سے بڑھ گئی، تو معاملہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو گیا، جو گدھے گزر گئے سو گزر گئے، جو بچ رہے وہ بار برداری اور مزید خواری کے کام آئے۔ بعد ازاں طویل خاموشی چھا گئی، گویا یہ ایک ڈرامہ تھا جو کسی خاص مقصد کے لئے رچایا گیا تھا، خاموشی سے اس کا ڈراپ سین ہوا اور قوم کو بتایا گیا کہ اب گدھوں کے گوشت کے پھیلاؤ پر قابو پا لیا گیا ہے۔ زیر نظر اقتصادی سروے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے، کہ گزشتہ برس سے گدھوں کی کل تعداد میں ایک لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ اگر گزشتہ برس بے شمار گدھے بڑے ہوٹلوں کے دسترخوانوں کی زینت بن گئے تھے تو اگلے ہی برس ان کی تعداد میں ایک لاکھ کا اضافہ کیسے ہو گیا۔ یا وہ بات غلط تھی، یا موجودہ تعداد غلط ہے۔ خیر ”گدھا خوروں“ کے لئے خوشخبری ہے کہ اب وہ تسلی سے یعنی جی بھر کر گدھا خوری کر سکتے ہیں۔ گدھوں کی مہنگی کھال کو برآمد کر کے زر مبادلہ کے ذخائر میں بھی معقول اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کھال سے مصنوعات تیار کر کے بھی پاکستانی لیڈر کی صنعت کو فروغ دیا جاسکتا ہے، اس ضمن میں پاکستانی مصنوعات دنیا بھر میں پہلے ہی بہت مقبول ہیں، اگر اب اسحاق ڈار اس اہم صنعت پر توجہ دیں تو ایک تو گدھوں کی تعداد میں معقول اضافہ کیا جاسکتا ہے، دوسرا یہ کہ اس کی مصنوعات میں معیار کو بہتر کرتے ہوئے برآمدات میں بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ امید ہے اس اقتصادی سروے کی روشنی میں آنے والے سال

میں گدھوں سے خاطر خواہ منافع حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کی جائے گی، جو حکمرانوں

کی مراعات میں اضافے کے کام آئے گا۔

! پولیس کی اصلاح اور معاشرہ

آرپی او بہاول پور احسان صادق کی میڈیا کے نمائندوں کے ساتھ مشاورت تھی، یہ تصور عام پایا جاتا ہے، اور ہے بھی حقیقت کہ میڈیا کے نمائندے عام آدمی سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی دی ہوئی خبریں ٹی وی میں دیکھ اور اخبارات میں پڑھ کر لوگ کسی خبر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ کہا گیا کہ آج ہم سے سننے کی بجائے ہمیں بتایا جائے، پولیس کے رویوں میں تبدیلی آئی ہے یا نہیں، تھانے جانے پر کوئی بات سنتا ہے یا نہیں؟ پولیس سے جڑے مسائل کیا کیا ہیں؟ حالات کو بہتر کرنے کے لئے تجاویز؟ ملے جلے تاثرات بیان کئے گئے، جیسا کچھ بھی تھا، پولیس پر زیادہ اعتماد کی بات نہیں کی گئی، اور یہ بھی کہ تبدیلی نمایاں نہیں۔ بات حادثات کی بھی ہوئی اور ذکر خود کشیوں کا بھی ہوا، ان کاموں کی روک تھام کیسے ہو سکتی ہے، انہیں کم کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ایک صحافی بھائی نے بتایا کہ بہاولپور میں ایک عرصہ سے خود کشی کے لئے کالا پتھر استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ عام دکانوں پر بھی دستیاب ہے، اس لئے سادہ اور عام لوگ بھی یہ خرید لیتے ہیں، اور اسے زندگی کے خاتمے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے تیزاب کے بھی سرعام فروخت ہونے پر اعتراض کیا۔

صحافیوں کو بتایا گیا کہ بہاول پور ریجن میں پولیس اصلاحات کے ذریعے جرائم میں کمی واقع ہوئی ہے، خاتے کا خواب ابھی ادھورا ہے، کیونکہ ایکٹ عرصہ سے بگڑے ہوئے نظام کو تبدیل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ تبدیلی کی راہ میں اس وقت اور بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں، جب اصلاح کنندگان بھی اپنی اصلاح نہ کرنا چاہتے ہوں، اور یہ بھی کہ ریجن یا علاقے سے باہر کی پولیس اپنی ڈگر پر چل رہی ہو، ایسے میں کسی ایکٹ ریجن میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ آرپی او نے بہاولپور کے تھانوں میں وی آر اوز کا تقرر کر رکھا ہے، یہ پولیس آفیسر تھانے میں عام سائل کے چھوٹے موٹے مسائل موقع پر ہی حل کرتے ہیں، جو مقدمات درج کرنے کے قابل ہوتے ہیں اس میں سائل کی مدد کرتے ہیں، اس عمل سے بھی عوام کو کافی سہولت میسر آئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ پولیس کے بارے میں شکایات کا ازالہ کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ پہلے سے زیادہ درخواستیں آئی ہیں، اس کی وجہ یہ دلیل دی گئی کہ لوگوں کو ریپانس ملتا ہے، جس کی وجہ سے ان کا ہمارے دفتر پر اعتماد میں اضافہ ہوا ہے، اور وہ پہلے سے زیادہ حوصلہ مندی سے درخواستیں دیتے ہیں، ہم ان درخواستوں پر تحقیقات کرواتے ہیں۔ ہمارے پاس ان افسران کا ریکارڈ موجود ہے، جن کے خلاف درخواستیں آتی ہیں، کس کے خلاف کتنی اور کس نوعیت کی درخواستیں ہیں، اس سے ہم ان کا تبادلہ کرتے ہیں، پھر بھی خرابی پر مُصر رہنے والوں کی فہرستیں بنائی جا رہی ہیں، جن کو ملازمت سے فارغ کر دیا جائے گا۔ پولیس کو بااخلاق

بنانے اور اس کی اصلاح کے لئے سیمینارز کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ تبدیلی کی رفتار ست ہی سہی، سفر جاری ضرور ہے۔

پولیس کے محکمہ کو کرپشن اور ظلم و زیادتی وغیرہ میں سرفہرست قرار دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اگر کسی ایکٹ ریجن کا آرپی او تبدیلی کے لئے کوشاں ہے تو یہ کام ہر ریجن میں نہیں ہوتا، کسی بھی ادارہ کی کارکردگی کا بہت سا انحصار اس کے سربراہ پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تبدیلی عارضی ثابت ہوتی ہے، ایکٹ سربراہ کے جانے کے بعد دوسرے نے اپنی مرضی سے کام چلانا ہوتا ہے۔ اجتماعی اور نمایاں تبدیلی تو اس وقت آسکتی ہے جب پورے صوبے میں ایکٹ بہتری کا ایکٹ ہی فارمولا ترتیب دیا جائے۔ پولیس کے رویوں اور معاملات میں بہتری کے امکانات تو زیادہ نہیں، کیونکہ ایکٹ تو خود محکمہ کا سانچہ ہی ایسا بن چکا ہے، دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ معاشرہ بھی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر خود کشیوں کی بات ہوتی ہے تو کیا کالا پتھر اور تیزاب پر پابندی لگانے سے خود کشیاں ختم ہو جائیں گی، کیا ٹرین بھی بند کر دی جائے گی؟ رسیوں کی خرید و فروخت بھی ختم ہو جائے گی؟ تمام زہریلی ادویات اور سپرے بھی غائب کر دی جائے گی؟ ضرورت تو خود کشی روکنے کی ہے، سبب معاشرتی ناہمواریاں ہیں، اس کی روک تھام حکومت اور معاشرے کا کام ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ حادثاتی موت ہے، گھر والے خود اپنے دس بارہ برس کے بچے کو موٹر سائیکل حتیٰ کہ گاڑی

بھی چلانے کے لئے دے دیتے ہیں، اس پر فخر بھی کرتے ہیں، مگر حادثے کی صورت
میں رونا پڑتا ہے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح کی بھی سخت ضرورت
ہے۔

مسئلہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا

بینک یکم رمضان المبارک کو بھی کھلے ہوتے ہیں، مگر اس روز لین دین نہیں کرتے۔ گویا صارفین کے لئے بینک بند رہتا ہے۔ اس روز بینک والے بہت ہی نیک کام کرتے ہیں، نیکی کے موسم بہار کے مہینے کے پہلے ہی روز اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ کی کسوتی ہوتی ہے۔ اس روز جس صارف کے 35 ہزار 550 روپے سے زائد بینک میں رکھے ہوں تو اس سے ڈھائی فیصد زکوٰۃ کاٹی جائے گی، صارف کو گھر بیٹھے ثواب دارین حاصل ہو جائے گا۔ مگر اپنے ہاں بد قسمتی یہ ہوتی ہے کہ یا ر لوگ ثواب بھی ایسا ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں، جس پر کوئی خرچ نہ اٹھے، بس کچھ تسبیحات پڑھنے سے اور کچھ نماز وغیرہ کے ذریعے نیکیوں کا بندوبست ہو جائے۔ رمضان المبارک میں نیکیوں کے اور بھی بہت سے بندوبست اللہ تعالیٰ نے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک یا دو روز قبل بہت سے لوگ بینکوں سے اپنے پیسے نکلوا لیتے ہیں، تاکہ وہ زکوٰۃ کی کسوتی گرفت میں نہ آسکیں، اور اگلے ہی روز رقم دوبارہ جمع کروادی جاتی ہے۔ بینکوں نے بھی صارفین کی مشکل مزید یوں آسان کر دی ہے کہ وہ صارف کو چیک نما رسید دے دیتے ہیں، جس کی بنا پر انہیں رقم نکلوانے کا تکلف بھی نہیں کرنا پڑتا، بس زکوٰۃ کسوتی سے اگلی ہی صبح آکر رقم کو دوبارہ اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

جب ہر مسلمان کو یہ یقین ہے کہ رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار ہے، ہر نیکی کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے، تو پھر وہ اس نیکی سے کیوں بھاگتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہر مسلمان کا یہ ایمان بھی ہے کہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں زکوٰۃ بھی ایک رکن ہے تو اس کے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا، تو پھر لوگ ڈنڈی کیوں مارتے ہیں۔ اس سوال کے کئی جواب ہیں، لوگ تو سب سے پہلی اور اہم دلیل یہ دیتے ہیں کہ حکومت کے معاملات چونکہ مشکوک ہوتے ہیں، حکومت کی کارکردگی پر عوام کو اعتماد نہیں، دنیا داری تو چلتی رہتی ہے، مگر جب معاملہ مذہب کا آجائے تو پھر احتیاط سے کام کرنا چاہیے، کہ ان کی زکوٰۃ کی مد میں دی ہوئی رقم کسی اور کام میں تو استعمال نہیں ہو گئی۔ جب لوگ ان محکموں کی طرف دیکھتے ہیں، جو زکوٰۃ کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں، اس میں اقربا پروری کا عمل دخل بھی ہوتا ہے، پسند نا پسند کا معاملہ بھی اور کسی حد تک کرپشن کے امکانات بھی، تو لوگ حکومت کے اداروں پر اعتماد کرنے کی بجائے خود اپنے ہاتھ سے زکوٰۃ دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو حقیقی معانوں میں اپنے ہاتھ سے ہی زکوٰۃ اور صدقات دینے کو اصل جانتے ہیں، اس کے بغیر ان کے خیال میں یہ چیزیں قبولیت کی منزل کو نہیں پہنچتیں۔ بینکوں سے رقوم نکلوانے والوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جو زکوٰۃ دیتے ہی نہیں، وہ صرف اس لئے اپنی رقوم نکلواتے ہیں کہ ان کے مال میں کمی واقع نہ ہو۔

رب العالمین نے زکوٰۃ کو مسلمانوں کے ایمان کا حصہ کیوں بنایا؟ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین اور کئے ہوئے فیصلے انسانی عقل سے مطابقت نہ بھی رکھتے ہوں تو مسلمانوں کا غیب پر ایمان بھی ضروری ہے۔ مگر زکوٰۃ کے بارے میں بات تو سیدھی سادی اور واضح ہے، یہ ان امیر لوگوں سے وصول کی جاتی ہے، جن کے پاس دولت ضرورت سے کافی زیادہ ہوتی ہے۔ عام آدمی جو اپنی ضروریات زندگی درمیانے درجے تک بھی پوری کر رہا ہے، اس سے زکوٰۃ کا حصہ وصول نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے زکوٰۃ کا نصاب قائم کر رکھا ہے، نہ اس سلسلے میں کوئی ابہام ہے نہ خفیہ اور پوشیدہ معاملہ۔ مگر لوگ اپنی کم فہمی اور لالچ کی بنا پر یہ خیال کرتے ہیں، کہ زکوٰۃ دینے سے ان کی دولت میں کمی آجائے گی۔ یہ تنخیل اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ہی خلاف ہے، اللہ تعالیٰ اپنے دیئے ہوئے رزق میں سے ہی آگے تقسیم کرنے کا فارمولا بتاتا اور اس پر عمل درآمد دیکھنا چاہتا ہے۔ سرکاری طور پر وصول کی جانے والی زکوٰۃ کو تو لوگ ٹیکس ہی تصور کرتے ہیں اور ٹیکس کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ حکومت کی عیاشیوں اور مراعات کے لئے ہی نچوڑا جاتا ہے۔ ٹیکس دینے میں بھی قوم کو اسی لئے پریشانی ہوتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت عوام پر اپنا اعتماد بحال کرے، جس مد میں بھی حکومت رقم وصولیتی ہے، عوام اسی پر شک کرتے ہیں۔ اگر لوگ بینکوں سے رقم نکلاتے ہیں تو ان کا فرض ہے وہ دل کے اطمینان سے زکوٰۃ ادا ضرور

کرے، یہ انسان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہے۔

!ایک چاند اور منافع خوری

چاند دیکھنا بھی کیسا دلکش عمل ہوتا تھا، گاؤں کی کھلی جگہ پر لوگ جمع ہو جاتے تھے، خواتین اور بچے کچے کچے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ جایا کرتی تھیں۔ چاند نظر آ جانے کی صورت میں مبارکبادی کا شور اٹھتا تھا اور نظر نہ آنے پر ایک خاموشی ہوتی یا پھر کچھ سرگوشیاں، رمضان المبارک یا عید کو ایک دن کے لئے ملتوی کر دیا جاتا تھا۔ ہر شہر ہر گاؤں میں لوگ چاند دیکھ کر مذہبی ایام و شعار کا اہتمام کرتے تھے، ایک سے زیادہ عیدیں اور دیگر مذہبی تہوار ہوتے تھے، کہ کہیں چاند دکھائی دے دیا کہیں ایسا نہ ہو سکا۔ پھر حکومت نے ایک عدد رویت ہلال کمیٹی بنادی، عوام کی وہ چاند دیکھنے کی صدیوں کی روایت ”رویت کمیٹی“ نے چھین لی، بس کمیٹی چاند دیکھے گی اور ہم روزہ رکھ لیں گے، وہ کہے گی تو عید پڑھ لیں گے۔ یہی ہوتا رہا، کمیٹی دور بین لگا کر چاند دیکھتی، پھر اس کا اجلاس ہوتا، طویل کاروائی ہوتی اور رات گئے اعلان کیا جاتا۔ بات پھر بھی نہ بن سکی، کمیٹی پر بھی کچھ لوگ راضی نہ ہوئے۔ پشاور اور فانا کے علاقوں میں ایک یا دو روز قبل ہی عید ہو جاتی، کمیٹی کا وجود تو قائم تھا مگر وہ اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

گزشتہ دنوں مذہبی امور کے وفاقی وزیر وزیر پشاور تشریف لے گئے، مقصد یہ تھا کہ پاکستان بھر میں ایک دن ہی رمضان المبارک شروع ہو اور ایک دن ہی عید ہو، اس سلسلہ میں مسجد قاسم خان کے خطیب مفتی شہاب الدین پوپلنرئی سے ملاقات کی جانی بھی مقصود تھی، کیونکہ یہی وہ مفتی صاحب ہیں جو ہر سال اپنا الگ چاند دیکھتے اور ایک روز قبل ہی روزہ اور عید کا اہتمام کرتے ہیں۔ ملاقات تو ہو گئی، مگر ثمر آور ثابت نہ ہو سکی، مفتی صاحب کا یہی جواب تھا کہ اگر مجھے کوئی شہادت ملی تو میں اس کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہوں گا۔ وزیر صاحب امید و بیم کی صورت میں واپس آئے۔ چند ہی روز بعد رمضان المبارک کا چاند دیکھنے کا موقع آ گیا۔ قوم نے یہ خوشخبری بھی سن لی کہ مفتی صاحب نے ایک روز پہلے اپنی شہادتیں اکٹھی کرنے کے لئے اجلاس ہی طلب نہ کیا۔ یوں پاکستانیوں کو ایک دن رمضان المبارک کا آغاز کرنے کا موقع میسر آ گیا، امید ہے عید پر بھی یہی اظہارِ بیچختی ہوگا اور آنے والے دیگر چاند بھی مل جل کر ہی دیکھے جائیں گے۔

رمضان المبارک کی آمد سے قبل جہاں چاند کو دیکھنے کے مراحل ہوتے ہیں، وہاں اور بھی بہت سی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ رمضان المبارک نیکیوں کا موسم بہار ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر خاص نظر کرم فرماتا ہے، قرآن پاک بھی اسی مہینے نازل ہوا، شبِ قدر بھی اسی میں ہے، اور نیکیوں

کا اجر بھی حد و حساب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لوگ تراویح میں قیام کرتے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور عبادات میں رات دن گزارتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کر کے افطاریاں کروانے بھی نیکی کمائی جاتی ہے۔ جب اجر و ثواب کی حد و حساب نہیں ہوتی، تو اپنا تاجر طبقہ بھی ایکشن میں آ جاتا ہے، اس کا فارمولا بھی یہی ہے کہ اگر نیکیوں کے اجر میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے تو کیوں نہ اشیائے ضرورت کی قیمت میں بھی بے حساب اضافہ کر دیا جائے؟ یہی ہوتا ہے، جوتی کپڑے سے لے کر خواتین کے بناؤ سنگھار تک، آلو پیاز سے لے کر آم اور سیب تک، ہر چیز کی قیمت میں من مانا اضافہ کیا جاتا ہے۔ تصور کیا جاتا ہے کہ سال بھر کی آمدنی اسی ماہِ مبارک میں ہی وصول کی جانی ہے۔ تمام تر نیکیوں اور منافعوں کے باوجود معاشرے میں ایک بڑا تضاد پایا جاتا ہے، یہی نیکیاں سمیٹنے والے تاجر جب اپنی دکان پر بیٹھے ہوتے ہیں تو ناجائز منافع کے حصول کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو عمرے کرتے اور روزے حرمین شریفین میں رکھتے ہیں، بڑی بڑی افطاریاں کرتے ہیں، ادارے اور کمپنیاں بڑے ہوٹلوں میں مہنگی افطاریوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان کی نگاہ ذخیرہ اندوزی یا ناجائز منافع خوری پر نہیں ہوتی، وہ اپنی نیکیوں پر فخر کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ عوام کی ضرورت کی چیزوں کی قیمت کم کر کے ثواب حاصل نہیں کرتے، بلکہ زیادہ قیمت وصول کر کے

عمرے کے ذریعے ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں، جس میں کسی دوسرے کا کوئی فائدہ نہیں
ہوتا۔ کاش ہمارا یہ طبقہ رمضان میں ہر چیز کا منافع عام دنوں سے بھی کم کر کے اور عوام
کو ریلیف دینے کا اہتمام کر کے ثواب دارین کا حقدار قرار پائے، نہ کہ لوٹ مار کے
ذریعے اللہ اور عوام کے ہاں گرفت میں آئے۔

! دل، خط اور سڑکیں

میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک وزیراعظم میاں نواز شریف زیر علاج ہیں، اُن سے متعلق کوئی کالم نہ لکھوں گا۔ اب بھی کئی روز اور گزر جاتے، مگر ہوا یہ کہ اب ایک تو وہ اپنے گھر منتقل ہو چکے ہیں، دوسرا یہ کہ ان کے متعلق ”کالمناہ“ خبریں تسلسل کے ساتھ آرہی ہیں، ایسے میں اپنا خاموش رہنا کافی مشکل تھا۔ وزیراعظم کے برادرِ خورد وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف بھی چونکہ اپنے بڑے بھائی کی عیادت کے لئے لندن میں موجود ہیں اور وہیں سے اپنے صوبے کا نظم و نسق بذریعہ ویڈیو کانفرنس چلا رہے ہیں، انہوں نے ایسے ہی ایک پروگرام میں بتایا ہے کہ ”وزیراعظم کے سینے میں 20 سال کا دل آگیا ہے۔“۔ وزیراعلیٰ کے اس بیان کے بعد اب معاملات کافی تبدیل ہو جائیں گے، بلکہ اس عمل سے بہت سے مسائل پیدا ہونے کا خدشہ بھی ہے۔ اب اگر وزیراعظم بیس سالہ دل کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کریں گے تو حالات کیا ہوں گے؟ اس سے قبل کہ نواز شریف بہت سے مسائل کا شکار ہوں، وہ ہمت کر کے دل کی بجائے دماغ سے کام لیں تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ دل کے علاوہ ان کے جسم کے دیگر اعضاء ایک ہی عمر کے ہیں۔ وزیراعظم کے بھائی اور ان کے دیگر مشیر تو دل کی جوانی کی بات کریں گے، ان تمام لوگوں کو بھی ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ اس عمر میں بیس سالہ دل کی بات سن یا مان کر

انجام کیا ہوگا۔ مشیروں سے درخواست ہے کہ وہ بھی ذرا ہاتھ ہولار کھیں، تاکہ تیس سالہ دل اور اڑسٹھ سالہ جسم کا آپس میں ٹکراؤ ہی نہ ہو جائے۔

ادھر خبر آئی ہے کہ عوام دوست وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے تمام وزرائے اعلیٰ کو خط ارسال کئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ صوبائی حکومتیں اپنے اپنے ضلع میں اشیائے خورد و نوش اور دیگر چیزوں کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافے کو روکنے کا بندوبست کریں۔ رمضان المبارک میں قیمتوں کو مناسب سطح پر رکھنے کے لئے اقدامات کریں۔ امید ہے یہ خطوط وزرائے اعلیٰ کو موصول ہو چکے ہوں گے، اور وہ بھی پہلی ہی فرصت میں وفاقی حکومت کے ان احکامات کو عملی جامہ پہنا کر اشیائے خورد و نوش اور اشیائے صرف کی قیمتوں کو کم کر دیں گے۔ تاہم اپنے وزیر اعلیٰ چونکہ برطانیہ میں ہیں اس لئے یہ خط یقیناً انہیں نہیں ملا ہوگا، مگر جب وہ ویڈیولنک کے ذریعے احکامات جاری کرتے ہیں تو یہاں والی انتظامیہ کا فرض تھا کہ وہ خط میاں صاحب تک پہنچا دیا جاتا۔ خیر وزیر اعلیٰ ایسے خطوط کے محتاج نہیں، وہ خود بھی اس قسم کے معاملات میں کافی سرگرم رہتے ہیں۔ ہر سال کی طرح اب بھی رمضان میں وزراء، مشیروں اور پارلیمانی سیکریٹریوں وغیرہ کی ڈیوٹیاں لگائی جا چکی ہوں گی، یہ لوگ شہر شہر جائیں گے، ماڈل بازار اور رمضان بازاروں پر چھاپے ماریں گے، اور قیمتوں کو کنٹرول رکھنے کی اپنی سی کوششیں کریں گے، حکومتی انداز کے مطابق وہ ایسے بازاروں پر اظہارِ اطمینان

کریں گے۔ قوم چیختی رہے گی کہ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی ہر چیز کی قیمت میں اضافہ کر دیا گیا ہے، مگر حکومتی نمائندے اپنے قول پر مُصر رہیں گے کہ رمضان بازاروں میں یہ چیزیں کنٹرول ریٹ پر فروخت ہو رہی ہیں۔ دونوں فریق اپنی جگہ سچے ہیں، دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کتنے فیصد لوگ ان رمضان بازاروں تک رسائی رکھتے ہیں اور کتنے عام بازاروں کا رخ کرتے ہیں؟

قیمتوں کو قابو کرنے کے حکومتی عزائم ایک طرف، دوسری طرف یہ خبر بھی آئی ہے کہ ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں نے بھی گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکومت اپنی رٹ قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے، یا ذخیرہ اندوز اور ناجائز منافع خور اپنے مشن میں کامیاب ہوتے ہیں، کہ سال بھر میں رمضان المبارک ہی ان کے لئے ایسا مہینہ ہوتا ہے، جس میں کھل کر لوٹ مار کی جاسکتی ہے۔

ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ ٹی او آر پر بنائی گئی کمیٹی ناکامی کے کنارے تک پہنچ چکی ہے، اپوزیشن کا قول ہے کہ حکومت ایک قدم پیچھے ہے، ہمیں سڑکوں پر آنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ عوامی نمائندوں کی دلچسپی اور سنجیدگی کا عالم یہ ہے کہ اسمبلی کا کورم پورا نہ ہونے پر حکومت کو سُبکی کا سامنا کرنا پڑا اور اپوزیشن لیڈر نے بجٹ پر بحث سے انکار کر دیا۔ ویسے اپوزیشن سڑکوں پر

آنے کا شوق پورا کر لے، کیونکہ وزیراعظم فرما چکے ہیں کہ ”قسمت کی بات ہے، ہم
سڑکیں بناتے ہیں اور ’وہ‘ سڑکوں پر آتے ہیں“۔ نظام ہستی چل رہا ہے، ہر کوئی اپنی
اپنی ڈگر پر قائم ہے۔

! لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی

رمضان المبارک کے اولین لمحات میں جب مغرب کی نماز ادا کی جا رہی تھی تو بجلی غائب ہو گئی، بجلی کے یوں بے وقت جانے پر لوگوں کا فطری طور پر یہی تبصرہ تھا کہ حکومت نے تو رمضان میں بجلی نہ جانے کی خبر دی تھی، اور ہوا یہ ہے کہ بالکل آغاز میں ہی بجلی چلی گئی۔ کافی دیر کے بعد بجلی آئی تو تراویح میں بھی اس نے یہی کام دکھایا، اس کا آنا جانا لگا رہا۔ صبح ابھی سحری جاری ہی تھی کہ معمول کی لوڈ شیڈنگ کا وقت ہو گیا۔ پہلا روزہ بجلی کی آنکھ مچولی میں گزرا، مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد جب کچھ کھانے پینے کا وقت ہوا (کیونکہ افطاری میں تو گرمی کی وجہ سے صرف شربت پینے کا ہی کام ہوتا ہے) تو چولہا منہ چڑھا رہا تھا، نماز عشاء سے قبل ہی گیس داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اس کی ہنگامی لوڈ شیڈنگ تھی، چند منٹ کے لئے وہ پھر واپس آئی اور پھر اگلی صبح تک کے لئے غائب۔

ایک بیان یہاں وزیراعظم کے نام سے بھی منسوب کیا گیا ہے جس میں انہوں نے بجلی کی بلا تعطل فراہمی کا حکم جاری کیا ہے۔ اول تو ضروری نہیں ہوتا کہ پالیسی بیان حکمران کی زبان سے ہی ادا کروایا جائے، مگر کوئی بہت اہم بات

ہو تو ایسا ہو بھی جاتا ہے، اس لئے ایسے بیانات حکمران خود بھی دیتے رہتے ہیں، مگر جب وہ مصروف ہوں یا پھر علیل ہوں تو ان کی جگہ پر ان کے نمائندے یہ بیان جاری کر کے حکمرانوں کے نمبر ٹانگنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بجلی کے دونوں وزیروں نے بھی لوڈ شیڈنگ پر اپنے بیانات ریکارڈ کروا دیئے ہیں، رمضان سے قبل بھی وہ یہی کہتے آئے تھے کہ رمضان میں سحری اور افطاری کے وقت لوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی، یہ کافی محتاط بیان تھا، مگر افسوس کہ وہ اس پر بھی پورے نہیں اتر سکے۔ مگر بیان کی حد تک خواجہ آصف نے کہا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم سحری اور افطاری میں بجلی مہیا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔“ دوسری طرف چھوٹے وزیر عابد شیر علی کا بیان آیا ہے کہ ہم پچاس فیصد علاقوں میں سحر و افطار میں بجلی دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ دونوں وزیروں نے درجہ بدرجہ ہی جھوٹ بولا ہے۔ سیاست میں یہ کام اس قدر تسلسل سے کیا جانا ایک روایت ہے اور یہ روایت جاری ہے۔

قومی اسمبلی میں بھی بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی بازگشت بہت شدت کے ساتھ سنائی دی، یہ دلچسپ جملہ بھی کہا گیا کہ اگر لوڈ شیڈنگ کا یہی عالم رہا تو یہ سلسلہ حسین نواز کے پوتوں تک جاری رہے گا۔ کیا جانئے کہ یہ خدشہ ظاہر کرنے والے معزز ممبر کے ذہن کے گوشے میں یہ خدشہ بھی ہو کہ حسین نواز کا پوتا بھی حکمرانی کے مزے ہی لوٹ رہا ہوگا، اور اُس وقت کی اپوزیشن شاید اسی طرح

احتجاج کر رہی ہوگی۔ مسلم لیگ ان کے رہنماؤں اور کارکنان کے لئے یہ نہایت درجے خوشخبری ہے کہ ان کی پسندیدہ حکومت سالہا سال چلنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، کیونکہ اپوزیشن نے اس کا خود اعتراف کر لیا ہے۔ اگر یہ کام اگلی تین نسلوں تک چلتا رہا تو اس بات کا خدشہ بھی اپنی موت آپ مر جائے گا جس میں پانامہ لیکس وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ تب سب جانتے ہو گئے کہ حسین نواز کا کاروبار تو لندن اور دنیا کے دیگر ممالک میں ہے، مگر وہ اور ان کی اولاد حکومت پاکستان میں کرتی ہے۔ ان کے لئے یہ بھی مناسب ہوگا کہ ”میڈان پاکستان“ کی سٹیپ اپ اپنے ساتھ ہی رکھیں، تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ پاکستان کی بنی ہوئی مصنوعات دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی کارآمد ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حسین نواز کے پوتے باہر اپنا کاروبار کریں اور عشروں بعد آئی ٹی میں اتنی جدت آچکی ہوگی کہ وہ باہر بیٹھ کر ہی ویڈیولنک کے ذریعے پاکستان کا نظام سلطنت سنبھال سکیں گے۔ میاں نواز شریف کو سیاست میں آئے ہوئے تین عشرے مکمل ہو چکے ہیں، اگر نسلوں تک یہ سلسلہ جاری رہا تو کوئی بعید نہیں کہ ان کی اولاد بادشاہت ہی اعلان کر دے، تاہم یہ بہتر ہے کہ بادشاہت پر جمہوریت کا ملمع چڑھا کر عوام کو حسب روایت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ قومی اسمبلی میں دیگر امور کے ساتھ لوڈ شیڈنگ جیسے گھسے ہوئے مگر اہم ایشو پر تقریریں جاری تھیں، ہر کوئی اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا کہ اپوزیشن کے ہی ایک رکن جمشید دستی نے کورم پورانہ ہونے کی نشاندہی کر دی

جس پر اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ خدایا یہ کیسے حکمران ہیں، کہ جن کے ہوتے بھکی اور بجٹ

پر بحث کے باوجود کورم بھی پورا نہیں ہوتا؟

اخبار کے اندرونی صفحہ پر شائع ہونے والی دو کالمی تصویر نے چونکا دیا، ٹوٹی پھوٹی الماریوں میں نہایت بوسیدہ اور بے ترتیب کتابیں پڑی ہیں، اگر ساتھ ہی خبر میں اس تصویر کی وضاحت موجود نہ ہوتی تو بھی یہ کسی کبائٹ خانے کا منظر ہے۔ تاہم خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوٹ سلطان کی پبلک لا بھیری ہے، جو تقریباً دو عشرے قبل ضلع کونسل کی حکومت نے قائم کی تھی، بعد ازاں اس کا کوئی وارث نہ رہا، تو اس لا بھیری کو کبائٹ جانتے ہوئے کسی باختیار افسر کے حکم پر لیہ کے تحصیل آفس پہنچا دیا گیا، اور وہاں اس سے کبائٹ کی رونق بڑھادی گئی۔ اب یہ لا بھیری تو موجود ہے، مگر الماریاں ٹوٹی ہوئی اور کتابیں سالہا سال کی گرد میں اٹی، خستہ اور پھٹی پرانی ہیں۔ اس کبائٹ خانے میں یقیناً بہت ہی کم اہلکاروں کا جانا ہوتا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بہت سی کتابیں چوری ہو چکی ہیں، بہت سی نایاب کتابیں دیمک کا رزق بن چکی ہیں، اور نہ جانے کتنی اہم کتابیں اب بھی بوسیدہ ہو کر مٹی میں مٹی ہونے جا رہی ہیں؟ پبلک لا بھیری ایسے ہی نہیں بنتی، اکیس برس قبل کوئی ایسا افسر ضلع کونسل میں تعینات ہوا ہوگا، جس نے لا بھیری کا تصور پیش کیا ہوگا، یا ممکن ہے کہ صوبہ کی سطح پر چھوٹے شہروں میں پبلک لا بھیریاں بنانے کا حکم ملا ہو۔ عمل تو ہو گیا، مگر اس خزانے کو بچانے کی

کوئی کوشش نہ ہوئی۔ ایسا صرف لائبریریوں کے ساتھ ہی نہیں ہوتا، بلکہ جس افسر کا جو مزاج ہو، اس کے مطابق وہ اپنے زیر کٹرول علاقے میں جو منصوبہ بندی چاہتے ہیں کر دیتے ہیں، اب اس کے بعد آنے والے افسر کی مرضی کہ اس منصوبے کو جاری رکھے یا کباڑ خانے میں پھینک دے۔ عام شہروں میں ایسے بے شمار مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں، کوئی عمارت کھنڈر بنی ہوتی ہے، کوئی پارک ویرانہ بن چکا ہوتا ہے، کوئی انتظار گاہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی ہے۔ کسی نے تصور پیش کیا، اور اپنے تخیل میں رنگ بھر دیا، آنے والے نے اس پر پانی پھیر دیا، کیونکہ اس کا مزاج پہلے سے مختلف تھا۔ یہی کچھ اس لائبریری کے ساتھ ہوا۔

اس لائبریری سے کتابیں چوری ہونا ایک فطری عمل ہے، ”چور“ اس لائبریری کی حالت کو دیکھتے ہوں گے، پھر وہ سوچتے ہوں گے کہ اگر ہم یہاں سے کتاب اٹھاتے ہیں تو یہ چوری ہے، زیادتی ہے، اور اگر نہیں اٹھاتے تو یہ کتابیں ضائع ہو جائیں گی، دیمک کھا جائے گی، اور بوسیدہ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گی۔ چوروں نے جو فیصلہ کیا، اس کے بارے میں تو عدالت ہی درست فیصلہ کر سکتی ہے، کہ وہ کتابوں کو دیمک کا رزق بننے کے لئے چھوڑ دیتے، یا پھر انہوں نے جو اقدام کیا وہ صحیح تھا؟ مگر عدالت تک بات کہاں جائے گی، اگر کسی ایسے کتاب چور نے کتاب چرا کر جرم کیا تو ان لوگوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا، جن کے ذمے اس لائبریری کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری تھی،

انہوں نے اس کو کیوں لاوارث چھوڑ دیا، کیوں اس کی حفاظت نہیں کی؟ دراصل کتاب دوستی یا کتاب شناسی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ بہت بڑی، بڑی لائبریریوں کے سربراہ بھی ایسے ہیں جو کتاب سے دوستی یا محبت کی تہمت سے آزاد ہیں، انہیں لکھنے کی بات تو بہت دور، کتاب پڑھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی، بس، برسا برس وہ ملازمت کے چکر میں لائبریریوں کے انچارج بنے بیٹھے ہیں، یوں جانے کہ وہ محض انتظامی افسران کھلا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم ایسے لائبریرین موجود ہیں، جو خود بھی پڑھنے لکھنے والے لوگ ہیں (یا تھے)، ورنہ تو بس ملازمت کے تقاضے نبھائے جا رہے ہیں۔

یہ تو بڑی اور باقاعدہ لائبریریوں کا معاملہ ہے، مگر یہ چھوٹے قصبوں یا ٹاؤنز میں یا پھر مختلف زونز میں پبلک لائبریریوں کی حالت کوٹ سلطان والی لائبریری سے قطعاً مختلف نہیں۔ حکومت ایسی سیکمیں تیار کرتی ہے اور عمل کروانے کے لئے افراد اور افسران کی دلچسپی صفر ہوتی ہے۔ لائبریری سے دلچسپی لینے والے افراد کی تعداد اپنے معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، تو پھر کیسے ان کو سنبھالا جاسکتا ہے، کون ان کی حفاظت کرے گا۔ یہاں تو بڑی لائبریریوں سے چھوٹے بڑے بیورو کریٹ کتابیں لے جاتے ہیں اور لے جاتے ہوئے بھی ان کا واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، یہ رویہ بھی کتاب دشمنی ہی کہلائے گا، کہ جو چیز آپ کو پسند ہے وہ اٹھا لیں، حالانکہ وہ پبلک پراپرٹی

ہوتی ہے، اس پر سب کا حق ہوتا ہے۔ کوٹ سلطان کی اس چھوٹی سی لائبریری کا نوحہ کیا
پڑھنا کہ یہ عمل تو بااختیار لوگوں کی ترجیح میں ہی شامل نہیں۔

! جامعات بمقابلہ پرائمری سکول

اس چوک پر بنائی گئی نئی یادگار بہت دنوں سے پردے میں تھی، پردہ ہٹے گا تو کیا منظر سامنے ہوگا، آنے جانے والے اس کے منتظر تھے، گزشتہ دنوں آخر کار پردہ ہٹا دیا گیا۔ پردہ ہٹا تو لوگوں نے عجیب منظر دیکھا، سٹیل کی بنی ہوئی ایک بہت وزنی بے ترتیب سی کوئی چیز ایستادہ ہے، مگر جب اس کو ایک خاص زاویے سے دیکھا جائے تو آرٹ کا یہ نمونہ دل میں اتر جاتا ہے، یہ ایک بڑے سائز کی زینب ہے، جس کے ساتھ کتاب کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ اس کے افتتاح کی اہم تقریب کے لئے وفاقی وزیر مملکت، برائے تعلیم میاں بلخ الرحمن، اسلامیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر قیصر مشتاق، کمشنر بہاول پور شاقب ظفر، آرپی او ڈاکٹر احسان صادق اور بہت سے لوگ موجود تھے۔ اس چوک سے چھوٹی بڑی پانچ سڑکیں نکلتی ہیں، چوک کے اوپر ہی اسلامیہ یونیورسٹی کا اولڈ کیمپس ہے، اسی حوالے سے یہ چوک ”یونیورسٹی چوک“ کہلاتا ہے، اسی چوک پر ڈیوٹرین بھر کا سب سے بڑا کالج، ’ایس ای کالج‘ ہے۔ تقریباً نصف کلومیٹر پر خواتین یونیورسٹی ہے، تقریباً اتنے ہی فاصلے پر لڑکیوں کے دو ہائی سکول ہیں، خواتین کا ایک ٹیکنیکل ادارہ اور لڑکوں کے دو ہائی سکول بھی اس چوک سے تقریباً ایک کلومیٹر کے اندر موجود ہیں۔ گویا اس چوک کو ہر لحاظ سے تعلیمی اداروں سے منسلک چوک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی

مناسبت سے اسلامیہ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اس چوک کو یادگار بنانے کے لئے اقدام کا فیصلہ کیا، اس سے قبل چوک پر ضلعی انتظامیہ کی طرف سے کبھی فوارہ لگا دیا جاتا، جو کہ کچھ عرصہ چلنے کے بعد محض ایک رکاوٹ کا کام دیتا کہ جس کے ارد گرد ٹریفک کو اپنی اپنی سڑک کا راستہ مل سکے۔ یونیورسٹی کے کالج آف آرٹ نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور نہایت محنت سے ایک یادگار قائم کر دی، اس کے لئے مشاورت، محنت، تکنیک اور سرمایہ سمیت جو کام یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء نے کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ گویا قلم اور کتاب کی یہ یادگار اسی چوک کے لائق تھی۔

اس موقع پر منعقد کی جانے والی تقریب میں وفاقی وزیر مملکت نے اپنے خطاب میں بڑی ہی دلجمعی کے ساتھ جامعات کی بات کی، انہوں نے پہلے تو اس یادگار کے تصور کو سراہا، اور اسے عالمی سطح کی یادگار قرار دیا، اس تصور پر کام کرنے والوں کو خصوصی شاباش دی۔ پھر یونیورسٹیوں کے ماحول کی یوں منظر کشی کی کہ ایک خوبصورت تصور آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ ”عالیشان عمارت ہو، دورویہ سڑکیں ہوں، سڑکوں کے کناروں پر درخت ہوں، درختوں کے نیچے بیچ رکھے ہوں، اطراف میں جمیل ہو، لائبریریاں ہوں اور قلم کتاب کا رشتہ جڑا رہے...“۔ انہوں نے یہ ’خوشخبری‘ بھی سنائی کہ پاکستان کی جامعات عالمی معیار پر بس پورا اترنے کو ہی ہیں۔ وزیر موصوف کے خطاب کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ

انہوں نے اس موقع پر اپنے سیاسی قائدین کا ذکر نہیں کیا، صرف تعلیمی اور ادارے کی بات کی، ورنہ یہ لوگ تو کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو میاں، برادران کے ذکر کے بغیر ان کی بات پوری نہیں ہوتی۔

جامعات کی نقشہ کشی کا حسین تصور لے کر جب میں تقریب کے بعد واپس جا رہا تھا تو میرے ذہن میں پرائمری سکولوں کا منظر گھوم رہا تھا۔ تضاد کی انتہا ملاحظہ فرمائیں کہ تعلیم کا اہم ترین سفر کتنا عجیب ہے کہ بچہ جب گھر سے نکل کر سکول جاتا ہے، تو اسے کس قسم کے ماحول اور مناظر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دیہات میں پرائمری سکولوں کے حالات کس سے پوشیدہ ہیں۔ اب نجی سکولوں نے ماحول کچھ بدل دیا ہے۔ مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ جس معصوم بچے کا دل بہلانے کے لئے خوبصورت ماحول دیا جانا ضروری ہے، وہ نہیں دیا جاتا، حکومت کو اس بات کا پورا ادراک بھی ہے۔ گزشتہ برسوں میں سکولوں میں ”کڈز رومز“ بھی بنائے گئے تھے۔ مگر یہ کام ہزاروں میں سے چند سکولوں میں ہوا۔ بعد میں وہاں بھی توجہ نہ دی گئی۔ مگر جب عام بچے اپنی اچھی قسمت کی بنا پر پڑھ لکھ کر یونیورسٹی تک پہنچ جائیں تو انہیں بالکل مختلف ماحول دستیاب ہوتا ہے۔ تعلیم کے وزیر مملکت کو چاہیے کہ وہ اس بات پر بھی غور فرمائیں، اچھا باغ اگانے کے لئے معیاری نرسری کی ضرورت ہوتی ہے، خود رو پودوں میں سے چند پودے چن کر باغ نہیں لگائے جاتے۔ جناب! جو منظر کشی آپ نے جامعات کے لئے کی

ہے، کاش پرائمری تعلیم کے لئے بھی کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سکولوں میں طلبہ کی
حاضری میں واضح بہتری نہ آئے اور جو کروڑوں بچے سکولوں سے باہر ہیں، وہ بھی
سکولوں میں داخل ہو سکتے ہیں، ضرورت عمل کی ہے۔

احترام خواتین؟

بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ! پاکستان کی دواہم ترین وزارتوں کے قلمدان سنبھالنے والے خواجہ آصف کے بیانات تو آئے روز زیر بحث آتے رہتے ہیں، گزشتہ دنوں موصوف نے اسمبلی میں تحریک انصاف کی رکن قومی اسمبلی شیریں مزاری کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے تو فطری طور پر ہنگامہ سا مچ گیا۔ واک آؤٹ ہوا، احتجاج ہوا اور کہا جاتا ہے کہ وزیر صاحب نے اپنے الفاظ پر تحریری اور زبانی معافی مانگ لی۔ دوسری طرف سپیکر نے یہ الفاظ کاروائی سے حذف کروا دیئے، گویا کسی خاتون کو ٹریکٹر ٹرالی کہنا یقیناً تضحیک کی ذیل میں آتا تھا تو الفاظ کو حذف کیا گیا۔ شیریں مزاری اور ان کی پارٹی نے تحریری اور زبانی معافی مسترد کرتے ہوئے تحریک استحقاق اسمبلی میں جمع کروادی اور مطالبہ کیا کہ معافی اسمبلی میں آکر مانگی جائے۔ فی الحال اس بات کا امکان کم ہی ہے، کہ ان کے بارے میں یہ خبر بھی آئی ہے کہ وہ لندن جا رہے ہیں، جہاں وہ اپنے قائد کی عیادت کا فریضہ نبھائیں گے اور وزیراعظم کو ملکی حالات پر بریفنگ بھی دیں گے۔ جب تک ان کی واپسی ہوگی، تو یہ ہنگامی معاملہ دیگر اہم ہنگامی معاملات کی اوٹ میں چھپ چکا ہوگا۔

خواجہ آصف کے بیان پر بات ختم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے، یا اسے بڑھایا جا رہا ہے۔ اب بجلی کے چھوٹے وزیر عابد شیر علی بھی اپنے بڑے وزیر کی حمایت میں میدان میں اتر آئے ہیں، ان کا کہنا کہ ”ٹریڈر ٹرالی ٹریڈر ٹرالی ہوتی ہے، خواہ وہ پارلیمنٹ کے اندر ہو یا باہر، خواجہ آصف کا بڑا پین ہے کہ انہوں نے ارکان سے معافی مانگ لی، عمران خان نے کنٹینر پر کھڑے ہو کر اس سے بھی زیادہ گندی سیاست کی ..“ کیا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ بیان ایکٹ معزز وزیر کا ہے، جو پاکستان کے سب سے زیادہ بحران میں اچھے محکمے کا وزیر ہے؟ ٹریڈر ٹرالی تو واقعی ٹریڈر ٹرالی ہی ہوتی ہے، مگر موصوف بتا سکتے ہیں کہ اس کا پارلیمنٹ کے اندر کیا کام؟ معافی مانگنا تو خواجہ آصف کا بڑا پین ہے، مگر جو بات انہوں نے کی وہ کس زمرے میں آئے گی؟ عابد شیر علی کا یہ جملہ بھی معافی خیز ہے کہ ”عمران خان نے ... اس سے بھی گندی سیاست کی“۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جو سیاست یا بیان بازی کر رہے ہیں یہ ”گندی“ ہے۔ گویا گندی سیاست رو بہ عمل ہے، اس میں مقابلہ بھی ایکٹ دوسرے سے آگے نکلنے کا ہے؟ حکومتی جماعت حقوق نسواں کی دعویدار ہے، اس سلسلے میں قانون سازی بھی ہو رہی ہے، اور بڑھ چڑھ کر وکالت بھی کی جا رہی ہے، خواتین کے حقوق کے لئے اشتہارات بھی شائع کروائے جا رہے ہیں، مگر ستم ملاحظہ ہو کہ عملی مظاہرہ اس کے برعکس ہے، خواتین کو میدانِ عمل میں لانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ خواتین کو ہر کوئی احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، تاہم میدان میں آنے

والی دوسروں کی خواتین کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، وہ قابلِ افسوس ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اپنے ہاں خواتین کی تضحیک صرف مخالف خواتین کی کی جاتی ہے۔ خواتین قابلِ احترام ہیں، خواہ وہ مخالف پارٹی کی ہوں یا اپنی جماعت کی۔ ہمارے اکثر سیاستدانوں کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ٹھٹھہ مذاق کے عادی ہیں، احترام کیا چیز ہے، وہ اس سے آگاہ ہی نہیں۔ یہ ایک رویہ ہے، اور ایسے رویے کے حامل افراد کیا تبدیلی لاسکتے ہیں؟ جو لوگ دوسری خواتین کا احترام نہیں کر سکتے وہ ان کے بارے میں جو قانون سازی کریں گے یا کر رہے ہیں وہ کتنی اثر انداز ہوگی؟ اس پر کس قدر عمل کیا جاسکے گا؟ یقیناً ایسے قوانین پر عمل کرنے کے لئے سنجیدگی اور وقار کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ ہمارے پاس ہے نہیں۔ ایک غلط بات کر کے اس کو معذرت کے ذریعے ختم کرنے کی بجائے مزید تاویلات بلکہ غیر سنجیدہ مذاق کیا جا رہا ہے۔ اس عمل کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ جب کسی کی عزت اچھالی جائے گی تو وہ بھی عزت اچھالنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے گا، اس کے بعد کیا ہوگا؟ پہلے تو سیاست میں ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے کا دھندہ ہو رہا ہے، اب خواتین کی تضحیک کا کام بھی شروع ہو گیا ہے، کیا بڑے چھوٹے وزیر اس کے انجام سے باخبر ہیں؟ یہ معاملہ کسی ایک پارٹی کا بھی نہیں، تمام معزز ممبران پارلیمنٹ کو خلوص کے

ساتھ خواتین کے بارے میں قانون سہاری کرتے وقت ان کا احترام بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

یہ تو طے ہے کہ رمضان المبارک میں دو قسم کے لوگ اپنے عمل میں بہت آگے چلے جاتے ہیں، دونوں کا عمل ایک لحاظ سے ایک جیسا ہی ہے، مگر روح کے حساب سے ایک دوسرے کے متضاد۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو نیکی کے موسم بہار میں خوب نیکیاں کمانا چاہتے ہیں، راتوں کی تراویح، تہجد، تلاوت قرآن پاک اور صدقات و خیرات ان کی مصروفیات ہوتی ہیں، دوسری طرف تاجر طبقہ ہے، کہ رمضان المبارک کے آتے ہی اشیائے خور و نوش کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کر دیتے ہیں، ان کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ ہر چیز میں اسی نسبت سے منافع کمایا جائے جس نسبت سے نیکیوں کے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اتنا اضافہ تو ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا، تاہم اس اضافے کے لئے وہ اپنی پوری توانائیاں بروئے کار لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یہاں ستم یہ بھی ہوتا ہے کہ یہی منافع خور اور ذخیرہ اندوز جب عوام کے جسم سے رہا سہا خون بھی نچوڑ لیتے ہیں تو اسی منافع سے عمرہ کی ادائیگی کرتے، خیرات کا اہتمام کرتے اور ثواب دارین کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

عمرہ کرنے کے لئے چار قسم کے لوگ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں، ایک قسم ان لوگوں کی ہے، جو زندگی بھر اللہ کا گھر دیکھنے کی تمنا دل میں پالتے ہیں، مگر

اتنی پونجی نہیں ہوتی کہ اس قدر اخراجات کر کے وہ اپنی آرزوؤں میں رنگ بھر سکیں،
 اپنی خواہشوں کی آبیاری کر سکیں۔ مگر پائی پائی جوڑنے کے بعد آخر ایسا وقت آ جاتا ہے
 جب ان کی مرادیں برآتی ہیں، اور انہیں 'بلاوا' آ جاتا ہے، بہت سے غریب لوگ جب
 عمرہ کی سعادت حاصل کر آتے ہیں تو ان کے اس عمل کو ایک انمولی ہی قرار دیا جاتا
 ہے، کہ وسائل کی عدم دستیابی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو حاضری کا موقع دیا۔
 دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو معاشی لحاظ سے درمیانے درجے کے ہیں، بس ایک آدھ
 موقع پا کر حج یا عمرہ کر آتے ہیں، جو ان کے عمر بھر کا اثاثہ ہوتا ہے۔ تیسری قسم ان
 سرمایہ داروں کی ہے جن کے پاس دولت کا کوئی حساب ہی نہیں، وہ کسی بھی صبح فیصلے
 کرتے ہیں کہ شام کو انہوں نے نماز حرمین شریفین میں ادا کرنی ہے، اور ایسا ہی ہوتا
 ہے۔ کراچی کے بہت سے تاجر ہر جمعہ سعودی عرب ہی ادا کرتے ہیں۔ بے شمار لوگ
 ایسے ہی جن کے عمرے شمار کی حدود پار کر چکے ہیں۔ چوتھی قسم کے لوگ بھی ہیں، جو
 نعت خوانی وغیرہ کو اپنا پیشہ بناتے ہیں اور پھر اسی کی برکت سے لوگ انہیں ہاتھوں پر
 اٹھاتے، کندھوں پر بٹھاتے ہیں، اور عمرہ و زہ خرچہ سمیت دیتے اور اسی عمل سے وہ
 خود بھی ثواب دارین کا حصول اپنے لئے ممکن بناتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے عمرے بھی
 سرمایہ داروں کی طرح بس ہاتھ کے اشارے کے فاصلے پر ہوتے ہیں، جب چاہا دوسروں
 کے خرچ پر ہو آئے۔ یہاں ایک اور قسم کے عمرے بھی سامنے آتے ہیں، وہ ہیں سرکاری
 خرچ پر ادا کیا جانے والے عمرے۔ صدر ہوں یا وزیراعظم، یا ان

کے ساتھ جانے والے بہت سے لوگ، یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ قوم کے تحفظات پر اسے بتایا جاتا ہے کہ اس عمرے (یا حج) کے اخراجات صاحب نے اپنی جیب سے ادا کئے ہیں۔ ان کی باتوں پر البتہ یقین کوئی نہیں کرتا۔

جس کے پاس پیسہ ہے وہ عمرہ کرے یا خیرات، اس کی مرضی، مگر اس حقیقت سے آگاہی ہونی چاہیے کہ عمرہ مکمل طور پر ذاتی نیکی ہے، اور صدقہ، خیرات اور دوسروں کی مدد کرنا جہاں ذات کے لئے نیکی کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں، وہاں اس سے خلقِ خدا بھی راضی ہوتی ہے، بنیادی طور پر یہی اصل مدعا ہے۔ مگر اپنے ہاں نیکی میں بھی ذاتی مفاد کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ سعودی مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز آل شیخ نے بھی کہا ہے کہ بار بار ادائیگی سے عمرے کی افادیت ختم یا کم ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ سعودی عرب سے بھی اس قسم کے فیصلوں کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ ایک فرد کو حج یا عمرہ کا کئی سال بعد موقع دیا جائے۔ مگر یہاں جو لوگ خیرات کرتے ہیں، اس کی تفصیل بھی کسی ایسے سے کم نہیں، کہ ایسے موقع پر بھی بھگڈڑ مچ جاتی ہے، بسا اوقات کچھ لوگ مارے بھی جاتے ہیں۔ جب ملک میں غربت کا یہ عالم ہو، تو ایسے میں عمرہ کرتے وقت سوچنا ضرور چاہیے۔ کیا دوسروں کے غم بانٹنے اور ان کو خوشیاں دینے کا زیادہ ثواب ہے، یا اپنی ذات کے لئے عمرہ کرنے کا، وہ بھی اکثر ایسے کہ پیسہ دوسروں کا ہی ہوتا ہے۔

!میڈیا احتیاط کرے

سپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق نے میڈیا کے لئے رولنگ دی ہے کہ ”جو الفاظ اسمبلی کی کاروائی سے حذف کر دیئے جائیں، میڈیا انہیں شائع یا نشر نہ کرے۔۔ میں اپنی ذمہ داری نبھاتا ہوں، میڈیا کو بھی اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔۔“ ایک معزز رکن نے سپیکر کی توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کروائی تھی کہ اسمبلی کی کاروائی سے حذف کئے جانے والے الفاظ میڈیا میں نشر یا شائع ہو جاتے ہیں، اس طرح انہیں کاروائی سے حذف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جس خاتون رکن کے بارے میں وفاقی وزیر خواجہ آصف نے حذف کر دیئے جانے کے قابل الفاظ کہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ اسمبلی کی کاروائی سے بھی وہ الفاظ حذف ہو گئے، میڈیا بھی انہیں قوم کے سامنے نہ لائے، مگر وزراء جو الفاظ سوشل میڈیا پر استعمال کر رہے ہیں، ان کے لئے کون جوابدہ ہے، ان کو پوچھنے والا کون ہے؟ پاکستان کا قانون ساز ادارہ ہونے کے ناطے پارلیمنٹ کے ارکان کا احترام مسلم ہے، ان کے احترام کا یہ فطری تقاضا بھی ہے کہ ان کی سوچ، بصیرت، گفتگو وغیرہ سب کچھ معیاری، سنجیدہ اور باوقار ہو۔

کون نہیں جانتا اپنی اسمبلیوں میں کاروائی کس قسم کی ہوتی ہے، اس میں

سنجیدگی کا کتنا عمل ہوتا ہے، حاضری کی کیا پوزیشن ہوتی ہے، ارکان کی تیاری کا کیا عالم ہوتا ہے، کسی الیٹوپر سوالات کس طرح کے ہوتے ہیں اور ان کے جوابات دینے والے وزیر ام یا دیگر ذمہ داران کے جوابات اور رویے کیسے ہوتے ہیں؟ ملکی مفاد کے بارے میں ان لوگوں کی سوچ کیسی ہے اور اپنے ذاتی مفاد میں وہ کونسے اقدام کرتے ہیں؟ اسمبلیوں میں کس طرح مچھلی بازار سجایا جاتا ہے، کیسے بجٹ یا دیگر مواقع کی کاپیاں اچھالی جاتی ہیں، کیسے سپیکر کا گھیراؤ کیا جاتا ہے، کیسے نعرے لگائے جاتے ہیں، کیسے ٹھٹھ مذاق کیا جاتا ہے، کیسے گپ شپ کا ماحول بنایا جاتا ہے، ابھی گزشتہ روز ہی پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن کی خبر آئی ہے کہ بجٹ کے دوران وزراء گیئیں ہانکتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ اسمبلی میں معزز ارکان کی حاضری کا عالم یہ ہوتا ہے، کہ کورم اکثر ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا ہے، کتنے معزز ارکان ہیں جنہوں نے خاموشی کا طویل روزہ رکھا ہوتا ہے، وزیر اعظم اور بعض سیاسی لیڈر اسمبلی میں چند روز ہی تشریف لے جاتے ہیں۔ اور تو اور ایسا کچھ بھی وہاں بولا جاتا ہے، جس کو کاروائی سے حذف کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ پر معافی مانگنی پڑتی ہے اور الفاظ واپس لینے پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں سپیکر جو ذمہ داری نبھاتے ہیں وہ یہ ہوتی ہے کہ وہ قابل اعتراض الفاظ کاروائی سے حذف کر دیتے ہیں۔

جب میڈیا پر پارلیمنٹ کی کاروائی دیکھی جاتی ہے تو نہایت سنجیدہ ماحول

سامنے آتا ہے، کسی اہم ایڈیٹر پر معزز ارکان کی گفتگو، بحث و مباحثہ اور پھر فیصلے عوام کے سامنے لائے جاتے ہیں، قوم کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے منتخب نمائندوں نے کس قدر عرق ریزی اور محنت کے ساتھ مسائل حل کئے ہیں، عوام کے حقوق کی کتنی جنگ اسمبلی کے ایوانوں میں لڑی ہے۔ یہ میڈیا کی پیشہ ورانہ ضرورت ہے، معاملہ جیسا بھی ہو، اس میں سے سنجیدہ اور مناسب خبر نکالنا میڈیا کا کام ہے، کس رکن کی بات کو خبر کی شہ سرخی بنانا ہے، کس مطالبے کو اہمیت دینی ہے، کس کی بات کا انچوڑ نکال کر میڈیا میں پیش کرنا ہے، یہ ساری مہارتیں صحافیوں کے حصے میں آتی ہیں۔ ادارے بھی اپنے تجربہ کار اور پیشہ ور صحافیوں کو ہی اسمبلیوں کی کارروائی کی رپورٹنگ کے لئے بھیجتے ہیں۔ مگر یہ بھی مناسب نہیں کہ اسمبلی میں رونما ہونے والی 'غیر نصابی سرگرمیوں' کے بارے میں میڈیا خاموشی ہی اختیار کرے، معزز ارکان کے معزز ادارے میں ہونے والی منفی سرگرمیوں سے نگاہیں پُجرا لی جائیں، 'سب اچھا ہے' کی رپورٹ پیش کی جائے۔ اگر اسمبلی کی کارروائی باوقار طریقے سے انجام پائے تو اس کی منفی کوریج کیسے ہو سکتی ہے، اس کے خلاف خبریں کیسے شائع ہو سکتی ہیں، ضرورت تو یہ ہے کہ خرابی کو دور کیا جائے، نہ کہ خرابی جاری رہے گی، بس اس کو دوسروں کے سامنے نہ لایا جائے۔ میڈیا تو معاشرے کا آئینہ ہے، اس میں کارکردگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اگر میڈیا معزز ارکان کی کاروائیاں شائع نہیں کرے گا تو پھر واقعی سوشل میڈیا کا کیا کیا جائے گا، نجی محفلوں سے ہوتی ہوئی باتیں

جب زبانِ زردِ عام ہو گئی تو ان کے راستے کون روکے گا؟ یہ بھی درست ہے کہ میڈیا کی
کچھ حدود و قیود ہونی چاہیے مگر اصل ضرورت شکلوں کے درست کرنے کی ہے، آئیے
توڑنے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

سندھ اسمبلی میں گزشتہ روز ہنگامہ ہو گیا، یہ تو کوئی نئی بات نہیں تھی، کیونکہ وہاں یہ کچھ آئے روز ہوتا ہے، تازہ ہنگامے کی وجہ منی لانڈرنگٹ بنی، لندن میں بیٹھی قیادت کی بات ہوئی، دئی میں بیٹھی دوسری قیادت کی بات ہوئی، یوں پی پی اور ایم کیو ایم والے آپس میں الجھ پڑے، بات صرف زبان تک ہی نہیں رہی، نوبت ہاتھ پائی تک پہنچ گئی، معزز ارکان دست و گریباں ہو گئے۔ وزراء اور اپوزیشن لیڈر نے سچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی، ایوان مچھلی منڈی کا منظر پیش کرتا رہا۔ اس منظر کو یقیناً بہت سے ارکان نے ایک مزاحیہ پروگرام کے طور پر دیکھا ہوگا، ٹی وی پر یہ منظر دیکھنے والوں کی اکثریت تو اس سے لطف اندوز ہی ہوئی، لوگوں نے اس اقدام سے اپنے نمائندوں کیا صل پوزیشن اور بصیرت کا اندازہ بھی لگایا۔ تاہم جن لوگوں کے قائدین کا ذکر ہو رہا تھا وہ کسی حد تک جذباتی ضرور ہونگے، وہ دھکم پیل اور دست و گریباں ہونے والوں میں سے اپنے حامیوں کے ساتھ ہونگے۔ یہ ساری ہنگامہ آرائی ممبران نے اپنے قائدین سے محبت میں کی۔ قیادت سے محبت فطری بات ہے، خاص طور پر اپنے ہاں جمہوریت تو نام ہی قائدین کا ہے، ہر کسی کی اپنی پارٹی ہے، جو اُس پارٹی میں ہے، وہ یقیناً اپنے قائد کا مخلص یا محتاج ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنے قائد سے کم اخلاص

افورڈ ہی نہیں کرتے۔

اسمبلی میں وجہ اس مستقل ٹکراؤ کی یہ ہے کہ سندھ اسمبلی میں مختلف تہذیبوں کے لوگ جمع ہیں، ایک طرف سندھ کی قدیم تہذیب کے لوگ ہیں تو دوسری طرف ہندوستان سے آئے ہوئے اردو بولنے والے تھے، جو سندھ کے شہروں میں آباد ہو گئے، ان کی تہذیب بالکل مختلف تھی، پھر کراچی کے صنعتی، تجارتی شہر ہونے کے ناطے یہاں پنجابی، بلوچ اور پختون بھائی بھی زیادہ آئے، وہ بھی اپنے اپنے رسوم و رواج اور کلچر کے ساتھ کراچی میں موجود ہیں۔ کراچی کو ان سب لوگوں نے مل کر پاکستان کا سب سے بڑا شہر بنا دیا، مگر بد قسمتی سے ان کی تہذیبوں میں کھڑی دیواریں نہیں گرائی جاسکیں، یہ ممکن تھا کہ اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے یہ لوگ سندھی بھی رہتے اور پاکستانی بھی ہوتے، مہاجر یا دوسری قوم ہونا کوئی جرم نہیں، مگر پہلے پاکستانی پھر اپنی تہذیب۔ اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ پاکستان سے محبت نہیں کرتے، یا پہلے یہ اپنی قومیت پر ہیں بعد میں پاکستانی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ لوگ آپس میں کبھی شیر و شکر نہیں ہو سکے، الگ تشخص قائم رکھنا بہت اچھی بات ہے، مگر یہاں یہ تشخص تعصب کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر نوبت ٹکراؤ تک رہتی ہے۔ اگر معاملہ تہذیبوں کا نہ بھی ہو تو بھی اپنی سیاست میں اس قدر تلخی ہے کہ دوسرے کو برداشت کرنے کا تصور

دھندلایا ہوا ہی ہے۔

جس وجہ سے سندھ اسمبلی میں ہنگامہ آرائی ہوئی وہ کسی دلچسپی سے کم نہیں، حکومت اور اپوزیشن دونوں نے ایک دوسرے کو قیادت کے طعنے دیئے، کسی کی قیادت لندن میں ہے تو کسی کی دبئی میں۔ اسے اپنی بد قسمتی ہی قرار دیا جائے گا کہ قیادتیں باہر بیٹھ کر ملک چلا رہی ہیں۔ ایم کیو ایم کی قیادت عشروں سے لندن میں قیام پذیر ہے، وہیں سے ڈوری ہلتی اور کنٹرول سنبھالا جاتا ہے، اُن کے اشارے کے بغیر پتہ نہیں ہلتا۔ لندن کی قیادت پر کیا الزامات ہیں، کیا معاملات ہیں، کہ وہ پاکستان نہیں آتے، مگر حکومت چلاتے ہیں، سندھ کے گورنر نے پاکستان میں طویل مدت کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اسی طرح پی پی کی مرکزی قیادت سابق صدر آصف زرداری بھی لندن اور دبئی میں ہی زیادہ وقت گزارتے ہیں، وہیں سے ہدایات ملتی ہیں۔ ان دونوں پارٹیوں کی ہی بات نہیں، خود پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف بھی بیمار پڑے تو لندن سے ہی ویڈیو لنک کے ذریعے اہم اجلاس کی صدارت کی، اب بھی اہم حکومتی شخصیات عیادت کو جواز بنا کر لندن جاتی ہیں اور بریفنگ دیتی اور ہدایات لیتی ہیں۔ اسی دوران پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف نے بھی کئی روز تک لندن میں بیٹھ کر ہی صوبے کا انتظام و انصرام چلایا۔ یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں، لندن سے اپنی بہت پرانی شناسائی ہے، ہمارے ملک کی ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک ڈوریاں لندن سے

ہی ہلتی رہی ہیں، اب بھی اگر پرانی ڈگر پر اپنی قیادتیں لندن بیٹھی ہیں، یا معاملات وہاں سے کنٹرول ہوتے ہیں، تو کوئی حیرانی یا پریشانی کی بات نہیں، اس بات کو طعنہ نہیں جانا چاہیے، بلکہ انگریز حکومت کا تسلسل جان کر صبر کر لینا چاہیے، کیونکہ اب بھی ہم گورے نہیں کالے انگریز کے غلام ہیں۔

روزینہ الین خان کی خبر کو پاکستانی میڈیا میں خوب کوریج ملی، اسے لندن کے شہریوں نے ووٹ دے کر پارلیمنٹ کی رکن منتخب کر لیا ہے، یہ سیٹ صادق خان کے لندن کا میئر بننے پر خالی ہوئی تھی۔ پاکستانی اس لئے بھی خوش ہیں کہ روزینہ کے والد کا تعلق پاکستان سے ہے، پاکستانیوں کے لئے دوسری خبر جسے بہت اہمیت دی جا رہی ہے کہ روزینہ کے والد ٹی وی میکنک ہیں، ان کی والدہ جو کہ پولش خاتون ہیں، ایک پٹرول پمپ پر کام کرتی تھیں۔ صادق خان کے لندن کے میئر بننے پر بھی اس بات میں بہت دلچسپی لی گئی تھی کہ ان کے والد بس کے ڈرائیور تھے۔ یہ دونوں خبریں پاکستانیوں کے لئے فخر کی بات ہیں، ظاہر ہے فخر دوہی ہیں، اول یہ کہ وہ پاکستانی ہیں، دوم یہ کہ وہ عام لوگ ہیں۔ پاکستانی عوام کے لئے یہ خبریں مثال ہیں، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پاکستانی عوام نے لندن کی مثال کو خود کبھی نہیں اپنایا، یہاں تو یہی کچھ ہے کہ جس کے پاس گاڑیوں کا بیڑہ ہے، جس کا گھر محل نما ہے، جس کا کاروبار دور و نزدیک تک پھیلا ہوا ہے، جس کے ارد گرد بندوق بردار محافظ ہیں۔ خواہ اس کی ڈگری جعلی ہو، خواہ خلق خدا اس سے تنگ ہو، خواہ اس کا اخلاق کردار قابلِ اعتراض ہو۔ عوام نے کبھی غور نہیں کیا۔ مقابلے میں اگر کوئی بہت ہی اچھا آدمی بھی آگیا تو وہ ووٹوں سے اس لئے محروم

رہے گا کہ وہ عام آدمی ہے، عوام میں رہتا ہے، اس کے پاس وہ چیزیں نہیں ہیں جن کا مالک اس کا مخالف ہے۔ یہ ہماری سادگی ہے یا بھولپن یا تضاد کہ ہم پسند کچھ کرتے ہیں، داد کسی کو دیتے ہیں اور ووٹ کسی اور کو۔

لندن میں ہی جب اپنے وزیراعظم کا آپریشن ہوا، تو ان کے چھوٹے بھائی وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف ٹیکسی میں بیٹھ کر ہسپتال سے گھر واپس گئے۔ یہ تصویر قوم نے سوشل میڈیا اور اپنے اخبارات میں بھی ملاحظہ کی۔ وہاں سادگی اختیار کرنا ایک عام بات ہے، وہاں کا وزیراعظم بھی اسی ماحول میں رہتا اور سادگی سے زندگی گزارتا ہے۔ پاکستان واپس آتے ہی اپنے حکمرانوں پر مرتب ہونے والا اثر فوری طور پر زائل ہو جاتا ہے، یہاں وہی شاہانہ انداز زندگی کے اطوار لوٹ آتے ہیں۔ پروٹوکول پر بے دریغ خرچ کیا جاتا ہے، گاڑیوں کی قطاریں، پولیس کی سیکڑوں کی نفری، بندوبست، اہتمام ذرا سی نقل و حرکت پر بہت زیادہ رقم اڑادی جاتی ہے۔ اب رمضان میں سستے بازاروں کا عالم ہی دیکھ لیں کہ وہاں پر وزراء کی ڈیوٹیاں ہیں، انتظامی افسران پابند ہیں، چار سٹو میاں برادران کے چھوٹے بڑے سیکڑوں فلیکس آؤنڈراں ہیں، یہ تمام اخراجات غیر ضروری ہیں، قیمتوں کو کنٹرول کرنا حکومت کا کام ہے، مگر یہاں تو اس کی تشہیر پر ہی لاکھوں لگا دیئے جاتے ہیں۔

سادگی اور بچت کے دعوے تو بہت سنائی دیتے ہیں، ایوانِ صدر اور وزیرِ اعظم ہاؤس کے علاوہ وزیرِ اعلیٰ ہاؤس پنجاب کے اخراجات میں بھی کروڑوں روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب تازہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایوانِ وزیرِ اعظم کی تزئین و آرائش پر بیس کروڑ روپے کے اخراجات اٹھیں گے۔ ممکن ہے اس مسکین دفتر کی حالت اس قدر خستہ ہو گئی ہو، یا اس کی دیواروں پر بچوں نے پنسلوں سے لکیریں کھینچ دی ہوں، یا اس کے فرش اکھڑ گئے ہوں، یا اس کی دیواروں سے چونا گر رہا ہو، اس لئے اس کی دوبارہ تزئین و آرائش کی ضرورت پڑ گئی ہو۔ بیس کروڑ اگرچہ بہت بڑی رقم ہے، مگر کھرب پتی لوگوں کے سامنے کروڑوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی، وہ بھی اس صورت میں جب معاملہ قومی خزانے کا ہو، اگر سرکاری خزانے سے بھی بے دریغ روپیہ استعمال نہ کیا جائے تو حکمرانی کا کیا مزہ؟ بتایا گیا ہے کہ دو کروڑ سے زائد کے ہاتھ روم بنیں گے۔ اُدھر قومی اسمبلی میں وزیرِ خزانہ کے خطاب کے دوران پینتالیس حکومتی ارکان واک آؤٹ کر گئے، ان کا مطالبہ تھا کہ ارکانِ اسمبلی کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے، اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر جرنیلوں، ججوں اور بیوروکریٹس کی تنخواہیں کم کر دی جائیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسحاق ڈار ہماری بات نہیں سنتے اب ہم کسی وزیر کو نہیں وزیرِ اعظم کو اپنے مطالبات پیش کریں گے۔ ممبرانِ اسمبلی جب دفاتر کی آرائش اور ہاتھ روموں کی تعمیر پر بیس کروڑ کا خرچہ دیکھتے ہیں، تو انہیں اپنی تنخواہیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ان کی یہ بھی سادگی ہے یا

پھر وزیر خزانہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کہ جن کی بات ایک وزیر نہیں سنتا تو وزیراعظم

ان کی کیا سنیں گے؟

!! غریب مرغی کھائیں

اب یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وزیر خزانہ کے تازہ بیان کے بعد غریب خوشی سے پھولے نہیں سارہے ہونگے۔ اپنے ہاں دانشور غریبوں کا رونا روتے نہیں تھکتے، اگر یہ کہا جائے کہ دانشور اور اپوزیشن وغیرہ غریبوں کا رونا غریبوں سے بھی زیادہ روتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر وزیر خزانہ نے بجٹ کے موقع پر قومی اسمبلی میں اپنی ایک اہم تقریر میں غریبوں کی خوراک کا مسئلہ حل کر کے بڑے بڑوں کو خاموش کروا دیا ہے۔ کسی رکن اسمبلی نے بے پروائی کی اڑادی کہ 'دال مہنگی ہو گئی ہے، اب غریب دال بھی نہیں خرید سکتے'، وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے تسلی بخش جواب دیتے ہوئے کہا کہ "... اگر دال مہنگی ہے تو مرغی کھائیں، کیونکہ ہم نے مرغی سستی کر دی ہے۔ غریب اور عام آدمی اب مرغی کھانے کی تیاری کریں، اس کے لئے ضروری..."۔

نہیں ہے کہ وہ یہ اہم قدم اٹھانے کے لئے عید کا انتظار کریں، بلکہ رمضان المبارک کے دنوں میں بھی مرغی کھانے کا شوق پورا کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اب غریبوں کو مرغی کھانی ہی پڑے گی، کیوں کہ اس کا حکم وزیراعظم کے بعد حکومت کے اہم ترین وزیر اسحاق ڈار نے دیا ہے، اگر کوئی حکم عدولی کا خیال دل میں لائے گا تو اس کو بھی جان لینا چاہیے کہ حکومت اپنی رٹ قائم کرنے کے طریقوں سے بخوبی آگاہ ہے۔

غریب امیرانہ شان کے کاموں سے جھجکتے رہتے ہیں، شہر میں کوئی بڑی دکان کھل جائے
 جس میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے ہوں تو عام آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ ممکن
 ہے اب مرغی کھانے کے حکم کے بعد بھی غریب یہ قدم نہ اٹھائیں، اس کے لئے بہتر
 رہے گا کہ حکومت اخبارات میں اشتہارات شائع کروائے، ٹی وی چینلز پر بھی متحرک
 اشتہار نشر کروا کر عوام کو آگاہی دی جاسکتی ہے، کہ اب غریب مرغی کھایا کریں گے۔
 اس کے لئے یہ اقدام بھی کیا جاسکتا ہے، کہ وزراء اور ممبران پارلیمنٹ پر مشتمل ٹیمیں بنا
 دی جائیں، جو اس بات کا جائزہ لینے کے لئے اچانک چھاپے ماریں کہ آیا کوئی غریب
 بازار سے دال وغیرہ تو نہیں خرید رہا، قانون شکنی کا ارتکاب کرنے والوں کو رنگے
 ہاتھوں پکڑ کر جیل بھیج دیا جائے، ایک جرم تو یہ کہ اس نے وزیر خزانہ کے فرمان کی حکم
 عدولی کی، دوسرا یہ کہ ممکن ہے وہ کسی سازشی جماعت کا ممبر ہو، جو حکومتی رٹ کو چیلنج
 کر رہا ہو، اور حکومت کو ناکام کرنے کی سازش کا حصہ بن رہا ہو۔ اس چھاپہ مار اور
 آگاہی میں اگرچہ بلدیاتی ممبران ہی بہتر رہتے، انہوں نے چونکہ ابھی باقاعدہ کام شروع
 نہیں کیا اس لئے یہ کام دیگر تنظیموں کے ذریعے بھی کروایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی بہتر ہو سکتا
 ہے کہ اب رمضان بازار میں مرغیوں کے کاؤنٹنر بنوائے جائیں، اور بعد میں بھی یہ
 تسلسل قائم رکھتے ہوئے، مرغیوں کے ماڈل، سستے حکومتی بازار جاری رکھے جائیں۔

مرغی کا سالن بنانا کوئی بڑی بات نہیں، غریب جہاں شور بے والے آلو کھاتے ہیں، ہنڈیا میں اگر آلو کی جگہ مرغی ڈال لیں گے تو نئی ڈش تیار ہو جائے گی۔ مگر وزیر صاحب کے اس حکم کا تقاضا اور شان یہ ہے کہ مرغی کے سالن کے معاملات کو شور بے سے آگے تک بھی لے جایا جائے، کیونکہ شور بے سے آگے ڈشوں کے امکان اور بھی ہیں۔ نئی نئی ڈشوں کی ریسپیٹ کے لئے بازار میں بے شمار کتابیں اور رسالے دستیاب ہیں، ظاہر ہے کھانا بنانے کا طریقہ سیکھنے کے لئے رسالہ تو خریدنا ہی پڑے گا، اگر گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ ہو تو کسی ہمسائی خاتون یا لڑکی کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دوسری مزید آسان صورت ٹی وی چینل ہیں، بیسیوں چینل کھانے کے طریقے سکھا رہے ہوتے ہیں، بس غریبوں کو ایک عدد مناسب سا ٹی وی خریدنا ہوگا، دوسرا بس تھوڑا سا خرچہ کر کے وہ ماحول دینا ہوگا جو ٹی وی چینل کے باورچی خانوں میں دکھایا جاتا ہے، آخری آئیٹم مرغی ہے، وہ بازار سے خریدنا ہوگی۔ مرغی کی بیسیوں ڈشیں بن سکتی ہیں، عام سالن کے علاوہ سویٹ ڈش بھی چکن کی ہی بن جائے گی، مرغی کا حلوا بھی بن سکتا ہے۔ گویا اگر غریب صرف مرغی ہی کھانا چاہے تو کھانے کے تمام لوازمات مرغی سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ وزیر خزانہ نے مرغی سستی کر دی ہے، مرغی کھانے کا حکم دے دیا ہے، مرغی کھانے کے طریقے ہم نے بتا دیئے ہیں، اب بھی اگر غریب مرغی نہیں کھاتے اور دال وغیرہ کھانے پر ہی اصرار کرتے ہیں تو انہیں نہ کوئی روک سکتا ہے

اور نہ کوئی مرغی کھانے پر مجبور کر سکتا ہے، اب فیصلے کا اختیار غریبوں کے ہاتھ میں

ہے۔

گزشتہ روز قوم نے عالمی فادر ڈے منایا۔ بہت سے عالمی دن ایسے ہیں جن کا ہم لوگوں نے بہت ہی محبت سے اردو ترجمہ بھی کر رکھا ہے، مگر فادر ڈے پر انگلہ نری کا کوئی معقول اردو متبادل دکھائی نہیں دیا۔ مدر ڈے کو 'ماں کا عالمی دن' کہہ دیا جاتا ہے، اُسی وزن میں یہاں 'باپ کا عالمی دن' کہا جانا چاہیے، یا پھر 'والد کا عالمی دن' مگر کچھ عجیب سا لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس انگلہ نری لفظ کو اردو میں لکھ کر دل خوش کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایٹو بھی زیر بحث آتا ہے کہ آیا اس قسم کے دن سال میں ایک مرتبہ ہی آتے ہیں، جس موقع پر والد، والدہ، ٹیچر یا دیگر کسی سے اظہارِ عقیدت و محبت کیا جائے؟ سال بھر میں ایک مرتبہ آنے والے دن بھی بہت سے ہیں، جن میں سالگرہ، برسی، شادی کی سالگرہ وغیرہ شامل ہیں، ظاہر ہے یہ تقریبات سارا سال نہیں منائی جاسکتیں، مگر جس محبت اور عقیدت کا اظہار ہر روز بلکہ ہر لمحہ ہونا چاہیے، اسے بھی ہم سال کے ایک دن کے لئے محدود کر دیں تو یہ کام کوئی زیادہ قابلِ تحسین نہیں۔ والدین ہوں یا کسی مسئلے پر کوئی دن منایا جائے، یا کسی بیماری کو یاد کیا جائے، پورا سال ایک خاص دن کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

سال بھر میں ایک دن منائے جانے کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں، یہ عالمی دنوں کی روایت ظاہر ہے مغرب کی ہے، ہم یہ کام کیوں کرتے ہیں اس کی دواہم وجوہ ہیں، اول یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب نے ترقی کی ہے، آخر ان اقوام میں کوئی خوبیاں تھیں، اور ہیں، جن کی بنیاد پر وہ ترقی کے بام عروج پر پہنچے، گویا ہمیں ان کی تقلید کرنی چاہیے، کہ ہم بھی وہی کام کریں جو انہوں نے کئے اور ترقی پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے وہاں سے صرف انہی مثالوں کو اپنایا جس سے ہم تقریبات تو کر سکتے ہیں، تقلید بھی کر سکتے ہیں، مگر ترقی نہیں۔ جو کام ترقی کے لئے ضروری ہیں، ہم کبھی ان کے قریب بھی نہیں جاتے۔ مثلاً سادگی، محنت، ایمانداری، اصول پسندی، صفائی، انصاف، خدمت خلق اور اسی قسم کے دیگر کام ہم نہیں کرتے، نہ ہمارے حکمران وہاں سے اس قسم کی چیزوں کو درآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم وہاں سے کچھ چیزیں درآمد کر کے خود کو ترقی یافتہ تصور کرنے لگتے ہیں تو وہ خواتین کی آزادی، ان کے لباس کا اختصار اور عالمی ایام وغیرہ اہم ہیں۔ دوم یہ کہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکا ہے، گویا اب ہم وہاں کی ہر روایت کو اپنانے پر مجبور ہیں، اگر ایسا نہ کیا تو دقیانوسی کملائیں گے، ایسا ہم کر نہیں سکتے۔ یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ مغرب کے لئے ایسے ایام منانا ایک مجبوری ہے، کہ وہاں خاندانی نظام ختم ہو رہا ہے، وہاں رشتے نام کے ہی بچ رہے ہیں، یہ ایام ان کی بقا کی کوشش ہے۔ اپنے ہاں ابھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، ہمارا مذہب بھی

ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

والد صاحب کے عالمی دن کے موقع پر ایک اور بات سوشل میڈیا کے ذریعے سامنے آئی ہے، ویسے تو سوشل میڈیا ”نمائش باہمی“ کا ایک بڑا ذریعہ ہے، مگر اب بہت سے لوگوں نے اپنے والدِ نزرگوں کی تصاویر بھی سوشل میڈیا پر شیئر کی ہیں، انہوں نے بھی جن کے والد زندہ سلامت ہیں، اور اپنے بچوں کے سر پر ان کی شفقت کا سایہ موجود ہے اور ان لوگوں نے بھی جن کے والد جہاںِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، ہر دو لوگوں نے والد سے محبت اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ جو ہیں انہیں اللہ تعالیٰ صحت اور تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے، جو گزر گئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وسیع جنتوں میں جگہ عطا فرمائے۔ اس عالمی دن کے موقع پر بہت سے لوگ بڑی محنت سے اپنے ابا جان کی تصویر ڈھونڈ کے لائے ہیں، اسے سکیں کروایا ہے اور پھر فیس بک پر اپ لوڈ۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ تر افراد کے والد صاحب بار لیش اور مذہبی ماحول میں رہنے والے ہیں، (شاید کچھ پرانے ہیں اس لئے)۔ بہت سے ایسے ہیں جو صرف اس لئے اپنے والد صاحب کی تصویر اپ لوڈ نہیں کر سکے کہ ان کے والد اب دنیا میں نہیں، اور گھر والوں کے پاس اب ان کی کوئی تصویر موجود ہی نہیں۔ عالمی دنوں کا سلسلہ تو چلتا رہے گا، گلوبل ویلج کے باسی ہونے کے ناطے اب ہم لوگ اس قسم کی سرگرمیوں کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے، مگر ہمیں اپنے مذہب اور معاشرتی

اقدار کا خیال رکھتے ہوئے ایسی باتوں کو ایکے دل کے لئے محدود و نمونہ کرنا چاہیے۔

گزشتہ روز میں کالم نہیں لکھ سکا، اس سے پہلی رات میں نماز تراویح کی ادائیگی کے بعد گھر پہنچا تو گیارہ بجتے ہی والے تھے، ٹی وی چینل پر خبروں کی جھلکی دیکھی تو بجلی کے چھوٹے وزیر قومی اسمبلی میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے، انہوں نے بجلی کی دستیابی اور فراہمی کے بارے میں یقیناً اور بھی بہت سی حوصلہ افزا باتیں کی ہوں گی، قوم کو خوشخبری سنائی ہو گی کہ ”.. اگلے دو برس میں لوڈ شیڈنگ کا نام و نشان مٹ جائے گا، جن علاقوں میں بجلی چوری ہو رہی ہے وہاں بجلی فراہم نہیں کی جائے گی، اور یہ کہ رمضان المبارک میں سحر و افطار کے وقت لوڈ شیڈنگ بالکل نہیں کی جائے گی، ان اوقات میں بلا تعطل بجلی فراہم کی جائے گی وغیرہ وغیرہ“۔ مگر ٹی وی چینل نے وزیر موصوف کے جو ارشادات عالیہ اپنے چینل کے لئے منتخب کئے، وہ بھی اگرچہ بجلی کے متعلق ہی تھے، مگر ذرا مختلف پیرائے میں۔ ان سے معلوم کیا گیا کہ بجٹ کے اس اہم سیشن کے موقع پر بجلی کے بڑے وزیر ایوان میں کیوں نہیں آئے، تو انہوں نے بتایا کہ ”.. خواجہ آصف صاحب ٹرانسپارمر کے لئے ٹرائی لینے گئے ہیں، اس کے لئے ٹریکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی..“۔ اس پر اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ نے سخت احتجاج کیا اور وزیر کو طنزیہ اور تضحیک آمیز گفتگو کرنے پر معذرت کرنے کا کہا، وزیر نے حسب

معذرت سے انکار کر دیا کہ میں نے تو ٹیکنکل الفاظ کا استعمال کیا ہے، تاہم دباؤ زیادہ بڑھنے پر سپیکر اور ن لیگ کے ایک مرکزی قائد عبدالقادر بلوچ کے کہنے پر وزیر صاحب نے معذرت کر لی۔

بات شروع ہوئی تھی کالم نہ لکھنے سے، ہوا یوں کے ہم لوگ بھی بہت سے لوگوں کی طرح ذرا تاخیر سے ہی سوتے ہیں، بمشکل دو گھنٹے بعد سحری کے لئے اٹھنا ہوتا ہے، ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ بجلی غائب ہو گئی، کچھ دیر انتظار کیا، کچھ تعاون یو پی ایس نے کیا، گرمی سے لڑتے، کروٹیں بدلتے اور بجلی کے وزراء کو ان کے قائدین سمیت بہت ہی خاص الفاظ میں یاد کرتے سحری کا سائرن بج گیا۔ اب کچن میں بھی اندھیرا ہے، اوپر سے گرمی کا تڑکا۔ خاتون اول کا پارہ گرمی کے ساتھ چڑھنے لگا اور یہ ناچیز اس غیظ و غضب کا واحد شکار۔ محترمہ کی صلواتیں جا تو اسلام آباد ہی رہی تھیں، یا پھر کچھ مزید علاقوں میں، مگر ان کا سامنا مجھے ہی کرنا پڑ رہا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ لکھنے پر مامور فرشتوں کے علاوہ وہ وقت سحر جو 'مناجات' بھی کی گئیں، وہ گویا میں نے ہی سنیں، بہت روکا کہ بھئی سحری تیار کرتے ہوئے اللہ رسول کا ذکر کرتے ہیں، نہ کہ وفاقی وزراء یا کسی اور کا، اور وہ بھی ذرا مختلف انداز میں۔ میری ایکٹ نہ چلی، مغلطات کی تسبیح کے دانے گرتے رہے، دعاؤں کے متضاد عمل کی گردان ہوتی رہی اور موبائل کی دی ہوئی روشنی میں سحری تیار ہوتی رہی۔ میں

ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ تسلیج صرف ہمارے گھر ہی تو نہیں کی جا رہی ہے، یہ کارِ خیر تو متاثرہ علاقے کے تمام گھروں میں ہی ہو رہا ہوگا۔ سحری کے بعد نیا امتحان، گرمی اور بے آرائی۔

اب واپڈا والوں کو فون کی کہانی شروع ہوئی، شکایت وغیرہ کے لئے ایک پی ٹی سی ایل اور ایک موبائل نمبر بجلی کے بل پر بھی درج ہوتا ہے، مگر وہ قسمت سے ہی اٹھایا جاتا ہے، بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ ٹرانسفارمر جل گیا ہے، یقیناً لوڈ بڑھ گیا ہوگا، خدا خدا کر کے تقریباً گیارہ بجے بجلی بحال کر دی گئی۔ بھاگم بھاگتے پانی کی موٹر چلائی، ابھی سنبھل ہی رہے تھے کہ بجلی پھر غائب، یہی جانا کہ اب ٹرانسفارمر کو سیٹ کر رہے ہونگے، چیکنگ وغیرہ میں چند منٹ لگ جاتے ہیں، مگر مزید دو گھنٹے لائیٹ نہ آئی، اس دوران واپڈا والوں نے پی ٹی سی ایل فون ایک مرتبہ سنا اور موبائل کا نہ سننے کا ریکارڈ قائم رکھا۔ ڈھائی بجے کے قریب دوبارہ بجلی آئی اور پورے ڈھائی بجے چلی گئی کیونکہ یہ اعلانیہ لوڈ شیڈنگ کا مستقل شیڈول ہے۔ ایسے میں میرا کالم لکھنا ممکن نہ رہا تھا، مگر میں یہ ضرور سوچتا رہا کہ کیا ٹرانسفارمر کی دوبارہ تنصیب چودہ گھنٹے کا کام ہے، وہ بھی ایسے میں جب رمضان المبارک کی ایمر بجنسی بھی ہو؟ پھر خیال آیا کہ رات خبروں میں دیکھا اور سنا تھا کہ بجلی کے بڑے وزیر ٹرانسفارمر کے لئے ٹرائی لینے گئے ہیں، اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس

ٹرائلی کے لئے ٹریکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی، سو چا کہ وزیر صاحب ہمارا ٹرانسفارمر ہی
لینے گئے ہونگے، بڑے آدمی ہیں، راستے میں دیگر مصروفیات کی وجہ سے لیٹ ہو گئے
ہونگے، ہم عوام کا کیا ہے، بجلی کے بغیر بھی جی لیتے ہیں۔

! چولستان کی خشک سالی

بہت دنوں سے اخبارات میں چولستان میں خشک سالی کی خبریں آرہی تھیں، تصاویر شائع ہو رہی تھیں، جن میں دکھایا جا رہا تھا کہ چولستانی اپنے مویشیوں سمیت نقل مکانی پر مجبور ہیں۔ وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے، اپنے مال مویشی کو ہانکتے چولستان سے باہر آبادیوں کی جانب رواں دواں تھے۔ چولستانیوں کی یہ نقل مکانی نئی یا انوکھی بات نہیں، یہ عمل انہیں ہر سال گرمیوں کے پہلے مہینوں میں دہرانا پڑتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے پانی کا بندوبست کیا جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کو معمول کے مطابق گزار سکیں۔ چولستان کی نگرانی اور فلاح و بہبود کے لئے ”چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی“ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، یہ ادارہ اس خطے کے تمام تر مسائل پر نگاہ رکھتا اور انہیں حل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ خشک سالی کی صورت حال اور خبروں کے بعد ادارہ نے اپنی سی کوششیں کیں، مگر مسائل زیادہ ہونے کی بنا پر عموماً یہ معاملہ سی ڈی اے کے بس کا روگٹ نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ اس ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ’پراونشل ڈسٹرکٹ انٹرجینٹ اتھارٹی‘ سے رجوع کیا گیا تھا، اب خبر آئی ہے کہ مذکورہ اتھارٹی نے اجلاس طلب کر لیا ہے، جس میں کمنشنر بہاول پور، ایم ڈی چولستان اور بہاولپور ڈویژن کے تینوں اضلاع کے ڈی سی اوز بھی شرکت کریں گے۔

اسلام آباد یا لاہور بیٹھ کر چولستان کے حالات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ ان شہروں میں دو چار دن گرمی پڑ جائے تو بادل گھبر گھبر آتے ہیں، جم کر برستے ہیں، جل تھل کر دیتے ہیں، یوں چند روز کے لئے موسم تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ مگر عام بارش حتیٰ کہ بادل بھی بہاول پور تک نہیں پہنچتے۔ وہاں یہ محاورہ عام ہے کہ جب بادل آتے ہیں، ہوائیں چلتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وسطیٰ پنجاب تک بارش، برسا دو اور جب جنوبی پنجاب کی باری آتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ’مٹی پاؤ‘۔ یوں بالائی علاقوں میں بارشیں برسانے والی ہوائیں جنوبی پنجاب کے علاقوں میں گرد آلود ہو جاتی ہیں۔ یہ چولستانیوں کی قسمت کا معاملہ نہیں، یہ سطح زمین کی کہانی ہے، ظاہر ہے پہاڑی علاقوں میں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں، ان کے قریب میدانی علاقے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں، مگر صحرا کی گرمی بادلوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی۔ صحرائین بارشوں کو ترستے رہتے ہیں، کیونکہ ان کے تمام معمولات کا دار و مدار بارش پر ہی ہوتا ہے، بارش ہوگی تو سبزہ ہوگا، جو اُن کے مویشی کھائیں گے اور زندگی کی رونقیں بحال رہیں گی۔ بارش ہوگی تو ٹوبوں میں پانی بھرے گا، جہاں سے ان کے اونٹ گائے اور بھیڑ بکریاں تادیر پانی پیتے رہیں گے، اور بہت سے ٹوبوں سے انسان بھی، پانی اپنے برتنوں میں بھر کر رکھ لیتے ہیں اور اسی سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ گرمیوں میں بارش کا برسا چولستانیوں

کی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

چولستان کا ایک بہت بڑا مسئلہ پانی ذخیرہ کرنے والے ٹوبے ہیں، کہنے کو تو یہ چولستان میں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں، مگر ستم یہ ہے کہ حکومت ان کی صفائی کا خاطر خواہ بندوبست نہیں کرتی، حالانکہ یہ کروڑوں روپے کا منصوبہ نہیں ہوتا۔ اگر ہر سال ٹوبوں کی بھل صفائی ہو جائے تو پانی کا معقول ذخیرہ ممکن ہے، جس سے نقل مکانی میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یہاں ایک اور مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ چولستانی اب خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہتے ہیں، وہ حکومت یا دیگر امدادی تنظیموں کی راہ نکلتے رہتے ہیں، کہ وہ آکر ان کے ٹوبوں کی بھل صفائی کریں، اگر وہ اپنی مدد آپ کے تحت کچھ کام کر لیں تو بھی بہتری کے امکان پیدا ہو سکتے ہیں۔ چولستان کے بہت سے علاقوں میں صاف پانی کی پائپ لائنیں بچھا دی گئی ہیں۔ جس سے پینے کا صاف پانی صرف لوگوں کو ہی میسر نہیں ہوتا بلکہ یہ سہولت مویشیوں کے لئے بھی موجود ہے، جگہ جگہ ان کے لئے شیڈ بنائے گئے ہیں، تاکہ جانور گھاس وغیرہ چرنے کے بعد سائے میں بیٹھ سکیں اور وہاں موجود پانی سے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ مگر پھر وہی ستم کہ یہ پائپ لائنیں کسی حد تک تو کام کر رہی ہیں، مگر زیادہ تر خراب پڑی رہتی ہیں، شیڈ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں، اور بہت سے مقامات پر ویرانہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ چولستان سے خشک سالی کا خاتمہ تو ممکن نہیں، مگر ٹوبوں کی مناسب اور

سالانہ بھل صفائی اور چولستان میں موجود سرکاری اور صاف پانی کی پائپ لائنوں کی مناسب مرمت اور دیکھ بھال سے اس خشک سالی اور نقل مکانی کے مسئلے کی سنگینی میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

!لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی

امجد صابری کی کس سے دشمنی ہو سکتی ہے؟ جو شخص ہر محفل میں مدحتِ رسول ﷺ بیان کرتا تھا، جس کی گفتگو کا محور مدینہ ہوتا تھا، جس سے کوئی بھی کچھ پڑھنے کی درخواست کرتا تو یقیناً مدینے کا منظر ہی سامنے آتا تھا۔ آج کل چونکہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ہے اس مناسبت سے ٹی وی چینلز پر افطار و سحر کی ٹرانسمیشن چلتی تھیں، اپنے مزاج اور سرگرمی کے لحاظ سے وہ بھی ان پروگراموں کا لازمی حصہ تھے۔ ان کی شہادت کے بعد جب ان کی یادیں تازہ کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں تو بتایا جا رہا ہے کہ وہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ مدینہ میں گزارنے کے خواہشمند تھے، تاہم ٹی وی چینل سے معاہدے کی وجہ سے ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ ٹی وی کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ بھی پورا ہو سکے گا یا نہیں۔ یوں وہ چینل سے کیا جانے والا معاہدہ ادھورا چھوڑ کر جامِ شہادت پی کر عدم کو سدھار گئے۔ امجد صابری پاکستان کے ماتھے کا جھومر تھے، وہ جس ملک میں بھی گئے پاکستان کا نام روشن کیا، جہاں بھی گئے اپنے مخصوص انداز کی قوالی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اگرچہ ان کی قوالی کی طرز ان کے والد کی بنائی ہوئی تھی، شہرت کی بلندیوں پر تو یہ قوالیاں پہلے ہی تھیں، مگر ان کو جدید دور کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے امجد نے خوب محنت کی اور وہ اپنے مشن

میں کامیاب رہے۔ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے وہ میڈیا میں مکمل طور پر 'ان' تھے۔ کونساٹی وی چینل ہے جس نے اپنے پروگراموں کی رونق بڑھانے کے لئے انہیں مدعو نہ کیا ہو۔ بہت سے چینلز نے ان کے گھر جا کر ان کے فیملی انٹرویو بھی کئے ہوئے تھے۔ کراچی کی ٹارگٹ کلنگ میں کسی سے دشمنیاں نہیں نکالی جارہیں، یہ تو ملک دشمنی ہے، کراچی کا امن تباہ کرنے کی سازشیں ہیں، کراچی پاکستان کی معاشی ترقی کا صدر دروازہ ہے، اگر اسے بند کر دیا جائے یا اسے خراب کر دیا جائے، تو ترقی کیسے اندر داخل ہو سکے گی۔ اس واقعہ سے دو روز قبل ہی سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے بیٹے کا اغوا بھی حکومتوں کے لئے لمحہ فکریہ تھا، ابھی حکومتی مشینری اس اغوا پر اپنی سرگرمیوں کا آغاز ہی کر رہی تھی، ابھی مغوی کو تلاش کرنے والوں کے لئے ایکٹ کروڑ روپے انعام کا اعلان ہی کر رہی تھی کہ دوسرا المناک واقعہ رونما ہو گیا۔ وفاقی حکومت نے مرحوم کے اہل خانہ کے لئے ایکٹ کروڑ روپے دینے کا اعلان کیا ہے، جب کہ ان کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی وفاقی حکومت نے خود ہی اٹھانے کا کہا ہے۔ اگرچہ اسے حکومت کا مثبت اقدام قرار دیا جاسکتا ہے، مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر لوگوں کی جان اور مال کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کب نبھائے گی، کراچی میں پولیس کی ناکامی کے بعد رینجرز کے ذریعے آپریشن کے بھی اگرچہ بہتر نتائج برآمد ہو

رہے ہیں، مگر آخر کیا وجہ ہے کہ ٹارگٹ کلنگ کا خاتمہ نہیں ہو رہا۔

کراچی میں قتل و غارت کا سلسلہ تین دہائیوں سے جاری ہے، کونسا طبقہ ہے جس کے بڑے بڑے رہنما ٹارگٹ کلنگ کی بھیجٹ نہیں چڑھے۔ مذہبی رہنما، قانون نافذ کرنے

والے اداروں کے اعلیٰ حکام، نمایاں بیوروکریٹس، غیر ملکی سفارتکار، اہم عدالتی شخصیات، مخیر حضرات، انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے، تاجر، صنعتکار، صحافی اور سیاسی و سماجی شخصیات دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بنیں۔ کتنے چراغ گل ہوئے، کتنی تاریکی بڑھی، کتنا لاقانونیت میں اضافہ ہوا۔ روشنیوں کا شہر کس طرح ایک تاریک جنگل کا روپ دھار گیا، صنعت و تجارت کے مرکز کو کس کی نظر لگ گئی کہ اس کا سکون تباہ

ہو گیا۔ یہی کراچی تھا جس نے پورے ملک کے تمام کلچر اپنے اندر سمو لیے تھے، یہاں پختون برادری کا عمل دخل بہت زیادہ ہے، یہاں بے شمار پنجابی روزگار کی تلاش میں آئے، سندھ کا تو یہ شہر ٹھہرا، بلوچوں کا بھی یہاں بہت اثر ہے۔ مہاجروں کی تو اکثریت ہے۔ اس شہر کا تو دامن بہت وسیع تھا، اس کی بائیں ہر کسی کے لئے کھلی تھیں۔ کب امن بحال ہوگا، حکومتیں غیر سنجیدہ ہیں، یا وہ توجہ نہیں دیتیں، یا معاملہ ان کے بس سے نکل چکا ہے، کچھ تو ہے، کہ معاملہ کنٹرول میں نہیں آ رہا۔ یہاں تو بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ خفیہ کیمرے بھی ناکارہ تھے۔ جو بھی تھا، جو بھی ہوا، بہت برا ہوا۔ قیمتی لوگ جو بے ضرر ہی نہیں، لاکھوں لوگوں کے دلوں کی

دھڑکن تھے، غیر متنازع تھے، ظلم کا شکار ہو گئے۔ امجد صابری اپنا طویل روزہ قیامت کے دن ہی افطار کریں گے، اور اپنی اس معروف قوالی کا مصداق ہو گئے کہ ”لوٹ کر میں نہ جاؤں گا خالی...“۔

وڈے سائیں نے سندھ اسمبلی میں ایکٹ نیا ریکارڈ قائم کر دیا، اپنے ہی قائم کردہ ریکارڈ کو توڑ دیا۔ گزشتہ روز انہوں نے سندھ اسمبلی میں دو گھنٹے باون منٹ طویل خطاب کیا۔ اس دوران مذاق، طنز، طعنے، مخالفتیں، ترقی اور دیگر امور پر بات ہوئی۔ ظاہر ہے اس قدر طویل خطاب میں تنوع تھا تو دلچسپی قائم رہی۔ وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر کو ہمیشہ کی طرح شعروں سے بھی مزین کیا، اور غلط شعر پڑھنے والی اپنی روایت کو قائم رکھا۔ بھول جانا ان کی پرانی عادت ہے، شعر اکثر بھول جاتے ہیں اور بعض اوقات تو دوسروں کے نام بھی، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے امجد صابری کے قتل پر بات کرنا چاہی تو وہ جنید جمشید کو شہید کہہ گئے۔ اس سے ایکٹ اندازہ تو ہوتا ہے کہ جنید جمشید کو بھی وہ اچھی طرح جانتے ہیں، ورنہ یہ نام ذرا مشکل سے زبان پر چڑھتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی سیٹ بھی بھول جاتے ہیں، جس پر انہیں ان کی مخصوص نشست کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

طویل ترین تقریر میں یقیناً اپوزیشن نے مداخلت بھی کی، جس کا شاہ صاحب نے خوب جواب دیا، پورا بازو ایک طرف کو لہراتے ہوئے مخالف کو مخاطب کیا، ان کے

طعنوں کے جواب دیئے اور جوابی طعنے ارسال کئے۔ اسی دوران سپیکر سراج درانی نے بھی اپنے وزیر اعلیٰ کا بھرپور ساتھ دیا، اور اپوزیشن کے تقریر میں مداخلت کرنے والے ارکان کو اس طرح ڈانٹا جیسے کوئی سخت مزاج استاد اپنی کلاس کو ڈانٹتے ہیں۔ ”سٹ ڈاؤن، سٹ ڈاؤن، اسمبلی کا ماحول خراب نہ کریں۔“ اس جملے کو دہرایا بھی گیا اور باڈی لینگویج کا بھی بھرپور استعمال کیا گیا۔ یوں یہ تقریر طویل سے طویل ہوتی گئی۔ تقریر کے دوران وزیر اعلیٰ نے اچانک سپیکر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا، ”سائیں! آپ میری تقریر سے بور تو نہیں ہو رہے۔“ سپیکر وزیر اعلیٰ کی تقریر سے یقیناً بور نہیں ہو رہے ہونگے، کیونکہ وہ تو ’وڈا سائیں‘ ہیں، اور ان کے سامنے بولنا یا انہیں ٹوکنگناہ سے کم نہیں، یہ اپوزیشن ہی ہے جو گستاخی وغیرہ کرتی رہتی ہے، ورنہ پی پی کے ترکش میں ان سے بہتر کوئی تیر نہیں۔

قائم علی شاہ نے اپنے ہیلی کاپٹر کو بابا آدم کے زمانے کا کہا اور بتایا کہ اس میں جان خطرے میں ڈال کر سفر کیا جاتا ہے۔ یہ جام صادق کے دور میں خریدا گیا تھا۔ اب بھی اگر نیا ہیلی کاپٹر لینے کی بات ہوئی ہے تو لوگوں کو پریشانی ہو رہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ یار لوگ شاہ صاحب کو بھی قدیم زمانے کا انسان سمجھتے ہیں، اس ضمن میں مذاق اور مزاح سے بھرپور تصاویر اور تحریریں اخبارات اور سوشل میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ

صاحب کو کسی بھی صوبے کا سب سے زیادہ عمر رسیدہ وزیر اعلیٰ ہونے کا شرف حاصل ہے، آخر ان میں کوئی خوبی تو ایسی ہے کہ سندھ میں پی پی پی کی نگاہ انتخاب سید قائم علی شاہ پر ہی پڑی ہے۔ ان کی زندہ دلی اور مخالفین کو آڑے ہاتھوں لینے کی پالیسی بھی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے، جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر اس ہیلی کاپٹر کے بارے میں کسی صحافی یا مخالف سیاستدان سے معلوم کیا جاتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ یہ ہیلی کاپٹر قائم علی شاہ کے زمانے کا ہے۔ مگر انہوں نے ہیلی کاپٹر کی قدامت کو مزید طول دینے کے لئے اسے بابا آدم سے جا ملایا، ظاہر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے وہیں تک مشال دی جاسکتی ہے۔

وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ اسم با مسئلہ ہیں، وہ ایک عرصے سے قائم ہیں اور آج بھی مخالفین کے طعنوں اور طنزوں کے تیر سہتے ہیں، انہیں جواب دیتے ہیں مگر اپنی سیٹ پر قائم دائم ہیں۔ بہت ساری ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باوجود بھولنے والی عادت ذرا پریشان کرتی ہے، مگر شاہ صاحب اس معاملے میں پڑتے ہی نہیں، تقریر کے دوران تو چونکہ وہ اکیلے ہی کھڑے ہو کر تقریر کر سکتے ہیں، اسمبلی کے فلور پر کوئی ان سے تعاون نہیں کر سکتا، مگر گزشتہ روز بھی جب وہ تعزیت کے لئے مرحوم امجد صابری کے گھر گئے تو حسب روایت میڈیا نے انہیں آن لیا، اس موقع پر انہوں نے جو بات بھی کی، ان کے کان میں

سرگوشی کی آواز ضرور آئی، تاکہ وہ کسی کا غلط نام نہ بول جائیں۔ اگر سرگوشی کرنے والے کسی صاحب کی مستقل ڈیوٹی لگا دی جائے تو شاہ صاحب اسمبلی میں شعر بھی درست پڑھ سکتے ہیں اور بھولنے والے دیگر معاملات سے بھی نجات پا سکتے ہیں۔

شیو چرن کو راجستھان کا رہائشی بتایا گیا ہے، اس کی عمر 84 برس ہے اور وہ میسرک کا امتحان دے رہا ہے۔ یہاں تک کی خبر ایک عام خبر ہے مگر اس کی دلچسپی آگے ہے، موصوف نے شرط رکھی تھی کہ میسرک کروں گا تو شادی کروں گا، وہ عمر کے آخری حصے تک میسرک کر سکا اور شاید نہ ہی شادی۔ اس خبر کا مزید دلچسپ اور اہم حصہ یہ ہے کہ شیو چرن آٹھ دہائیاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہا، بلکہ اس نے تقریباً 47 مرتبہ میسرک کا امتحان دیا، مگر ہر دفعہ اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اب اس کا کہنا ہے کہ چلنے پھرنے اور دیکھنے سننے میں بھی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور امتحان دینے کے لئے بھی اسے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے قریب سفر کرنا پڑتا ہے۔

یہ فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا، کہ آیا شیو چرن اپنے منزل پانے میں کامیاب ہوگا، یا زندگی کی بے وفائی کی بھیمنٹ چڑھ جائے گا۔ اگر اسے کچھ اور مہلت مل جائے تو وہ قیل ہونے کی نصف سینچری ضرور مکمل کر سکتا ہے، لیکن یہ مہلت قسمت کے ہاتھ میں ہے۔ خبر سے یہ معلوم نہیں ہوا کہ آیا شیو چرن نے جس شادی کے لئے میسرک کی شرط عائد کی تھی، یہ خود ساختہ تھی یا کسی نازنینہ کا

مطالبہ تھا۔ اگر یہ فریق ثانی کا مطالبہ تھا تو آیا وہ فریق بھی موصوف کے پاس ہونے کے انتظار میں بیٹھا ہے، یا اس کے فیل ہونے کی ہیٹرک مکمل ہونے کے بعد اپنی راہیں جدا کر چکا تھا۔ اگر راہیں جدا ہو چکی تھیں اور محترمہ کسی اور کے آنگن کی تلسی بن چکی تھی تو شیو صاحب کو بھی اس شرط کے پیچھے اس قدر بھاگنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ یہ میسٹرک کی منزل جس شرط پر حاصل کی جا رہی تھی، وہ منزل ہی اپنا وجود کھو چکی تھی۔

وقت گزرنے کے بعد میسٹرک کرنے سے کون متاثر ہوتا۔ یا پھر یہ ہوتا کہ جب موصوفہ نے دیکھ لیا تھا کہ مجنوں سے میسٹرک نہیں ہوتا، تو اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے میسٹرک سے مستثنا ہی قرار دے دیتی، تعلیم کی اپنی اہمیت ہے اور کسی مجنوں سے شادی کرنے کی اپنی۔

جس تعلیمی بورڈ سے شیو چرن امتحان دے رہا ہے، وہ بھی شاید اپنا مستقل ذریعہ آمدنی ضائع نہیں کرنا چاہتا، ممکن ہے کہ بورڈ نے اس کیس کو خصوصی کیس کے طور پر اہمیت ہی نہ دی ہو، بس ہر سال ایک آدمی آتا ہے، داخلہ فیس بھرتا ہے، امتحان دیتا ہے، ناکامی کی صورت میں اگلے برس پھر امیدوار بن کر آ جاتا ہے۔ اگر بورڈ والے غور کرتے تو پانچ سات مرتبہ فیل ہونے پر امیدوار کو بلاتے، جن مضامین میں موصوف کے پاس ہونے کے امکانات نہیں تھے، ان میں رعایتی نمبر دیتے اور ایک تقریب کر کے سند اُس کے ہاتھ میں تھماتے۔ پانچ سات کا تو ذکر ہی کیا، یہاں تو بات پانچ دہائیوں تک پہنچ گئی، مگر کسی نے اس کو اعزازی

سند دینے کا اعلان نہ کیا۔ شاید اب بورڈ والے اس انتظار میں ہوں کہ وہ نصف سینچری مکمل کر لے تب ہی اسے کسی اعزاز کے ساتھ میشرک کی سند سے نوازا جائے، تاہم بورڈ والوں کو مزید ریکارڈ کے چکر میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہیے، یہ نہ ہو کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ بورڈ نے اگر اپنی آمدنی کے چکر میں شیو چرن کو رعایتی نمبر دے کر پاس نہیں کیا اور میشرک کی سند سے نہیں نوازا، تو بھی وہاں کی صوبائی حکومت، یا تعلیم کی وزارت یا کوئی این جی او یا کوئی بڑی شخصیت ہی اس کام کا بیڑہ اٹھالیتی اور اس بیچارے کی میشرک سے جان چھوٹ جاتی۔ بزرگ شہریوں کو حکومتیں جہاں بے شمار دیگر سہولتیں فراہم کرتی ہیں، انہیں بہت سے معاملات میں استثناء حاصل ہوتا ہے، اگر یہاں بھی ہو جاتا یا اب بھی ہو جائے تو یہ بھی ایکٹ ریکارڈ ہی ہوگا۔ راجستھان میں چوراسی سالہ میشرک کے سٹوڈنٹس کو دیکھ کر اپنے چولستان کے مناظر بھی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں، راجستھان اور چولستان سرحد کے آر پار ہیں، مگر دونوں کی صورت حال ایک دوسرے کے برعکس ہے، بھارت نے وہاں نہروں کو 'اپ لفٹ' کر کے علاقے کو سیراب کرنے کی کوشش کی ہے اور پاکستان کے اس علاقے میں خشک سالی کے ڈیرے رہتے ہیں۔ وہاں انہوں نے صحرا میں موجود قلعوں میں ثقافتی رنگٹ بکھیرے ہیں، یہاں چولستانی قلعے اپنا وجود کھو رہے ہیں۔ وہاں چوراسی سالہ بابے میشرک کے پیچھے بھاگتے ہیں، چولستان میں شرح تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔

نسیم بی بی پہلے ہی ناراض ہو کر میکے گئی ہوئی تھی، میاں چنوں کے اس دیہاتی گھر میں اب عبدالرشید تھا اور اس کے چار بچے۔ وہ شام کو مزدوری سے واپس آیا تو تین سالہ محمد حفیظ نے عید کے کپڑوں کا ذکر چھیڑ دیا، ساتھ ہی جوتی کا مطالبہ کر دیا، جب مطالبے کی شدت میں اضافہ ہوا تو والد نے بچے کو جھڑک کر خاموش ہو جانے کے لئے کہا، مگر بچہ چھوٹا تھا، اس لئے زیادہ خوفزدہ ہونے کی بجائے مزید ضد کرنے لگا اور رونے لگا، اب باپ طیش میں آگیا اور تین سالہ حفیظ کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ بچہ بے ہوش ہو گیا، اس کا باپ اسے ہسپتال لے گیا، مگر بچہ جانبر نہ ہو سکا اور عید پر نئے کپڑے اور جوتی پہننے کی حسرت دل میں لئے اس دُکھی دنیا سے کنارہ کر گیا۔ خبر کی بھٹک پا کر پولیس بھی موقع پر پہنچ گئی جس سے والد کی گرفتاری اور تین سالہ بیٹے کا پوسٹ مارٹم عمل میں آیا۔

چشم تصور سے اس گھر کو دیکھئے، جس میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، جہاں چار بچوں کی ماں بچوں کو باپ کے حوالے کر کے خود اپنے باپ کے گھر چلی گئی ہے۔ ماں یا خاتون کے بغیر تو گھر بھی ویرانہ ہی ہوتا ہے، ممکن ہے بچوں کے کھانے پینے کا بندوبست ان کے والد کی کسی رشتہ دار خاتون نے کر دیا ہو، مگر

دو چار دن تو رشتہ دار تعاون کرتے ہیں اور پھر منہ پھیر لیتے ہیں۔ بچے عارضی طور پر ہی سہی، ماں کی مامتا سے محروم تھے، جب کبھی والد کے ہاتھوں بچوں کی شامت آتی ہوگی تو ماں ڈھال بنتی ہوگی، بچوں کی حفاظت کرتی ہوگی اور انہیں باپ کے غضب سے بچاتی ہوگی، مگر اُس روز تو ماں تھی ہی نہیں، جب تین سالہ بچہ کپڑوں اور جوتی کا مطالبہ کر رہا ہوگا تو دوسرے بچے خوفزدہ ہو کر منظر دیکھ رہے ہوں گے، مگر ان کے خوف نے اس وقت حقیقت کا رنگ اختیار کر لیا، جب بچے کی ضد اور والد کے غضب میں اضافہ ہوتا گیا۔ ذرا دیکھئے وہ منظر جب باپ ایکٹ معصوم سے بچے کو اٹھا کر بیچ رہا ہوگا اور دوسرے بچے بے بسی سے دیکھ رہے ہوں گے۔ بچے یہ منظر مرتے دم تک نہیں بھلا سکیں گے، اپنے ہی باپ کے اس اقدام کو وہ تاحیات نفرت اور غصے سے یاد کریں گے۔ اب انجام کار کیا ہوگا، شاید باپ یہ عید جیل میں گزارے گا، پھر رشتہ دار اکٹھے ہوں گے اور دوسرے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر یہ فیصلہ کریں گے کہ عبدالرشید کو جیل سے چھڑوانے کی سعی کی جائے، تاہم بچوں کی ماں تو گھر ضرور آچکی ہوگی۔

حفیظ پر پانچ سات سو روپیہ نہ لگانے والے باپ کو اب کس قدر خرچ کرنا پڑے گا اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ اب حفیظ پر ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ پہلے اس کے لئے کفن کی صورت میں نئے کپڑے خریدے جائیں گے، پھر اس کے لئے الگ سے قبر کی

صورت میں مستقل کمرہ تیار کیا جائے گا جس پر بھی خرچہ اٹھے گا۔ پھر اپنے ہاں رسوم و رواج کی کہانی بھی ہے۔ جن پر بلا مبالغہ ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں اور اپنے ہاں امیر ہو یا غریب پورا معاشرہ ان رسوم و رواج کے جکڑ بندیوں میں الجھا ہوا ہے۔

عبدالرشید کا یہ گھر ہمارے معاشرے کے اکثر خاندانوں کا عکاس ہے، گھر گھر میں میاں بیوی میں لڑائی ہے، لڑائی کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر لڑائی والے اکثر گھروں کا مشترکہ ایٹو غربت ہی ہے۔ جب شام کو مزدور واپس آتا ہے تو وہ بیوی بچوں کے مطالبات پورے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ تب لڑائی کا آغاز ہوتا ہے۔ بچوں پر میاں بیوی کی لڑائی کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس پر کسی نے کبھی غور نہیں کیا، لڑائی کرنے والے تو ظاہر ہے جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اس کے مضمرات اور نتائج کو مد نظر نہیں رکھ سکتے۔ مگر معاشرے کے کسی طبقے یا حکومت کے کسی ادارے نے بھی اس ایٹو کو اہمیت نہیں دی۔ اپنے ہاں حکومتوں کو دیکھا جائے تو ان کے میگا پراجیکٹس عام آدمی کے فائدے کے لئے نہیں ہوتے، مگر فنڈز دوسرے علاقوں کے ترقیاتی کاموں میں سے کاٹے جاتے ہیں، کیا حکمران اپنی مراعات عوام کے خون سے نچوڑ کر حاصل نہیں کرتے؟ مزدور کی آمدنی میں گزارہ بھی مشکل ہے، چہ جائیکہ اس سے اضافی ضرورتیں بھی پوری کی جاسکیں اور ضروری خوشیاں بھی خریدی جاسکیں۔ مختصر حضرات کے لئے بھی لمحہ فکریہ ہے اور معاشرے کے لئے بھی، کیا ہم سب لوگ اپنے اخراجات کو جواز فراہم کر سکتے ہیں، کیا معاشرے کے ان حالات

کی موجودگی میں ہزاروں روپے کی کس کی افطاری جائز ہے؟

مسجد کے اندر بہت سارے موٹر سائیکل کھڑے کرنے کی جگہ ہے۔ بروقت آنے والے نمازی اپنے موٹر سائیکل اندر کھڑے کرتے ہیں اور تاخیر سے آنے والوں کو پارکنگ باہر کرنا پڑتی ہے، جہاں کچھ گاڑیاں وغیرہ بھی کھڑی ہوتی ہیں۔ مسجد سڑک سے کچھ اونچی ہے، اندر آنے والے تمام موٹر سائیکل سوار اپنی سواری پر چڑھ کر ہی اندر داخل ہوتے ہیں، میں نے کبھی کسی صاحب کو باہر موٹر سائیکل بند کر کے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا، مسجد انتظامیہ نے واضح طور پر وہاں لکھ رکھا ہے کہ موٹر سائیکل باہر جا کر شارٹ کریں، مگر ہر کوئی موٹر سائیکل اندر ہی شارٹ کرتا اور اس پر بیٹھ کر باہر آتا ہے۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ہو رہا ہوتا ہے، جب سامنے صحن میں نمازی اپنی نماز اور عبادت میں مصروف ہوتے ہیں۔ مسجد کے اس منظر کو دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کا سکول یاد آتا ہے، سکول عام کھیتوں سے ذرا اونچی جگہ پر تھا، چار دیواری چھوٹی ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے لوگ دکھائی دیتے تھے۔ طلباء جب کسی استاد کو سائیکل پر آتے ہوئے دیکھتے تو گیٹ کی طرف بھاگتے، ماسٹر صاحب سائیکل روک ہی رہے ہوتے تھے کہ طلباء ان سے سائیکل پکڑنے کی دوڑ میں شامل ہو جاتے، کوئی ایکٹ کامیاب ہو جاتا تو وہ سائیکل سکول کی حدود میں لے جاتا۔ تصور نہیں تھا کہ کوئی استاد بھی سائیکل پر چڑھ کر سکول میں داخل

ہو سکے۔ یہاں مساجد کا احترام بھی کوئی نہیں کرتا۔

بات سواری پر ختم نہیں ہوتی، جوتی جہاں آپ نے اتار دی، واپسی پر تلاشِ بسیار کے بعد ہی ملے گی، یا پھر اتار کر کسی محفوظ جگہ پر رکھیں۔ رمضان المبارک میں چونکہ رش معمول سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے جوتیوں کا مسئلہ ہی رہتا ہے۔ بعد میں آنے والے اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ وہ جوتا پہن کر جوتوں کے اوپر سے گزرتے رہتے ہیں، اگر آپ نے غلطی سے جوتی اسی قطار میں رکھی تھی، تو واپسی پر ذہنی طور پر تیار رہیے کہ اس پر سے کئی لوگ جوتے پہن کر گزر چکے ہونگے اور اس کی حالت بگڑ چکی ہوگی۔ میں نے غور کیا ہے کہ بہت سے معقول پڑھے لکھے لوگ بھی جوتے پہن کر نیچے توجہ نہیں کرتے کہ وہ لوگوں کی جوتیوں پر چل رہے ہیں یا فرش پر۔ ہماری مسجد میں گرمیوں میں پانی والے پتکے چلتے ہیں، جن کی ٹھنڈی فوار گرمی کا زور توڑتی ہے، ہر پتکے کے سامنے چار پانچ لوگوں کی اجارہ داری ہے، وہ پہلے آکر وہاں ڈیرہ ڈال لیتے ہیں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی سیٹ ’سہ زرو‘ کرنے کے لئے وہاں کپڑا وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ مسجد میں موبائل کا کلچر بھی عام ہے، ویسے تو ہر مسجد میں نمازیوں کی یاد دہانی کے لئے یہ لکھ رکھا ہوتا ہے کہ ”اپنے موبائل فون بند کر دیں“، اس

کے علاوہ نماز باجماعت کے وقت بھی اعلان کیا جاتا ہے، مگر نماز کے دوران موبائل گھنٹیاں بجنے کا عمل لازمی سامنے آتا ہے، ظاہر ہے فون کرنے والے کو تو یہ معلوم نہیں کہ جسے وہ فون کر رہا ہے وہ کس جگہ ہے اور کس عمل میں مصروف ہے۔ اس لئے کسی کی گھنٹی بجی تو بار بار بجتی رہتی ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اکثر لوگ فون بند کرنے کی بجائے فوراً کال سنتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں، جو فون آن کر کے نمازیوں کے کندھوں کے اوپر سے راستہ بناتے باہر کی جانب لپکتے ہیں، اس دوران ان کی بات چیت بھی جاری رہتی ہے، نہ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ میری وجہ سے لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہیں، میری وجہ سے دوسروں کو پریشانی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ہماری مسجد میں افطاری کا اہتمام کیا گیا تھا، شام سے ہی تیاریاں شروع ہو گئیں، دریاں بچھ گئیں، دیکیں آنے لگیں، اور دیگر لوازمات تیار ہونے لگے۔ نہ جانے کہاں سے سیکڑوں لوگ جو عام طور پر وہاں نہیں پائے جاتے تھے، افطاری کے لئے آدھمکے۔ اس اچانک رش پڑنے سے بہت سے نمازیوں کو صف کے بغیر فرش پر ہی نماز ادا کرنا پڑی۔ انتظامیہ نے کھانا نماز کے بعد رکھا تھا، بس لوگوں نے فرض نماز کو ہی کافی جانا اور کھانے کے لئے دسترخوان پر بروقت قابض ہو کر بیٹھ گئے، اگلے چند منٹوں میں انہوں نے کھانے کے ساتھ خوب انصاف کیا، وہ تو چلے گئے، انتظامیہ کو البتہ صفائی کی سخت مصروفیت مل گئی کیوں کہ تراویح کا وقت قریب تھا۔ میں پورے رمضان المبارک میں یہی سوچتا رہا کہ ہم صفائی، سلیقہ

اور تہذیب کب سیکھیں گے؟ ہمیں یہ باتیں کون سکھائے گا؟

سرگودھا کی داد خان فیملی کو ”حسن کارکردگی“ ایوارڈ کون دے گا؟ اس کا فیصلہ محکمہ تعلیم نے کرنا ہے یا محکمہ بہبود آبادی نے! اگر ہمت کریں تو دونوں محکمے ہی اعلیٰ اور منفرد کارکردگی کی بنا پر اس خاندان کو ایوارڈ دے سکتے ہیں۔ داد خان اور اس کی اولاد نے دونوں محکموں کا سر ہی فخر سے بلند کر دیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود پنجاب حکومت ہی آگے بڑھ کر ان کو کوئی تمغہ عطا کر دے۔ یہ ریکارڈ یوں قائم ہوا کہ سرگودھا کے مضافات میں جھل چکیاں کے مقام پر 85 سالہ داد خان رہائش پذیر ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے کثرتِ اولاد کی نعمت عطا کی ہے، وہ اکیس بچوں کے والد ہیں، وہ مزید شادی کے بھی امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے وہ بزرگ ہیں اور جب بچے اکیس ہونگے تو وہ سارے ”بچے“ ہی نہیں ہونگے بلکہ اب تو ان میں سے زیادہ تر بڑے ہو چکے ہوں گے۔ ریکارڈ یہ بھی ہے کہ ان تمام بچوں میں سے کسی نے کبھی کسی سکول کا منہ نہیں دیکھا۔ سکول کا منہ نہ دیکھنا اگرچہ ایک محاورہ ہے، کام کے سلسلے میں ان بچوں میں سے کوئی سکول کے سامنے سے گزرا ہو اور اس نے انجانے میں سکول کا منہ دیکھ لیا ہو تو کچھ کہا نہیں جاسکتا اور نہ ہی ایسے میں سکول کا منہ دیکھنے والے پر کوئی الزام دھرا جاسکتا ہے۔

دوسرا ریکارڈ یہ بن گیا کہ داد خان کے بڑے بیٹے فرید نے بھی ہمت سے کام لیا اور وہ بھی اپنی اولاد میں اکیس کے ہند سے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کٹورے پر کٹورا، پیٹا باپ سے بھی گورا۔ اب بیٹے کا کہنا ہے کہ ابھی تو اس نے والد کا ریکارڈ برابر کیا ہے، وہ یہ ریکارڈ توڑنے کے لئے پر عزم ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ریکارڈ کو کسی بلند ترین سطح پر لے جائے کہ تیسری نسل میں سے کوئی ایسا سورما پیدا نہ ہو جو اپنے باپ دادا کا قائم کیا ہوا ریکارڈ توڑ سکے۔ یہاں تک تو بچوں کی تعداد کا ریکارڈ تھا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، مگر اس کے بعد بھی ایک ریکارڈ ہے، وہ یہ کہ باپ کی طرح بیٹے کا بھی کوئی بچہ کبھی سکول نہیں گیا۔ اس گھرانے کے کل افراد کی تعداد نوے بتائی جاتی ہے، جن میں سے کسی کو سکول جانے کی توفیق نہیں ہوئی، ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کسی کے لئے سکول جانے کا ماحول پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ لوگ کبڑا کام کرتے ہیں اور بچوں کے والدین کا قول ہے کہ بچے جتنے زیادہ ہونگے اتنا ہی ان کے کاروبار کا پھیلاؤ ہوگا، اسی قدر محنت کریں گے اور زیادہ آمدنی گھر آئے گی۔ داد خان کا یہ بھی قول ہے کہ اگرچہ بچوں نے تعلیم حاصل نہیں کی، مگر ایک تو وہ کام سے مطمئن ہے، دوسرا یہ کہ اس کی پوری اولاد خاندان کا سربراہ ہونے کے ناطے اس کی بہت عزت کرتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے۔ یہ خاندان تیس برس قبل افغانستان سے آیا تھا، اب پاکستانی شہری کی حیثیت سے خوشحال زندگی گزار رہا ہے اور محکمہ بہبود آبادی کے اس سلوگن

کم بچے، خوشحال گھرانہ“ کا منہ چڑا رہا ہے۔“

یہاں ایک گھر کے افراد کی تعداد نوے ہے تو یقیناً ان کے عزیز واقارب بھی ساتھ رہتے ہونگے، یوں یہ سیکڑوں افراد پر مشتمل ایک بے ترتیب آبادی ہوگی، جہاں پر نہ گاؤں کی طرح کا نقشہ ہوگا اور نہ کوئی کالونی کا منظر ہوگا، یقیناً اس آبادی تک کوئی معقول سڑک بھی نہیں جاتی ہوگی۔ صبح سویرے بڑے چھوٹے کباڑ اکٹھا کرنے نکلتے ہونگے اور دوپہر یا شام تک اپنے اپنے حصے کا کاروبار کر کے لوٹ آتے ہونگے۔ سرگودھا کوئی پسماندہ علاقوں میں شامل نہیں ہے۔ یہ تو پٹنہان لوگوں کا قصبہ ہے کہ وہ محنتی قوم ہے، اور سب مل جل کر گھر کے ایک بزرگ کی سربراہی میں کام کر رہے ہیں، ایسے مناظر تو شہروں کے اندر بھی موجود ہیں، جہاں پر خانہ بدوشوں کی صورت میں غلیظ جھونپڑیوں میں خاندان کے دسیوں افراد رہتے ہیں اور ان کے بچے کھرے کے ڈھیروں سے کاغذ اور پلاسٹک کی بوتلیں پھنستے دکھائی دیتے ہیں، سکول کا منہ یہ بھی نہیں دیکھتے۔ چولستان کے دور دراز علاقوں میں پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے بہت سے سکول قائم کر دیئے ہیں، یہ داد خان فیملی تو عام علاقے میں رہتی ہے، یہاں بھی اگر فاؤنڈیشن والے ”نیو سکول پروگرام“ کے تحت ایک سکول بنا دیں تو اس خاندان کا یہ ریکارڈ تو ٹوٹ سکتا ہے، کہ کسی ایک بچے نے بھی سکول کا منہ نہیں دیکھا۔ شاید یوں تیسری نسل میں ہی کوئی خوشگوار تبدیلی رونما ہو سکے۔

!بتلیاں اور جگنو

وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے جٹو پارک میں سیکڑوں بتلیاں آزاد کیں۔ یہ کارِ خیر انہوں نے پارک میں اپنی نوعیت کے پہلے ’بوٹنیکل گارڈن‘ کا افتتاح کرتے ہوئے سرانجام دیا۔ یہاں ’بٹر فلائی ہاؤس‘ بنایا گیا ہے۔ افتتاح کے موقع پر وزیر اعلیٰ نے کہا کہ قوم کو اچھی خبریں بھی ملنی چاہئیں، معاملات کے مثبت پہلو بھی لوگوں کو دکھائے جائیں، تاکہ ٹینشن سے نکلیں۔ انہوں نے بٹر فلائی ہاؤس میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ بات تو طے ہے کہ جس بات میں میاں صاحب دلچسپی لے لیں اس کو منطقی انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں، اور جس کام میں ان کی دلچسپی گہری ہو جائے تو پھر معاملہ راتوں رات کا ہو جاتا ہے، کہ ریکارڈ مدت میں کام تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ اب پہلا کام تو یہ ہوگا کہ بٹر فلائی ہاؤس کی روایت سب سے پہلے لاہور کے اہم اور بڑے پارکس میں منتقل ہوگی، اس کے بعد وزیر اعلیٰ یہی کام کرنے کے لئے ڈویژنل افسران یعنی کمشنرز کو احکامات دیں گے۔ اور اگلے مرحلے میں ضلع کی سطح پر یہی ”قتلی گھر“ بنائے جائیں گے۔ یوں اس گہری دلچسپی کا نتیجہ اگلے چند ماہ میں منظر عام پر آجائے گا۔ خاص طور

پر جن شہروں میں ہارٹیکلچرل سوسائٹیز قائم ہیں، وہاں پر ایک آدھ ماہ میں تتلی ہاؤس بننے شروع ہو جائیں گے۔ اگر یہی افتتاح میاں صاحب سے کچھ عرصہ قبل کروالیا جاتا تو موجودہ بجٹ میں بھی تتلیاں بھری جاتیں، یہی حکم شہر شہر کو جاری کر دیا جاتا، مگر کچھ روز کی تاخیر ہوئی، مگر مایوسی کی ضرورت نہیں، خوش ذوق لوگ خاطر جمع رکھیں، مختلف پراجیکٹس سے تتلیوں کے لئے کچھ رقم نکالنا کوئی بڑی بات نہیں۔

تتلیوں کے عام ہونے کا موسم تو آگیا، کیونکہ اب وہ سرکاری سرپرستی میں پرورش پائیں گی، اور حکومت کی ہی حمایت میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ بٹر فلائی ہاؤس میں یقیناً تتلیوں کی پیدائش سے لے کر باغ کی رونق بڑھانے تک کے تمام مراحل روبہ عمل لائے جاتے ہوئے، پہلے ان کی نرسری تیار ہوتی ہوگی اور تب انہیں آزاد کیا جاتا ہوگا۔ جب جلو پارک میں سیر کرنے والے خواتین و حضرات اور بچے پارک میں آئیں گے تو تتلیوں کو وہاں پا کر ان کی خوشی کی انتہا ہو جائے گی۔ رنگ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے پارک میں بھاگتے کھیلتے بچے بھی تتلیوں کی طرح ہوتے ہیں، یوں تتلیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی قوم کے چھوٹے بڑے سپوت تتلیاں پکڑنے کے بہت

شوقین ہوتے ہیں، یہی بچے جنہیں ہم پیار سے متلیاں ہی قرار دے دیتے ہیں، پارک میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتے رہے ہوں گے اور متلیاں ان ننھے شکاریوں سے بچنے کے لئے ادھر ادھر اڑائیں بھرتی دکھائی دیں گی۔ اکثر پارکوں اور باغات وغیرہ میں لکھا ہوتا ہے کہ ”پھول توڑنا منع ہے“، مگر اس تحریر کو دیکھ کر پھول توڑنے سے کوئی باز نہیں آتا۔ یا تو کسی مالی یا محافظ وغیرہ کو کھڑا دیکھ کر پھول نہیں توڑے جاتے، یا پھر مہذب والدین اس کام سے منع کرتے ہیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ پھولوں والے پودوں کے گرد ایسی باڑ لگا دی جاتی ہے، جسے عبور کر کے پھول توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر تتلیوں کا معاملہ پھولوں سے کچھ مختلف ہے، کہ پھولوں کے پودے کسی حصار میں لائے جاسکتے ہیں، مگر ان تتلیوں کو بہت بڑے پیمانے پر قید نہیں کیا جاسکتا، اس لئے ان کے شکاریوں اور دشمنوں کو روکنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

متلیاں تو اب پنجاب بھر کے باغوں کی زینت بن ہی جائیں گی، کیونکہ معاملہ خادم اعلیٰ تک پہنچ چکا ہے۔ اگر بوٹنیکل گارڈن کے افسران، ذمہ داران اور ماہرین ایک قدم اور اٹھا کر جگنوؤں کو بھی بازیاب کروانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ایک تاریخی کارنامہ ہوگا۔ کیونکہ

نئی نسل تو اب جگنو کے نام سے ہی واقف رہ گئی ہے، اس کا وجود کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لوگ شاعری میں جگنوؤں اور تتلیوں کا ذکر پڑھتے ہیں تو حسرت سے بس جگنو کو یاد کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی جس طرح تتلی کو تصویر وغیرہ کے ذریعے جس طرح نمایاں کیا جاسکتا ہے اس طرح جگنو کی تصویر کشی بھی آسان نہیں، یا یوں جانئے کہ تصویر سے جگنو کی بھرپور عکاسی ممکن نہیں۔ خیبر پہلے تو قوم رنگ برنگی تتلیوں کی اڑانوں سے محفوظ ہو گئی، اس کی بڑھوتری اور حفاظت کی منصوبہ بندی کی بہر حال ضرورت ہے، اس کے لئے قوم کی تربیت کی ضرورت ہو گی۔ جب ہر طرف باغوں اور پارکوں میں تتلیاں اڑیں گی، تو دل کو بھانے کے مناظر ہوں گے اور قوم ٹینشن کی خبروں سے نجات پائے گی۔

ٹماٹر کی مقبولیت کی کوئی ایک وجہ نہیں، یہ خویوں کا منبہ ہے، سب سے پہلی اور اہم خوبی تو اس کی رنگت ہے، دور سے ہی یہ نظروں کو بھاتا اور اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، ایسا شوخ رنگ پایا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں، اگر یہ صحت مند اور صاف ستھرا ہو تو سونے پہ سہاگہ۔ یہ تو دکان دار کا کمال ہے کہ وہ کس طرح گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ٹماٹر ایک خوبصورت معاون سبزی ہے، اس کی خویوں کی بنا پر یار لوگ اسے کچا ہی کھا جاتے ہیں، بس کچھ نمک پاشی کرنا پڑتی ہے۔ ٹماٹر کو سالن کے لئے بھی لازم و ملزوم کر لیا گیا ہے، جس سالن میں ٹماٹر نہیں ہوگا، وہ ذائقہ کی دولت سے محروم ہی رہے گا۔ ٹماٹر کی رنگت تو محاورے کی صورت اختیار کر چکی ہے، سرخ و سپید رنگت والے کو ٹماٹر سے ہی تشبیہ دی جاتی ہے، یہ الگ کہانی ہے کہ ایسی رنگت ٹماٹر کھانے سے آتی ہے یا اس کے لئے کوئی اور خوراکیں بھی درکار ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، مگر یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ٹماٹر کھا کر ٹماٹر کا رنگ چڑھتا ہے۔ بات صرف رنگت پر ہی ختم نہیں ہوتی، ٹماٹر کی گول مٹول جُھریوں اور داغوں سے پاک (شکل بھی مشابہت کے لئے استعمال کی جاتی ہے، ظاہر) ہے جس کا رنگ ٹماٹر جیسا ہوگا تو چہرے کی تازگی اور صحت بھی ٹماٹر جیسی ہی ہوگی۔

ٹماٹر کو حضرت انسان نے (خاص طور پر کھانا پکانے کی اس ترقی کی دوڑ نے) بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ ٹماٹر کو صرف کاٹ کر اور اس کے اوپر نمک چھڑک کر کھانے کی بات ہی نہیں، اس کو کُٹ پیس کر اس کے چھوٹے بڑے پیکٹ بنائے جاتے ہیں، معاملہ 'ساشے' سے شروع ہوتا ہے اور کئی لیٹر تک جاتا ہے، ہر کوئی اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق خریدتا اور استعمال کرتا ہے۔ کھانے والی خشک چیزوں کا ذائقہ بڑھانے اور ان کی خشکی میں کمی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ فاسٹ فوڈ کے اس دور میں اب بہت سارے ساشے ساتھ ملتے ہیں۔ ٹماٹر کی خوبصورتی کا اس کی صحت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے، جب یہ کچھ پرانا ہو جاتا ہے تو اس پر جھریوں کا راج ہوتا ہے، وہ پلپلا بھی ہو جاتا ہے، دلچسپ بات ہے کہ ایسے میں بھی اس کی مانگ کم نہیں ہوتی، اس صورت میں اسے مقامی ہوٹل کی انتظامیہ خرید لیتی ہے، سالن میں ڈالنے کا کام تو ہوتا ہی ہے، اس کی مقامی سطح پر ہی کیچپ بھی بنائی جاتی ہے، جو ساشے یا کسی پیکنگ کی صورت میں نہیں، بلکہ کسی بوتل یا پلیٹ میں ڈال کر پیش کر دی جاتی ہے، ہم لوگ بحیثیت قوم چونکہ کھانے پینے کے بے حد شوقین واقعہ ہوئے ہیں، اس لئے یہ غور کم ہی کرتے ہیں کہ کھا کیا رہے ہیں؟ اسی کشمکش میں بہت کچھ کھا جاتے ہیں۔

ٹماٹر صرف کھانے کے کام ہی نہیں آتا، اس سے ایک اور اہم کام بھی لیا جاتا

ہے، وہ ناپسندیدہ لوگوں کو مارنے کے کام آتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے اس کا رِخیر کے لئے گلے سڑے ٹماٹر ہی استعمال میں لائے جاتے ہیں، مگر اس بات کا زیادہ امکان نہیں ہوتا، کیونکہ جس قدر ان کا استعمال ہوتا ہے، اتنی تعداد میں گلے سڑے اور خراب ٹماٹر کس نے محفوظ کر رکھے ہوں گے؟ ان ٹماٹروں کا استعمال اس وقت ہوتا ہے، جب کسی مخالف سیاستدان کا جلسہ ناکام کرنا ہو، کسی کی تقریب کی ایسی تیزی پھیرنی ہو، کسی کے استقبال کے پروگرام کو تہہ وبالا کرنا ہو، تو ایسے میں یہی ٹماٹر کام آتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایسی کاروائی زیادہ تر اپنے ہی لوگوں کے درمیان کی جاتی ہے، جہاں دودھڑوں کی بات ہو، کسی مخالف پارٹی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے ٹماٹر کے بدلے میں ڈنڈے بھی کھانے پڑ سکتے ہیں۔ حالیہ رمضان المبارک سے پہلے ٹماٹر کا اس قدر بڑا ریلو آگیا تھا، کہ دکانوں اور سڑھیوں پر ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا، اس صورت میں یہ پندرہ سے بیس روپے کلو فروخت ہو رہا تھا، مگر رمضان المبارک کے مہینے کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ یہ یکایک ڈیڑھ دو سو روپے کلو تک چلا گیا۔ حکومت اور اس کی پوری مشینری کے چھاپے ناکام ہو گئے، انہوں نے بہت کوشش کی مگر (ٹماٹر سمیت بہت سی اشیاء کی) قیمتیں ہاتھوں سے نکل گئیں۔ عید پر عوام اس ڈش سے محروم رہ گئے، تاہم 'ٹماٹر رنگٹ' لوگوں کے لئے یہ قیمت بھی زیادہ نہیں، اتنے مہنگے ٹماٹر کھانے والے ٹماٹر کی طرح نہ ہونگے تو کیا بے حال عوام کو یہ رنگٹ چڑھے گا؟

حکومت تقریباً پینتالیس روز سے اپنے سربراہ کے بغیر چل رہی تھی، کہ صاحب نے دردِ دل پال لیا تھا، یہ درد چونکہ زندگی کی بقا کے لئے خطرناک ہوتا ہے، اس لئے اس کا مداوا ضروری تھا۔ وزیراعظم نے اس درد سے جان خلاصی کے لئے انگلستان کا انتخاب کیا، کہ وہاں کے ڈاکٹر میاں صاحب کے دل کے رموز سے پہلے سے واقف تھے۔ سعودی عرب کے زمانے میں بھی یہی درد ایک آدھ مرتبہ جاگا تھا، لندن کے ڈاکٹروں نے اس کا بندوبست کر دیا تھا، کئی سال بعد ایک مرتبہ پھر اسی درد نے سراٹھایا تو لندن کے ڈاکٹروں کی ضرورت پیش آئی۔ میاں صاحب تو سنا ہے چیخ آپ کے بعد واپس آنا چاہتے تھے، مگر ڈاکٹروں نے اجازت نہ دی۔ اوپن ہارٹ سرجری ہوئی، پاکستان میں بیسیوں بکروں کی قربانی دی گئی، قوم کی دعائیں رنگ لائیں اور بکروں کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت پا گیا، سربراہ حکومت چند روز میں ہی چلنے پھرنے، واک کرنے اور شاپنگ وغیرہ کرنے کے قابل ہو گئے، ان کی اس قدر تیز رفتاری سے بہتر ہوتی ہوئی صحت کو دیکھ کر مخالفین نے اس آپریشن پر ہی شکوک کا اظہار کر دیا۔ وزیراعظم کی غیر موجودگی میں حکومت کا بندوبست اُن کے ایک عزیز و فاقی وزیر

نے سنبھالے رکھا، اگرچہ ان کا رویہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا، کہ اپوزیشن کا تو کام ہی
 تنقید ہے، خود 'ن' لیگ کے ارکان اسمبلی بھی موصوف کی تقریر کے دوران واک آؤٹ
 کر گئے، اُن کی طرف سے دی گئی افطار پارٹی میں بھی نہ گئے، اور پھر روایت کے عین
 مطابق وزیراعظم کی صاحبزادی مریم نواز کے کہنے پر ناراضگی ختم کر کے اپنی ڈگر پر واپس
 آ گئے۔ یوں وزیراعظم کی عدم موجودگی میں دو افراد نے ہی نظام حکومت چلایا، ایک
 اسحاق ڈار کہ بجٹ کا زمانہ تھا، یا یوں کہیے کہ اسحاق ڈار کا زمانہ تھا، بجٹ بناتے، ٹیکس
 لگاتے، غریبوں کا تمسخر اڑاتے، مہنگی دال والوں کو مرغی کھلاتے، اسحاق ڈار نے بجٹ
 منظور کروالیا۔ بہت سے امور مریم نواز کے ہاتھ میں بھی ہیں، فیصلے ان کی مرضی سے
 ہوتے ہیں، یہ بھی جمہوریت کا حُسن ہی ہے، کہ سیاست میں وراثت تو تھی ہی، اب
 حکومت میں بھی وراثت کا کلچر فروغ پا رہا ہے۔ وزیراعظم اپنی صاحبزادی کو تربیت کا
 موقع دے رہے ہیں، یہی جمہوریت کا فطری تقاضا ہے۔ مسلم لیگ ن کا خیال تھا کہ
 وزیراعظم کی آمد کے موقع پر تاریخی استقبال کیا جائے، دس لاکھ افراد کے اکٹھا کرنے کی
 منصوبہ بندی ہوئی تھی، تاہم بعد ازاں قیادت کے مشورے پر یہ منصوبہ ختم کر دیا گیا۔
 اگر استقبال ہوتا تو حکومت کو مزید تنقید کا سامنا کرنا پڑتا، اگر نہیں کیا جاتا تو حکومت کے
 بارے میں نرم گوشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تاہم اب بھی ایک سو کے قریب افراد اس بونگ
 طیارے پر آئیں گے، جن میں وزیراعظم کے خاندان کے افراد کے علاوہ ان کے عملے کے
 لوگ اور وہ

قریبی افراد جو وزیراعظم کی عیادت کے لئے لندن گئے ہوئے تھے۔ سو کے قریب افراد کو لینے جانے والے اگر استقبال کا ماحول نہ بھی بنائیں تو ہزاروں لوگ جمع ہو ہی جائیں گے۔ (یہ کالم وزیراعظم کا طیارہ اترنے سے پہلے لکھا گیا)

دوسری طرف اپوزیشن بھی وزیراعظم کے استقبال کے لئے تیار ہے، وزیراعظم پاناما لیکس کے معاملے کے جہاں سے ادھورا چھوڑ گئے تھے، بات وہیں سے شروع ہوگی، بیماری اور خوشی غمی تو انسان کے ساتھ ہے، مگر مسائل سے منہ موڑنا ممکن نہیں، اس لئے حالات جیسے بھی ہوں پاناما لیکس کا مسئلہ تو حل کرتے ہی بنے گی۔ شاید ایک مرتبہ پھر ایسا ہنگامہ اٹھے گا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی، اپوزیشن والے اپنے ڈھول بجائیں گے، حکومت اور اس کے حامی جوابی ہنگامہ کریں گے، یوں اس ہنگامہ آرائی میں سچ اور حقیقت کہیں دب جائے گا، کون سچا ہے، کون غلطی پر ہے، کون ظالم ہے، مظلوم کون ہے، کرپشن کس درجے پر ہے، ایمانداری کی کہانی کہاں تک ہے؟ نقار خانے میں توتی کی آواز کون سنے گا؟ عوام کچھ نہیں جان پائیں گے۔ ویسے بھی یار لوگ موجودہ حکومت کو بادشاہ کہتے ہیں، حقیقت میں پاکستان کے عوام بادشاہ ہیں۔ جو جہاں کھڑا ہے، اسی کا حامی ہے، اسی کی دلیلوں کو اپنے منہ کا لقمہ بناتا اور اسی کی جگالی کرتا ہے، کیا وزیر، کیا مشیر اور کیا حکومت کے حامی۔ یہی کچھ اپوزیشن کا سامان

ہے۔ جس زورہ موسم میں احتجاج کی سیاست ہوگی، دیکھیں کوئی نتیجہ نکلتا ہے، یا یہ طویل

میچ 'ڈرا' ہوتا ہے، اور پاکستانیوں کی قسمت اور حالات جوں کے توں رہتے ہیں۔

عید کی خوشی نوجوانوں نے یوں منائی کہ وہ موٹر سائیکل لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، سڑکوں پر انہوں نے دوڑیں لگائیں، راہ گیر ہراساں ہوئے، سوار یوں والے پریشان ہوئے اور ادھر ادھر ہنگامہ آرائی رہی۔ کچھ سڑکوں پر پیدل لوگ کم ہی ہوتے ہیں، یہ سڑکیں شوقین موٹر سائیکل سواروں کے لئے بہترین شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سڑکوں سے گزر گاہ کا کام تو لیا ہی جاتا ہے، مگر خوشی منانے والے نوجوان یہاں موٹر سائیکل کے کرتب بھی دکھاتے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر ایسے سواروں کے مختلف پوز دکھائے جاتے ہیں، ایک نوجوان موٹر سائیکل پر لیٹ کر اپنے موبائل کے ذریعے کسی کو ایس ایم ایس کر رہے ہیں، تبصرہ کرنے والے نے بھی خوب کہا کہ یہ صاحب حضرت عزرائیل کو ایس ایم ایس کر رہے ہیں کہ جلد تشریف لے آئیے۔ کوئی نوجوان موٹر سائیکل چلا رہے ہیں، مگر ان کا رخ کچھلی جانب ہے، کوئی چلتے موٹر سائیکل پر کھڑے ہیں، یہ سارے کرتب دکھاتے ہوئے ٹریفک بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے، لطف اندوز ہوتی ہے، اور دل ہی دل میں کسی بڑے حادثے کا خوف بھی طاری رہتا ہے۔ اس کرتب کاری میں ایک نہایت خطرناک کھیل 'ون ویلنگ' نے بھی اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔

ان کرتبوں اور ون ویل کے کھیل میں عید کے موقع پر کچھ جانوں کی قربانی بھی دے دی جاتی ہے کیونکہ کسی کو زندگی دینے کے لئے کچھ قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نوجوان اپنے خون سے کہانیاں لکھتے اور ان میں رنگت بھرتے ہیں۔ خون ہمیشہ رنگت لاتا ہے، ہر سال ون ویلنگ میں جان دینے والوں کا خون بھی رائیگاں نہیں جاتا، یعنی اس کھیل کی کشش ہی کچھ اتنی ہے کہ ہر سال بہت سے لوگوں کے مر جانے کے باوجود اگلے برس بہت سے نوجوان جان دینے کے لئے تیاری کر کے میدان میں اتر آتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ان لوگوں نے زندگی ہارنے کا پروگرام عید کی سرگرمیوں میں شامل کر رکھا ہوتا ہے۔ عید خوشی کا موقع ہے، یہ نوجوان بظاہر اپنی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لئے باہر نکلتے ہیں، مگر زندگی ہار جاتے ہیں، ان کی اپنے مقصد کے لئے لگن کا اندازہ لگائیے، کہ وہ جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ گھر سے تو نئے کپڑے پہن کر نکلے تھے، طرح طرح کے پکوان کھانے کی تیاری تھی، خوب ہٹا کھلا کرنے کا منصوبہ تھا، مل جل کر سب کچھ ہوا، کھایا پیا، ہنگامہ کیا، شرارتیں کیں اور آخر میں ون ویلنگ کا دور ہوا، جو اس راہ میں کام آگیا وہ کامیاب ہوا اور جو کام نہ آیا وہ ناکام لوٹ آیا، گویا اب وہ اگلی عید پر قسمت آزمائے گا، یا پھر یوم آزادی وغیرہ کے موقع پر۔ یہ نہیں کہ ون ویلنگ کرنے والے نوجوان اس انجام سے بے خبر ہوتے ہیں، بلکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ جہاں ان کے پیش رو چلے گئے، اس راہ پر چلنے سے وہ بھی یقیناً اسی منزل پر پہنچیں گے، مگر جب لگن ہی منزل پر پہنچنے کی

ہے، تو پھر موت سے فرار کس طرح ممکن ہے۔

ویلنگ کرنے والے نوجوان اپنے پچھڑنے والے ساتھیوں اور ان کے والدین کے حالات سے خوب واقف ہوتے ہیں، ان کی بے بسی اور آہ و بکا کا بھی انہیں خوب اندازہ ہوتا ہے، گھر خالی ہو جاتا ہے، دوست سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں، زخموں سے چور مردہ جسم ہو یا نوجوان ویلر کے والدین کے بین، نوجوانوں پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ اپنے ایکٹ نوجوان دوست کو منوں مٹی تلے دفن کر کے پھر سے آستین چڑھا کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ موت کے کٹوں میں جانے سے نوجوانوں کو کون روکے گا؟ اس میں سب سے پہلا اور اہم فرض والدین کا ہے، جو اپنے بچوں کو موثر سا کھل دے کر خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگتے ہیں، انہیں کوئی خبر اور آگاہی نہیں ہوتی کہ ان کا بچہ کس ماحول میں وقت گزار رہا ہے، کتنی دیر بعد گھر لوٹ رہا ہے؟ اگر والدین اپنے بچوں کے دوستوں پر نگاہ رکھیں اور بچے کو اعتماد میں لے کر محتاط رہنے کا درس دیں تو اس خونی کھیل میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ دوسرا فرض پولیس کا ہے، وہ ایسی شاہراہوں پر خصوصی ناکوں یا خفیہ کیمروں کا بندوبست کرے، تاکہ کوئی اپنے اور دوسروں کے لئے کسی اہم سڑک کو موت کا کٹواں اور خطرے کی علامت نہ بنے دے۔ یہاں مجبوری یہ ہے کہ پولیس روکتی بھی ہے مگر یہ فوراً فون ملا کر اپنے کسی بڑے سے بات کرواتے اور رہائی پالیتے ہیں۔ گرفتاری ان کے لئے مذاق سے کم نہیں، گزشتہ

دنوں عید کے موقع پر ایسے ہی گرفتار شدگان نے پولیس وین میں بیٹھ کر سیلفیاں

بنائیں، کیونکہ وہ جاننے تھے کہ جاتے ہی وہ رہا ہو جائیں گے۔

کون ہے جس نے عبدالستار ایدھی کی تعزیت کر کے ثواب دارین سے اپنا حصہ وصول نہ کیا ہو۔ جس کا جو مقام تھا، جو اہلیت تھی، اور جتنی کچھ پہنچ تھی، اس نے اپنی کاروائی کی۔ ایدھی کے بیٹے کی اپنے انداز کی کہانی تھی، دوستوں کی الگ گفتگو تھی، ان کے عملے کے افراد کی اور بات چیت تھی، لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں لکھا، ان سے مستفید ہونے والے اپنے طریقے سے کہانی بتاتے ہیں، دیکھنے والوں کا اپنا نقطہ نگاہ ہے، ٹی وی پر ان کے واقعات اور حقائق بیان ہو رہے ہیں۔ مرنے کے بعد غیر متنازع، ہیر و اور سادگی و درویشی کا پیکر قرار دیئے گئے، کیونکہ وہ تھے ہی ایسے۔ ہر کسی نے اپنے طریقے سے ان کی تعریف کی، ان کی خدمات کو سراہا، ان کی مشکل زندگی پر بات چیت کی، ان کے دو سوٹوں اور چپل کی بات کی، بینک بیلنس کا ذکر ہوا، اور ذاتی گھر کے نہ ہونے پر بھی بات ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے ایدھی کو رول ماڈل قرار دیا، بہت سے سیاستدانوں نے بھی انہیں اپنے اپنے حساب سے خراج عقیدت پیش کیا۔ دانشوروں اور میڈیا پرسنز نے ان کی تقلید کے لئے بھی قوم کی خوب رہنمائی کی اور بتایا کہ ہم سب یہ کام کیوں نہیں کر سکتے؟

دانشوروں اور مثبت سوچ رکھنے والوں کا یہ سوال واقعی بہت اہم ہے، قابلِ غور بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ پاکستان میں اس وقت بھی لاکھوں لوگ خدمت کے اسی جذبے سے سرشار ہیں، ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو افراد اور اداروں کے نام سے نمایاں ہو چکے ہیں، بہت سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اپنے اپنے حلقے میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ایسے افراد اور اداروں کی بھی کمی نہیں جن کا نام ملکی سطح پر نمایاں ہو کر سامنے آچکا ہے۔ ظاہر ہے ہر فرد ایدھی نہیں بن سکتا، ایدھی جیسے افراد تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، زندگی بھر اساتھوں اور آرام و سکون قربان کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایدھی کی وفات سے خدمت کا ایک جذبہ پوری قوم کے دلوں میں موجزن ہو گیا ہے، فوری طور پر ہی ہر فرد خدمت کے کام میں جُخت جانا چاہتا ہے، شاید وقت کے ساتھ ساتھ یہ غبار اتر جائے گا۔ چونکہ پاکستان میں خدمت کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، اس لئے ان سے مستفید ہونے والے بھی بہت ہیں، دینے والوں کے بہت سے معاون ہیں، جو سہولتوں کے دوسروں تک پہنچاتے ہیں، یوں اس کام میں مصروف لوگوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

دل میں خدمت کا جذبہ رکھنا، کسی حد تک دوسروں کی مالی مدد کرنا زیادہ مشکل کام بھی نہیں، ہم لوگ اپنی حیثیت سے بھی کم تر چند روپے دے کر اپنے متنبیں یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ ہم بھی بڑے حاتم طائی ہیں۔ تھوڑی سی مشکل اس وقت

شروع ہوتی ہے جب خدمت کا کام عملی طور پر کرنا پڑے۔ اگرچہ جو فرد خدمت کا جتنا کام کرنا چاہے وہ غنیمت ہے، جس حیثیت میں کرے وہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر معراج وہی ہے کہ انسان دوسروں کی مدد کرے تو اپنی بڑی آمدنی سے چند کئے نہیں، معقول حصہ دے، اگر رقم نکالے تو اپنا پیٹ کاٹ کر، خرچ کرے تو اپنے کاروبار میں سے نمایاں۔ ہم میں سے کون ہے جو دو نئے سوٹ سلواتے ہوئے کہے کہ میں ایک سلوا لیتا ہوں، دوسرا کسی مستحق کو دے دوں گا، اسی طرح کھانے پینے پر اٹھنے والے اخراجات کو کم کرنے والا کون ہے؟ شاید ایسے افراد کی تعداد گنتی کی ہوگی جو صاحبِ حیثیت ہیں، ہر سال حج اور عمرے کر سکتے ہیں، مگر وہ ایک دو حج اور کچھ عمرے کر کے اب وہاں خرچ ہونے والی رقم کو غریب، نادار، مستحق اور مریضوں پر لگا رہا ہو، کہتے ہیں جو اپنے اخراجات اور ضروریات کو ایک جگہ روک کر بچ جانے والی رقم کو ضرورت مندوں پر خرچ کرتے ہیں؟ ہم ایدھی نہیں بن سکتے، مگر اپنی ضروریات پوری ہونے پر، یا اضافی رقم کو تو خدمت کے کاموں میں لگا سکتے ہیں۔ اگر ہم بحیثیت مجموعی خدمت کا بیڑہ اٹھالیں، فضول خرچیوں اور عیاشیوں سے ہاتھ کھینچ لیں، تو پاکستان میں غربت کی سطح کم ہو سکتی ہے، ضرورت مندوں کی مدد ہو سکتی ہے، انسانیت کی خدمت ہو سکتی ہے، مگر جب ہم اپنے پیٹ سے آگے نہیں سوچتے، اپنی مراعات اور عیاشیوں پر قانع نہیں ہوتے، تو ہماری ناک کے نیچے انسانیت لڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے لگی اور ہماری آنکھوں پر مفاد کی چرپی کچھ دیکھنے نہیں دے گی، کسی محسن کی زندگی سے

ہم کو نہیں چاہیے

میں نے یہ سب کچھ

ہسپتال یا چڑیا گھر؟

وزیر اعلیٰ پنجاب اچانک ساہیوال کے ڈسٹرکٹ ہسپتال پہنچے تھے، لوگوں کے لئے اگرچہ یہ دورہ اچانک تھا۔ اس دورے کے پیچھے دو عناصر اہم تھے، ایک یہ کہ وزیر اعلیٰ اس سے قبل یہ اعلان بارہا کر چکے ہیں کہ اب وہ ہسپتالوں کے معاملات کو سیدھا کر کے دکھائیں گے، انہیں یہ دعویٰ اس لئے کرنا پڑا کہ ان کے برادر، نزرگٹ جو کہ لندن میں اپنے دل کا علاج کروانے گئے تھے، مخالفین نے تنقید کا نشانہ بنایا کہ اگر خود پاکستان میں معقول ہسپتال ہوتا تو وزیر اعظم کو علاج کے لئے لندن نہ جانا پڑتا۔ اس ہنگامہ کے بعد وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف نے ہسپتالوں کی بہتری کا بیڑہ اٹھالیا، یار لوگوں نے کلمہ شکر ادا کیا، دیر آید، درست آید۔ چلیس عشروں کی تاخیر سے ہی سہی، بہتری تو آئے گی۔ دوسری اہم وجہ یہ بنی کہ ساہیوال میں جھولا ٹوٹ گیا، بچے زخمی ہو گئے، وزیر اعلیٰ دراصل انہی کی عیادت کے لئے وہاں پہنچے تھے، انہوں نے ڈی سی او کو معطل کر دیا۔ ہسپتال میں گندگی کے ڈھیر دیکھ کر صاحب کا موڈ بہت خراب ہوا، انہوں نے ہسپتال کے ایم ایس کی بھی سخت سرزنش کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہسپتال ہے یا چڑیا گھر؟ انہوں نے جھولا گرنے سے زخمی ہونے والے ہر بچے کے لئے ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا۔ ہسپتال کے لئے وزیر اعلیٰ کے یہ ریمارکس حسب حال ہیں، دلچسپ بات یہ ہے

کہ انہیں بخوبی علم ہے کہ پنجاب کے اکثر ضلعی ہسپتالوں کی یہی صورت حال ہے، وہ ان ہسپتالوں کی نقشہ کشی بھی کرتے رہتے ہیں، وہاں کی مشینری کے خراب ہونے اور ڈاکٹرز کی غفلت وغیرہ کے قصے بھی سناتے رہتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے ہسپتال کو چڑیا گھر نہ جانے کن خصوصیات کی بنیاد پر قرار دیا، حالانکہ وہاں بات ہوئی تھی گندگی کے ڈھیروں کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چڑیا گھروں میں گندگی کے ڈھیر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ممکن ہے کہ وزیر اعلیٰ نے ہسپتال میں بلیاں، کُتے، چوہے اور کُوے وغیرہ وافر تعداد میں دیکھے ہوں، جن کی بنا پر انہوں نے ہسپتال کو چڑیا گھر کہا۔ مگر پنجاب کے ہسپتالوں میں چڑیا گھر کے جانور دیکھنے کے لئے چند لمحات کو آنکھیں بند کرنا پڑیں گی۔ ایسے میں سب سے پہلے تو ہاتھی دکھائی دے گا۔ ایسے ہاتھی صرف ہسپتالوں میں ہی نہیں، اکثر سرکاری اداروں میں ہوتے ہیں۔ ان ہاتھیوں کی ایک خوبی بھی ہوتی ہے کہ ان کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ یہ ہسپتال یا اداروں کے وسائل ڈکارنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، جہاں یہ وسائل گھاس کی طرح چرنے کا کام کرتے ہیں، وہیں پر یہ چھوٹے موٹے اہلکاروں کو اپنے قدموں تلے روندنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ جب یہ ہاتھی مست ہو جاتے ہیں، پھر یہ کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ ہاتھیوں کے علاوہ ان ہسپتالوں میں بندر بھی ہوتے ہیں، جو کرتے کراتے تو کچھ نہیں، بس آنے والوں کو پریشان کرتے ہیں۔

ممکن ہے وزیر اعلیٰ کی کسی چوہے پر بھی نظر پڑ گئی ہو، کیونکہ چوہوں کا تو ہر طرف راج ہے، یہ مخلوق ہسپتالوں سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس تک ہر جگہ موجود ہے۔ پشاور کے چوہے تو بہت عرصہ اپنی کارکردگی کے حوالے سے چھائے رہے، جن کی بازگشت شہر اقتدار میں بھی سنائی دی۔ پارلیمنٹ ہاؤس اور معزز ممبران کی رہائش گاہوں میں بھی چوہے پائے جاتے ہیں، یہ معاملہ بھی کسی خاص حکومت یا افراد تک محدود نہیں، سالہا سال سے پارلیمنٹ میں چوہے قابض ہیں، کوئی بھی حکومت اس کی ذمہ داری قبول نہیں کرتی اور کوئی بھی حکومت اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکی۔ چڑیا گھر سے مراد ایسا مقام بھی ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے جانور رہتے ہیں، گویا چڑیا گھر ایک جنگل کا نام ہے، جہاں جانور اور پرندے کسی حد تک قید ہیں اور قانون انسان کا چلتا ہے۔ انسان کے قانون کی بات کریں تو جنگل کا قانون سامنے آ جاتا ہے، جنگل کے قانون کا ذکر کریں تو انسان کا قانون نظر آنے لگتا ہے۔ وزیر اعلیٰ صاحب! یہ ہسپتال چڑیا گھر ہی تو ہیں، اسی لئے تو یہاں جنگل کا قانون رائج ہے، اسی لئے تو یہاں درندگی کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں، اسی لئے تو یہاں کسی کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اسی لئے تو یہاں ہمدردی کے جذبات مفقود ہیں۔ معاملات اچانک چھاپے مارنے سے درست نہیں ہونگے، ہسپتالوں کے وسائل کا جائزہ لیا جائے، وہاں کی ضرورتوں کا حساب کیا جائے، مشینری، ادویات اور دیگر

فڈز کی سخت مانیٹرنگ کی جائے، تب جا کر بہتر نتیجہ برآمد کرنے کے کچھ امکان پیدا ہو
سکتے ہیں، ورنہ یہ اچانک دوسرے اچانک ہی بے اثر ہوتے رہیں گے۔

غریب پوزیشن ہولڈرز؟

میٹرک کا رزلٹ ہر سال معمول کی ایک خبر لے کر آتا ہے، فلاں بورڈ کا رزلٹ اتنے فیصد رہا، فلاں بورڈ میں لڑکیوں (یا لڑکوں نے) میدان مار لیا وغیرہ وغیرہ۔ اس عام سی مگر کسی حد تک نمایاں خبر میں ہمیشہ چھوٹی چھوٹی کئی خبریں پوشیدہ ہوتی ہیں، جو بعض اوقات بین السطور میں دیکھی جاسکتی ہیں اور اکثر اوقات کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ خبر کی نوعیت اور خبریت کی تلاش دراصل میڈیا کے نمائندے کے کمالات کا حصہ ہوتی ہے، وہ اپنے تجربے کی بنا پر معاملے کو ہر پہلو سے جانچتا، دیکھتا اور پرکھتا ہے، ایک ہی طرح کی خبر سے بہت سی اور مختلف خبر نکالتا ہے۔ جنوبی پنجاب کے بورڈز کے نتائج بھی معمول کے مطابق ہی رہے، تاہم بہاول پور بورڈ نے مجموعی طور پر پنجاب بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ مگر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مذکورہ بورڈ کے تین اضلاع بہاول نگر، رحیم یار خان اور بہاول پور میں خود مرکزی شہر (بہاول پور، ڈیفنڈنل ہیڈ کوارٹر) پوزیشن لینے میں تیسرے نمبر پر رہا۔ بورڈ میں ہونے والی تقریب کے مہمان خصوصی، صوبائی وزیر ملک اقبال چٹرنے برہمی کا اظہار کیا، کہ بہاول پور میں اتنے اچھے اور ادارے ہیں، مگر کوئی نمایاں پوزیشن حاصل نہیں ہو سکی۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف کی بات سے محکمہ تعلیم کے ضلعی افسران تو پریشان ہوئے ہونگے، مگر کوئی، اور نہیں

کیونکہ وزارت کے مزے لینے کے علاوہ اُنہوں نے بھی کوئی کارِ نمایاں کبھی سرانجام نہیں دیا۔ یہ بات اگر ایک صوبائی وزیر نے نہ بھی کہی ہوتی تو محکمہ تعلیم اور اداروں کے لئے قابلِ غور ضرور ہے۔

ایک اہم خبر یہ بھی ہوئی کہ بورڈوں میں پوزیشن لینے والے بہت سے بچوں کے والدین مزدور، سبزی فروش، کسان، حجام، گدھا سڑھی چلانے والے یا اسی طرح دیگر کاموں میں مزدوری کرنے والے لوگ بھی تھے۔ خواتین نے گھروں میں کام کر کے اپنے بچوں اور بچیوں کو پڑھایا، بعض دیہات سے ٹرانسپورٹ کا مناسب بندوبست نہ تھا، بعض لوگوں کے وسائل اس قدر نہیں تھے، تاہم ان بچوں اور بچیوں نے محنت کی، ان کے والدین نے ان کی بھرپور مدد بھی کی اور دعائیں بھی دیں۔ بچے خوشی سے نہال تھے اور ان کے والدین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، اس غریب طبقے کے لوگوں نے کبھی اس طرح اپنی عزت ہوتی نہ دیکھی تھی، اس نتیجے کے پیچھے والدین کا وہ جذبہ بھی ہوتا ہے، جس کے تحت وہ اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرتے رہے اور نتیجہ سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ بچے بلا کے ذہین تھے، اور بہت ذمہ دار بھی، وہ جانتے تھے کہ ان کے والدین نے کن حالات میں ان کو پڑھایا، فریقین کی محنت رنگ لائی۔ غریبوں کے بچوں اور بچیوں کی پوزیشنوں سے ایک اور بات بھی سامنے آئی کہ یہ تقریباً تمام پوزیشنز آرٹس کے مضامین میں آئیں، یعنی یہ لوگ سائنس میں کوئی محرکہ

نہ مار سکے، ممکن ہے بہت سے غریب بچوں نے سائنس بھی پڑھی ہو، مگر نتیجہ بتا رہا ہے کہ سائنس میں انہوں نے کوئی نام پیدا نہیں کیا۔ اس کی وجہ بھی غربت ہی ہے، اگر ان کے پاس کچھ رقم وافر ہوتی تو وہ اپنے بچوں کی کوچنگ کا اہتمام کرتے، انہیں شہر کے اچھے اور معروف اساتذہ کے پاس ٹیوشن رکھواتے اور اکیڈمیوں میں تعلیم دلواتے، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ غربت ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی اور وہ دنیا کی دوڑ سے پیچھے رہ گئے۔

بتایا جاتا ہے کہ آئین پاکستان کی شق 25 کہتی ہے کہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی عمر کے ہر بچے کو سرکاری سرپرستی میں مفت تعلیم دلوائے۔ کہنے کو اپنی حکومتیں اپنا فرض بخوبی نبھا رہی ہیں، بلکہ تعلیم ان کی پہلی ترجیح ہے، مگر یہ ان کا صرف قول ہے، ان کے افعال اپنے اقوال سے میل نہیں کھاتے۔ یہ تضاد امتحانات کے نتائج کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اب اگر بہت سے غریب لوگوں کے بچوں نے پوزیشن لے لی ہے تو یہ افسوسناک منظر اگلے دو سالوں میں سامنے آسکتا ہے، کہ ان میں سے بہت کم بچے یا بچیاں ایف اے کے پوزیشن ہولڈرز میں شامل ہونگے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ میٹرک تک تو پھر بھی کتابیں اور تعلیم مفت ہونے کی وجہ سے بچوں کو ان کے والدین نے تعلیم دلوائی، مگر کالج کی تعلیم مفت نہیں، فیس اور کتابیں دونوں پر ہی خرچہ اٹھتا ہے، اور غریب والدین کے پاس اس قدر پیسے نہیں۔ برہم ہونے والے

وزیر یا کوئی حکومتی اہلکار دو برس بعد ایف اے کے امتحانات کے نتائج میں سے میٹرک

کے اب کے آرٹس کے سٹوڈنٹس کو تلاش ضرور کرے۔

پارلیمنٹ لاجز میں ہمارے منتخب نمائندے قیام پذیر ہیں، وہ ملک کے کونے کونے سے منتخب ہو کر یہاں پہنچے ہیں، قانون ساز ادارے کے ممبر ہونے کے ناطے انہیں بہت سے استحقاق بھی حاصل ہیں، ان کی اہمیت بھی ہے اور پروٹوکول وغیرہ بھی۔ لاجز سے تازہ خبر آئی ہے کہ وہاں مقیم پی پی کی مرکزی رہنما سینیٹر سٹی پلیجو اپنے آبائی علاقے سے واپس اپنے فلیٹ میں آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے بیڈ روم کی کھڑکی گری پڑی تھی، بیڈ پر فائلیں (ایک اطلاع کے مطابق کتابیں بھی) بکھری پڑی تھیں، انہوں نے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دی، اور بتایا کہ انہیں کسی بھی نقصان کا اندیشہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ قیمتی اشیاء یا نقدی وغیرہ فلیٹ میں نہیں رکھتیں۔ دوسری طرف قومی اسمبلی کے قائم مقام سپیکر جاوید عباسی نے ان کے فلیٹ کا دورہ کیا اور لاجز کی کھڑکیوں پر آہنی گرل لگانے اور کیمروں کو فعال کرنے کے لئے ہدایات جاری کیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق یہ سب کچھ تیز آندھی کی وجہ سے ہوا، جس میں کھڑکی بار بار کھلنے اور بند ہونے سے اس کے شیشے ٹوٹ گئے اور ہوا کی وجہ سے ہی فائلیں وغیرہ بکھر گئیں۔ ممکن ہے یہ خیال پولیس نے ظاہر کیا ہو، تاکہ مدعا ہی غائب کر دیا جائے اور الزام کسی پر بھی نہ آ سکے۔ ابھی پندرہ روز قبل ہی لاجز میں چوری کی ایک واردات ہو چکی ہے، جس

میں مسلم لیگ ن کے ”ٹی وی“ رہنما طلال چوہدری کے فلیٹ میں چوری ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ چور تین ہزار ڈالر نقدی اور کچھ جیولری بھی لے اڑے تھے۔ پولیس کو اطلاع کرنے پر بھاری نفری آگئی تھی، مگر ملزم گرفتار نہیں ہو سکے، جس وجہ سے فطری طور پر نہ ڈالر واپس ہوئے اور نہ ہی جیولری۔

چوروں نے پارلیمنٹ لاجز کو ہی کیوں ٹارگٹ بنا لیا ہے، اگر یہ چور صاحبان کسی مجبوری پر لاجز آتے اور اپنا کام کرتے ہیں تو ان کی کارکردگی زیادہ پیشہ ورانہ نہیں، کیونکہ کسی پیشے میں پچاس فیصد رزلٹ زیادہ قابلِ تعریف نہیں ہوتا، اگر ایک واردات میں ڈالر اور جیولری ہاتھ لگی تو دوسری میں کچھ بھی نہ ملا۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ دونوں وارداتوں میں وارداتیے مختلف ہوں، پہلی واردات میں تجربہ کار لوگت ہوں اور دوسری میں ایسے لوگت ہوں جو اس میدان میں نووارد ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں، تجربہ سے ترقی کر جائیں گے، ہو سکے تو وہ پہلی پارٹی کو استاد مان لیں۔ مگر کیا کیجئے کہ استاد ماننے کے لئے بھی بڑی کھوج لگانی پڑے گی، انہیں کہاں تلاش کیا جائے گا، ہاں اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں تب ان کا اتنا پتا مل سکتا ہے۔ ورنہ پہلا گروپ ہی دوسرے کو تلاش کر کے برا بھلا کہے کہ انہوں نے چوروں کی لاج نہیں رکھی، واردات بھی کی، مگر ناکام۔ تیسری طرف حکومت بھی میدان میں آگئی ہے، اور قائم مقام سپیکر کا فلیٹ کا دورہ کرنا حکومتی سنجیدگی کی علامت ہے، یہ الگ بات ہے کہ سینیٹر سے

سپیکر قومی اسمبلی کا کوئی تعلق تو نہیں بنتا، مگر بااختیار لوگوں کا کچھ نہیں کہا جاسکتا، وہ جہاں مناسب سمجھیں آ موجود ہوتے ہیں، اور اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔

لاجز کی کہانی بھی عجیب ہے کبھی وہاں چوہوں کا راج ہوتا ہے تو کبھی چوروں کا، کبھی وہاں شراب اور نشے وغیرہ کے مشاغل کے الزامات لگ جاتے ہیں تو کبھی کوئی اور مسائل سر اٹھا لیتے ہیں۔ چوہوں کی موجودگی بھی پریشان کن ہی ہے، اگرچہ سکیورٹی اور کیمرے چوہوں کی راہیں نہیں روک سکتے، مگر صفائی اور حفظانِ صحت کے معاملات کا خیال رکھنے والے دیگر ادارے کہاں ہیں؟ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ادارے جان بوجھ کر معزز ممبرانِ اسمبلی کو خراب اور بدنام کرنے کے درپے ہوں، اور چوہوں کے سد باب کے لئے اپنی کوششوں کو حقیقی رنگ نہ دیتے ہوں، بس کاروائیوں پر ہی زور ہو اور فائلوں کے پیٹ بھرتے جارہے ہوں۔ ان ارکان کو اسمبلی میں ایسی کوئی تحریک لانی چاہیے، تاکہ حکومت بذاتِ خود دلچسپی لے کر ممبران کی ان بلاؤں سے جان چھڑوائے۔ رہ گئے چور، تو اب ان کے لئے کھڑکیوں کے باہر آہنی گرلیں لگ جائیں گی اور کیمروں کا بندوبست ہو جائے گا۔ ان کے بعد بھی اگر کوئی چور گھس آیا تو یہ کسی سازش کا حصہ ہی ہوگا۔ لازماً چوریوں کی وارداتوں کے بعد عوام کو اطمینان رکھنا چاہیے، کہ جہاں ان کے نمائندے محفوظ نہیں تو عوام کس باغ کی مولیٰ ہیں۔

آزاد کشمیر کے الیکشن میں مسلم لیگ ن کی واضح برتری نے سیاسی تالاب میں ایک لہر سی پیدا کر دی ہے۔ پاکستان میں پاناما لیکس کا شور کچھ دنوں سے بہت سرائٹھا رہا تھا، اسی دوران وزیراعظم نواز شریف دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لندن گئے تو ان کے بارے میں رائے عامہ تقسیم ہو گئی، معاملہ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا، وزیراعظم کی واپسی کا انتظار ہونے لگا، تحریکیں چلانے کے اعلانات ہونے لگے۔ مگر یہ سب کچھ شاید آزاد کشمیر کے الیکشن کے بعد ہونا تھا، کہ اس کے نتائج نے حالات بدل دیئے۔ سیٹوں میں کامیابی کا تناسب اتنا کہ کوئی ن لیگ کے عشر عشر بھی نہیں۔ اس الیکشن کو کیا نام دیا جائے گا، آیا مسلم لیگ ن کی مقبولیت میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے، وہاں کے عوام نے دوسری جماعتوں کو پکڑ کر نظر انداز کر دیا ہے، اُن کی تمام ترامیدیں ن لیگ سے ہی وابستہ ہیں؟ کچھ تو ہے، جمہوریت میں الیکشن کے نتائج ہی فیصلہ کن ہوتے ہیں، اپوزیشن کی تحریکوں اور اعتراضات اپنی جگہ، مگر جب عوام ہی فیصلہ کر دیں تو پھر اپوزیشن کو انہی کی سنہنی چاہیے اور اخباری بیانات، ہنگامہ آرائی اور دیگر منصوبہ بندیوں کی بجائے عوام کی رائے اپنے حق میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو لوگ اُن کے ساتھ کھڑے ہیں، انہیں مطمئن رکھیں اور دیگر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں، تب ہی جا کر

کوئی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ فی الحال کشمیر کے الیکشن کے بعد اپوزیشن کو اپنی کمزوریوں کو دیکھنا چاہیے۔ دوسری طرف یہ بھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کشمیر اور پاکستان کے دیگر علاقوں کے ماحول اور مزاج میں فرق ہے، اسی الیکشن میں لاہور والی نشست سے ن لیگ کی ناکامی پی ٹی آئی کے لئے امید کی ایک کرن ہے، دیکھیں اب آئندہ کے لئے دونوں جماعتیں کیا لائحہ عمل اختیار کرتی ہیں۔

تحریک انصاف کو اگرچہ کشمیر کے الیکشن میں قابل ذکر ووٹ نہیں مل سکے، تاہم اس نے الیکشن سے قبل ہی پاکستان بھر میں تحریک چلانے اور وزیراعظم کے خلاف پانامہ لیکس کے حوالے سے مہم چلانے کا اعلان کر رکھا تھا۔ جمہوریت میں ہر کسی کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، احتجاج بھی اس کا حق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا یہ حُسن اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر رہتا ہے۔ عمران خان نے دھرنوں کو روایت بنایا تو مخالفین نے اس عمل کو ایک چٹڑ بنانے کی کوشش کی۔ تمام سیاسی جماعتیں ہی اپنے اپنے دائرے کے اندر اپنی حیثیت میں سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، مگر پی ٹی آئی اس معاملہ میں زیادہ فعال معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عمران خان اکثر اپنی تحریکوں اور کوششوں کو سولو فٹوائیٹ کے ذریعے ہی کامرانی کی منازل تک پہنچانے کا عزم رکھتے ہیں، اپوزیشن کی دیگر جماعتوں سے رابطہ سے قبل ہی وہ

یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اگر کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اکیلے ہی نکل کھڑے ہونگے، یوں وہ کسی کو ساتھ لینے بغیر ہی اپنے مفروضے پر عمل کرتے ہوئے تنہا ہی نکل پڑتے ہیں۔ انہوں نے کبھی خیبر پختونخواہ میں اپنی اتحادی جماعت، جماعت اسلامی سے بھی کم ہی مشاورت کی ہے۔

حکومت کے خلاف تحریک چلانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی، مگر تحریک ہمیشہ کسی منزل کے حصول کے لئے برپا کی جاتی ہے، تحریک کو جاندار بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ جماعتوں کو شامل کیا جائے، مگر تحریک انصاف کے بارے میں اپوزیشن کی تمام جماعتیں تحفظات کا شکار ہیں کہ یہ پارٹی سولو فلائیٹ کی قائل ہے، دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے سے ہمیشہ کتراتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کامیابیاں سمیٹنے کی بجائے اسے تنقید کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں میں بالکل آزاد ہے، مگر کسی بڑے مقصد کے لئے دوسروں کو ساتھ ملانا پڑتا ہے۔ قائد حزب اختلاف خورشید شاہ نے بھی کہا ہے کہ ”.. عمران خان کی سولو فلائیٹ سے اپوزیشن کو نقصان پہنچ رہا ہے، حکومت کے خلاف ان کی تحریک اس بار بھی ناکام ہوگی۔“۔ اپوزیشن کی ایک نمایاں جماعت اگر اپنی الگ اور تنہا اثران پر مقرر ہے تو یقیناً دوسری جماعتیں ’ون ٹکائی ایجنڈا‘ ہونے کے باوجود اسے آپس کے اتحاد کے لئے قائل نہیں کر سکتیں، اپوزیشن کا یوں بکھر کر رہ جانا حکومت کے فائدے میں ہے، اوپر

سے آزاد کشمیر کے انکلیشن میں کامیابی بھی حکومت کی خوش قسمتی کی دلیل ہے۔

حکومت کے تعلیمی اہداف؟

پنجاب میں تعلیم کا معیار بلند ہونے جا رہا ہے، شرح خواندگی بھی اگلے دو برس (تک سو فیصد کی بلند ترین سطح کو چھونے لگے گی، تینتالیس ہزار کے قریب نئے (2018 اساتذہ بھرتی کئے جائیں گے، زیادہ تعداد والے سکولوں میں ڈبل شفٹ لگائی جائے گی، ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن پروگرام کا دائرہ کار مزید بڑھایا جائے گا، 36 ہزار اضافی کلاس رومز تعمیر کئے جائیں گے، پانچ ہزار سکولوں کو شمسی توانائی پر منتقل کیا جائے گا، اپریل تک کم کارکردگی دکھانے والے سکول پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت چلے 17 جائیں گے۔ اس سلسلہ میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے ایک اجلاس کی صدارت کی، مندرجہ بالا فیصلے ہوئے اور احکامات جاری کئے گئے۔ خبر میں یہ بھی بتایا کے خصوصی نمائندے سر (DFID) گیا ہے کہ برطانیہ کے بین الاقوامی ترقی کے ادارے مائیکل باربر اور سکول روڈ میپ ٹیم کے دیگر ارکان نے صوبے میں معیاری تعلیم کے فروغ کے لئے موثر اقدامات پر وزیر اعلیٰ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کو اور ان کی ٹیم کی کاوشوں کو قابل ستائش قرار دیا ہے۔

پنجاب میں گزشتہ تیس برس میں سے تقریباً بیس سال میاں برادران کی حکومت رہی

ہے، جبکہ آٹھ سال سے صوبے کی حکومتی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک تعلیم کی ترقی اور معیار کی بات ہے، تو یہاں کچھوے کی چال صادق آتی ہے۔ صوبہ بھر میں ایسے پرائمری سکولوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، جن میں کلاس رومز پورے ہیں، واش رومز موجود ہیں، وہ بجلی، فرنیچر سمیت دیگر سہولتوں سے بھی آراستہ ہیں، ورنہ عالم یہی ہے کہ ابھی تک اکثر سکولوں میں دو کمرے، کسی حد تک چار دیواری اور دو یا تین اساتذہ موجود ہیں۔ اساتذہ کی حاضری کے لئے کچھ سالوں سے بہت سخت دیکھنے میں آرہی ہے، مگر معاملہ حکومت کی مکمل گرفت میں نہیں ہے۔ شرح خواندگی میں اضافہ کی خواہش اور کوشش کے باوجود یہ کام نہیں ہو سکا۔ اب یہی سکول پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے حوالے کئے جا رہے ہیں، کیونکہ فاؤنڈیشن نے گزشتہ دس برس میں اپنی اصول پسندی اور محنت کی بنا پر اپنے وجود کا لوہا منوایا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے تحت جن سکولوں کی بات کی ہے وہ یہی فاؤنڈیشن کے حوالے کئے جانے والے سکول ہی ہیں، ابھی چند ماہ قبل تعلیمی سال کے آغاز میں ایک ہزار سکول اسی مد میں فاؤنڈیشن کے حوالے کیا گیا تھا، صرف تین ماہ کی قلیل مدت میں ان سکولوں میں بچوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے، اسی کامیابی کو دیکھتے ہوئے حکومت مزید ڈھائی ہزار سکول فاؤنڈیشن کو دے رہی ہے، مزید بھی امکانات ہیں۔ حکومت کی اس پالیسی کے خلاف اگرچہ اساتذہ کی یونینز نے احتجاج بھی کیا ہے، مگر ان کی کارکردگی چونکہ بہت ناقص رہی ہے، اس لئے

ان کی مزاحمتی تحریک کے کامیاب ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک طرف حکومت سکولوں کو فاؤنڈیشن کے حوالے کر کے اپنا بوجھ ہلکا کر رہی ہے، دوسری طرف ہزاروں اساتذہ کی بھرتیاں کی جا رہی ہیں۔ حکومت کے اس قدم سے سکولوں میں اساتذہ کی کمی کا الزام یا اعتراض تو ختم ہو جائے گا، مگر پرانے اور نئے اساتذہ کو یکسوئی کے ساتھ بچوں کو پڑھانے کا موقع بھی دیا جائے، انہیں دیگر بیگار سے معاف رکھا جائے، ان کے اعتراضات کو سنا جائے۔ دوسری طرف اربوں روپے کی لاگت سے اگلے برسوں میں سکولوں میں تعمیر ہونے والے کمرے ضرورت سے پھر بھی کم ہیں، حیرت ہے کہ ان کو ”اضافی کمرے“ لکھا جا رہا ہے۔ حکومت کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان کے سکول ”خراب کار کردگی“ کے مرتکب کیوں ہو رہے ہیں، نئی بھرتیاں، فاؤنڈیشن کو جانے والے سکولوں سے فارغ ہونے والے سرکاری اساتذہ دیگر سرکاری سکولوں کو کیسے کامیاب بنائیں گے۔ اب بات چھتیس ہزار کمروں کی نہیں، حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام سکولوں کو پورے کلاس رومز دے اور وہاں شاف بھی مکمل ہونا چاہیے۔ اگر حکومت تعلیم کے لئے بڑا بجٹ مختص کر کے کمروں وغیرہ کی تعمیر کو سکول کمیٹیوں کے سپرد کر دے تو بہت سی بچت ہو سکتی ہے۔ بہت ہی کم بجٹ کے ساتھ یہ دعوے کسی صورت قابل عمل دکھائی نہیں دیتے، اسی بجٹ کے ساتھ اگلے دو برس میں تعلیمی میدان میں کسی انقلاب کی نوید نہیں دی جاسکتی۔ ہاں اگر میاں صاحب تعلیم کو بھی کوئی میگا

پراجیکٹ تصور کر لیں تو دو سالوں میں بڑے معرکے سر کئے جاسکتے ہیں۔ ورنہ قسطوں میں تمام سرکاری سکول پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے حوالے کرنے سے بھی بہتری کے امکانات ہو سکتے ہیں۔

چینی، آٹے کا بھاؤ کنٹرول کرنا حکومت کا کام ہے، اور انصاف کی فراہمی ججز کا ”فرض“۔ یہ بیان ہے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ سید منصور علی شاہ کا۔ اگرچہ اس اصول سے ہر کوئی آگاہ ہے، مگر ستم یہ ہے کہ اصولوں، قوانین اور فامولوں سے کوئی اتفاق نہیں کرتا۔ چیف جسٹس نے بھی اپنے عہدہ جلیلہ پر جلوہ گر ہونے کے فوراً بعد اسی قسم کا بیان دیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ عدلیہ از خود نوٹس نہیں لے گی، حکومت اپنا کام کرے اور ہم اپنا کام کریں گے۔ اب جبکہ وہ اپنے عہدے پر کام شروع کر چکے ہیں، انہوں نے اپنی منصوبہ بندی پر عمل شروع کر دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ تیرہ لاکھ زیر التوا مقدمات کو جلد نمٹانے کے لئے جامع منصوبہ تیار کر لیا۔ پرانے مقدمات کو جلد نمٹانے اور عدالتی نظام کی بہتری کے لئے خود کار کمپیوٹرائزڈ نظام ستمبر تک نافذ کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کریپٹ افسران کی فہرستیں بنائے جانے کی بھی خبر دی۔ وہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ لاہور میں جدید ویڈیو لنک سسٹم کا افتتاح کر رہے تھے۔

پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عدلیہ بہت حد تک آزاد ہے۔ اگرچہ کچھ سال قبل تک یہ آزادی بہت محدود تھی۔ عدلیہ کی آزادی زیادہ تھی یا کم، یہ

ایک الگ کہانی ہے، مگر مقدمات کے فیصلے نہ ہونا دوسری بات۔ اپنے ہاں بد قسمتی سے بے شمار ایسے مقدمات ہیں جن کے فیصلے ایک نسل کو دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ زمینوں اور جائیدادوں کے مقدمات تو تیسری نسل تک بھی پیشیوں کی بھیٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ایک ماتحت عدالت نے کسی حقدار کے حق میں فیصلہ کر بھی دیا تو مخالفین (اگر وہ ناحق پر بھی ہوتے ہیں) اوپر والی عدالت میں چلے گئے اور معاملہ پھر عشروں تک جا پہنچا۔ عدالتیں تو اوپر سے اوپر موجود ہیں، اور یوں پیشیاں بھگتتے بھگتتے نسلیں بیت جاتی ہیں۔ بہت سے حقدار ایسے بھی ہیں جو راہوں میں ہی رُل جاتے ہیں، دستبردار ہو جاتے ہیں، مار دیئے جاتے ہیں، لوٹ لئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات نتیجہ لڑائی بھگڑے اور قتل و غارت گری کی صورت میں نکلتا ہے، پھر یہ دشمنیاں طول پکڑ لیتی ہیں اور کئی کئی قتل ہو جاتے ہیں۔

کوئی بھی ادارہ بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں ہوتا، اس میں کام کرنے والے ہی اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔ عدلیہ کسی بھی ملک کا سب سے اہم اور معزز ادارہ ہوتا ہے، اس کو مزید نیک نام بنانے اور احترام دینے کے لئے اس میں کام کرنے والوں کا کردار ہوتا ہے۔ ادارے میں کام کرنے والوں کے علاوہ ادارے کے سربراہ کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ موجودہ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نے آتے ہی جن خواہشات کا اظہار کیا، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ کرنا

چاہتے ہیں، اس کے لئے انہوں نے خوب منصوبہ بندی بھی کر رکھی تھی۔ عدلیہ سے عوام کو دو چیزوں کی توقعات ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ کام ضرور اور جلد ہو جائیں، یعنی انصاف بھی دستیاب ہو، دہلیز پر یعنی قریب ملے اور بہت جلدی بھی مل جائے۔ بعض اوقات عدالتوں کو اندازہ نہیں ہوتا اور مسائل کی زندگی موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اب چیف جسٹس نے نہ صرف ان باتوں کی یقین دہانی کروائی ہے، بلکہ اس سسٹم کو جدید بنانے کے لئے ٹیکنالوجی اپنانے کا بھی اعلان کیا، سالوں کی معلومات کے لئے بھی کمپیوٹر اور موبائل پر سہولت دینے کا فیصلہ بھی ہوا ہے، جس سے ہر کوئی اپنے گھر بیٹھے ہی معلومات حاصل کر سکے گا۔

عدالتوں میں زیر التواء مقدمات کی تعداد سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیشیوں پر پیشیاں دینے کی وجہ یہی مقدمات ہیں، اگر اب ان کو نمٹانے کے لئے جامع منصوبہ بنالیا گیا ہے تو یہ نہایت ہی خوش آئند فیصلہ ہے، جس پر عملدرآمد کرنے سے عوام کے مسائل حل ہوں گے، ان میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ اس خبر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر عدلیہ نے تہیہ کیا ہے کہ وہ اپنا کام کرے گی تو حکومت اور اس کے اداروں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے فرائض نبھائیں۔ یہاں بد قسمتی سے کوئی اپنا کام کرے یا نہ کرے، دوسرے کے کام میں مداخلت کرنا اور دوسروں پر تنقید کرنا اپنا

اولین فرض جاننا جاتا ہے۔ اگر ہر کوئی اس اصول پر عمل شروع کر دے تو مسائل حل ہونے میں تاخیر نہیں ہوگی، سکون بھی ہوگا، امن بھی اور سب کے کام بھی بروقت ہو جایا کریں گے، بس ضرورت عمل کی ہے۔

اسلام آباد کے چڑیا گھر کے ہاتھی کی قسمت بھی جاننے کو ہے، کیونکہ معاملہ ایوانِ بالا کی قائمہ کمیٹی کے ہاتھ آ گیا ہے۔ سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے کابینہ سیکریٹریٹ نے اسلام آباد کے مسائل پر بہت گہرا غور و خوض کیا، پولی کلینک ہسپتال کی کارکردگی پر بھی تشویش کا اظہار کیا گیا، چیئرمین قائمہ کمیٹی سینیٹر طلحہ محمود نے کہا کہ پولی کلینک ہسپتال میں خون کے فروخت ہونے کی خبریں ہیں، پمپ ہسپتال میں صفائی کا مسئلہ ہے، ڈاکٹرز کے خلاف التواء کا شکار انکوائریوں کی بھی بات ہوئی، چڑیا گھر کے کاؤن ہاتھی کی حالت پر تشویش کا اظہار کیا گیا، دیگر جانوروں کی حالت زار پر بھی افسوس کا اظہار ہوا، ارکان کی بحث کے بعد چیئرمین نے فیصلہ سنایا کہ کاؤن ہاتھی کی حالت پر دنیا بھر کو تشویش ہے، اس لئے اسے کسی ماحول دوست ملک بھیج دیا جائے۔ قائمہ کمیٹی کی مہربانی ہے کہ اس نے اسلام آباد کے بہت سے مسائل پر اپنی تشویش اور پریشانی وغیرہ کا اظہار کر دیا ہے۔ کمیٹی نے کوئی انوکھا یا نیا کام نہیں کیا، بلکہ جب منتخب ایوانوں میں مختلف مسائل پر کمیٹیاں تشکیل دی جا رہی ہوتی ہیں، تو بہت سی باتیں پیش نظر ہوتی ہیں، مثلاً ایک بات یہ بھی ذہن میں ہوتی ہے کہ کمیٹی میں نام آنے سے معزز رکن کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے، دوسری بات یہ کہ کمیٹی میں نام

آنے کے بعد آمدنی میں بھی معقول اضافہ ہو جاتا ہے۔ تیسری اور اہم بات شاید یہ بھی ذہن میں ہوتی ہو کہ کمیٹی کے فیصلوں کے ذریعے عوام یا علاقے کے مسائل حل کرنے ہیں۔ مگر دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کمیٹیوں کے فیصلوں پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔ کمیٹیوں نے بھی شاید کبھی عمل نہ ہونے کا برا نہیں منایا، کیونکہ اُن کا کام ہو جاتا ہے، نام بھی بن جاتا ہے اور جیب بھی گرم ہو جاتی ہے۔

اسلام آباد میں اگر چڑیا گھر میں موجود کاون ہاتھی کی حالت تشویش ناک ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس پر انتظامیہ کی توجہ نہیں، ظاہر ہے ہاتھی کا خیال حکومت نے براہ راست تو رکھنا نہیں، یہ کام چڑیا گھر انتظامیہ کے کرنے کا ہے، مگر چڑیا گھر والے بھی کیا کریں، انہیں اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں، ایک یہ کہ چڑیا گھر کے جانوروں کی نگرانی کرنی ہے، آیا وہ پورے ہیں یا کسی بڑے صاحب کے گھر کی رونق میں اضافہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ آیا تمام جانوروں کی صحت درست ہے یا کسی کو کسی بیماری وغیرہ نے گھیر رکھا ہے۔ اس بات کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے کہ چڑیا گھر کے جانوروں کی خوراک اعلیٰ معیار کی تو نہیں آگئی، کیونکہ خوراک جتنی اچھی ہوگی اسی قدر اس پر اخراجات زیادہ اٹھیں گے، اس لئے کسی حد تک بچت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسی بچت میں سے ہی انتظامیہ کے لئے کچھ اضافی آمدنی کی گنجائش نکالی جاتی ہے۔ پاکستان

کے چڑیا گھروں میں جانوروں کی خوراک کا معیار بھی دیکھے جانے کے قابل ہے۔ بہاول کے چڑیا گھر میں شیروں کے لئے جو زندہ گائے ذبح کرنے کے لئے لائی جاتی ہے وہ اپنے قدموں پر چل کر نہیں آسکتی۔ یہ دلچسپ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ چڑیا گھروں کے جانوروں کی خوراک وہاں کی انتظامیہ کے لئے بڑی مرغوب ہے۔

اسلام آباد چڑیا گھر کے ہاتھی کا معاملہ کافی سنجیدہ ہے، کیونکہ یہ ہاتھی یہاں اکلوتا ہے، ورنہ اسلام آباد میں سفید ہاتھیوں کی کمی نہیں۔ چڑیا گھر سے نکل کر شہر کی طرف ہو لیں تو ہر طرف سفید ہاتھیوں کے غول دکھائی دیں گے۔ اگر یہی قائمہ کمیٹی کبھی سفید ہاتھیوں کا حساب کرے، اور دیکھے کہ ان کی حالت کیسی ہے؟ تو وہ حیران رہ جائے کہ سفید ہاتھیوں کے لئے اسلام آباد کی آب و ہوا اور ماحول بہترین ہے۔ کمیٹی کے اجلاس کی خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ چڑیا گھر کے ہاتھی کی حالت کیوں خراب ہے، اسے کس قسم کے ماحول کی ضرورت ہے، کہ اب اسے کسی ماحول دوست ملک میں ہی رکھا جاسکتا ہے؟ اسے اگر اسلام آباد میں بھی اس کی ضرورت کے مطابق ماحول فراہم نہیں کیا جاسکتا تو چڑیا گھر کے دیگر جانوروں کا کیا ہوگا؟ اگرچہ کمیٹی نے دیگر جانوروں کا ذکر بھی کیا ہے، مگر انہیں کسی ماحول دوست ملک میں بھجوانے کی بات نہیں کی۔ اب قائمہ کمیٹی نے فیصلہ کر دیا ہے، چڑیا گھر کا ہاتھی تو ممکن ہے کسی ماحول

دوست ملک میں بھیج دیا جائے، مگر چڑیا گھر کے دیگر جانور اور شہر میں رہنے والے سفید

ہاتھیوں کے بارے میں کمیٹی نہ جانے کب اور کیا فیصلہ کرے گی؟

سید قائم علی شاہ آٹھ سال تک وزارتِ علیا کی ذمہ داریاں نبھانے کے بعد بالآخر مستعفی ہو گئے، ان کا استعفیٰ فوراً قبول بھی کر لیا گیا۔ اگر انہوں نے یہ کارنامہ خود سرانجام دیا ہوتا تو ممکن ہے اس کی قبولیت میں اخلاقاً ہی کچھ تاخیر کر دی جاتی، یہ کام چونکہ منصوبہ بندی کے تحت ہوا، اس لئے اس کارروائی کے تمام امور معمول کے مطابق ہی نمٹائے جا رہے ہیں۔ تاہم سندھ میں پی پی حکومت کی نیا وزیر اعلیٰ بلا مقابلہ لانے کی معصوم سی خواہش شاید پوری نہ ہو سکے، کیونکہ پی ٹی آئی نے جمہوریت کے حُسن کو بڑھاوا دینے کے لئے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خیر جو بھی ہو، قائم علی شاہ اپنی سیٹ پر قائم نہیں رہ سکے، اب ان کی جگہ پر مُراد علی شاہ کی مراد برآئی ہے۔ آنے والے دنوں میں اس تیار شدہ تبدیلی کا پراسس مکمل ہو جائے گا۔ قائم علی شاہ پاکستانی سیاست کے بزرگ ترین سیاست دان گئے جاتے تھے۔ آجکل چونکہ ٹی وی چینلز کا زمانہ ہے، اس لئے کسی بھی سیاستدان کی سابقہ کارگزاری کو تاریخ کی ترتیب کے ساتھ دوبارہ دکھانے کا اہتمام کر دیا جاتا ہے، کسی کو یاد کرنا ہو، کسی کو کچھ یاد دلانا ہو، کسی کا تمسخر اڑانا ہو، یا کسی کا جھوٹ سچ سامنے لانا ہو، تو پرانی ویڈیوز کو ترتیب دے کر ایک رپورٹ تیار کر لی جاتی ہے۔ خبر میں مزید چٹخارہ پیدا کرنے کے لئے اس کے ساتھ

میوزک بھی اسی قسم کا دیا جاتا ہے، بعض اوقات بھارتی گانوں کی گونج میں کسی کی تھنیک کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سندھ کے 'وڈے سائیں' رخصت ہوئے ہیں تو ٹی وی چینلز نے یہی کچھ کیا ہے، یہ کاروبار ابھی مزید بھی کچھ دن تک جاری رہے گا۔

ابھی تو قائم علی شاہ نے وزیر اعلیٰ کے انتخاب تک اسی سیٹ پر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے، مگر ساتھ ہی یہ خبر بھی آگئی ہے کہ اگلے دنوں میں مکمل فرصت پانے کے بعد بھی وہ آرام سے نہیں بیٹھیں گے، فراغت کے دنوں کے لئے انہوں نے ایک مصروفیت تلاش کر لی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو وہ مبارک باد کے مستحق ہیں، کہ کچھ ہی عرصہ میں وہ صاحب کتاب ہو جائیں گے۔ صوبے کی حکومت کی سربراہی سے اچانک فارغ کر دیئے جانے کے بعد فوری طور پر کتاب لکھنے کے ارادے سے شاہ صاحب کی خود اعتمادی اور پر عزم ہونے جیسی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ کسی صدمے کے بعد انسان کوئی تخلیقی کام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا، یا کم از کم بڑا تخلیقی کام نہیں کر سکتا، اگر جذبات بھرا مضمون لکھنے کی بات ہوتی تو کہا جاسکتا تھا کہ شاید وہ مضمون شاہکار بن جائے، کیونکہ دل و دماغ کوئی چوٹ کھانے کے بعد جن جذبات کا اظہار کریں گے وہ یقیناً شاہکار ہی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی اگر انہوں نے کتاب لکھنے کے عزم کیا ہے، تو یہ

ایک خوش آئند بات ہے، کیونکہ شاہ صاحب سندھ کی سیاست میں عشروں سے عملی طور پر موجود ہیں، انہوں نے قیام پاکستان کے وقت سے لے کر اب تک تمام وقت متحرک رہ کر گزارا ہے۔ انہوں نے پاکستان بننے بھی دیکھا، مارشل لا لگتے بھی دیکھے، انہوں نے ایک ہی پارٹی میں اپنی زندگی گزاری، یہ امر کسی بھی اعزاز سے کم نہیں کہ انہوں نے پارٹی کے قیام سے لے کر اب تیسری نسل تک پارٹی کے ساتھ وفاداری کی، اور پارٹی قیادت (مالکان) نے بھی انہیں اس وفاداری کا صلہ دیا۔

کتاب لکھنے کے لئے یقیناً قائم علی شاہ کے پاس لاکھوں باتیں ہوں گی، ہزاروں واقعات ہوں گے، نہ جانے کتنے پوشیدہ گوشے ایسے ہیں جن کا علم صرف شاہ صاحب کو ہی ہے، وہ پارٹی کے بانی سے لے کر ان کی تیسری نسل تک کی سیاست کے عینی شاہد ہیں۔ یقیناً بہت سی باتیں ایسی بھی ہوں گی، جن کے منفی اثرات عوام اور سیاست پر پڑ سکتے ہیں، یا ایسا سچ بھی انہیں معلوم ہو سکتا ہے، جس سے ملک و قوم کو ان کے قائدین کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچا۔ وہ طرح طرح کے واقعات تو لکھ سکتے ہیں، مگر قوم کو سچ کی بھی ضرورت ہے، ان کی کتاب تاریخ کا ایک باب ہوگی، اور مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سچ بولے۔ قائم علی شاہ کی کتاب دلچسپ ضرور ہوگی، کیونکہ ان کا تقریر اور گفتگو کا اسلوب دلچسپ ہی ہوتا ہے، اگرچہ تقریر میں وہ شعر وغیرہ بھول جاتے تھے، مگر لکھنے کے عمل میں وہ تسلی سے

درست شعر بھی لکھ سکتے تھے۔ قوم ان کی اس کاوش کی منتظر ہے۔

! برداشت سے ہی ترقی ممکن ہے

ورکشاپ دو روزہ تھی، صحافیوں کو آن لائن جر نلزم کی ضرورت واہمیت کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اگرچہ اب صحافیوں کی اکثریت آن لائن جر نلزم سے واقف ہے، مگر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے لوگ اس سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں، جس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ان میں تربیت کی کمی ہے، انہیں ٹیکنالوجی کے وسیع سمندر میں غوطہ زنی کے ہنر سے آگاہی نہیں، یوں وہ یہاں سے وہ فائدے حاصل نہیں کر سکتی جن کا حصول مناسب رہنمائی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ دوروزہ ورکشاپ بہاول پور پریس کلب اور ’پیس جر نلزم فورم‘ کے اشتراک سے منعقد کی گئی تھی۔ حالات میں بے حد تبدیلی آچکی ہے، پہلے بس یہی ہوتا تھا کہ کسی بھی ہنر کا ماہر اپنا کام کرتا تھا اور دوسرے اسے دیکھ کر سیکھتے تھے، سیکھنے والے بڑوں سے ان کے تجربہ کی بنیاد پر سوال کرتے اور رہنمائی لیتے تھے۔ یہ نہیں کہ اب یہ سلسلہ منقطع ہو چکا یا اس کی افادیت دم توڑ چکی ہے، بلکہ یہ کام فطری طور پر جاری ہے۔ تاہم تربیت کا، نظام اپنا اثر رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں اس کی افادیت کو ایک ضرورت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر احسان صادق بہاول پور کے ریجنل پولیس آفیسر ہیں، انہوں نے پولیس کی

روایات تبدیل کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے، انہوں نے ورکشاپ کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے میڈیا کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ معاشرے کا منظر نامہ میڈیا ہی بناتا ہے، کیونکہ میڈیا جو کچھ دیکھتا ہے، وہ بیان کر دیتا ہے، اسی کے بیان کئے ہوئے منظر پر ہی لوگ اعتماد کرتے اور اسی کو آگے بیان کرتے ہیں۔ جدید دور میں جدید ٹیکنالوجی سے انسان کی زندگیاں متاثر ہو رہی ہیں، میڈیا زندگیوں میں تبدیلیاں رونما کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میڈیا رائے سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے، کسی شخص سے کوئی بات معلوم کی جائے تو یہی جواب ملے گا کہ اخبار میں پڑھی ہے، گویا اخبار کی خبر پر لوگ اعتبار کرتے ہیں اور اسی لئے اس خبر کو معتبر بھی ہونا چاہیے۔ میڈیا جب کرائم کا کھوج لگا رہا ہوتا ہے تو ایسا محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ اس وقت دراصل کرائم کو پر موٹ کیا جا رہا ہے، کیونکہ جو لوگ جرم کے نشیب و فراز سے آشنا نہیں ہوتے وہ میڈیا کے ذریعے جرم کی تکنیک سیکھتے اور اسے معاشرے پر آزماتے ہیں، یوں دراصل جرم کے خاتمے کے لئے کوشاں میڈیا خود جرم میں اضافے کا کام کر رہا ہوتا ہے، اسی لئے ایک صحافی کا فرض ہے کہ وہ نہایت احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ رپورٹنگ کرے تاکہ اس کی کوشش اپنا مثبت اثر معاشرے اور لوگوں پر چھوڑ سکے۔

آر پی او کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر ہم بہت کچھ سیکھ رہے ہیں، اور مثبت

رپورنگ کی بات کر رہے ہیں تو ہمیں وہ باتیں بھی بھلا دینے کی سخت ضرورت ہے، جو معاشرے میں بگاڑ، تلخی یا خرابی کا باعث بنتی ہیں۔ جرائم اور قانون کھلنی کے معاملات کو ہی اچھالنے سے معاشرے کا جو عکس دنیا کے سامنے جاتا ہے، وہ حقیقت میں پورے حالات کی عکاسی نہیں کرتا، صرف تنقید کرنے اور منفی باتوں کو اجاگر کرنے کی بجائے مثبت باتوں اور بہتری کی طرف پیش رفت کرنے والے اقدامات کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا اپنا درست کردار ادا نہیں کر سکا، ٹاک شوں میں سنجیدگی کی ضرورت ہے، باہر کے ممالک میں کسی ایشور پر ٹاک شو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ پروفیسرز کسی عنوان پر پُر مغز گفتگو کر رہے ہیں، اپنے ہاں ٹاک شو کے شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے، اور پھر کسی کی کوئی بات سمجھ نہیں آتی۔ آرپی او کا کہنا تھا کہ ہمیں میڈیا کے معاملات پر بھرپور بحث کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کا کردار سب سے بڑا اور اہم ہے۔ ڈاکٹر ظفر اقبال اور آصف بھٹی نے مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جب تک کسی ملک کے اندر ایک دوسرے کے مذہب اور ثقافت کو برداشت نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک ملک اور معاشرے میں بھائی چارہ، امن اور سکون نہیں ہوگا، خود کو دوسروں سے برتر تصور کرنا اور دوسروں کو کمتر سمجھ کر نفرت کرنا ہی اصل خرابی ہے، جس سے اسلام بھی منع کرتا ہے اور اخلاق بھی۔ امن اور برداشت کو اپنانے سے ہی

قومی ترقی کی راہوں پر کامزن ہو سکتی ہیں۔

تین معصوم بچے ایک ہی تکتے پر سر رکھ کر سو رہے ہیں، ان کی عمریں بالترتیب نو، چھ اور چار سال ہیں۔ بڑے دو بھائی ہیں اور چھوٹی چار سالہ زنیہ بہن۔ چھوٹے بہن بھائی لگتا ہے بس باتیں کرتے کرتے سو گئے، کم دونوں کے رُخ اور سر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ قریب ہی ایک تصویر ان کے باپ کی ہے، وہ بھی سو رہا ہے، گھر کا اور کوئی فرد وہاں موجود نہیں۔ بچوں کی ماں فوت ہو چکی ہے، اور دوسری ماں اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ یہ سونے والے بچے دراصل ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں، کہ اب یہ کبھی بیدار نہیں ہونگے۔ اور قریب ہی سونے والا ان کا والد ابدی نہیں، بے ہوشی کی نیند سو رہا ہے، جو کچھ دیر کے بعد ہوش میں آجائے گا۔ بہاول پور کی قائد اعظم کالونی کہ جس میں غریب اور مزدور طبقہ کی اکثریت رہائش پذیر ہے، کا المناک واقع یہ ہے کہ تینوں بچوں کو ابدی نیند سلانے والا خود اُن بچوں کا والد ہی ہے۔ ان بچوں کی ماں کو اپنے بچوں کو مامتا کا پیار دینے کا موقع نہ ملا۔ ازل سے بلاوا آگیا، وہ رخصت ہوئی اور بچے بے آسرا ہو گئے۔ والد نے دوسری شادی کر لی، مگر نئی آنے والی 'ماں' کا بچوں کی وجہ سے اپنے شوہر سے اکثر جھگڑا رہنے لگا، گزشتہ دنوں وہ اسی سلسلے میں ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی تو سفاک والد نے اپنے بچوں کو زہر پلا دی، اس کا اثر ہونے سے قبل ہی ان کا

گلا گھونٹ کر انہیں بھی ان کی حقیقی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ کچھ دوائی خود بھی پی، مگر اتنی کہ زیادہ اثر نہ ہوا۔

کتنا ہی سنجیدہ معاملہ تھا، کہ اگر کسی فرد کے تین بچے ہیں اور ان بچوں کی ماں ملکِ عدم سدھار جاتی ہے، تو اُن بچوں کو کون پالے گا؟ اس حقیقت سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا کہ اگر بچوں کا والد فوت ہو جائے تو ان کی ماں زندگی بھر بیوہ اور بے آسرا رہ کر اپنی اولاد کو پال لیتی ہے، مگر جب کسی کا باپ فوت ہو جائے تو اس کے لئے اپنے بچوں کو پالنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت ہی عورت میں رکھی ہے، وہی بچوں کو پال سکتی ہے، جبکہ مرد کا کام باہر جا کر کام کرنا اور پیسہ کما کر لانا ہے، تاکہ بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے فوت ہونے پر مرد اکثر شادی کر لیتے ہیں۔ یہ الگ کہانی ہے کہ مرد کو چار شادیوں تک کی اجازت ہے، اگر وہ انصاف کی شرط پوری کر سکے، مگر اپنے ہاں ایک سے انصاف نہیں ہوتا اور بات آگے سے آگے چلی جاتی ہے۔ اگر مرد اپنی بیوی کے فوت ہونے کے بعد کوئی مرد دوسری شادی کرتا ہے تو آخر اس کے گھر والے اور دیگر عزیز واقارب آنے والی خاتون کے خاندان کا جائزہ لیتے ہیں، انہیں بتایا جاتا ہے کہ پہلے اس مرد کے تین بچے بھی ہیں، وہ بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ مگر اپنے ہاں بد قسمتی سے ایسے معاملات میں شادی کے موقع پر بہت کچھ چھپا لیا جاتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ

پوشیدہ راز کھلتے جاتے ہیں، اور خوشگوار تعلقات کشیدہ ہونے لگتے ہیں، انجام وہی ہوتا ہے جو اوپر کے تازہ واقع میں بیان ہوا ہے۔ اپنے معاشرے میں ایسی بے شمار شادیاں ہوتی ہیں، جن میں والدین کو علم بھی نہیں ہوتا، بسا اوقات تو پہلی بیوی کو بھی بہت بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شوہر نامدار نے دوسرا بیاہ بھی چار کھا ہے۔ یوں اس اہم ترین معاشرتی مسئلے کو کہ جس کی بنیاد پر نئی نسل کا دار و مدار ہے، نہایت غیر سنجیدگی سے نبھایا جاتا ہے۔

ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ ایک خاندان کا اب کیا باقی رہا، ایک بیوی فوت ہو گئی، دوسری اپنے گھر چلی گئی، بچوں کو قتل کر دیا گیا، رہ گیا فرد واحد، جو کہ اس ساری داستان کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟ کچھ عرصہ جیل اور پھر نامعلوم انجام، تین بچوں کے قتل پر اسے سزائے موت بھی ہو سکتی ہے، مگر کبھی ایسی سزائے موت کی خبر سنی نہیں کہ کسی کو اپنے ہی بچوں کو قتل کر دینے کی پاداش میں سزا ہو گئی۔ دہشت گردی یا دوسروں کو قتل کرنے والوں کو تو پھانسیاں ہوتے دیکھتے ہیں، مگر مذکورہ بالا کیس میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس بھیانک عمل کی روک تھام کے لئے پورے معاشرے کو کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے، مگر یہاں تعلیم عام کئے اور قانون پر عمل درآمد کئے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔

گھر سے میت کے اٹھائے جانے کا وقت آیا تو ایک کھرام سا مچ گیا، گھر کا سربراہ باون برس کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہو رہا تھا۔ غلام نازک شہزاد لودھراں میں محکمہ تعلیم کے ضلعی سربراہ تھے۔ انہوں نے اپنے فرائض کو یوں نبھایا کہ گزشتہ سالوں میں دو مرتبہ لودھراں جیسا ضلع بھی پنجاب بھر میں کارکردگی کے حساب سے پوزیشن لینے والوں میں شامل ہو گیا۔ پنجاب حکومت نے بہتر کارکردگی کے لئے کچھ ضابطے اور اشاریے دیئے ہوئے ہیں، جن میں اساتذہ اور طلبہ کی حاضری، افسران کے سکولوں کے دورے، داخلوں کی شرح، معیار تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ دفتر میں اُن کے رویے سے بعض لوگ ناخوش تھے، وجہ یہی تھی کہ وہ ہر کسی سے کام لیتے تھے، جس پر سست رو نظام میں کام کرنے والے لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، مگر اسی کام کا نتیجہ ہی تھا کہ ضلع نے پنجاب بھر میں دو مرتبہ پوزیشن لی۔ ہفتہ کی رات تک دفتر میں کام کرتے رہے، رات کو اتوار کی چھٹی کے سبب اپنے گھر ڈیرہ غازی خان چلے گئے۔ صبح دردِ دل کے باعث ڈاکٹر کے پاس گئے، مگر معاملہ زیادہ بگڑ چکا تھا، جانبر نہ ہو سکے اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اگرچہ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی، اس کے باوجود وہ کھانے پینے میں بہت زیادہ پرہیز اور احتیاط برتتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اس ناگہانی موت پر تو ہر کوئی دل گرفتہ

تھا، تاہم گھر سے میت اٹھاتے وقت ایک بچی کی چیخوں نے ماحول کو دہلا کر رکھ دیا۔
 مرحوم نے باون بہاریں دیکھی تھیں، تاہم ان کے بیٹے برسر روزگار تھے۔ انسان
 صدمے سہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ وہ اپنے والدین اور دوسرے قریبی لوگوں
 کی جدائی کو بھی آخر کار بھول جاتا ہے۔ خاص طور پر جب گھر میں نان نفقہ کا مسئلہ نہ ہو،
 اپنا گھر بھی ہو اور کمانے والے بھی۔ اللہ تعالیٰ صبر دینے والا ہے۔ معاشرے میں ایسے
 بے شمار لوگ ہیں، جن کا آخری وقت آ جاتا ہے، کیوں کہ موت کا وقت معین ہے، مگر
 اس کے لئے عمر کی کوئی قید یا حد مقرر نہیں۔ دنیا داری کی حد تک مسئلہ اس وقت بنتا
 ہے کہ جب گھر کا کفیل فوت ہو گیا، چھوٹے چھوٹے بچوں کو پالنے اور سنبھالنے والا کوئی
 نہیں۔ ایسے میں بعض اوقات کوئی اچھا کھانا پیتا گھر بھی غربت کی غاروں میں گھر جاتا
 ہے، خوشحالی کی زندگی گزارنے والے بچے اشیائے ضرورت کو بھی ترسنے لگتے ہیں، اگر
 وہ پہلے سے بھی غریب تھے تو بھی سربراہ خانہ کے بعد ان کی حالت مزید خراب ہو جاتی
 ہے۔ ایسے میں ان بچوں کو پالنے والا کوئی نہیں ہوتا، پالنا تو دور کی بات ہے، پوچھنے
 والا بھی کوئی نہیں آتا۔ یہ ایک گھمبیر معاشرتی معاملہ ہے۔ عمومی اور عملی طور پر معاشرہ
 ایسے گھروں سے لا تعلق ہوتا ہے، مگر ارادہ کرم افسوس وغیرہ کا اظہار کرتا رہتا ہے،
 اور اس خواہش کا اظہار بھی کہ

کاش اس گھر کی مدد کی جاتی۔

اس کاش یا خواہش کو کچھ لوگ عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں، معاشرے میں اگرچہ ان کی تعداد اور ان کا دائرہ اثر اس قدر وسیع نہیں کہ وہ معاشرے کے اکثریتیم اور مستحق بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیں، مگر جتنی کوشش وہ کر رہے ہیں، وہ قابلِ تحسین اور لائقِ تقلید ہے۔ گزشتہ دنوں ایک ایسی تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا، جو ایسے بچوں کے لئے سجائی گئی تھی کہ جن کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا تھا، اور والد کے بعد ان کا کوئی کفیل بھی نہیں تھا۔ الخدمت فاؤنڈیشن نے اپنی خدمات میں ایک شعبہ ایسے ہی بچوں کے لئے مختص کر رکھا ہے۔ ان بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کئے جاتے ہیں، ان کے اہل خانہ کی بھی رمضان المبارک یا عید وغیرہ کے موقع پر مدد کی جاتی ہے۔ ان بچوں کا انتخاب نہایت ہی احتیاط اور چھان بین کے بعد کیا جاتا ہے۔ مذکورہ تقریب عید ملن کے نام پر منعقد کی گئی تھی اور اس کے لئے بہاول پور چڑیا گھر کا انتخاب کیا گیا تھا، تاکہ بچے، ان کی مائیں اور دیگر عزیز آئیں تو ان کے لئے سیر کا ماحول بھی میسر آ جائے، ان بچوں کو دوستانہ ماحول دیا گیا، سیکڑوں روپے کی اشیاء پر مشتمل گفٹ پیک تو تمام بچوں کے لئے بھی بنایا گیا تھا، مگر کھیل ہی کھیل میں سوالات وغیرہ پوچھ کر بھی بہت سے بچوں کو تحفے دیئے گئے۔ الخدمت فاؤنڈیشن کی اس سکیم کے بہاول پور کے روح رواں ڈاکٹر

منصور باجوہ کا کہنا تھا کہ ان بچوں کی دیکھ بھال اور سرپرستی ہمارا دینی فریضہ ہے،
اور سنتِ رسول ﷺ بھی۔ اگر پورا معاشرے یہ روش اپنالے تو بہت بہتری آ سکتی ہے۔

گزشتہ قومی الیکشن میں جب خیبر پختونخواہ میں تحریک انصاف کی عددی اکثریت سامنے آئی تو پاکستان بھر سے سنجیدہ حلقوں کا خیال تھا کہ پارٹی کو ایک اچھا موقع میسر آ گیا ہے کہ وہ اپنی کارکردگی سے اپنے دعووں اور نعروں میں رنگ بھریں، عوام کو بتائیں کہ ان کے منصوبے صرف تقریروں اور تحریروں تک ہی محدود نہیں، بلکہ وہ قابل عمل بھی ہیں۔ لیکن ایک تصور پایا جاتا ہے کہ خیبر کی حکومت اس طریقے سے کچھ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی، جس طرح اس کی خواہش اور عوام کی توقعات تھیں۔ صوبہ چونکہ دہشت گردی کا مرکز ہے، اس لئے یقیناً وہاں مسائل بھی زیادہ ہیں۔ تاہم پولیس اصلاحات میں بہتری کی خبریں سنتے ہیں، پولیس چونکہ ایک بہت ہی بگڑا ہوا محکمہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے اس کی اصلاح بھی اسی قدر مشکل ہے۔ دوسری بہتری جو خیبر کے جنت نظیر پہاڑی علاقے میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ بھی قابل تحسین ہے، کہ وہاں پر کروڑوں کی تعداد میں درخت لگائے جا رہے ہیں، جو آنے والے سالوں میں خوشگوار تبدیلی کا موجب بنیں گے۔ تعلیم کے لئے بھی بجٹ میں اضافہ کیا گیا ہے، اس کے اثرات بھی ایک آدھ سال میں سامنے آجائیں گے۔ تاہم یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے، کہ اگر وہاں کچھ اصلاحات ہوئی ہیں تو آئی ٹی کے دور میں اور سوشل میڈیا کے دلدادہ لوگوں کے ہوتے، وہاں کی

مثبت کارکردگی کی تفصیل دوسرے صوبوں کے عوام تک نہیں پہنچ رہی۔

خیبر پختونخواہ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدرتی حسن سے نوازا ہے، اس سے بے شمار ملک محروم ہیں۔ پاکستان میں قدرتِ حق نے ہر قسم کی سطح زمین اور ہر قسم کا موسم عطا فرمایا ہے، مگر خیبر پختونخواہ کے بلند و بالا درختوں سے ڈھکے پہاڑ، برف پوش چوٹیاں، آبشاریں، طلسماتی جھیلیں، سیاحوں سے اٹھکیلیاں کرتے بادل، برف گھلنے، بارش ہونے اور چشموں کے پانی کے اکٹھا ہونے سے بننے والے دریا، کیا کیا نظارے ہیں کہ بس انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ سیاحوں کے لئے کسی جنت سے کم نہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ یہاں دہشت گردی وغیرہ کے جواز کی بنا پر سیاح ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے، یا ان میں نمایاں کمی آگئی تھی، مگر اس علاقے میں سیاحت کی کمی کی خاص اور بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سیاحت کو فروغ دینے کے لئے ضروری سہولتوں کا فقدان ہے۔ حکومتیں اپنے وسائل اس طرف منتقل کرنے کے بارے میں غور ہی نہیں کرتیں۔ پاکستان کی سیاست میں تاریخی کامیابیاں حاصل کرنے والے میاں برادران بھی سیاحت کا بہت شوق رکھتے ہیں، انہوں نے خاص طور پر پنجاب میں پارکوں وغیرہ پر کافی توجہ دی ہے، مگر بحیثیت وفاقی حکمران شمالی علاقوں کے لئے ان کے کارناموں کی فہرست تشنہ تکمیل ہے، اس طرف انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اب عمران خان سے اس ضمن میں بہت سی توقعات تھیں، مگر معاملہ درخت لگانے تک ہی محدود ہے۔ اگر شمالی

علاقہ جات میں سیاحوں کے لئے پرامن ماحول کے ساتھ ساتھ سہولتیں بھی بہم پہنچا دی جائیں، سڑکوں کو کشادہ کر دیا جائے، خستہ سڑکوں کی مرمت ہو جائے، صاف ستھری رہائش گاہیں اور اچھے کھانے وغیرہ ملیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہاں سیر کرنے والوں کو جم غفیر نہ جمع ہو جائے، جس سے یہاں کے لوگوں کے روزگار میں معقول اضافہ ہوگا اور ملک بھر سے ہی نہیں، پوری دنیا سے سیاح یہاں آکر قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

بات حکومت کی کارکردگی سے شروع ہوئی تھی، جذباتی ہو کر خوبصورت مناظر کی طرف مڑ گئی۔ خیبر پختونخواہ حکومت ایکٹ بہت ہی اہم قدم اٹھانے جا رہی ہے، ایکٹ بل کی منظوری دی گئی ہے، جس کے مطابق صوبے میں گورنر، وزیر اعلیٰ، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، وزراء، مشیر، معاونین خصوصی، ضلع تحصیل ناظم، چیف سیکریٹری سمیت تمام سیکریٹریز، ایڈووکیٹ جنرل وغیرہ میں سے کوئی بھی حکومت میں رہتے ہوئے اپنا ذاتی کاروبار نہیں کر سکے گا، اور نہ ہی کاروبار پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکے گا۔ ایکٹ کمیشن تشکیل دیا جائے گا جو ہر سال پبلک آفس ہولڈرز کے اثاثوں کی چھان بین کرے گا۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو پانچ لاکھ روپے تک جرمانہ ہوگا۔ کمیشن تین ارکان پر مشتمل ہوگا، جس کا انتخاب دورانی سلیکشن کمیٹی کرے گی، جس کا ایکٹ رکن حکومتی اور دوسرا اپوزیشن کی طرف سے نامزد کردہ ہوگا۔ خیبر پختونخواہ کا یہ اقدام قابل

تحسین ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام بڑے عہدیداروں کے اثاثے سالانہ بنیادوں پر سامنے آجایا کریں گے۔ ایسے اقدام دوسری حکومتیں بھی کر لیں تو کرپشن میں کسی حد تک کمی آ سکتی ہے۔

! موٹے اور کاہل افراد

موٹے اور کاہل افراد کی بھی عالمی درجہ بندی سامنے آ گئی، اس مقابلے میں سعودی عرب نے تیسری پوزیشن حاصل کی ہے، جبکہ پہلی مالٹا اور دوسری سواری لینڈ کے حصے میں آئی ہے۔ سنتے آئے تھے کہ امریکہ میں موٹوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، تاہم وہ پہلی تین نمایاں پوزیشنوں میں نہیں آ سکا۔ برٹش جرنل میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب کے 86 فیصد افراد موٹاپے کا شکار ہیں، جس کی خاص وجہ ذیابیطس کا مرض ہے، طبی ماہرین نے سعودی شہریوں کو کھانے پینے کی صحت مندانہ عادات اپنانے اور ورزش کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ یقیناً موٹے سعودی شہری اس بیماری سے پریشان تو پہلے سے ہی ہوں گے، مگر اب عالمی درجہ بندی میں نمایاں مقام پر پہنچنے کے بعد ممکن ہے وہاں کوئی ہل چل مچے اور یار لوگ کسی احتیاطی تدبیر کی جانب رجوع کریں۔ یا پھر شاہ سلمان کے علم میں یہ خبر لائی گئی تو کیا معلوم وہ بھی اس پرائیکشن لے لیں اور موٹاپے کے خاتمے کے احکامات جاری کر دیں۔ جیسے بھی ہو اب سعودی شہریوں کو محتاط رہنے کی سخت ضرورت ہے۔

موٹاپا کافی تکلیف دہ بیماری ہے، اس بیماری میں مبتلا انسان کو اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ ہر کوئی

اپنے ارد گرد ایسے لوگوں کو دیکھتا اور ان کی پریشانی کو محسوس کرتا ہے۔ جب انسان کو یہ بیماری لگ جاتی ہے تو پھر اس بیماری کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے مزید بیماریاں انسان کو گھیر لیتی ہیں۔ مگر موٹے انسان کے لئے سب سے تکلیف دہ مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں ان کا اسی بیماری کی وجہ سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔ موٹا ہونا ایک اذیت ناک بیماری ہے، مگر شاید ہی کوئی ایسی بیماری ہو، جسے مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہو، عام طور پر بیمار افراد ہمدردی کے لائق تصور کئے جاتے ہیں، مگر یہاں معاملہ الٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ہاں ڈراموں، فلموں اور دوسرے ایسے ہی مواقع پر موٹاپے کو مزاح اور مذاق کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، یہ تو بہت سے موٹوں کا بھی کمال اور ہمت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مذاق کے لئے پیش کر دیتے ہیں اور اگر دوسرے ان کا مذاق نہ بھی اڑائیں تو وہ خود کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کا مذاق اڑایا جائے۔ موٹا ہونا بیماری ہے تو جب اس بیماری کا آغاز ہوتا ہے، اسی وقت اس کو قابو کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ عمل صرف موٹاپے کے ساتھ ہی نہیں دہرانا چاہیے، بلکہ ہر بیماری کو ابتدا میں ہی پکڑ لیا جائے تو اس کے خاتمے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، مگر جب وہ اپنی جڑیں مضبوط کر لے تو اس کو جڑ سے اکھاڑنا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو موٹاپے اور کابلی کا آپس میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا، مگر یہ تصور

کیا جاسکتا ہے کہ کوئی انسان کاہل ہے تو اپنی اس عادتِ بد کی وجہ سے موٹاپے کا شکار ہو
 سکتا ہے، اگر کاہل نہیں بلکہ صرف موٹا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ موٹاپے کی وجہ
 سے ہلنے چلنے سے بیزار ہو جاتا ہے، ایسے میں کاہلی کا انسان پر سوار ہو جانا کوئی حیرت کی
 بات نہیں۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ موٹے افراد کاہل بھی ہوتے ہیں۔ سعودی عرب
 میں اس قدر زیادہ افراد موٹے کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب تو سعودیہ کے طبی ماہرین
 کے پاس ہی ہوگا، تاہم سروے کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ یہ افراد ذیابیطس کے
 مریض ہیں۔ سعودیہ میں لوگ چونکہ اب آسودہ حال ہیں، جب انسان کے پاس پیسہ ہو
 تو وہ بے شمار غموں سے آزاد ہوتا ہے، غم انسان کو کمزور کر دیتے ہیں، سعودیہ والوں
 کے پاس دھن بھی ہے، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے مرنے کے بعد کے مراحل کی
 بھی زیادہ فکر نہیں ہوتی، کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دو مقامات ایسے ہیں،
 جہاں نماز پڑھنے سے لاکھوں ہزاروں نمازوں کا اجر نصیب ہو جاتا ہے، یوں چھوٹے
 موٹے گناہ تو ان نمازوں سے جھڑ جاتے ہیں۔ رہے نسبتاً بڑے گناہ، تو وہاں قانون کی
 عملداری کی بنا پر ان کی سزا موجود ہے، لہذا وہ کم سرزد ہوتے ہیں، اگر ہوتے ہیں تو ان
 کی سزا ملتی ہے۔ جہاں تک طبی ماہرین کے مشورے کا تعلق ہے وہ کم ہی قابلِ عمل ہے،
 کیونکہ جو لوگ بیٹھے بٹھائے ارب پتی ہیں، انہیں حرکت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور
 جب حرکت نہیں کریں گے تو موٹے ہوں گے اور کاہل بھی کملائیں گے، یوں تہذیبی کے
 امکانات کم ہیں۔

! تنزین و آرائش اور خود کشیاں

گورنر ہاؤس کی تنزین و آرائش پر مزید گیارہ کروڑ باون لاکھ روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے، ازراہ کرم وزارت خزانہ نے رقم جاری کر دی ہے۔ اس چھوٹی سی خبر میں اگرچہ گیارہ کروڑ کی بھی بہت اہمیت ہے، مگر ”مزید“ کی بات نرالی ہے۔ گویا گورنر ہاؤس کی تنزین و آرائش ایک اہم فریضہ ہے جسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس پر کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں اور مسلسل کئے جاتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ وزارت خزانہ گزشتہ دو مالی سالوں کے دوران بیس کروڑ سے زائد خرچ کر چکا۔ اس کے علاوہ گورنر ہاؤس کے ریٹ ہاؤس پر چھ کروڑ سے زائد، ملازمین کی رہائش گاہوں پر ایک کروڑ اور سکیورٹی کی مد میں سات کروڑ کے قریب خرچ کیا جائے گا۔ گورنر ہاؤس پر اس قدر اخراجات کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام صوبے میں وفاق کی نمائندگی کرتا ہے، نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی انگریز نمائندہ ہے، اس کی اہمیت اس وقت دو چند ہو جاتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ آئین میں اس عہدے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان کے آئین میں گورنر جہاں مرکز کا نمائندہ ہوتا ہے، وہاں اس عہدہ کی حیثیت نمائش ہے، صرف دستخط وغیرہ کرنا اور پروٹوکول سے لطف اندوز ہونا گورنر کے فرائض میں شامل ہے۔ اختیارات کے حوالے سے اس عہدیدار کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہوتا، اگرچہ آرڈیننس وغیرہ جاری کرنا اور

صوبائی اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین کو حتمی شکل دینے کے لئے ان پر دستخط کرنے جیسے اہم کام بھی گورنر کے ذمہ ہیں، مگر یہ بھی یاد رکھا جائے کہ اپنے ہاں گورنر کے پاس کوئی اختیار نہیں کہ وہ دستخط کرنے سے انکار کر دیں۔ یوں دستخط کرنا ایک بڑا اختیار تو ہے، مگر اس کے ساتھ ہی بے اختیاری بھی جڑی ہوئی ہے۔

گورنر ہاؤس کی اپنی اہمیت ہے، وسیع و عریض علاقے کو کم از کم پنجاب میں انگریزوں کی سب سے بڑی اور اہم یادگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ عمارت انگریزوں کی یادگار ہے، اس لئے فطری طور پر یہاں کے باسی بھی انگریز بن کر ہی رہتے ہیں، وہی انداز حکمرانی، وہی روایات، وہی مراعات۔ گورنر جب اس عظیم الشان عہدے پر اس عالیشان عمارت میں داخل ہوتے ہیں تو آتے ہوئے بے شمار دعوے کرتے ہیں، قوم کو بتاتے ہیں کہ تعلیم ان کی اولین ترجیح ہوگی، صوبے کے عوام کی صحت کو بہتر کر کے دم لیں گے، پینے کا صاف پانی ہر فرد کو میسر ہوگا، صوبے میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگا اور امن و امان کی صورت حال مثالی ہو جائے گی، کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پیشرو بھی جاتے ہوئے ایسے ہی دعوے کر کے گیا تھا، مگر عمل کی صورت حال صفر ہی رہی تھی۔ ایسے میں یہ لوگ نہ جانے کس زعم میں دوبارہ انہی دعوؤں کو دہرانے لگ جاتے ہیں۔ جب وہ جانتے ہیں کہ گورنر کے پاس صرف

دستخط کرنے کے اختیار ہیں، اور گردن گردن مراعات ہیں اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، تو آخر انہیں کونسی چیز ان دعووں پر مجبور کرتی ہے، جن پر وہ کسی صورت عمل نہیں کر سکتے؟ اگر کوئی گورنر ایسا بھی آجائے جو کچھ کرنے کی صلاحیت یا خواہش رکھتا ہو تو اسے بھی نظام کی جکڑ بندیوں میں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اپنے ہاں اکثر گورنر ایسے ہوتے ہیں جو مشنری دل و دماغ بھی نہیں رکھتے، جنہوں نے کبھی کوئی ایسا معرکہ بھی نہیں مارا ہوتا جس میں عوامی خدمت یا تعلیمی میدان میں کوئی کارنامہ، یا سماجی خدمت کا کوئی کام یا صحت عامہ کے لئے کوئی بہتری نہیں کی ہوتی، وہ بھی جب گورنر بن کر قوم کے خزانے سے دونوں ہاتھوں سے مراعات سمیٹنے لگتے ہیں تو ایسے ایسے نعرے بلند کرتے ہیں کہ قوم حیران و ششدر رہ جاتی ہے، اور جب وہ حسب توقع کچھ بھی نہیں کر پاتے تو شرمندگی بھی نہیں ہوتی، یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ذرا ان کروڑوں روپوں کو دیکھئے اور حکمرانوں کے علاوہ دیگر اداروں کی حالت کا جائزہ لیجئے، سرکاری ہسپتالوں کی حالت زار کا اندازہ لگائیے، سرکاری سکولوں کی کمپرسی پر ماتم کیجئے، جہاں کمرے، واش روم اور دیگر سہولتیں سرے سے موجود ہی نہیں، دوسری طرف معاملہ کروڑوں کا ہے، ظاہر ہے بڑے لوگوں کے لئے کروڑوں کی حیثیت ہی کیا ہے، ایک استحصال ہے جو بڑھتا جا رہا ہے، ایک خلیج ہے جو وسیع ہوتی جا رہی ہے، ایک ظلم ہے، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ حاکم کے گھر کی تزئین و آرائش پر کروڑوں کا خرچہ اور غریبوں کے گھر میں چند ہزار (بعض اوقات چند

سو روپے) نہ ہونے سے خود کشیاں؟ کیا اس بارے میں کسی گورنر نے کبھی سوچا؟

! لائبریری کنٹینر اور یونیورسٹی کیمپس

پاکستان میں کنٹینرز کی مقبولیت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ تصور تو اور بھی بہت لوگوں کا ہوگا، مگر اس کی ابتداء علامہ طاہر القادری نے کی، جب وہ کنٹینرز میں بیٹھ کر اسلام آباد دھرنے کے لئے نکلے۔ کنٹینرز میں بیڈ روم بھی تھا اور آفس بھی، عقبی جانب شیشہ تھا، جس سے ریلی کی صورت میں پیچھے آنے والوں کو بھی دیکھا جاسکتا تھا اور اسلام آباد پہنچ کر اس کا پردہ ہٹا کر اپنے چاہنے والوں اور میڈیا کے لئے خطاب بھی کیا۔ یہ بھی مرحلہ آیا کہ کارکن باہر بارش میں پڑے رہے اور صاحب کنٹینرز کے اندر سکون کی نیند سوئے رہے۔ جاٹا ایسی ہی قربانیوں سے بنتے ہیں۔ پھر عمران خان نے تحریک کا آغاز کیا تو کنٹینرز کو نئی زندگی ملی۔ انہوں نے کنٹینرز پر کھڑے ہو کر کئی مہینے تک رونق لگائے رکھی۔ کنٹینرز کی کہانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ تحریک انصاف کے دھرنوں وغیرہ کے دوران بہت سے راستوں کو روکنے کے لئے حکومت نے بھی انہیں کنٹینرز کا سہارا لیا۔ اس کے علاوہ حکومت محکمہ صحت میں بھی موبائل کنٹینرز استعمال کرتی ہے۔ اب پنجاب حکومت کی طرف سے بھی کنٹینرز میدان میں اتریں گے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب کے سپیشل مانیٹرنگ یونٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبے میں موبائل کنٹینرز

لائبریریوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ موبائل کنٹینر لائبریری کے قیام سے عوام کو کتابیں فراہم کی جائیں گی، یونٹ کے ایک سینئر ممبر نے میڈیا کو بتایا ہے کہ یہ کام وزیر اعلیٰ کی ہدایت کے مطابق کیا جا رہا ہے، یہ وقت احتجاج نہیں تعلیم کا ہے، ہر بچے اور شخص کے ہاتھ میں کتاب تھمائیں گے۔ کنٹینر کو احتجاج کی بجائے تعلیم کے فروغ کے لئے استعمال کریں گے۔ اب کنٹینر اس قدر قبولیت عام حاصل کر چکا ہے کہ اس کا نام آتے ہی جہاں پہلے اس کے ذریعے سامان تجارت کی نقل و حمل کا خیال ذہن میں آتا ہے، وہاں اب اس کے استعمال کے لئے اور بھی تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ اب کنٹینر میں لائبریری ہوگی، ابتدا ہے، تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی۔ یہ کنٹینر کہاں کہاں جائے گا؟ دیہات میں گھومے گا، شہر میں قیام کرے گا؟ کتابیں کن لوگوں کو جاری کی جائیں گی؟ ان کی واپسی کیسے ممکن ہوگی؟ کیا اپنے معاشرے میں کتاب سے دلچسپی رکھنے والے اتنے افراد ہیں کہ وہ کتاب پڑھنا تو چاہتے ہیں مگر کتاب ان کی دسترس میں نہیں، وہ کتاب خرید نہیں سکتے یا زیادہ دور جا کر کتاب پڑھ نہیں سکتے، اس لئے ان کی دہلیز پر کتاب کے پڑھنے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اگر کتاب انہیں جاری کر دی جائے گی، تو اس کی واپسی کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ کیا ہم نے شرح تعلیم کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ ایک ایک فرد نہ صرف کچھ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے، بلکہ کتب بینی میں بھی دلچسپی لینے لگے؟ کنٹینر لائبریری بھی ضرور بنائیں، مگر ساتھ ہی کچھ کنٹینر سکول بھی بنادیں، کیوں

کہ لاکھوں بچے تو اب بھی سکول نہیں جاتے۔

دوسری طرف خبر آئی ہے کہ ینگورہ کے ایک سکول کے 56 بچوں کو اس وقت سکول سے نکال دیا گیا جب انہوں نے مسلسل تین روز تک غیر حاضری کا ارتکاب کیا۔ یہ سکول کسی اور کا نہیں، بچیوں کی تعلیم کے حق میں آواز بلند کرنے پر نوبل انعام حاصل کرنے والی ملالہ کا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ خوشحال سپلک سکول میں مذکورہ بالائے مسلسل تین روز نہیں آئے، جس کی بنا پر ان کی سکول سے چھٹی کروادی گئی۔ بظاہر تو یہ سکول کا ذاتی معاملہ

ہے، ڈسپلن قائم کرنے کے لئے بہت سے اقدام کرنے پڑتے ہیں، اگر اس قسم کی سختی نہ ہو تو معاملہ قابو سے نکل جاتے ہیں۔ مگر جب ایسے اقدام وہ لوگ کریں جو بچوں کی تعلیم کے فروغ کے بہت بڑے دعوے دار ہیں تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ایک اور اہم خبر بھی ہے کہ اب پاکستان کے تمام اضلاع میں یونیورسٹیوں کے سب کیمپس قائم کر دیئے جائیں گے۔ ملک بھر میں 143 اضلاع میں سے 66 ایسے کیمپسز سے محروم ہیں، جہاں دو مراحل میں ان کی تکمیل کر دی جائے گی۔ یقیناً اس سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو بہت سہولت حاصل ہو جائے گی، سٹوڈنٹس کو تعلیم کے لئے دور دراز نہیں جانا پڑے گا۔ مگر یہ بھی ہوگا کہ ہر ضلع میں کیمپس بننے سے جہاں روزگار میسر ہوگا وہاں بہت معیاری اساتذہ ہر جگہ دستیاب نہ ہو سکیں گے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ توجہ ابتدائی تعلیم دینے کی ضرورت ہے

زسری ہوگی تو آگے باغات لگائے جا سکیں گے؟

وگ کا رواج کب سے ہے، اور اس کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے، یقیناً یہ پرانی کہانی ہے، مگر بھارت میں دارالعلوم دیوبند نے ایک تازہ فتویٰ جاری کیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے وگ لگا کر نماز پڑھنے سے نماز مکمل نہیں ہوتی اس لئے اس کام سے گمراہ کیا جائے۔ کچھ لوگ سر کے بالوں سے محروم ہوتے ہیں، جوانی تک تو بال ساتھ نبھاتے ہیں، مگر بعض لوگوں کے جلد یا بدیر بال ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسان گنجا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاملہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا، مگر یار لوگ اس صورت حال میں بالوں سے محروم افراد کو مذاق کا نشانہ بناتے اور بعض اوقات ان کی تضحیک پر اتر آتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ گنجا ہونے والے صاحب کی شخصیت پر کوئی دھبا لگ جاتا ہے، بلکہ گنجا پن سے شخصیت میں نکھار آ جاتا ہے، انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی بھی طرح ایسے لوگوں کی شخصیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ اس مسئلے کو ایک بڑی خامی (یا کمی) تصور کرتے ہیں، جس کی بنا پر انہیں اس کمی کو راز رکھنے کے لئے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ہم مستقل ہی سر پر کسی نہ کسی طرح کی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھتے ہیں، ٹوپی ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے، جس کے بغیر وہ ادھورے سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے، جو اپنی اس

خامیٰ کو چھپانے کے لئے ٹوپی کا تکلف کرتے ہیں۔ عمر کچھ زیادہ ہو جائے تو جناح کیپ کو اپنے لباس کا حصہ بنا لیا جاتا ہے۔ بالوں سے محروم لوگوں کے بہت سے لطیفے بھی موجود ہیں، ہمارے ہاں یہ ایک المیہ ہے کہ لطیفے اکثر دوسروں کی تضحیک پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ٹوپی اور پگڑی وغیرہ تو عام دیکھنے میں آتی ہے، جس کی اوٹ سے کسی کو اندر کی کہانی کا علم نہیں ہوتا، اس کے علاوہ بھی ایک طریقہ اس کچی پردہ ڈالنے کا ہے، وہ ہے وگ۔ یہ اگرچہ بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں، ایسے حساس لوگوں نے اپنی محرومی پر وگ کا پردہ ڈال لیا تو گویا ایک مستقل مسئلے کو اپنے گلے ڈال لیا۔ اس راز کو راز رکھنے کا تقاضا ہے کہ احتیاط کا دامن سختی سے تھاما جائے، ایمر جنسی یا جلدی بھی ہو تو یہ سجاوٹ سر پر سجا کر ہی باہر نکلنا پڑتا ہے۔ دیگر چیزوں کی طرح وگ کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہوگی، اس لئے ذرا سستی قسم کی وگ سے دوسروں کو کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے، کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر یہ کسی اچھے برائڈ کی درآمد ہو تو پردہ رہ سکتا ہے۔ وگ اچھی ہو یا بری، اس کو مستقل سر پر چپکائے رکھنے کے لئے بہت سے مسائل کا مستقل سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وگ پوش حضرات ہر میدان میں ہوتے ہیں، مگر زیادہ شہرت سیاستدانوں کو ہی ملتی ہے، کیونکہ وہ ٹی وی چینلز پر بھی نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو وگ کے نام پر تنقید کا نشانہ بنایا

جانتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ راز کبھی فاش نہیں ہوا، اور کوئی سیاستدان ایسا سامنے نہیں آیا جو اچھے بھلے بالوں والا تھا اور قوم نے دیکھا کہ وہ یکایک گنجا ہو گیا۔

اب آئیے ذرا مذکورہ بالا فتوے کا جائزہ لیا جائے، وگت چونکہ مکمل راز ہے، اور بعض اوقات تو وگت لگانے والوں کے گھر والوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا، اس لئے جب یہ لوگ مسجد میں نماز ادا کریں گے تو وگت کا کیا کریں گے؟ اگر نماز کے وقت وگت اتار کے رکھتے ہیں، تو عجیب محسوس ہوتا ہے، وگت لگانے والے فرد کو مزید تنقید اور مذاق کا نشانہ بننا پڑے گا۔ اور اگر وہ نماز سے قبل وگت نہیں اتاریں گے تو پھر ان کے دل میں عجیب وسوسے آتے رہیں گے، آیا ان کی نماز کسی منزل کو پہنچی بھی سہی یا بس یہ پریکٹس خالی اٹھک بیٹھک اور چند ٹکروں تک ہی محدود ہے؟ جب دل میں طرح طرح کے وسوسے ہوں تو نماز کی حالت کیا ہوگی؟ اگر دارالعلوم کے مفتی حضرات کچھ گنجائش نکال لیتے تو وگت کو ٹوپی بھی قرار دے سکتے تھے، آخر سر پر کوئی ٹوپی، رومال یا کپڑا وغیرہ رکھنے کا بھی یہ لوگ سخت حکم جاری کرتے ہیں۔ دیکھیں اب اس دارالعلوم کے پیروکار کیا راستہ اختیار کرتے ہیں، فتوے پر عمل کرتے ہیں یا اس پر نظر ثانی کی درخواست کرتے ہیں، کیونکہ دیگر مسالک کے ماننے والے تو اس فتوے کے پابند نہیں۔

سفر کراچی کا درپیش تھا۔ ریلوے کے بارے میں ہماری خوش فہمی یقین کی حدوں کو چھو رہی تھی، وقت کی پابندی کی خبریں بھی عام تھیں، تاہم چند منٹ کی تاخیر سے ٹرین پہنچ گئی۔ جس بوگی میں ہم نے سفر کرنا تھا، اس کے سامنے ہی پلیٹ فارم پر ہم نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ہم چونکہ فیملی کے ساتھ تھے اور پورا کیمین ہی بکٹ تھا، مگر ٹرین میں قدم رکھتے ہی ایک صدمے نے ہمیں آلیا۔ ٹرین کی سیٹیں صاف ستھری اور سبز کپڑے کی پوشش سے مزین تھیں، مگر عام بوگی کو پوشش، پردوں اور ایئر کنڈیشنر کے ذریعے عام گاڑی سے مختلف بنایا گیا تھا۔ فیملی کے لئے تحلیے کا اہتمام نہ تھا، راہداری کی طرف پردہ لٹک رہا تھا، چھ کی بجائے پانچ سیٹیں اس کیمین میں تھیں، چھٹی سیٹ پردے سے باہر اکلوتی سیٹ کی طرف تھی، یوں ہمارے خاندانی نظام کو توڑ دیا گیا، یعنی ہم پانچ لوگ ایک کیمین میں اور ہم میں سے ایک فرد گھر سے باہر تھا۔ ہماری ایک نشست کی پشت دوسرے کیمین کی پشت سے ملتی تھی، جس میں درمیان میں چھ انچ چوڑا اور پوری تین سیٹوں طویل خلا تھا، جو ہمسایوں کے گھروں میں جھانکنے کے لئے کافی تھا۔ ہمیں فیملی کی وجہ سے ایک چادر اس خلا کو پُر کرنے میں استعمال کرنا پڑی، بعد ازاں اسے سی کی کولنگ بڑھی تو ہم چادر بھی اوپر نہ لے سکے، کہ اگر چادر لیتے ہیں تو پردہ خراب ہوتا ہے، اگر

نہیں لیتے تو سردی لگتی ہے، ترجیح پر دے کو دینا تھی، سو ہم نے رات بھر سردی کھائی۔ یہ صدمہ چونکہ گاڑی میں داخل ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا، مگر کچھ ہی دیر بعد ہم نے اسے بھول جانے (یا برداشت کرنے) کا فیصلہ کیا، مگر رات بھر سردی وغیرہ کی وجہ سے صدمے کو بھلانا سکے۔

چند برس قبل تک ریل کی حالت مایوس کن ہو چکی تھی، اگر یہ کہا جائے کہ ریل آخری سانسیں لے رہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ ریلوے سٹیشن اجڑ چکے تھے، مال گاڑیوں کا وجود تقریباً ختم ہو چکا تھا، مسافر گاڑیوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہو رہی تھی، ریلوے کی رہائشی کالونیاں کھنڈرات کا روپ دھار رہی تھیں، چھوٹے روٹس پر چلنے والی ٹرینوں کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا، وہاں موجود سٹیشن کی اینٹوں تک بھی لوگٹ لے جا چکے تھے۔ اس موقع پر خواجہ سعد رفیق کی تحسین نہ کرنا بخیلی سے کم نہیں، کہ ان کی مسلسل محنت اور توجہ سے اب نہ صرف ریل کا پہیہ چل رہا ہے، بلکہ اس میں مسلسل بہتری بھی آرہی ہے۔ یقیناً دیگر ریلوے سٹیشنز کی باری بھی آئے گی، بہاول پور کا نمبر لگ چکا ہے، پورا ریلوے سٹیشن زمین بوس کر دیا گیا ہے، اب جدید تقاضوں اور سہولیات کے ساتھ نئی عالیشان عمارت یہاں بنائی جائے گی۔ کراچی تک جاتے جاتے سامنے سے دوسری لائن پر چند ہی منٹ بعد کسی گاڑی کا آجانا بہت خوشگوار تجربہ ہے، خاص طور پر مال گاڑیاں بھی مناسب تعداد میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ

ریلوے کی زمینوں وغیرہ کا معاملہ نہایت حساس اور گھمبیر ہے، قبضہ گروپ سے یہ زمینیں واگزار کروانا آسان کام نہیں۔ یہ کام ہے بہت ضروری۔

ریلوے کے اس خوش نما چہرے پر جو بد نما داغ مستقل دکھائی دیتا ہے، وہ ہے تمام ہی شہروں میں ریلوے سٹیشنز کے قرب و جوار میں حد درجہ گندگی اور کچرا۔ یہ صورت کسی ایک شہر میں نہیں، خود بہاول پور میں جہاں کروڑوں روپے کی لاگت سے مکمل اور ماڈل ریلوے سٹیشن دوبارہ تیار ہو رہا ہے، وہیں پر سٹیشن کے دوسری جانب گندا پانی، بدبو اور اس کے دیگر لوازمات موجود ہیں۔ جس شہر میں بھی ٹرین رکنے کے لئے آہستہ ہوتی ہے، وہیں پر گندا پانی، کچرا، قبضہ گروپ موجود ہے، حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ریلوے لائن سے چند فٹ دور تک وہاں کے قابض رہائشیوں کی چارپائیاں پڑی ہوتی ہے، اور جب ٹرین صبح سویرے وہاں سے گزرتی ہے تو وہ لوگ خوابِ خرگوش میں محو ہوتے ہیں۔ جب گاڑی شہروں سے باہر نکلتی ہے، تو پیارا پاکستان اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اپنے حُسن کے جلوے بکھیر رہا ہوتا ہے، کہیں پہاڑ اور سرنگیں ہیں تو کہیں دریا اور میدان، کہیں فصلیں لہلہا رہی ہیں تو کہیں صحرا اپنے مخصوص حسن کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ یہ نظارے نہ صرف دل کو بھاتے ہیں، بلکہ انہیں دیکھتے ہی دل سے اپنے وطن کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، مگر جو نہی ٹرین کسی بھی شہر میں داخل ہوتی ہے، تو گندگی، گندا پانی اور کچرے وغیرہ کو دیکھ کر طبیعت خراب ہونے لگتی ہے،

امید ہے خواجہ سعد رفتی اس اہم معاملے پر محکمہ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے

! وفاقی کابینہ کا ادبی اجلاس

اس مرتبہ وفاقی کابینہ کے اجلاس میں وزیراعظم میاں نواز شریف کا موڈ نہایت خوشگوار تھا۔ انہوں نے اپنے وزراء کے علاوہ وفاقی سیکریٹریز وغیرہ سے بھی بہت اچھے موڈ میں گپ شپ کی۔ خبر کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجلاس گپ شپ کے انداز میں ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ وزیراعظم سیکریٹریز سے شعر سنتے رہے، جب انہوں نے سیکریٹری خزانہ سے شعر کی فرمائش کی تو انہوں نے غالب کی پوری غزل ہی سنا دی، جس پر وزیراعظم نے ان کے انتخاب کی داد دی۔ کابینہ کے اجلاس میں اقتصادی راہداری کے بارے میں بھی کچھ باتیں ہوئیں، کچھ دیگر ملکی مسائل بھی زیر بحث آئے ہونگے، جن کو حل کرنے کے لئے حکومت نے سردھڑکی بازی لگانے کے عزم کا اظہار کیا ہوگا، عوامی سطح کے تمام مسائل کو فوری حل کرنے کے احکامات جاری ہوئے ہونگے۔ ملک کو بہت جلد ترقی کی راہ پر لانے کی باتیں بھی ہوئی ہونگی، مخالفین کے پروپیگنڈہ کی نفی اور اس کے اثرات زائل کرنے کے مشورے بھی کئے گئے ہوں گے۔ ان سب کچھ کے علاوہ کابینہ کے اجلاس میں شعر و شاعری کا اہتمام بھی قابلِ تحسین قدم ہے۔

وفاقی کابینہ میں کتنے معزز ممبران ادبی ذوق رکھتے ہیں، اس کا اندازہ تو

نہیں کیا جاسکتا، مگر وزیراعظم کے خود شعر سننے اور شعر سنانے والوں کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کرنے سے خود اُن کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی وزیر نے بھی کسی شاعر کا کلام پیش کیا ہو، یا کوئی شعر سنا کر اپنے وزیراعظم کے دل کو خوش کرنے کا اہتمام کیا ہو، مگر وہ خبر کا حصہ نہیں بن سکا۔ دراصل وزیراعظم کا بینہ وغیرہ کے اجلاس کا تکلف بہت کم ہی کرتے ہیں، جیسے وہ اسمبلی کے اجلاس میں بھی صرف ہنگامی حالات میں ہی جاتے ہیں۔ اگر انہوں نے کا بینہ کا اجلاس کیا ہے، تو تمام ارکان اور وزارتوں کے متعلقہ سیکریٹریز کے لئے شاید پریشانی کا سبب بھی ہو، کہ نہ جانے کیا سوالات ہونگے، وزیراعظم کا موڈ کیسا ہوگا، کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وزیراعظم اپنے وزراء اور سیکریٹریز کی پریشانی کو بھانپ گئے ہوں اور انہوں نے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لئے سخت سوالات اور ان کے مشکل جوابات تک نوبت نہ آنے دی، بلکہ جب سٹوڈنٹس ٹیسٹ کے لئے تیار نہ ہوں تو اچھے استاد اس روز کلاس کو سرپرائز دیتے ہوئے گپ شپ اور شعر و شاعری یا کسی اور غیر نصابی سرگرمی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اگر وزیراعظم اپنے وزراء اور سیکریٹریز کا یونہی حوصلہ بڑھاتے رہیں تو آنے والے اجلاس میں اس ادبی تقریب کا منظر مزید بہتر ہو سکتا ہے، ممکن ہے اس مرتبہ ایک سیکریٹری کی تحسین ہونے پر اگلی مرتبہ دیگر بھی کچھ لوگ کچھ

غزلیں تیار کر لائیں۔ جو غزل نہیں کر سکتے وہ شعر ہی زبانی یاد کر لائیں۔ یوں محفل میں رنگت جم جائے گا۔ اس طرح جو لوگ ادبی ذوق نہیں رکھتے، یا جن کا ایسا مزاج ہی نہیں، وہ بھی وزیراعظم کو خوش کرنے کے لئے خود کو اسی ذوق کا دلدادہ ظاہر کریں گے۔ اگلے اجلاس تک وفاقی وزراء کو بھی آزمایا جاسکتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ان میں سے بھی بہت سے کچھ نہ کچھ یاد کرائیں گے، کہ نہ جانے وزیراعظم کس شعر یا غزل پر خوش ہو جائیں اور ان کے دل میں مذکورہ وزیر کا مقام مزید بلند ہو جائے۔ تاہم ان لوگوں کو کسی اچھے شاعر کی غزلیں تیار کرتے وقت اچھے اساتذہ سے رابطہ ضرور کر لینا چاہیے، تاکہ تلفظ وغیرہ کی وجہ سے کابینہ کے اجلاس میں تسبکی نہ ہو۔ یہ بھی بہتر رہے گا کہ اگلے اجلاس میں وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کو خصوصی طور پر دعوت دی جائے، انہیں ہر طرح کی غزلیں یاد ہیں، اگر بڑے میاں صاحب چاہیں گے تو انقلابی ترانہ بھی چھوٹے میاں صاحب پڑھ دیں گے، جس میں سرمایہ داروں اور مملات میں رہنے والوں کو لکارا جاتا ہے۔ اگر ترانوں میں کوئی وفاقی وزیر یا کوئی وفاقی سیکریٹری میاں شہباز شریف کا ساتھ دینا چاہے تو بھی وہ دوسروں سے مل کر گانے کا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر وزیراعظم کو کوئی ترانہ یا غزل وغیرہ زیادہ پسند آجائے تو تمام لوگ مل کر بھی قومی ترانے کی صورت میں گا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ممکن ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میاں نواز شریف کے بارے میں جو لوگ یہ منفی سوچ رکھتے ہیں کہ وہ ادبی ذوق نہیں رکھتے اس کی نفی ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اگلے کس اجلاس میں میاں صاحب کا موڈ اتنا خوشگوار رہتا ہے، کہ وہ شعر سنیں، اگر موڈ خراب ہوا تو سب کی تیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

! وزیر اعلیٰ سندھ کے نام خط

وزیر اعلیٰ سندھ مراد علی شاہ نے عوام سے رابطے کی نئی صورت نکالی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ ”عوام وزیر اعلیٰ ہاؤس کے پتے پر خط لکھیں، میں انہیں پڑھوں گا... وزراء، بیوروکریسی اور عوام کے تعاون کے بغیر مسائل کا حل ممکن نہیں...“۔ کتنے عوام وزیر اعلیٰ کو خط لکھتے ہیں اور وزیر اعلیٰ ان میں سے کتنے خط پڑھ سکتے ہیں اور کتنے لوگوں کے مسائل خط پڑھ کر حل کرتے ہیں، یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اگر انہوں نے ابتدا میں کچھ لوگوں کے خط پڑھ کر ان کے کام کر دیئے تو خطوں کی آمد میں حد سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے، ایسے میں ایک ہی فرد کے لئے اتنے خطوط کا پڑھنا ممکن نہیں رہے گا۔ ایسی صورت میں خط پڑھنے اور اس پر عملدرآمد کروانے والے عملے کی تعداد میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ آغاز میں کام کا گرم رہنا اور جلد ہی نمک کی کان میں موصوف کا نمک بن جانا کوئی اچھے کی بات نہیں ہوگی۔ آئی ٹی کے زمانے میں بھی اگر سندھ کے نئے سائیکس نے خط کو ترجیح دی ہے تو کچھ برا نہیں کیا۔ عام لوگ ابھی آئی ٹی تک اس طرح پہنچ نہیں رکھتے، تاہم جو لوگ آئی ٹی کی مہارت حاصل کر چکے ہیں، ان کے لئے بھی شکایات یا مشوروں وغیرہ کے لئے ایسا سوفٹ ویئر تشکیل دیا جاسکتا ہے، جس میں ہر کوئی اپنا حصہ ڈال سکتا ہے، ریکارڈ بھی محفوظ رہ جائے گا، عوام کو بھی سہولت ہوگی۔

میں آجکل کراچی میں ہوں، اس لئے میں نے بھی مناسب جانا کہ کیوں نہ وزیر اعلیٰ سندھ سائیں مراد علی شاہ کو ایک خط لکھ دوں، یہ ایک بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے، جس سے کراچی کینٹ سٹیشن سے لے کر گلشن حدید (سٹیبل ملز) تک جاتے ہوئے میرا واسطہ پڑا۔ میں فیملی کے ساتھ تھا، بچوں نے ٹرین پر کراچی میں داخل ہو کر کینٹ سٹیشن تک پہنچتے ہوئے جو مناظر دیکھے تھے، ان کا واسطہ جس طرح کچرے، گندگی وغیرہ سے پڑا تھا، کراچی کے بارے میں ان کا ذہن بن رہا تھا۔ مگر جب ہم ٹیکسی میں سڑک پر سفر شروع کیا، تو کراچی کا نقشہ ہی کچھ اور تھا، صاف ستھری بڑی سڑکیں، تیز ہوا سے جھومتے درخت، بلند و بالا عمارتیں اور کاروباری مراکز۔ ابھی ہم لوگ ماحول سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ وہی سڑک جس پر ہم اڑے اڑے جا رہے تھے، اچانک بڑے بڑے گڑھوں میں تبدیل ہو گئی، سڑک کے ایک طرف کسی سپلائی کے لئے بھی گڑھے کھودے گئے تھے، پوری سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، ہر طرف مٹی کے مرغولے اڑ رہے تھے، جس گاڑی کو جہاں سے راستہ ملتا وہ نکلنے کی کوشش میں تھی، مگر ٹریفک کے حد سے زیادہ ہونے کی وجہ سے کچھوے کی چال سے چل رہی تھی۔ کچھ ہی آگے چل کر سڑک پر پانی کھڑا پایا، یہ نہ جانا جائے کہ وہاں کھڈے نہیں تھے، کسی گاڑی کا ٹائیر کسی کھڈے میں اتر جاتا، تو کوئی موٹر سائیکل دو فٹ تک پانی میں گھس جاتا، یہ پانی بارش کا بھی نہیں تھا، اس پانی سے گٹر کی بدبو آ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے گرد و غبار اور گندے پانی سے

نجات ملی، مگر اس کے بعد بھی تاویر ٹریفک جام ہی رہی۔ یوں ہمارا کراچی کی سیر کی خواہش دھندلانے لگی۔

یہ کربناک اور افسوسناک منظر کافی طویل ہے، میں اس پر وزیر اعلیٰ کو (اُن کے بیان کے بعد) خط لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا کہ اگلے روز کے اخبارات میں ایک بڑے اشتہار پر نگاہ پڑی، وہ اشتہار تاجر تنظیموں کی طرف سے دیا گیا تھا، جس میں وزیر اعلیٰ اور گورنر سندھ سے اپیل کی گئی تھی، جس پر ان دو حضرات کے علاوہ تمبرگاجناب آصف علی زرداری اور ان کے پارٹی کے چیئرمین خلف الرشید بلاول زرداری کی تصویر لگائی گئی تھی۔ اپیل میں یہی مسئلہ بیان کیا گیا تھا، تصاویر کے ذریعے بھی مسئلے کی سنگینی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہی سڑک چونکہ اندرون سندھ کو جاتی ہے، اس لئے یہاں آنے والے سرمایہ کار یہیں سے گزرتے ہیں، لہذا اس سڑک کی از سر نو اور فوری تعمیر کی درخواست کی گئی تھی۔ یقیناً مراد علی شاہ بھی اسی سڑک سے ہی گزرتے ہوئے، اس کے خراب ہونے کی وجہ سے طویل رستہ تبدیل کرتے ہوئے، مگر سندھ سے کراچی میں داخلے کی سڑک جس پر سے بلابالغہ ہزاروں گاڑیاں روزانہ گزرتی ہیں، اس کی تعمیر کے فوری احکامات کی ضرورت ہے، میں نے خط لکھ دیا ہے، تاکہ سندھ سے اور سڑک بن جانے کی صورت میں کراچی کے میکنوں کے کام آئے۔

اہالیانِ کراچی کی دلجوئی؟

وزیر اعظم میاں نواز شریف کراچی پہنچے، مگر ان کے دورہ کا آؤٹ پٹ کیا تھا، کوئی نہ جان سکا۔ وفاقی دار الحکومت اسلام آباد کا اپنا مزاج ہے، جس میں حکمرانی کا شمار غالب رہتا ہے۔ اس کی مرکزی اہمیت کے پیش نظر یہاں وسائل کا استعمال بھی بے حد و حساب ہوتا ہے، شہر کی نفاست، سکیورٹی اور خوبصورتی کے تمام تقاضے ترجیحی بنیادوں پر پورے کئے جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں بیٹھنے والوں کے فرائض میں پورے پاکستان کی ترقی، خوشحالی، حفاظت اور دیگر سہولتیں بھی شامل ہیں، اسی لئے حکمرانوں کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ان کی پورے پاکستان اور اس کے ضروری مسائل پر نگاہ ہے، مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ وطن عزیز میں ہی بے شمار علاقے ایسے ہیں جو پسماندگی کا شکار ہیں، جہاں غربت اور جہالت عام ہے، جہاں بنیادی انسانی سہولتیں تک میسر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں کے چند پسندیدہ شہروں کے علاوہ کہ جن میں اسلام آباد اور لاہور خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کے علاوہ کوئی اس فہرست میں شامل نہیں۔ پنجاب میں جنوبی پنجاب کے اضلاع کی حالت دیکھئے، بلوچستان کا تو ذکر ہی کیا، سندھ کی حالت بھی خراب ہے، رہا خیبر پختونخواہ تو اسے بھی مخالف حکومت کی وجہ سے وفاقی حکومت نے نظر انداز کر رکھا ہے۔

کراچی جس قدر بڑا شہر ہے، فطری طور پر مسائل بھی اسی قدر زیادہ ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی، صوبائی حکمرانوں کی کرپشن کے قصے، ترقیاتی کاموں کا نہ ہونا، بھتہ کلچر اور کچرے کے ڈھیروں کا ذکر تو ہم سب لوگ ٹی وی چینلز پر دیکھتے اور اخباروں میں پڑھتے ہیں، مگر ایک ستم یہ بھی ہے کہ وفاقی حکومت کراچی پر کوئی توجہ نہیں دے رہی۔ (یہ الزام صرف موجودہ حکومت پر ہی نہیں، ماضی میں خود پی پی کی حکومت میں بھی کراچی پر کوئی توجہ نہ دی گئی) دوروز قبل وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کراچی آئے، انہوں نے مصروف ترین دن گزارا اور شام کو واپس لوٹ گئے، انہوں نے یہاں دہشت گردی کے خلاف بیان جاری کئے، ملکی ترقی کی نوید سنائی، امن کا پیغام دیا اور گھر پلٹ گئے۔ اگلے روز جب وزیراعظم کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے تو ساتھ ہی وزیراعلیٰ سندھ مراد علی شاہ کا بیان بھی موجود تھا، ”وزیراعظم نے ملاقات کے لئے صرف پانچ منٹ دیئے۔“ کہا جاتا ہے کہ سندھ کے وزیراعلیٰ نے وزیراعظم سے کچھ گلے کرنے تھے، کچھ شکایات لگانی تھیں، کچھ تحفظات تھے، مگر انہیں حال دل کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ یہ ایک اصولی اور فطری بات بھی تھی، اگر وزیراعظم کراچی کے حالات جاننے کے لئے آتے ہیں، یا وہ کراچی کی حالت بہتر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں وہاں کے وزیراعلیٰ کو وقت دینا چاہیے تھا۔ پورے دن میں دس بیس منٹ کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ وقت کوئی معمولی نوعیت کے مسئلے کے لئے نہیں

دینا تھا، بلکہ یہ تو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کا سوال تھا۔ اگر کراچی میں امن ہوگا تو ملک کی ترقی کا یہ راستہ کھلا رہے گا۔ آپ آئے کراچی کے مسائل حل کرنے ہیں اور ”مصرف“ دن گزار کے واپس جا رہے ہیں؟ آپ کی آمد سے کراچی والوں کو کیا ملا؟ وزیراعظم نواز شریف کے کراچی جانے سے قبل اخباری شیڈول میں بتایا گیا تھا کہ وہ عبدالستار ایدھی، امجد صابری اور کرکٹر حنیف محمد کے گھر بھی تعزیت کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ ممکن ہے یہ تعزیتیں انتظامیہ کے شیڈول میں شامل ہی نہ ہوں، بہر حال یہی ہوا، وہ کراچی گئے بھی، مصرف ترین دن بھی گزار آئے، نہ وزیراعلیٰ کو وقت دیا کہ معلوم کرتے، دہشت گردی اور پکڑے کے خاتمے کے لئے صوبائی حکومت کیا اقدام کر رہی ہے؟ ملکی ترقی میں صوبائی حکومت کس قدر اور کیا حصہ ملا رہی ہے؟ اسی نوع کے دیگر معاملات تھے، مگر نہ ہوئے۔ دوسری طرف تعزیتوں کا معاملہ تھا، مرحومین کے گھر والوں کو خبر پڑھ اور سن کا انتظار تھا، وہ تو انتظار تو اس وقت ختم ہو چکا ہوگا جب ان لوگوں کو ایک روز قبل تک کسی نے اطلاع نہیں دی، اور سیکورٹی کے بندوبست نہیں کئے تو وہ جان چکے ہوں گے کہ وزیراعظم تعزیت کے لئے نہیں آرہے۔ صوبائی حکومت اگر مخالف ہے تو وہ بھی عوام کی منتخب کردہ ہے، اور اسی سے کام چلانا ہے۔ سرکاری تقریبات میں شرکت تو معمول کی کارروائی ہے۔ کراچی کے مسائل حل کرنے

کے لئے زخموں پر مرہم رکھنے کی ضرورت ہے، مذکورہ بالا دونوں کام کئے ہوتے تو

میاں صاحب کی عوام میں مقبولیت میں اضافہ ہوتا، عوام کی دلجوئی ہوتی۔

! پروٹوکول کی بیماری

سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ بڑے سائیں جناب قائم علی شاہ اپنا عہدہ چھوڑنے کے بعد پہلی مرتبہ اپنے آبائی شہر خیرپور گئے۔ اس موقع پر انہیں وی وی آئی پی پروٹوکول دیا گیا، ان کے قافلے میں پندرہ پولیس موبائل اور چالیس سے زائد دیگر گاڑیاں شامل تھیں۔ اس موقع پر انہوں نے میڈیا کو بتایا کہ وہ پارٹی کے کارکن ہیں اور رہیں گے، وہ سیاست سے ریٹائر نہیں ہو رہے اور یہ بھی کہ وہ اب بھی جوانوں سے کم نہیں۔ جب قائم علی شاہ اپنے عہدے پر قائم تھے تو روایتی خبرنگاری کے ساتھ ساتھ ان کی ایسی خبریں بھی جاری کی جاتی تھیں جو بعض اوقات مزاحیہ مگر کئی مرتبہ تضحیک آمیز ہوتی تھیں، خاص طور پر ان کی عمر کو سوشل میڈیا میں مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا، ان کی بھول جانے کی عادت کا بھی خبروں کا اہم حصہ ہوتی تھی۔ وہ سرکاری طور پر خبروں کے پس منظر میں چلے گئے ہیں، مگر سندھ حکومت کے بارے میں کرپشن کا الزام ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ اب شاہ صاحب ایکٹ سابق وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے شہر گئے ہیں تو پروٹوکول ان کے ساتھ ہی رہا ہے، نہ جانے پروٹوکول دینے والوں کی یادداشت بھی کام نہیں کرتی، کہ وہ بھول ہی گئے کہ قائم علی شاہ اب وزیر اعلیٰ نہیں، اگر حکومت اور اس کے اداروں نے جان بوجھ کر یہ کام کیا ہے، تو لوگ یقین کر لینا چاہیے کہ کرپشن کی گنگا بہہ رہی ہے

اور پوری حکومت اس میں اٹھان کر رہی ہے۔

یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس بے دردی سے خزانے پر بوجھ ڈالنے کے بارے میں قائم علی شاہ سے کوئی نہیں پوچھے گا، کیونکہ ان سے پوچھا جانا بنتا ہی نہیں، اب ان کے پاس کوئی اختیار نہیں کہ وہ سرکاری طور پر پروٹوکول حاصل کر سکیں، گویا یہ خدمت سندھ کی صوبائی حکومت نے انہیں از خود پیش کی ہے۔ اس لئے سوال حکومت سے ہی بنتا ہے کہ وہ کس قانون کے تحت سرکاری خزانے کو لاکھوں کائیکہ لگا رہے ہیں؟ مگر حکومت سے سوال کون کرے؟ اگر کوئی کر بھی گزرے تو اسے جواب کون دے گا؟ پروٹوکول کا یہ عمل ہر جگہ اور ہر حکمران کے ہاں رائج ہے۔ سندھ میں صرف موجودہ یا سابقہ وزیر اعلیٰ کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہاں کی حکمران پارٹی کے مالکان اس سے بھی بڑھ کر پروٹوکول لیتے ہیں، حکومت میں اگرچہ ان کا کوئی حصہ نہیں، مگر اسمبلی میں بیٹھنے والے حکمران انہی کے مرہونِ منت ہیں، انہی کے دم سے حکومت اور انہی کی وجہ سے وزارتیں۔ بلاول زرداری جب بھی پاکستان آتے ہیں اور اندرونِ سندھ کے ان کے دوروں میں پروٹوکول کا انتہائی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی حال خاندان کے دیگر افراد خانہ کے پروٹوکول کا ہے۔

پروٹوکول کی یہ وبا صرف سندھ میں ہی نہیں، اسلام آباد میں بھی یہی کچھ ہوتا

ہے اور اسلام آباد میں بھی اپنے جو بن پر ہے۔ وزیراعظم کے علاوہ وہاں ایک شخصیت صدر مملکت کے نام سے بھی وہاں موجود ہے، جو اسی قسم کا پروٹوکول لیتے ہیں، لاکھوں روپے ماہانہ کا خرچہ کرتے ہیں، یقیناً کچھ کام بھی کرتے ہوں گے۔ پنجاب میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ پنجاب کی اولادیں بھی یہی کام کرتی ہیں، بعض اوقات کسی سڑک کے بند ہونے اور سرکاری گاڑیوں کے ہجوم سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی حکمران کی ہی فوج ہوگی، بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں حکمران کے صاحبزادے یا صاحبزادی ہیں۔ اولاد ہونے کے استحقاق کے ساتھ قوم کے کندھوں پر سوار ہیں۔ قوم ان معاملات کو مستقل برداشت کرتی اور بھگلتی ہے۔

پروٹوکول کو تنقید کا نشانہ تو بنایا جاتا ہے، اس پر بہت زیادہ غصے اور ناراضی کا اظہار بھی کیا جاتا ہے، کیونکہ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ حکمرانوں کی ایک زیادتی ہے، جس کا سدباب اور خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے، دراصل پروٹوکول ایک نشہ ہے، جسے حکمرانوں نے اپنی سہولت اور آسانی کے لئے ضرورت کا نام دے رکھا ہے۔ اپنے معاشرے میں نشہ کے عادی لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، مگر ضرورت یہ ہے کہ نشہ کی عادت کا خاتمہ کیا جائے، اس طلب کو ختم کیا جائے، جس کی خواہش میں انسان نشہ پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ کام کوئی حکمران تو کرے گا نہیں، کون مفت کی عیاشی پسند

نہیں کرتا، یہ کام عوام ہی کر سکتے ہیں، پروٹوکول کی وجہ سے رکے ہوئے راستوں پر
عوام چڑھ آئیں، اپنے ہی ووٹوں سے منتخب ہونے والوں اور قومی خزانے سے عیاشیاں
کرنے والوں کو سر سے اتار پھینکیں، تو سب درست ہو سکتا ہے۔

کراچی میں گزشتہ رات گئے حالات نے انگڑائی لی۔ رہنبر نے فاروق ستار کو زیر حراست لیا، اور بعد میں بہت سے اور رہنماؤں کو بھی۔ نصف شب کے وقت ایم کیو ایم کے صدر مقام 'نائن زیرو' پر چھاپہ مارا۔ کچھ رہنماؤں کو رہا بھی کر دیا گیا۔ اس چھاپہ ماری پروگرام کی نوبت اس وقت آئی جب متحدہ کی قائد کی تقریر نے ہلچل مچادی، پاکستان کے خلاف زہریلی تقریر کی، اور کارکنوں کو مخصوص میڈیا ہاؤسز پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ تعمیل ارشاد میں کارکنوں نے اپنی کارروائی کی۔ ایکٹ اور بڑی تبدیلی یہ آئی کہ اپنے ہی قائد کی زہر میں چبھی تقریر اور رہنبر کے رد عمل کے بعد پارٹی کے کچھ رہنماؤں نے بھی سوچنا شروع کر دیا کہ آیا وہ درست مقام پر کھڑے ہیں، یا ان کا ماضی غلطیوں سے پُر ہے۔ ایم کیو ایم کے مستقبل کے بارے میں مختلف رائے زنی ہو رہی ہے، کوئی اسے مستقل ختم کر رہا ہے اور کوئی اس کو مستقل پارٹی قرار دے رہا ہے۔ ایم کیو ایم کے ساتھ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسی ہی آرا سے اس کو سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔

ایم کیو ایم کے بارے میں ایکٹ رائے یہ پائی جاتی ہے کہ بے شمار لوگ ان کے عسکری انداز سیاست کی وجہ سے خوف کے زیر اثر ان کا ساتھ دیتے ہیں، کسی کو

جرات نہیں کہ وہ ان کی مخالفت میں ووٹ کاسٹ کر سکے۔ اسی قسم کے خیالات بھتہ کے بارے میں بھی سامنے آتے ہیں، کہ پارٹی کا بندوبست اسی پر چلتا ہے، اس کا روبرو کو بہت عروج حاصل ہوا، ایسا کہ یہ ابھی تک جاری ہے۔ اس کے بعد چھینا جھپٹی بھی ساتھ ہی جاری رہی، خواتین کے پرس، لوگوں کے موبائل سے لے کر قربانی کی کھالوں بھری گاڑیوں تک چھیننے کا رواج تھا۔ اس کے بعد سب سے خطرناک عمل 'ٹارگٹ کلنگ' تھا، جس سے کراچی کو عشروں سے واسطہ پڑا ہوا ہے، ایسے افراد کی فہرست بہت طویل ہے جو ٹارگٹ کلنگ کی بھینٹ چڑھے۔ بد قسمتی ملاحظہ ہو کہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ایم کیو ایم کے تمام مخالفین نے ان تمام تر مسائل کی ذمہ داری ایم کیو ایم پر ہی ڈالی۔ ماضی میں ہونے والے مختلف آپریشنز میں بھی یہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسائل کی ذمہ دار ایم کیو ایم ہے، جبکہ ایم کیو ایم نے مسلسل انکار ہی کیا۔ اب کچھ عرصہ سے، جبکہ ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں بہت اضافہ ہو گیا تھا تو کراچی میں رینجرز کا آپریشن شروع ہوا، جسے فوج، پولیس اور عوام کی بھی حمایت حاصل ہے۔

اب نئی صورت حال میں پارٹی کے بہت سے رہنماؤں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا ہے، اس سے قبل مصطفیٰ کمال کی صورت میں ایم کیو ایم میں ایک دراڑ پیدا ہو چکی ہے، اب اگر مزید بہت سے لوگ پارٹی سے نکلتے ہیں تو ان میں سے بیشتر پاک سر زمین پارٹی میں ہی جائیں گے، کیونکہ اُس گھر میں انہیں اجنبیت کا

احساس نہیں ہوگا، وہاں اپنے ہی بھائی بندوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہاں کن لوگوں کے دروازے کھلے ہیں، کن کو وہ خوش آمدید کہیں گے، اور کن کو جواب دے دیں گے۔ مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر ان لوگوں کو اتنے سال ایک پارٹی میں رہنے کے بعد اس کی حقیقی خرابیوں کا علم کیوں نہ ہو سکا، اگر عوام ایک پارٹی کے بارے میں اعلانیہ باتیں کرتے ہیں، پارٹی پر ہر مذکورہ بالا الزام لگاتے ہیں، تو یہ باتیں خود پارٹی رہنماؤں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہیں؟ ایسا ہی کچھ مصطفیٰ کمال نے نئی پارٹی کا اعلان کرتے وقت کہا تھا۔ یا ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے قائدین انقلابی فیصلہ کر رہے ہیں، یا وہ جانتے ہیں کہ پارٹی پر ”قائد تحریک“ الطاف بھائی کی گرفت کمزور پڑ چکی ہے۔ یا وہ کہتے ہیں کہ ہماری قیادت غلطی پر تھی، ہم مروانا ان کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ ممکن ہے کچھ ایسے لوگ بھی سامنے آجائیں جو کہیں گے کہ ہم تو شروع سے ہی پارٹی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے، ہم قائدین کو اس بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہو، کراچی کو امن کی ضرورت ہے، رینجرز کے مسلسل چھاپوں سے امن میں اضافہ ہوا ہے، پائیداری آئی ہے، نسبتاً استحکام نصیب ہوا ہے، اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ چونکہ کراچی ایک عرصہ سے ایم کیو ایم کے ہی زیر اثر ہے، اس لئے یہاں کی خرابیوں کی ذمہ داری بھی اسی پارٹی پر ہی ڈالی جائے گی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ میڈیا ایک آئینہ ہے، یہ چہرے دوسروں کو دکھاتا ہے، چہرہ اچھا نہ دکھائی دے

تو ایہ تو نے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

مائیں ون“ بہت سے لوگوں کی خواہش تھی، بہت سے لوگوں کا فارمولا تھا، بہت ”
 سے لوگوں کی طرف سے اسے ناقابل عمل قرار دیا جاتا تھا۔ یہ فارمولا ’قائد تحریک‘
 الطاف حسین کو اپنی ہی بنائی ہوئی پارٹی سے نفی کرنے کا تھا۔ بات تو غیر فطری محسوس
 ہوتی ہے، مگر بسا اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں کہ بیمار جسم سے کسی اہم عضو کو
 بھی کاٹنا پڑ جاتا ہے۔ ایم کیو ایم پر بار بار ایسے وقت آئے جب پارٹی کو ملک دشمن قرار دیا
 گیا، اس کے خلاف آپریشن ہوئے، عقوبت خانے پکڑے گئے، اسلحے کے انبار دریافت
 ہوئے، قاتلوں کی نشاندہی ہوئی، دشمن ملک کی مدد کا سراغ ملا، مگر چند ہی روز بعد
 سب کچھ معمول پر آ جاتا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اب بھی کراچی میں کافی عرصہ سے
 بد امنی کے ڈیرے تھے، ٹارگٹ کلنگ کا راج تھا، اب بھی ہے مگر بہت کم ہو چکا ہے،
 بہتہ بھی جاری ہے۔ اس صورت حال میں حکومت نے کراچی میں آپریشن کا فیصلہ کیا۔
 قائد تحریک کچھ عرصہ قبل تک ٹی وی چینل پر خطاب کا شوق پورا کیا کرتے تھے،
 صورت حال یہ تھی کہ ہر چینل ان کی تقریر کو ”لایو“ چلانے پر مجبور تھا۔ اس براہ
 راست پروگرام میں قائد کے دل میں جو آئے وہ کہتے تھے، اور جب بات پاکستان کی
 سلامتی تک پہنچنے لگی، مسلح افواج کو مجموعی طور پر گالی دینے کا رواج زور پکڑنے لگا تو
 حکومت بھی مجبور ہو گئی

کہ بھائی کی براہِ راست تقریر پر پابندی لگا دے۔ اس فیصلے سے جہاں ٹی وی چینلز نے
 سکون کا سانس لیا وہاں عوام کو بھی اس کشیدگی سے فرصت نصیب ہوئی۔
 پابندی براہِ راست خطاب پر لگائی گئی تھی، مگر ایم کیو ایم کی تقریبات میں اس قسم کی
 پابندی نہیں تھی۔ کراچی پریس کلب کے باہر ایم کیو ایم کی بھوک ہڑتال جاری تھی تو
 قائد کے خطاب نے کا یا پلٹ دی۔ انہوں نے پاکستان کے خلاف باتیں کیں۔ بات آگے
 بڑھی، قائد کے جانثار باہر نکلے تو انہوں نے نہ صرف میڈیا ہاؤسز پر حملے کئے، بلکہ توڑ
 پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ بھی کیا، ایک شخص کی جان بھی گئی۔ چونکہ کراچی میں رینجرز کا
 آپریشن بھی ہو رہا ہے، لہذا قانون کی حرکت مزید تیز ہوئی، پاکستان میں ایم کیو ایم کے
 فاروق ستار سمیت بعض اہم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا، کچھ دیر بعد رہا کر دیا گیا۔ اگلے
 روز فاروق ستار نے اپنی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اب فیصلے پاکستان میں ہونگے،
 الطاف حسین کا کردار بحیثیت بانی کا رہے گا۔ اس بیان کو اگرچہ لوگوں نے سنجیدگی سے
 نہیں لیا، مگر جب کراچی اور حیدرآباد سے 'قائد تحریک' کی قد آدم تصاویر اترنا شروع
 ہوئیں تو جانا گیا کہ اب کسی حد تک ایم کیو ایم نے اپنے قائد کے بغیر ہی جینے کا فیصلہ کر لیا
 ہے۔ ایم کیو ایم کے مرکز نائن زیر و اور کراچی کے دیگر مقامات سے بھی یہ بورڈ اور
 تصاویر اتار دی گئیں۔

حیدرآباد میں ’’مٹکا چوک‘‘ سے نہ صرف تصاویر ہٹائی گئیں، بلکہ چوک کا نام بھی تبدیل کر کے لیاقت علی خان چوک رکھ دیا گیا۔ ایک نسل جوان ہو چکی تھی، جو اپنی پیدائش سے اب تک الطاف حسین کی تصویروں کے بڑے بڑے بورڈ دیکھتی آئی تھی، ان کے لئے یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

ایم کیو ایم کے قائد کا ایک عرصہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا تھا کہ وہ اپنی تقریر کے دوران اچانک پارٹی سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیتے، اس دوران وہ اپنے ہنر کی بنا پر کبھی رو دیتے، کبھی جذباتی ہو جاتے اور کبھی مظلوم بن جاتے۔ اعلان کے بعد وہ خاموش ہو جاتے تاکہ وہ اپنے جانثاروں کے رد عمل سے لطف اندوز ہو سکیں، جانثار اُن کی توقع کے عین مطابق گٹر گڑا کر اُن سے التجائیں کرتے، درخواستیں کرتے، ہاتھ جوڑتے، پاؤں پڑتے کہ مرشد ایامت کیجئے، ہم آپ کے بغیر جی نہیں سکیں گے، ہمارے سب کچھ آپ ہی ہیں، آپ ہیں تو تحریک ہے، آپ ہیں تو ہم ہیں، وغیرہ وغیرہ، اور آخر میں قائد ار راہ کرم چند منٹ پہلے دیا ہوا استعفیٰ واپس لے کر اپنے جانثاروں کو خوش کر دیتے۔ یہ واردات ایک مرتبہ نہیں ہوئی۔ اب جبکہ استعفیٰ بھی نہیں ہوا، اور قائد کا پارٹی سے عمل دخل ختم کر دیا گیا ہے۔ عملی طور پر یہ سب کچھ ہو چکا ہے، مگر اب بھی یہ ایک کہانی ہی لگتی ہے، جان چھڑکنے والے لوگ کس طرح اپنے قائد کی تصاویر اتروانے پر رضا مند ہو گئے، کیا محض ایک تقریر نے بیسیوں سالوں کی محبت کا خاتمہ

کرو یا؟ ایسی تو بہت سی تقریریں بھائیوں نے سن رکھی تھیں۔ دوسرا یہ کہ آیا ایک فرد
میں ہی سہارہ پائی جاتی تھیں، باقی پارٹی اور رہنما و وہ میں ڈھلے ہیں؟

! کورم اور ذمہ داری

پنجاب کے منتخب عوامی نمائندوں کا اجلاس جاری ہے، ان معزز نمائندوں میں سے اکثر لاہور میں جمع ہیں، ممکن ہے کچھ ضروری کاموں کی وجہ سے اسمبلی کے اجلاس میں آنے سے معذور ہوں، مگر حالت یہ ہے کہ صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں کورم ٹوٹنے کی ہیئرک ہو چکی ہے، گزشتہ روز جب سپیکر ہال میں داخل ہوئے تو صرف سات ارکان موجود تھے، جن میں دو خواتین اور ایک اپوزیشن رکن شامل تھا، تاہم اس وقت کوئی وزیر نہیں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ رونق بڑھی تو کارروائی شروع ہوئی، تاہم ق لیگ کے ایک رکن نے کورم کی نشاندہی کر دی، جو کہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا، چنانچہ سپیکر نے اجلاس اگلے روز تک ملتوی کر دیا۔ مسلسل تین روز تک کورم ٹوٹنے سے اسمبلی کے چیف وہپ نے بھی انگڑائی لی اور مسلم لیگ ن کے تینوں روز تک غیر حاضر رہنے والے ارکان کے خلاف کارروائی کا عندیہ دیا، کہا گیا کہ ان کی تنخواہوں اور مراعات سے بھی تین دن کی کٹوتی کی جائے گی۔ یہ اپنے معزز منتخب نمائندوں کی سنجیدگی کی مختصر سی جھلک ہے، یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا، یہ روایت ہے، جو اکثر دہرائی جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں، یہاں تو دنگل بھی ہوتے ہیں، یہاں گالی گلوچ ہوتی ہے، یہاں طعنے دیئے جاتے ہیں، یہاں جھوٹ بولے جاتے ہیں، یہاں ایسے وعدے بھی کئے جاتے ہیں جو کبھی پورے کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ سب کچھ کے ساتھ یہاں

جو کچھ بھی کیا جائے اس کی تنخواہ بھی ملتی ہے، اس کے عوض مراعات بھی ملتی ہیں، اور استحقاق الگ حاصل ہوتا ہے۔

اسمبلی کے کورم ٹوٹنے کے واقعات تو ریکارڈ پر ہونگے، مگر ایسی باتیں بہت ہی کم ریکارڈ پر آتی ہیں، یا سال دو سال بعد بتائی جاتی ہیں کہ اتنے ممبران نے ایکٹ یا دو سال میں اسمبلی کے فورم پر ایکٹ لفظ بھی اپنی زبان سے ادا نہیں کیا، یہ بھی کہ بے شمار ارکان ایسے ہیں، جو اجلاس میں نہیں آتے مگر ان کی تنخواہ اور مراعات میں سے کوئی کٹوتی وغیرہ نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی کہ اپنے بہت سے وزیر بھی اسمبلی کا رخ نہیں کرتے۔ کونے

سوال اور کونے جواب؟ سوال کرنے والے جواب کا انتظار کرتے ہیں اور جواب دینے والے یا تو تشریف ہی نہیں لاتے اگر آتے ہیں تو جواب دینے کی بجائے کوئی بہانہ سازی کر دیتے ہیں، اگلی پٹیشی پڑ جاتی ہے۔ پنجاب اسمبلی میں تو اس کے قائد بھی کبھی کبھار ہی آتے ہیں، سال بھر میں دو چار مرتبہ۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ فارغ ہی نہیں بیٹھے ہوتے، انہیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ اگر فارمولا یہی ہے کہ اس سے اہم کام اور بھی ہوتے ہیں، تو وزیر اور دیگر ارکان بھی اسی فارمولے پر عمل کرتے ہیں، جب وزراء کو معلوم ہے کہ ان کے لیڈر نے نہیں آنا تو وہ بھی نہیں آتے، اور جب ان کے ارکان کو علم ہے کہ ان کے وزراء نے نہیں آنا تو ارکان بھی نہیں آتے۔

اسمبلی کے اجلاس میں لوگ کیوں نہیں آتے؟ یہ قابلِ غور مسئلہ ہے، اس پر بحث و مباحثہ ہونا چاہیے، اگر اسمبلی کے سال بھر میں اجلاسوں (یا دنوں) کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے تو یہ کام کیا سوچ کر کیا گیا، جتنے روز کام کرنا طے ہے یا اتنے دنوں کا کام نہیں ہوتا؟ کیا یہ اجلاس یا یہ دن صرف دیہاڑی لگانے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، کہ کام تو دس روز کا ہے، اجلاس تیس روز ہوگا، گویا تیس روز کے لئے اضافی مال بنایا جائے گا۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ جو رکن جتنے دن غیر حاضر رہے گا، اس کی تنخواہ اور مراعات میں سے کٹوتی ہوگی، مگر ایسے نہیں ہوتا۔ ستم یہ ہے کہ یہ لوگ کرتے کرتے کچھ نہیں، قومی خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ اسمبلیوں (خاص طور پر پنجاب اسمبلی) میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو ”عام آدمی“ کے زمرے میں آتے ہیں؟ یقیناً ایسے افراد کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں تک ہی محدود ہوگی۔ جو لوگ اپنے الیکشن پر کروڑوں روپے لٹا دیتے ہیں، اسمبلی سے چند سو روپے روزانہ کے لئے بھی بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں، جو ممبران غیر حاضر رہتے ہوئے بھی ٹی اے ڈی اے وصول کرتے ہیں، کیا وہ کرپشن کا ارتکاب نہیں کرتے؟ جیسے عوام ہیں، ان کے نمائندے بھی فطری طور پر انہی جیسے ہوتے ہیں، اس لئے عوام سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے نمائندوں سے معلوم کریں کہ جناب ہم لوگوں نے آپ کو اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کیا تھا، نہ کہ عیاشیوں کے لئے۔ مگر بات تو

وہی ہے، جیسے منتخب کرنے والے، ویسے منتخب ہونے والے اور ویسے ہی حکمران۔

! گرایا جانا ایم کیو ایم کے دفاتر کا

کیا یہ خاموشی بھی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے، یا کسی گہری سازش کا حصہ، یا مصلحت کی انتہا؟ کہ سندھ بھر کے بڑے شہروں سے الطاف حسین کی تصاویر اتار پھینکی جائیں، اور کسی کوئے کھدرے سے صدائے احتجاج بھی سامنے نہ آئے۔ بات بات پر شہر کو آگ لگا دینے والے کس طرح اس سانحہ عظیم پر خاموشی کی بکھل مارے باہمی سرگوشیوں میں گم ہیں۔ ایسی انڈر سٹینڈنگ کبھی نہ دیکھی گئی تھی، ”قائد“ کے ایک اشارے پر مرٹن والے اسی سے لا تعلقی پر اتر آئے ہیں، بھائی سے مرشد، مرشد سے قائد، قائد سے بانی اور بانی سے صاحب تک بات پہنچ چکی ہے۔ الطاف حسین تو اول روز سے ہی ایسا تھا، اب قوم کو احساس ہو گیا ہے تو اس پر دیر آید درست آید ہی کہا جاسکتا ہے۔ مگر کیا شہر سے بھتے خود الطاف وصول کرتا تھا، کیا ٹارگٹ کلنگ وہ اپنے ہاتھ سے کرتا تھا، کیا جلاؤ گھیراؤ فرد واحد کا وطیرہ تھا، کیا کراچی کے امن کو تباہ کرنے کے لئے اس کی مضبوط ٹیم اس کے شانہ بشانہ نہ کھڑی تھی، کیا اس کی ملک دشمنی اور را“ سے تعلقات میں الطاف تنہا تھا؟ نہیں، ایم کیو ایم کی قیادت کی اکثریت ان جرائم میں برابر کی شریک تھی، تو پھر ”مائینس ون“ پر کیسے کام چلایا جاسکتا ہے؟ پارٹی میں جو لوگ بھی جرائم کا ارتکاب کرتے رہے، ان کو ان کے کئے کی سزا ملنی چاہیے، ساری زندگی الطاف حسین کی پوجا کرنے

والوں اور اس کے اشاروں پر ناپچنے والوں کو کس طرح گنگا نہ ملایا جاسکتا ہے؟
 یہی خاموشی ایم کیو ایم کے متواتر دفاتر گرانے پر بھی کسی حد تک قائم تھی، اب ایم کیو ایم
 کے نئے پاکستانی قائد فاروق ستار نے کچھ احتجاج کیا ہے۔ الطاف حسین کے حالیہ نعروں
 اور بیانات کے بعد تک الطاف کا دم بھرنے والے فاروق ستار نے نہایت احتیاط کے
 ساتھ اپنے آپ اور اپنی قیادت کو بچانے کا بندوبست کر لیا ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ اب
 بات برداشت سے باہر ہو چکی ہے۔ اسی رویے کو سفید جھوٹ کہتے ہیں، یہ لوگ آغاز
 سے ہی اسی قسم کی باتیں سنتے آئے ہیں، انہی کو برداشت کرتے آئے ہیں، اور اب بھی
 برداشت کر رہے تھے کہ اچانک تبدیلی آگئی۔ اب بھتہ خور قوم کے خدمتگار بن گئے،
 قاتل غمخوار قرار پا گئے۔ دوسری طرف رہنما ہے کہ چُن چُن کر ”را“ کے ایجنٹ تلاش
 کر رہی ہے، گلیوں محلوں سے نکال رہی ہے اور اسے ”حسن اتفاق“ ہی قرار دیا جائے کہ
 ان ایجنٹوں کا تعلق انہی خادموں اور غمخواروں کی پارٹی سے ہی ثابت ہو رہا ہے۔ فلاں
 لنگڑے، فلاں کالے، فلاں موٹے کا تعلق کس پارٹی سے تھا، کون کراچی کے لئے دہشت
 کی علامت بنے ہوئے تھے؟ ایم کیو ایم کے دفاتر گراتے ہوئے یہ قرار دیا جا رہا ہے کہ وہ
 غیر قانونی تھے، نہ جانے وہ غیر قانونی جگہ پر تعمیر کئے گئے تھے، یا ان کی تعمیر غیر قانونی
 طریقے سے ہوئی تھی، یعنی منظوری

وغیرہ نہیں لی گئی تھی، گزشتہ تین دہائیوں میں یہ دفاتر تعمیر کئے گئے، ان سالوں میں ہر لحاظ سے کراچی پر ایم کیو ایم کا ہی راج تھا، سینٹ، قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلی اور مقامی حکومت، سب ہی ان کے قبضہ قدرت میں تھے، تب تو ہونے والا ہر کام 'قانونی' ہی تھا۔ یہ دفاتر کیسے غیر قانونی رہ گئے؟

ان دفاتر کا گرایا جانا ایک غیر ضروری عمل ہے، اس پر مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں نے حیرت کا اظہار کیا ہے، کہ اس کام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا دفاتر گرانے سے پارٹیاں بن یا بگڑ سکتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ایم کیو ایم کے دفاتر کیوں گرائے جارہے ہیں۔ ویسے تو یہ عام خیال پایا جاتا ہے، کہ ان دفاتر کو گرانے کی بجائے یہاں ہسپتال، لائبریریاں اور ڈسپنسریاں وغیرہ بنائی جاسکتی تھیں، مگر اس خیال کو تقویت خود ایم کیو ایم کے فی الحال نئے قائد نے بہم پہنچائی، اور انہی چیزوں کے قیام کی بات کی جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ ممکن ہے اس طرف صوبائی حکومت یا رینجرز کا دھیان نہ گیا ہو، یہ کام ابھی جاری ہے، جو بچ رہے ہیں ان کے بارے میں ہی سوچ لیا جائے، وہاں کوئی تعمیری کام ہو سکتا ہے۔ ویسے دفاتر گرائے جانے کے موقع پر چیزوں کی لوٹ مار کے وقت کچھ کارکن آپس میں لڑ بھی پڑے۔ تاہم اس منظر سے یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ عوام کی ایم کیو ایم سے حقیقی محبت کی سطح کیا تھی۔

گزشتہ دنوں پنجاب بھر کے تعلیمی بورڈز نے اپنے امتحانی نتائج کا اعلان کیا، سب سے اہم خبر یہی برآمد ہوئی کہ گجراتوالہ اور ملتان بورڈز کی دولڑکیوں نے 505 میں سے صرف ایک ایک نمبر کم لیا، یعنی دونوں نے 504 نمبر لے کر پنجاب بھر میں نہ صرف پہلی پوزیشن حاصل کی، بلکہ اس قدر زیادہ نمبروں کا ریکارڈ بھی قائم کر دیا۔ ملتان بورڈ کی لڑکی کا تعلق ایک چھوٹے سے قصبے کبیر والہ سے ہے اور اس کے والد کا ایک چھوٹا کاروبار ہے۔ صرف ایک نمبر کم ہونا بھی حیران کن بات ہی ہے، کوئی زمانہ ہوتا تھا جب ممتحن ”خوشحالی“ کے ضمن میں بھی نمبر کاٹ لیا کرتے تھے، اب شاید نئے زمانے میں جب کہ سختی اور لکھائی یکھنے کے دیگر لوازمات اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں، خوشحالی کی کوئی اہمیت نہیں رہی، ویسے بھی کمپیوٹر کی اپنی لکھائی ہوتی ہے، لکھنے والا خواہ کوئی بھی ہو، لکھائی ایک جیسی ہوتی ہے۔ گویا ان دونوں بچیوں کو جماعت نہم میں سب کچھ آتا تھا، یہ نہایت ہی خوش کن اور حوصلہ افزا خبر ہے۔ دوسری طرف اسی خبر کا دوسرا اہم اور پریشان کن پہلو یہ ہے کہ پنجاب کے تمام بورڈز کا اوسط نتیجہ 49 فیصد سے لے کر 56 فیصد تک ہی رہا۔ یوں جانے کہ امتحان کے میدان میں اترنے والے تقریباً نصف بچوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، یہ الگ بات ہے کہ کسی نے

کوئی پیپر چھوڑ دیا، کوئی امتحان دینے نہیں گیا اور کوئی فیل ہو گیا، مگر نتیجہ مایوس کن ہے۔

اس سے قبل جب پنجاب کے تعلیمی بورڈز نے میٹرک کے نتیجے کا اعلان کیا تھا، تو نتائج کے ساتھ ساتھ ایک اور خبر سامنے آئی تھی کہ آرٹس میں پوزیشن لینے والے اکثر بچوں کے والدین بہت غریب لوگ تھے، وہ معمولی کام کرتے تھے، مگر انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کو ترجیح بنا کر رکھا، اہمیت دی اور بچوں کی محنت رنگ لائی، قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ کالم نویس نے تب بھی ایک خدشے کا اظہار کیا تھا کہ یہی بچیاں جنہوں نے میٹرک میں پوزیشن لی ہے اور ان کے والدین کی غربت کو ہم سب لوگ ایک خوش آئند ایشو بنا کر قلابازیاں لگائیں اور بھنگڑے ڈالے، وہاں جس پریشانی کا اظہار کیا گیا تھا، وہ یہ تھی کہ یہ غریب لوگ میٹرک تک تو پہنچ جاتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ ہو سکتا ہے انٹر میڈیٹ تک بھی پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں، مگر آگے اعلیٰ تعلیم تک غریب کی رسائی ممکن نہیں ہوتی، کیونکہ نیچے تو کسی حد تک تعلیم کے اخراجات کم ہوتے ہیں مگر کالج وغیرہ میں جا کر تعلیم مالی حالت کے ساتھ چلتی ہے۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی کی سطح تک اگر کوئی غریب کا بچہ پہنچ گیا تو جاننے کہ وہ اول تو بہت زیادہ غریب ہے ہی نہیں، یا پھر وہ قسمت کا دھنی ہے۔

میرے اس خدشے کا تصور میں حقیقت کا رنگ اس وقت بھر گیا جب میٹرک اور انہم کے چند روز بعد ہی ملتان کی سرکاری یونیورسٹی نے بی اے، بی ایس سی کے نتائج کا اعلان کیا۔ جن بچیوں نے پوزیشن حاصل کی تھی، ان میں صرف ایک کسان کی بیٹی تھی، باقی کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ دس میں سے چار کا تعلق سرکاری اور دیگر کا باقی اداروں سے تھا، یہ بھی واضح ہی ہے کہ نجی اداروں میں غریب کا بچہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ جس کسان کا ذکر ہوا ہے، وہ بھی یقیناً غربت کے زمرے میں نہیں آتا ہوگا۔ تو تفریق تو میٹرک سے گریجوایشن تک سامنے آگئی۔ گویا غریب کے بچے اول تو پہلی ٹھوکر کھا کر سکول سے باہر ہی گر جاتے ہیں، سکول جانے کی بجائے چائلڈ لیبر، وغیرہ کا شکار ہو جاتے ہیں، باقی پرائمری میں رہ جاتے ہیں، اسی طرح گرتے گرتے میٹرک تک اور اوپر مزید کم جاتے ہیں۔ نصیبوں کا لکھا سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔

اپنی حکومتیں بھی تعلیم کے میدان میں جتنی کوششیں کرتی ہیں، ان میں زیادہ تر غریبوں کے لئے ہی ہوتی ہیں، بتایا جاتا ہے کہ تعلیم مفت ہے، داخلوں کے لئے میرٹ ہے، اگر امیروں کے لئے صادق پبلک سکول اور ایچی سن ہیں تو غریبوں کے لئے دانش سکول ہیں۔ حالانکہ دانش سکول شرح خواندگی میں ایک فیصد بھی اضافہ نہیں کر رہے کہ یہاں چھٹی کلاس سے تعلیم شروع ہوتی ہے۔ حکومتی رویوں

اور تعلیمی بورڈز کے نتائج سے یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ غریب کے لئے آگے
بڑھنے کے تمام راستے بند ہوتے جاتے ہیں، بڑے لوگ افسر اور یہ اُن کے کلرک بنیں
گے اور بڑے لوگ سیٹھ اور یہ اُن کے غنشی بنیں گے۔

! سب سے پہلے پاکستان زندہ باد

قومی اسمبلی میں سوالات کے وقفے کے دوران جب ایم کیو ایم کے ایکٹ رکن کا سوال آیا تو موصوف نے نعرہ لگایا ”سب سے پہلے پاکستان زندہ باد“۔ سپیکر کو یہ ادا بہت پسند آئی انہوں نے کہا پھر کہیے، موصوف نے پھر مزید بلند آواز سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا، اور کہا کہ وہ پہلے سے ہی پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے والوں میں سے ہیں۔ اس نعرہ بازی پر ایوان نے ڈیسک بجا کر انہیں بھرپور داد دی۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے پی ٹی آئی کے رکن اسمبلی نے کہا کہ تہدیلی آگئی ہے۔ 22 اگست سے، جب سے الطاف حسین نے پاکستان کے خلاف نعرہ بازی کی اور زہر اگلا، بس اسی روز سے کراچی اور متحدہ کی اکثریت والے شہروں میں پاکستان زندہ باد کا کلچر عام ہو گیا، ابتدائی وجہ یہ بنی یہ اُن کے قائد کے اقوال سے نفرت کے پھیلنے اور بہت بڑھ جانے کے امکانات بہت ہو گئے تھے، دوسرا یہ کہ جب پاکستان کی سالمیت کے محافظ اداروں نے متحدہ کے اس ملک دشمن سلسلے کو ختم کرنے کا اشارہ دیا تو اب پوری متحدہ بغیر وضو کے ہی اسلام قبول کرنے پر مقرر ہے۔ یہ نہیں ہے کہ متحدہ میں پہلے پاکستان زندہ باد کی روایت نہ تھی، یا یہ لوگ پاکستان کے خلاف کام کرتے تھے، یا یہ ملک دشمن تھے مگر پاکستان میں ہی قیام پذیر تھے۔

جس آدمی نے بھی پاکستان کے لئے ہندوستان چھوڑا، ان کا سب کچھ وہاں رہ گیا، وہ جس طریقے سے پاکستان پہنچے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ظاہر ہے قربانیاں بھی ہجرت کرنے والوں نے ہی دینا تھیں، وہ آگٹ اور خون کا دریا پار کر کے یہاں آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ متحدہ نے مہاجر صرف اردو بولنے والوں کو قرار دے دیا، ان کے علاوہ پنجاب میں جس قدر لوگ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آئے انہیں مہاجر کے روایتی معانی نصیب نہ ہوئے۔ یہ کہانی بھی دوسری ہے کہ مہاجر انسان کب تک رہتا ہے، جب لوگ ہندوستان سے آگئے اور یہاں آ کر اپنا کاروبار یا ملازمت وغیرہ شروع کر دی، ان کا سلسلہ روزگار چل پڑا تو پھر کیسی مہاجرت؟ اب وہ یہیں کے رہنے والے ہیں، اب ان کا جینا مرنا پاکستان کے ساتھ ہے۔ مگر اپنے مہاجر ہیں کہ ان کی مظلومیت ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی، ان پر ظلم ہونے کی وہ وجہ بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم مہاجر ہیں۔ مگر کوئی یہ بھی تو پوچھے کہ جناب تین دہائیوں سے تو کراچی میں آپ کا ہی راج ہے، بھتوں، قتل، لوٹ مار کے علاوہ کیا تبدیلی آئی، اور حکومت میں ہوتے ہوئے مظلوم کیسے بن گئے؟ حکومت آپ کی ہے تو ظالم کون ہوگا۔

جب مہاجر ہجرت کر کے پاکستان آ گئے، تو پھر پاکستان زندہ باد خود ہی ہو جاتا ہے، مگر پاکستان میں رہ کر ”را“ کی بجائے اور مستقل ہی پاکستان مخالف نعرے لگانا متحدہ کا وطیرہ ہے۔ متحدہ کے خلاف جتنے بھی آپریشن ہوئے تقریباً

تمام میں یہ ثابت کیا گیا کہ ایم کیو ایم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے 'را' سے تربیت لی اور فنڈز وصول کئے، اس کے بعد پاکستان آ کر کارروائیاں کیں۔ مگر عملاً کچھ نہ ہوا، سنگین سے سنگین الزام بھی ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب متحدہ والے الطاف حسین سے لاطعتی کا اظہار کر رہے ہیں تو یہ عمل بے حد مشکوک ہے، یہ لوگ تو الطاف بھائی کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اب اپنے قائد کی تمام نشانیاں مٹانے پر کیسے رضا مند ہو گئے، کیا اس سے قبل موصوف نے اس قسم کی تقریر کبھی نہیں کی؟ یہ لوگ تو اپنے قائد کے ہر قسم کے خیالات کے تائید کنندہ تھے، کیسے قبرستان جیسی خاموشی طاری ہو گئی؟ اب اگر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہی حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ لینا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ اس سے قبل یہ سرٹیفکیٹ ان لوگوں کے پاس نہیں تھا۔ اب یہ نعرے کسی مصلحت کے تحت ہی لگائے جا رہے ہیں، مگر اپنی حکومت ہے کہ ڈبیک بجانے پر آمادہ ہے۔ کیا پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے سے بھتے، قتل اور لوٹ مار معاف ہو جاتی ہے؟ کیا کوئی ٹارگٹ کلر کسی اہم شخص کو مارنے کے بعد پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا دے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ اگر متحدہ کے لوگ پہلے سے ہی پاکستان زندہ باد کے قائل ہیں تو اب یکایک یہ نعرہ لگانے کا کیا جواز ہے؟ یہ نعرہ تو ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے، مگر جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا استعمال نہایت زیادتی ہے۔

پاکستانی کرکٹ ٹیم انگلینڈ میں اُسی کی ٹیم کے خلاف میدان میں ہے۔ ٹیسٹ میچوں کی سیریز برابر ہو گئی۔ اس برابری کے موقع پر پاکستان میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے، ریکارڈ قائم ہوئے، ٹیم اور قوم فتح سے سرشار ہو گئی۔ خمار ابھی اترا نہیں تھا کہ ون ڈے سیریز کا آغاز ہو گیا۔ شاہینوں نے پے در پے چار میچ ہار کر قوم کے غم و غصے کو دعوت دے دی۔ مگر پانچواں میچ جیت کر ٹیم کو کلین سویپ سے بچا لیا۔ بس یہی انگلینڈ میں کرکٹ ٹیم کی مختصر داستان ہے، ابھی میچ اور بھی ہیں، مگر یہاں ایک اور خبر نے حالات میں ہلچل سی پیدا کر دی، بتایا گیا کہ کرکٹ کی عالمی رینکنگ میں پاکستان کا نمبر نواں ہے۔ یعنی اگر دنیا کی دس بڑی ٹیمیں الگ کی جائیں تو پاکستان کی ٹیم ان میں شامل ہے، گویا دنیا میں تقریباً اتنی ہی ٹیمیں مقبول عام ہیں اور پاکستان کا نمبر آخری سے پہلا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام قابل ذکر ٹیمیں پاکستان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پہلے نمبروں پر براجمان ہیں۔ دوسری طرف کرکٹ کی عالمی رینکنگ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کا کوئی کھلاڑی انفرادی طور پر پہلی دس پوزیشنوں میں شامل نہیں، نہ باؤلنگ میں اور نہ ہی بیٹنگ میں۔ عالمی رینکنگ میں مختلف حوالوں سے نکات جمع کئے جاتے ہیں، تب ترتیب بنتی ہے۔

اپنے ہاں کرکٹ بورڈ، حکومت اور عوام کی اپنی رہنمائی ہے، یہ عالمی رہنمائی کو زیادہ محسوس ہی نہیں کرتے، اگر کرلیں تو اس کی بہتری کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اپنے ہاں ابھی تک مولا جٹ سٹائل کو شرفِ قبولیت بخشے والوں کی اکثریت ہے، اگر کسی کھلاڑی نے کسی میچ میں چوکوں چھکوں کی برسات کر دی تو وہ چھا گیا، میڈیا اسے سر پر اٹھالیتا ہے، اس کے اہل خانہ سے لے کر اس کے ہمسایوں تک کے انٹرویو شروع ہو جاتے ہیں، اس کے سکول کے زمانے کے حالات اور اس کے اساتذہ کو تلاش کر لیا جاتا ہے، دوستوں سے رابطے کئے جاتے ہیں۔ وزیر اعظم اسے لاکھوں روپے انعام دینے کا اعلان کرتے ہیں، دیگر حکومتی ادارے بھی بڑھ چڑھ کر اس قومی خدمت میں اپنا حصہ ملانے کا اعلان کرتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ وہ ایسے تمام اخراجات قومی خزانے سے ہی ادا کرتے ہیں، تاہم نام انہی کا بنتا ہے)۔ بہت سے نجی ادارے بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے میں مختصر حضرات بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے، وہ بھی لاکھوں روپے اس نیک کام میں لگا کر اپنا نام روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کبھی پوری ٹیم کوئی معرکہ مار لے تو پھر تو بس قوم کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے، منچلے سڑکوں پر نکل آتے ہیں، کامیابی کی خوشی میں ون ویلنگ کا انعقاد کیا جاتا ہے، آتش بازی ہوتی ہے، اور بعض اوقات فائرنگ بھی۔ ٹیم کے لئے مبارکبادوں کے پیغام ہوتے ہیں۔

جب اپنی ٹیم مایوس کن کھیل کا مظاہرہ کرتی ہے، تو پھر قوم کے مزاج کا مت پوچھئے،
 مغلظات کی گردانیں تیار کی جاتی ہیں، طعنے دیئے جاتے ہیں، کھلاڑیوں کو ٹیم سے نکال
 باہر پھینکنے کے مشورے دیئے جاتے ہیں، کرکٹ بورڈ اور اس کے آؤٹ ڈیٹڈ
 عہدیداروں کو کوسا جاتا ہے، انہیں ان اہم عہدوں سے ہٹانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے،
 کھلاڑیوں کی چھٹی کروانے کی بات کی جاتی ہے، نئے خون کی بھرتی کا مشورہ دیا جاتا
 ہے۔ اگر کارکردگی زیادہ ہی خراب ہو جائے، شکست عبرتناک کے ساتھ شرمناک بھی
 ہو جائے تو پھر شاہینوں کے جانثار انہی کے خلاف میدان میں اتر آتے ہیں۔ گدھوں کے
 گلے میں کسی ہیر کا نام لکھ کر بھی ڈال دیا جاتا ہے۔ کیا کچھ جتن نہیں کئے جاتے۔ مسلسل
 ناکامیوں کے بعد اپنی کارکردگی کا جائزہ نہ لینا اور کچن کا بینہ کے فیصلوں پر ہی ڈٹے رہنا ہی
 آئندہ کے لئے ناکامی کا موجب بنتا ہے۔ سب سے پہلے کرکٹ بورڈ کے اراکین کو دیکھنا
 چاہیے، کون کیا ہے، کرکٹ سے اس کی دلچسپی کتنی ہے، انتظامی امور میں اس کا تجربہ کیا
 ہے، وہ اپنی عمر اور سرگرمیوں کے حوالے سے کس قدر متحرک ہے؟ اسی طرح سلیکشن
 کمیٹی کی غیر جانبداری پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیے، اور آخر میں لڑکوں کے انتخاب پر
 کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ اگر بورڈ والے علاقائی کرکٹ بورڈوں کو
 فعال کریں اور مختلف مقابلوں کی صورت میں لڑکے آگے لائیں تو چھپی ہوئی صلاحیتیں
 ظاہر ہو سکتی ہیں، پسند ناپسند کے دائرے سے نکلے بنا کام نہیں بنے گا۔ یوں ہم عالمی
 رینکنگ میں بدترین سطح سے

ابو نعیم احمد

۱۰۰

آجکل سابق وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی اپنی پارٹی کو متحرک رکھنے کے لئے میدان میں ہیں۔ پہلے انہوں نے ملتان میں ایک کنونشن سے خطاب کیا، یہ وہی موقع ہے جہاں ان کی تقریر کے دوران سٹیج ٹوٹ گیا تھا اور آپ گرتے گرتے بچ گئے تھے۔ اس کے بعد دوسرا پڑاؤ بہاول پور میں ڈالا اور اب خانیوال میں کارکنوں سے خطاب کیا۔ انہوں نے پی پی کا بنیادی فلسفہ وفاداری بتایا، یعنی تمکثیں لینے والے تو پارٹی چھوڑ جاتے ہیں، مگر کارکن پارٹی نہیں چھوڑتے۔ انہوں نے کارکنوں کو ساتھ لے کر چلنے کی خوشخبری بھی سنائی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ ”اپنا صوبہ بننے تک ہمیں انصاف نہیں ملے گا“۔ اپنے صوبے سے یہاں مراد جنوبی پنجاب کا صوبہ ہے، یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پی پی ابھی تک یہ فائل نہیں کر سکی کہ جنوبی پنجاب کے صوبے کا حدود اربعہ کیا ہوگا، اس ممکنہ یا مجوزہ صوبے کا نام کیا ہوگا، اس کا دار الحکومت کس شہر کو بنایا جائے گا اور یہ بھی کہ صوبہ بنانے کے لئے کونسے لوازمات درکار ہیں؟ بس ایک سیاسی نعرہ ہے جسے نہایت تسلسل کے ساتھ لگایا جاتا ہے، اور اپنا کام نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تقریب سے سابق گورنر مخدوم احمد نے بھی خطاب کیا۔

سابقہ دور میں جب یہی یوسف رضا گیلانی وزیراعظم تھے تو جنوبی پنجاب میں صوبوں کی تحریک زوروں پر تھی، ایک علم جناب محمد علی درانی نے اٹھار کھا تھا، تو دوسرا انہی مخدوم احمد محمود کے ہاتھ میں تھا اور تیسری طرف نواب صلاح الدین بھی اسی صوبے کے حق میں پرچم اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ تینوں حضرات بہاول پور کی بحیثیت صوبہ بحالی کے خواہاں تھے، یہی ان کا نعرہ تھا اور شاید یہی کوشش۔ دوسری طرف ملتان والے بھی خُم ٹھونک کر میدان میں آگئے، ہمیں بھی صوبہ چاہیے، کسی نے کہا کہ صوبے کا نام ملتان ہو، کسی نے اسے جنوبی پنجاب کے نام سے یاد کیا اور کچھ نے دیگر تمام ناموں کو مسترد کرتے ہوئے سرائیکی صوبے کے حق میں آواز بلند کر دی، اور بہاول پور صوبہ کے حامیوں کو سرائیکیوں کا غدار قرار دینے میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لیا، تاہم بہاول پور والوں کے موقف میں کافی نرمی تھی، کہ صوبے ایک سے زیادہ بھی بن سکتے ہیں۔ جب پنجاب اسمبلی سے دو صوبوں کی قرار داد منظور ہو گئی اور اس میں واضح طور پر بتایا گیا کہ بہاول پور صوبہ بحال کیا جائے اور دوسرے علاقے کے صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اب وفاقی حکومت نے جو بورڈ بنانا تھا، اس میں کسی 'سٹیک ہولڈر' کو نامزد نہیں کیا، غیر اصولی سا بورڈ تشکیل دے دیا، زیادہ تر لوگوں نے احتجاجاً اس کا حصہ بننے سے ہی انکار کر دیا۔ یوں یہ صوبہ یا صوبے خود پی پی کے دور حکومت میں ہی ناکام بنا دیئے گئے تھے۔

پی پی اب بھی جنوبی پنجاب میں صوبوں کے نام پر سیاست کر رہی ہے، ظاہر ہے سیاست کرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے، کہ عوام کو کوئی نعرہ دے کر ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا جائے، عوام بھی اسی امید پر پارٹی کے ساتھ اظہارِ پیچمتی کرتے رہیں، یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اگر گیلانی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں اپنے صوبے کے قیام کی صورت میں ہی انصاف ملے گا، تو نہ جانے وہ کونسا انصاف چاہتے ہیں، اسی جنوبی پنجاب کے رہائشی ہوتے ہوئے وہ پارٹی کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں، یہاں رہتے ہوئے ہی انہیں پاکستان کے وزیر اعظم بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کے کزن مخدوم احمد محمود کو بھی جنوبی پنجاب کے رہائشی ہونے کے باوجود پنجاب کی گورنری ملی۔ جنوبی پنجاب سے پاکستان اور پنجاب پر حکمرانی کرنے والے سیاستدانوں کی فہرست بہت طویل ہے، جن میں صدر پاکستان اور وزیر اعظم تک شامل تھے، اگر یہ لوگ بھی خطے کے عوام کو انصاف نہیں دلو اسکے تو باہر سے آکر کون ان کی خدمت کرے گا؟ مخدوم احمد محمود نے خانیوال کے سیاستدانوں پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کا باوا آدم نرالا ہے، کوئی سیاستدان کسی ایک پارٹی میں نہیں نکلتا۔ مخدوم صاحب کو یہ بھی علم ہو گا کہ خود وہ بھی یہ کارِ خیر متعدد مرتبہ سرانجام دے چکے ہیں، پارٹیاں بدلنے کی مہارت تو اس قدر زور پکڑ چکی ہے، سالہا سال ایک لیڈر کو مغالطات سے نوازنے کے بعد اچانک اسی لیڈر کے گن گانے کا ماحول بنا لیا جاتا ہے۔ گیلانی صاحب کارکنوں

کو ساتھ لے کر ضرور چلیں، مگر کارکنوں کی تلاش کا مرحلہ پہلے مکمل کر لیں۔

! قربانی کی کھالیں ہمیں دیجئے

جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے نکلے تو بہت سے بچے ہاتھوں میں پمفلٹ تھامے کھڑے تھے، وہ ہر گزرنے والے نمازی کو ایک ایک کاغذ دے رہے تھے، اسی وجہ سے مسجد کے گیٹ پر کچھ رش سا ہو گیا تھا، مسجد سے آنے والے کچھ بچے اچھل کر پمفلٹ اچکنا چاہتے تھے، تاہم تقسیم کرنے والوں کو بھی شاید ہدایت تھی کہ چھوٹے بچوں کو پمفلٹ نہیں دینے۔ دو مختلف پمفلٹ میرے ہاتھ بھی لگ گئے۔ ”قربانی کی کھالیں ہمیں دیجئے“۔ ایک پمفلٹ بہت ہی معیاری اور اچھے کاغذ پر تیار کیا گیا تھا، دونوں طرف تحریر تھی اور عالمی سطح کی مسجد کی ایک تصویر تھی، سیکڑوں کمروں پر مشتمل دو مختلف کیمپس تصویر میں موجود تھے۔ دیکھتے ہی میرا سر چکرا گیا، الہی! کیا اپنے ہاں بھی اس قسم کی بُر شکوہ اور عالیشان عمارات موجود ہیں؟ وہ کونسے خوش بخت بچے ہیں جو یہاں دین اور دنیا کی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں؟ وہ کتنے خوش نصیب اساتذہ ہیں جنہوں نے اس جامعہ کا بندوبست کیا ہوا ہے؟ تاہم میں نے پمفلٹ سنبھالا اور فیصلہ کیا کہ گھر جا کر تفصیل سے اس کا مطالعہ کروں گا۔ دوسرا پمفلٹ ایک سادہ سے کاغذ پر تھا، صفحہ کے ایک ہی طرف مختصر سی تحریر تھی۔

گھر جا کر پہلے پمفلٹ کا مطالعہ کیا تو اس کے پہلے صفحہ کے اوپر تو بہت عالیشان عمارتوں کی تصویر تھی، مگر اسی صفحہ کے آخر میں وسیع میدان کی تصویر تھی، جس کے پس منظر میں فصلیں دکھائی دے رہی تھیں، ایک چھوٹے سے پلاٹ کی بنیادیں بھی رکھی گئی تھیں، جس کے ایک حصے میں چند سرے سر اٹھائے کھڑے تھے، دوسری طرف چند سوائٹیں پڑی تھیں۔ تحریر میں بتایا گیا تھا کہ یہ عالیشان جامعہ زیر تعمیر ہے، اس میں کوئی ہال بنوا کر، ایٹنیں لگا کر، سر یا خرید کر، سیمنٹ دے کر ثواب دارین حاصل کیا جاسکتا ہے، جنت میں گھر بنوایا جاسکتا ہے، قربانی کی کھالوں کے علاوہ صدقات، خیرات، زکوٰۃ، عطیات وغیرہ کے لئے بھی مخیر حضرات سے اپیل کی گئی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس کا تخمینہ لاگت ایک ارب روپے لگایا گیا تھا۔ کیا جانے کہ بیسیوں یا پچاسیوں سال بعد یہ میدان انہی عمارتوں کے نیچے بچھپ جائے جن کی تصاویر پمفلٹ پر دی گئی ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ آنے والی نسلیں یہی عمارت دیکھ پائیں، یا ممکن ہے اس سے بھی بہتر عمارتیں وجود میں آجائیں۔ فی الحال تو پر عزم لوگوں نے صرف امیدوں پر ہی ایک ارب روپے کے منصوبے کی بنیاد رکھ دی ہے۔ دوسرا پمفلٹ جتنا سادہ تھا، اتنا ہی پیچیدہ بھی، اس کی پیچیدگی میری کم علمی سے وابستہ تھی۔ یہ بھی کسی مدرسے کی طرف سے ہی تھا، جس میں قربانی کی کھالوں کی پر زور اور بہت ہی محبت سے کی گئی اپیل تھی، اور ساتھ ہی قربانی

کے جانور میں حصہ کی بات تھی (حصہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بڑے جانور کی کھال ہاتھ آ جاتی ہے) لکھا تھا، ادنیٰ حصہ .. اتنے روپے .. درمیانہ حصہ .. اتنے روپے اور اعلیٰ حصہ .. اتنے روپے۔ تاہم یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اعلیٰ ادنیٰ کی یہ تقسیم گوشت کی نہیں جانور کی ہے۔ پیچیدگی بھی یہی ہے کہ قربانی تو قربانی ہوتی ہے، اسے اعلیٰ ادنیٰ میں تقسیم کر کے ثواب دارین کو بھی اعلیٰ ادنیٰ بنا دیا گیا، یہ لکھا جاسکتا تھا کہ ایک حصہ آٹھ سے بارہ ہزار روپے تک ہے، ہر کوئی اپنی مالی حالت کے مطابق اپنا حصہ ڈال سکتا تھا۔

شام ڈھلے میں گھر سے باہر نکلا تو گلی کے گارڈ نے نہایت احترام کے ساتھ مجھے سلام کیا، میری طرف قدم بڑھائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے ساتھ کوئی بات کرنے والا ہے، بلکہ میں نے اس کے انداز سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی مطالبہ کرنے والا ہے، سرجی کا حال چال معلوم کرنے کے بعد استفسار کیا، کیا آپ قربانی کریں گے، ”انشاء اللہ!“ میں نے کہا، تو پھر سرجی قربانی کی کھال مجھے دینا سرجی! میرے لئے یہ سوال اچانک اور نیا تھا کہ کیا ایک گارڈ کو بھی قربانی کی کھال دی جاسکتی ہے؟ میں نے سوچنے کی مہلت لی اور اس سے اجازت چاہی۔ دو ایک دوستوں کے فون بھی آئے کہ انہیں قربانی کی کھالیں درکار تھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا کافی مشکل ہے کہ کھال کس کے حوالے کی جائے، ایسے میں

حکومت کا معاملہ سب سے بہتر ہے، کہ وہ ذبح کئے بغیر ہی کھال اتار لیتی ہے، کسی جانور کی نہیں، انسانوں کی۔ اس مرتبہ کراچی والے بھی خوش نصیب قرار پائیں گے کہ قربانی کی کھالیں اپنی مرضی سے کسی کو دے سکیں گے، کھالوں کی وین ٹوٹنے والے ”پاکستان زندہ باد“ ہو چکے ہیں۔

! عید، سری پائے، کھالیں اور صفائی

ضلعی انتظامی افسر نے عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک حکمنامہ جاری کیا ہے، جس کے مطابق عید کے موقع شہری علاقوں میں سری پائے جلانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، یعنی اب یہ شوق رکھنے والے لوگ اپنے سری پائے اٹھا کر دیہات کا رخ کریں، یا شہر سے باہر کسی کھلے مقام پر اپنے چولہے گرم کریں، وہاں سلنڈر لے جائیں یا لکڑی سے کام چلائیں یہ ان کی مرضی۔ اُدھر قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کے بارے میں ہدایات تو ملکی سطح پر جاری ہو چکی ہیں، جن پر ضلعی انتظامیہ بھی عمل کروانے کی پابند ہے کہ کالعدم تنظیمیں یہ کام نہیں کر سکیں گی، جن فلاحی تنظیموں کو اجازت دی گئی ہے وہ بھی مقامی حکومتوں کے منظور کردہ سینئر پر ہی کھالیں اکٹھی کر سکتی ہیں۔ تیسری بات یہ جیسا کہ ظاہر ہے خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے گی، اس ضمن میں پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو سختی سے ہدایات کر دی گئی ہیں۔

عید والے دن تو قوم قانون نافذ کرنے والے اداروں کی دسترس سے ذرا محفوظ ہی ہوتی تھی، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ اب عید پر بھی بہت سے لوگ پریشان ہی رہیں گے، پولیس کا انہیں ڈر رہے گا اور پولیس کو اُن کی تلاش۔

جہاں تک کھالیں جمع کرنے کا تعلق ہے، یہ معاملہ تو اب بہت اوپر کی سطح تک پہنچ چکا ہے، یہ ایٹو نیشنل ایکشن پلان تک جا پہنچا ہے کہ یہ کھالیں دہشت گرد تنظیمیں حاصل کرتی ہیں اور اس کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں، لہذا حکومت نے ان کے کھالیں اکٹھی کرنے پر پابندی لگا دی ہے، جو کھالیں اکٹھی کرتا یا ان کو کھالیں دیتا پکڑا جائے گا، وہ اپنے مستقبل پر نظر رکھ کر ایسا کرے، تاہم دیگر تنظیموں یا اداروں کے لئے سینٹرز کی منظوری ہو چکی ہے۔ مگر اپنے ہاں کھالوں کے بارے میں ایک ذہن بنا ہوا ہوتا ہے، سب سے زیادہ کھالیں تو مقامی دینی مدارس کو ہی جاتی ہیں، اس کے علاوہ فلاحی تنظیمیں بھی اپنا حصہ وصول کرتی ہیں، کچھ تنظیمیں ایسی بھی ہیں، جن کے بارے میں لوگ ڈبل مائنڈ ہوتے ہیں، مگر ہمسائیگی کے ناطے انہیں بھی کھالیں دے دیتے ہیں۔ اس لئے قربانی کی کھال احتیاط اور جانچ پڑتال کے بعد دیں، یہ نہ ہو کہ قربانی کی کھال کی وجہ سے اپنی کھال ہی حکومتی اداروں کی گرفت میں آ جائے اور جان چھڑانی مشکل ہو جائے، یوں عید کا مزہ تو جو کچھ خراب ہوگا، بعد میں بھی نہ جانے کب جان خلاصی ہوگی۔

سری پائے پر شاید پہلی مرتبہ پابندی لگی ہے، امکان ہے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی زیادہ توجہ کھالوں پر ہی ہوگی، اس لئے سری پائے کسی حد تک چل جائیں گے، کون پولیس والے ہونگے جو گلی گلی چکر لگا کر پاپوں کے جلنے کی

بدبو سونگھیں گے اور اس کی کھوج لگا کر گھر پر دستک دے کر پائے اپنے قبضے میں لیں گے۔ یہ حکم چونکہ ضلعی انتظامی افسر کا دیا ہوا ہے، اس لئے پائے جلانے والے کچھ لوگوں کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے، کارکردگی دکھانے کے لئے اور افسر صاحب کو خوش کرنے کے لئے کچھ کرنا پڑے گا۔ سری پائے کے جلانے پر پابندی اگرچہ ایک متنازع حکم ہے، مگر ایک گھر میں یہ جلتے ہیں، ساتھ دس گھر اس کی بدبو اور گھٹن سے تنگ ہوتے ہیں۔ اس پابندی پر عمل درآمد کرنے کے لئے شہروں میں کمیٹیوں اور صفائی کے عملے کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں، یہ لوگ روک نہیں سکتے مگر پولیس کو اطلاع تو کر سکتے ہیں۔

عید الاضحیٰ کے موقع پر خود لوگوں کا پیدا کردہ بہت بڑا مسئلہ گندگی کا پھیلاؤ ہوتا ہے، ہمارے ہاں ”بہاول پور ویسٹ منیجمنٹ کمیٹی“ نے گھر گھر دروازوں پر دستک دے کر کنگ سائز کے شاپر دیئے ہیں، ساتھ ہی دو عدد پمفلٹ بھی، کہ جن پر عید مبارک، صفائی کی اپیل اور کمیٹی کے بہت سے نمبر بھی دیئے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں جس وقت چاہیں فون کر کے صفائی کے عمل کو جاری کیا جاسکتا ہے، عملہ ویسے بھی عید کے دنوں میں ہمہ وقت صفائی میں مصروف رہے گا، جس کی وجہ سے گندگی پھینکنے اور اٹھانے والوں کا مقابلہ جاری رہے گا، تجربہ یہ بھی ہے کہ اس مقابلے میں کامیابی صفائی والوں کی ہی ہوتی ہے۔ اپنے ہاں کلچر یہ ہے کہ کمیٹی کے دیئے ہوئے بڑے شاپر گھر میں استعمال کے لئے رکھ

لئے جاتے ہیں اور قربانی سے برآمد ہونے والا کچرا گلی کے کسی کونے میں پھینک دیا جاتا ہے، اگر ویسٹ منیجمنٹ کمیٹی کی کوششیں جاری رہیں تو کبھی وقت ضرور آئے گا جب ہر طرف صفائی کا راج ہوگا۔

عید ابھی گزری نہیں تھی کہ بھاگ دوڑ سی چل گئی، وجہ اس ہنگامہ آرائی کی یہ ہوئی کہ اس مرتبہ حکومت نے عید کی تین چھٹیاں تو دے دیں، مگر کیا کچھ کہ بڑی عید بذاتِ خود تین دن تک ہوتی ہے، عید سے قبل ایک چھٹی فطری بات ہے، کہ دور دراز سے لوگوں نے گھر پہنچنا ہوتا ہے، یہ سفر بارہ گھنٹے سے زیادہ تک بھی ہے، اگر کوئی سرکاری ملازم اسلام آباد سے جنوبی پنجاب جائے گا تو یقیناً بارہ گھنٹے سے زیادہ سفر کر کے آئے گا، اسلام آباد میں تو ملازمت کرنے والے پورے پاکستان سے آتے ہیں، وہاں سے بلوچستان اور سندھ کے علاقوں میں جانے والوں کا سفر اس سے بھی زیادہ ہے۔ حکومت نے عید کے دوسرے روز تو چھٹی کر دی، مگر تیسرے دن دفاتر میں حاضری ہونے کا حکم تھا۔ اس جلدی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اگر تین روز تک چھٹی دی گئی تو پورا ہفتہ چھٹیاں ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت نہایت ذمہ داری کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے، کہ قوم کا زیادہ وقت ضائع نہ ہو، عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے حکومت کو مزید وقت میسر آ سکے، حکومت کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے، مگر بعض اوقات حالات سازگار نہیں ہوتے۔

حکومت کو اچھی طرح علم ہے کہ اس عید کو تین روز تک منایا جاتا ہے، بہت سے

لوگ قربانی بھی تیسرے روز کرتے ہیں۔ اگر حکومت تین روز چھٹی کرتی تو آگے صرف جمعۃ المبارک بچتا، جبکہ وفاقی اداروں اور بہت سے تعلیمی اداروں میں ہفتہ کے روز چھٹی ہوتی ہے، اس سے عجیب صورت حال سی بن جاتی، گویا جمعہ ہی کام کا دن رہتا۔ مگر چھٹی نہ کرنے سے اس سے بھی عجیب بلکہ غریب صورت پیدا ہو گئی۔ ہوا یوں کہ لوگوں کو عید کے دوسرے روز ہی واپس لوٹنا تھا، کیونکہ تیسرے دن دفتر میں حاضری لازمی تھی۔ اس طرح عید کے دوسرے دن دوبارہ مسافر نکل کھڑے ہوئے، نہ سڑکوں پر ٹریفک، نہ پبلک ٹرانسپورٹ۔ ہاں البتہ اسلام آباد یا لاہور سے سرکاری گاڑیوں پر اپنے آبائی علاقوں میں عید منانے جانے والوں کی دہری عید تھی، ایک تو گاڑی سرکاری، اوپر سے پٹرول بھی مفت۔ سرکار کے کھاتے میں عیاشی کا یہ کلچر بہت پکھیل چکا ہے اور حکومت اس عمل کا برا نہیں مناتی، حکمران چونکہ خود بے تحاشا مراعات حاصل کر رہے ہوتے ہیں، اس لئے اپنے سرکاری افسران وغیرہ کی عیاشیوں میں دخل اندازی نہیں کرتے، اس معاملے میں کسی حد تک مل کر کھانے کا رجحان موجود ہے۔

عید کے تیسرے روز سرکاری دفاتر اور سکول وغیرہ کھولنے سے حکومت کا زیادہ چھٹیاں نہ کرنے کا خواب پورا نہ ہوا۔ پہلے روز حاضری نہ ہونے کے برابر رہی، بعض سکولوں میں تو بچے سرے سے آئے ہی نہیں، باقیوں میں بھی اتنے آئے جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔ سرکاری دفاتروں میں مقامی لوگ تو کسی حد تک

پہنچ گئے، مگر دور والوں کی بہت کم تعداد دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچی۔ جن دفاتروں کا تعلق
 عوامی معاملات و مسائل سے ہے، وہاں سائلوں نے بھی قدم نہیں رکھا، وہ جانتے ہیں
 کہ متعلقہ افسران و اہلکاران موجود ہی نہیں ہونگے، یا تمام لوگ نہیں ہوں گے۔ یوں اگر
 دور دراز والے حکومت کے خوف سے واپس پہنچ بھی گئے تو وہ سخت پریشانی میں مبتلا
 رہے، حکومت کو کوسے رہے، کُڑھتے رہے، جہاں دوسرے نہیں آئے وہاں ہم بھی نہ
 آتے تو کونسا پہاڑ گر جانا تھا۔ اگلے روز جمعہ ہے اور ہفتہ کو پھر بہت سے ادارے اپنی
 چھٹی کرتے ہیں۔ یوں جمعرات، جمعہ اور ہفتہ دفاتر اور سکولوں میں حاضری نہایت کم
 رہے گی، جس سے کوئی کام سرے نہیں چڑھے گا، نہ کسی سائل کا مسئلہ حل ہوگا اور
 سکولوں میں بہت ہی کم تعداد کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جاسکے گا۔ ایسے میں
 حکومت کو غیر فطری اور سخت فیصلے نہیں کرنے چاہیئے۔ اپنی قوم میں اس قدر احساسِ
 ذمہ داری موجود نہیں کہ جب دفاتر یا سکول کھل جائیں تو پہلے ہی روز حاضری پوری ہو
 جائے، یہاں تو اگر دو چار چھٹیاں بھی اکٹھی مل جائیں تو اس کے بعد کئی روز تک
 حاضری پوری ہوتے لگ جاتے ہیں۔ چونکہ اپنے ہاں ذمہ داری کا مکمل طور پر فقدان
 ہے، اس لئے لوگوں کو مایوس اور پریشان کرنے کی بجائے بہتر ہوتا ہے کہ چھٹیاں دے
 دی جائیں، تاکہ لوگ یکسوئی اور خوشی کے ساتھ اپنی عید مناتے، گھروں کو لوٹنے
 والے پر دیسی اپنے عزیز واقارب سے ملتے۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ نہ عید منائی اور نہ ہی
 دفاتر میں حاضری ہوئی۔ آئندہ

ایسے فیصلے کرنے وقت حکومت کو فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے

!گنڈا سے، ڈنڈے، انڈے اور ہم

اس خیال میں ممکن ہے پُر امید لوگوں کو مایوسی کی جھلکی دکھائی دے کہ پاکستان میں جمہوری تربیت کی یہی رفتار رہی تو ایک صدی تک بہتری کے کوئی امکانات دکھائی نہیں دیتے، کیونکہ تربیت کسی بھی پیمانے پر ہو ہی نہیں رہی، بہتری آئے گی کہاں سے؟ ہاں جمہوریت انہیں اس ہے، جو الیکشنوں میں کامیاب ہوتے ہیں، اُن کی بھی پانچوں گھی میں ہوتی ہیں، جو کامیاب ہونے والوں کے گرد حصار بنا لیتے ہیں، اور جب تک جیتنے والے اقتدار میں رہتے ہیں، یہ مضبوط حصار قائم رہتا ہے۔ نہ جیتنے والوں کو اور نہ ہی ان کے ساتھیوں کو جمہوری تربیت کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی وہ اس کے محتاج ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ جمہوریت کی گاڑی کے دونوں پہیوں (سیاستدان اور عوام) کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اگر پاکستان جمہوری ملک ہے یا یہاں جمہوریت کا بول بالا رکھنا ہے تو جمہوری اقدار کا بھی خیال رکھا جائے، جمہوری اصولوں کی بھی پاسداری کی جائے، جمہوریت کے تقاضے بھی پورے کئے جائیں۔

پاکستانی جمہوریت کی پہلی خامی یہ ہے کہ یہاں تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں موروٹی ہیں۔ مسلم لیگ ن تو ہے ہی پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف کے

نام سے رجسٹرڈ۔ جب پارٹی کا نام ہی کسی فرد کے نام پر رکھا جائے گا تو وہ یقیناً اسی کی وراثت ہوگی۔ اس خوش فہمی کی گنجائش نہیں کہ پارٹی تو میاں صاحب کے نام پر ہے مگر وہ جمہوریت کی اصل کے قائل ہیں۔ ہر گز نہیں، پارٹی میں آمریت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ پارٹی سربراہ کے موقف سے سرمو اختلاف کرے، ان کے کسی فیصلے کو حذف تنقید بنا سکے، ان کی کسی بات کی تردید کر سکے۔ ’جو تم کو ہو پسند، وہی بات کہیں گے۔۔ دن کو اگر رات کہو، رات کہیں گے‘ کی عملی تصویر بنے پارٹی کے بڑے بڑے رہنما صرف ہاں میں ہاں ملانے پر ہی اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے پائے جاتے ہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو وزیر اپنے وزیر اعظم اور پارٹی لیڈر کی جتنی تعریف کرتے ہیں، ان کی ریٹنگ اور گریڈنگ اسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ کسی وزیر کی کارکردگی بھی شاید اسی فارمولے کے تحت ناپی جاتی ہے کہ اس نے وزیر اعظم کے حق میں کتنے بیان دیئے، یا مخالفین پر کس قدر جوابی حملے کئے، اپنے تنہا کس قدر مخالفین کو لاکارا اور اپنے وزیر اعظم کی کارکردگی کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملائے، اپنے حکمران کی ایسی ایسی باتوں کی اس طرح تشریح کی کہ خود بات کرنے والوں کے فرشتوں کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات نہ آئی ہوگی۔

خیر جب کوئی کسی کے نام کی پارٹی میں ہوگا تو اسی کے گھن گانا ان کی مجبوری ہے۔ یہی عالم صرف جماعت اسلامی کے علاوہ ہر پارٹی کا ہے۔ اپنی پارٹی قیادت

کی ہر بات کو حرفِ آخر قرار دینے کا کلچر بھی عام ہے، انکیشن ہوں یا کوئی اور مہم، پارٹی کارکن جان لڑاتے دکھائی دیتے ہیں، پارٹی لیڈروں کو خبر نہیں ہوتی کہ ان کے جیالے اور متوالے کس قدر گرم جوش ہیں اور نجی محفلوں میں یا گلی کوچوں میں وہ آپس میں کس طرح دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں؟ بات تو دست و گریبان سے بہت آگے تک جاتی ہے، مغالطات کی فہرستوں کی گردانیں ادا کی جاتی ہیں، نئے نئے الزامات دہرائے جاتے ہیں، تہمتیں دھری جاتی ہیں۔ معاملہ یہاں بھی ختم نہیں ہوتا، بات جان لینے تک بھی پہنچ جاتی ہے، کارکن شہادت کے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں، لیڈر اپنے کارکنوں کے خون سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی بھی پوری کوشش کرتے ہیں، ویسے بھی خون کے بارے میں یہ عام روایت ہے کہ وہ رنگٹ لا کر ہی رہتا ہے، ایسے میں خون کو کیش کروانا بڑی کامیابی جانا جاتا ہے۔ ان باتوں کو بھی جانے دیں۔ کارکنوں کی تربیت کون کرے گا؟

یہاں تو سیاستدان خود بھی تربیت کے لائق ہیں۔ ایک دوسرے کو للکارنے اور نیچا دکھانے کا رواج تو تھا، اب اگر ایک نے دوسرے کے گھر کے باہر (اب پانچ کلو میٹر دور) جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے، تو حکومتی وزراء نے بھی اپنے کارکنوں کو ہلاشیری دینا شروع کر دی ہے، میڈیا کو تو نئی اور انوکھی چیزیں چاہیئیں، اب گنڈاسے، ڈنڈے، بیلے اور انڈے اٹھائے ایک دوسرے کے خلاف کارکن میدان میں اتر آئے ہیں، میڈیا انہیں بھرپور کوریج دے رہا ہے۔ نہ جانے ہم کدھر جا رہے ہیں، ہماری منزل کیا ہے، ہم ماضی کے گنڈاسوں سے کب جان خلاصی کروا سکیں گے

قوم کی تربیت کا ذمہ کون اور کسب الخفائے کا؟ کچھ معلوم نہیں۔

! بے حسی اور تربیت کا فقدان

مزاحیہ اداکار لاڈلا کا اس عارضی دنیا سے کوچ کر جانا معمول کی ایکٹ خبر ہے کہ ہر کسی نے کوچ کرنا ہے، مگر معلوم ہوا کہ ماضی کا مزاحیہ اداکار کمپرسی کی حالت میں دنیا سے گیا، اس کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا، اس کی خبر گیری کسی نے نہ کی، اس کی تیمارداری کرنے کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہ گمنامی کے گہرے غار میں غائب ہو گیا، وہ دنیا سے گیا تو المیہ یہ ہوا کہ میو ہسپتال کے باہر اس کی لاش گھنٹوں لاوارث پڑی رہی، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، ہسپتال کی انتظامیہ اپنی معمول کی سرگرمیوں میں مصروف رہی، جب میڈیا کے ذریعے بات نکلی تو ایکٹ پلچل سی مچی اور انتظامیہ نے لاش کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ یہ معاملہ صرف لاڈلا کے ساتھ ہی نہیں ہوا، یہاں بڑے بڑے لوگ جب سکرین یا منظر سے ہٹتے ہیں تو پھر اُن کو پوچھنے یا یاد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، یوں وہ ہوتے ہوتے گمنامی کے سمندروں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ان کا نام تو کسی حد تک یاد رہ جاتا ہے، بسا اوقات لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ فرد جس کا تذکرہ ہو رہا ہے، زندہ بھی ہے یا عدم کو سدھار چکا ہے؟ لاڈلا کی کمپرسی کی حالت میں موت ہماری اجتماعی بے حسی کی عملی دلیل ہے

معاشرے کے وہ لوگ جو اپنی زندگی میں لوگوں میں مقبول تھے، اپنی باتوں سے لوگوں کا
 دل لبھاتے تھے، جن کی باتیں سن سن کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے،
 انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا کرتے تھے، جب وہ کچھ کرنے کے قابل نہ رہے تو یار لوگوں
 نے انہیں بھلانے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہ لیا، انہیں پیچھے مڑکے نہ دیکھا۔ لوگ کیا
 یاد رکھتے، ایسے لوگ تو قومی اثاثہ ہوتے ہیں، ان کو سنبھال کر رکھنا تو حکومتوں کی ذمہ
 داری ہوتی ہے، مگر اپنے ہاں یہ عام رواج ہے کہ اگر کسی اداکار کی کمپرسی اور خراب
 حالت کا حکومت کو علم ہو گیا تو اس کے علاج کے لئے احکامات جاری کر دیئے گئے، مفت
 علاج کا حکم بھی جاری ہو گیا، دیکھ بھال کے بھی بندوبست ہو گئے، اور جو کسی وجہ سے منظر
 پر نہ آ سکے وہ گننامیوں کی تاریکیوں میں ہی گم ہو کر رہ گئے۔ دنیا کی بے ثباتی کا یہ عالم
 ہے، کہ ہم لوگ اپنے ہمسائیگی میں بھی نہیں جانتے کہ یہاں کون رہتا ہے، اس کی مالی
 حالت کیا ہے؟ اپنے ہاں ہر کوئی بلا وجہ مصروف ہے، وقت کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی
 ہے، کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت کسی کے پاس نہیں، دنیا حال میں جی رہی ہے یا پھر
 مستقبل میں، ماضی کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بیتے وقت کو یاد رکھنے یا یاد کرنے کا
 وقت کسی کے پاس نہیں۔

عید گزری ہے تو چھٹیوں کے بعد آنیوالے اخبارات نے بڑے لوگوں کے بارے میں قوم
 ، کو بتایا ہے کہ کس نے کہاں عید پڑھی، وہ کس طرح عوام میں گھل مل گئے

انہوں نے کس طرح لوگوں سے عید ملی، اور یہ بھی کہ اس موقع پر پروٹوکول بھی نہیں تھا۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا کہ عید پر پردیسوں کی آمد و رفت کا غیر معمولی رش تھا، ٹرانسپورٹرز نے من مانے کرائے وصول کئے۔ مگر ساتھ ہی حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ اس معمول کی کاروائی کے ساتھ اخبارات کی دیگر تمام خبریں بھی معمول کے مطابق ہی رہیں۔ عید کی چھٹیوں میں حادثات کی خبریں بھی جوں کی توں رہیں، قتل و غارت گری کا بازار بھی ویسے ہی گرم رہا، اغوا کی وارداتیں بھی ہوتی رہیں، زہر پی کر جان دینے کی خبریں بھی آئیں۔ کونسی برائی ہے جو عید الاضحیٰ کے مبارک موقع اور حج کے متبرک دنوں میں ہم سے سرزد نہیں ہوئی؟ ہم نے ہر وہ کام کیا جو عام دنوں میں کرتے ہیں، نہ حج کا احترام، نہ قربانی کا جذبہ، نہ مذہبی تہوار کا احساس۔ نہ یہ جاننے کی کسی نے کبھی کوشش کی ہے، نہ کسی نے اس آگاہی مہم پر کام کیا ہے، معاشرے کی تربیت کیسے کی جاسکتی ہے؟ یہ بھاری ذمہ داری کس کے کاندھوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر کسی فرد پر اس ذمہ داری کا بوجھ آتا ہے تو کیا وہ اسے قبول کرتا ہے، اسے اٹھانے کے لئے تیار ہے، اس کو نبھارہا ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ اول گھر، والدین، اساتذہ، معاشرہ، سیاستدان اور حکمران۔ یہ سب ذمہ دار ہیں۔ مگر افسوس کہ سب نے اپنی ترجیحات تبدیل کر لی ہیں، ہر کوئی اپنی دھن میں مگن ہے۔

یہ منظر وفاقی دارالحکومت کے اُجلے چہرے پر بد نما داغ تھا۔ اسلام آباد کے اہم سیکٹر میں ہمارا قیام تھا، چند منٹ کی دوری پر میڈیا ورکشاپ کا اہتمام تھا جس میں صحافیوں کی جسمانی حفاظت کے بارے میں بتایا جانا مقصود تھا۔ ہم لوگ ہوٹل سے نکل کر ورکشاپ کے مقام کی طرف پیدل ہی نکلے، پہلی گلی کا موڑ مڑتے ہی اس مہنگی ترین جگہ پر ایک نجی سکول تھا، جس کی عمارت مرلوں یا کنالوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ معاملہ ایکڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک خاتون اپنے بچے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی وہاں سے نکلیں، یقیناً چھوٹے بے بی سے بڑے بچے کو سکول چھوڑ کر آ رہی ہوگی، یا اس کے کسی معاملے پر سکول والوں سے ملنے گئی ہوگی۔ ساتھ ہی ایک نو دس برس کی لڑکی تھی، جو خاتون سے چند فٹ پیچھے تھی، اس کے کپڑے وغیرہ گواہی دے رہے تھے کہ وہ غریب لڑکی ہے، اس کے ہاتھ میں فائل اس بات کی شاہد تھی کہ وہ لڑکی اس خاتون کے ساتھ ہی تھی، خاتون کا 'سامان' اٹھانے کے لئے اس کے ساتھ گئی تھی۔ چونکہ یہ منظر میں نے موڑ پر دیکھا اس لئے میرے کیمرا سنبھالنے سے قبل ہی یہ منظر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اسلام آباد سرکاری عمارات پر مشتمل شہر ہی نہیں، یہاں ریٹائرڈ افسران

والہکاران کے علاوہ سرمایے کے حامل بے شمار گھرانے آباد ہو چکے ہیں، سیکٹر پر سیکٹر بنتے گئے، شہر سے جنگل کٹا گیا، ان کی جگہ پر عمارتیں اگتی رہیں اور شہر پکھیلتا گیا۔ دور دراز والے لوگ جب کسی کام کی غرض سے اسلام آباد جاتے ہیں تو بہت دنوں تک اداس رہتے ہیں، اسلام آباد کی ترقی دیکھ کر وہ خوش بھی ہوتے ہیں، پریشان بھی رہتے ہیں اور کسی حد تک کڑھتے بھی ہیں۔ یہ لوگ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بھی رہتے ہیں، کہ آخر لوگوں کے پاس کس قدر پیسہ ہے اور حکومت بھی شہر اور یہاں کے حکومتی اداروں پر کس طرح خرچ کرتی ہے؟ جس سکول سے یہ خاتون نکل رہی تھیں، اس کی فیس یقیناً دسیوں ہزار روپے فی بچہ ہوگی، وہ اپنے بچے کے لئے کس قدر متفکر ہوگی کہ صبح ہی اپنے بچے کی فائل لے کر سکول پہنچ گئی، وہ خود کوئی معاملہ لے کر وہاں پہنچی یا سکول والوں نے طلب کیا، یہ الگ معاملہ ہے۔ اصل سوچنے والی بات یہ ہے کہ خاتون کے ساتھ اس بچی کی کیا حیثیت ہے، جو گھر میں کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال پر مامور ہے۔ اسلام آباد کے پوش علاقوں میں ایسا کونسا گھر ہوگا جہاں اہل خانہ نے کوئی لڑکی اپنے گھر کی صفائی، بچوں کو سنبھالنے اور دیگر کاموں کے لئے نہ رکھی ہو۔ وفاقی دارالحکومت، جہاں پاکستانی عوام کے لئے قانون سازی ہوتی ہے، عوام کی بہبود کے دیگر بے شمار قوانین کے علاوہ بچوں سے جبری مشقت لینے کے بارے میں

بھی قانون بنائے جاتے ہیں، بیانات کی حد تک حکمران عوام کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم بچوں سے مشقت لینے کے عمل کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے، اور یہ بھی کہ آنے والے اتنے سالوں میں کوئی بچہ سکول سے باہر نہیں ہوگا۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ خود قانون بنانے والوں کے گھروں میں بھی کام کرنے والوں کے بچے اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بچے کا والد کسی 'صاحب' کا ڈرائیور بھی ہے، مالی بھی اور گھر کا سودا سلف بھی لا دیتا ہے، بچے کی ماں گھر کی صفائی کرتی ہے، کھانا بھی پکاتی ہے، باقی کام بھی کرتی ہے۔ رہ گئے بچے تو وہ 'صاحب' کے بچوں کا دل بہلانے کے لئے گلی میں بھی لے جاتے ہیں، قریبی دکان سے سودا بھی لا دیتے ہیں، گھر کی مالکن نے بازار یا اپنے کسی بچے کے سکول جانا ہو تو ساتھ لے جاتی ہیں۔

غریبوں کے بچوں کی یہ قسمت اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، تو کسی کو احتجاج کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں، کہ قسمت کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا، ویسے بھی قسمت کو کونسا اپنے عقیدے سے مطابقت بھی نہیں رکھتا، نہ ہی دھاڑ دھاڑ کرنے سے قسمت تبدیل ہوتی ہے۔ ستم یہ ہے کہ غریبوں کے بچوں پر یہ ظلم ہمارا سیاسی نظام کر رہا ہے، حکومتیں جو کہ عوام اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کی ذمہ دار ہیں، وہ غریب بچوں کی پسماندگی کی بھی ذمہ دار ہیں۔ قانون بنا کر انہیں آئین کی زینت بنا دینا اور آئین کو بالائے طاق پر رکھ دینا قوم کے

ساتھ ظلم اور نا انصافی ہے۔ اسلام آباد میں ایسے ہزاروں بچے ہونگے جو بڑے لوگوں
کی بیگمات کی خدمت پر مامور ہونگے، بڑوں کے بچوں کو سکول چھوڑ کر آتے ہونگے۔ کیا
فرماتے ہیں وزراء اے حکومت بیچ اس مسئلہ کے؟

بس عید کے تین روز ہی سکون سے گزر سکے، اس کے بعد بہت سے کام جو پہلے جاری تھے، شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے تو لوڈ شیڈنگ کا نمبر آتا ہے، عید وغیرہ کے دنوں میں چونکہ انڈسٹری بند ہوتی ہے، بازار اور مارکیٹیں بھی بند ہوتی ہیں، اس لئے حکومت کے پاس بجلی وافر مقدار میں موجود ہوتی ہے، اپنے بجلی کے وزراء اور حکمران نہایت اطمینان سے عید کے دنوں میں لوڈ شیڈنگ نہ کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں، بہت حد تک اس پر عمل بھی ہو جاتا ہے، مگر کچھ بد قسمت علاقے پھر بھی لوڈ شیڈنگ کی زد میں آ ہی جاتے ہیں۔ حکومت نے اس مرتبہ عید کی تیسرے روز کی چھٹی تو نہ کی، مگر اس روز لوڈ شیڈنگ البتہ نہیں ہوئی، شاید حکومت اور واپڈا والوں کا آپس میں مناسب رابطہ نہیں نہیں ہو سکا۔ اگر واپڈا والوں کو بروقت یاد آ جاتا کہ آج چھٹی نہیں ہے تو وہ قوم کی عادتیں خراب نہ کرتا، بلکہ لوڈ شیڈنگ ایک روز قبل ہی شروع کر دیتا۔ لوگوں کا وہ دن خوش قسمتی سے اچھا گزر گیا، لوگوں کو خوشگوار حیرت بھی ہوئی۔ خیر عید گزر گئی ہے اور لوڈ شیڈنگ اپنے معمول کے مطابق شروع ہو گئی ہے۔ حج پوری امت مسلمہ کے لئے ایک بڑی مثال ہے کہ وہاں امیر غریب کا فرق ختم ہو جاتا ہے، وہاں ایک ہی لباس پہن کر ایک جیسی عبادات کرنا ہوتی ہیں۔ مگر لوڈ شیڈنگ کے معاملہ میں اپنے حکمران عوام سے کوسوں دور ہیں، یعنی

اُن کے لئے مستقل ٹھنڈا ماحول اور عوام کے لئے لوڈ شیڈنگ کا مستقل وجود۔ عید کے دوروز اخبار نہیں آیا تو بھی کافی سکون رہا، نہ حکمرانوں کے دعوے، نہ مخالفین کے نعرے، نہ کرپشن کی کہانی، نہ احتساب کے قصے۔ نہ بچوں اور لڑکیوں کے اغوا کی وارداتیں، نہ ڈاکوؤں کے واقعات۔ نہ قتل و غارت نہ خودکشیاں، نہ زہر پینے کی باتیں، نہ دریا میں کودنے کے معاملے، نہ پٹکھے سے جھولنے کی کہانیاں، نہ غربت کی وجہ سے بچوں کے قتل کے واقعات۔ غرض سکون ہی سکون تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہماری بے خبری کے زمرے میں آتا ہے، ان میں سے اکثر کام ہو رہے تھے، اکثر پروگرام جاری تھے۔ تاہم جو جاری نہیں تھے، عید کی چھٹیوں کے بعد وہ بھی شروع ہو گئے ہیں۔ وزیراعظم امریکا روانہ ہیں تو عمران خان بھی رائے ونڈ کی سیر کو نکلنے کی تاریخ دینے والے ہیں، ممکن ہے وہ میاں صاحب کی واپسی پر ہی رائے ونڈ کا قصد کریں، کسی کے گھر کے باہر احتجاج کی روایت کوئی زیادہ پسندیدہ عمل نہیں، مگر گھر کے سربراہ کی عدم موجودگی میں کسی کے گھر کے باہر ہنگامہ کرنا اخلاقی لحاظ سے تو بالکل ہی مناسب نہیں۔ عمران خان کو اس معاملے میں اپنے حمایتیوں اور اتحادیوں کی بھی سرد مہری کا سامنا ہے۔ اُن کا یہ قدم بھی اسی تشریح کی ذیل میں جاتا ہے، جس کے متعلق بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت کی بہت سی خامیاں عمران خان کے بے وقت ہنگامے کی وجہ سے چھپ جاتی ہیں، رائیونڈ کے دورے سے بھی ان لیگ کی مظلومیت

ہی سامنے آئے گی۔

وزیراعظم پاکستان نے گزشتہ عید اپنے بچوں کے ساتھ لندن میں گزاری تھی، وجہ ان کے دل کی بیماری تھی، بیماری نہ بھی ہوتی تو اس سے قبل بھی ایسے مواقع آچکے ہیں، جب انہوں نے عید بچوں میں باہر ہی گزاری۔ تاہم اس مرتبہ وہ پاکستان میں تھے، مگر عید کی چھٹیوں کے فوراً بعد انہوں نے اپنے طے شدہ دورے پر امریکہ جانا تھا، سو وہ چلے گئے۔ گویا میاں نواز شریف کے امریکا کے دورے میں عید بھی ایک اہم مصروفیت تھی، سو وہ اس سے فارغ ہو کر امریکا روانہ ہو گئے۔ وزیراعظم کے غیر ملکی دوروں کا بڑا چرچا ہے، اگر حساب لگایا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ دیگر پاکستانی حکمرانوں سے زیادہ دورے فرماتے ہیں، اس کی ایک بڑی اور اہم وجہ طبیعت کا رجحان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ وزیراعظم کو سیر سپاٹے کا بہت شوق ہے، جب وہ پاکستان میں ہوتے ہیں تو بھی اپنے دورے کے لئے کسی تفریحی مقام کا انتخاب کرتے رہتے ہیں، اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی مری میں ان کا گھر ہے، جہاں آنے کے لئے نہ تو کوئی دورہ ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کو اطلاع دینے کی، بس موڈ بنا، حکم دیا، روٹ لگا اور روانہ۔ گویا معاشرے اور زندگی میں معمول کے وہ تمام کام جو عید پر دو تین روز کے لئے معطل ہو گئے تھے اب رواں دواں ہو چکے ہیں۔

پنجاب حکومت میں رانا برادری کے وزراء کا بہت عمل دخل ہے۔ سپیکر رانا اقبال ہیں، وہ حکومت میں وراثت کی روایت پر عمل پیرا ہیں، کہ ان کے والد رانا پھول محمد کے نام پر تو شہر کا نام بھی تبدیل ہو گیا تھا، کیوں نہ ایسے باپ کے ہونہار بیٹے کو (مستقل) سپیکر بنایا جاتا۔ رانا ثناء اللہ کی اہمیت پر کوئی بحث نہیں، کہ وزیر قانون اہم تر وزیر ہوتا ہے، لاہور میں منہاج القرآن کے درجن بھر کارکنوں کے پولیس کے ہاتھوں قتل کے بعد موصوف کو عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا، شاید مخالفین کے دباؤ کو کم کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بعد ازاں اسی آب و تاب کے ساتھ وہ اسی وزارت کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہیں، یہ حکومت کی پسند کا مسئلہ ہے، یا یہ اہم فریضہ کوئی اور سرانجام نہیں دے سکتا، اس کا صحیح علم حکومت اور رانا ثناء اللہ کو ہی ہوگا۔

رانا صاحب کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حکومت کے (خود ساختہ) ترجمان بھی ہیں، یعنی مخالفین کے سوالوں کے جواب دینا اور مخالفین کو سوالوں اور بیانات میں الجھانا رانا صاحب کی اہم ڈیوٹی ہے۔ تیسرے رانا مشہود ہیں، اگرچہ یہ بھی بعض اوقات الزامات کی زد میں رہتے ہیں، ایک مرتبہ تو ان پر کسی سے رشوت لینے اور آگے دینے کے الزامات بھی لگے، مگر وہ ایک ہی

جست میں مسائل سے نکل آئے، بحران کے دوران ان کی وزارت کی کشتی بھی ڈولتی رہی ہے، مگر بالآخر تعلیم جیسی اہم وزارت کا بوجھ انہی کے کندھوں پر ہے۔

اپنے ہاں خبر سازی کا ایکٹ بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ تعلیم، صحت اور بنیادی ضرورتوں جیسے اہم مسائل پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور منظر پر گنڈا سے، نعرے، دھمکیاں، بڑھکیں اور اسی نوع کی دیگر چیزیں رہ جاتی ہیں۔ اگر کسی وزیر نے کسی علاقہ کا دورہ کیا تو وہاں ان کی وزارت سے متعلق بھی کچھ نہ کچھ سوال پوچھے جاتے ہیں، مگر جب خبر بنتی ہے تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے بیان اور باتوں میں اپنے مخالف سیاستدانوں کے بارے میں کس کس لہجے میں بات کی ہے، کس کو لکارا ہے، کس کو چیلنج کیا ہے، کس کو لتاڑا ہے، کس کی بات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے، اپنی باتوں کو کس طرح حق اور سچ کا اظہار قرار دیا ہے؟ وزیر کے متعلقہ محکمہ کی خبر نیچے کہیں دب جاتی ہے، بعض اوقات تو خبر کی ذیلی سرخیوں میں بھی ان کی وزارت کی باتوں کو جگہ نہیں ملتی، البتہ خبر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ان کی وزارت سے متعلق بھی کچھ باتیں لکھ دی جاتی ہیں۔ اس المیہ نے اس لئے جنم لیا کہ اپنے ہاں الیکٹرانک میڈیا کی دوڑ کی وجہ سے ریٹنگ کا معاملہ بھی بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے، ریٹنگ کے مقابلے میں بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے، بسا

اوقات پہچان انگیزی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات ایسا دکھایا جاتا ہے کہ سیاسی کارکنوں کی آپس میں خانہ جنگی ہونے کو ہی ہے۔

رانا مشہود خان ملتان گئے تو انہوں نے اپنے دورے کی تمام روایتی کارروائیاں مکمل کیں، انہوں نے محکمہ تعلیم کے افسران کے اجلاس کی صدارت کی اور معلومات حاصل کیں، وہ سکولوں میں بھی گئے اور وہاں میڈیا کی ہمراہی میں دورہ کیا، بچوں اور بچیوں سے سوال پوچھے، یقیناً وہ بچوں سے بے تکلف بھی ہوئے ہونگے۔ انہوں نے واٹر فلٹر پلانٹ کا افتتاح بھی کیا۔ اس تمام کچھ کے باوجود ان کی مصروفیات اور باتوں سے جو خبر میڈیا نے برآمد کی وہ اس قسم کی تھی ”عمران کو نئی دلہن مل گئی تو مارچ ختم ہو جائے گا... اپوزیشن ترقی کا راستہ روکنا چاہتی ہے... جنگ ہونے پر بھارت ٹوٹ جائے

گا...“۔ ان سرخیوں کے ساتھ خبر کی تفصیل بھی تھی، جس میں مندرجہ بالا جملوں کی تشریح کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ”... وزیر اعلیٰ شہباز شریف کے وٹن کے مطابق تعلیم کے بجٹ میں ریکارڈ اضافہ کر دیا گیا ہے، تاکہ کوئی بچہ سکول سے باہر رہ کر تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔ 36 ہزار کلاس رومز تعمیر کئے جارہے ہیں، شہر ہزار نئے اساتذہ بھرتی کئے جارہے ہیں، تاکہ ہر پرائمری سکول میں کم از کم چار ٹیچر موجود ہوں۔ پرائمری میں سکول آنے والی بچیوں کو دو سو کی بجائے ایک ہزار روپیہ ماہانہ دیا جائے گا...“۔

ہونا یہ چاہیے کہ وزیر

موصوف اپنے محکمے کی بات کو ترجیح دیں، نعروں اور دھمکیوں کی سیاست نہ کریں اور
میڈیا کا فرض ہے، کہ وہ تعلیم، صحت اور دیگر اہم ایشوز پر سیاسی نعروں کو ترجیح نہ دیں،
مگر کیا کیجئے کہ ایسا کرنے سے ریٹنگ ڈاؤن ہو جاتی ہے۔

اخبار نے اپنے آخری صفحہ پر ایک کالمی تصویر شائع کی ہے، جس میں ایک شخص بکھرے،
 الجھے اور بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ زمین پر بیٹھا ہے، اس کی دائرہ سفید ہے،
 گریبان کا بٹن کھلا ہوا ہے، اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی زنجیر سے گھٹنوں کو
 حصار میں لیا ہوا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ پر ہتھکڑی لگی ہوئی ہے اور اس کی نگاہیں دور
 کسی چیز کو گھور رہی ہیں، دراصل وہ خیالوں میں گم ہے، اپنے ماضی کو سوچ رہا ہے یا
 مستقبل کے مناظر میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شکل سے یہ کوئی جیب کترا لگتا
 ہے، یا پھر نشہ کا عادی شخص کہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا، یا کوئی مجبوظ الحواس کہ جسے
 پولیس نے کسی جرم کے کھاتے میں ڈال دیا۔ مگر یہ سارے اندازے غلط ہیں، یہ عام
 آدمی نہیں، یہ ایک بہت بڑا دہشت گرد ہے، کہ جس کے نام سے جنوبی پنجاب کے جاگیر
 دار اور سرمایہ دار کانپتے تھے، اس کے ایک اشارے پر اس کی مراد پوری کی جاتی تھی۔
 اس نے زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز تو عام آدمی کے طور پر کیا تھا مگر بہت جلد وہ راہ گم
 کر بیٹھا، ایسا بھٹکا کہ علاقے کا بد معاش بن گیا، پھر دنیا اسے 'چھوٹو' کے نام سے جاننے
 لگی، پھر وہ آگے بڑھتا گیا اور کارواں بنتا گیا۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھی بے
 شمار تھے، یوں چھوٹو گینگ معرض وجود میں آ گیا۔

چھوٹو کی کہانی دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر اخبار میں شائع ہونے والی تصویر بھی ایک کہانی ہے، یہ معاملہ بھی ایک داستان ہی ہے کہ وہ ڈاکو کیسے بنا؟ ایسی داستانیں معاشرے میں بکھری پڑی ہیں۔ ایسی کہانیوں پر فلمیں بنتی رہی ہیں۔ ایک ایسا فرد جو جنگل کا بادشاہ ہے، جنگل کے قانون کا قائل ہے، جنگل کی طرف اسے کیوں جانا پڑا؟ اس بات پر معاشرے کے دانشوروں کو سوچنا چاہیے، تھنک ٹینک اداروں اور افراد کو ایسے مشورے دیں، جن پر عمل کر کے معاشرے میں امن اور رواداری کو فروغ ملے، دوسروں کے احترام اور ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ ادیبوں کو ایسی کہانیاں ترتیب دینی چاہئیں، جن سے ایسے مسائل کو پیش نظر رکھا جائے، جو مسئلے یا برائی کو ابتداء میں ہی روکنے کا راستہ نکالیں۔ قانون ساز ادارے ایسے قوانین مرتب کریں جن کی روشنی میں دوسروں کا استحصال نہ کیا جائے۔ طاقت کا قانون نہ ہو، قانون کو ہاتھ میں لینے کا تصور نہ ہو، قانون کے احترام اور اس پر عمل کا رواج ہو۔ عجب بات ہے کہ کبھی جاگیر دار ظالم ہوتے ہیں اور غلام رسول (چھوٹو) جیسے لوگ مظلوم ہوتے ہیں، اور جب چھوٹو طاقتور بن جاتے ہیں تو پھر جاگیر دار مظلومیت کا روپ دھار لیتے ہیں، طاقت کا غلط استعمال ہی دراصل معاشرے میں عدم توازن پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جب طاقت کا توازن پولیس کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں ایک مرتبہ پھر یہی ڈاکو کسی حد تک مظلومیت کی ذیل میں

آ جاتے ہیں۔

طاقت کے غلط استعمال کا انجام بھی ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے، جس نے بھی اپنی طاقت کو ظلم کے لئے استعمال کیا وہ چھوٹو کی طرح خوار ہوا۔ تصویر میں وہ عبرت کی تصویر بنا بیٹھا ہے، اب وہ عدالتوں کے رحم و کرم پر ہے، اس نے نہ جانے کتنے بڑوں کو لوٹا ہوگا، قتل بھی کئے ہونگے، اس کی گینگ نے نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ گل کئے ہونگے۔

اس گینگ کے لگائے ہوئے زخم کب مندمل ہونگے؟ اب معاملہ عدالتوں میں ہے، پولیس مقابلوں کا کلچر بھی عام ہے، قاتلوں کو پھانسیاں بھی لگ رہی ہیں۔ وہ یقیناً اپنے انجام کو تو پہنچ جائے گا، مگر ان معاملات کا سد باب کب ہوگا؟ کون کرے گا؟ یقیناً ان بڑی معاشرتی برائیوں کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ سب سے پہلی درسگاہ تو بچے کا گھر ہے، بد قسمتی سے اپنے ہاں بہت ہی کم گھرایسے ہوتے ہیں، جہاں تربیت کا مناسب بندوبست کیا جا رہا ہو۔ تاہم کسی حد تک یہ کمی تعلیم پورا کرتی ہے، مگر المیہ یہی ہے کہ سکولوں میں بھی تربیت نام کی کوئی چیز کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اساتذہ کا معاملہ یہ ہے کہ بس پرانے اساتذہ کو یاد کر کے دل بہلایا جاتا ہے، ورنہ اب تو شفیق، محنتی اور دیانتدار اساتذہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اور رہ گئیں حکومتیں اور اس کے ادارے، وہاں تو ہر کوئی اپنی دھن میں مگن ہے، اپنے پیٹ

سے آگے اُن کو کچھ بچھائی نہیں دیتا۔ وسائل کی تقسیم غیر منصفانہ ہے۔ جب تک سوچ کی

کٹری بٹری پر نہیں چڑھے گی، منزل تک رسائی ممکن نہیں۔

ہمارا سکول گھر سے ڈھائی کلومیٹر دور تھا، ہمیں پیدل ہی دوسرے گاؤں (سکول) جانا ہوتا تھا، سکول گاؤں سے باہر تھا، سڑک اور چار دیواری چکی اور چھوٹی تھی۔ دور سے ہی استاد صاحبان اپنی اپنی سائیکل پر آتے دیکھے جاسکتے تھے۔ جو نہی استاد سکول کے گیٹ کے قریب پہنچتے، بہت سے لڑکے بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے، وہ اپنے استاد سے سائیکل وصول کرنے وہاں جاتے تھے، استاد سائیکل سے اتر جاتے اور جو لڑکا سائیکل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا وہ اسے سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کر آتا۔ یہ استاد کے احترام کی ایک جھلک تھی۔ اگر استاد پیدل چل رہے ہوتے تو کوئی طالب علم ان سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرتا۔ استاد کو سامنے سے آتا دیکھ کر راستہ بدل لیا جاتا تھا۔ احترام واجب تھا، خواہ ٹیچر کا تعلق کسی اور کلاس حتیٰ کہ کسی اور سکول سے ہی کیوں نہ ہو۔ ہم اب بھی اپنے پرانے اساتذہ سے ملتے ہیں تو احترام کا رشتہ اسی مضبوطی سے قائم ہے، اب جبکہ ہمیں تعلیمی اداروں سے فارغ ہوئے صدی بیت چکی ہے، (یا بدل چکی ہے) اب بھی کسی تعلیمی ادارے میں جانا ہوتا ہے تو استاد کی وہی عزت کرتے ہیں، جو اپنے زمانے میں کرتے تھے۔ خواہ ٹیچر خود ہماری عمر کے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ پرانے وقتوں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

دنیا میں تو کل ٹیچر کا عالمی دن منایا گیا تھا، مگر پاکستان میں اس دن کو ازراہ عقیدت و احترام ”سلام ٹیچر ڈے“ کہا جاتا ہے۔ اس سال بھی ہر سال کی طرح ہی یہ دن منایا گیا۔ بڑی، بڑی تقریبات منعقد کی گئیں، اساتذہ کو سلام پیش کیا گیا، ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا، انہیں شیلڈس دی گئیں، ان کی کارکردگی کو سراہا گیا۔ اچھا ہے، چلیں سال بھر میں ایک روز ہی سہی عالمی سطح پر استاد کی قدر تو پہچانی جاتی ہے۔ بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں استاد کے احترام کی مثالیں دی جاتی ہیں، استاد کو دوسرے لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہے، سڑک ہو یا دفتر، مارکیٹ ہو یا عدالت، ہر جگہ پر استاد کو فوقیت حاصل ہے، سرکاری سطح پر استاد محترم ہے۔ اپنے ہاں بھی استاد کا احترام موجود ہے، مگر سرکاری یا قومی سطح پر نہیں، انفرادی یا ذاتی لحاظ سے۔

استاد کے احترام کے کچھ تقاضے ہیں، تعلیم کے حصول اور ترقی کے سفر پر کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے استاد کا احترام لازم و ملزوم ہے۔ احترام کیسے کیا جائے؟ یا کیسے کروایا جائے؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اب جبکہ ہر طرف ان تقاضوں پر روشنی ڈالنے کے لئے تقریبات منعقد ہو رہی ہیں اور اس ضرورت کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ استاد کا احترام کس قدر ضروری ہے۔ دوسری طرف اسی قسم کی محافل میں اساتذہ کے بارے میں ناقابل برداشت زبان

استعمال کی جاتی ہے، انہیں بہت بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے، جس سے نہ صرف ان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے، بلکہ دوسروں کے سامنے ان کی اہمیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر یہ بے عزتی پروگرام بہت تسلسل سے جاری رہتا ہے۔ ایک اعلیٰ ضلعی انتظامی افسر سے لے کر محکمہ تعلیم کے افسر تک، سب ہی استاد کو ڈانٹ کر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا بھی منواتے ہیں اور اپنے کئے پر خوش بھی ہوتے ہیں۔ ایسے پروگرام اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں، محکمہ تعلیم کے افسران کی تو سمجھ آتی ہے، مگر عام انتظامی افسران کا معاملہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور کھینچاتانی کا یہ سلسلہ مستقل جاری رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے (اور عام حالات میں دکھائی بھی یہی دیتا ہے) کہ استاد دلجمعی سے کام نہیں کرتے، بچوں کی تعلیم اور پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اپنے ادارے سے ہٹ کر انہیں اکیڈمیوں اور ٹیوشن وغیرہ کی زیادہ فکر لاحق رہتی ہے۔ سرکاری سکولوں میں اساتذہ کی آپس کی لڑائی ختم نہیں ہوتی، اور جب دو چار اساتذہ آپس میں الجھتے ہیں، یا ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار یا اہتمام کرتے ہیں، تو ان کے پاس طلبا کو پڑھانے کے لئے کیا وقت بچے گا۔ جب جواز تلاش کرنے کی مہم جوئی ہوتی ہے، تو ہزار بہانے تراشے جاتے ہیں۔ اساتذہ کو شکایت ہے کہ ان سے ”غیر نصابی“ کام نہ لئے جائیں، ان سے مردم شماری نہ کروائی جائے، ان کی الیکشن میں ڈیوٹی نہ لی جائے، انہیں سیلاب زدگان کے حساب کے لئے نہ بھیجا جائے، ان کے ذمہ گندم کے بارदान کا حساب نہ لگایا جائے۔ جیسے

بھی ہوا، احترام بہت کم ہو چکا ہے۔ اب محض تقریبات سے یہ کمی پوری ہونے والی

نہیں، اساتذہ کو اپنے کردار کی روشنی میں اپنے احترام میں اضافہ کرنا ہوگا۔

ہم ایک ہیں؟

ہمارے سیاسی رہنما قومی معاملات پر کس قدر سنجیدہ ہیں، انہیں ملک کے اندر اور باہر کے حالات کی کتنی فکر ہے، ان کے دل میں ملک و قوم کی بہتری کا کتنا درد ہے؟ ان باتوں کا اندازہ لگانے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں، بس گزشتہ روز کے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کی روداد پڑھ لیجئے۔ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے، قیادتوں کی بلند پروازی اور بلند نگاہی دیکھنے کو مل جائے گی۔ پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس عام حالات میں منعقد نہیں ہوتا، قومی سطح کا کوئی اہم ایشوز پر بحث ہو تو دونوں ایوان اکٹھے ہوتے ہیں۔ آئین کی رو سے سال میں ایک مرتبہ یہ اجلاس صدارتی خطبہ سننے کے لئے بلایا جاتا ہے، ورنہ ہنگامی حالات میں اس کا انعقاد ہوتا ہے۔ جب اسلام آباد میں پی ٹی آئی نے دھرنا دیا تھا اور وہ طوالت اختیار کر گیا تھا تو حکومت نے مشترکہ اجلاس کا سہارا ہی لیا تھا، اس کا حکومت کو یہ فائدہ ہوا کہ اجلاس کو ڈھال بنا کر حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی، یہ اجلاس بہت دنوں تک جاری بھی رہا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ وزیراعظم میاں نواز بھی ایک طویل عرصے کے بعد ایوان میں تشریف لائے، اس کے بعد شاید وہ سال بھر میں پہلی مرتبہ ایوانِ بالا کے اجلاس میں بھی گئے۔ آج کل چونکہ کشمیر میں بھارتی مظالم جاری ہیں، اور سرحدوں پر بھی کسی حد تک کشیدگی بھی

موجود ہے، حتیٰ کہ کچھ گولہ باری ہو بھی چکی ہے۔ گولہ باری کے علاوہ ہمارے ٹی چینلز پر لفظوں کی جنگ جاری ہے۔ دوسری طرف عمران خان کی جانب سے مارچ در مارچ ہو رہے ہیں، ابھی رائے ونڈ یا ترا ہوئی ہے تو آنے والے دنوں میں اسلام آباد پر چڑھائی کا پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہے۔ حکومت نے گزشتہ دنوں اگرچہ پارلیمانی پارٹیوں کا اجلاس بھی وزیراعظم کی صدارت میں طلب کیا تھا، مگر معاملات پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بھی بلا لیا تھا۔

اجلاس بلایا تو کشمیر کے نام پر گیا تھا، مگر وہاں حسبِ روایت تقریری مقابلہ شروع ہو گیا، اگر بات مقابلے پر ختم ہو جاتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، کیونکہ ایسے بے شمار مواقع آتے ہیں، جب صرف تقریروں کا شوق ہی پورا کیا جاتا ہے۔ مگر جب بات ہو دوسروں پر کچھڑ اچھالنے کی، دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے کی، گڑے مُردے اکھاڑنے کی، الزامات لگانے اور دہرانے کی، دوسروں کو نیچا دکھانے کی، گویا جب مقصد ہی تبدیل ہو جائے تو پھر مطلوبہ نتیجے کی امید رکھنا بھولپن کی انتہا ہی کہلوائے گا۔ اعتراضِ احسن کو طویل تقریر کا بے حد شوق ہے، اور جب ان کو کسی بات پر ذاتی غصہ بھی ہو، تو ان کی تقریر میں ادبی چاشنی اور شعروں کا عمل دخل بھی ہو جاتا ہے۔ جب معاملہ کو بگاڑنا اور دوسرے سے انتقام لینا مقصود ہو تو الزامات کی بوچھاڑ بھی کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے مشترکہ اجلاس میں یہی کچھ کیا۔ کیونکہ گزشتہ دنوں وزیراعظم کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں وزیراعظم نے اُن سے بے رخی سے ہاتھ ملایا تھا، اندازہ تھا کہ اعتراضِ احسن موقع پاتے ہی جواب دیں گے، وہی ہوا، انہوں نے کہاں لیگ نے گالی گلوچ، بریگیڈ“ بھی بنا رکھی ہے۔ ان کو جواب دینے کے لئے ن لیگ کے مشاہد اللہ“ نے اپنی خدمات پیش کیں اور پانا مائیکس میں میاں نواز شریف کو بڑی کر دیا اور بے نظیر پر یہی الزام عائد کر دیا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اٹھارہ تو کیا سن اٹھائیں تک بھی پی پی کا وزیراعظم نہیں بنے گا، جواب میں پی پی والے جذباتی ہو گئے، خورشید شاہ نے اجلاس کے بائیکاٹ کی دھمکی دے دی اور کہا کہ آپ ایسی ہی باتیں کر لیں، ہم جاتے ہیں، باتیں ختم ہو جائیں تو ہم آجائیں گے۔ سپیکر اور وزراء نے مشکلوں سے انہیں ٹھنڈا کیا، مشاہد اللہ نے روایتی طور پر معذرت کر لی، یہی کام ان کے وزراء کو بھی کرنا پڑا۔ چند ماہ قبل انہی جناب نے وزیر ہوتے ہوئے فورسز کے خلاف بے جا باتیں کی تھیں، وزارت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے، معذرتیں الگ کرنا پڑیں، گویا معافیوں کے یہ پرانے عادی ہیں، یہی رویہ غیر سنجیدہ ہے۔ اسی اجلاس کا پی ٹی آئی نے بائیکاٹ کر رکھا تھا، اسے اس بات پر تنقید کا نشانہ بننا پڑا کہ کشمیر پر منعقد ہونے والے اجلاس میں ذاتی اختلافات کو ختم کر کے شامل ہونا چاہیے۔ اجلاس میں حکومت اور اپوزیشن کے ٹکراؤ پر پی ٹی آئی قائد خوش تھے۔ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کی کاروائی ہی دراصل ہمارے اجتماعی رویے کی عکاس ہے، اپنے

ملک پر اللہ کا کوئی خاص فضل ہی ہے، ورنہ ہمارے نما بخندوں اور سیاستدانوں نے اس کی
تباہی میں کوئی کمی نہیں چھوڑ رکھی۔

! گرمی اور ہماری ذمہ داریاں

موسم گرمی کا طویل روزہ رکھ کر سو گیا ہے، نہ پہلو بدل رہا ہے اور نہ ہی انگڑائی لے رہا ہے، ہر کسی کی نگاہیں موسم کے مزاج اور موڈ پر مرکوز ہیں، مگر موسم ہے کہ کسی کی سنسنے کے موڈ میں نہیں۔ کوئی وقت تھا جب اکتوبر کے آغاز میں موسم خوشگوار ہو جایا کرتا تھا اور درمیان تک کم از کم رات کے وقت تو سردی کا احساس ہونے لگتا تھا، مگر اب صورت یہ ہے کہ درجہ حرارت نیچے آنے کا نام نہیں لیتا۔ اس موسم میں گرمی کا تصور نہیں تھا، اس لئے مئی جون کی گرمی لُو والی اور خشک ہوتی تھی، جولائی اگست میں برسات اور جس کا دور ہوتا تھا، مگر یہ ستمبر اور اب اکتوبر والی گرمی میں جس بھی ہے اور دن کو تپش بھی۔ ویسے تو ہر موسم اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، اس لئے اسے قبول اور برداشت کرنا ہی پڑتا ہے، کہ اس کے بغیر چارہ کوئی نہیں۔ اسی طرح ہر کسی کی اپنی پسند ہے، کسی کو سردیاں اچھی لگتی ہیں تو کوئی گرمیوں سے خوش ہے، کوئی معتدل موسم کو اپنا آئیڈیل قرار دیتا ہے تو کوئی بہار کو۔ خزاں کے چاہنے والے بھی معاشرے میں ضرور ہونگے کہ پتہ جھڑ میں جب درختوں کی طویل قطار ہو اور راہیں گرے ہوئے پیلے پتوں سے اٹی پڑی ہوں، ایسا موسم شاعرانہ قسم کا ہوتا ہے۔ ادا سی کی منظر کشی اس ماحول سے بہتر کسی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔

گرمی کا زور کب ٹوٹے گا، کوئی نہیں جانتا، سائنس دان پریشان ہیں، دنیا میں گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے، جہاں ماحول برف سے ڈھکا رہتا تھا، وہاں بھی برف پگھلنے لگ گئی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں سردیاں سمٹی جا رہی ہیں۔ دنیا کو اس معاملے پر بہت سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں تو ایک عام آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ کون سے اقدامات ہیں جن پر عمل کرنے سے موسم کی شدت میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ اپنے ہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر موسم اور ہر قسم کی سطح زمین موجود ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں موسم بھی بہت زیادہ ہیں۔ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ موسم پر ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کی ضرورت ہے۔ اپنے ہاں کتنا پانی کروڑوں روپے کی فصلیں اور املاک تباہ کرتا ہوا دریا میں جا گرتا ہے، بہت سی قیمتی انسانی جانیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں اور مویشی بھی سیلاب کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ علاقوں میں خشک سالی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جنگلات کی کٹائی ایک اہم ایٹو ہے۔ مگر ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اپنے حکمرانوں، اپوزیشن اور دیگر سیاستدانوں کو دیکھیں تو ان سب کا خیال ہے کہ انہیں صرف سیاست ہی کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ڈیم بنانے کی بات آتی ہے تو بھی درمیان میں سیاست آچپکتی ہے، اور قوم جانتی ہے کہ کالا باغ

ڈیم پر اربوں روپے ضائع ہو چکے ہیں، مگر اس ڈیم کو ہمیشہ لاشوں اور ووٹوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کالا باغ ڈیم کو 'متنازع' قرار دے کر ایک طرف کر دیا جاتا ہے، مگر اور بھی تو بہت سے ڈیم بن سکتے ہیں، ان کے لئے کوئی خاطر خواہ تیاری دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے ملک میں جنگلات کی پہلے ہی بہت زیادہ کمی ہے، مگر جنگلات کو کاٹنے کی رفتار حد سے زیادہ ہے، ان میں بہت سے درخت تو سڑکوں وغیرہ کی تعمیر میں کاٹنے پڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ہاؤسنگ کالونیوں کی تعمیر کے ضمن میں بھی باغات اور درختوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ آبادی اس قدر بڑھ رہی ہے کہ اس کے سرچھپانے کے لئے جگہ چاہیے۔ ملک معاشی عدم توازن کا شکار ہے، جن کے پاس پیسہ ہے، بے حد ہے، جو غریب ہے، بہت زیادہ ہے۔ شہروں سے باہر کالونیاں کھمبیوں کی طرح اگ رہی ہیں، سبزے کی جگہ سنگ و خشت کی عمارتیں کھڑی ہیں۔ با وسیلہ لوگوں نے اپنی ضرورت کے لئے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے 'مشینیں' لگا رکھی ہیں، ان کے گھر، دفتر اور گاڑی میں اسے سی پلتے ہیں، جن سے ٹھنڈک اندر آتی اور گرمی باہر جاتی ہے۔ سڑکوں کے کناروں پر درخت نہیں رہے، گھروں میں درخت لگانے کی جگہ نہیں۔ مگر جس قدر ہو سکے ہمیں سبزہ اگانے کی کوشش کرنی چاہیے، حکومتی سطح پر شجرکاری کا اہتمام تو ہوتا ہے، مگر اس کو بہت کم ہی سنبھالا جاتا ہے، معاشرے کے تمام طبقات کا فرض ہے کہ وہ سبزہ اگانے اور گرمی بھگانے کی مہم میں بھرپور حصہ لیں، نیکی بھی حاصل کریں، اور گرمی کی شدت میں بھی کمی ہو، آموں کے آم، گھلیوں کے

4

4

4

! پارٹی الیکشن اور شیر

کون کہتا ہے کہ الیکشن کمیشن آف پاکستان آزاد اور خود مختار نہیں؟ آزادی کی تازہ خبر ملاحظہ فرمائیے کہ کمیشن نے پاکستان کی حکمران جماعت کو انتخابی نشان الاٹ کرنے سے انکار کر دیا ہے، وجہ اس انکار کی یہ ہوئی کہ کمیشن کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہر سیاسی جماعت دیگر امور کے علاوہ اپنی پارٹی کے اندر عہدیداروں کے انتخابات کے نتائج پیش کرنے کی پابند ہے، پارٹی کے اندر الیکشن کیسے ہوا، الیکشن کس کی نگرانی میں ہوا، اور کون لوگ عہدوں پر منتخب کئے گئے؟ الیکشن کمیشن کے اس انکار کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ضمنی الیکشن بہت قریب ہوتا تو ن لیگ کے امیدوار کو 'شیر' کے نشان سے محروم رہنا پڑتا۔ اگرچہ حکومتی پارٹی کے امیدوار کی شکست کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، مگر خیریت یوں بھی گزری کہ کوئی ضمنی الیکشن قریب بھی نہ تھا۔ الیکشن کمیشن کے یوں کباب میں ہڈی بننے کے بعد پارٹی قیادت اور قریبی مشیروں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ پارٹی میں الیکشن کروا ہی لئے جائیں۔

ویسے تو یہ اپنی جمہوریت کا المیہ ہے، مگر دل کے خوش رکھنے کو اگر اسے

جمہوریت کا لحسن بھی قرار دے لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، کہ پاکستان میں جمہوریت کی علمبردار سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوریت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تو ستم ظریفی کی انتہا اس وقت بھی ہو جاتی ہے، جب فوجی حکمران بھی خود کو جمہوریت کے چمپین قرار دینے پر مُصر ہوتے ہیں۔ پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت کو دیکھ لیں، پارٹی کی ذاتی جاگیر یا وراثتی جائیداد سے زیادہ کی حیثیت نہیں۔ حکومتی پارٹی ایک شخص کے نام پر ہے، گویا وہ اس کا مالک ہے۔ پی پی کو دیکھ لیں، وراثت کی طرح ایک ہی خاندان میں تقسیم ہو رہی ہے، پہلے وراثت بیٹی کو منتقل ہوئی، پھر معاملہ داماد کے ہاتھ میں چلا گیا اور اب سیاست میں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے نواسے کی ذات ہی تبدیل کر دی گئی۔ تاہم پارٹی کا اندرونی معاملہ جانتے ہوئے اسے سب نے قبول کر لیا، مالکوں کی مرضی وہ اپنا جو بھی نام رکھیں۔ پی ٹی آئی میں پارٹی کے بانی ہی پارٹی کے سربراہ ہیں، مگر ان کے بغیر نہ پارٹی کی پوزیشن دکھائی دیتی ہے، نہ اس میں کسی کی دلچسپی، اور نہ ہی ان کے ہوتے کسی اور کی مجال ہے کہ وہ چیئرمین بن کر دکھائے۔ اسے این پی، جے یو آئی اور دیگر جماعتوں کا بھی یہی عالم ہے۔ ایم کیو ایم کی چند روز قبل تک یہی کہانی تھی، اب بھی یار لوگوں کو یقین نہیں آ رہا کہ پارٹی سے اس کے بانی کا نام مائنس کر دیا گیا ہے۔ رہ سہہ کر جماعت اسلامی ہی ایک پارٹی بچتی ہے، جس کے اندر حقیقی جمہوریت ہے، یہ تلخ حقیقت مخالفین کو بھی تسلیم کرنا پڑتی ہے۔

حکومتی پارٹی کا تو کیا ہی کہنا کہ جس کا نام بھی ایک شخصیت کے نام پر ہے، گویا مسلم لیگ ن کی اگر ”ن“ ختم کر دی جائے تو پارٹی کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلم لیگ ’ن‘ ہے تو پھر اس میں الیکشن کا کیا کام؟ اور اگر الیکشن کمیشن کے کہنے پر پارٹی میں الیکشن ہو بھی جائیں گے تو وہ محض کاغذی کارروائی ہوگی، کمیشن کی بلا سے کاغذی کارروائی ہو، یا حقیقی، بس رپورٹ ہونی چاہیے، مجبوراً پارٹی نے رپورٹ تیار کرنے کا بندوبست شروع کر دیا ہے، چند روز بعد ہی عالمہ کا اجلاس طلب کر لیا گیا ہے، جس میں الیکشن کمیشن کی طرف سے ڈالی گئی ’پھٹیکٹ‘ سے نمٹنے کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ تقریریں ہوگی، تھوڑی بہت سنی جائیں گی، زیادہ تر کہی جائیں گی، گونگوؤں سے مٹی جھاڑنے کے طریقے زیر بحث لائے جائیں گے، الیکشن کی تاریخ مقرر ہو جائے گی، اور قوم کے سامنے یہ بڑی خبر بھی جلد ہی آجائے گی کہ جناب میاں محمد نواز شریف کو پاکستان مسلم لیگ ن کا صدر منتخب کر لیا گیا ہے، اسی طرح پنجاب میں بھی بہت ہی شفاف الیکشن کے نتیجہ میں جناب میاں محمد شہباز شریف صوبے کے صدر منتخب ہو گئے ہیں، بعد ازاں مبارکبادوں کے پیغامات ہو گئے، خوشی اور شادمانی کی لہر پوری پارٹی میں دوڑ جائے گی اور قانونی ماہرین کی طرف سے تیار کی گئی رپورٹ الیکشن کمیشن آف پاکستان کو پیش کر دی جائے گی، جس کے بعد وہ پارٹی مذکور کو شیر کا انتخابی نشان الاٹ کرنے کا پابند ہو جائے گا۔

اسی قسم کے پارٹی انکیشن کی وجہ سے ہی کسی پارٹی عہدیدار کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے قائد کے بارے میں ایک جملہ بھی ادا کر سکے۔ اسی لئے اس قسم کے قائدین ملک کو اپنی پارٹی کے طریقے سے چلانے کے عادی ہیں۔

نتیجہ غیر متوقع نہیں، تعلیمی بورڈز کے سابقہ نتائج کو دیکھتے ہوئے یہی امید تھی کہ ایک روز آئے گا، جب طلباء و طالبات کے حاصل کردہ نمبر کل نمبروں سے بھی آگے نکل جائیں گے۔ بہت زیادہ نمبر لینے کا رجحان جس رفتار سے ترقی کی منزلیں پھلانگتا جا رہا ہے، اس سے اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ منزلیں عبور کرنے کا وقت قریب ہے۔ تعلیمی بورڈز نے اپنے انٹر میڈیٹ کے پارٹ فرسٹ کے نتائج میں کچھ طلباء کو کل سے بھی زیادہ نمبر دے کر توقعات کے عین مطابق کام کیا ہے۔ جب اصل سے بھی زیادہ نمبر دینے کی بات میڈیا کے ہتھے چڑھی تو ان طلباء و طالبات کو احتجاج کا موقع مل گیا جن کے نمبر کم آئے تھے، ان کا احتجاج اس لئے بھی حق بجانب تھا کہ اگر کسی کے نمبر غلطی سے بڑھ سکتے ہیں تو کسی کے غلطی سے کم بھی تو ہو سکتے ہیں۔ یوں ایک احتجاج کا ماحول بن گیا، معاملہ صرف ایک بورڈ کا ہی نہ ہوا، لاہور، فیصل آباد، گوجرانوالہ، بہاول پور اور ملتان بورڈز کے ان کارناموں پر پنجاب کے بہت سے شہروں میں احتجاج کیا گیا۔ لیہ میں ایک صدمہ یہ بھی ہو گیا کہ نجی کالج کا طالب علم فرحان فزکس اور انگلش میں فیل ہونے کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے زہریلی گولیاں کھا کر ملکِ عدم سدھار گیا۔

بورڈز کے صدر دروازوں پر طلباء کے احتجاج اور اشتعال کی وجہ وہی سٹوڈنٹس بنے جن کے نمبر کم تھے، ان کا مطالبہ تھا کہ ری چیکنگ کی جائے، عام حالات میں ری چیکنگ کی فیس وصول کی جاتی ہے، کیونکہ بورڈز نے فنڈز حاصل کرنے کے لئے دسیوں قسم کی مددات بنا رکھی ہیں، طلباء سے فنڈز وصول کر کے اپنی مراعات کا بندوبست کیا جاتا ہے، بہت سی حکومتی خدمات بھی بورڈز کے فنڈز سے پوری کی جاتی ہیں، بورڈز کے حکام کے بہت سے سیر سپاٹا پروگرام کی رقم بھی ظاہر ہے انہی امیدواروں سے کشید کی جاتی ہے۔ اب جبکہ بورڈز خود قصور وار تھے، ری چیکنگ کا مطالبہ فوری طور پر تسلیم کر لیا گیا اور مشتعل طلباء کو ٹھنڈا کرنے کا مزید اہتمام یہ کیا کہ ری چیکنگ کی کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔ یقیناً ان میں بہت سے طلباء ایسے بھی ہونگے جنہیں علم ہوگا کہ وہ پاس نہیں ہو رہے، مگر بورڈ والوں کو تنگ کرنے کے لئے انہوں نے بھی اپنا نام ری چیکنگ میں لکھوا دیا۔ کیا جاننے کہ یہ لطیفہ بھی سامنے آ جائے کہ جن طلباء کے نمبر سرحدیں عبور کر گئے تھے، اصل نتیجہ آنے پر ان میں سے کوئی فیل قرار دیا جائے۔ بورڈز کے حکام کا کہنا ہے کہ ہمارے پیپر دوسرے بورڈز کو بھیجے جاتے ہیں، وہاں سے ہی نمبر لگ کر آتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کمپیوٹر کی غلطی سے ایسا ہوا، ظاہر ہے اس قدر وسیع پیمانے پر اہتمام ہوتا ہے، سوفٹ ویئر کی کوئی خرابی بھی ہو سکتی ہے۔ سب کچھ ممکن ہے، مگر کیا اتنے اہم کام کی ذمہ داری صرف کمپیوٹر پر ڈال کر جان خلاصی کروائی جاسکتی ہے۔

رزٹ تیار ہونے کے بعد کیا آخر میں رزٹ کی فائل ری چیکنگ نہیں ہونی چاہیے؟ غلطیاں تو انسان سے ہی ہوتی ہیں، مگر احتیاط کا دامن تو تھام کے رکھنا چاہیے۔ اگر کمپیوٹر کی غلطی سے کوئی فیل ہو گیا اور اس نے مایوس ہو کر خود کشی کر لی، تو کمپیوٹر کو کیا سزا دی جائے گی؟ کتنی قید اور کتنا جرمانہ ہوگا؟ یا پھر پھانسی بھی ہو سکتی ہے؟ بورڈز کے حالیہ رزٹ پر جگہ ہنسائی ہوئی۔ بہاول پور بورڈ کے چیئرمین نے پانچ اہلکاروں کو معطل کر کے گو لگوؤں سے مٹی جھانڈنے کا بندوبست بھی کر دیا۔

اپنے تعلیمی نظام میں زیادہ نمبر حاصل کرنے کا رجحان ہیجان انگیزی تک پہنچ چکا ہے۔ تعلیمی ادارے اپنی تشہیر کا ذریعہ اپنی حاصل شدہ پوزیشنز کو ہی بناتے ہیں۔ بہت سے ادارے ایسے ہیں جو بہت ہی ذہین طلباء و طالبات کو مفت داخلہ دیتے اور بعد میں ان کے نتیجہ سے مزید داخلے حاصل کرتے ہیں، اپنے اداروں کو چار چاند لگاتے ہیں۔ یوں نمبر حاصل کرنے والی مشینوں کا ماحول بنا ہوا ہے۔ جبکہ سٹوڈنٹس میں تربیت کا فقدان ہے، ان میں معلومات عامہ کی کمی ہے، حتیٰ کہ ان مقابلوں میں شریک ہونے والے عام ادارے صرف محدود پیمانے پر ہی مطالعہ کرواتے (بلکہ رٹنا لگواتے) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت نہم کے گزشتہ امتحانات میں پنجاب بھر سے دو بچیوں نے 505 میں سے نمبر حاصل کر کے ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ 504 آنے والے دنوں

میں بچے اصل نمبروں سے زیادہ لیا کریں گے، علم ہو نہ ہو نمبر البتہ بہت ہونگے۔

پنجاب اسمبلی نے ایکٹ قرار داد منظور کی ہے، جس کے مطابق صوبے کے تمام اضلاع میں یونیورسٹی بنائی جائے گی، یا یونیورسٹی کیمپس قائم کیا جائے گا۔ یہ قرار داد بہاول پور سے ممبر اسمبلی ڈاکٹر سید وسیم اختر نے پیش کی، جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ ہائر ایجوکیشن کے لئے حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتیں بہت گہری توجہ دے رہی ہیں۔ میٹرک کے بعد کے طلباء و طالبات میں لاکھوں لیپ ٹاپ تقسیم ہو رہے ہیں، مختلف امتحانوں میں پوزیشن لینے والوں کو گارڈ آف آنر دیئے جا رہے ہیں، انہیں مری وغیرہ کے سیر سپاٹے کے علاوہ بیرونی ممالک کے تفریحی دورے پر بھی بھیجا جاتا ہے۔ جامعات قائم کی جا رہی ہیں، پی ایچ ڈی کے امیدوار اپنے مقالہ جات اور ڈگریوں کے ساتھ میدان میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے جانے والوں کو وظائف دیئے جا رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں کی عالیشان عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ حکومتوں کا یہ جذبہ قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے، تعلیم کے فروغ اور ترقی کے لئے کی جانے والی کوششوں کو سراہا جانا ضروری ہے۔

ہماری حکومتوں کی کاوشیں جاری رہتی ہیں، شاید اس میں خواہشیں بھی شامل ہو

گئی، دعوے اور نعرے بھی لگتے رہتے ہیں، اور اپنے کاموں کی تشہیر کا کوئی موقع جانے نہیں دیا جاتا، مگر سب کچھ کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اپنے ہاں اعلیٰ تعلیم کے مواقع پورے بھی نہیں، اور جہاں موجود ہیں، وہاں معیاری تعلیم کا فقدان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جامعات کی عالمی درجہ بندی کی جاتی ہے تو بد قسمتی سے پہلی پانچ سو یونیورسٹیوں میں پاکستان کا نام شامل نہیں ہوتا، دور کیا جائے، کہ اسی برس ہونے والی درجہ بندی میں پہلی پانچ سو میں کوئی یونیورسٹی نہیں آ سکی۔ جبکہ چھ سو سے آٹھ سو میں سات جامعات کے نام آئے ہیں۔ اس درجہ بندی میں ظاہر ہے بہت سے اشارات طے ہوتے ہیں، جن میں تحقیق، اساتذہ کی کوالی فیکیشن، کیمنپسز کی صورت حال، نتائج، عالمی معیار کے نصاب کا معاملہ اور بھی بہت سی باتیں آتی ہوں گی، مگر اپنے ہاں مکھی پر مکھی مارنے کا رجحان ہے۔ نہ نئی تحقیق، نہ نئی ایجاد، اساتذہ کی اکثریت علم و فضل سے محروم۔ اس ماحول میں معیار کہاں سے آئے گا؟ اساتذہ خود بھی رٹے رٹائے انداز میں لپکھ دیتے ہیں، بلکہ اب تو لپکھ کی پیشکش کی جاتی ہے، زبان اور دماغ کا استعمال کم اور کمپیوٹر کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ سوال کرنے کی عادت ہمارے طلباء نے پالی نہیں، اور اگر کوئی سوال کر دے تو اکثر اساتذہ کو اچھا نہیں لگتا۔ تعلیمی زوال کی ایک وجہ ہمارا پرائمری نظام تعلیم بھی ہے، جہاں ابھی تک

ایک ایک صوبے میں لاکھوں بچے اور ایک ایک ضلع میں پچاسیوں ہزار بچے سکول جانے سے محروم ہیں۔ حکومت کے دعووں کو دیکھیں تو تعلیم کا سلسلہ آسمانوں کو چھو رہا ہے، زمینی حقائق کو دیکھیں تو لاکھوں بچوں کو سڑکوں اور کام کی جگہوں پر دیکھ کر حکومتی دعوے کرناک مذاق نظر آتے ہیں۔ جو بچے سکولوں میں جا رہے ہیں، وہ کس قدر معیاری تعلیم سے روشناس ہو رہے ہیں، یہ بات بھی سب پر آشکار ہے۔ سکولوں میں سہولتوں کے فقدان کا چرچا تو چار سو ہے، معیارِ تعلیم بھی بہت کم ہے۔ سرکاری سکول جو کبھی معیار کی علامت اور ضمانت سمجھے جاتے تھے، اب ان کا نام مذاق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اساتذہ کے پاس بھی بہت سے جواب اور جواز بھی موجود ہیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ تعلیم کے زوال میں حکومتوں کے ساتھ اساتذہ کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ یہ قصہ تو طویل ہے، اب نئی قرار داد آئی ہے تو خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے، اضلاع میں یونیورسٹیوں کی واقعی اور سخت ضرورت ہے، ان کے نہ ہونے سے طلباء و طالبات کو دور دراز کا سفر کر کے بڑے شہروں میں جانا پڑتا تھا، جہاں ان کے اخراجات بھی بے شمار ہوتے تھے، تعلیم ویسے بھی انصاف کی طرح دہلیز پر، فوری اور ضرور ملنی چاہیے۔ مگر جہاں لاکھوں بچے سکولوں سے باہر ہوں، جہاں سرکاری سکول موشیوں کے باڑوں کا روپ دھارے ہوئے ہوں اور جہاں حکومتوں کے دعوے شرح تعلیم سو فیصد اور مفت کرنے کے ہوں، وہاں پمپلی ضرورت پر انمیری تعلیم پر توجہ دینے کی ہونی چاہیے۔ اگر ہر ضلع میں یونیورسٹی بن جائے تو بہت اچھا ہے، مگر

ہر بستی میں پرائمری سکول کا ہونا اس سے بھی ضروری ہے۔ امید ہے ایسی بھی کوئی قرار
داد جلد آئے گی۔

عوام ابھی اس خوشخبری سے لطف اندوز ہی ہو رہے تھے، کہ ایک اور نسبتاً کم درجہ کی خوشخبری آ پہنچی۔ ابھی وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے پاکستان مسلم لیگ ن کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہونے کی خبر کی روشنائی خشک نہ ہوئی تھی، کہ برادرِ خورد، خادمِ اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی بھی ایسی ہی خبر منظرِ عام پر آ گئی، کہ وہ بھی پنجاب کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے ہیں، اس خبر کے ساتھ ہی ایک تیسری خبر یہ سامنے آئی کہ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الہی بھی اپنی پارٹی کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے ہیں، صفحہ آخر پر ایک اور خبر پر نگاہ پڑی، جس میں بتایا گیا تھا کہ بیرسٹر وسیم الحسن جمیعتِ علمائے پاکستان پنجاب کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ ان تمام لوگوں کے مقابلہ میں اول تو کسی صاحب نے آنے کی کوشش ہی نہیں کی، اگر آ بھی گئے تو کاغذات واپس لے لئے، اگر نہیں لئے تو انہیں ووٹ کوئی نہیں ملا۔ ان میں سے کسی پارٹی کے بھی کسی رکن کی یہ مجال نہیں کہ پارٹی کے طے شدہ منصوبہ بندی کے خلاف کاغذ جمع کروائے، یا آپس میں بھی رائے لی جائے، جو فیصلہ ’اوپر‘ سے ہوگا، اسی پر عمل کرنا پڑے گا۔

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کی کہانی خاندانوں سے باہر نہیں نکلتی۔ وزیراعظم کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما ہے کہ پارٹی ان کی ذاتی جاگیر ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہو کہ پارٹی خود وزیراعظم کے نام پر ہے۔ نام پر پارٹی بنانے کا مطلب یہی ہے کہ کوئی دوسرا اُس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ جو رہنمایا کارکن ایسی پارٹی کا حصہ ہیں، وہ اول دن سے ہی یہ سوچ کر وہاں آئے ہیں کہ فلاں صاحب کی قیادت میں ہی سفر کرنا ہے۔ یہ بات بھی آئینے کی طرح عیاں ہے کہ پارٹیوں میں مشاورت برائے نام ہی ہوتی ہے۔ ایسا بھی حکومت ملنے کی صورت میں کرنا پڑتا ہے، اگر پارٹی اپوزیشن میں ہے تو مشاورت کی زیادہ ضرورت ہی نہیں۔ موجودہ حکومتی پارٹی کا تو ماضی بھی گواہ ہے کہ یہ مشورہ وغیرہ لینے کو زیادہ مناسب خیال نہیں کرتے، حتیٰ کہ جب جناب نواز شریف پہلی مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے تو اُن کی حکومت اتحاد کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی، مگر چند ہی ماہ میں انہوں نے اتحاد کے اجلاس بلانا اور اتحادیوں سے مشاورت کرنا بھی ترک کر دیا۔ پارٹی میں بھی ان کے چند ہی خاص لوگ ہیں جن سے شاید وہ مشورہ کرتے ہوں۔ مشاورت کی ضرورت وہاں ہوتی ہے، جہاں کسی کو کوئی اہمیت دی جائے، جہاں بادشاہت ہو وہاں باقی لوگ رعایا کی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔

پاکستان میں تمام سیاسی جماعتیں ذاتی جاگیر یا ذاتی کاروبار سے زیادہ کی

حیثیت نہیں رکھتیں۔ اب الیکشن کمیشن کی کاغذی کارروائیوں کی تکمیل کے لئے پارٹیوں کے الیکشن ضروری ہو گئے تھے، ورنہ الیکشن میں نشان بھی الاٹ نہ ہوتا اور ممکن ہے پارٹی کے نام پر الیکشن لڑنے پر بھی پابندی لگا دی جاتی۔ الیکشن کمیشن کو بھی اچھی طرح خبر ہے کہ یہ الیکشن فائلوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کروا دیئے جاتے ہیں۔ پارٹیوں نے ستم تو یہ کیا کہ ’بلا مقابلہ‘ ہی اپنے صدور منتخب کروا لئے، وہ چاہتے تو افسانے کو کچھ رنگ دیا جاسکتا تھا، اور پارٹی کے اندر ہی ایک آدھ امیدوار کو آگے آنے دیتے، انتخاب کا ماحول جاندار بن جاتا۔ مگر بات وہی بادشاہت کی آ جاتی ہے، بلا مقابلہ کا بھی اپنا ہی مزہ ہے، کسی کی اہمیت اس قدر ہو جائے کہ کوئی مقابلے میں آنے کی ہمت ہی نہ کرے، یا احترام اس قدر ہو کہ کوئی مقابلے کے لئے سامنے ہی نہ آئے۔ لیکن اپنے ہاں پارٹیوں میں الیکشن صرف الیکشن کمیشن کو مطمئن کرنے کے لئے کروائے جاتے ہیں۔ غریبیوں پر امیدواروں کی کارروائی ڈال دی اور چھوٹی سیٹوں پر نامزدگیاں کر دیں، یوں پارٹی کے اندر الیکشن کے تمام مراحل خوش اسلوبی اور ملی بھگت سے ادا ہو جاتے ہیں۔ اگر تحریک انصاف نے کچھ عرصہ قبل انٹرا پارٹی الیکشن کروانے کی کوشش کی تھی تو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، یہی کام اگر مسلم لیگ ن یا اسی قسم کی کوئی اور پارٹی بھی مقامی سطح پر کرے گی تو یہی حشر ہوگا۔ مگر مرکزی سطح پر ہونے والے الیکشن میں تحریک انصاف ہو یا مسلم لیگ ن اور یا پھر پیپلز پارٹی، سب کا انتخابی نظام اور نتیجہ ایک

جیسا ہی ہوتا ہے، کہ جو پارٹی کا مالک ہے وہی صدر بنے گا۔ اس کے ساتھ کسی کا مقابلہ
نہیں، وہ بلا مقابلہ ہی کامیاب ہوگا۔

پُٹھٹی ہونے میں کچھ دیر تھی، نیم سرکاری سکول کے باہر بچوں کو لینے والوں کا رش تھا، گاڑیاں، موٹر سائیکل، رکشوں وغیرہ پر لوگ بچوں کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ سکول کی بیرونی سیڑھی پر سات برس کی ایک بچی بیٹھی تھی، گوری رنگت، نیلی آنکھیں، سادہ سا لباس۔ اس کے پاس ہی کھجور کے پتوں کی بنی ایک ٹوکری پڑی تھی، جس میں کچھ ٹافیاں تھیں، جو اُس نے سکول کے بچوں کو فروخت کرنے کے لئے رکھی تھیں۔ انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لئے وہ کاپی کے پھٹے ہوئے کاغذ پر سینسل سے کوئی تصویر بنا رہی تھی، شاید اسے لکھنا نہیں آتا تھا، ورنہ ممکن ہے وہ کچھ لکھ رہی ہوتی۔

کیمرے کی آنکھ نے یہ تصویر محفوظ کر لی۔ تصویر اخبار میں شائع ہونے کے بعد رپورٹر نے تحقیق کی، کوشش بسیار کے بعد وہ بچی کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ دو بہنیں تھیں، دوسری اس سے چھوٹی تھی، ان کا والد کسی موبائل کمپنی کے ٹاور پر گارڈ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا اور معمولی تنخواہ لیتا تھا۔ بچیوں کی والدہ بیمار تھی، جس کی دوائی کے اخراجات پورے کرنا بھی گھر والوں کے لئے ایک مسئلہ تھا۔ بچیوں سے بات چیت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کی خواہش ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں، اُن کے والد سے گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ اس کی اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں۔

رپورٹر نے سنویری اخبار کو بھیجی، اخبار نے معقول کوریج دی۔ تیسرے ہی روز تیسرے ڈیوٹن سے ایک فون رپورٹر کو آیا۔ فون کرنے والے کا کہنا تھا کہ وہ بچی کی تعلیم کے تمام اخراجات اٹھانے کو تیار ہے، جس میں تعلیمی اخراجات کے علاوہ بھی اس بچی کا جو خرچہ ہو وہ بھی ادا کیا جائے گا۔ اچھے سے اچھے سکول میں پڑھانے کی آفر موجود تھی۔ حتیٰ کہ تمام اخراجات کا تخمینہ لگا کر سال بھر کی پیسگی رقم جمع کروانے کا بھی کہا گیا تھا۔ تاہم ایک شرط تھی کہ بچی کے نام کا ہی اکاؤنٹ ہو۔ رپورٹر دوبارہ اس بچی کے والد کے پاس پہنچا، اسے پوری روداد سنائی، اسے بچی کے مستقبل اور غائبانہ صاحب خیر کے جذبات سے آگاہ کیا، اس انداز سے ماحول بنایا کہ والد کی انا بھی مجروح نہ ہو، وہ کوئی وزن یا احسان بھی محسوس نہ کرے، کیونکہ مدد کرنے والے نے غیر مشروط مدد کا اعلان کیا تھا، صرف ایک ہی شرط تھی کہ بچی پڑھ جائے۔ رپورٹر نے اپنی کہانی سنائی اور بچی کے والد کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ والد کا جواب پاکستانی معاشرے کے مجموعی رویے کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ جواب سن کر رپورٹر کی آنکھوں میں چمکنے والے ستارے بھج گئے، اس کی امیدوں کا محل ریت کی دیوار کی طرح بکھر گیا، اُس کا کیا تھا، وہ تو ایک پل کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا، وہ تو مدد کا ایک ذریعہ بننا چاہتا تھا۔

بچی کے والد کا جواب جس طرح رپورٹر کی سماعتوں پر بجلی بن کر گرا، جن صاحب نے مدد کی آفر کی تھی، اُن کے لئے اور بھی تکلیف دہ بات تھی، جو شخص غیر مشروط اور کھلی مدد کے لئے تیار ہو، اُس پر کیا گزری ہوگی؟ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے۔ بچی کے والد نے کہا کہ ”ہم غریب لوگ ہیں، بچی کو پڑھا کر ہم نے کیا کرنا ہے، یہ تو پرایا دھن ہے، ٹافیاں وغیرہ فروخت کر کے چار پیسے کمالاتی ہے، ہمیں گھر کی ضرورت ہے، اگر کسی نے مدد کرنی ہے، تو ہمارا گھر بنوادے اور میری بیوی کے علاج کا خرچہ دے دے...“

رپورٹر چونکہ رابطے کا ہی ذریعہ تھا، وہیں کھڑے کھڑے صاحب دل شخص کو فون ملایا، بچی کے والد کے جوابات سے آگاہ کیا۔ اُن صاحب نے اپنی آفر یہ کہہ کر واپس لے لی کہ میں تو صرف بچی کو پڑھانے پر خرچ کر سکتا ہوں، وہ جتنا بھی ہو جائے، کسی اور مدد میں نہیں۔ یہ پوری دیگ سے ایک چاول کی مثال ہے، اپنے ہاں پاکستان بھر میں کروڑوں بچے سکولوں سے باہر ہیں، کوئی ہوٹلوں، دکانوں اور گھروں میں مزدوری کر رہے ہیں، کوئی ورکشاپوں، حجام کی دکانوں یا دیگر کام سیکھ رہے ہیں، کوئی آوارہ گردی کر کے زندگی کو تاریکی کے غاروں میں دھکیل رہے ہیں، جو بعد میں جرم اور نشہ کی زندگی کی طرف پلٹ جاتے ہیں، کوئی بھیک مانگ رہے ہیں۔ معاشرے کے لئے ناسور بن جانے والے یہ کروڑوں بچے پاکستانی حکمرانوں، مخیر حضرات، اساتذہ، دانشوروں، سرمایہ داروں اور پورے معاشرے کے لئے سوالیہ نشان ہیں۔ مگر اس رویے کا بھی کسی کے پاس جواب نہیں، کہ تاریکیاں بڑھانے والوں کو

کون کب جائے؟

کون کب جائے؟

کون کب جائے؟

صحت انسان کے لئے کس قدر ضروری ہے، یہ بات حکومت خوب جانتی ہے، یہ علم اور ضرورت کی آگاہی ہی تھی کہ وزیراعظم پاکستان جناب نواز شریف بہ نفس نفیس رحیم یار خان پنچے اور غریب اور مستحق لوگوں میں ہیلتھ کارڈ تقسیم کئے۔ ان کارڈز کے حاملین کو سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج کی سہولت حاصل ہوگی۔ پنجاب میں اس کی یہ افتتاحی تقریب تھی، وزیراعظم نے ازراہ کرم اس کی ابتدا پنجاب کے آخری جنوبی ضلع سے کی، اسی کام کا آغاز وہ لاہور سے بھی کر سکتے تھے، یہ غریب اور دور دراز علاقوں کی محبت ہی تھی، جس کی کشش میں وہ رحیم یار خان تک کھینچتے چلے گئے۔ وہ ایئرپورٹ سے اترے تو انہیں سیدھا آڈیٹوریم لایا گیا، ایک مقامی سیاستدان جو کہ سابق وفاقی وزیر بھی رہ چکے ہیں، وزیراعظم کی گاڑی میں ہی گئے۔ یہ بات اہم ہے کہ چھوٹے علاقوں میں حکمران قدم رنجہ فرماتے ہیں، تو جس کو وہ اپنی گاڑی میں بٹھالیں، یا جس کو وہ اپنی گاڑی چلانے کا شرف بخش دیں، اس کا بیڑہ پار ہو جاتا ہے، حکمران مقامی انتظامیہ کو خط نہیں لکھتی، فون نہیں کرتی، دراصل یہ قربتوں کے لطیف اشارے ہوتے ہیں، یوں مقامی انتظامیہ جان جاتی ہے کہ کن صاحب کو پروٹوکول دینا اور ان کی بات ہر قیمت پر ماننی ہے۔

وزیراعظم نے شیخ خلیفہ آڈیٹوریم میں ہیلتھ کارڈز تقسیم کرنے تھے، ہال میں داخلہ بھی میرٹ پر ہی دیا جا رہا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ جو لوگ بڑے کروفر کے ساتھ رہتے ہیں اور مقامی طور پر بڑے پروٹوکول میں وقت گزارتے ہیں، وہ قطاروں میں کھڑے تھے۔ جن کے پاس دعوت نامہ تھا، مگر شناختی کارڈ نہیں تھا، وہ بھی واپس گئے، جن کے پاس شناختی کارڈ تھا دعوت نامہ نہیں تھا انہیں بھی داخلے کی اجازت نہیں مل سکی۔ کچھ صاحبان زیادہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے، انہوں نے واپسی میں ہی عافیت جانی، مگر بعض کے نزدیک واپس جانا بھی بے عزتی تھی، سو وہ ڈٹے رہے، ان میں سے کچھ منت سماجت اور سفارش وغیرہ کے ذریعے اندر جانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس تقریب کا ایک حُسن یہ بھی تھا کہ جن لوگوں کے لئے یہ تقریب برپا کی گئی ان میں سے صرف دس لوگوں کو اندر جانے کی اجازت تھی، یعنی صرف دس لوگ ہی منتخب کئے گئے جنہیں وزیراعظم کے ہاتھ سے کارڈ نصیب ہونا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وزیر صحت نے بتایا کہ اس سکیم سے رحیم یار خان کے پانچ لاکھ تین ہزار آٹھ سو تہتر افراد مستفید ہو گئے۔ ایک لاکھ تتالیس ہزار ایک سو اکتتر گھرانوں کو رجسٹر کیا ہے۔ اگر ان میں سے کچھ لوگ اپنے محسن کی جھلکی دیکھ لیتے تو ان کی نسلیں بھی یاد رکھتیں، چلیں کوئی بات نہیں، جھلکی نہ سہی، کارڈ ہی سہی۔

اس تقریب میں وزیراعظم نے بہت سی باتیں کیں، یہ خوشخبری بھی سنائی کہ ملک بھر میں پچاس جدید ہسپتال بنائے جا رہے ہیں، جن میں غریبوں کے ہر مرض کا

علاج مفت ہوگا، صحت پر آدھا بجٹ بھی خرچ کرنا پڑا تو کریں گے، غریبوں کی فلاح و بہبود پر اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ یہ بھی ہوا کہ غریبوں کی مشکلات کا ذکر کرتی ہوئے وزیراعظم کی آواز بھڑا گئی، آنکھوں میں نمی کے آثار بھی دیکھے گئے۔

میاں صاحب یقیناً دردِ دل رکھنے والے انسان ہیں، غریبوں کی مشکلات وہ برداشت نہیں کر سکتے، مگر ستم یہ ہے کہ وہ تیسری مرتبہ پاکستان کے وزیراعظم بنے ہیں، پنجاب میں کم و بیش بیس برس تک ان کی حکومت رہی ہے، گزشتہ آٹھ برس سے بھی انہی کی حکومت ہے، مگر غریبوں کے لئے مفت علاج اور مزید پچاس ہسپتالوں کا دعویٰ کرنے والے وزیراعظم پاکستان میں ایکٹ بھی ایسا ہسپتال نہیں بنا سکے جس میں وہ خود اپنا علاج کروا سکتے، یا جہاں غریبوں کا علاج مفت ہوتا ہو۔ وہ پچاس ہسپتال شوق سے بنائیں، غریبوں کی دعائیں لیں، لیکن یہ بھی خیال میں رکھیں کہ اس وقت جو ہسپتال پاکستان میں موجود ہیں، ان میں کس قدر عوام کو ریلیف مل رہا ہے، کتنے غریب مفت علاج کروا رہے ہیں، کتنے امراض کی مشینری ہسپتالوں میں دستیاب ہے، کتنے ہسپتالوں میں مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کا درست انتظام ہے؟ لاہور تک کے ہسپتالوں میں لوگ پریشانی کے عالم میں مر رہے ہوتے ہیں۔ پہلے ان ہسپتالوں کی حالت کو بہتر کر لیا جائے، بعد میں نئے ہسپتال بھی بن جائیں گے۔ وزیراعظم غریبوں کی حالت پر آنسو نہ بہائیں، ان کی حالت بہتر کرنے کے لئے کوئی کام کر کے دکھائیں۔ آدھا بجٹ خرچ کر دینے جیسے دعوے اصل حقائق کو بھی مشکوک بنا دیتے



گھر میں نیا مہمان آنے پر اپنا جان کے لئے خوشی کی خبر آئی ہے، اب بچے کی پیدائش پر والدہ کی طرح والد کو بھی چار ماہ کی چھٹی مل سکے گی، ان چار ماہ میں تنخواہ بھی ملے گی۔ اس سے قبل یہ چھٹی محض پندرہ روز تک تھی۔ اس خبر کا دوسرا اہم ترین حصہ یہ ہے کہ یہ خوشخبری پاکستان یا امریکہ وغیرہ میں نو مولود بچوں کے والد کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ منفرد اور انوکھا فیصلہ سپین کی پارلیمنٹ نے کیا ہے، اور یقیناً اسی ملک میں اس پر عمل درآمد ہو سکے گا۔ بچے کا ابا اب اپنی خوشی کو اہتمام کے ساتھ مناسکے گا۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کی مناسب دیکھ بھال اور خدمت وغیرہ سرانجام دے سکے گا، دوست احباب کی دعوتیں اڑا سکے گا، بچے کی ماں کے آرام کا خیال رکھ سکے گا، بچے کو جھولے وغیرہ دینے کے لئے اس کے پاس مناسب اور وافر وقت ہوگا۔ ان طویل چھٹیوں کا آخری ایک آدھ ماہ تو وہ سیر سپاٹا بھی کر سکتے ہیں، کیونکہ اتنے عرصے میں مہمانوں کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا، خاتون کی صحت بھی بحال ہو جائے گی اور معاملات زندگی دوبارہ معمول پر آجائیں گے۔ خیر یہ تو سپین کے مرد حضرات کا مسئلہ ہے کہ وہ ان چھٹیوں کو کس طرح گزارنا پسند کرتے ہیں، یا ان کی کیا مشکلات یا مسائل ہیں؟ تاہم یہ فیصلہ اپنی نوعیت کا منفرد فیصلہ ہے کہ دنیا بھر میں مرد کو چند روز تو

خوشی منانے کے لئے دیئے جاتے ہیں، چار ماہ کا تجربہ پہلی مرتبہ سہین کرنے جارہا ہے، اگر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے تو یقیناً یورپ اور دیگر ممالک کی پارلیمنٹ بھی اس جانب توجہ مبذول کرے گی، کیا جانے کہ کچھ ہی عرصہ بعد دیگر ممالک بھی ایسے ہی قوانین بنا کر اپنے ہاں مردوں کو عیاشی کروادیں۔

یہ فیصلہ تو پڑھی لکھی خواتین کے لئے ہے، پاکستان جیسے ملک میں جہاں شرح خواندگی کی سطح ناقابلِ بیان ہے، وہاں پڑھی لکھی اور پھر ملازمت پیشہ خواتین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی تعداد مزید کم ہے، جہاں گھر کے دونوں افراد ملازمت کرتے ہوں۔ اپنے ہاں دیہات ہوں یا مزدور پیشہ طبقہ، خواتین زچگی کے آخری دنوں تک کام کاج اور مزدوری وغیرہ میں مصروف رہتی ہیں، دو چار روز قبل ہی چھٹی لی جاتی ہوگی، بلکہ بعض اوقات تو چھٹی کی نوبت ہی نہیں آتی۔ دن میں کھیتوں میں کام کیا، یا مزدوری کی اور رات فطرت نے اپنی صنایع ظاہر کر دی۔ اس طبقے کو چند روز ہی آرام نصیب ہوتا ہے، تیسرے ہی روز وہ کام کاج کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ رہ گئے ننھے فرشتے یا ننھی پری کے ابا جان تو اُن کی چھٹی کا کیا تصور؟ وہ کام کریں، ماحول بنے تو چھٹی لے لیں اور مٹھائی کا اہتمام کر لیں، ورنہ یہ کارِ خیر گھر والے مل کر سرانجام دے لیتے ہیں، اور ابا کی چھٹی کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اگر یہ

خبر اپنے معزز ارکانِ پارلیمنٹ کی نظر سے گزری تو کوئی بعید نہیں کہ اگلے اجلاس میں ان چھٹیوں کا مطالبہ قرار داد کی صورت سامنے آجائے۔ پاکستان میں چونکہ ملازمت پیشہ افراد کا تناسب بہت کم ہے، اس لئے اُن کے حق میں آواز اٹھانے والے بھی کم ہی ہوں گے، اگر یہی قانون ارکانِ پارلیمنٹ کے بارے میں ہوتا اور پوری تنخواہ کے ساتھ چار ماہ کی چھٹی دی جاتی، تو یقیناً یہ قانون پلک جھپکنے میں منظور ہو جاتا۔ دوسرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اپنے زیادہ تر معزز ممبرانِ پارلیمنٹ ان بہاروں کے بعد کئی خزانے بھی دیکھ چکے ہیں، اس لئے انہیں اس چھٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔

ممکن ہے سین میں غیر سرکاری 'اے' سرکاری آہوں کی چھٹیوں والی اس عیاشی پر احتجاج بھی کریں، کہ جس فرد کو کوئی ضروری اور اہم کام بھی نہیں اور وہ چار ماہ قومی خزانے پر بوجھ کیوں بنیں۔ یا تو وہ ملازمت پر آئیں، یا پھر تنخواہ کے بغیر چھٹی دی جائے۔ لیکن قانون وہاں کی پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے، اس لئے نہ تو مخالفت کے امکانات ہیں اور نہ ہی احتجاج کا تصور۔ البتہ دوسرے اے یہ مطالبہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اگر انہیں چھٹی دینا ممکن نہیں تو کم از کم کچھ الاؤنس ہی دے دیا جائے، تاکہ وہ بھی بچے کی پیدائش پر سرکاری خرچ پر کچھ جشن منانے کی پوزیشن میں آسکیں۔ پاکستان میں اگر نو مولود کے والد کو چار ماہ کی چھٹی ملنے لگ جائے تو آہوں کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں، اور ہر

دوسرے سال پوری متخوہ کے ساتھ چار ماہ کی چھٹی منظور ہو سکتی ہے، شاید اسی لئے

یہاں ایسا قانون منظور نہیں ہوتا۔

! یہ حادثات، شامتِ اعمال

گزشتہ دو تین روز میں پاکستان بھر میں حادثات اس تسلسل سے رونما ہوئے کہ پوری قوم کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔ کونسا دل ہے جس نے آنسو نہیں بہائے، کون سا انسان ہے جو سو گوار نہیں ہوا۔ موٹر وے پر سفر کرنے والے لطف اندوز ہی ہوتے ہیں، ماحول کے مطابق گاڑی چلانے میں ذہنی کوفت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، رفتار بھی بڑی مشکلوں سے قابو میں رکھی جاتی ہے۔ بار بار بریک لگانے کا تصور نہیں ہوتا۔ یار لوگ بڑی بے فکری سے ڈرائیونگ کرتے اور منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ موٹر وے پر چلتے ہوئے کسی سفری پریشانی کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر یہ کیا ہوا کہ ایک ٹرک کا حادثہ ہوا اور اس میں بہت سی گاڑیاں جا ٹکرائیں، کچھ دھند تھی تو کچھ فضائی آلودگی۔ ماحول عجیب سا تھا، ٹکراؤ کے نتیجے میں ڈنڈہ دجن کے قریب جانیں ضائع ہو گئیں۔ دوسرا حادثہ کراچی میں اس وقت پیش آیا جب زکریا ایکسپریس ٹریک پر کھڑی فرید ایکسپریس سے جا ٹکرائی۔ دودرجن سے زائد مسافر ملکِ عدم کے راہی ہوئے، بیسیوں زخمی ہو گئے، یقیناً بہت سے زخمیوں کی حالت تشویشناک ہوگی۔ پاکستان میں ریلوے کی نینا ڈوب رہی تھی، موجودہ حکومت کے وزیر ریلوے خواجہ سعد رفیق نے بہت محنت سے ریلوے کو بحال کیا، اجڑے سٹیشن آباد ہو گئے، اور ویران لائنوں پر گاڑیاں چلنے لگیں۔ اگرچہ خواجہ صاحب نے اپنی وزارت سے

ہٹ کر حکومت مخالفین کے حملوں کا جواب بھی اپنے ہی ذمہ لے رکھا ہے، تاہم وہ اپنی وزارت کو بھی خوب وقت دے رہے ہیں۔ مگر اس ساری محنت اور کامیابی کے باوجود ایک منفی پہلو یہ ہے کہ گزشتہ ساڑھے تین برس میں ریل کو سیکڑوں حادثات بھی پیش آئے، جن میں درجن بھر بڑے حادثات تھے، جن میں ایک سو سے زائد مسافر اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ حادثے کے فوراً بعد معاملہ اس کی ذمہ داری کا ہوتا ہے، اپنے ہاں یہ سلسلہ رائج ہے کہ کسی کمزور فرد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر جان چھڑالی جاتی ہے۔ جبکہ ریلوے میں حادثات کی روک تھام کے لئے بارہ ارب روپے مالیت کا آٹومیٹک پروٹیکشن سسٹم بھی منظور کیا گیا تھا، جس پر عمل کی نوبت نہیں آئی۔

تیسرا حادثہ بہت بڑا ہے، مگر ہمارا میڈیا ذرا اسلام آباد کی کوریج میں مصروف تھا، اس لئے وہ عوام کو یہ خبر نہیں دے سکا کہ گڈانی شپ بریکنگ یا رڈ پر کھڑے جہاز میں موجود لوگوں پر کیا ہوتی؟ ساحل پر کھڑے ناکارہ جہاز کو کاٹ کر توڑا جا رہا تھا، جس میں بچا ہوا تیل بھی تھا، جہاز صاف کرنا اور اس کو کاٹنا معمول کا کام اور کاروبار ہے۔ مگر سیٹھ اور ٹھیکیدار کی مجرمانہ غفلت کی بنا پر جہاز کی صفائی اور کٹائی بیک وقت شروع کر دی گئی، تاکہ وقت اور پیسہ بچایا جاسکے، یوں لالچ نے سیکڑوں خاندان اجاڑ دیئے۔ کٹائی سے اڑنے والی چنگاریاں تیل میں گرنے سے آگ بھڑک اٹھی، بیسیوں مزدور، مارے گئے،

بیسویں لاپتہ ہیں، چوتھا روز ہے، متعلقہ ادارے آگٹ بجھانے میں ناکام ہو چکے ہیں، مرنے والوں کی درست تعداد کا علم نہیں ہو رہا، آگٹ بجھنے کے بعد مرنے والوں کی اصل تعداد کا اندازہ لگایا جاسکے گا۔ حادثے ایسے ہی پیش نہیں آ جاتے، غفلت کا عمل دخل موجود ہوتا ہے۔ زندگی کے سفر میں حادثات کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جب انسان سفر کرتا ہے تو حادثات اس کے منتظر ہوتے ہیں، کبھی اس کی اپنی غفلت کی وجہ سے اور کبھی کسی دوسرے کی غفلت کی وجہ سے حادثہ پیش آ جاتا ہے۔

اپنے ہاں حکومتیں اپنی ترقی کے دعوے کرتی نہیں تھکتیں۔ ملکی ترقی کے لئے عالمی بینک اور اسی قسم کے دیگر اداروں کے سرٹیفیکیٹ روزانہ زبانی طور پر سنائے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی معیشت مستحکم ہو چکی ہے۔ مگر قدرتی آفات سے نمٹنے کے لئے کوئی اہتمام ہی موجود نہیں، قدرتی آفت تو دور کی بات ہے، یہاں انسان کے ہاتھ کی پیدا کردہ آفت بھی بے قابو ہی رہتی ہے، کسی مریض کو ہنگامی طور پر ہسپتال جانا پڑ جائے تو ڈاکٹر، مشین اور دوائی سب کچھ ہی نایاب ہوتا ہے۔ مریض لیٹریاں رگڑتے مر جاتے ہیں، یہاں سکول چلے جائیں تو سہولتیں نہ ہونے کے برابر، سفر کریں تو مقامی سڑکیں کسی عذاب سے کم نہیں۔ بات صرف مجرمانہ غفلت اور حکومتوں کی طرف سے سہولتوں کی کمی تک ہی محدود نہیں، ہم سب لوگوں کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ آخر اس قدر

آفات نے ہمارے گرد گھیرا تنگ کیوں کر دیا ہے، کیا یہ ہماری شہامتِ اعمال ہے، یا
محض حادثات؟ ہمیں دونوں صورتوں پر غور کرنا چاہیے۔

ہر سکول کے باہر پمفلٹ آویزاں کئے جائیں گے، جن پر واضح طور پر ٹال فری نمبر لکھا ہوگا۔ طلبہ اپنے سکول میں ہونے والے ناروا سلوک، کلاسز کا تسلسل سے نہ ہونا، استاد کی غیر حاضری، گندگی اور بنیادی سہولتوں کے فقدان بارے اپنی رائے ٹال فری نمبر پر درج کروائیں گے۔ اس سکیم کا آغاز لاہور اور بہاول پور سے کیا جا رہا ہے۔ اس ہیلپ لائن کا قیام ”پڑھو پنجاب، بڑھو پنجاب“ پروگرام کے تحت کیا گیا ہے۔ جو کام حکومت پنجاب، محکمہ تعلیم، وزیر تعلیم، ای ڈی اوز وغیرہ مل کر بھی نہیں کر سکے، اب وہ سکول کے بچوں کے ذریعے کروانے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اگر یہ کام اتنے ہی آسان ہوتے اور یہ مسائل ایسے ہی حل ہونے والے ہوتے تو بین الاقوامی سطح پر بہتر کارکردگی کے سرٹیفیکیٹ پانے والے وزیر اعلیٰ کے صوبے کے سکولوں میں حقیقی معاونوں میں سب اچھا کی رپورٹ ہوتی۔ سرکاری سکولوں کا مرثیہ پڑھنے کی یہاں ضرورت نہیں، کیونکہ حکومت کا ایکٹ ایکٹ اہلکار حکومت کے غیر سنجیدہ رویے سے آگاہ ہے، بچہ بچہ سکولوں کی حالت زار سے آشنا ہے۔ خود وزیر اعلیٰ اپنی جذباتی تقریروں میں اس بات کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے سکولوں میں استاد نہیں، چار دیواری نہیں، پینے کا پانی نہیں، بچے نہیں (سچ تو یہ ہے کہ

کچھ بھی نہیں)۔ ایسے میں بنیادی سہولتوں کی عدم دستیابی کے باوجود سکولوں کے باہر پمفلٹ آویزاں کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اگر کسی سکول میں چار دیواری ہی نہیں، تو کیا کسی بچے کے ٹال فری نمبر پر فون کرنے سے چار دیواری بن جائے گی؟ کیا کسی بچے کے شکایت درج کروانے پر سکول میں کلاس روم تعمیر ہو جائیں گے؟ کیا کسی کی شکایت پر کسی پرائمری سکول میں سات کلاس روم اور سات ہی استاد پورے کر دیئے جائیں گے؟ زمینی حقائق اور تجربہ بتاتا ہے کہ کسی بھی بچے کے کسی فون پر اس قسم کا کوئی مطالبہ پورا نہیں کیا جائے گا۔ تو پھر یہ نمبر لٹکانے اور بنانے کا کیا فائدہ؟

ہاں! یہ ٹال فری نمبر اس وقت کارآمد ہو گا جب کسی استاد نے کسی بچے کو ہاتھ بھی لگا دیا، کیونکہ ”مار نہیں، پیار“ کا سلوگن حکومت کو عزیز از جان ہے، اور بچے اس سلوگن سے بھی عزیز۔ مگر وہی بچے جو سکولوں میں داخل ہو گئے، جو داخل نہیں ہو سکے، ان کے لئے البتہ نعرے اور دعوے کافی بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ پنجاب میں گزشتہ تیس برس میں سے کم و بیش بیس سال حکومت کرنے والے میاں برادران سکولوں سے باہر پنجاب کے اسی لاکھ بچوں کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں، شاید ’سابقہ‘ حکومتوں نے ہی ان بچوں کو سکول نہیں آنے دیا، یا پھر آئے ہوؤں کو سکول سے نکال دیا۔ میاں شہباز شریف جلسوں اور تقریبات میں سکول سے باہر بچوں کا ذکر جذباتی انداز میں کرتے ہیں، بعض

اوقات تو ان کی آواز بھی بھرا جاتی ہے، پھر اُن کے دل سے آواز اٹھتی ہے، جسے وہ فرط جذبات میں ترانے کی صورت میں گاتے ہیں، اس موقع پر وہ عموماً حبیب جالب کی ایک انقلابی نظم کا سہارا لیا کرتے ہیں، اور ظلم کے ضابطوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ غریب جب اٹھے تو امرا اور اشرافیہ کے معاملات کو گرا دیں گے۔

حاضرین و سامعین سوچتے رہ جاتے ہیں کہ یہ اشرافیہ ہے کون؟ خیر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ٹال فری نمبر صرف ایک کام کے لئے استعمال ہوگا، وہ ہے اساتذہ کی تضحیک اور توہین۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ ایک اور ٹال فری نمبر بھی سکولوں کے باہر آویزاں کروادے، جو اساتذہ کے استعمال کے لئے ہو، جس پر فون کر کے استاد صاحب اپنے شاگردانِ رشید کے بارے میں حکمرانوں کو آگاہ کر سکیں کہ وہ مہینے میں کتنے روز سکول تشریف لاتے ہیں؟ کلاس میں اُن کا رویہ کیا ہوتا ہے؟ استاد کی توہین کو کوئی موقع وہ کیسے ضائع نہیں کرتے؟ ان کی سکول اور سکول سے باہر سرگرمیاں کیا ہیں؟ کس طرح وہ ہوم ورک نہیں کرتے، اساتذہ کے سامنے کس طرح بد تمیزی کرتے ہیں؟ ان کے والدین بار بار فون کرنے کے باوجود بھی نہیں آتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت طرح طرح کے پمفلٹ آویزاں کرنے کی بجائے سکولوں کو سہولتوں سے آراستہ کرے، ہر پرائمری سکول میں کم از کم سات کلاس روم ہوں، اتنے ہی استاد بھی، دیگر بنیادی اور ضروری سہولتیں بھی موجود ہوں، بچوں کے

والدین کو بھی سکول رابطے کا پابند کیا جائے، اور یہ بھی کہ حکومت اپنے دیگر غیر اہم اور
اشتہاری قسم کے میگا پراجیکٹس کو روک کر صرف پنجاب کے پون کروڑ بچوں کو ہی
سکول لے آئے تو بڑی بات ہے۔

! زمین پر بیٹھے بچے

تقریب پر وقار تھی اور موضوع قابلِ تحسین۔ متعدد معزز ممبرانِ اسمبلی اگلی نشستوں پر جلوہ گر تھے، ان میں سے موضوع سے تعلق شاید کسی ایک دو کا تھا۔ جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے تعلیمی شعبہ جات کے سربراہان بھی تشریف رکھتے تھے، شہر کے صاحبانِ علم و دانش بھی مدعو تھے، موضوع سے دلچسپی رکھنے والے باذوق شہری بھی موجود تھے، طلباء و طالبات کی بڑی تعداد بھی حاضر تھی۔ سٹیج پر تعلیم و تربیت کے وزیر مملکت میاں بلخ الرحمن، پنجاب کے وزیر تعلیم رانا مشہود، وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی ڈاکٹر قیصر مشتاق جلوہ افروز تھے۔ جس معاملے پر اسلامیہ یونیورسٹی کے غلام محمد گھوٹوی ہال میں یہ تقریب ہو رہی تھی، وہ ایک انوکھا مگر بہت ہی دلکش تھا۔ ”بچوں میں مطالعہ کی عادت کا احیاء و فروغ“۔ ضلعی انتظامی افسر کی نگرانی میں یہ خوبصورت پراجیکٹ ترتیب دیا گیا تھا، پانچویں کلاس کے پچیس ہزار بچے منتخب کئے گئے تھے، جن میں ہر ہفتہ ایک بچے کو کتاب دی جائے گی، دوسرے ہفتے دوسرے کو، اسی طرح چار بچے چار ہفتوں میں کتاب کا مطالعہ کریں گے اور مہینے کے آخر میں چاروں بچے اور ان کے استاد صاحب مل کر کتاب کے موضوعات پر بحث اور گفتگو کریں گے، حاصلِ مطالعہ پیش کیا جائے گا، کتاب کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا بھی تجزیہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں فیروز سنز نے بھی اہم

کردار ادا کیا، کمپنی نے پچاس ہزار روپے سالانہ کمٹائیں دینے کا اعلان کیا۔

تقاریر ہوئیں، تعلیم کے وزراء نے اس پراجیکٹ کو سراہا، صوبائی وزیر تعلیم نے پروگرام کی تحسین و خوبی سے متاثر ہو کر اس کو پنجاب بھر میں نافذ کرنے کا اعلان بھی کیا۔ یقیناً مقامی انتظامیہ کا یہ پراجیکٹ قابلِ تقلید ہے۔ کتاب بچوں کو آوارگی کی بجائے سنجیدگی کی طرف لائے گی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ چلنا صرف آج ہی ضرورت نہیں، حالات کا یہ تقاضا ہمیشہ سے رہا ہے۔ جو زمانے کی رفتار کو پہچان گئے وہ کامیاب ہو گئے، جو رُک گئے وہ کچلے گئے۔ اس برق رفتاری کا درس ایک صدی قبل ہمیں اقبالؔ بھی دے گئے ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائل نے انسان کی زندگی میں بجلیاں بھر دی ہیں۔ ہماری نئی نسل فطری طور پر گلیمر کے پیچھے ہی سرپٹ بھاگ رہی ہے، ہر کسی کے ہاتھ میں موبائل ہے اور کندھے پر لپ ٹاپ۔ والدین نے بچوں کی معمولی سی ضد پر انہیں موبائل لے دیئے ہیں۔ بچوں پر نگاہ رکھنا والدین کا فرض ہوتا ہے، والدین کے خیال میں بچے گھر میں بیٹھے بہتر ہیں، خواہ وہ کمپیوٹر میں کچھ بھی دیکھیں۔ سب کچھ ہے مگر بچوں میں مطالعہ کی عادت صفر ہے۔ اگر انتظامیہ نے بچوں میں مطالعہ کے احیاء اور فروغ کے لئے پراجیکٹ بنایا ہے تو اس پر نہایت یکسوئی اور محنت سے عمل کرنے کی ضرورت ہے، یہ نہیں کہ سرکاری طور پر جاری ہونے والے بے شمار

پراجیکٹس بڑی شان و شوکت سے شروع ہوتے ہیں اور نہایت گمنامی کے عالم میں اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات پراجیکٹ کا دار و مدار اس کے بانی افسر پر بھی ہوتا ہے، کسی باذوق سرکاری افسر نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو آنے والے صاحب کی اس میں دلچسپی نہ ہوئی تو کتنا ہیں اگلے سالوں میں خستہ حال سٹوروں میں دیمک کی خوراک بن جاتی ہیں۔ دیمک بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کی خوراک کا بندوبست ہماری سرکار خوب کرتی ہے۔

جن بچوں کے لئے یہ تقریب سجائی گئی تھی، ان میں سے بھی نمونے کے طور پر کچھ بلائے گئے تھے تاکہ انہیں کتابیں دے کر تصاویر بنوائی جاسکیں۔ وہ خوبصورت ہال میں لگی کرسیوں کے اطراف میں دیواروں کے ساتھ نیچے بیٹھے تھے، ان بچوں کی اگرچہ تعداد صرف دس تھی، جن میں پانچ بچیاں اور پانچ بچے تھے، مگر سرکاری سکولوں کے کلچر کے مطابق ان پر کسی نے توجہ نہ دی، ایک صحافی کے توجہ دلانے پر انہیں وہاں سے اٹھایا گیا، ان معصوم بچوں پر جب وفاقی وزیر مملکت کی توجہ دلائی گئی تو انہیں یونیورسٹی اساتذہ نے اپنے ساتھ سیٹوں پر ایڈجسٹ کر لیا۔ ذرا بچوں اور بچیوں کے جذبات کا اندازہ لگائیے، جب وہ سبھی سبھی گیلری میں نیچے بیٹھے تھے، مقررین تقریریں کر رہے تھے، جو بچوں کے سر کے اوپر سے گزرتی ہو گئی، اور جن بچوں کے روشن مستقبل کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی، وہ خود مہمان ہوتے ہوئے بھی دوسرے مہمانوں کے قدموں میں بیٹھے تھے۔

پوری سرکاری تقریب ایک طرف اور ان بچوں کا نیچے بیٹھنا ایک طرف، اس رویے سے
سنجیدگی اور اخلاص کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ دل اسی انجام سے ڈرتا ہے ... ان بچوں
اور اس قسم کے دیگر حکومتی منصوبوں کی طرح یہ پراجیکٹ بھی زمین پر ہی نہ بیٹھ
جائے۔

یومِ اقبال آیا اور گزر گیا۔ حکومتوں نے گزشتہ برس کی طرح 9 نومبر کی چھٹی کو متنازع بنائے رکھا۔ ”چھٹی ہوگی، نہیں ہوگی، ہے، نہیں ہے“ کا مسئلہ حل نہ ہوا، یوں بہت سے تعلیمی ادارے بند رہے اور بہت سے کھلے۔ برسہا برس سے ہونے والی چھٹی حکومت نے کیوں ختم کی؟ یہ راز فاش نہیں ہو سکا۔ حکومت نے چھٹی ختم کرنی ہی ہے تو اس کا پہلے سے واضح اعلان کیا جائے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ تعلیمی ادارے کھلے رہیں، بچوں اور طلبہ و طالبات کو علامہ اقبالؒ کے بارے میں آگاہی دی جائے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ کچھ ادارے کھلے تو کچھ بند رہے، جو کھلے اُن میں بھی حاضری کم رہی۔ صورتِ حال اور حاضری کو یقینی بنایا جائے، تمام بچوں کو ان کی عمر کے مطابق علامہ اقبال کی شخصیت، کلام اور خدمات کے بارے میں آگاہ کیا جائے، معاملہ اس تفصیل اور ترتیب سے سمجھایا جائے کہ ہر بچہ اقبالؒ سے شناسا ہو جائے۔ بچوں پر کیا موقوف اپنے ہاں تو اساتذہ اقبالؒ فہمی سے نا آشنا ہیں۔ مشکل ترین شاعر ہونے کے باوجود انہوں نے بچوں کے لئے نہایت عام فہم نظمیں بھی لکھی ہیں۔ صبحِ اسمبلی میں پڑھی جانے والی ”دعا“، جو کہ سکولوں میں ایک لازمی جزو کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، اقبال کی لکھی ہوئی ہے، مگر اس سادہ اور آسان دعا کی بھی اساتذہ اپنے بچوں کے سامنے تشریح نہیں کرتے، بچے طوطے کی

طرح رٹی رہائی دعا تو پڑھ دیتے ہیں، مگر انہوں نے کبھی خیال نہیں کیا، کہ ان کی کون کونسی تمنائیں دعا بن کر اُن کے لبوں پر آتی ہیں، اور انہی تمنائوں کی روشنی میں ایک طالب علم کو دوسروں کے لئے کیسا غمو نہ ہونا چاہیے۔

یومِ اقبالؒ پر تقریبات میں کمی بھی واقع ہو چکی ہے، اقبالؒ فنی بھی کم ہو رہی ہے، اقبالؒ کے پیغام سے عدم دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے، اس سب کچھ کے باوجود چند تقریبات دیکھنے میں آتی ہیں، جن سے اقبالؒ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، یا ان کا پیغام دوسروں تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے، یا ان کے کلام میں دلچسپی لینے کی ترغیب ملتی ہے۔ ایسی ہی ایک تقریب گزشتہ روز اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے گھوٹوی ہال میں منعقد ہوئی۔ مہمان مقرر پروفیسر خواجہ محمد زکریا تھے، جو لاہور سے خاص طور پر اس تقریب کے لئے تشریف لائے تھے۔ سامعین میں اساتذہ، دانشور، شہری اور طلبہ و طالبات شامل تھے۔ خواجہ صاحب نے نہایت سلیقے اور ترتیب سے علامہ اقبالؒ کی نثر اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے بتایا کہ مقصدی شاعری میں عموماً مقصد زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، شاعری دب جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعری میں مقصد لانے والے شاعر زیادہ کامیاب نہیں ہوئے، مگر علامہ اقبالؒ کو یہ کمال حاصل ہے، کہ ان کی شاعری بھی اپنے کمال پر ہے اور مقصد حاصل کرنے میں بھی کوئی کمی نہیں رہی۔ اقبالؒ کے کلام میں سب سے زیادہ توجہ مسلمانوں کی حالت پر دی گئی ہے، ان کی خواہش

تھی کہ ملتِ اسلامیہ متحد ہو کر اپنے مسائل خود حل کرے۔ وہ اپنی بہتری کے لئے اقوامِ مغرب کی طرف نہ دیکھے۔ ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی انفرادی تربیت پر بھی مرکوز ہے۔ ”مردِ مومن“ بھی علامہ اقبالؒ کا مطلوب ہے، وہ اجتماعی تربیت کے نتیجے میں تیار شدہ افراد کو مردِ مومن قرار دیتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پیروی بھی کرے، اور زمانے کی رفتار کے ساتھ بھی چلے۔

علامہ اقبالؒ کی خودی کو خواجہ زکریا نے شخصیت سے تعبیر کیا، مگر شخصیت ظاہری نہیں کہ جس میں سوٹ بوٹ اور بہت اچھی شکل و صورت دکھائی دیتی ہے، بلکہ شخصیت وہ جو انسان کے اندر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔ ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے، اگر وہ اسی پر سخت محنت کرے، (اسی محنت و مجاہدہ کو اقبالؒ عشق کا نام دیتے ہیں) تو انسان ترقی کے سفر پر گامزن ہو سکتا ہے۔ اسی ضمن میں اقبالؒ نے مسلمانوں کے بارے میں یہی تجزیہ کیا کہ وہ ہر بات کو مقدر پر چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ محنت نہیں کرتے، آگے بڑھنے کی جستجو نہیں کرتے، نئی سے نئی تحقیق کا نہیں سوچتے۔ اقبالؒ کا کلام مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے، مگر بد قسمتی سے نہ اقبالؒ کے کلام کو اس کی روح کے مطابق پڑھا اور سمجھا نہیں جاتا۔ اگر سرکاری سطح پر نصاب سے ایک قدم آگے بڑھ کر اقبالؒ کو سمجھا اور سمجھایا جائے اور ان کے کلام کو واقعی شمع

کی صورت قرار دیا جائے تو اقبالؒ کا مطلوب انقلاب عملی شکل میں برپا ہو سکتا ہے۔

ٹرمپ کی کامیابی کی خبر اور نتیجے کے بعد امریکہ کے حالات کی خبر سنی تو دل و دماغ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اپنے سیاسی حالات اور اسلام آباد نظروں کے سامنے آ گیا۔ ہمارے جیسے 'دور درازیوں' کو اگر کبھی کسی کام کی غرض سے اسلام آباد جانا پڑ جائے تو طبیعت بہت خراب ہوتی ہے، غریب علاقوں کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا ہے، وہاں کے ترقیاتی کاموں میں کٹوتی کر کے وہ رقم اسلام آباد اور لاہور کے میگا پروجیکٹس پر لگا دی جاتی ہے۔ اپنے علاقوں کی پسماندگی اور حکمرانوں کے شہروں کی نفائستیں اور نزا کتیں دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے، وہاں شاہ خرچیاں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر کچھ رقم بچا کر عوام کے بنیادی حقوق کی بحالی پر لگا دی جائے تو لوگوں کے معیار زندگی میں کتنی بہتری آ سکتی ہے۔ مگر جب اسلام آباد میں بھی بجلی کی لوڈ شیڈنگ دیکھتے ہیں تو دل کو کچھ تسلی ہوتی ہے، کہ چلیں یہ صدمہ تو اسلام آباد اور پسماندہ علاقوں والے برابر برداشت کر رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ یہاں چھ گھنٹے بجلی جاتی ہے تو وہاں تین گھنٹے۔ ٹرمپ کی کامیابی کا پاکستان کی سیاست سے بہت گہرا تعلق ہے، خوشی اس لئے ہوئی کہ پاکستان اور امریکہ کی سیاست میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔ پاکستان کے عوام امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی وجہ سے (ہیلری کی کامیابی)

کے لئے بڑے پر امید تھے۔ چونکہ اکثر تجزیوں اور مباحثوں میں ہیلری کو ہی معمولی برتری رہی، بہت سے معاملات میں ٹرمپ نے ایسی باتیں بھی کیں جن سے مسلمانوں کو پریشانی کا سامنا ہوا۔ حتیٰ کہ چند ماہ قبل جب امریکہ میں انتخابی مہم کا آغاز ہو چکا تھا اور صادق خان لندن کے میئر منتخب ہوئے تھے، تو ٹرمپ نے کہا تھا کہ میں امریکہ کا صدر بن گیا تو صادق خان اور مسلمانوں کو امریکہ آنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ دیگر بھی بہت سے عوامل تھے، جن کی بنا پر امریکہ میں مقیم پاکستانی ٹرمپ کے خلاف تھے۔ مگر حالات نے پلٹا کھایا اور متوقع نتیجے کی ہی کاپیا پلٹ گئی۔ پاکستانی بھی ہیلری کی ناکامی پر شدید مایوسی کا شکار ہوئے۔

اس مایوسی کے باوجود ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے سیاسی نظام میں بہت سی مطابقت پائی جا رہی ہے۔ یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ پاکستان کے سیاسی بندوبست نے اس قدر ترقی کر لی ہے یا امریکی نظام اتنا زوال پذیر ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کے سسٹم کے برابر آ گیا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ عظیم تبدیلی امریکہ میں ہی آئی ہے، اپنے ہاں بہتری شاید آٹے میں نمک کے برابر ہی آئی ہو، مگر وہاں یہ منظر دیکھ کر دل خوش ہو گیا، کہ ہارنے والی امیدوار کے حامی جذباتی ہو کر سڑکوں پر نکل آئے، وہائٹ ہاؤس کے سامنے ان کا ٹکراؤ بھی ہوا۔ سڑکوں پر کچھ جلا کر آگٹ بھی لگائی گئی، ممکن ہے

انہوں نے بھی فائر ہی جلائے ہوں۔ شہر شہر احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں، نئے صدر کے خلاف بھرپور احتجاج کیا گیا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ سارے مناظر پاکستان سے ہی مستعار لئے گئے ہیں۔ اپنے ہاں بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ انتخابی نتائج کو خوش دلی سے قبول کر لیا جائے، ورنہ ہمیشہ یہی کچھ ہوتا ہے کہ شکست کھانے والا ہمیشہ دھاندلی کا الزام لگاتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ہارنے والا اگلی مرتبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو گزشتہ الیکشن جیتنے والا اب ہار کر الزام تراشی کا فریضہ نہایت یکسوئی اور پورے عزم سے دہراتا ہے۔ امریکی الیکشن کی انتخابی مہم میں بھی ایک بڑی تبدیلی یہ آئی ہے اور اسے وہاں کے عوام نے کھلے دل سے قبول کیا ہے کہ وہاں بھی ”مولا جٹ“ سٹائل کو بھرپور مقبولیت ملی ہے۔ ٹرمپ نے جس طرح بھی دھمکیاں دیں، دشمنوں کو لکارا، لتاڑا، وہاں کے عوام کی اکثریت نے ان کے اس انداز کو پسند کیا، اور تجزیہ نگاروں کے دعوؤں کے باوجود ٹرمپ کو ووٹ دے کر دنیا کو حیران اور بہت سوں کو پریشان کر دیا۔ اگرچہ نتائج کے فوراً بعد ٹرمپ نے سب کو ساتھ لے کر چلنے کا عندیہ دیا ہے، اور یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ امریکہ کی حکومتیں بدل جاتی ہیں پالیسیاں بہت کم تبدیل ہوتی ہیں۔ تاہم اب تبدیلی کا آغاز ہو گیا ہے، اس مرتبہ بڑھکیں لگی ہیں، دھمکیاں ملی ہیں، منفی جذبات بھڑکے ہیں۔ نتیجے کے بعد احتجاج ہوا ہے، ریلیاں نکلی ہیں، آگ لگی ہے، بے شمار ٹی وی سیٹ توڑ

دیئے گئے۔ اب آگے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں، ہم ترقی کر کے
! امریکہ تک نہیں پہنچ سکتے تو کیا ہوا؟ ان کی تنزلی دیکھ کر خوش تو ہو سکتے ہیں نا

ہم کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہم سوچنے کے لئے چند لمحات بھی نہیں نکالتے۔ دن رات ازل سے چوبیس گھنٹے کا ہی ہے، پلٹ کر چند برس پہلے کی طرف دیکھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے پاس بہت وقت تھا، کوئی مہمان جاتا تھا تو کچھ روز اس کا قیام ہوتا تھا، دوست احباب اکٹھے ہو کر باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگویں مار لیا کرتے تھے، مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو کچھ دیر وہاں بھی بیٹھ جاتے تھے۔ اب وقت بدل گیا ہے، ہر کوئی سخت مصروف ہے، مہمان بن کر کہیں آنا جانا کم ہوتا جا رہا ہے، اگر گئے بھی تو بس گئے اور آئے۔ احباب کو طے عرصے بیت جاتے ہیں، مسجد میں گئے تو بھاگنے کی جلدی۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا یہ چلن ہے کہ وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔ یقیناً ایسا ہی ہے، مگر ہم اگر ہر وقت مصروفِ عمل ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہے؟ ہم ہر وقت مصروف رہ کر کس قسم کی ترقی کر رہے ہیں؟ ہماری مصروفیت موبائل فون ہے، لیپ ٹاپ اور نیٹ نے ہماری ساری توجہ اپنی جانب مرکوز کر لی ہے۔ یہاں سے ہم اکثر وہی کام کرتے ہیں جو لا حاصل ہوتا ہے، جس کا کوئی آؤٹ پٹ نہیں، جس کا خود ہمارے سمیت کسی بھی دوسرے کو کوئی فائدہ نہیں، مگر اس حقیقت سے کون آشنا نہیں کہ انسان وقت ضائع نہیں کرتا، دراصل وہ وقت کے ہاتھوں ضائع ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ

اس لئے ہے کہ ہم سوچتے نہیں، معاملات پر غور نہیں کرتے۔

ہمارے رویوں کے اثرات ہمارے ہر شعبے پر نمایاں ہیں، جس شعبہ زندگی پر نگاہ ڈالیں وہی زوال پذیر ہے۔ تربیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ترقی میں انسان آگے سے آگے سفر کر رہا ہے، مگر یہاں ہم قدم قدم پیچھے کی جانب جا رہے ہیں۔ اپنے ہاں مولا جٹ کلچر ختم ہونے کی بجائے فروغ پا رہا ہے، سیاسی پارٹیوں کے قائدین ایک دوسرے کو لٹکارتے ہیں، ان کے الٹ پلٹ نام رکھتے ہیں، ان پر الزامات کی بوچھاڑ کرتے ہیں، کچھڑا چھالتے ہیں، تہمتیں باندھتے ہیں، حتیٰ کہ مغفلات سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ ملک کے اندر بہت سے فکر مند طبقات کی خواہش ہے کہ معاملات سنجیدگی سے لئے جائیں، مگر یہاں بڑے بڑے کام بھی غیر سنجیدہ طریقے سے انجام پاتے ہیں۔ پی پی اور مسلم لیگ ن تو یہاں تین دہائیوں سے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ دشمنی اس قدر دکھائی کہ ابتدا میں میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب ہوتے ہوئے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کا استقبال تک نہیں کرتے تھے۔ وقت نے دونوں پارٹیوں کے قائدین کو سیاست سکھا دی، پھر انہوں نے مخالفت کا لبادہ تو اوڑھے رکھا، مگر اندر سے ایک ہو گئے۔ مشرف دور میں ”میشاقِ جمہوریت“ نے سارے پردے بھی فاش کر دیئے۔ یہ اندرونی (خفیہ) اتحاد آج بھی جاری ہے، اور معاہدے کے مطابق باریاں لی اور دی جا رہی ہیں۔

سیاسی قیادتوں نے ہی قوم کی تربیت کرنا تھی، مگر افسوس کہ وہ خود قوم کے مزاج کے مطابق کام کر رہے ہیں، اگر عمران خان سے قوم نے توقعات باندھیں، تو اس کی وجہ یہی تھی کہ دو پارٹیوں سے قوم تنگ آ چکی تھی۔ مگر بد قسمتی ملاحظہ کیجئے کہ جس پر تکیہ تھا، اس نے بھی کارکنوں کی تربیت کا کوئی بندوبست نہ کیا، پارٹی کے الیکشن ہونے لگے تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ طرح طرح کے سیاستدان ارد گرد جمع کرنے سے تنقید کا نشانہ بننا پڑا، کوئی تقریب ہوئی تو کارکن کھانے پر ٹوٹ پڑے، کوئی جلسہ ہوا تو خواتین شریں پسندوں سے محفوظ نہ رہ سکیں، خیبر میں حکومت ملی تو کوئی خاص تبدیلی ظاہر نہ کر سکے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اپنے جلسوں اور دھرنوں میں مخالفین کے لئے ’اوئے ووئے‘ کے خطابات بھی جاری ہیں۔ سب سے نوجوان سیاسی قیادت بلاول زرداری، جو کہ سیاسی مصلحت کے تحت ’بھٹو‘ بھی ہیں، ان کا طرزِ تکلم بھی پاکستان کی سیاسی کان میں آ کر نمک ہی ہو چکا ہے، اول روز سے ہی ان کے ہدایتکاروں اور استادوں نے انہیں پاکستانی طریقے کی سیاست سکھائی ہے، باہر کے پڑھے لکھے ایک ارب پتی نوجوان کو چاہیے تھا کہ پاکستان میں بھی وہی اندازِ سیاست اپناتا جو ترقی یافتہ اقوام کا وطیرہ ہے، مگر انہوں نے بھی چیخ چیخ کر تقریر کرنے اور ’چاچا، چاچا‘ کر کے مخالفین کی تضحیک کو ہی اپنا لیا ہے، سندھ کی سیاست میں کوئی بہتری نہیں آئی، کرپشن کے قحط بھی عام ہیں تو ترقیاتی کام بھی صرف اشتہارات تک دکھائی دیتے ہیں۔ اگر بلاول جیسے پڑھے لکھے اور نوجوان سیاستدان بھی

پاکستانی عوام کو کوئی نیا اور معقول پیغام نہیں دے سکتے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارا

انجام کیا ہوگا۔

نور محل برقی قہقہوں سے جگمگا رہا تھا، رنگ و نور چار سو بکھرا ہوا تھا، محل کے سامنے وسیع لان میں ایک ٹی وی پروگرام کا سیٹ تھا، تیز روشنیوں سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ سیٹ کو بہاول پور کی ثقافتی علامتوں سے سجایا گیا تھا، مہمان چار پائیوں پر جلوہ گر تھے، چار پائیوں پر چولستان کی رنگ برنگے کپڑے سے بنی چادریں بچھی تھیں۔ ایک لکڑی زمین میں گڑی تھی، جس کی کٹی ہوئی شاخوں پر ہانڈیاں لٹک رہی تھیں، یہ چولستان کا برتن رکھنے کا خاص طریقہ ہے۔ لکڑی کے ایک سٹینڈ پر گھڑے پڑے تھے، ایک طرف چرخا رکھا تھا، روٹی کو محفوظ رکھنے کے لئے کھجور کے پتوں کی بنی چنگیریں بھی رکھی تھیں، ایک جانب ایک ٹوکرا تھا، جس کے قریب ایک سفید رنگ کا مرغا اور مرغی موجود تھے۔ مہمانوں اور میزبانوں نے بھی اجرکوں سے خود کو ثقافتی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تھی۔ جھومر شو بھی ہوا، چولستانیوں کے ایک گروپ نے روایتی رقص بھی پیش کیا، جس میں رقص کے ساتھ منہ سے آگ نکالنے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ یہ ٹی وی کے لئے ایک شو کی ریکارڈنگ کا منظر تھا، ایک طرف مہمان تھے تو دوسری طرف ان کے سامنے پروگرام کو قہقہوں سے مزین کرنے کے لئے مزاحیہ فنکار بھی تیار بیٹھے تھے۔ پروگرام چونکہ کلچر اور میلوں ٹھیلوں کے بارے میں تھا، اس لئے مزاحیہ فنکاروں میں سے ایک نے جوکر کا روپ دھار

رکھا تھا، دوسرا فوٹ گلوکار بنا ہوا تھا اور تیسری سرکس میں رسے پر چلنے والی کے روپ میں تھی۔

پروگرام کے آغاز میں میزبان نے مہمانوں کو مخاطب کر کے کچھ ضروری باتیں کیں، جن کا تعلق ریکارڈنگ کی تکنیک سے تھا، تاہم ایک خاص بات جو انہوں نے کہی وہ یہ تھی کہ ”ہنسنے پر ٹیکس ختم کر دیا گیا ہے۔“ گویا پروگرام میں لوگوں کو کھل کر ہنسنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ حقیقت ہے ہنسی تو کہیں کھو گئی ہے، کسی جگہ چلے جائیں، کسی تقریب میں بیٹھ جائیں، کسی ماحول کو دیکھ لیں، چہروں پر کشیدگی کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں، پیشانی شکن آلود، آنکھوں میں غصے کے انگارے اور ناامیدی کی راگ۔ زبان پر گلے شکوے، بددعائیں، الزامات، اعتراضات، تنقید۔ دل میں خوف، مرض کا خوف، مالی معاملات کا ڈر، چوری چکاری، دہشت گردی، غنڈہ گردی کا ڈر۔ مہنگائی، بے روزگاری اور غربت کا غم۔ رشتے ٹوٹنے اور گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوریوں کی پریشانی۔ کتنے ہی غم ہیں جنہوں نے انسانوں کو اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے، انسان ایک سوچ سے نکلتا ہے تو دوسری ایک مسئلہ اور عذاب کی صورت سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ حکومتوں اور سیاستدانوں کے معاملات عوام کے غم و غصے میں مسلسل اضافے کا موجب ہوتے ہیں۔ حکومتی عیاشیوں پر عوام کا خون کھولتا اور جلتا ہے، پروٹوکول اور ہٹو بچو کا کلچر عوام کے دلوں پر چھیریاں چلاتا ہے، لوٹ مار کی

بھیانک وارداتیں سن کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ چاروں طرف غموں اور پریشانیوں کے گہرے سائے انسان کو گھیرے رکھتے ہیں۔

ٹی وی چینلز کو ہی دیکھ لیں، خبروں کا کوئی منظر، کوئی ٹاک شو دیکھ لیں، سیاستدان آپس میں دست و گریباں نظر آئیں گے، بظاہر مہذب اور پڑھے لکھے لوگ ٹاک شو کے آغاز کے ہی چند منٹ برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہیں، لگتا ہے، بہت سلیجھی ہوئی اور معقول گفتگو کریں گے، مگر چند ہی منٹ میں کام گرم ہو جاتا ہے، پھر ایسا موقع بھی آتا ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی مہمان اپنی پوری قوت سے بول رہے ہوتے ہیں، تین یا چار مہمان تک بھی مسلسل بولتے ہیں، سننے والا کوئی بھی نہیں ہوتا، کیونکہ میزبان سمیت ناظرین کے پلے بھی کچھ نہیں پڑتا۔ گویا ٹی وی بھی تفریح اور معلومات کی بجائے لوگوں کے لئے پریشانی کا موجب ہے، بہت سے لوگوں نے ٹاک شوز دیکھنا ہی ترک کر دیئے ہیں۔ مگر ٹی وی چینلز پر ایک چیز اب خوش آئند ہے کہ ہر چینل نے ایک یا دو شو ایسے ترتیب دے لئے ہیں، جن سے عوام کو حقیقی معنوں میں تفریح فراہم ہوتی ہے، ایسے پروگراموں میں معلومات بھی ہوتی ہیں اور مزاحیہ فنکار بھی اپنے فن سے ناظرین کو قہقہے لگانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر کشیدگی اور بوریت سے تنے ماتھوں پر چمک آ جاتی ہے، انسان کچھ دیر کے لئے خود پر مسلط ہو جانے والی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے، ایسے پروگرام کرنے والے بھی

مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان پر وگرا موں میں لوگوں کو ہنسانے اور ہنسی پر لگنے والے
ٹیکس کو منسوخ کروانے والے بھی لائق تحسین ہیں، یہ فنکار موجودہ حالات میں غنیمت
ہیں، کسی نعمت سے کم نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پاکستانی قوم کو اپنی ایک اہم ضرورت کا علم ہو گیا، وہ یہ کہ شرح خواندگی میں اضافہ کے لئے تعلیمی بجٹ میں چار فیصد اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا انکشاف صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ممنون حسین نے اس وقت کیا، جب تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے وزیر مملکت میاں بلغ الرحمن اُن سے ملنے ایوان صدر گئے۔ یہ ملاقات نہایت خوشگوار ماحول میں ہوئی، کیونکہ احسن اتفاق سے دونوں حضرات کے نظریات میں کمال درجے کی یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، دونوں پاکستان میں تعلیم عام کرنے کے مشن کو نہایت جذباتی انداز میں آگے بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، دونوں کے حکومتی عہدوں کے آغاز ہی سے بڑے گہرے مراسم ہیں، وجہ سیاسی تعلق بھی ہوگا، مگر اصل وجہ تعلیم کی بہبود ہے۔ میاں بلغ وزیر مملکت ہوتے ہوئے تعلیم کو اس قدر بلند مقام پر لے گئے ہیں، اگر وہ پورے وزیر ہوتے تو پاکستان میں تعلیم مزید بلند پرواز ہوتی۔ پاکستان میں تعلیمی ترقی کی دوسری اہم ترین وجہ صدر مملکت ہیں، کہ انہوں نے اپنی مملکت کے وزیر کو ہر قسم کی مدد اور تعاون کی یقین دہانی کروائی ہے۔ خوش قسمتی نے عوام کے ہاں ڈیرے ڈال دیئے ہیں، کہ اُن کے ان دونوں سرپرستوں کے عہدے مملکت سے جڑے ہیں۔ صدر مملکت نے تعلیم پر چار فیصد خرچ کرنے کو ملک کی

ضرورت بتایا، اور یہ مشورہ بھی دیا کہ سرکاری اور نجی ادارے مل کر پالیسیاں بنائیں، تاکہ معیارِ تعلیم میں بہتری لائی جاسکے۔

صدر مملکت نے ایکٹ اور بے حد اہم ضرورت کی نشاندہی بھی کی، انہوں نے کہا کہ اداروں میں رضاکارانہ کام کرنے کے رجحان کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ ”پاکستان کے آئینی سربراہ کی زبان سے ادا ہونے والے اس جملے کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر اپنے ہاں لوگوں میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بے حد سرکاری اخراجات میں کمی آ سکتی ہے، وہ لوگ جو کئی دہائیوں تک سرکاری خزانے سے تنخواہ لینے کے بعد اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اچھی اور قابلِ رشک صحت سے بھی نوازا ہے، ان کی آمدنی بھی معقول ہے تو اگر وہ مختلف اداروں میں اپنی بلا معاوضہ خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اور کونسی خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں متعلقہ ادارے کو تجربہ کار مشیر میسر آ سکتا ہے، اسی طرح سکولوں کالجوں میں بھی ریٹائرڈ اساتذہ خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ مگر اپنے ہاں گنگا الٹی بہتی ہے۔ یہاں زندہ ہاتھی لاکھ کا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد وہ سو لاکھ کا ہو جاتا ہے، نوکری سے فارغ ہونے کے بعد انہیں پہلے سے زیادہ تنخواہ پر نئی ملازمت مل جاتی ہے۔ واضح رہے کہ صدر صاحب کا یہ مشورہ صرف دوسروں کے لئے ہے، ورنہ پاکستان میں ایکٹ شخصیت پر اگر سب

سے زیادہ قومی خزانے سے رقم خرچ ہوتی ہوگی تو وہ صدر پاکستان ہیں۔ اپنے عہدے کے لئے نہ تو ”رضاکارانہ“ کام کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی کروڑوں روپے سالانہ خرچ کو کم کرنے کا منصوبہ دکھائی دیتا ہے۔ تاہم رعایا کا فرض ہے کہ وہ صدر مملکت کی ایکٹ ایکٹ بات پر عمل کریں اور رضاکارانہ کام کرنے کے رجحان میں بہتری لائیں۔ جناب ممنون حسین نے تعلیمی پروگرام پر عملداری کے لئے تمام وسائل بروئے کار لانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

ایکٹ اور ضرورت بھی زیر بحث لائی گئی، کہ قائد اعظم یونیورسٹی (اسلام آباد) کی چار دیواری مکمل کی جائے، اور مزید اہم یہ کہ یونیورسٹی کی زمین ناجائز قابضین (?) سے چھڑوانے کے لئے اقدامات کی ضرورت ہے۔ دونوں اہم شخصیات نے صرف ضرورت“ کی بات کی، کیونکہ اس سے بڑھ کر دونوں کے اختیار میں اور کچھ بھی نہیں۔ ان کی بتائی ہوئی ضرورتوں کو کون پورا کرے گا؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ایوانِ صدر کا بجٹ شاید صدر صاحب کی ضرورت پوری کرتا ہے، مگر تعلیم کا بجٹ نہ تو صدر صاحب بناتے ہیں اور نہ ہی تعلیم کے چھوٹے وزیر۔ جو لوگ بجٹ بناتے ہیں، ان کی اپنی ترجیحات ہیں۔ چلیں یہ تو بے اختیار لوگ ہیں، یہاں تو اپنے وزیر اعظم بھی اپنے نشریاتی خطاب میں فرما رہے ہوتے ہیں کہ... ’یہاں تھانے بکتے ہیں، یہاں دفاتر میں کوئی کسی کی بات نہیں سنتا، یہاں سکولوں میں کمرے، چار دیواری نہیں، حتیٰ کہ استاد بھی نہیں، یہاں انصاف

نہیں ملتا... وغیرہ وغیرہ۔“ کوئی بااختیار ہو یا بے اختیار، پروٹوکول اور مراعات میں کوئی کمی نہیں۔ یہی ان کی ضرورت ہے، عوام کی کیا ضرورت ہے، کسی کو فکر نہیں۔

جاگیر داروں کا کوئی احتجاج ہماری نگاہ سے نہیں گزرا، جس میں انہوں نے مفتی منیب الرحمن کے بیان کی تردید کی ہو یا مفتی صاحب پر الزامات کا جوابی حملہ کیا ہو، یا پھر اُن کے پاس جواب نہیں، یا انہوں نے جواب دینا ضروری نہیں جانا۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ اگر کسی نے تردید کی وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہی۔ مفتی منیب نے کہا ملک کو اتنا نقصان جاگیر داروں نے نہیں پہنچایا، جتنا درباروں، خانقاہوں اور ”در سگاہوں پر قابض مذہبی جاگیر داروں نے پہنچایا ہے.... اکثر خانقاہیں نیلام ہو چکی ہیں... جہاں نفس کی اصلاح ہونی تھی، وہاں نذرانوں کا کاروبار چل رہا ہے... قوم کو ان کے چنگل سے آزادی دلانے کی ضرورت ہے... گدی میرٹ پر نہیں وراثت میں ملتی ہے..“۔ کہنے کو مفتی صاحب نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے، انہیں خوب معلوم ہے کہ جاگیر دار کس قسم اور کس سطح کا بھی کیوں نہ ہو وہ تنقید اور نکتہ چینی برداشت نہیں کرتا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس بیان کا جواب تیار کیا جا رہا ہو، یا اس کی تردید کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہو، یا میڈیا پر آئے بنا ہی مفتی صاحب کے بیان پر کوئی براہ راست رابطہ ہی ہو رہا ہو۔

مفتی صاحب کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، مگر بیان کے پہلے حصے پر بات کرنا

بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ کہنا مناسب نہیں کہ جاگیر داروں نے ملک کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے فریق دوم کے عمل میں شدت پیدا کرنے کے لئے اول الذکر کے مظالم کو کم قرار دیا، یعنی جب دونوں قسم کے جاگیر داروں کی بات ہوئی تو دوسری قسم کو زیادہ خطرناک اور نقصان دہ قرار دیا۔ اب ایسا وقت آچکا ہے کہ مفتی صاحب کے بقول 'مذہبی جاگیر دار' اس قدر طاقتور ہو چکے ہیں کہ وہ دوسرے جاگیر داروں سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر اس معاملے میں ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو پاکستان میں مذہبی جاگیر داروں میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا شمار دونوں قسم کے جاگیر داروں میں ہوتا ہے، گویا یہ لوگ دو آتشہ ہیں۔ جہاں تک آمدنی کی کہانی ہے تو مذہبی جاگیر داری میں آمدنی کے ذرائع بہت زیادہ ہیں، مرید دور دراز سے آتے اور نذرانے پیش کرتے ہیں، عرس کے دنوں میں تو نوٹوں کی بوریاں بھر کر پیر صاحب کے گھر جاتی ہیں۔ بعض دربار ایسے بھی ہیں، جہاں اولادوں میں وراثت کا تنازع ہوتا ہے، کیونکہ دربار یا خانقاہ کی وراثت کا مل جانا قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتا۔ جب پیسہ بے حد و حساب آتا ہے، تو پھر زمینیں بھی بن جاتی ہیں، کاروبار بھی ہو جاتے ہیں، بیرون ملک بندوبست بھی ہو جاتے ہیں، کروڑوں کی قیمتی گاڑیاں، عالیشان بنگلے اور اس قسم کی دیگر مراعات، سہولیات تو انہیں میسر ہی ہوتی ہیں۔ ان پیروں کا نقشہ اقبالؒ گزشتہ صدی میں ہی کھینچ گئے تھے۔

اپنے ہاں درباروں اور خانقاہوں کے زیادہ تر گدی نشین اپنے بزرگوں کی کمائی ہی کھا رہے ہیں، انہی کا نام چلتا ہے، زائرین انہی بزرگوں کے نام پر آتے ہیں، اپنے عقیدے کے لحاظ سے وہ جو کچھ نذرانہ پیش کرتے ہیں، وہ بزرگوں کے نام پر ہی دیتے ہیں، اگرچہ قبول وہ گدی نشینوں کو ہی ہو جاتا ہے۔ نفس کی اصلاح کا کام تو اہالیانِ قبور کر گئے، کاروائی کے طور پر یہ ’مذہبی جاگیردار‘ بھی اپنے مریدوں کو کچھ نہ کچھ درس ضرور دیتے ہیں، کچھ ایسے شکل و صورت بھی بنا رکھتے ہیں، خیر اگر جُبہ و دستار نہ بھی ہو، تو مریدانِ باوفا برا نہیں مناتے، بلکہ پیر جس صورت میں بھی ہو، وہ پیر ہی ہے۔ مفتی صاحب کے بقول یہ کاروبار صرف درباروں اور خانقاہوں میں ہی نہیں ہو رہا، بلکہ مذہبی درسگاہیں بھی اس میں شامل ہیں، انہوں نے بھی اپنی ریاستیں قائم کر رکھی ہیں، وہی ان کی جاگیر ہیں۔ بات جاگیر کی ہے تو پاکستان میں سیاست بھی ایکٹ جاگیر ہے، پارٹیاں بھی جاگیرداروں کے گھروں کی باندیاں ہیں، جس کی پارٹی ہے، وہ اس کا مالکِ کل ہے۔ پارٹی سے آمدنی بھی حاصل ہو رہی ہے، پارٹی کے ذریعے اپنی حد تک حکومت بھی قائم ہے، الیکشنوں میں کامیابی ہو جائے تو سونے پہ سہاگہ۔ جو حکمران بن جاتے ہیں وہ ملک کو اپنی جاگیر تصور کر لیتے ہیں۔ بات آزادی کی آ جاتی ہے، ان ہمہ قسم کے جاگیرداروں سے نجات کیسے حاصل کی جائے، کون بغاوت کرے، یہاں تو ہر انسان کسی نہ کسی ”جاگیردار“ کے ہاتھوں

مجبور ہے، اس کا پابند ہے۔ کوئی زمینیں جاگیر داروں کے ہاتھ، کوئی منڈ ہی اور کوئی سیاسی
جاگیر داروں کی رعایا ہے، بغاوت کون کرے گا؟

انوکھے سرکاری ملازمین

کونسا سرکاری ملازم ہے، جو مہینے میں آٹھ دس روز دفتر جائے، کام بھی کوئی نہ کرے، بس گپ شپ، کینٹین پر چائے پانی اور کچھ دیر دفتر میں بیٹھ کر گھر واپس آ جائے، مگر جب تنخواہ کا وقت آئے تو پوری تنخواہ اس کے ہاتھ میں تھما دی جائے؟ اگر انہی دنوں کے وہ کوئی ٹی اے ڈی اے کا دعویٰ کرے تو اسے اس مد میں بھی کچھ رقم مل جائے؟ اگر ایسا ہونے لگے تو دفاتر میں آلو بولیں گے، ویرانی کا راج ہوگا، سائل خوار ہو جائیں گے۔ بہت سے اداروں میں تو اب حاضری کے لئے جدید طریقہ اپنایا جاتا ہے، جب کوئی دفتر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے وہ اپنا انگوٹھا ایکٹ مشین پر رکھے گا، جس سے اس کی دفتر میں آمد کی اطلاع ہو جائے گی، اس کے آنے کا وقت درج ہو جائے گا، یہی عمل اسے واپسی پر دہرانا ہوتا ہے۔ نظام بائیو میٹرک کی گرفت میں ہے۔ مگر یہ بندوبست ہر جگہ نہیں ہو سکا، اگر حکومت اس طرف توجہ دے تو کچھ مشکل نہیں۔ عام سرکاری محکموں میں بھی رجسٹر پر حاضری لگائی جاتی ہے، تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ اسی طرح سکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کا معاملہ بھی یہی ہے کہ امتحان کے قریب جا کر ان کی حاضریاں شمار کی جاتی ہیں، اگر مطلوبہ تعداد سے کم ہوں تو داخلہ نہیں بھیجا جاتا، جس سے سال ضائع ہونے کا یقینی امکان ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں

میں انتظامیہ کے پاس یہی ایکٹ تھیار ہوتا ہے، جس کے ذریعے سے سٹوڈنٹس کو قابو کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، ورنہ یہ ہستیاں کالج یا یونیورسٹی تو آ جاتی ہیں، کلاس میں نہیں۔

مگر پاکستان میں ایکٹ سرکاری ادارہ ایسا بھی ہے، جہاں کام کرنے والے کی حاضریاں ستر یا اسی فیصد کی بجائے دس فیصد بھی ہوں تو ان کو پوری تنخواہ ملتی ہے۔ یہ ہمارے معزز ممبرانِ اسمبلی ہیں، جن میں سے چیئرمین سینٹ، سپیکر اور وزیر بھی بنائے جاتے ہیں۔ خبر آئی ہے کہ ممبرانِ پارلیمنٹ کی تنخواہوں میں ایک سو پچاس فیصد اضافہ کی منظوری دے دی گئی ہے۔ یوں اب چیئرمین سینٹ اور سپیکر قومی اسمبلی دو لاکھ پانچ ہزار تنخواہ لیں گے، ان کے ڈپٹی ایکٹ لاکھ پچاس ہزار، وفاقی وزیر دو لاکھ، چھوٹے وزیر (وزیر مملکت) ایکٹ لاکھ اسی ہزار اور عام رکن قومی اسمبلی ایکٹ لاکھ پچاس ہزار روپے تنخواہ وصول کرے گا، یوں اس اضافے سے قومی خزانے پر ماہانہ چالیس کروڑ روپے کا بوجھ پڑے گا۔ واضح رہے کہ یہ تنخواہ ہے، مراعات اور الائنمنٹ اس کے علاوہ ہیں۔ وزیر خزانہ نے کہا ہے کہ بلوچستان اسمبلی کے ممبران کی تنخواہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ کابینہ کے اجلاس میں جب بات تنخواہوں کی ہوئی تو وزیر اعظم نے تنخواہ میں اضافہ کا عندیہ دیا اور ساتھ ہی کارکردگی بہتر کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ مگر ستم یہ ہے کہ اسمبلیوں کی کارکردگی شرمناک حد تک خراب ہے

اکثر اوقات کورم ہی ٹوٹ جاتا ہے، اگر کسی مسئلے پر بحث ہے تو وہ بھی غیر سنجیدہ رخ ہی اختیار کئے رکھتی ہے، قانون سازی میں بہتر کا خیال کسی نے کبھی نہیں رکھا۔ جن دنوں میں معزز ممبران تشریف ہی نہیں لاتے، ان دنوں کے ٹی اے ڈی اے بھی وصول فرما لیتے ہیں۔ اسمبلی میں سوال کرنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، اور ان کو جواب دینے والے ان سے بھی کم ہیں، آئے روز یہ مہربان دست و گریبان رہتے ہیں۔ یوں پارلیمنٹ کے ارکان ایک کرناک مذاق کی صورت میں قوم کے سینے پر مونگ ڈل رہے ہیں، اور اسی ستم کی بھاری تنخواہ وصول کرتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے ارکان کی تنخواہ ہونی چاہیے، مگر یہ خیال بھی رکھا جائے کہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر (کہ کمیشن نے نظر انداز کرنے کا خود ہی ماحول بنا رکھا ہوتا ہے) کروڑوں روپے الیکشن مہم پر لگاتے ہیں، اثاثے چھپاتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں۔ ایسے ارکان اسمبلی کہ جن کے پاس واقعی روزگار کے ذرائع زیادہ وسیع نہیں، یا جن کا روزگار محدود ہے، ان کی تعداد بھی انگلیوں پر ہی گنی جاسکتی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا جاسکتا ہے، کہ اگر کوئی عام اور غریب نمائندہ اسمبلی میں پہنچ گیا ہے، تو وہ دوسروں سے زیادہ محنتی اور حاضر باش ہوتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو مسلسل غیر حاضر رہنے اور کچھ بھی نہ کرنے پر اس قدر تنخواہ ملے گی، تو

دیگر سرکاری محکموں کے ملازمین کے لئے کیا حکم ہے؟ اور یہ بھی کہ آیا قانون سہار

اداروں کے معزز ممبران کو یہ غیر منجیدہ رویہ زیب دیتا ہے؟

سعودی حکومت نے ایک انوکھا فیصلہ صادر کیا ہے، جس کے مطابق اب خواجہ سراؤں کو عمرہ کی اجازت نہ ہوگی۔ ہم اس بات پر کم ہی غور کرتے ہیں کہ بہت سے مواقع پر ہم ایسے جذبات کا اظہار کر جاتے ہیں، جو صریحاً اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں مداخلت یا اعتراض وغیرہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسے رد عمل سے بظاہر تو ہم کسی کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں، درحقیقت ہم خالق کائنات کی تخلیق پر نکتہ چینی کر رہے ہوتے ہیں۔ دوسروں کا مذاق اڑا کر یا انہیں تضحیک کا نشانہ بنا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرنے والے اس بات کو ذہن سے نکال دیتے ہیں کہ جس کو مذاق کیا جا رہا ہے اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس مذاق کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم اکثر اوقات کسی کی شکل، قد اور رنگ وغیرہ کو نشانہ بناتے ہیں، جبکہ ان تمام عناصر کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے جیسا بنایا ہے، ہم اس کا مذاق اڑا کر اللہ کی صناعت کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ گناہ اس قدر عام ہے کہ اس میں ہر طبقہ فکر ملوث ہے، کیا دانشور، کیا علماء، کیا سیاستدان، کیا عوام، اکثر اس فعل بد کا شکار ہیں۔ خواجہ سراؤں نے اگرچہ خود بھی ایسا ماحول بنا رکھا ہوتا ہے، جس سے دوسروں کو ان کا مذاق اڑانے کا موقع میسر آتا ہے، وہ خود کو مردانہ رنگ میں ڈھالنے کی بجائے زنانہ

شکل و صورت اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ ان کی ظاہری شبہات مردوں کے قریب تر ہوتی ہے۔ اس صورت کو نبھانے کے لئے وہ ہر محفل اور ہر موقع پر بے تکلف ہی دکھائے دیتے ہیں۔ ان کی مضحکہ خیز بناوٹ پر بچوں سے لے کر بڑوں تک سب ہی اپنے حساب کے مطابق تبصرے کرتے اور آوازے کستے ہیں۔

خواجہ سراؤں کو چونکہ اجتماعی طور پر مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس لئے معاشرے میں ان کو ذمہ دار شہری کے طور پر قبول ہی نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو سرکاری ملازمتوں میں ان کا کوئی کونہ ہے۔ یہ لوگ کبھی حکومتوں کے در پر دست سوال دراز کرتے ہیں، کبھی عدالتوں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، کبھی نوبت احتجاج پر آ جاتی ہے۔ عدالتوں نے اپنے بعض فیصلوں کے ذریعے ان کے حقوق دلانے کے احکامات صادر کئے ہیں، مگر مجموعی طور پر ان لوگوں کے بارے میں کوئی قابلِ تحسین قدم نہیں اٹھایا گیا۔ خواجہ سراؤں کی بات نہ سنے جانے اور ان کے مطالبات پورے نہ ہونے اور معاشرے میں ان کو مذاق اور تضحیک کا نشانہ بننے کے پیچھے جہاں معاشرتی بے حسی کار فرما ہے، وہاں ان کا اپنا عمل دخل بھی حد سے زیادہ ہے۔ اُن کے غیر سنجیدہ رویے ان کو معاشرے میں سنجیدہ مقام دلانے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ نوبت یہاں تک ہے کہ کسی بھی قسم کی محفل یا ماحول میں ان لوگوں کو مذاق ہی تصور کیا جاتا ہے، جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو روزگار کی سہولت میسر نہیں

آتی۔ جن گھروں میں یہ پیدا ہو گئے، وہ بھی ان کو برداشت نہیں کرتے۔ یقیناً ایسا بھی ہوگا کہ بہت سے خواجہ سرا ایسے ہونگے جو عام شریف گھر میں پیدا ہوئے اور یہ راز زیادہ لوگوں پر نہ کھلا، اور وہ عام انسان کی زندگی بسر کر رہے ہونگے، مگر معاشرے میں ایسے راز رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں خواجہ سراؤں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے، اس کو جہالت قرار دیا جاسکتا ہے، کہ قوم اپنی جہالت کی بنا پر ان کو تضحیک کا نشانہ بناتی اور دوسرے درجے کے شہری بنا کر رکھتی ہے، یہ غیر انسانی رویہ قابلِ مذمت تھا، ہے اور رہے گا، مگر سعودی عرب سے آنے والی خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ خانہ کعبہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، صرف وہی لوگ وہاں جاسکتے جو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے، یا پھر فاجر العقل ہیں کہ انہیں اپنی ہوش نہیں۔ کسی مسلمان کو خانہ کعبہ میں داخلے سے کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اگر سعودی حکومت کے پاس ایسی کوئی شرعی دلیل ہے تو اسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کرنا چاہیے تھا، ملت کو مطمئن کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ ان بھٹکے ہوئے لوگوں کے راستے ہم خود ہی بند کر رہے ہیں۔ ستم یہ بھی ہے کہ اپنی حکومتیں بھی سعودی عرب کے سامنے ایسے سوالات کرنے سے کتراتی ہیں، کیونکہ ان کے اپنے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ سعودی حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو ایک نگاہ سے دیکھے۔

